سیرت امیرالمومنین

حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

حصّہ دوم

تالیف

علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہٗ

سیرت امیر المومنین

حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

حصہ دوم

تالیف

علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ

ناشر

امامیہ پبلیکیشنز ۳۵ حیدر روڈ لاہور

فون نمبر ۷۲۲۸۶۴۲

نام کتاب:- سیرت امیرالمومنینؑ (حصہ دوم)

مصنف:- علامہ مفتی جعفر حسین علی اللہ مقامہ وارفع درجہ

طابع:- معراج دین پرنٹر مچھلی منڈی لاہور

کمپوزر:- بی سٹار کمپوزر۔ فون نمبر 7466488

ناشر:- امامیہ پبلیکیشنز

بار سوم مارچ 2000ء

تعداد:-

ملنے کا پتہ

العصر اسلامک بک سنٹر

۳۵۔ حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور۔ فون نمبر 7248642

فہرست

عرض ناشر

عرصہ دراز سے ہماری یہ خواہش تھی کہ سیرت امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ سلام کا دوسرا حصہ قارئین کی نذر کریں۔ جس سے نہ صرف علامہ مفتی جعفر حسین اعلی مقامہ کی روح کو یک گونہ سکون حاصل ہو بلکہ ان کی محنت شاقہ سے اردو کے قالب میں ڈھلنے والا عظیم شاہکار "کلام امام' امام الکلام" کا مصداق ادب کا خزینہ' علم و حکمت کا گنجینہ' فصاحت و بلاغت کا بحر بیکراں' منبع رشد و ہدایت' ظلمتوں کی گھٹا ٹوپ اندھیری راتوں میں مشعل راہ ہدایت' علوم و معارف کا گراں بہا سرمایا' حکمت و اخلاق کا سرچشمہ' عامتہ الناس کی علمی و ادبی تشنگی کو دور کرنے کا باعث ہو۔ مگر چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہم اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر سکے۔ مگر اب تائید ایزد متعال سے اس قابل ہوئے ہیں کہ اس علمی و ادبی شاہکار کو زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ کر کے آپ تک پہنچا سکیں۔ ہماری دعا ہے کہ علامہ مفتی جعفر حسین قبلہ اعلی اللہ مقامہ کا یہ صدقہ جاریہ ان کی بلندی درجات کا باعث ہو اور رب ذوالجلال انہیں جوار اعلی علیین میں جگہ مرحمت فرمائے (آمین ثم آمین)

سرکار علامہ مفتی صاحب سیرت امیرالمومنین علیہ السلام حصہ اول کے افتتاحیہ میں اس کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کے مقصد کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

"امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک طرف علم کی سرپرستی سے نوع انسان کے کارواں کو آگے بڑھایا اور دوسری طرف عمل کے وہ روشن نمونے پیش کئے جو ہر منزل میں چراغ راہ کا کام دیتے اور زندگی کی اعلی قدروں سے روشناس کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ کی زندگی اور اس کے روشن آثار کی پیروی کی جائے تاکہ آپ کے افکار و نظریات سے روشنی حاصل کی جائے اور آپ کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کی راہیں متعین کی جائیں اور مادہ پرست ذہنیت کی شکست' اخلاقی و روحانی قدروں کے ارتقاء اور اسلامی تصورات کے احیاء کے لئے اس مصلح اعظم کی تابناک زندگی کے نقوش کو مشعل راہ بنایا جائے اور ان کے اصول زندگی کی غیر متزلزل بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کی جائے۔ تاکہ انفرادی و اجتماعی زندگی دینی تقاضوں سے ہم آہنگ اور

اخلاقی رفعتوں سے ہمکنار ہو سکے۔

اسی مقصد کے پیش نظر آپ کی سیرت و زندگی کے یہ تحریری نقوش پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں نہ رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے نہ مبالغہ آفرینی سے، نہ ان میں ناروا عصبیت کارفرما ہے اور نہ بیجا جنبہ داری۔ بلکہ حقائق و واقعات اور تاریخی مسلمات کی روشنی میں انہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ آپ کی زندگی و سیرت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑ سکے۔ تاریخی واقعات کو تاریخ ہی کی زبان میں دہرایا گیا ہے اور انہیں غلط رنگ دینے یا مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، اور اختلافی مسائل کو صرف تجزیہ تاریخ و نقد روایت تک محدود رکھا گیا ہے اور حتی الامکان باہم آویزیوں سے ذبح کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔"

ادارہ ان تمام معاونین کا کہ جن کی شب و روز کی محنت، لگن اور جستجو نے اس کار کٹھن کو آسان بنایا ہے تہہ دل سے ممنون احسان ہے، خصوصی طور پر جناب سید سجاد حسین نقوی صاحب کا کہ جنہوں نے پروف ریڈنگ جیسے مشکل مرحلہ میں نہ صرف ہماری رہنمائی فرمائی بلکہ کمال دلچسپی لیتے ہوئے زیر نظر کتاب کے تمام پروف بذات خود پڑھے۔ ادارہ ان کی صحت اور جملہ توفیقات میں اضافہ کے لئے دست بدعا ہے۔

ہم ان تمام احباب کے بھی مشکور و ممنون ہیں کہ جو وقتاً" فوقتاً" کتب کے معیار کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں اپنی بیش قیمت آراء سے نوازتے رہتے ہیں اور ہماری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ ہم ہر طرح کی مثبت تنقید کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ قبول کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار اور منتظر رہتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین اپنے اس جذبہ کو جاری رکھتے ہوئے ہمارے ساتھ دست تعاون بڑھاتے رہیں گے۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی والصلوٰۃ علی محمد المصطفی ولہ الاصفیاء

انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل انسان کی جسمانی ساخت' ذہنی شعور' فکری ارتقاء اور اخلاقی و روحانی اقدار سے وابستہ ہے۔ انہی جسمی و نفسی صفات کے آئینہ میں اس کی شخصیت کے خدوخال کو دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک جسمی صفات کا تعلق ہے انہیں آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے مگر نفسی و روحی صفات مشاہدہ کے حدود سے باہر ہیں۔ انہیں صرف آثار سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اگرچہ تمام انسان جسمانی اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں مگر ان میں بعض افراد اپنی غیر معمولی قوتوں اور فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے اتنے ارفع مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ ان کی صفات و خصوصیاتِ عام انسانوں کے تصور کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس لیے کہ انسان اسی صفت کا صحیح تعین کر سکتا ہے جو خود اس کے اندر پائی جاتی ہو مگر اس سے ملتی جلتی ہوئی صفت سے متصف نہیں ہو گا تو جس طرح کیف و سرور اور درد و الم ایسے کیفیات کو ان سے دو چار ہوئے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا اسی طرح صفات نفسیہ کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے گا اور نہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے گا مگر انسان کتنا بھی روشن فکر اور یگانۂ روزگار کیوں نہ ہو وہ تمام صفات و کمالات اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا کہ ہر صفت کو سمجھ سکے اور ہر کمال کو پرکھ سکے بلکہ ایک کمال میں انتہائی بلندی پر ہو گا تو دوسرے کمالات کے اعتبار سے پستی میں نظر آئے گا یا پہلے کمال کے مقابلہ میں نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے گا کیونکہ انسان اپنی قوت و توانائی کو ایک آدھ درجہ ہی پر مرکوز کر کے عملی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا اور ارتقائی مدارج طے کر سکتا ہے اور اگر قوت و استعداد کو مختلف کمالات کے حصول میں صرف کرے گا تو قوت و توانائی بٹ جائے گی اور نتیجۃً ہر جذبہ ناقص و ناتمام رہے گا اور کسی صفت کو بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچاسکے گا۔

مولائے کائنات امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت اس اعتبار سے منفرد و یگانہ ہے کہ ان میں وہ تمام فضائل و کمالات جو نہ کسی میں یکجا ہوئے اور نہ ہوں گے پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کے اندر جمع تھے یہ اوصاف اپنے تنوع اور تباین کے اعتبار سے انسانی فہم سے بالاتر ہیں اس لیے کہ نہ وہ اجتماعی صورت میں کہیں نظر آتے ہیں اور نہ متضاد صفتوں کے نشوونما پانے اور ان میں ربط وہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہر ایک میں ہوتی ہے کہ کوئی نمونہ ومثال سامنے رکھ کر ان کے نفسی صفات و معنوی خصوصیات کو سمجھا جاسکے البتہ مظاہر و آثار سے ان صفات کی ہلکی سی جھلک دیکھی جاسکتی ہے چنانچہ آپ کی متنوع پر رنگ اور گوناگوں کمالات سے آراستہ شخصیت پر جتنی مرتبہ نظر کی جائے کمال وفضائل کے مختلف گوشے نظروں کے سامنے ابھرتے اور عمل وکردار کے جوہر نکھرتے چلے آتے ہیں۔ گو دیکھنے میں آپ ایک شخصیت تھے مگر مختلف صفات وکمالات کے اعتبار سے متعدد شخصیتوں کا مجموعہ تھے اور اس ایک ذات میں تمام محاسن وفضائل اپنی پوری دلآویزیوں کے ساتھ سمٹ کر جمع ہو گئے تھے اور یہی وہ طغرائے

امتیاز ہے جس نے آپ کی بوقلموں شخصیت کو رفعت انسانی کا شاہکار اور کمالات و محاسن کے پھولوں کا گلدستہ صد رنگ و چمن صد بہار بنادیا ہے۔ آپ رونق دہ بزم آب و گل بھی تھے اور جلوہ فراز عالم انوار بھی، علم و عرفان کا زریں صحیفہ بھی تھے اور حسن کردار کا ورق زرنگار بھی۔ مسند قضا پر مشکل گتھیوں کے گرہ کشا بھی تھے اور محراب عبادت میں عابد شب زندہ دار بھی۔ سخاوت میں فرد فرید بھی تھے اور شجاعت میں یکتائے روزگار بھی۔ انشاء و تفنن کلام کے سرچشمہ بھی تھے اور خطابت و بیان کے قلزم زخار بھی۔ ادبیات و فنون عربیہ کے گنج شائگاں بھی تھے اور علم کلام و فلسفہ الہیات کے خزینہ دار بھی۔ قرآن کے جامع اور پہلے مفسر بھی تھے اور دنیائے اسلام کے اولین مصنف و قلمکار بھی۔ امن و آشتی کے پیغامبر بھی تھے اور دشمنان دین سے برسرپیکار بھی، زینت افزائے عرشہ خلافت بھی تھے اور اقلیم ولایت کے تاجدار بھی، مشکل کشائے عالم بھی تھے اور نیرنگی زمانہ سے دو چار بھی، آلام حیات پر خندہ زن بھی تھے اور رات کے اتھاہ سناٹوں میں اشکبار بھی۔ برق شعلہ ساماں بھی تھے اور ساون کی ہلکی پھوار بھی، چلچلاتی دھوپ بھی تھے اور شجر سایہ دار بھی، ہوائے تند کا تھپیڑا بھی تھے اور نسیم سبک رفتار بھی، جلالی قدرت کا آئینہ بھی تھے اور جمالی فطرت کا سنگھار بھی **اشدء علی الکفار** کی عملی تصویر بھی تھے اور **رحماء بینھم** کا مثالی کردار بھی، غرض جس صفت کمال پر نظر کی جائے وہ اس جامع اضداد ذات میں موجود ملے گی۔

ان متضاد صفات کے اجتماع اور ان کے ناقابل فہم امتزاج نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور جوں جوں آپ کی کتاب زندگی کے نقوش پر نظر کی جاتی ہے حیرت و استعجاب میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے یوں تو دنیا میں ہزاروں انسانوں نے فضائل و کمالات کی کڑی منزلیں طے کیں اور ہر جادہ کمال پر اپنے نشانات قدم چھوڑے مگر جامعیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے آپ کی شخصیت اتنی بلندوبالا ہے کہ قدآور شخصیتیں بھی ان کے سامنے پست نظر آتی ہیں اور ان کی عظمت کے نقوش اتنے روشن ہیں کہ زمان و مکان کے طویل فاصلوں کے باوجود ان کی تابندگی سے آنکھوں میں خیرگی آجاتی ہے۔ اگرچہ اموی فرمانرواؤں اور ان کے ہواخواہوں نے تمام وسائل بروئے کار لاکر ان نقوش کو دھندلاہٹوں کی دبیز تہوں میں چھپانے کی کوشش کی مگر اس آفتاب عظمت و جلال کی جگمگاہٹوں پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آپ ان کی باطل کوشیوں کے باوجود کعبہ ارادت و قبلہ عقیدت بن کر رہے اور دنیا نے بلا امتیاز عقیدہ و مذہب انہیں اپنی عقیدتوں میں مرتکز اور ضمیر کی گہرائیوں میں جاگزیں پایا۔ چنانچہ آپ کی بلندیٔ فکر و [illegible]ل نے غیر مسلم افراد کے ذہنوں کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے آپ کی علمی و ادبی رفعت اور دینی و سیاسی بصیرت پر بلند پایہ مقالے اور مبسوط کتابیں لکھ کر خراج تحسین ادا کیا جن میں میخائیل نعیمہ، جورج جرداق، پولس سلامہ، عبدالمسیح انصاکی استاد فواد فرم البستانی اور روکس ابن زائد العزیزی کے نام سرفہرست ہیں اور مسلمانوں نے بھی خواہ وہ کسی فرقہ و گروہ سے تعلق رکھتے ہوں کسی نہ کسی اعتبار سے ان سے عقیدت و نیاز مندی کا اظہار ضروری سمجھا۔ اہل تشیع تو شیعۂ علی کہلاتے اور انہیں جانشین رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و خلیفہ منصوص سمجھتے ہی ہیں۔ اہلسنّت کے نزدیک بھی وہ صحابہ کبار، عشرہ مبشرہ اور خلفاء راشدین میں شامل ہیں۔ صوفیاء و اہل طریقت کے پیشوا شبلی جنید

بغدادی معروف کرخی، سری سقطی ابویزید بسطامی وغیرہ سلسلہ تصوف کی کڑیاں ان سے ملاتے اور قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، شاذیہ، اویسیہ وغیرہ انہی کے سرچشمہ ولایت سے اپنی تشنگی بجھاتے ہیں۔ قرائے سبعہ میں سے اکثر و بیشتر انہی کی قراءت پر اعتماد کرتے اور مفسرین ان کی تفسیری افادیت کو تفسیر کا گران بہار سرمایہ سمجھتے ہیں۔ محدثین ان کے سلسلہ روایت کو صحت عرشیہ کی سند قرار دیتے اور فقہاء استنباط و احکام میں ان کے اقوال سے رہبری و راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ متکلمین ان کے کلامی مباحثہ پر علم کلام کی عمارت کھڑی کرتے اور قضاۃ ان کے فیصلوں سے فصل خصومات کے اصول سیکھتے ہیں۔ علماء اخلاق اخلاقی قدروں کے درس اور کردار سازی کے سبق ان کے حکیمانہ کلمات میں تلاش کرتے اور فصحاء و ادباء ان کے چمن زار بلاغت کے سدا بہار پھولوں سے معانی و بیان کے گلدستے سجے ہیں۔

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد — کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد

اس کار گاہ عالم میں پیغمبر اکرم ؐ کے علاوہ اتنی وسیع النظر اور جامع علوم شخصیت کہیں نظر نہیں آتی جس کی فکری و نظری تجلیوں اور علمی و تحقیقی کرنوں سے ہر دلستان فکر و جہان دانش نے روشنی حاصل کی ہو۔ نظر و فکر کی کتنی راہیں تھیں جو آپ کی بدولت کھلیں اور علم و تحقیق کے کتنے مخفی گوشے تھے جو آپ نے بے نقاب کئے۔ آج دنیا میں جہاں جہاں علم و حکمت کی شمعیں روشن اور فکر و دانش کے چراغ فروزاں نظر آتے ہیں وہ اسی قندیل درخشاں کی تابندگیوں کا کرشمہ اور اسی مشعل ضوفشاں کی درخشندگیوں کا پر تو ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پر تو آں — ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

امیرالمومنین علیہ السلام نے ملت اسلامیہ کو ایک عظیم علمی سرمایہ دیا جو توحید و خدا شناسی، علم کلام و فلسفہ الہیات اور رموز دین و اسرار احکام کا خزینہ عامرہ ہے بلکہ اسلامی علوم کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جس کا سلسلہ آپ تک منتہیٰ نہ ہوتا ہو اور شاید ہی کوئی مکتب فکر ایسا ہو جس نے آپ کی ذہنی توانائی و فکری رہنمائی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ نہ کیا ہو۔ آپ نے علمی دقائق کی گرہ کشائی کی، فکر و فن کے چراغ روشن کئے اور علم کی ہر شاخ کی آبیاری کا سامان کیا۔ قرآن کی جمع آوری کے ساتھ اس کے متعلقہ علوم قراءت تجوید، اعراب، رسم الخط اور تفسیر و تدوین کی طرف رہنمائی فرمائی۔ حدیث کی اقسام اور رواۃ کے اصناف پر روشنی ڈالی۔ استنباط احکام کے قواعد منضبط کئے۔ الہیات، طبیعیات اور ریاضیات کی خشک سرزمین کو اپنے افادات کی بارش سے سیراب کیا تہذیب، اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن کے حدود قائم کئے۔ حکمت نظریہ و حکمت علمیہ کے تفصیلی خاکے ترتیب دیئے بلاغت کے اسلوب وضع کئے نحوی قواعد کی بنیاد رکھی اور فلسفیانہ حقائق میں ادبیت کو سمو کر خیالات کے اظہار کا نیا سانچہ ایجاد کیا۔ بلاشبہ دنیائے اسلام میں جو تخلیقی سوتے پھوٹے اور مسلمانوں نے جو تحقیقی کارنامے انجام دیے وہ نتیجہ ہے آپ کی علمی سرپرستی کا۔ آپ نے علمی تحریک کو فروغ دے کر مسلمانوں میں تحقیقی ذوق پیدا کیا اور انہیں غلبہ و جستجو اور تعقل و تفکر کی راہ پر لگایا۔ اگر آپ علوم و معارف کے نشر میں سرگرم عمل نہ ہوتے تو مسلمان فتوحات کے نشہ میں

کھو کر علم و ہنر سے بیگانہ رہتے اور جہانبانی و کشور کشائی ہی کو اپنی منزل آخر قرار دے لیتے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک طرف علم کی ترقی و تکمیل کی راہیں ہموار کیں اور دوسری طرف عملی زندگی کے خدوخال نکھارے اور سنوارے اور ایسے کردار ساز اور اخلاق آموز درس دیے جو شخصی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں یہ اخلاقی تعلیمات صرف قول و گفتار تک محدود نہ ہوتے تھے بلکہ ان کی تائید کے لئے عملی نمونے بھی ساتھ ساتھ پیش کر دیتے تھے کیونکہ انسان قول سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتا جس حد تک عمل کی خاموش زبان سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ غرض حضرتؑ نے اپنے علم و عمل سے وہ شمعیں روشن کیں جن کی چھوٹ ہمیشہ جہالت کی گزر گاہوں میں روشنی پھیلاتی اور تاریک گوشوں کو منور کرتی رہے گی۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی تابناک زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے علمی و عملی کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لئے بڑی وسعت نظر کی ضرورت ہے اور اس موضوع پر وہی افراد قلم اٹھا سکتے ہیں جو علوم و فنون کے مختلف گوشوں سے آشنا ہوں چہ جائیکہ مجھ ایسا بے بضاعت و کوتاہ نظر قلم اٹھائے اور اس سے عہدہ برآ ہو سکے۔
کہ بدانم ہمی کہ نادانم

بایں ہمہ اللہ کی توفیق و تائید پر بھروسا کرتے ہوئے اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت کی ہے اور مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے جو مواد فراہم کر سکا اسے ان صفحات پر چپکا دیا ہے۔ امید ہے کہ اہل نظر میری لغزشوں اور فروگزاشتوں کو بشری تقاضا اور انسانی فطرت کا لازمہ سمجھ کر دامن عفو و درگزر میں جگہ دیں گے۔

ومن اللہ استمد التوفیق وارجو الصواب

امیرالمومنین علیہ السلام کا علمی مقام

کسی مذہب و ملت نے علم کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اہمیت اسلام نے دی ہے اسلام مین علم کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے عقائد و نظریات کی بنیاد ہی علم پر ہے اس نے علم کو نور و روشنی اور جہل کو تاریکی و کورنگاہی سے تعبیر کر کے ضیاء و روشنی میں راہ و منزل کے متعین کرنے کی دعوت دی ہے اور جہل کے اندھیروں میں سرگرداں رہنے کی مذمت کی ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

افمن جعلنا لہ نورا یمشی بہ فی النا س کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منہا

کیا وہ شخص جس کے لیے ہم نے نور قرار دیا جس کی روشنی میں وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں بھٹک رہا ہو اور نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو۔

پیغمبر اکرمؐ نے جن کی بعثت کا مقصد اولین، کتاب و حکمت کی تعلیم تھا، علم سے وابستگی کا ذوق پیدا کیا اور ہر اسلامی فرد پر طلب علم کا فریضہ عائد کر کے علمی ترقی کی راہیں ہموار کیں چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے:۔

طلب العلم فریضتہ علی کل مسلم الا ان اللہ یحب بغاۃ العلم

ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا واجب ہے اور اللہ علم حاصل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سے صرف دینی و اخلاقی علوم ہی مراد نہیں ہیں بلکہ ہر وہ علم اس میں داخل ہے جو آثار قدرت و اسرار کائنات کو بے نقاب کر کے مظاہر فطرت کی طرف رہنمائی کرے اور خدا شناسی کی منزل تک پہنچائے۔ بلا شبہ اس منزل تک رسائی کا واحد ذریعہ علم ہے۔ اسی سے کائنات کی باریکیاں کھلتی اور اس میں چھپی ہوئی حکمتیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے خالق کے وجود اور اس کے کمال حکمت پر دلیل لائی جاتی اور یقین و اعتقاد میں پختگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے **وبالعلم یعرف اللہ ویوحد** علم ہی سے اللہ اور اس کی یکتائی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام علوم و معارف کا سرچشمہ تھے۔ آپ ہی سے علم کے سوتے پھوٹے اور آپ ہی کے تربیت یافتہ علم و کمال کی بلندیوں پر فائز ہوئے۔ لیکن جس طرح ایک استاد کے شاگرد برابر نہیں ہوتے اسی طرح وہ افراد جنہوں نے آپ سے تعلیم و تربیت پائی وہ علمی اعتبار سے ایک سطح پر نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ نہ ہر ایک کی استعداد و قوت فہم یکساں تھی اور نہ ہر ایک کو درسگاہ نبوت سے استفادہ علمی کے یکساں مواقع حاصل ہوئے۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ امتیازی وصف ہے کہ ایک طرف ذہن رسا اور غیر معمولی فہم و ذکا کے مالک تھے اور دوسری طرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتصال اور قرب کا جو شرف انہیں حاصل رہا وہ کسی ایک کو حاصل نہ تھا اور خلوت و جلوت میں استفادہ علمی کے جتنے مواقع انہیں ملے وہ کسی ایک کو میسر نہ آسکے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ میں کوئی بھی آپ کے علمی مرتبہ تک نہ پہنچ سکا امام فخرالدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان علیا کان اعلم الصحابۃ و اما ابو بکر فانہ انما اتصل بخد متہ علیہ السلام فی زمان الکبر و ایضا ماکان یصل الی خد متہ فی الیوم واللیلۃ الازمانا یسیرا اما علی فانہ اتصل بخد متہ فی زمان الصغرو قد قیل العلم فی الصغر کا لنقش فی الحجرو العلم فی الکبر کالنقش فی اخلو (اربعین ص ۴۶۶)

حضرت علی علیہ السلام صحابہ میں سب سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ رہے ابوبکر تو انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچنے کا موقع بڑی عمر میں ملا اور یوں بھی شب و روز میں انہیں تھوڑا ہی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں باریابی کا ملتا تھا مگر حضرت علی علیہ السلام بچپنے ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہو گئے تھے اور عام مقولہ ہے کہ جو علم بچپنے میں سیکھا جاتا ہے وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے اور بڑھاپے میں سیکھا ہوا سبق ایسا ہوتا ہے جیسے ریت پر کھنچی ہوئی لکیریں۔

حضرت علی علیہ السلام نے دبستان رسالت میں تعلیم و تربیت پائی۔ نبوت کی تجلیوں سے آئینہ دل و دماغ پر جلا کی اور اس مرتبہ علمی پر فائز ہوئے کہ علم و حکمت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو آپ کی نظروں سے اوجھل رہاہو اور حقائق و معارف کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو آپ پر منکشف نہ ہوا ہو۔ قرن اولیٰ اور اس کے بعد کے ادوار میں ایک فرد بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جو علم میں آپ کا ہمپایہ ہو۔ عبدالملک ابن ابی سلمان کہتے ہیں کہ

قلت لعطاء اکان فی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ و الہ وسلم احد اعلم من علی قال لا واللہ لا اعلمہ (استیعاب، ج ۳، ص ۴۰)

میں نے عطاء سے پوچھا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں علی علیہ السلام سے بڑھ کر کوئی عالم تھا کہا خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم ہو۔

حضرت کا علمی امتیاز و تفوق اتنا نمایاں تھا کہ مخالف و موافق دونوں اس کے معترف رہے اور کسی کو اس سے انکار کی جرات نہ ہو سکی۔ چنانچہ ایک شخص نے معاویہ ابن ابی سفیان سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہا۔ معاویہ نے کہا کہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے علی علیہ السلام سے پوچھو وہ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اس نے کہا کہ میں آپ ہی سے

پوچھنا چاہتا ہوں معاویہ نے کہا'

و یحکہ کرھتہ رجلا کان رسول اللہ یغرہ بالعلم غرا و قد کان اکابر الصحابتہ یعترفون لہ بذا لک (فتح القدیر' ج ۳' ص ۴۶)

افسوس ہے کہ تم اس شخص سے پوچھنا ناپسند کرتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری طرح علم بھر دیا تھا اور جس کی علمی برتری کا اکابر صحابہ تک اعتراف کرتے رہے ہیں

صحابہ کبار نہ صرف آپ کی علمی برتری کے معترف تھے بلکہ پیش آئند مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرتے اور آپ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلوں کو بڑی آسانی سے حل کر دیتے تھے۔ حضرت عمر کو بھی کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ سے رہنمائی حاصل کرتے اور اگر کوئی حکم دے چکے ہوتے اور حضرت علی علیہ السلام اس کے خلاف رائے دیتے تو اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر کے علانیہ کہتے

لولا علی لھلک عمر (ریاض النضرہ' ج ۲' ص ۲۵۶)

اگر علی علیہ السلام نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو چکا ہوتا۔

حضرت عمر امیرالمومنین علیہ السلام کے تلمذ ابن عباس سے بھی علمی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ شیوخ بدر کے ہمراہ ان کے ہاں آیا جایا کرتے تھے انہی شیوخ میں سے بعض نے ان سے کہا کہ ابن عباس جوان ہیں انہیں آپ کے ہاں آنا چاہئے نہ یہ کہ آپ ان کے ہاں جائیں۔ حضرت عمر نے ابن عباس اور ان شیوخ کو اپنے ہاں بلایا اور ان سے بعض آیات کی تفسیر دریافت کی ان میں سے بعض خاموش رہے اور بعض نے لاعلمی کا اظہار کیا آخر ابن عباس نے آیات کی تفسیر بیان کی اور کسی کے لئے بولنے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ حضرت عمر نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا

انہ من قد علمتم (ذخائر العقبی ص ۲۲۸)

اب تمہیں ان کے مرتبہ کا علم ہوا ہوگا۔

اس اعلیٰ علمی دستگاہ کے باوجود ابن عباس حضرت علی علیہ السلام کے آگے زانوائے تلمذ تہ کرتے تھے آپ کے علمی فیضان سے بہرہ یاب ہوتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے

وما علمی و علم اصحاب محمد فی علم علی الا کقطرہ فی سبعتہ ابحر (مناقب)

میرے اور اصحاب پیغمبر کے علم کو علی علیہ السلام کے علم سے وہی نسبت ہے جو ایک قطرہ کو سات سمندروں سے ہوتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام جس مرتبہ علمی پر فائز تھے اس مرتبہ پر نہ کوئی فائز ہوا اور نہ آئندہ ہو گا۔ شیخ الرئیس ابن سینا اس امر کی شہادت دیتے ہوئے کہتے ہیں

كان علی من العلوم فی الحول الذی لا تحلق الیہ البشر (الامام علی "عزیزی")

حضرت علی علیہ السلام علوم میں اس بلند مقام پر فائز تھے کہ انسان کی قوت پرواز اس تک پہنچنے سے قاصر ہے۔

حضرت کے علمی تفوق کی یہ ایک روشن دلیل ہے کہ تاریخ و سیر کی کوئی کتاب یہ نہیں بتاتی کہ آپ نے کسی مسئلہ کے جواب میں، وہ امور دینیہ سے متعلق ہو یا مسائل عقلیہ سے، ریاضی سے متعلق ہو یا ہیئت سے، فلسفہ سے متعلق ہو یا کلام سے، طبیعات سے، متعلق ہو یا الہیات سے عجز و درماندگی کا اظہار کیا ہو یا غور و فکر کی ضرورت پڑی ہو یا کسی سے پوچھنے کی احتیاج محسوس کی ہو بلکہ جب بھی کوئی ایسا مسئلہ آپ کے سامنے پیش ہوتا جس کے جواب سے دوسرے عاجز و درماندہ ہوتے تو آپ اس آسانی سے اسے حل کر دیتے گویا کوئی پیش پا افتادہ بات ہو اور اس کی نوبت ہی نہ آتی کہ یہ کہتے کہ مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے یا کسی اور سے دریافت کیا جائے۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت عمر نے امیرالمومنین علیہ السلام سے کہا کہ یا ابا الحسن علیہ السلام آپ سے جب بھی کوئی مسئلہ پوچھا جاتا ہے یا کسی قضیہ کا حل دریافت کیا جاتا ہے تو آپ فوراً" اس کا جواب دے دیتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ فکر و تامل کے بعد جواب دیا کریں۔ حضرت نے اپنا ہاتھ کھول کر ان کے سامنے کیا اور پوچھا کہ اس میں کتنی انگلیاں ہیں کہا پانچ۔ فرمایا تم غور و فکر اور سوچ بچار سے کام لینے کے بجائے فوراً" کیوں بول اٹھے۔ کہا کہ اس میں غور و فکر کی ضرورت ہی کیا تھی فرمایا کہ جس طرح انگلیوں کے شمار میں تمہیں غور و فکر کی ضرورت پیش نہیں آئی اسی طرح تمام حقائق و مطالب میرے سامنے واضح و آشکارا ہیں اور کسی مرحلہ پر مجھے سوچ بچار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ عوام سے لے کر مسند نشینان خلافت تک آپ کے سرچشمہ علم سے سیرابی کے محتاج رہے اور انہیں جب بھی کسی مشکل مسئلہ میں الجھن پیدا ہوتی تو آپ کے در پر دستک دیتے اور آپ بغیر کسی ذہنی دباؤ کے اس الجھن کو دور کر دیتے۔ آپ کے اس علمی استغناء پر نظر کرتے ہوئے خلیل ابن احمد خراہیدی نے کتنا حقیقت کو لئے ہوئے یہ جملہ کہا ہے۔

استغنائہ عن الکل و احتیاج الکل الیہ دلیل علی انہ امام الکل (تاسیس الشیعہ)

آپ کا دوسروں سے بے نیاز ہونا اور تمام لوگوں کا اپنی احتیاج کو ان سے وابستہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ امام کل ہیں۔

حضرت کا علم صرف قرآن و سنت اور اسلام کے اوامر و نواہی تک محدود نہ تھا بلکہ آسمانی کتب اور سابقہ ملل و ادیان کے تعلیمات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے چنانچہ آپ منبر پر فرمایا کرتے تھے

لو کسرت الی الو ساد ہ ثم جلسته علیها لقضیت بین اهل التوریت بتورا تهم و بین اهل الا نجیل بانجیلهم و بین اهل الزبور بزبورهم و بین اهل الفرقان بفرقانهم (مطالب السئول ص ۸۹)

اگر میرے لئے مسند بچھا دی جاتی تو میں اہل تورات میں تورات کی رو سے اہل انجیل میں انجیل کی رو سے اہل زبور میں زبور کی رو سے اور اہل قرآن میں قرآن کی رو سے فیصلے کرتا۔

حضرت کے سینہ میں علم کا قلزم زخار موجزن تھا۔ جو ابر باراں کی صورت میں برستا۔ پیاسوں کو ڈھونڈتا اور خشک زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ چنانچہ آپ اپنے صدر مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے

ها ان ههنا لعلما جما لو اصبت له حملته (نہج البلاغہ)

میرے سینہ میں علم کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کاش مجھے ایسے افراد مل جاتے! جنہیں میں اس علم کا امین بناتا!

آپ فراز منبر پر بلند ہو شگان علم کو پکارتے اور دعوت عام دیتے کہ **سلونی قبل ان تفقدونی** "جو پوچھنا ہو میری زندگی میں مجھ سے پوچھ لو" پوچھنے والے اپنی ذہنی پرواز کے مطابق پوچھتے رہے اور بقدر وسعت ظرف جواب حاصل کرتے رہے۔ یہ دعویٰ آپ کے لئے مخصوص ہے اور آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرائت نہ ہو سکی اور اگر کسی نے دعویٰ کیا بھی تو اسے خفت و شرمساری سے دوچار ہونا پڑا۔ سعید ابن مسیب کہتے ہیں

ما کان احد من الناس یقول سلونی غیر علی ابن ابی طالب (استیعاب' ج ۳' ص ۴۰)

لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مجھ سے جو چاہو پوچھ لو سوائے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے

امیرالمومنین علیہ السلام کا علمی ارتقاء قدرت کے فیضان اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا ورنہ اس دور میں کہ جب عربوں کا علم' ایام عرب' انساب عرب' گھوڑوں کی اصل و نسل اور قیافہ شناسی تک محدود تھا ان علمی و فلسفی اور طبیعاتی و ماوراء الطبیعیاتی مسائل پر لب کشائی نہ کی جا سکتی تھی جو اکثر آپ کے خطبات و بیانات کا موضوع رہے ہیں۔ ان علمی و فنی مطالب کے ساتھ ادبی اسلوب بیان نے کلام کو اور جاذب و پر کشش بنا دیا ہے کہ کلام خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی کلام اثر آفرینی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ان پر ایسے اچھوتے انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ جواہر کلام کے پرکھنے والے نقش حیرت بن کر رہ گئے ہیں۔

علم الہیات

علم الہیات سے مراد وہ علم ہے جو صانع عالم کے وجود' اس کے صفات اور ان امور سے بحث کرتا ہے جو ذات الٰہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسلام میں ہستی باری کا اقرار اور اس کی یکتائی کا اعتراف اصل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عقیدہ پر دوسرے عقائد کا دارومدار اور تمام اعمال کی صحت کا انحصار ہے۔ اسی اہمیت کی بنا پر علماء اسلام نے اسے خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ اس پر سیر حاصل بحثیں کیں اور تحقیقی و استدلالی کتابیں تحریر میں لائے اگرچہ ان سب کی کاوشیں قابل قدر ہیں مگر حضرت علی علیہ السلام وہ حکیم عالم اسلام ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مسائل الٰہیہ میں عقلی و فلسفی استدلال کی طرح ڈالی۔ دقیق گتھیوں کو آسان لفظوں میں سلجھایا اور ایک ایک مسئلہ پر ایسے لطیف انداز میں روشنی ڈالی کہ اس سے بہتر پیرایہ بیان و طرز استدلال ممکن نہیں ہے آپ نے الہیاتی حقائق کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو متکلمین کی نظروں سے اوجھل اور حکماء و فلاسفہ کی فکری و ذہنی پرواز سے بلند تر تھے۔ اگرچہ حکماء یونان' سقراط' افلاطون اور ارسطو نے الہیاتی و مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بحث کی ہے اور فطرت کی داخلی شہادت اور حادث کے لئے موجد کی ضرورت سے ایک ایسی ہستی کا اثبات کیا ہے جو تغیر و تبدل سے بری' ہر اعتبار سے کامل و اکمل اور کائنات کی محرک اول و سرچشمۂ وجود ہے مگر حضرت کے کلمات خودشناسی وحدت ذات عینیت صفات اور تنزیہ و تقدیس کے سلسلہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور اس کثرت سے حقائق و مطالب لئے ہوئے ہیں کہ قدیم حکماء و فلاسفہ کے کلام کو صرف ان کے مبادیات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور علماء اسلام نے انتہائی کد و کاوش سے جو الہیاتی مباحث مدون کئے وہ بھی آپ کے افادات سے سرمو آگے نہیں بڑھ سکے اور ہر پھر کر انہی مطالب کے گرد گردش کرتے ہیں جو آپ نے اپنے خطبات اور مختلف سوالوں کے جوابات میں بیان فرمائے۔ علم الہدی سید مرتضیٰ تحریر کرتے ہیں۔

اعلم ان اصول التوحید والعدل ماخوذہ من کلام امیرالمومنین وخطبہ فانھا تتضمن من ذلک مالا زیادہ علیہ ولا غایتہ وراء ومن تامل الماثور فی ذلک من کلامہ علم ان جمیع ما اسھب المتکلون من بعد فی تصنیفہ و جمعہ انما ھو تفصیل تلک الجمل و شرح تلک الاصول۔ (غرر و درر)

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ توحید و عدل کے اصول امیرالمومنین علیہ السلام کے کلمات و خطبات سے ماخوذ ہیں کیونکہ وہ تمام الہیاتی مطالب پر حاوی ہیں ان میں نہ اضافہ ممکن ہے اور نہ ان سے آگے کوئی حد ہے۔ چنانچہ جو شخص آپ کے کلام پر نظر کرے وہ جان لے گا کہ آپ کے بعد متکلمین نے جن تفصیلی مباحث کی تالیف و تدوین کی وہ آپ ہی کے بیان کردہ مجملات کی تفصیل اور آپ ہی کے پیش کردہ اصول کی

تشریح و توضیح ہیں۔

حضرت کے ان خطبات و جوابات میں مسائل بھی ہیں اور دلائل بھی، حقیقت بھی ہے اور ادبیت بھی، فلسفہ بھی ہے اور حسن اسلوب بھی، ہر شبہ کا جواب بھی ہے اور ہر اعتراض کا رد بھی۔ آپ نے وحدت کو کثرت کی آمیزش سے پاک و صاف کر کے توحید کے خدوخال کو نکھارا۔ ذات و صفات کے تفرقہ کو باطل ثابت کر کے دوئی کے تصور کو مٹایا اور رویت بصری، حلول و اتحاد، تمثیل و تشبیہ، احتیاج و ترکیب اور تفصیل و تجسیم ایسے غلط نظریات کی دلائل سے رد فرمائی اور مشککین کے شکوک و شبہات کا ازالہ فرمایا۔ غرض خدا شناسی کی منزل میں آپ کے ارشادات ایک دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک ان دیکھی ہستی کے کمال ذات و صفات کی طرف رہنمائی کرتے اور خیالات و افکار کو زندقہ و الحاد کے دھندلکوں میں بھٹکنے سے بچا لے جاتے ہیں۔

ذیل میں الہیات کے سلسلہ میں آپ کے چند ارشادات مختصر تشریح کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں جو اسلام کے صحیح تعلیمات کے آئینہ دار اور مذاہب عالم کے عقیدہ الوہیت کے مقابلہ میں اسلامی عقیدہ الوہیت کی برتری کا واضح ثبوت ہیں۔

خدا شناسی کے درجات

خدا شناسی کے چند درجے ہیں جنہیں امیرالمومنین علیہ السلام نے ذیل کے کلمات میں بیان فرمایا ہے۔

اول الدین معرفتہ و کمال معرفتہ التصدیق بہ و کمال التصدیق بہ توحیدہ و کمال توحیدہ الاخلاص لہ و کمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ
(نہج البلاغہ)

دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے کمال معرفت اس کی تصدیق ہے اور کمال تصدیق توحید ہے اور کمال توحید تنزیہہ و اخلاص ہے اور کمال تنزیہہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں ایک ان دیکھی اور غیر محسوس ہستی کا تصور پیدا ہو۔ یہ تصور کیوں پیدا ہوتا ہے اس کے بارے میں دو نظریئے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ تصور معاشرہ و ماحول کی پیداوار ہے اور خاندانی ورثہ کے طور پر ایک ذہن سے دوسرے ذہن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل مذہب میں پلنے بڑھنے والا بچہ اپنے دل و دماغ کو خدا کے تصور سے خالی نہیں رکھ سکتا اور دین و مذہب سے بیگانہ لوگوں میں آنکھ کھولنے والا بچہ خدا کے تصور سے دور رہتا ہے اور اسی راہ پر چلتا ہے جس راہ پر اپنے گردوپیش کے لوگوں کو چلتا دیکھتا ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جب انسان نے اس کارگاہ ہستی میں آنکھ کھولی تو کچھ چیزوں کو مفید پایا اور کچھ چیزوں کو نقصان دہ! جن چیزوں کو مفید سمجھا انہیں حاصل کرنے کے اسباب و ذرائع تلاش کئے اور جن چیزوں کو نقصان دہ سمجھا ان سے بچنے کا سامان کیا۔ مگر اس نے دیکھا کہ یہ اسباب و ذرائع بے نتیجہ بھی ثابت ہوتے ہیں اور کامیابی کے اسباب مہیا ہونے کے باوجود کامیابی نہیں ہوتی اور رنج و تکلیف سے بچاؤ کے سامان کے باوجود مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس ناکامی و نامرادی نے اسے حوادث زمانہ کے آگے ہتھیار ڈالنے اور اپنی کمزوری و بے بسی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب اس نے اپنے کو عاجز و درماندہ پایا تو اس احساس درماندگی کے نتیجہ میں اس کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوا کہ اس عالم میں کچھ بالا دست طاقتیں کارفرما ہیں جو اس کے ارادوں پر حاوی اور کائنات کے خشک و تر پر حکمران ہیں۔ وہی تکلیف و راحت فقر و امارت اور مرض و صحت پر اختیار رکھتی ہیں اور وہی دنیا میں پیش آنے والے وقائع و حوادث کی ذمہ دار ہیں۔ ان طاقتوں کو دیوتاؤں کا نام دیا گیا اور مختلف حوادث کے مختلف دیوتا مان لئے گئے۔ ان دیوتاؤں میں سوریہ (سورج) وایو (ہوا) اور اگنی (آگ) بھی شامل ہیں۔

جب انسانی شعور نے اور ارتقائی منزلیں طے کیں تو اس نے دیکھا کہ اگرچہ مختلف دیوتا مختلف امور سرانجام دیتے ہیں۔ مگر ان کے کاموں میں ایک نظم و ضبط اور ربط و تسلسل پایا جاتا ہے، جس میں کبھی خلل رونما نہیں ہوتا۔ سطح سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں تو بارش برستی ہے اور بارش برستی ہے تو کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں۔ اگر بارش

برسانے والے دیوتا اور کھیتیاں اگانے والے دیوتا میں اتحاد و یکجہتی نہ ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بخارات اٹھتے اور بارش نہ ہوتی یا بارش ہوتی اور کھیتیاں ہری نہ ہوتیں۔ اس نظم و ہم آہنگی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان دیوتاؤں پر بھی ایک بڑا دیوتا حکومت کرتا ہو گا جو انہیں ادھر سے ادھر نہیں ہونے دیتا۔ اس سے ایک ان دیکھی ہستی کا تصور پیدا کر لیا گیا جو پرمیشر اور خدا کہی جاتی ہے۔ انسان دیوتاؤں کے آگے جھکنے کا خوگر تو تھا ہی اس نے ان دیکھے پرمیشر کے سامنے بھی سر خم ہو گیا اور دیوتاؤں سے وابستگی برقرار رکھتے ہوئے اس سے بھی تصوراتی رشتہ جوڑ لیا بہر حال یہ تصور اہل مذاہب سے سن کر پیدا ہوا ہو یا دیوتاؤں کے اشتراک عمل سے' مذہب سے وابستگی کا پیش خیمہ اور دین سے تعارف کا نقطہ آغاز ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشاد "دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے" میں معرفت سے مراد یہی ابتدائی تصور ہے اور دین سے دین اسلام یا کوئی خاص دین مراد نہیں ہے بلکہ زندقہ و الحاد کے مقابلہ میں کسی آئین کی ذہنی پابندی مراد ہے جو اسی تصور کی پیداوار ہے۔ یہ درجہ معرفت ناقص اور تصور کی حد تک محدود ہے اور تصور کوئی بھی ہو وہ اپنے اندر قطعیت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ وہ صحیح ہو اور ممکن ہے کہ وہ صرف ذہنی پیداوار ہو اس وقت تک اسے صحت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا جب تک دلیل و برہان سے اس کی قطعیت کا ثبوت بہم نہ پہنچا لیا جائے اور ذہن کو شکوک و شبہات کے دغدغوں سے پاک و صاف نہ کر دیا جائے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس تصور پر قانع نہ رہے بلکہ فکر و نظر سے کام لے کر غیر یقینی صورت کو یقینی صورت میں بدلے اور ادراک و تصدیق کی منزل تک پہنچے۔ وہ افراد جو سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے اس تصور ہی کو کافی سمجھ لیتے ہیں اور غور و فکر کی تکلیف گوارا نہیں کرتے وہ تصدیق سے محروم رہ جاتے ہیں حالانکہ اس تصور کے پیدا ہونے کے بعد ان پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ فکر و نظر سے کام لیں اور آثار سے مؤثر کے وجود کا ثبوت بہم پہنچائیں۔ جبکہ اس کے وجود کی نشاندہی کرنے والے آثار ہر طرف نمایاں اور ہر سطح کے ذہن کے لئے علم و ایقان کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ ایک سطحی نظر رکھنے والا عام آدمی زمین اور اس میں سبزہ و گل کی روئیدگی' سربلند پہاڑ اور مچلتے ہوئے سمندر' گرتی ہوئی آبشاریں اور فضا میں اڑتے ہوئے ابر کے ٹکڑے' چاند' سورج کی چمک دمک اور ستاروں کی جگمگاہٹ' طلوع و غروب کے پر کیف مناظر اور شب و روز کے سفید و سیاہ ورق دیکھ کر خالق عالم کی ہستی کا یقین اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور ایک بلند نظر و باریک بین انسان کائنات کی رعنائی و پہنائی اور اس میں لاکھوں نوری سال کے فاصلوں پر واقع سحابیے' فضا کی بلندیوں پر جگمگ کرتے سنہری جھمکے' محیط عالم پر چھائی ہوئی کہکشاں کی وسعتیں اور سیاروں کی محوری و دوری گردشیں دیکھ کر یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کس نے یہ بزم عالم آراستہ کی' کس نے چاند سورج کو ضیا بار بنایا اور کس نے قوت تجاذبہ و مدافعت پیدا کی۔ جس کے زیر اثر اجرام فلکی معینہ راہ پر گامزن اور لگے بندھے قانون پر راہ پیما ہیں۔ کیا یہ عظیم کائنات آپ ہی آپ پیدا ہو گئی اور خود بخود مقررہ راہوں پر رواں دواں ہے؟ مگر یہ کیسے جبکہ کوئی نقش بغیر نقاش کے اور کوئی اثر بغیر موثر کے وجود میں نہیں آتا تو یہ کائنات کسی خالق کی کارفرمائی کے بغیر کس طرح موجود ہو گئی یقیناً اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ جس سے کائنات کی

تخلیق اور عالم کا نظم و نسق وابستہ ہے۔ جب فکر و نظر کی رہنمائی سے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے تو شک و تذبذب کے حدود سے نکل کر تصدیق کے درجہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور جوں جوں فکری عمل بڑھتا ہے ہستی باری کا عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ صانع عالم کو واحد و یگانہ مانا جائے۔ اگر اسے مان لینا ہی کافی ہوتا تو مشرکین قریش اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کوئی وجہ مخاصمت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ وہ سب اسے مانتے تھے اور کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرتا تھا۔ ان سے نزاع تھی تو اس بنا پر کہ وہ دوسروں کو بھی الوہیت یا الوہیت کے صفات میں شریک سمجھتے تھے چنانچہ مشرکین قریش خدا کو واحد و یکتا ماننا نہ چاہتے تھے بلکہ خدا کے ساتھ بتوں کو بھی شریک کرتے تھے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی لئے آمادہ پرخاش تھے کہ آپؐ نے ایک خدا کا تصور پیش کیا تھا اگر آپ بتوں کے عمل دخل کی نفی نہ کرتے تو ان کے جذبات برانگیختہ نہ ہوتے اس لئے کہ انہیں خدا سے نہیں بلکہ خدا کو ایک ماننے سے کد تھی اور اسی ایک کہنے سے وہ سیخ پا ہوتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اذا دعی اللہ وحدہ کفرتم وان یشرک بہ تومنوا

جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ اوروں کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے۔

رہے دوسرے مذاہب تو اگرچہ وہ اپنا رابطہ الہامی کتابوں سے رکھنے کے دعویدار ہیں اور بنیادی طور پر خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر یہ عقیدہ توحید سے علیحدہ ہے کیونکہ وہ تصرف و تدبیر عالم میں دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ یہود نے عزیر کو ابن اللہ قرار دے لیا۔ مسیحی ایک تین اور تین ایک کے چکر میں پڑ گئے اور باپ بیٹا اور روح القدس کے مجموعہ کو خدا ماننے لگے۔ ہندوؤں نے برہما کو پیدا کرنے والا وشنو کو زندہ رکھنے والا اور شیوا کو ہلاک کرنے والا فرض کر لیا اور پھر ان تینوں میں وحدت پیدا کرنے کے لئے ایک ہی مجسمہ میں ان تینوں کے سر الگ الگ دکھاتے ہیں جسے تریمورتی کہتے ہیں یہ بھی تثلیث ہی کی ایک صورت ہے۔ سناتن دھرمیوں نے خدا کے لاکھوں روپ بنا ڈالے جنہیں اوتار کہتے ہیں۔ آریہ توحید پرستی کا دعویٰ کرنے کے ساتھ روح اور مادہ کو بھی ایشور کی طرح قدیم اور ازلی سمجھتے ہیں۔ بعض نفس، مادہ اولیٰ دہر اور خلا کو قدیم مانتے ہیں۔ بعض اجرام فلک میں ارواح کے قائل ہیں جنہیں آتماؤں سے تعبیر کرتے ہیں اور انہیں اجرام فلکیہ کی طرح قدیم سمجھتے ہیں۔ بعض نے مختلف حوادث و وقائع کے مختلف خدا مان لئے جو ایک بڑے خدا کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو خلق کرنے کے بعد اس کا نظم و انضباط دوسروں کے سپرد کر دیا ہے اور خود معطل و بے کار ہو کر رہ گیا ہے۔ سویہ دو خداؤں کے قائل ہیں ایک یزداں خالق خیر ہے اور ایک برہمن جو خالق شر ہے۔ خالق خیر کو نور سے اور خالق شر کو ظلمت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض صوفیہ خدا، کائنات اور انسان کو ایک وحدت قرار دیتے ہیں۔ بعض فلاسفر اللہ کو صرف

عقل اول کا خالق مانتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ **الواحد لایصدر عنہ الا الواحد** (ایک سے ایک ہی چیز صادر ہوتی ہے) چنانچہ اللہ نے عقل اول کو پیدا کیا اور عقل اول نے عقل ثانی اور فلک اول کو اور اس طرح عقل عاشر نے جو کہ خدائے عالم طبیعت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اس جہان کو پیدا کیا۔

یہ مذاہب' خدا کو دو ماننے والے ہوں یا تین یا زیادہ' بہت سے خداؤں کے ضمن میں اللہ کی ہستی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے انہیں منکرین خدا کی صف میں شمار نہیں کیا جا سکتا مگر درحقیقت یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہے اس لئے کہ جسے مانا ہے وہ چند خداؤں میں کاایک خدا ہے اور جسے ماننا چاہئے تھا وہ چند خداؤں میں کا ایک نہیں ہے بلکہ ایسا ایک ہے جس کا دوسرا نہیں ہے۔ اس ماننے کو ماننا اسی وقت کہا جائے گا جب اللہ کو ہر لحاظ سے واحد و یکتا مانا جائے' نہ اس کی قدرت و ازلیت میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور نہ اس کے افعال و اعمال میں کسی کو دخیل سمجھا جائے۔ لہٰذا وہ مذاہب و ادیان جو دوسروں کو کسی اعتبار سے بھی خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ خدا شناسی کی منزل سے ناآشنا قرار پائیں گے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ خدا کو ایک ماننے کے ساتھ اسے صفات ممکنات' جسم و جسمانیات' نقل و حرکت زمان و مکان وغیرہ سے منزہ و مبرا سمجھا جائے۔ جن لوگوں نے توحید کا عقیدہ رکھنے کے ساتھ یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ ہماری طرح شکل و صورت جسم اور اعضاء رکھتا ہے عرش پر متمکن اور مادی چیزوں کی طرح قابل رویت ہے' وہ خدا شناسی کی منزل سے بمراحل دور ہیں۔ اس لئے کہ اگر اسے زمان و مکان کا پابند' حرکت و انتقال کا حامل اور جسم و جسمانیات کی سطح پر قرار دے لیا تو اسے ان تمام نقائص سے متصف مانا جو ممکنات میں پائے جاتے ہیں اور جب وہ نقائص سے خالی نہ رہا تو واجب الوجود ہی کہاں رہا کیونکہ واجب الوجود وہی ہو سکتا ہے جو تمام نقائص سے بری اور ہر قسم کی احتیاج سے بلند تر ہو۔

پانچواں درجہ یہ ہے کہ اس کے صفات کو اس کی ذات سے الگ تصور نہ کیا جائے اس لئے کہ اگر ذات سے الگ صفات تجویز کئے گئے تو عقیدہ توحید ناقص و ناتمام رہے گا کیونکہ صفات کو زائد برذات ماننے سے دوئی لازم آئے گی' ایک ذات اور ایک صفت اور دوئی کا ادنیٰ شائبہ بھی اس کی عظمت توحید کے منافی ہے۔ جب اس کی ذات ہر اعتبار سے کامل اور احتیاج سے بری ہے تو اسے اظہار کلی کے لئے صفتوں کا سہارا لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

معرفت خداوندی کے یہ پانچ مراتب ہیں جنہیں امیرالمومنین علیہ السلام نے چند مختصر الفاظ میں سمو کر پیش کیا ہے اور ہر درجہ کو درجہ ما قبل کے اعتبار سے کامل قرار دیا ہے۔ لہٰذا معرفت کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ان پانچوں مراتب کو جزو عقیدہ نہ قرار دیا جائے اور اگر کسی درجہ پر بھی خط انکار کھینچا گیا تو نہ عقیدہ الوہیت بے داغ رہ سکتا ہے اور نہ عقیدہ توحید۔

اثبات وجود باری

امیرالمومنین علیہ السلام نے اللہ کے وجود پر مختلف دلائل قائم کئے ہیں جو عقل و فطرت کے معیار پر پورے اترتے اور ہر صاحب شعور کو اقرار پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وجود باری کے سلسلہ میں حضرتؑ کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) و کلمتہ الاخلاص فانھا الفطرۃ۔ (نہج البلاغہ)

اللہ کی ہستی و وحدت کا عقیدہ فطرت کی آواز ہے۔

خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے جو اسے ایک ان دیکھی اور غیر محسوس ذات کے اعتراف پر مجبور کرتی ہے۔ حضرتؑ نے اس فطری و جبلی شہادت کو اللہ کے وجود کے ثبوت میں پیش کیا ہے اگر چہ ہم اسے مختلف طریقوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے لئے دلیلیں ڈھونڈتے رہتے ہیں مگر ثابت کرنے کی یہ کوششیں اس لئے نہیں کرتے کہ اس کے وجود کا اثبات ہماری دلیلوں پر منحصر ہے بلکہ ہمارے شعور میں اس کا تصور اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ کوئی دلیل نہ ملنے پر بھی ہمارے ایقان میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ یہ جذب اور طبعی اعتقاد خود سب سے بڑی اور غیر متزلزل دلیل ہے اور اسے ذہنی شعور کی انکشافی کیفیت اور فطرت کی اندرونی شہادت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے عقلی دلائل کا سہارا لینے کی محتاج نہیں ہے۔ اگر آئینہ ضمیر و وجدان مادیت کے غبار سے دھندلا نہ گیا ہو اور ہوائے نفس کی پیروی نے توجہ فطری کو سلب نہ کیا ہو تو انسان فطرت کی روشنی میں یہ محسوس کرے گا کہ اس کائنات کی خلقت میں آفریدگار مطلق کا دست توانا کارفرما ہے جس نے ہر چیز میں نظم و ترتیب قائم کر کے اپنی حکمت بالغہ کا ثبوت دیا ہے۔

وجود باری کے فطری ہونے کے سلسلہ میں بعض اعلام نے فرمایا ہے کہ آئیہ قرآنی **الست بربکم قالو ابلی** (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں سب نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے) میں خداوند عالم نے اپنے بندوں سے ربوبیت کا اقرار لیا ہے۔ اور اپنی ہستی کا اقرار نہیں لیا کیونکہ اس کی ہستی کا اعتراف فطری ہے اور ہر شخص فطرۃً اسے ماننے پر مجبور ہے۔

(۲) الحمد للہ الدال علی وجودہ بخلقہ و بمحدث خلقہ علی ازلیتہ۔ (نہج البلاغہ)

تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو خلق کائنات سے اپنے وجود کا اور پیدا شدہ مخلوقات سے اپنے قدیم و ازلی ہونے کا پتہ دینے والا ہے۔

انسان میں عقل کا جوہر ودیعت کیا گیا ہے تاکہ علت و معلول کے باہمی ربط میں ایک ابدی و ازلی وجود کا شعور

حاصل کرے۔ لہٰذا وجود باری کے سلسلہ میں عقل سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور عقل ہی سے صانع عالم کے وجود پر دلیل لائی جا سکتی اور اس کی ہستی کا اثبات کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان امور میں جو ماوراء الطبیعیات ہیں نہ ظاہری حواس کا گزر ہے اور نہ تجربات کا دخل ہے انہیں صرف عقل ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر عقل سے رابطہ ختم کر کے اللہ کے کلام سے اس کے وجود پر استدلال کیا جائے تو جس کا وجود ہی ابھی زیر بحث ہے اس کے کلام سے استدلال کے کیا معنی۔ یہ تو دعویٰ کو دلیل کا درجہ دے دینا ہے اور پھر کسی چیز کو جو واقع میں سچ ہو سچا کہہ دینا کافی نہیں ہوتا، جب تک اس کی صداقت پر دلیل نہ قائم کی جائے۔ بیشک فطرت اللہ کے وجود پر ایک ناطق برہان ہے۔ مگر جن کی فطرت پر مادیت یا ماحول کے اثرات غالب آجاتے ہیں وہ فطرت کی رہنمائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے صرف عقل ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انہیں اللہ کا قائل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے وجود باری کے فطری و بدیہی ہونے کے باوجود عقل کو معیار قرار دیا ہے اور آثار قدرت و خلق کائنات سے اس کے وجود پر استدلال کیا ہے۔ اس استدلال کی بنیاد اس علم و یقین پر ہے جو زمین و آسمان اور کائنات کی وسعتوں میں غور و فکر سے انسان کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور ذہنوں کا رخ خالق و مدبر عالم کی طرف موڑ دیتا ہے۔ چنانچہ جو شخص ادنیٰ شعور رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی نشان قدم بغیر رہرو کے نہیں ابھرتا اور کوئی عمارت بغیر معمار کے کھڑی نہیں ہوتی اور ہر مصنوع صانع کا دست نگر اور ہر مخلوق خالق کی محتاج ہے۔ خواہ وہ ہماری نظروں کے سامنے ہو یا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اسی بنا پر خداوند عالم نے کائنات میں غور و فکر کا حکم دیا ہے تاکہ اس کے نتیجہ میں اس کی ہستی کا اثبات کیا جا سکے۔ ارشاد باری ہے۔

قل انظر و اماذافی السموات والارض۔ ان سے کہو کہ وہ زمین و آسمان کی چیزوں پر نظر ڈالیں۔

چنانچہ انسان جب اس کائنات کو دیکھے گا اور اس میں کارفرما حکمتوں پر نظر کرے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہ رہے گا کہ جب ہر مصنوع کے لئے صانع کا ہونا ضروری ہے تو اس کائنات کا بھی ایک خالق و صانع ہونا چاہئے جو بذات خود موجود ہو اور اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو۔

(۳) من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ (بحار الانوار) جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

خداوند عالم کے آثار وجود النفس و آفاق میں پھیلے ہوئے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اس کی ہستی پر روشن و واضح برہان ہے ذرہ ہو یا آفتاب قطرہ ہو یا سمندر پتی ہو یا گلشن جرم صغیر ہو یا عالم کبیر یکساں اس کے وجود کی ایک علامت اور اس کی یکتائی کی طرف ایک اشارہ ہیں۔

ہر گیاہے کہ از زمین روید   وحدہ لا شریک بہ گوید

یہ کائنات میں بکھری ہوئی علامتیں انسانی پیکر میں سمو دی گئی ہیں۔ گویا کائنات ایک تفصیلی صحیفہ ہے اور انسان ایک اجمالی صفحہ ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی العالم الاکبر

کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر عالم اکبر سمایا ہوا ہے۔

لہٰذا اشیاء کائنات پر نظر کرنے کے ساتھ اپنے نفسوں پر بھی نظر کرنے کی ضرورت ہے اگر انسان نفس کی کارفرمائی کو سمجھ لے گا تو کارفرمائے عالم کے عرفان کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔ ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف عالم اور خود ان کے نفسوں میں دکھاتے ہیں تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یقیناً وہی برحق ہے۔

یہ انسان جو ایک چھوٹی سی کائنات ہے۔ جسم اور نفس پر مشتمل ہے۔ جسم میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا ہے چنانچہ جب تک قوت نمو باقی رہتی ہے ہڈیاں گوشت پوست اور اس کی ساتھ قدو قامت بڑھتا رہتا ہے اور جب زمانہ نمو ختم ہو جاتا ہے تو اعضاء تحلیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ہڈیوں پر سے گوشت تک اتر جاتا ہے ڈھانچہ بدل جاتا ہے اور صورت و ہیئت کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ مگر وہ خود بچپن ہو یا جوانی یا بڑھاپا ہر دور میں وہی رہا ہے جو بدو خلقت سے تھا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بچپن میں کوئی اور ہو جوانی میں کوئی اور اور بڑھاپے میں کوئی اور۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا وجود و تشخص اس کے اعضاء سے نہیں بلکہ اس کے نفس سے وابستہ ہے جو شروع سے آخر تک ایک حالت پر باقی رہتا ہے اگرچہ یہ نفس نہ آنکھ سے دکھائی دیتا ہے نہ حاسوں کی گرفت میں آتا ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہاں پر ہے اور کس سمت میں ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہاں نہیں ہے مگر ہے اس لئے کہ اعضاء کی حرکت اور دوسرے آثار حیات اس کے وجود کی گواہی دیتے ہیں اور انہی آثار سے مردہ و زندہ میں تفریق کی جاتی ہے۔ اسی نفس کے زیر اثر اعضاء میں حس و حرکت ہوتی ہے اور عقل و فکر کی قوتیں کام کرتی ہیں اگر انسان اپنے جسم اور اس میں اپنے نفس کی کارفرمائی پر غور کرے تو اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب اس چھوٹی سی کائنات کا نظام ایک متصرف و نگران کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا تو اس عظیم کائنات کا نظم و نسق جس کی وسعتیں انسانی حد تصور سے باہر ہیں کسی مدبر و حکیم اور خبیر و علیم ہستی کے بغیر کیونکر باقی رہ سکتا ہے۔

نفس شناسی و خدا شناسی میں چند وجوہ مماثلت یہ ہیں۔

(۱) جس طرح نفس محرک و مدبر بدن ہے اسی طرح اللہ محرک و مدبر عالم ہے۔

(۲) جس طرح نفس اپنے ارادہ و اختیار سے تدبیرِ بدن کرتا ہے اسی طرح اللہ اپنے ارادہ و اختیار سے تدبیر عالم کرتا ہے۔

(۳) جس طرح بدن میں نفس ایک ہوتا ہے اسی طرح اللہ واحد و یکتا ہے۔ اگر بدن میں دو نفس ہوتے تو ان میں باہمی ٹکراؤ ہوتا اور اس کے نتیجہ میں نظام بدن قائم نہ رہتا اسی طرح اگر ایک کے علاوہ کوئی اور بھی خدا ہوتا تو نظم عالم درہم و برہم ہو کر رہ جاتا اور تمام کائنات تباہ و برباد ہو جاتی جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔

لو کان فیھما الھتہ الا اللہ لفسدتا۔ اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو زمین و آسمان دونوں تباہ و برباد ہو جاتے۔

(۴) جس طرح نفس، تحریک و تدبیر بدن پر قدرت رکھتا ہے اسی طرح اللہ، نظم و نسق کائنات پر قادر ہے۔

(۵) جس طرح نفس، بدن کے ہر حصہ پر نظر رکھتا ہے اور جسم کی کوئی کیفیت اس سے مخفی نہیں ہے اسی طرح اللہ، کائنات کے ایک ایک ذرہ کا عالم و نگراں ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

(۶) جس طرح نفس تمام اعضاء بدن سے مساوی تعلق رکھتا ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں حصہ جسم سے قریب اور فلاں حصہ جسم سے دور ہے اسی طرح اللہ تمام کائنات سے یکساں نسبت رکھتا ہے اور اس کا علم و قدرت سب پر یکساں محیط ہے۔

(۷) جس طرح نفس بدن سے پہلے موجود تھا اور بدن کے بعد موجود رہتا ہے اسی طرح اللہ ابدی و ازلی ہے اور ہر شے سے پہلے موجود اور ہر شے کے بعد موجود رہے گا۔

(۸) جس طرح نفس کی کیفیت کو جانا نہیں جا سکتا اسی طرح اللہ کی کنہ ذات کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔

(۹) جس طرح نفس کی جگہ متعین نہیں کی جا سکتی اسی طرح اللہ کے لئے محل و مقام تجویز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۰) جس طرح نفس ہمارے لمس کی گرفت میں نہیں آتا اسی طرح اللہ کو چھوا نہیں جا سکتا۔

(۱۱) جس طرح نفس دیکھنے میں نہیں آتا لیکن اس کا وجود قابل رویت اشیاء سے بھی واضح تر ہے اسی طرح اللہ کا وجود غیر مرئی ہونے کے باوجود ہر چیز سے بدیہی و روشن تر ہے۔

(۱۲) جس طرح نفس متعدد صفات و ملکات کا حامل ہے اور پھر ایک ہے اسی طرح خدا تمام صفات کمالیہ کا مبداء و منشا ہونے کے باوجود یگانہ و بسیط ہے۔

(۱۳) جس طرح ہم اپنے نفس کا علم و ادراک رکھتے ہیں اور یہ علم و ادراک کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ حضوری طور پر معلوم و منکشف ہے اسی طرح خالق کائنات کا وجود بدیہی اور دلیل کی احتیاج سے بالاتر

ہے۔

(۴) **عرفت الله سبحانه بفسخ العزائم و حل العقود و نقض الهمم۔** (نہج البلاغہ) میں نے اللہ سبحانہ کو پہچانا ارادوں کے ٹوٹنے، نیتوں کے بدل جانے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔

مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے تمام ارادوں پر مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتا ہے حالانکہ اس کے ارادہ میں زور اور عزم میں قوت ہوتی ہے اور بظاہر اسباب و ذرائع بھی مہیا ہوتے ہیں اور کوئی مانع بھی نظر نہیں آتا مگر کوئی غیبی طاقت روکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کے ارادہ و راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اگر خود اسے یہ طاقت ہوتی تو اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے میں مانع ہی کیا تھا وہ اپنی ارادہ کی تکمیل کرتا اور اپنے مقصد سے ہمکنار ہوتا۔ مگر عزم و ارادہ کی مضبوطی کے باوجود اس کی ناکامی اس کا ثبوت ہے کہ اس کے ارادوں پر ایک ایسی طاقت حکمران ہے جو چاہے تو انہیں تکمیل تک پہنچنے دے اور چاہے تو انہیں ناکام کر دے۔ یہ عزم و ارادہ کی شکست اسی بالا دست ذات کی کار فرمائی کا کرشمہ ہے جس کے سامنے انسانی قوتیں سپر انداختہ ہو جاتی ہیں۔

(۵) **ان الله تجلى لعباده من غير ان راوه وار بهم نفسه من غير ان يتجلى لهم۔** (علم الیقین محسن فیض) اللہ اپنے بندوں کے لئے عیاں ہے بغیر اس کے کہ وہ اسے دیکھیں اور اس نے اپنے آپ کو دکھا دیا بغیر اس کے کہ وہ ان کے سامنے جلوہ گر ہو۔

دنیا میں ہر موجود اپنے آثار و عوارض سے اپنا وجود ثابت کرتا ہے مثلاً کسی انسان کی زندگی، زندگی مرتب ہونے والے اثرات سے جانی پہچانی جاتی ہے مگر خدا کا وجود اتنا واضح روشن اور منجلی ہے کہ کائنات کی ہر شے وہ محسوس ہو یا غیر محسوس مرئی ہو یا غیر مرئی اس کے وجود کی ایک مستقل دلیل ہے اور اتنا نمایاں وعیاں ہے کہ گویا مخلوق اور اس کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں ہے۔ حارث اعور بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام بازار کی طرف سے گزرے تو ایک شخص کی زبان سے قسم کے یہ الفاظ سنے "**لا والذی احتجب بالسبع**" اس ذات کی قسم جو سات پردوں میں نہاں ہے" حضرتؑ نے اس کی پشت پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ وہ کون ہے جو سات پردوں میں پوشیدہ ہے کہا اللہ فرمایا۔

اخطات ثكلتك امك ان الله عزو جل ليس بينه وبين خلقه حجاب لانه معهم اينما كانوا۔ (توحید صدوق) تم نے غلط سمجھا ہے اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے وہ تو ہر مخلوق کے ساتھ ساتھ ہے جہاں بھی وہ ہو۔

اس نے کہا کہ یا امیرالمومنین پھر اس قسم کا کفارہ کیا ہے فرمایا کہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ تم سمجھو کہ تم جہاں

بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ کہا کہ میں اس کا کفارہ مسکینوں کو کھانا کھلا کر ادا نہ کروں فرمایا کہ تم نے اپنے پروردگار کی قسم ہی کب کھائی ہے کہ تم پر کفارہ عائد ہو۔

مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم ہمارے حاسوں اور ادراکی قوتوں سے بالاتر ہونے کے باوجود اپنے آثار قدرت کے اعتبار سے ظاہر و نمایاں ہے اور ناقابل رویت ہونے کے باوجود اس کا وجود اتنا ہی قطعی و یقینی ہے جتنا کسی شے کا رویت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

(۶) لیس باللہ من عرف بنفسہ ھو الدال بالدلیل علیہ والمودی بالمعرفتہ الیہ (احتجاج طبرسی) جس کی حقیقت نفس الامری پہچانی جا سکے وہ خدا نہیں ہے وہ خود اپنے وجود کی دلیل ہے اور اسی نے اپنی معرفت کے وسائل پیدا کئے ہیں۔

خداوند عالم اپنے وجود کے اثبات میں کسی غیر کے توسط کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے وجود کی مستقل دلیل ہے۔ یہ درست ہے کہ کائنات اوراس کے مظاہر اسکی ہستی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں بلکہ ہر چیز جو انہی کے وجود کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اسی نے اس میں رہنمائی کا جوہر پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ضمیر و وجدان کی شہادت سے اسے پہچانا تو ضمیر و وجدان کی دولت اسی کی دی ہوئی ہے اگر عقل کے ذریعہ اسے پہچانا تو یہ عقل اسی کا عطیہ ہے انبیاؑ و آئمہ کے ذریعہ پہچانا تو انبیاء و آئمہ اسی کے فرستادہ و مقرر کردہ ہیں۔ اگر کسی دلیل پر بنا کرتے ہوئے اس کی معرفت حاصل کی تو دلیل کی طرف رہنمائی کرنے والا وہی ہے۔ اگر خداوند عالم نے انسان میں قوائے فکری و عقلی ودیعت نہ کئے ہوتے تو وہ علت و معلول کے ربط کو نہ سمجھ سکتا اور نتیجہ علتہ العلل یعنی خدا کے وجود پر دلیل قائم کرنے سے قاصر رہتا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے چاند سورج اور زہرہ کے طلوع وغروب سے جو اس کے وجود پر استدلال کیا اور اپنے کو مشرکین کی صف سے علیحدہ قرار دیا تو یہ اسی کی تعلیم و رہبری کا نتیجہ تھا چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علی قومہ۔ یہ ہماری سمجھائی بجھائی ہوئی دلیلیں ہیں جو ہم نے ابراھیم کو اپنی قوم پر حجت تمام کرنے کے لئے عطا کی ہیں۔

غرض جس چیز سے بھی اس کے وجود پر استدلال کیا جائے گا وہ اپنے وجود میں اس کی محتاج اور اس کی ذات پر منتہی ہو گی۔ جب خود اس کی ذات اپنی ذات کی طرف رہنمائی کرتی ہے تو اسے اپنے وجود کے ثبوت میں ذات سے خارج کسی چیز کی احتیاج نہ ہو گی چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

اولم یکف بربک انہ علی کل شئی شھید۔ کیا تمہارا پروردگار اس کے لئے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اگرچہ اہل نظر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مخلوقات سے خالق کے وجود پر دلیل قائم کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہہ بھی نہیں کہ ہر مصنوع صانع کے وجود پر ایک محکم برہان ہے مگر اہل عرفان کی بلند نگاہی اس پر اکتفا نہیں کرتی اور وہ مخلوقات سے خالق کے وجود پر استدلال کرنے کے بجائے خالق کے وجود کا آئینہ سمجھتے ہیں اور اسی سے اس کی ذات کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اعرفو اللہ باللہ (توحید صدوق)۔ اللہ کو اللہ کے ذریعہ پہچانو۔

حضرتؑ خود اس بلند مرتبہ معرفت پر فائز تھے چنانچہ ایک شخص نے آپؑ سے پوچھا کہ آپؑ نے کس چیز سے اللہ کو پہچانا فرمایا**بما عرفنی نفسہ**۔ اس چیز سے جس چیز سے خود اس نے اپنے کو پہچنوایا' پھر پوچھا کہ اس نے کیونکر پہچنوایا فرمایا

لا تشبھہ صورت ولا یحس بالحواس ولایقاس بالناس قریب فی بعدہ و بعید فی قربہ۔(توحید صدوق)

کوئی صورت اس کے مشابہ نہیں نہ حواس سے اسے معلوم کیا جاسکتا ہے اور نہ انسانوں پر اس کا قیاس ہو سکتا ہے وہ فہم و ادراک سے دور ہونے کے باوجود قریب ہے اور قریب ہونے کے باوجود دور ہے۔

ایک مرتبہ جاثلیق' مسیحوں کے ایک گروہ کے ساتھ مدینہ آیا اور حضرتؑ سے پوچھا کہ آپؑ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ اللہ کو پہچانا ہے یا اللہ کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہچانا ہے فرمایا۔

ماعرفت اللہ بمحمد و لکن عرفت محمد باللہ عزو جل۔(توحید صدوق)

میں نے خدا کو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ نہیں پہچانا بلکہ محمد(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدائے بزرگ وبرتر کے ذریعہ پہچانا ہے۔

نظریہ مادیین اور اس کا رد

نظریہ مادیین کی رد میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لم یخلق الاشیاء من اصول از لیتہ ولا من اوائل کانت قبلہ ابدیتہ بل خلق ماخلق واتقن خلقہ و صور ماصور فاحسن صورتہ۔ (توحید صدوق)

خداوند عالم نے اشیاء کو بنیادی اجزاء اور مادی عناصر سے جو ازلی وابدی ہوں خلق نہیں کیا بلکہ جو چیز پیدا کی خود پیدا کی اور اس کی خلقت کو استحکام بخشا اور جس چیز کی صورت گری کی احسن طریقہ پر کی۔

اس جہان رنگ و بو میں جہاں خدا کے ماننے والے چلے آرہے ہیں وہاں منکرین خدا کا بھی ایک گروہ موجود رہا ہے یہ گروہ ماد-یین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان ماد-یین کے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ مادہ قدیم ہے اور اپنے وجود میں خالق سے بے نیاز ہے البتہ وہ ہستی جسے خدا کہا جاتا ہے اس نے مادہ میں حرکت و صورت ودیعت کی ہے اور مادہ خود ہی قانون علیت کے ماتحت خلق کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہے اور ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ حرکت مادہ کا دائمی خاصہ ہے لہٰذا کسی ہستی کو جو محرک وصورت گر ہو ماننے کی ضرورت نہیں ہے پہلا گروہ اگرچہ خدا کو تحریک کی ضرورت کے پیش نظر مانتا ہے مگر اسے معطل و بے کار سمجھتا ہے جو نہ ماننے کے برابر ہے اور دوسرا گروہ سرے سے خدا کے وجود اور اس کی ضرورت کا قائل ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید ان کے نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

قالو اماھی الاحیاتناالدنیا نموت و نحیی وما یھلکنا الاالدھر۔ وہ کہتے ہیں یہی دنیوی زندگی ہماری زندگی ہے یہیں مرتے اور یہیں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہمیں موت کے گھاٹ اتارتا ہے

ماد-یین کے انکار کی بنیاد کسی دلیل و برہان پر نہیں ہے بلکہ انکار کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نہ مشاہدہ میں آیا ہے نہ تجربہ نے اسے ثابت کیا ہے اور نہ عقل ہی اس کے ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ پھر ایک موہوم ہستی کو کیوں مانا جائے؟ ان کے نزدیک تمام موجودات کی تخلیق مادہ سے ہوئی ہے جو ازل سے چلا آرہا ہے۔ جس میں گھٹاؤ ہوتا ہے نہ بڑھاؤ۔ وہ خود سے ہے اور خود ہی اپنے سانچے بناتا اور ان میں ڈھلتا رہتا ہے۔ جیسے پانی کہ کبھی سیال ہے' کبھی منجمد اور کبھی گیس۔ چیز ایک ہی ہے صرف نام اور صورتیں بدلتی رہتی ہیں

نظریہ ماد-یین کے ابطال سے پہلے مادہ پر ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ مادہ ہے کیا؟ یہ تو کسی نے نہیں بتایا اور نہ بتا سکتا ہے کہ مادہ کی اصل حقیقت کیا ہے جو کچھ بتایا گیا ہے وہ صرف مادہ کے خواص ہیں۔ چنانچہ جو چیز جگہ گھیرتی' وزن رکھتی اور حواس پنجگانہ میں سے کسی حاسہ سے محسوس ہوتی ہے اسے مادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مادہ کے اجزائے ترکیبی کو عناصر اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو جس میں مادہ کے تمام خواص موجود ہوتے ہیں سالمہ کہا جاتا ہے اور عنصر کا وہ آخری ذرہ جس کی مزید تقسیم کی جائے تو وہ اپنے خواص عنصری پر باقی نہ رہے جوہر کہلاتا ہے۔ چنانچہ پانی کی وہ اکائی جو مزید تقسیم کے بعد پانی ہی رہے پانی کا سالمہ ہو گی اور اس کے اجزائے ترکیبی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا آخری ذرہ جو مزید تقسیم کے بعد آکسیجن یا ہائیڈروجن ہی رہے جوہر ہو گا ان سالموں کو جو پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں کی مقدار میں اور جوہروں کو جو ایک انچ کے ستر کروڑویں حصے سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں بڑی سے بڑی طاقتور خوردبین سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔

ان غیر مرئی ذرات کا تصور سب سے پہلے ایک یونانی مفکر دیمقراطیس (۴۶۰ -- ۳۷۰ ق م) نے پیش کیا اور

اسے ایٹم کا نام دیا جس کے معنی ناقابل تقسیم جزو کے ہیں دوسرے حکماء و فلاسفہ بھی اسے ناقابل تقسیم و تحلیل سمجھتے تھے۔ اس لئے اسے جزو لا یتجزیٰ کہتے تھے لیکن اب جوہر کو نا قابل تقسیم نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے توڑا جا چکا ہے چنانچہ اس میں متعدد برقی ذرات دریافت ہو چکے ہیں جن میں مثبت برقیہ (پروٹون) منفی برقیہ (الیکٹرون) اور تعدیلی ذرہ (نیوٹرون) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پروٹون اور نیوٹرون مرکز میں ایک جگہ پر مرتکز ہوتے ہیں اور الیکٹرون پروٹون کے گرد برقی کشش سے اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح سورج کے گرد سیارے۔ مادہ ان ذروں کے سوا کچھ نہیں ہے جو جوہری اجزاء میں شعاعی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ شعاعیں انرجی (توانائی) کہلاتی ہیں اور انہی کی کیمیائی ترکیب سے مادہ کی تشکیل ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مادہ اور توانائی ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں اگر یہ شعاعیں آزاد ہوں تو برق پارے ہیں اور تہ در تہ ہوں تو مادہ ہے۔

سائنس دانوں کا نظریہ ہے کہ ابتداء میں صرف انرجی (توانائی) تھی جو تہ بہ تہ ہو کر مادہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی اور مادیین کے نزدیک انہی مادی ذرات کے میل جول اور تدریجی ارتقاء سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے چنانچہ ابتداء میں مادہ گیس کی صورت میں تھا اس گیس سے سحابیوں کی تشکیل ہوئی سحابیوں سے ستارے بنے اور ستاروں سے سیاروں نے جنم لیا اسی طرح دنیا کی دوسری چیزیں مادہ کے تحول و انقلاب سے بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کا مادہ خلقت ایک ہے۔ ان میں رنگ، خاصیت، نرمی، سختی وغیرہ کے اعتبار سے جو تفاوت نظر آتا ہے وہ ان کے جوہروں کی کمی بیشی کی بنا پر ہوتا ہے۔

مادیین اور قائلین خدا دونوں مادی ذرات کو مادی اشیاء کی علت مادیہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح زیور کے لئے سونا اور تخت کے لئے لکڑی۔ فرق یہ ہے کہ مادیین، علت مادیہ ہی کو علت فاعلیہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کہ مادہ خود ہی مختلف شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے اور قائلین خدا علت مادیہ کو علت فاعلیہ کا درجہ نہیں دیتے بلکہ ایک قادر مطلق ہستی کو مادہ و مادی اشیاء کا خالق و موجد سمجھتے ہیں۔

سائنس کے اس نظریہ سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ابتداء میں صرف برقی شعاعیں تھیں۔ جن کی ترکیب و ترتیب سے مادہ کی تشکیل ہوئی بلکہ اس کی تائید امیرالمومنین علیہ السلام کے بعض اقوال سے بھی ہوتی ہے چنانچہ آپؑ کا ارشاد ہے۔

اول ما خلق اللہ النور (بحار ج ۱۴ ص ۱۴۲) خدا نے سب سے پہلے نور کو پیدا کیا۔

اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ جوہر کو شکست و ریخت اور تحلیل و تجزیہ سے برقی شعاعوں کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ حضرتؑ نے ان برقی شعاعوں کے انکشاف سے پہلے اپنے علم وہبی سے ان برقی شعاعوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

لوشئت لجعلت الماء نورـ اگر میں چاہوں تو پانی کو نوری شعاعوں میں بدل دوں۔

اس مقام پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مادیین علم کو حواس کے دائرہ میں محدود سمجھتے ہیں اور صرف اسی چیز کا اعتراف کرتے ہیں جو محسوس و مرئی ہو تو انہیں مادہ کی ان برقی شعاعوں کا علم کیونکر ہوا جبکہ وہ غیر مرئی اور حواس کی گرفت سے بالاتر ہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ان کے خواص و آثار ان کے ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ آنکھ سے دیکھی اور حواس سے جانی نہیں جاسکتیں تو جب انہوں نے خواص و آثار سے غیر مرئی شعاعوں کے وجود کو تسلیم کیا ہے تو اس کائنات میں ہر سو بکھرے ہوئے آثار سے خالق کائنات کے وجود کا اعتراف کیوں نہیں کرتے۔ جبکہ یہ عقل کا قطعی فیصلہ ہے کہ کوئی چیز خود اپنے وجود کی خالق نہیں ہو سکتی بلکہ ہر معلول علت سے وابستہ اور ہر اثر مؤثر کی کار فرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان برقی شعاعوں میں مثبت برق (پروٹون) پہلے وجود میں آئی یا منفی برق (الیکٹرون) اگر مثبت برق پہلے وجود میں آئی تو اسے منفی برق کی احتیاج کا احساس کیونکر ہوا کہ اس نے منفی برق کو ایجاد کیا اور اگر منفی برق پہلے وجود میں آئی تو اسے یہ احساس کیونکر ہوا کہ اسے اپنے نظام کو متوازن رکھنے کے لئے مثبت برق کی ضرورت ہے۔ جب کوئی چیز خود اپنے اجزاء کی خالق نہیں ہو سکتی تو مادہ اپنے اجزائے ترکیبی کا موجد کیونکر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ایک حکیم و برتر ذات ہے جس نے دو مختلف و متضاد چیزوں میں نظم و ترتیت اور توافق و ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

مادیین کے نظریہ کی بنیاد مادہ کی قدامت اور اس کی حرکت پر ہے۔ مادہ کے قدیم وازلی ہونے کی ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں کہ مادہ ہمیشہ سے یونہی چلا آرہا ہے اور کسی نے اسے عدم سے وجود میں آتے نہیں دیکھا۔ لہٰذا جب تخریب و تعمیر کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری و ساری ہے اور مادہ خود ہی مختلف روپ دھارتا اور مختلف شکلیں بدلتا رہتا ہے نہ اس کا کوئی نقطہ آغاز تجویز کیا جاسکا ہے اور نہ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ کارفرما نظر آیا ہے تو اسے قدیم ہی مانا جائے گا۔ مادیین کی اس دلیل کا جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ اگر انہوں نے مادہ کو عدم سے وجود میں آتے نہیں دیکھا تو اس کی قدامت و ازلیت کا کب مشاہدہ کیا ہے۔ جب حدوث و قدم دونوں مشاہدہ کے حدود سے باہر ہیں تو انہیں ان میں کسی ایک کا قطعی فیصلہ کرنا چاہئے تھا جبکہ مادہ کی قدامت کا نظریہ کسی صورت میں عقل و منطق سے سازگار نہیں ہے کیونکہ مادہ کی حرکت جس کے زیر اثر مادی ذرات ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہوتے اور متفرق و مجتمع ہو کر مختلف شکلیں بدلتے ہیں اس کے حدوث کی واضح دلیل ہے۔ اس لئے کہ حرکت عرض حادث ہے اور اجتماع و افتراق کی صورتیں بھی حادث ہیں۔ جب حرکت اور اتصال وانفصال اور تغیر و تبدل کی سب صورتیں اعراض حادثہ ہیں تو جس پر یہ اعراض طاری ہوں گے وہ بھی حادث ہو گا۔ اس لئے کہ اعراض حادثہ اعیان

حادثہ ہی پر طاری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا مادہ محل حوادث ہونے کی وجہ سے نہ قدیم ہو سکتا ہے اور نہ مبداء کائنات قرار پا سکتا ہے۔

مادیین کے نزدیک مادہ حیات و شعور سے خالی اور فکری و شعوری اعمال سے عاری ہے مگر موجودات عالم میں ذی حیات بھی ہیں اور غیر ذی حیات بھی' ذی شعور بھی ہیں اور غیر ذی شعور بھی۔ ایک ذی عقل انسان یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ حیات و شعور کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹا؟ کس نے یہ زندگی دی اور کس نے یہ شعور بخشا؟ مادہ تو زندگی و شعور کا خالق ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ جو خود حیات و شعور سے محروم ہو وہ دوسرے کو حیات و شعور کہاں سے دے گا اور کسی غیر ذی حیات کو ذی حیات کا اور کسی غیر ذی ادراک کو ذی ادراک کا خالق مانا نہیں جاسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حیات و شعور مادی اجزاء کی ترتیت کا نتیجہ ہیں جس طرح آٹو میٹک گھڑی کے پرزوں کی ترتیب سے گھڑی میں حرکت پیدا ہوتی ہے اسی طرح مادی اجزاء کی مخصوص ترتیب سے حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ انسان اور مردہ انسان میں ترتیب مادی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے مگر ایک میں حیات و شعور ہے اور دوسرے میں حیات و شعور نہیں ہے۔ اگر حیات و شعور مادی ترتیب ہی کا نتیجہ ہوتا تو دونوں میں یکساں زندگی بھی ہونا چاہئے تھی اور شعور بھی اور جب ایسا نہیں ہے تو ایک ایسا مبداء شعور و حیات ماننا ناگزیر ہو گا جو حیات و ادراک بھی رکھتا ہو اور قدیم و ازلی بھی ہو اور وہ ذات ذات خداوندی ہے جو حی و مدرک بھی ہے اور قدیم و ازلی بھی۔

کائنات کے اجزاء میں توافق و ہم آہنگی اور مقصد کی کارفرمائی بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ کائنات ایک علم و ادراک اور ارادہ و قدرت کی مالک ہستی کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس کارگاہ عالم پر نظر کی جاتی ہے تو ہر شے دوسری شے سے اس طرح وابستہ نظر آتی ہے جس طرح زنجیر کی کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و مرتبط ہوتی ہیں۔ جب سطح سمندر پر دھوپ پڑتی ہے تو بخارات وجود میں آتے ہیں اور بخارات کے ٹکڑے مل کر بادل کی شکل میں فضا پر چھا جاتے ہیں اور پھر موسلا دھار برسنے لگتے ہیں' جس سے زمین کی سیرابی اور دانہ کی روئیدگی کا ساماں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ زمین کی زرخیزی' بیج کی استعداد' آفتاب کی حرارت' موسم کی اثر آفرینی اور ہوا کے جھونکے اپنے اپنے مقام پر ایک لگے بندھے قانون کے اندر شریک عمل ہوتے ہیں۔ اس نظم و ضبط کو دیکھ کر مادہ کے منتشر ذرات کے اتفاقی اجتماع کو کائنات کا خالق قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اتفاق کسی نظم و قانون کا پابند نہیں ہوتا اور نہ اس میں تسلسل و دوام پایا جاتا ہے۔ لہٰذا جو چیز ہمیشہ ایک نہج سے ظہور میں آئے اسے اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ اتفاق کا کرشمہ ہے کہ ہمیشہ بہار کے موسم میں پتیاں پھوٹیں اور پھول کھلیں اور ہر پھول کی پتیاں طاق رہیں؟ موتی سیپیوں میں پیدا ہوں اور سیپیاں سمندر کی گہرائی میں پائی جائیں' مچھلیاں پانی میں زندہ رہیں اور پرندے فضاؤں میں اڑیں' سورج مشرق سے طلوع ہو اور مغرب کی سمت غروب ہو' چاند مقررہ تاریخوں میں گھٹے بڑھے' سورج اور چاند

گرہن معینہ دستور کے ماتحت لگے اور تمام کرے اور سیارے ہمیشہ اس رفتار سے اپنے مدار میں رواں دواں رہیں جو نظم کائنات اور نباتی و حیوانی زندگی کے لئے ضروری ہے؟ چنانچہ زمین چوبیس گھنٹوں میں ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے گرد چکر کاٹتی ہے اگر یہ رفتار ہزار میل کے بجائے سو میل رہ جائے تو شب و روز کا طول دس گنا زائد ہو جائے یعنی ۱۲۰ گھنٹے کا دن اور ۱۲۰ گھنٹے کی رات۔ اس کے نتیجہ میں دن اتنے گرم ہو جائیں کہ تمام نباتات جل جائیں اور راتیں اتنی ٹھنڈی ہو جائیں کہ ہر چیز منجمد ہو کر رہ جائے۔ اتفاق بہرحال اتفاق ہوتا ہے۔ اس میں کسی نظم و ترتیب کی پابندی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ سب کچھ اتفاق کی کرشمہ کاری ہے تو ہمیشہ ایک سا اتفاق کیوں ہوتا ہے اس چیز کو دیکھتے ہوئے کہ دنیا کی ہر چیز میں نظم و یک رنگی نئی پائی جاتی ہے اور موجودات وہ ارضی اجسام ہوں یا فلکی اجرام' سالمات ہوں یا جواہر' مثبت برقیے ہوں یا منفی' مقررہ حدود سے رائی برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ یہ اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس نظام کو چلانے والی کوئی برتر و حکیم ہستی موجود ہے۔ اسے بے شعور ذرہ کی غیر ارادی حرکت کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس نظم و ترتیب کے ساتھ جب اس چیز پر نظر کی جاتی ہے کہ ہر مخلوق میں وہی چیزیں ودیعت کی گئی ہیں جو اس کی نوع کے اعتبار سے ضروری' اس کی زندگی و بقا کے لئے لازمی ہیں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی غیر شعوری حرکت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مچھلی میں گلپھڑے پیدا کئے گئے تاکہ وہ پانی کے اندر سانس لے سکے۔ پرندوں کو پر دئے گئے تاکہ وہ پرواز کر سکیں۔ انسان کے جوڑوں میں لچک رکھی گئی تاکہ اسے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں آسانی ہو۔ درختوں میں رگ و ریشہ کے جال بچھائے گئے تاکہ ہر حصہ میں غذا پہنچ سکے۔ کار و کسب اور آرام و راحت کے اوقات کا لحاظ کرتے ہوئے سورج کی روشنی تیز اور چاند کی روشنی دھیمی رکھی گئی۔ غرض دنیا کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ اس سے ہر انسان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ مادہ جو عدم شعور کی بنا پر مقصد کا پابند نہیں ہو سکتا' اس بامقصد تخلیق کا خالق نہیں ہے۔ بلکہ یہ مادہ کی بے معنی و بے مقصد کارفرمائی کے بجائے ایک علیم و حکیم ذات کی حکمت آفرینی کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز میں ترتیب' تناسب اور مقصد کو ملحوظ رکھا ہے۔

عقل و ادراک کی نارسائی

خدا کی کنہ حقیقت تک عقل کی نارسائی کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الحمد لله الذی اعجزالا وهام ان تنال الاوجوده وحجب العقول عن ان تتخیل ذاته فی امتنا عها من الشبهته والشکل (توحید وصدوق)

تمام ستائش اس اللہ کے لئے ہے جس نے افکار و اوہام کو درماندہ کر دیا کہ وہ اس کے اصل وجود کے علاوہ اس کی حقیقت کو پا سکیں اور عقلوں کو اپنی ذات کے ادراک سے روک دیا ہے کیونکہ وہ شکل و شباہت سے بلند تر ہے۔

خالق کائنات کی کنہ حقیقت کا ادراک انسان کے دائرہ امکان سے باہر ہے' خواہ وہ بالغ نظر اور علم و حکمت کی بلندیوں پر فائز کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ انسان خود بھی محدود ہے اور اس کی فکری پرواز بھی محدود ہے اور خداوند عالم غیر محدود ہے۔ جس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا اور محدود کسی صورت سے غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا کہ اس کی کنہ ذات تک رسائی حاصل کر سکے اور غیب الغیوب کے پردوں کو اٹھا کر حقیقت وا قعیہ کی نقاب کشائی کرے۔ جب ایک نقش اپنے نقاش کو نہیں سمجھ سکتا حالانکہ وہ دوسروں کی بنی ہوئی چیزوں' کاغذ' رنگ اور موباف کی مدد سے چند لکیروں کو ترتیب دے کر انہیں ایک مخصوص شکل دیتا ہے تو انسان اس صانع و صورت گر کی کنہ حقیقت کو کیونکر جان سکتا ہے۔ جس نے بغیر کسی نمونہ و مثال کے شکم مادر کی تاریکیوں میں اس کی نقش آرائی کی ہو۔ انسان تو خود اپنی ذات سے بھی تماما" و کمالا" آگاہ نہیں ہے۔ چنانچہ آج تک کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ وہ مادہ روح اور حیات کی حقیقت کو سمجھ چکا ہے تو مادہ کے موجد اور روح و حیات کے خالق کی کنہ حقیقت کو کیا سمجھ سکتا ہے جبکہ وہ نہ زمان و مکان کی حدوں میں سما سکتا ہے نہ حواس کی گرفت میں آسکتا ہے اور نہ اس کی کوئی مثل و شبیہہ ہے۔ عام انسانوں کا تو ذکر ہی کیا انبیاء و اوصیاء بھی کمال معرفت کے باوجود اس کی کنہ ذات کے ادراک سے عجز کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

یا من لا یعلم ماهوالاهو۔

اے وہ ذات جسے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

عقل انسانی کی پرواز یہیں تک ہے کہ وہ مصنوع سے صانع اور آثار سے خالق کائنات کی طرف رہنمائی کرے کیونکہ یہ آثار اس کے وجود اور اس کے صفات کمالیہ' علم و قدرت وغیرہ پر برہان ناطق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی آثار و اعمال سے انبیاء و رسل اس کے وجود پر استدلال کرتے اور خدا پرستی کی دعوت دیتے تھے' چنانچہ جب

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ "**فمن ربکما یا موسیٰ**" اے موسیٰ علیہ السلام تم دونوں کا پروردگار کون ہے" تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا

ربنا الذی اعطی کل شئی خلقہ ثم ھدی۔

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کی اس کے مناسب حال صورتگری کی۔ پھر زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی فرمائی۔

فرعون نے تو رب کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کے آثار و افعال کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی ذات کے متعلق کچھ نہیں کہتے بلکہ ہر مخلوق کی جسمانی و ذہنی ساخت اور فطری و وجدانی رہبری کو جو قدرت کا عطیہ ہے اس کے وجود پر بطور شاہد پیش کرتے ہیں اور یوں اسے ادھر متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ کی ذات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا سکتا اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو اس کے آثار و اعمال کے بارے میں اور یہی مظاہر و آثار اس کی ہستی کا ناقابل انکار ثبوت ہیں۔

خدا کے صفات عین ذات ہیں

ذات و صفات کی وحدت کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ لشھادۃ کل صفتہ انھا غیرالموصوف و شھادہ کل موصوف انہ غیر الصفت۔

کمال تزیہہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہی اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے۔

انسان کے صفات اس کی ذات سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو تمام انسان صفات کے اعتبار سے یکساں نظر آئیں حالانکہ ان مین عالم بھی ہوتے ہیں اور جاہل بھی 'قادر و توانا بھی ہوتے ہیں اور عاجز و کمزور بھی۔ کیونکہ بعض میں علم و قدرت کی صفت پائی جاتی ہے اور بعض اس صفت سے عاری ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان کی ذات بحیثیت ذات علم و قدرت نہیں رکھتی بلکہ یہ صفتیں خارج سے اس میں آتی ہیں۔ اس کی ذات الگ ہے اور اس کے یہ صفات الگ ہیں۔ اگر خدا کو بھی ایسا ہی مان لیا جائے کہ وہ اپنے کمالات کے اظہار میں صفات کا محتاج ہے تو ذات بحیثیت ذات کمالات کی حامل نہ رہے گی بلکہ صفات کی دست نگر قرار پائے گی حالانکہ وہ ہر لحاظ سے بے نیاز اور احتیاج سے بری ہے اس کے علاوہ ذات کے ساتھ صفت تجویز کرنے سے دوئی کی جھلک پیدا ہو جائے گی کیونکہ مفہوم کے اعتبار سے صفت وموصوف میں مغائرت و بیگانگی ہوتی ہے۔ صفت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ

موصوف سے ایک الگ شے ہو اور موصوف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صفت سے جداگانہ چیز ہے۔ **لہٰذا** جب اسے صفت سے موصوف مانا جائے گا تو ذات کے ساتھ ایک اور چیز کو بھی ماننا ہو گا جو زائد بر ذات ہے اور جب اس کے ساتھ اور چیز کو بھی مانا تو وحدت حقیقیہ ختم ہو جائے گی اور جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے زوائد اور ماننا ہوں گے۔ اگر یہ زوائد بھی ذات کی طرح قدیم ہوں گے تو جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے قدیم اور ماننا پڑیں گے اور اگر یہ زوائد حادث ہیں تو ان کے وجود میں آنے سے پہلے وہ علم و قدرت سے عاری اور دوسرے صفات سے خالی قرار پائے گا اور یہ دونوں چیزیں بنیادی طور پر غلط ہیں۔ غرض اس کے صفات کمالیہ اس کی ذات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں اور وہ اسی طرح عین ذات ہیں جس طرح انسان کے لئے انسانیت عین ذات ہے۔ بایں معنی کہ انسانیت ہی عین انسان ہے اسی طرح صفات باری عین ذات باری ہیں اور اس سے الگ کوئی شے نہیں ہیں۔

الفاظ صفات باری کی تعبیر سے قاصر ہیں

امیر المومنین کا ارشاد ہے۔ **لیس لصفتہ حد محدود ولانعت موجود۔** اس کے کمال ذات کی کوئی حد معین نہیں اور نہ اس کے لئے توصیفی الفاظ ہیں۔

خداوند عالم کے صفات الفاظ میں ڈھل نہیں سکتے اور نہ لفظوں کے ذریعہ ان کی حقیقت تک رسائی ممکن ہے اس لئے کہ الفاظ انسان کے وضع کردہ ہیں اور وہ انہی چیزوں کے لئے الفاظ بناتا اور وضع کرتا ہے جو اس کے علم و مشاہدہ میں آتی ہیں یا ان معانی و مفاہیم کے لئے جن کا شعور و ادراک اسے ہو سکتا ہے اور جو چیز انسانی فہم و ادراک سے بلند تر ہو اس کے لئے کوئی لفظ بھی وضع نہیں کی جا سکتی۔ آخر وہ کسی چیز کے مقابلہ میں لفظ وضع کرے گا جبکہ وہ چیز نہ اس کی نظر سے گزری ہے اور نہ تنگنائے ذہن میں سما سکتی ہے البتہ جب اس نے زمین و آسمان اور وسیع کائنات پر نظر کی اور اس سے خالق کے وجود کا پتا لگایا اور اس خلق کائنات سے یہ بھی جانا کہ خالق و وجود بخش عالم وہی ہو سکتا ہے جو بے خبر عاجز اور زندگی سے عاری نہ ہو تو ان منفی صفات کو علم قدرت اور حیات سے تعبیر کیا گیا۔ یہ الفاظ چونکہ توصیفی معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور صفت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے موصوف کے مغائر ہو تو جہاں ذات الگ اور صفت الگ ہو گی وہاں تو یہ الفاظ اپنے معانی پر منطبق ہوں گے اور جہاں ذات و صفت میں امتیاز و علیحدگی نہ ہو بلکہ جو ذات ہو وہی صفت ہو اور جو صفت ہو وہی ذات ہو وہاں یہ الفاظ واقعی مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر رہیں گے اگرچہ اسے عالم' قادر اور حی کہا جاتا ہے۔ مگر صفت بحیثیت صفت اس میں نہیں ہو سکتی بلکہ علم' قدرت و حیات اور ارادہ کے آثار دیکھے گئے تو اسے عالم' قادر' حی اور مرید کے لفظوں سے یاد کیا اور انہی آثار کی بنا پر اسے صفات سے متصف مانا گیا۔ ان صفتوں کو صفات ثبوتیہ کا نام دیا گیا ہے۔ مگر در حقیقت ان صفات کے ذریعہ ان صفات کے اضداد کی نفی کرنا مقصود ہوتی ہے چنانچہ علم سے نفی جہل' قدرت سے نفی عجز' غناو بے نیازی سے نفی

احتیاج' عدل سے نفی ظلم اور حیات سے نفی موت کی جاتی ہے۔ اسی طرح اسے موجود کہا جاتا ہے تو اس معنی سے کہ وہ معدوم نہیں ہے اور واجب الوجود کہا جاتا ہے تو اس معنی سے کہ وہ ممکن الوجود نہیں ہے۔ تاکہ سلب نقائص سے اس کے کمال ذات کی ایک حد تک نشاندہی کی جا سکے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ان قیل کان فعلی تاویل الا زلیتہ و ان قیل لم یزل فعلی تاویل نفی العلم۔ (توحید صدوق)

اگر یہ کہا جائے کہ وہ تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عدم اس پر سابق نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہمیشہ سے رہا ہے تو اس کے معنی عدم و نیستی کی نفی کے ہیں۔

صفات ثبوتیہ و سلبیہ

خداوند عالم کی ذات تمام صفات جمال و کمال سے آراستہ اور تمام عیوب و نقائص سے بری ہے۔ ان صفات کی حد بندی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اللہ کی ذات غیر محدود ہے اور یہ صفات اس کی ذات سے جداگانہ وجود نہیں رکھتے بلکہ اس کی ذات ہی ان صفات کا مبداء و منشا ہے۔ لہٰذا ہر وہ صفت جو جمال و کمال کی آئینہ دار اور اس کے شایان شان ہو وہ اس کے لئے ثابت ہو گی اور ہر وہ صفت جو نقص و حدوث کی مظہر ہو اس کے ساحت قدس سے الگ قرار دی جائے گی۔ اصطلاح متکلمین میں پہلی قسم کو صفات ثبوتیہ اور دوسری قسم کو صفات سلبیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ان صفات ثبوتیہ و سلبیہ میں سے چند نمایاں صفات ذکر کئے جاتے ہیں۔

علم باری تعالیٰ

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یعزب عنہ عدد قطر الماء ولا نجوم السماء ولا سوافی الریح فی الھواء ولا دبیب لنمل علی الصفاء ولا مقیل الذر فی اللیلتہ الظلماء یعلم ساقط الا وراق و خفی طرف الاحداق۔ نہج البلاغہ)

اس سے پانی کے قطروں اور آسمان کے ستاروں اور ہوا کے جھکڑوں کا شمار چکنے پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی آواز اور اندھیری رات میں چھوٹی چیونٹیوں کے قیام کرنے کی جگہ' کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے وہ پتوں کے گرنے کی جگہوں اور آنکھ کے چوری چھپے اشاروں کو

جانتا ہے۔

خداوند عالم کا علم ماکان وما یکون پر محیط ہے اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی چیز اس کے دائرہ علم سے خارج نہیں ہے وہ ہونٹ کی جنبشوں چوری چھپے اشاروں اور دل میں گزرنے والے خیالات تک سے آگاہ ہے۔ جو شخص اللہ کو خالق عالم مانتا ہے وہ اسے عالم کائنات بھی تسلیم کرے گا۔ اس لئے کہ جو کسی شے کو جانتا ہی نہ ہو وہ اسے خلق نہیں کر سکتا۔ جب تمام عالم اس کا ایجاد کردہ ہے تو کون سی چیز اس کی نظروں سے اوجھل رہ سکتی ہے۔ وہ ازل سے ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اس کا علم نہ معلومات کے تابع ہے اور نہ موجودات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے کہ اشیاء موجود ہو لیں تو وہ جانے۔ بلکہ وہ ہر چیز کو اس کے موجود ہونے سے پہلے جانتا ہے اور اس پر طاری ہونے والے تصورات و کیفیات سے آگاہ ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس کے علم کی ہمہ گیری و وسعت پر روشنی ڈالنے کے لئے جزئیات کو بیان کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کا علم صرف کلیات میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام جزئیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس سے ان فلاسفہ کی رد ہوتی ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ خدا کو جزئیات کے علم نہیں ہے اس لئے کہ جزئیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور جزئیات کو تغیر سے وہ محل حوادث قرار پائے گا۔ یہ نظریہ فلاسفہ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اس لئے کہ جزئیات کے تغیر سے علم میں تغیر اس وقت لازم آتا ہے جب اسے ان تغیرات کا علم نہ ہو اور اگر تغیر و تبدل کی تمام صورتیں اس کے سامنے روشن ہوں تو یہ تغیر صرف معلومات میں ہو گا اور علم جو عین ذات ہے وہ اس سے متاثر نہیں ہو گا۔

علم الٰہی کے سلسلہ میں مسئلہ بدا بھی آتا ہے جو شیعی معتقدات میں سے ہے۔ ایک گروہ نے فرقہ امامیہ کی طرف یہ نسبت دی ہے کہ یہ بدا کے پردہ میں اللہ کے لئے جہل تجویز کرتا ہے۔ یہ غلط فہمی اس بنا پر ہوئی ہے کہ بدا کے لغوی معنی کسی چیز کے مخفی ہونے کے بعد ظاہر ہونے کے ہیں اور اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اللہ کو کسی امر میں غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس میں تبدیلی کر دیتا ہے اور یہ غلطی جہل اور بے خبری ہی کی بنا پر ہو گی۔ فرقہ امامیہ کی طرف جہل باری کی نسبت سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ ان کے نزدیک نہ بدا کا یہ مفہوم ہے اور نہ اس معنی سے بدا کی نسبت اللہ کی طرف دی جاسکتی ہے بلکہ بدا کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز ہمارے لئے پردہ خفا میں تھی اس کا ظہور ہوا نہ یہ کہ اللہ پر کوئی چیز مخفی تھی اور وہ بعد میں اس پر ظاہر ہوئی۔ اگر ایسا ہو تو تمام اشیاء سے اس کی نسبت مساوی نہ رہے گی حالانکہ وہ اپنے عموم علم و قدرت کی بنا پر سب سے یکساں نسبت رکھتا ہے۔ البتہ احوال و ظروف کے بدلنے یا اجرائے احکام کی مصلحت کے ختم ہونے سے جس طرح احکام میں ترمیم کر دیتا ہے جسے نسخ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مصالح و مقتضیات کے بدلنے سے حوادث و تکوینیات میں بھی ردوبدل کرتا رہتا ہے اور ایسا نہیں ہے جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو جو کرنا تھا وہ کر چکا اب اس کے ہاتھ بندھ چکے ہیں بلکہ وہ محو و اثبات پر اختیار تام رکھتا ہے۔ چنانچہ جہاں محو کرنے میں مصلحت ہوتی ہے وہاں محو کر دیتا ہے اور جہاں ثبت کرنے میں مصلحت ہوتی ہے وہاں ثبت

کر دیتا ہے اور ردوبدل کی یہ تمام صورتیں اس کے سامنے روشن ہوتی ہیں۔ اسی محو و اثبات کا نام بدا ہے قرآن مجید میں ہے۔

یمحوالله مایشاء و یثبت و عنده ام الکتاب

وہ جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب (لوح محفوظ) ہے۔

اگر نسخ احکام سے جہل لازم نہیں آتا تو بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر تکوینیات میں ردوبدل ہو تو اسے نتیجہ جہل قرار دے کر کسی کو مطعون کرنا تقاضائے دیانت و انصاف کے خلاف ہے۔

قدرت باری

حضرتؑ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وماالذی نری من خلقک و تعجب له من قدرتک و نصفه من عظیم سلطانک وما تغیب عنا منه و قصرت ابصارنا عنه و انتهت عقولنا دونه وحالت سواتر الغیوب بیننا و بینه اعظم۔(نہج البلاغہ)

یہ تیری مخلوق کیا ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور اس میں تیری قدرت کی کارسازیوں پر تعجب کرتے ہیں اور تیری عظیم فرمانروائی کی کارفرمائیوں پر توصیف کرتے ہیں حالانکہ وہ مخلوقات جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور جس تک پہنچنے سے ہماری نظریں عاجز اور عقلیں درماندہ ہیں اور ہمارے اور جن کے درمیان غیب کے پردے حائل ہیں اس سے کہیں زیادہ با عظمت ہے۔

کائنات اور اس کی لا انتہاء وسعتیں اللہ کی قدرت بے پایاں کی شاہد ہیں اس لئے کہ یہ اسی کی تخلیق ہے اور خلق و ایجاد ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے اور ارادہ و اختیار قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے لہٰذا جو صانع و خالق ہو گا وہ صاحب ارادہ و اختیار بھی ہو گا اور جو صاحب ارادہ و اختیار ہو گا وہ قادر و توانا بھی ہو گا۔ جب ایک مردہ انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ چلنے پھرنے لگے اور ایک نابینا سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ دیکھ سکے۔ تو ایک عاجز و درماندہ سے یہ امید کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی کائنات ایجاد کر دے جس کی ایجاد پر وہ قدرت ہی نہ رکھتا ہو۔ لہٰذا جب وہ خالق و صانع عالم ہے تو وہ خلق کائنات پر قدرت بھی رکھتا ہو گا۔ اگر اس نے قدرت و اختیار کے بغیر ہی ایسا عالم پیدا کر دیا جس کا کوئی نمونہ اس کے سامنے نہ تھا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ وہ پروں کے بغیر پرواز

کرتا، آنکھوں کے بغیر دیکھتا اور کانوں کے بغیر سنتا ہے۔ کوئی بھی ذی شعور اس کے دعویٰ کو تسلیم نہ کرے گا۔ اس لئے کہ اس میں اڑنے دیکھنے اور سننے کی طاقت ہی نہیں ہے۔ جب بصارت و سماعت کی قوت کے بغیر دیکھا، سنا نہیں جا سکتا تو قدرت و اختیار کے بغیر یہ عالم کیونکر خلق کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ خلق قدرت کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال جو اسے خالق و صانع مانتا ہے وہ اس کے قادر ہونے سے انکار نہیں کر سکتا اور انکار ہو بھی کیونکر سکتا ہے جبکہ اس کی قدرت کاملہ کے آثار ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں وہ اور جس میں دریا، پہاڑ، سمندر، ہرے بھرے درخت، قسم قسم کے حیوانات اور گوناگوں اقسام کے پرندے دکھائی دیتے ہیں اور فضا کی بلندیوں پر سورج چاند اور ستارے چمکتے نظر آتے ہیں اس کی قدرت کا روشن ثبوت ہیں اور پھر کائنات اسی کرہ خاکی اور نظر آنے والی اشیاء ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ان دیکھی کائنات کے مقابلہ میں یہ دیکھی بھالی دنیا تو بس اتنی ہی ہے جتنی سمندر کے پھیلاؤ کے مقابلہ میں ایک معمولی لہر۔ جب اس دکھائی دی جانے والی کائنات میں قدرت کے آثار و مظاہر کا احاطہ نہیں ہو سکتا تو ان دیکھی کائنات میں قدرت کی کارفرمائیوں کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ انسان لاکھ چاہے قدرت کی بے پایاں وسعتیں اس کے فہم و ادراک کی رسائی سے بالاتر رہیں گی نہ اس کی قدرت کی حد بندی ہو سکتی ہے اور نہ گنی چنی چیزوں میں محدود کی جا سکتی ہے بلکہ وہ ہر چیز پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بعض چیزوں پر اسے قدرت حاصل ہو اور بعض چیزیں اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوں۔ اس لئے کہ تمام ممکنات سے اس کی نسبت یکساں ہے۔ لہٰذا تمام چیزوں پر قدرت بھی یکساں ہونا چاہئے ورنہ تخصیص بلا مخصص لازم آئے گی۔ البتہ قدرت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فعل مقدور وقوع میں بھی آئے کیونکہ قدرت اور چیز ہے اور وقوع فعل اور ہے اور ان دونوں میں تلازم نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ کیا اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ اس زمین کو انڈے میں سمو دے اس طرح کہ نہ زمین کا حجم کم ہو اور نہ انڈا ٹوٹے حضرتؑ نے فرمایا۔

ویلک ان اللہ لا یوصف بعجز ومن اقدر ممن یلطف الارض ویعظم البیضہ (توحید صدوق)۔

خدا میں عجز و کمزوری نہیں ہو سکتی اس سے بڑھ کر کون قادر ہو گا جو چاہے تو زمین کو اتنا چھوٹا اور انڈے کو اتنا بڑا کر دے کہ زمین اس میں سما سکے۔

کلام باری

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

انما کلامہ سبحانہ فعل منہ انشاء ومثلہ لم یکن من قبل ذلک کائنا ولو کان قدیما لکان بھاثانیا۔(نہج البلاغہ)

اللہ سبحانہ کا کلام بس اس کا ایجاد کردہ فعل ہے اور اس طرح کا کلام پہلے سے موجود نہیں ہو سکتا اور اگر وہ قدیم ہوتا تو وہ دوسرا خدا ہوتا۔

انسان جب کلام کرتا ہے تو حرف سے حرف جڑتے لفظ کی صورت میں ڈھلتے اور آواز کے اتار چڑھاو کے ساتھ لب و دہن سے نکلتے ہیں۔ یہ حرفوں کا جڑنا لفظوں میں ڈھلنا اور زبان کی حرکت سے یکے بعد دیگرے نکلنا یہ سب حدوث کی علامتیں ہیں اور کلام الہی حوادث حروف' الفاظ اور صوت کا مجموعہ ہے لہٰذا خداوند عالم کو اس معنی سے تو متکلم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ حادث ہی محل حادث ہو سکتا ہے اور خدا نہ حادث ہے کہ مرکز حوادث ہو اور نہ جوہر ہے کہ محل اعراض ہو۔ بلکہ واجب الوجود اور قدیم و ازلی ہے۔ اس کے متکلم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس چیز میں چاہتا ہے کلام پیدا کر دیتا ہے اور اسے اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے درخت میں آواز پیدا کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا" **یا موسی انی انا اللہ رب العالمین** " اے موسیٰ بیشک میں ہی اللہ ہوں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے" جب کلام اللہ کا پیدا کردہ ہے تو اسے قدیم و غیر مخلوق نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ حادث و مخلوق ہی ہو گا۔ کیونکہ کلام لفظوں سے اور لفظ حرفوں سے مرکب ہوتا ہے اور جس میں اجزائے ترکیبی ہوں وہ حادث و مخلوق ہی قرار پائے گا۔ مگر ایک گروہ کلام الہٰی کو قدیم و غیر مخلوق مانتا ہے اور کلام کو دو قسموں پر تقسیم کر دیا ہے! ایک کلام نفسی اور ایک کلام ملفوظی اس کلام نفسی و ملفوظی کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جب کوئی شخص کلام کرنا چاہتا ہے تو زبان پر الفاظ لانے سے پہلے دل میں الفاظ تجویز کرتا اور ذہن میں ان کی ترتیب قائم کرتا ہے۔ اس طرح کلام کا ایک ذہنی وجود قائم ہو جاتا ہے۔ یہ گویا کلام نفسی ہے اور جب ذہنی الفاظ زبان کی حرکت اور ہوا کے تموج سے کان کے پردوں سے ٹکراتے ہیں تو وہ کلام ملفوظی ہے۔ اس گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ کلام نفسی ازل سے مرتب صورت میں ذات الہٰی کے ساتھ قائم تھااور اسی کلام نفسی کے اعتبار سے جو اس کی صفت قدیم ہے وہ متکلم کہلاتا ہے۔

یہ کلام نفسی کی اصطلاح تیسری صدی ہجری میں وضع کی گئی تاکہ اس کے کلام کو قدیم ثابت کیا جاسکے۔ پہلے تو اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا خدا کی صفتیں اس سے الگ تصور کی جا سکتی ہیں کہ کلام کو ایک جداگانہ حیثیت دے کر قدیم مانا جائے؟ اگر اس کی صفتیں اس کی ذات سے جدا مانی جائیں تو وہ قدیم ہوں گی یا حادث اگر حادث ہوں گی تو اللہ محل حوادث ٹھہرے گا اور قدیم ہوں گی تو قدیم ایک میں منحصر نہ رہے گا بلکہ جتنی صفتیں ہوں گی

اتنے قدیم ماننا پڑیں گے اور یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ لہٰذا کلام کو ذات سے ایک قدیم صفت قرار دینا صحیح نہ ہو گا۔ اس موقع پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کلام نفسی اس کے علم کے علاوہ کوئی اور صفت ہے کہ اگر وہ کلام نفسی سے متصف نہ ہوتا تو حروف والفاظ سے بے خبر رہ جاتا؟ جب ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا علم ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے تو علم سے الگ کلام نفسی کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر یہ کلام نفسی کلام نفسی کے حدود میں رہ کر کلام ہی نہیں ہے اور اللہ نے جسے وحی کی صورت میں اتارا اور انبیاء کے گوش زد کیا وہ یہی کلام ملفوظی ہی تو تھا جس کا وہ خالق و موجد ہے اور اسی خلق وایجاد کی بنا پر اسے متکلم کہا جاتا ہے اور جو چیز خلق ہو گی وہ لا محالہ حادث ہو گی۔ اگر کلام کو قدیم قرار دیا جائے گا تو ضروری ہے کہ وہ علت کا محتاج نہ ہو کیونکہ قدیم ایجاد و خلق سے بے نیاز ہوتا ہے نہ اس میں علت موجدہ کا عمل دخل ہوتا ہے جو اسے وجود میں لائے اور نہ علت مبقیہ کا جو اسے باقی و برقرار رکھے۔ اس لئے کہ علت موجدہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلول سے سابق ہو اور جس پر کوئی چیز سابق ہو گی وہ قدیم نہ ہو گا اور علت مبقیہ علت موجدہ ہی کے دوام استمرار کا نام ہے۔ جب علت موجدہ نہ ہو گی تو علت مبقیہ بھی نہ ہو گی۔ جب کلام اپنی قدامت کی بنا پر علت سے بے نیاز اور متکلم سے مستغنی ٹھہرا تو وہ اللہ کا فعل نہ رہا بلکہ دوسرا اللہ ہو گیا اور اگر اللہ کا فعل ہے تو وہ بہر صورت اللہ کا ایجاد کردہ ہو گا اور جس چیز سے ایجاد کا تعلق ہو گا وہ حادث قرار پائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ما یاتیھم من ذکر من ربھم محدث — جب ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ذکر میں سے کوئی چیز آئی ہے جو حادث ہے۔

نفی رویت

حضرتؑ نے خداوند عالم کے غیر مرئی ہونے کے بارے میں فرمایا ہے۔

لم ینتہ الیک نظر و لم یدرک بصر ادرکت الابصار واحصیت الاعمار۔ — نہ نظریں تیرے ساحت قدس تک پہنچ سکتی ہیں اور نہ نگاہیں تجھے دیکھ سکتی ہیں تو نے نظروں کو پا لیا ہے اور عمروں کا احاطہ کر لیا ہے۔

اللہ دنیا و آخرت میں نادیدنی اور نظر و بصر میں سمانے سے بلند تر ہے اسے نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکے گا کیونکہ دیکھنے میں وہی چیز آتی ہے جو کسی سمت میں واقع ہو۔ رنگ، شکل اور جسم رکھتی ہو اور اللہ، مکان، سمت، اعضاء و جوارح اور تمام لوازم مادہ سے پاک وصاف ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظر آئے یا نہ آئے آخرت میں بہرحال دکھائی دے گا اور دنیا والے اسے اسی طرح دیکھیں گے جس طرح فضا کی بلندیوں پر چاند دیکھتے ہیں۔

یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ ذاتاً ناقابل رویت ہے اور ناقابل رویت ذات نہ دنیا میں نظر آسکتی ہے اور نہ آخرت میں۔ چنانچہ قرآن مجید میں عمومیت کے ساتھ رویت کی نفی کی گئی ہے۔

لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھواللطیف الخبیر۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ رہا ہے اور وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

اگر رویت کے معنی علم و یقین کے لئے جائیں تو بے شک اہل عرفان کا ضمیر و وجدان اسے دیکھتا ہے۔ بایں معنی کہ انہیں اس ان دیکھی ہستی کا اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی دیکھی بھالی ہوئی چیز کا ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے یقین کی تعبیر رویت سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ذعلب یمنی نے امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے فرمایا **کیف اعبد ربا لم اره** میں اس رب کی کیونکر پرستش کر سکتا ہوں جسے دیکھا نہیں ہے اس نے دریافت کیا کہ آپ نے کیسے دیکھا ہے فرمایا۔

لم تره العیون بمشاھدہ الابصار ولکن راتہ القلوب بحقائق الایمان۔ (توحید صدوق) آنکھیں اسے آنکھوں کے مشاہدہ سے نہیں دیکھتیں بلکہ دل ایمانی حقیقتوں سے اسے دیکھتے ہیں۔

حضرتؑ کے اس ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے بارے میں جہاں جہاں نظر رویت اور لقاء کے الفاظ آئے ہیں وہاں رویت بصری مراد نہیں ہے بلکہ رویت قلبی مراد ہے جو علم و یقین کے معنی میں ہے۔

عدم مشابہت

حضرت کا ارشاد ہے۔

کذب العادلون بک اذ شبھوک باصنامھم و نحلوک حلیۃ المخلوقین باوھامھم و جزاء وک تجزئۃ المجسمات بخواطرھم۔ نہج البلاغہ) وہ لوگ جھوٹے ہیں جو تجھے دوسروں کے برابر سمجھ کر اپنے بتوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور اپنے وہم میں تجھ پر مخلوقات کی صفتیں جڑ دیتے ہیں اور اپنے خیال میں اس طرح تیرے حصے بخرے کرتے ہیں جس طرح مجسم چیزوں کے جوڑ بند الگ الگ کئے جاتے ہیں۔

کوئی چیز اللہ کے مثل و مشابہ نہیں ہے نہ کسی چیز سے اس کی تمثیل دی جاسکتی ہے کہ جس طرح یہود غیرت مند شوہر سے اور عیسائی مہرباں باپ سے اس کی تمثیل دیتے ہیں اور نہ کسی چیز سے اس کی تشبیہ دی جاسکتی ہے کیونکہ

جس چیز سے بھی اس کی تشبیہ دی جائے گی وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہو گی اور انسانی ذہن کی پرواز دیکھی بھالی چیزوں تک محدود ہے اور اللہ ہر اس چیز سے بلند تر ہے جو ذہن میں سمائے اور مشاہدہ میں آئے چنانچہ خلاق عالم کا ارشاد ہے۔

لیس کمثلہ شئی۔ اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔

پھر جس چیز کو اس کے مشابہ قرار دیا جائے گا وہ حادث ہونے کی بنا پر نقائص حدوث کی حامل اور مختلف کیفیات کا آماجگاہ ہو گی اور اللہ ہر نقص سے بری اور ہر عیب سے پاک ہے مگر کچھ ظواہر پرست افراد نے اسے مختلف کیفیتوں کا حامل قرار دے لیا ہے اور اس کے لئے ایسی چیزیں بھی تجویز کر دی ہیں جو اس کے ساحت قدس کے منافی ہیں چنانچہ حضرت عائشہؓ سے یہ روایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پوچھا کہ کیا اللہ ہنستا بھی ہے آپؐ نے فرمایا۔

والذی نفس محمد بیدہ انہ لیضحک۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۴) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے وہ ہنستا ہے۔

اسی طرح ایک گروہ نے اسے انسانی شکل و صورت میں ڈھال لیا ہے اور انسانی اعضاء ایسے اعضاء اس کے لئے تجویز کر دیئے ہیں اور اس مقصد کے اثبات کے لئے یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

ان اللہ خلق آدم علی صورتہ۔ اللہ نے آدم کو اپنی شکل و صورت پر پیدا کیا۔

اس حدیث کا مطلب وہی لیا گیا ہے جو مذکورہ بالا ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے حالانکہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ تجسیم کے قائلین نے حدیث کا ابتدائی حصہ نظر انداز کر کے اس کا مفہوم ہی بدل ڈالا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام اس حدیث کے مورد و محل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو آدمیوں کو جھگڑتے دیکھا اور ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا **قبح اللہ وجھک و وجہ من یشبھک** "تمہارے چہرے پر اللہ کی پھٹکار اور اس کے چہرے پر بھی جو تم سے مشابہ ہو" آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا۔

لا تقل ھذا فان اللہ خلق آدم علی صورتہ۔ (توحید صدوق) ایسا مت کہو اللہ نے آدم کو بھی اسی کی صورت پر پیدا کیا تھا۔

اس مورد کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس چابکدستی سے مورد حدیث کو حذف کر کے ضمیر کا مرجع بدل دیا گیا ہے اور حدیث کو من مانے معنی پہنا دیئے گئے ہیں۔

خدا پابند مکان و زمان نہیں ہے

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لم یسبقہ وقت ولم یتقدمہ زمان ولم یتعاورہ زیادہ ولا نقصان و لم یوصف باین ولا بمکان۔ (توحید صدوق)

وقت اس سے سابق نہیں ہے اور نہ زمانہ اس سے مقدم ہے۔ اس پر زیادتی و کمی وارد نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور نہ یہ کہ وہ کس جگہ پر ہے۔

ہر مادی چیز دوسری مادی چیز سے نزدیک ہو گی یا دور' نیچے ہو گی یا اوپر' دائیں بائیں ہو گی یا آگے پیچھے' اسی طرح ایک چیز دوسری چیز سے پہلے وجود میں آئے گی یا بعد میں یا دونوں ایک ساتھ وجود میں آئیں گی۔ پہلی حد بندی مکان کے اعتبار سے ہے اور دوسری حد بندی زمان کے لحاظ سے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی چیز مادی ہو اور پھر مکان و زمان کے حدود سے باہر ہو۔ مکان و زمان کی احتیاج اسے ہوتی ہے جو جسم رکھتا ہو اور جو جسم و جسمانیات کے صفات سے بری ہو۔ جس میں نہ طول ہو نہ عرض اور نہ عمق۔ وہ مکان و زمان کی حدود میں کیونکر آسکتا ہے۔ اگر اللہ کے لئے مکان و زمان تجویز کیا جائے گا تو اس کی اولیت ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ مکان و زمان کو اس سے پہلے ماننا ہو گا کیونکہ مکان ہوگا تو وہ ہو گا اور زمان ہو گا تو اس کا وجود ہو گا اور نتیجہ زمان و مکان کا پابند ہو کر ممکنات کی سطح پر آجائے گا نہ قدیم قرار پائے گا اور نہ واجب الوجود رہے گا۔

خدا مجموعہ اجزاء نہیں ہے

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ولا یوصف بشئی من الاجزاء ولا بالجوارح والاعضاء۔(نہج البلاغہ)

اسے اجزاء اور اعضاء و جوارح میں سے کسی سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔

خداوند عالم بسیط محض ہے اس کے لئے نہ اجزائے ذہنی تجویز کئے جاسکتے ہیں اور نہ اجزائے خارجی۔ اگر وہ اجزاء سے مرکب ہو گا تو وہ ان اجزاء کے ترکیب پانے سے جو اس سے پہلے موجود ہوں گے وجود میں آئے گا کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ جو چیز مرکب ہوتی ہے اس کے اجزاء پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ جب اس کے اجزاء اس پر مقدم ہوں گے تو وہ لامحالہ ان اجزاء کے بعد وجود پذیر ہو گا۔ اس صورت میں نہ اس کا مستقل وجود رہے گا اور نہ اجزاء کی

احتیاج سے بالاتر قرار پائے گا اور جو نہ اول و اقدم ہو اور نہ مستقلاً" وجود رکھتا ہو بلکہ اجزاء کا محتاج اور ان سے متاخر ہو وہ قدیم و واجب الوجود کیونکر ہو سکتا ہے؟

اللہ حرکت و سکون سے بری ہے

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لایجری علیہ السکون والحرکۃ وکیف یجری ماھو اجراہ۔(نہج البلاغہ)

اس پر حرکت و سکون طاری نہیں ہو سکتا جو چیز اس نے مخلوقات پر طاری کی ہو وہ اس پر کیونکر طاری ہو سکتی ہے۔

اللہ حرکت و سکون سے بری ہے اس لئے کہ حرکت و سکون اسی چیز میں تجویز کیا جا سکتا ہے جس کے لئے محل و مقام اور نقل مکانی کا تصور کیا جا سکے۔ اس لئے کہ کسی چیز کو اس وقت تک ساکن نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ کسی ایک جگہ کی پابند نہ ہو اور اللہ کے لئے جگہ تجویز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے محدود قرار دے لیا حالانکہ وہ غیر محدود اور مکان و زمان کے حدود سے بالاتر ہے اور متحرک اس وقت تک قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی عمل میں نہ آئے۔ اس منتقلی کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز ایک وقت میں ایک جگہ پر نہ تھی اور دوسرے وقت میں اس جگہ پر آگئی۔ پھر اس جگہ سے معدوم ہوئی اور دوسری جگہ پر موجود ہو گئی اور اسی نیست کے بعد ہست اور ہست کے بعد نیست کے سلسلہ پیہم کا نام حرکت ہے اور جو چیز نیستی سے ہستی میں اور ہستی سے نیستی میں آئے وہ لامحالہ حادث ہو گی۔ لہٰذا حرکت جو اس نیست و ہست کے مجموعہ کا نام ہے حادث ہو گی اور جس پر حرکت طاری ہو گی وہ بھی حادث ہو گا کیونکہ کسی چیز کے ساتھ اعراض کا پایا جانا اس کے حدوث کی دلیل ہے اور اللہ نہ حادث ہے اور نہ محل حوادث۔ اس لئے کہ حادث وہ ہے جو پردہ عدم سے وجود میں آئے اور خداوند عالم قدیم ہے جو مسبوق بالعدم نہیں ہو سکتا اور واجب الوجود ہے جس میں نیستی کا گزر ممکن نہیں ہے۔

ان صفات سلبیہ کے علاوہ بھی حضرتؑ کے کلام میں چند صفتوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی ذات خداوندی سے نفی ضروری ہے۔ جیسے اتحاد، حلول، احتیاج وغیرہ انہیں نظرانداز کیا جاتا ہے کیونکہ صفات سلبیہ کے ذیل میں جو مختصر دلائل ذکر کئے گئے ہیں انہی دلائل سے ان کی بھی نفی کی جا سکتی ہے۔

ہستی باری کا اقرار عمل کا مقتضی ہے

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تجعلوا علمکم جهلا ويقينکم شکا اذا علمتم فاعملوا واذا تيقنتم فاقدموا۔

اپنے علم کو جہل نہ قرار دو اور یقین کو شک نہ بناو جب جان چکے تو عمل کرو اور یقین پیدا کر چکے تو آگے بڑھو۔

دنیا میں ہر چیز کے کچھ خواص ہوتے ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے مثلاً" سنکھیا کی خاصیت سمیت ہے اور شراب کی خاصیت نشہ ہے خواہ سنکھیا کو سنکھیا سمجھ کر کھایا جائے یا نمک سمجھ کر یا شراب کو شراب سمجھ کر پیا جائے یا سرکہ سمجھ کر۔ سنکھیا اپنی خاصیت کے مطابق اثر کرے گا۔ اور شراب اپنی خاصیت کے مطابق اثر کرے گی اسی طرح علم و یقین کے بھی کچھ خواص ہوتے ہیں خواہ علم و یقین واقع کے مطابق ہو یا واقع کے مطابق نہ ہو۔ چنانچہ ایک شخص اندھیرے میں کوئی چیز دیکھتا ہے اور اسے رسی سمجھ کر بے جھجک گزر جاتا ہے مگر واقع میں وہ رسی نہ تھی بلکہ سانپ تھا یا اسے سانپ سمجھ لیتا ہے اور لرزتا کانپتا دوسری سمت ہو جاتا ہے مگر واقع میں وہ رسی تھی۔ پہلی صورت میں اسے کسی قسم کا خوف ڈر محسوس نہیں ہوا کہ بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا اور دوسری صورت میں ڈرے بغیر نہیں رہا اور اسی ڈر کی بنا پر اس نے راستہ بدل دیا اور دوسری سمت چلا گیا۔ یہ خوف اور بے خوفی واقع کا اثر نہیں ہے اگر واقع اثر انداز ہوتا تو بے خوفی کی جگہ خوف اور خوف کی جگہ بے خوفی ہوتی بلکہ یہ بے خوفی اثر ہے اس کا کہ سانپ کو رسی سمجھ لیا گیا اور خوف اثر ہے اس کا کہ رسی کو سانپ قرار دے لیا گیا اگر کوئی یہ جانتے ہوئے کہ سامنے سانپ ہے نہ خوف کھاتا ہے اور نہ راستہ بدل کر چلتا ہے تو اس کا جاننا نہ جاننا اور علم جہل ہو گا اس لئے کہ اس نے تقاضائے علم کو نظر انداز کر دیا اور جس سے بچ کر نکلنے کی ضرورت تھی اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔

ایمان کے معنی بھی علم و یقین کے ہیں اور اس کے تقاضے بھی وہی ہیں جو علم و یقین کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ پر ایمان اور اس کی ہستی پر یقین محکم ہو گا تو انسان کی عملی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی اور اس یقین کے اثرات اس کے افعال و اعمال پر واضح طور پر مرتب ہوں گے۔ کیونکہ ایمان ایک باطنی محرک ہے جس کا اثر ظاہری اعمال پر پڑتا ہے اور انہی ظاہری اعمال سے ایمان کی کمزوری و پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر ایمان پختہ و راسخ ہو گا تو عمل کی تحریک قوی ہو گی اور ایمان کمزور ہو گا تو عمل کی رفتار بھی سست ہوگی۔ یہ دونوں آپس میں اس طرح مرتبط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان کی حیثیت اساس و بنیاد کی ہے اگر عقیدہ و ایمان نہ ہو تو عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر عمل نہ ہو تو عقیدہ کی پختگی کا ثبوت بہم پہنچانا مشکل ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین

علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الایمان والعمل اخوان توأمان و رفیقان لا یفترقان لا یقبل اللہ احدھما الا بصاحبہ۔

ایمان اور عمل دو جڑواں بھائی ہیں اور ایسے دو ساتھی ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے اور اللہ ایک کو دوسرے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔

اگر کوئی شخص صدق دل سے اللہ کی ہستی کا اقرار کرتا اور یہ یقین رکھتا ہے کہ ایک بالا دست ذات موجود ہے جس سے خلوت و جلوت کے اعمال پوشیدہ نہیں ہیں تو وہ نہ اس کے احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کرے گا اور نہ اس کے اوامر کی خلاف ورزی میں جری و بیباک ہو گا اور اگر اس کی ہستی کے اعتراف کے ساتھ جذبہ عمل پیدا نہیں ہوتا تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابھی عقیدہ ناپختہ اور اعتراف صرف رسمی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ وہ علم جو عمل سے عاری ہو وہ علم نہیں بلکہ جہل ہے اور وہ یقین جس پر یقین کے اثرات مرتب نہ ہوں وہ یقین نہیں بلکہ شک ہے۔

مسئلہ قضاء و قدر

مسئلہ قضاء و قدر ایک مشکل مسئلہ ہے اور بعض افراد کی ژولیدہ فکری و کج بیانی نے اسے اور مشکل بنا دیا ہے اور جوں جوں اسے حل کرنے اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے حیرت و سرگشتگی بڑھتی ہی رہی ہے اور کاروان فکر صحیح راہ کو کھو کر جبر و تفویض کی وادیوں میں بھٹکتے رہے ہیں۔ اسی لئے اس میں زیادہ غور و تعمق سے منع کیا گیا ہے تاکہ ذہن اس کی پیچیدگیوں میں الجھ کر غلط راہ کی طرف نہ مڑ جائیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے قضاو قدر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

طریق مظلم فلا تسلکوہ وبحر عمیق فلا تلجوہ سر اللہ فلا تتکلفوہ۔

یہ ایک تاریک راستہ ہے اس میں قدم نہ اٹھاو ایک گہرا سمندر ہے اس میں نہ اترو اور اللہ کا ایک راز ہے اسے جاننے کی زحمت نہ اٹھاؤ۔

حضرتؑ نے عامتہ الناس کی ذہنی سطح کو دیکھتے ہوئے اس کی گہرائیوں میں جانے سے منع کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اگر کسی نے پوچھ لیا تو اس کی صحیح مفہوم کی طرف رہنمائی بھی فرمائی ہے اور مختلف عبارتوں اور اسلوبوں میں اس کے معنی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ارباب فکر و نظر نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس سے بلیغ تر اور حسین تر انداز بیان اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ چنانچہ حجاج ابن یوسف نے ابوالحسن بصری، عمرو ابن عبید، واصل ابن عطاء اور عامر شعبی کو تحریر کیا کہ وہ قضاء و قدر کے بارے میں جو رائے رکھتے ہوں یا جو آراء ان تک پہنچی ہوں انہیں

قلمبند کر کے مجھے بھیجیں۔ ان سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ قضاء و قدر کی تنگ و تار راہوں میں صرف امیرالمومنین علیہ السلام کے کلمات شمع راہ کا کام دیتے اور منزل کی صحیح نشاندہی کرتے ہیں۔ چنانچہ حسن بصری نے لکھا کہ میں نے قضاء و قدر کے بارے میں جتنے اقوال دیکھے اور سنے ان میں سب سے بہتر امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا یہ قول ہے۔

اتظن ان الذی نهاک دهاک انما دهاک اسفلک و اعلاک والله بری من ذالک۔

کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ جس نے تمہیں گناہوں سے روکا ہے اس نے تمہیں گناہ پر مجبور کیا ہے۔ ہمیں جنسی قوتوں اور کام و دہن کی لذتوں نے مجبور کیا ہے اور خالق اس سے بری ہے کہ وہ ایسا کرے۔

عمرو ابن عبید نے تحریر کیا کہ میں نے قضاء و قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام علیہ السلام کے اس قول کو سب سے بہتر پایا ہے۔

لو کان الوزر فی الاجل محتوما لکان الموزور فی القصاص مظلوما۔

اگر گناہ قضائے حتمی کا نتیجہ ہو تو پھر مرتکب گناہ کو سزا دینا اس پر ظلم کرنا ہے۔

واصل ابن عطاء نے تحریر کیا کہ میرے نزدیک قضاء و قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا یہ ارشاد ہر اعتبار سے جامع ہے۔

ایدلک علی الطریق ویاخذ علیک المضیق۔

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں راہ ہدایت دکھائے اور (نجات و سعادت کا) راستہ تمہارے لئے بند کر دے۔

عامر شعبی نے لکھا کہ قضاء و قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اس قول سے بہتر کوئی قول نہیں ہے۔

کلما استغفرت الله تعالی عنه فهومنک و کلما حمدت الله تعالی علیه فهومنه۔

ہر وہ کام جس سے تم اللہ سے توبہ و استغفار کرو وہ تمہارا کیا دھرا ہے اور ہر وہ عمل جس پر تم اللہ کی حمد و ستائش کرو وہ اس کی توفیق کے شامل حال ہونے کا نتیجہ ہے۔

جب حجاج نے یہ کلمات پڑھے تو امیرالمومنین علیہ السلام سے دشمنی و عناد کے باوجود یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ

لقد اخذ و ھامن عین صافیہ۔(مصابیح الانوار ج ا ص ۱۴۵)   ان لوگوں نے یہ مطالب سرچشمہ علم لدنی سے حاصل کیئے ہیں۔

حضرتؑ کے ان ارشادات سے ظاہر ہے کہ انسان پر اللہ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے بلکہ اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اس کے ارادہ و اختیار سے صادر ہوتے ہیں اس طرح کہ وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے اور فعل و ترک کی یہ دونوں صورتیں اس کے ارادہ و اختیار کے تابع ہیں۔ لہٰذا اس کے افعال کی ذمہ داری اسی پر عائد ہو گی اگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے انسان کو ایسا کیوں نہ بنایا کہ وہ برائی کرنے کے قابل ہی نہ ہوتا اور اس سے صرف نیکی ہی صادر ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان نیکی و بدی کے امتیاز سے محروم رہتا اور انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر آجاتا کیونکہ انسان کا اصل کمال ہی یہی ہے کہ وہ نیکی و بدی کو پہچانے اور باختیار خود بدی سے منہ موڑ کر نیکی کی راہ اختیار کرے اور اچھے کاموں پر جزا کا اور برے کاموں پر سزا کا مستحق قرار پائے۔ اشاعرہ و جبریہ نے قضاء و قدر سے دھوکا کھایا اور یہ سمجھ لیا کہ انسان سے جو اچھے برے افعال سرزد ہوتے ہیں وہ ان کے بجالانے پر مجبور ہے کیونکہ قضاء و قدر نے اسے پابند بنا دیا ہے اور وہ ان خطوط سے سرمو ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا جو اس کے لئے نوشتہ ازلی نے متعین کردئے ہیں۔ یہ عقیدہ سراسر غلط اور خلاف عقل و وجدان ہے اور دلائل قاطعہ اس کے بطلان پر شاہد ہیں۔

اولاً" یہ کہ ہرذی شعور انسان جانتا ہے کہ اس سے کچھ افعال باختیار صادر ہوتے ہیں جیسے چلنے پھرنے میں ہاتھ پیروں کی حرکت اور کچھ افعال بلا اختیار صادر ہوتے ہیں جیسے نبض کی جنبش اور دل کی دھڑکن وہ ان دونوں قسموں میں امتیاز کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ ہاتھ پیر کی حرکت اس کے اختیار و قدرت سے صادر ہوتی ہے اور نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن اس کے اختیار و قدرت سے باہر ہے بلکہ حیوان بھی یہ سمجھتا ہے کہ کون سا فعل اس کے مقدور میں ہے اور کون سا فعل اس کی قدرت سے باہر ہے چنانچہ اگر ایک تیز رو گھوڑے کے سامنے کوئی ندی یا چٹان آجائے تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس ندی یا چٹان کو پھلانگنا اس کے بس میں نہیں ہے اپنے قدم روک لیتا ہے اور جب رکاوٹ برطرف ہو جاتی ہے اور راستہ ہموار دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ دوڑ جاری رکھنا اس کے بس میں ہے اور وہ حسب معمول دوڑنے لگتا ہے جب ہم اپنے اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں فرق کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اختیاری افعال پر قدرت رکھتے ہیں اور غیر اختیاری افعال ہمارے احاطہ قدرت سے باہر ہیں تو اگر اپنے اختیاری افعال کی نسبت اللہ کی طرف دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں کوئی فرق ہی نہیں ہے اور جنہیں ہم اختیاری کہتے ہیں ان کے بجالانے پر بھی اسی طرح مجبور ہیں جس طرح غیر اختیاری حرکات و افعال میں بے بس ہیں اور یہ امر بدیہیات کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر ہمارے افعال میں ہمارے اراداہ و اختیار کا کوئی دخل نہ ہوتا اور ہماری حیثیت اس اوزار

کے مانند ہوتی جو کسی صنعت کار کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ جس طرح وہ چاہتا ہے اسے حرکت دیتا ہے یا لوہے کے اس ٹکڑے کے مانند ہوتی جو مقناطیس کے اثر سے حرکت کرتا ہے تو پھر ہو سکتا تھا کہ ہم کسی فعل کو ناپسند کرتے اور اسے نہ کرنا چاہتے تو وہ ہم سے قہراً صادر ہوتا اور کسی کام کو پسند کرتے اور اسے نہ کرنا چاہتے تو وہ ہم سے صادر نہ ہوتا اس لئے کہ ان افعال کا فاعل تو اللہ ہے اور اس نے اپنے افعال کو ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کے تابع نہیں رکھا بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ ہم ایک کام کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہے یا ہم ایک کام نہ کرنا چاہیں اور وہ کرنا چاہے مثلاً ہم مشرق کی طرف جانا چاہیں اور وہ یہ چاہے کہ ہم مغرب کی طرف بڑھیں تو قہراً ہمارے قدم مغرب کی طرف اٹھنا چاہئیں یا اس کے برعکس ہم مغرب کی سمت کا ارادہ کریں اور وہ یہ چاہے کہ ہم مشرق کی طرف جائیں تو قہراً ہمارا رخ مشرق کی سمت ہونا چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ جس سمت کا ہم قصد و ارادہ کرتے ہیں ہمارے قدم اسی سمت اٹھتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے افعال ہمارے قصد و ارادہ کے تابع ہیں جب ہم چاہتے ہیں تو وہ افعال وجود میں آتے ہیں اور جب نہیں چاہتے تو وقوع میں نہیں آتے اور کوئی خارجی قوت ہمیں فعل یا ترک پر مجبور نہیں کرتی۔

تیسرے یہ کہ اگر انسانی افعال اللہ کے ارادہ سے وقوع میں آتے ہیں خواہ اس نے ان کے بجا لانے کا حکم دیا ہو یا ان سے منع کیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا میں کفر و شرک، قتل و ظلم اور دوسرے قبیح امور اسی کے ارادہ سے وجود میں آئے ہوں اور جن اعمال خیر کا وقوع نہیں ہوا وہ اس کی نظروں میں ناپسندیدہ ہوں کیونکہ جن اعمال کے وقوع کا اس نے ارادہ ہی نہیں کیا وہ لا محالہ اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے ان افعال کے بجا لانے کا حکم دیا جن کے وقوع کا اس نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا اور ان کاموں سے منع کیا جن کو پسند کرتے ہوئے ایجاد کیا تھا۔ لہٰذا نافرمان کفر و عصیان کی بنا پر مطیع قرار پائیں گے کیونکہ انہوں نے وہی کام انجام دیئے جن کے وقوع کا اس نے ارادہ کیا تھا اور ان کاموں سے کنارہ کش رہے جن کے وقوع کا اس نے ارادہ نہیں کیا تھا اور اسے کوئی بھی ماننے کے لئے تیار نہ ہو گا کہ کفر و عصیان مراد الٰہی ہوں اور ایمان و اطاعت اور اعمال خیر ناپسندیدہ قرار پائیں۔ جبکہ اللہ کا ارادہ ایمان و اطاعت سے متعلق ہوتا ہے اور کفر و شرک اور معاصی کے وقوع کو ناپسند کرتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے

کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا

ان تمام باتوں میں جو بات بری ہے وہ تمہارے پروردگار کو ناپسند ہے

چوتھے یہ کہ تمام فرقہ اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر مسلمان کو قضاؤ قدر الٰہی پر راضی رہنا چاہئے تو اگر تمام افعال اللہ کی طرف سے ہیں اور انسان مجبور محض ہے تو اگر وہ کفر اختیار کرتا ہے یا شرک کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے بھی قضاؤ قدر کا فیصلہ سمجھ کر اس پر رضا مند رہنا چاہئے اور اس کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہئے کیونکہ اس کے

خلاف لب کشائی اللہ کے فیصلہ قضاؤ قدر پر نکتہ چینی و حرف گری کے مترادف ہو گی حالانکہ کوئی بھی ذی عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ کفرو شرک پر راضی رہنا چاہئے اور اسے بلا چون و چرا قبول کرلینا چاہئے جبکہ اللہ بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے

ولا یرضی لعبادہ الکفر اللہ اپنے بندوں کے لئے کفر پر راضی نہیں ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر اچھے برے افعال اللہ ہی کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور انسان اس کے ارادہ کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے اس طرح کہ جس چیز کو وہ چاہتا ہے بجبر کروا دیتا ہے اور جس چیز کو نہیں چاہتا اس سے بجبر روک دیتا ہے تو اس صورت میں اوامر و نواہی کے نفاذ کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ بندوں کو فعل و ترک کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا نہ انبیاء کے بھیجنے کی ضرورت تھی نہ کتابوں کے نازل کرنے کی حاجت اور نہ اوامرو نواہی کے نفاذ کی احتیاج اور پھر احکام کی پابندی پر جزا اور خلاف ورزی پر سزا تجویز کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ کیونکہ جزا و سزا اختیاری افعال پر مرتب ہوتی ہے اور غیر اختیاری افعال پر جزا یا سزا تجویز کرنا سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ غیر اختیاری افعال کو نہ اچھا کہا جاسکتا ہے اور نہ برا۔ ان پر اچھائی یا برائی کا حکم اسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے جب ان میں انسانی قدرت و اختیار کو دخل ہو۔ لہٰذا وہ عقیدہ جس کے نتیجہ میں بعثت انبیاء عبث' حشرو نشر بیکار' نفاذ' احکام باطل اور جزا وسزا غلط قرار پائے اسے کسی صورت میں اسلامی عقیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ انہی غلط نتائج پر نظر کرتے ہوئے ابوالعلاء معری نے کہا ہے۔

زعم الجھول ومن یقول بقولہ ان المعاصی من قضاء الخالق

جاہل اور اس کے ہمنوا یہ گمان کرتے ہیں کہ گناہ خالق عالم کی قضاء و قدر کا نتیجہ ہیں۔

ان کان حقاما زعمت فلم قضی حدالزناء و قطع کف السارق

اگر تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو اس نے زنا پر حد کی اور چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کیوں تجویز کی۔

اس عقیدہ جبر کے بطلان کے بعد اس میں کوئی شک و شبہہ نہ ہونا چاہئے کہ انسان فاعل مختار ہے اور اس کے اچھے اور برے افعال اسی کے ارادہ و اختیار کے تابع ہیں۔ اللہ سبحانہ نے انہی اچھے اور برے افعال کو پہچنوانے کے لئے انبیاء و اوصیاء مامور فرمائے۔ جنہوں نے خیر و شراور نیکی و بدی کی نشاندہی کی اور بدی سے بچ کر رہنے اور نیکی کی راہ پر چلنے کی تلقین فرمائی۔ اب ہم بدی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ہم نیکی کا راستہ جانتے نہیں بلکہ یہ ہمارے غلط انتخاب کا نتیجہ ہے اور نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ نیکی ہے۔ شعور و وجدان اس کا شاہد ہے کہ جہاں تک بدی کو بدی اور نیکی کو نیکی سمجھ کر اختیار کرنے کا تعلق ہے وہ ہمارے ارادہ و اختیار ہی سے وابستہ ہے اور جس قوت سے ہم کوئی کام کر سکتے ہیں اسی قوت سے ہم اسے ترک بھی کر سکتے ہیں۔ اس

اعتبار سے ہم سے صادر ہونے والے افعال کا استناد ہماری طرف ہو گا اور اس اعتبار سے کہ قوت و اختیار کا جوہر اللہ کا عطا کردہ ہے ان افعال کا استناد اللہ کی طرف بھی صحیح ہے لیکن اس قوت اختیار کے دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ہم سے اختیار چھین لیا ہے اور ہم مجبور کر دئے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی بھوکے کو روٹی دیتا ہے اور وہ روٹی کھانے کے بجائے اسے پھینک دیتا ہے تو اس کی ذمہ داری روٹی دینے والے پر عائد نہ ہو گی بلکہ اس شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا جس نے روٹی پھینکی ہے کیونکہ یہ فعل اسی کے ارادہ و اختیار سے صادر ہوا ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ قضاء و قدر سے باہر نہیں ہے مگر اس قضاء کا تعلق کبھی خلق و ایجاد سے ہوتا ہے اور کبھی افعال عباد سے۔ پہلی قسم قضائے تکوینی کہلاتی ہے اور دوسری قسم قضائے تشریعی قضائے تکوینی اپنے اندر لزوم رکھتی ہے کیونکہ کوئی طاقت اللہ کے ارادہ کے سامنے دیوار بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی اور قضائے تشریعی۔ انسان کے ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے۔ البتہ اللہ سبحانہ یہ جانتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے یہ اور یہ کرے گا اور چونکہ علم کسی فعل کے وقوع کا سبب نہیں ہوتا اس لئے اللہ کے علم سابق سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور قرار پائے۔ چنانچہ ایک عراقی نے امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا شامیوں سے لڑنا اور صفین کی جانب ہمارا حرکت کرنا قضاء و قدر کا نتیجہ تھا فرمایا کہ ہاں اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ اور ذی روح کو پیدا کیا ہم نے جہاں قدم رکھا جس نشیب میں اترے اور جس بلندی پر چڑھے وہ قضاء و قدر ہی کا فیصلہ تھا۔ کہا کہ پھر ہمیں تو کسی اجر کا استحقاق نہ ہونا چاہئے حضرتؑ نے فرمایا کہ تم نے اس قضا سے وہ قضاء سمجھ لی ہے جس کے خلاف ممکن نہیں ہوتا اگر ایسا ہو تو پھر ثواب و عقاب و حدو وعید اور امرونہی سب عبث قرار پائیں گے اور اس صورت میں انسان نیکی پر مدح کا اور برائی پر مذمت کا مستحق نہ رہے گا اور یہ مجوسیوں اور قدریوں کا نظریہ ہے۔

ان اللہ امر تخییرا ونھی تحذیرا وکلف یسیرا ولم یعص مغلوبا ولم یطع مکرھا ولم یرسل الرسل الی خلقہ عبثا۔ (مصابیح الانوار)

اللہ نے کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دے کر احکام دئے ہیں اور (بری باتوں کے عواقب و نتائج سے) ڈراتے ہوئے منع کیا ہے۔ اس نے تکلیف شرعی میں آسانی رکھی ہے اور اس کی خلاف ورزی اس لئے نہیں کی جاتی کہ وہ مغلوب و عاجز ہے اور نہ بجبر اس کی اطاعت ہوتی ہے اور نہ اس نے مخلوق کی طرف رسولوں کو بیکار مبعوث کیا ہے۔

اس عراقی نے کہا کہ پھر وہ کون سی قضاء و قدر تھی جس کے زیر اثر ہم نکلے۔ فرمایا وہ اللہ کا حکم تھا۔ اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

وقضی ربک ان لا تعبدو الا ایاہ۔ تمہارے پروردگار نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔

مقصد یہ ہے کہ اس مقام پر قضاء کا تعلق افعال عباد سے ہے یعنی وہ اپنے بندوں کو مامور کرتا ہے کہ فلاں فلاں کام انجام دیں اور اس حکم کی تعبیر لفظ قضی سے کی ہے جیسا کہ آیت میں قضی کے معنی حکم دینے کے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے ہمیں بجبر اس فعل کی بجا آوری پر آمادہ کیا ہے بلکہ یہ ہمارے ارادہ و اختیار سے وقوع میں آیا ہے اور جب ہم نے اپنے ارادہ و اختیار سے اس کام کو انجام دیا ہے تو اس پر اجر و ثواب کے بھی مستحق ہوں گے۔

یہ واضح رہے کہ صرف ارادہ و اختیار ہی سے نیک اعمال وقوع میں نہیں آتے بلکہ اس کے ساتھ اسباب کا مہیا ہونا اور موانع کا برطرف ہونا بھی ضروری ہے اور جب تک اس کی تکمیل کے اسباب فراہم اور موانع برطرف نہ ہوں گے ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکے گا۔ یہ اسباب کی فراہمی اور موانع کی برطرفی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کا نام توفیق ہے۔ جس سے کسی صورت میں بے نیاز نہیں رہا جا سکتا۔ اسی توفیق کی دستگیری سے انسان اعمال خیر کو تکمیل تک پہنچاتا ہے اور جزا و ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس توفیق سے جبر کا توہم نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ کسی کام کی انجام دہی کے اسباب مہیا کر دینا اور ہے اور اس کام پر مجبور کرنا اور ہے۔ بہرحال اس حد تک اللہ کے دخل کا اعتراف ضروری ہے کہ وہ موانع کو برطرف کر کے اعمال خیر کی بجا آوری کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ اس کے برعکس فرقہ معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ بندوں کے افعال میں اللہ کا کسی اعتبار سے کوئی دخل نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس نے بندوں کو قوت و طاقت دی ہے اور اعضاء و جوارح دئے ہیں جن سے وہ چلتا پھرتا دیکھتا سنتا اور دوسرے کام انجام دیتا ہے یہ عقیدہ جو تفویض کے نام سے موسوم ہے عقیدہ جبر کا ردعمل ہے جو جبر ہی کی طرح حقیقت و واقعیت سے دور ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسان کا اللہ سے مستغنی و بے نیاز ہونا لازم آتا ہے۔ صحیح مسلک وہی ہے جو افراط و تفریط کی ان دونوں سمتوں کے درمیان ہے اور جسے احادیث میں امر بین امرین سے تعبیر کیا گیا ہے اور امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشادات سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے چنانچہ حضرتؑ نے ایک شخص سے جو قضاء و قدر کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا فرمایا۔

ابا للہ تسطیع ام مع اللہ ام بدون اللہ۔ کیا تم اللہ کی مدد سے قدرت و استطاعت رکھتے ہو یا اللہ کے ساتھ شریک ہو کر یا اللہ کے بغیر۔

اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو آپؑ نے فرمایا۔

انک ان زعمت انک مع اللہ تستطیع فقد زعمت انک شریک اللہ معہ فی ملکہ وان زعمت انک من دون اللہ تستطیع فقد ادعیت الربوبیتہ ۔(توحید صدوق)

اگر تم یہ گمان کرو کہ تم اللہ کے ساتھ ہو کر استطاعت رکھتے ہو تو تم نے خدا کے ملک میں اس کا شریک ہونے کا گمان کیا اور اگر یہ کہو کہ تم اللہ کے بغیر خود مستقلاً" استطاعت رکھتے ہو تو تم نے ربوبیت کا دعویٰ کیا۔

اس شخص نے کہا **لا بل باللہ استطیع** "میں اللہ کی مدد و دستگیری سے استطاعت رکھتا ہوں" حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر تم اس کے علاوہ کچھ اور کہتے تو گردن زدنی قرار پاتے۔

اصول خمسہ

دین اسلام کے اساسی عقائد کو اصول اور بنیادی اعمال کو فروع کہا جاتا ہے۔ یہ اصول پانچ ہیں! توحید' عدل' نبوت' امامت' اور معاد۔ ان میں سے توحید نبوت اور معاد کے اصول دین ہونے پر تمام فرق اسلامیہ کا اتفاق ہے اور عدل و امامت شیعہ عقائد میں شمار ہوتے ہیں۔ اصول اصل کی جمع ہے جس کے معنی جڑ کے ہیں اور فروع فرع کی جمع ہے اور اس کے معنی شاخ کے ہیں۔ عقائد کو اصول اور اعمال کو فروع اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس طرح جڑ کے بغیر شاخیں پھلتی پھولتی نہیں اسی طرح اصول کو مانے بغیر فروع کے نشوو نما پانے اور برگ و بار لانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ فروع ان شرعی احکام کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ سے ہم تک پہنچے۔ اگر کوئی اللہ کی ہستی اور اس کی وحدت و یکتائی کا قائل ہی نہیں ہے اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ ان احکام کو احکام خداوندی ماننے اور ان پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہی کیونکر ہوگا اور اگر ان احکام کی بجا آوری و خلاف ورزی پر جزاء و سزا نہ ہو تو ان احکام کی پابندی کا ثمرہ و نتیجہ ہی کیا جبکہ انجام کار مطیع و نافرمان دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور اگر حشرو نشر کے ساتھ عدل کا عقیدہ نہ ہو تو اللہ کے لئے کون سا امر مانع ہے کہ وہ نیک و فرمانبردار بندے کو جہنم میں جھونک دے اور سرکش و نافرمان کو جنت میں جگہ دے دے۔ عادل نہ تسلیم کیا جائے تو جزاء و سزا کا نظریہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر احکام میں تحریف و تبدل سے تحفظ کا سرو سامان نہ ہو تو احکام اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہ سکتے بلکہ اغراض فاسدہ کا نشانہ بن کر اپنی ہیئت و صورت کھو بیٹھیں گے اور ابلاغ و اعلام کے باوجود حجت ناتمام رہے گی اور اتمام حجت کے بغیر ثواب و عقاب کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے۔ اسی تحفظ و نگہداشت کی ذمہ داری کا اہم امامت ہے۔ یہ اصول تمام تر عقل پر مبنی

ہیں اور عقل ہی وہ معیار ہے جس پر صحیح و غلط کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں بار بار فکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ عقل و بصیرت کی روشنی میں عقائد کو پرکھا جائے اور جانچ پرکھ کر دل و دماغ میں جگہ دی جائے۔ ذیل میں اصول خمسہ کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام کے چند ارشادات درج کئے جاتے ہیں جو حقائق دینیہ و معارف الہیہ کا سرچشمہ ہیں۔

توحید

توحید کا مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات ایک ہے اور ہر اعتبار سے واحد و یکتا ہے نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے نہ صفات میں اور نہ افعال میں۔ خلق و رزق' موت و حیات اور نظم عالم میں اسی کا عمل دخل ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی معبود اور عبادت کا سزاوار ہے۔ اس لحاظ سے توحید کے چار اقسام ہوں گے! توحید فی' الذات توحید فی الصفات' توحید فی الافعال اور توحید فی العبادات ۔

توحید فی الذات کے بارے میں حضرت کا ارشاد ہے۔

واعلم یا بنی انہ لو کان لربک شریک لاتتک رسلہ ولرائیت آثار ملکہ و سلطانہ و لعرفت افعالہ وصفاتہ ولکنہ الہ واحد کما وصف نفسہ لایضادہ فی ملکہ احد ولا یزول ابدا۔(نہج البلاغہ)

اے فرزند! یقین کرو کہ اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تے اور اس کی سلطنت و فرمانروائی کے بھی آثار دکھائی دیتے اور اس کے افعال و صفات بھی کچھ معلوم ہوتے مگر وہ ایک اکیلا خدا ہے جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے اس کے ملک میں کوئی اس سے ٹکر نہیں لے سکتا وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

خداوند عالم کی وحدت و یکتائی پر یہ ایک کھلی ہوئی اور روشن دلیل ہے جس میں نہ اصطلاحی الفاظ صرف ہوئے ہیں اور نہ ترتیب مقدمات سے اخذ نتائج پر مبنی ہے بلکہ اتنی سادہ اور واضح ہے کہ ہر سطح کا ذہن اسے سمجھتا اور قبول کرتا ہے۔ اس سے کسی فرد کو خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو انکار نہیں ہو سکتا کہ ابتدائے آفرینش سے پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء و رسل آئے سبھوں نے ایک ہی خدا کی نشاندہی کی اور ایک ہی خدا کا پیغام پہنچایا اگر اس ذات احد کے علاوہ کوئی اور بھی خدا ہوتا تو اس کے واجب الوجود ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ علم و قدرت اور دوسرے صفات کمالیہ رکھتا اور ان صفات کمالیہ کا ظہور ہوتا۔ اس کی قدرت کے آثار اور علم و حکمت کے مظاہر دیکھنے میں آتے اور انبیاء رسل کے ذریعہ اس کے احکام ہم تک پہنچتے۔ ان میں سے کچھ ایک خدا کی

طرف سے آتے کچھ دوسرے خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے اور اپنے اپنے خدا کی نمائندگی کرتے مگر اول سے آخر تک ہر نبی کی زبان سے بغیر کسی اختلاف کے ایک ہی آواز بلند ہوتی ہے کہ وہ واحد و یکتا ہے اور ہم سب اسی ایک خدا کے فرستادہ ہیں جس کا کوئی شریک و مثیل نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون۔ ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول بھیجا اسے وحی کے ذریعہ یہی تعلیم دیتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو۔

دنیا میں اور چیزوں کو بھی ایک کہا جاتا ہے مگر اللہ کی وحدت ان ایک کہی جانے والی چیزوں سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ وہ نہ گنتی میں سماتا ہے اور نہ شمار میں آتا ہے چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

واحد لابعدد۔(نہج البلاغہ) وہ ایک ہے مگر نہ گنتی کے اعتبار سے۔

فن حساب میں عدد اسے کہا جاتا ہے جو اپنے ما قبل اور مابعد عدد کے مجموعہ کا نصف ہو چنانچہ دو کے پہلے ایک کا عدد ہے اور اس کے بعد تین کا عدد ہے اور ایک اور تین کا مجموعہ چار ہوتا ہے اور دو کا عدد چار کا نصف ہے اسی طرح تین کے پہلے دو کا عدد ہے اور اس کے بعد چار کا عدد ہے اور دو اور چار کا مجموعہ چھ ہوتا ہے اور تین چھ کا نصف ہے یونہی چار کے پہلے تین کا عدد ہے اور اس کے بعد پانچ کا عدد ہے اور تین اور پانچ کا مجموعہ آٹھ ہوتا ہے اور چار آٹھ کا نصف ہے یونہی آخر عدد تک دیکھتے جایئے تو ہر عدد اپنے ما قبل اور مابعد کے مجموعہ کا نصف ہو گا جب عدد کی یہ تعریف ٹھہری کہ وہ اپنی دونوں سمتوں میں واقع ہونے والے اعداد کے مجموعہ کا نصف ہو تو ایک پر عدد صادق نہ آئے گا اس لئے کہ اس کی ایک سمت پر تو عدد ہے اور دوسری سمت عدد سے خالی ہے لہٰذا اللہ کو عدد کے اعتبار سے ایک نہیں کہا جائے گا اس لئے کہ ایک عدد ہی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جہاں گنتی میں آنے والے ایک کا تصور ہو گا وہاں دو کا بھی تصور ہو گا اور خداوند عالم ہر اعتبار سے واحد و یگانہ ہے۔ جس میں دوئی کے تصور کی بھی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ تعدد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک مابہ الاشتراک ہو اور ایک مابہ الامتیاز اسی مابہ الاشتراک و مابہ الامتیاز کو جنس و فصل سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً" انسان اور اونٹ دو الگ الگ چیزیں ہیں ان دونوں میں ایک مابہ الاشتراک ہے اور وہ جنبہ حیوانیت ہے اور ایک مابہ الامتیاز ہے جو انسان کو اونٹ سے اور اونٹ کو انسان سے الگ کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کا مابہ الامتیاز نطق یعنی تعقل و ادراک کی قوت ہے جو اسے اونٹ سے علیحدہ کرتی اور اس کی نوع کو اونٹ کی نوع سے الگ قرار دیتی ہے۔ اسی طرح دو انسان انسانیت میں اشتراک کے باوجود اس لئے دو ہیں کہ دونوں کے مشخصات و عوارض وجودی مختلف ہیں مثلاً" دونوں کے رنگ نسل زبان خدوخال قدوقامت عمر اور طینت میں اختلاف ہے ماں باپ جدا اور خاندان الگ ہے۔

لہذا ایسا موجود جو حدود و قیود سے بری ہو نہ اس کی جنس ہو اور نہ فصل تو اس کے لئے دوسرا تجویز کرنا سراسر خلاف عقل ہو گا۔ اس لئے کہ تعدد کے لئے مابہ الاشتراک ومابہ الامتیاز کا ہونا ضروری ہے اور باری تعالی اجزائے ذہنی و خارجی کی ترکیب اور حدود و قیود سے بالاتر ہے اگر اس کے لئے حدوقید تجویز کی جائے تو حدوقید کے منتفی ہونے سے اس کی بھی نفی لازم آئے گی حالانکہ وہ واجب الوجود ہے جو کسی صورت میں نیستی سے دوچار نہیں ہو سکتا جب اس کے لئے حدود و قیود نہیں ہیں تو اس کے ساتھ کوئی اور تجویز نہیں کیا جا سکتا وہ ایک اور صرف ایک ہے اور یہ وحدت و یکتائی وحدت عددی سے جدا ہے۔ اس لئے کہ وحدت عددیہ میں دوسرا تجویز کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ خارج میں دوسرا نہ پایا جاتا ہو مگر اللہ کے لئے نہ خارج میں' نہ ذہن میں اور نہ وہم میں دوسرا تجویز ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جنگ جمل میں ایک اعرابی امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے آیااور کہا کہ آپؑ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کچھ لوگ اس کی طرف لپکے اور کہا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ حضرتؑ کس عالم میں ہیں ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور تم نے یہ مسئلہ چھیڑ دیا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اسے پوچھنے دو ہم بھی تو نظریہ وحدت کی بقاء کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ یہ تو وہی چاہتا ہے جو ہم ان لوگوں سے چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اعرابی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے شخص یہ جملہ کہ "خدا ایک ہے" چار معنی رکھتا ہے! دو معنی اللہ کے بارے میں غلط ہیں اور دو معنی صحیح ہیں۔ جو دو معنی غلط ہیں ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ وہ گنتی کے اعتبار سے ایک ہے تو جس کا کوئی دوسرا نہ ہو اسے گنتی کے لحاظ سے ایک نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لئے جنہوں نے اسے تین میں کا ایک مانا وہ کافر ہوئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے ایک اس طرح کہا جائے جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں (ہندی عراقی یا حجازی) انسانوں میں سے ایک ہے تو یہ اسے دوسروں کے مانند ٹھہرانا ہے۔ اور جن دو معنوں کے اعتبار سے اسے ایک کہنا صحیح ہے ان میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ وہ ایک ہے یعنی تمام موجودات میں کوئی شے اس کے مشابہ نہیں ہے تو بیشک وہ ایسا ہی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک ہے یعنی ہر اعتبار سے ناقابل تقسیم ہے نہ خارج میں اس کی تقسیم ہو سکتی ہے اور نہ عقل و وہم میں تو بیشک ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے ان دونوں معنوں کا حاصل یہ ہے کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ اجزاء سے اس کی ترکیب ہوئی ہے۔

توحید فی الصفات کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فمن وصف الله سبحانه فقد قرنه ومن قرنه فقد ثناه ومن ثناه فقد جزاه و من جزاه فقد جهله۔ (نہج البلاغہ)

جس نے ذات الہی کے علاوہ صفات مانے اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا اور جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی جس نے دوئی پیدا کی۔ اس نے اس کے لئے جز بنا ڈالا اور جو اس کے لئے اجزا کا قائل ہوا وہ اس سے بے خبر رہا۔

اللہ کے صفات اس کی ذات سے الگ نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں بایں معنی کہ یہ صفتیں خارج سے اس پر طاری نہیں ہوئیں بلکہ خود اس کی ذات ہی ان صفات کمالیہ کا مبداء ومنشا ہے۔ اگر اس کے صفات زائد بر ذات قرار دیئے جائیں گے تو چونکہ اس کی ہر صفت قدیم ہے اس لئے جتنی صفتیں ہوں گی اتنے خدا اور ماننا ہوں گے اور اگر ذات وصفات کے مجموعہ کو وجوب و قدامت سے متصف مانا جائے توذات خداوندی میں ترکیب لازم آئے گی اور یہ دونوں چیزیں توحید کے منافی ہیں لہٰذا ان صفات کو عین ذات ماننا ہی تقاضائے توحید ہے۔ اس کی مزید توضیح علم الٰہیات کے باب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

توحید فی الافعال کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد ہے:۔

ذلک مبتدع الخلق و وارثہ والہ الخلق و رازقہ والشمس والقمر دائبان فی مرضاتہ۔ (نہج البلاغہ)

وہی مخلوقات کا پیدا کرنے والا اور اس کا وارث و مالک ہے اور کائنات کا معبود اور ان کا رازق ہے۔ سورج اور چاند اسی کی منشا کے مطابق ایک ڈھرے پر بڑھے جانے کی سرتوڑ کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

اللہ اپنے علم و قدرت سے ہر چیز پر علمی و عملی احاطہ کئے ہوئے ہے اور کوئی چیز اس کے دائرہ علم و احاطہ اختیار سے باہر نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا اور ہر شے پر اقتدار تام رکھتا ہے۔ اسے نہ کسی معاون کی ضرورت اور نہ کسی شریک کار کی حاجت ہے۔ وہی خالق و رازق، محی و ممیت اور مدبر و کارساز عالم ہے، اس نے خلق و رزق، احیاء و اماتت اور تدبیر عالم میں نہ کسی کو اپنا شریک ٹھہرایا ہے اور نہ یہ امور کسی کے سپرد کئے ہیں۔ وہ جس طرح اپنی ذات میں کوئی شریک نہیں رکھتا اسی طرح اپنے افعال میں بھی دوسروں کی شرکت سے بے نیاز ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم هل من شرکاء کم من یفعل من ذلکم من شئی سبحانہ و تعالی عمایشر کون۔

خدا وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر وہی تمہیں مارے گا پھر وہی تمہیں جلائے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی کام کر سکے۔ یہ لوگ جسے اس کا شریک بناتے ہیں وہ اس سے پاک و منزہ ہے۔

توحید فی العبادات کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الذی لاتحق العبادہ لغیرہ الالہ۔ (تفسیر البرہان)

عبادت کا استحقاق اللہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔

اللہ معبود حقیقی ہے اور اس کے علاوہ سب اس کے بندے ہیں۔ اس عبودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسی کی

عبادت کریں اور اسی کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ ہر نبی اور ہر رسول نے اپنی امت کو خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی عبادت کو مقصد حیات انسانی قرار دیتے ہوئے اسی کو عبادت کا سزا وار ٹھہرایا اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے بشدت منع کیا۔ توحید کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کو ایک مان لیا جائے بلکہ ایک ماننے کے ساتھ ہر بندگی اور ہر پرستش کو بھی اس کے لئے مخصوص کرنا ضروری و لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کو ایک مانتا ہے مگر شعوری یا لاشعوری طور پر غیر اللہ کو بھی عبادت میں شریک کرتا ہے تو وہ آخرت کی کامیابی و کامرانی سے محروم رہتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

من کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا و لایشرک بعبادۃ ربہ احدا۔

جو شخص اپنے پروردگار کی لقاء کا امیدوار ہے اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

عدل

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ارتفع عن ظلم عبادہ و قام بالقسط فی خلقہ و عدل علیھم فی حکمہ۔ (نہج البلاغہ)

وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے سے بالاتر ہے۔ وہ مخلوق کے بارے میں عدل سے چلتا ہے اور اپنے حکم میں انصاف برتتا ہے۔

خداوند عالم کے صفات میں عدل ایک بنیادی صفت ہے عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر شے کو اس کے مناسب حال، محل و مقام پر رکھا جائے۔ یہ صفت اللہ کے تمام افعال و اوامر میں کارفرما ہے۔ وہ نہ ظلم کا مرتکب ہوتا ہے نہ شر کا اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جو قبیح اور عبث ہو بلکہ اس کا ہر قدم حکمت و مصلحت سے وابستہ اور ہر حکم مقصد کا حامل ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اپنی اس صفت کا ذکر کیا ہے کبھی مثبت الفاظ میں جیسے۔

وتمت کلمتہ ربک صدقا وعدلا۔

تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور عدل پر تمام ہوتی ہے۔

اور کبھی منفی انداز میں جیسے۔

ان اللہ لیس بظلام للعبید۔ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

ان واضح نصوص کے بعد کوئی ایسا رخ اختیار نہ کرنا چاہئے تھا جس سے عدل کی نفی ہوتی ہو مگر اشاعرہ نے حسن و قبح عقلی کا انکار کر کے عدل کا بھی ایک طرح سے انکار کر دیا ہے حسن و قبہ عقلی کا مطلب یہ ہے کہ اچھے اور برے افعال کے پرکھنے کا معیار عقل ہے چنانچہ انسان سے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان میں کچھ اچھے ہوتے ہیں جیسے صدق' مروت' دیانت' حفظ' عہد وغیرہ اور کچھ برے ہوتے ہیں جیسے کذب' فریب' غصب' ظلم وغیرہ ان افعال کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ عقل ہی نے کیا ہے اور وہی اچھے افعال کو اچھا اور برے افعال کو برا سمجھتی ہے اور جن افعال کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ نہیں کرپاتی ایسا نہیں ہے کہ ان میں اچھائی یا برائی نہ ہو بلکہ واقع میں ان میں اچھائی ہوتی ہے یا برائی اور شارع نے تشریع احکام میں اسی حسن و قبح کا لحاظ رکھا ہے۔ اس طرح کہ جن چیزوں میں اچھائی ہوتی ہے انہیں واجب یا مستحب کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور جن چیزوں میں برائی ہوتی ہے انہیں حرام یا مکروہ قرار دے دیا جاتا ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انہ لم یامر ک الابحسن و لم ینھک الاعن قبیح۔(نہج البلاغہ) اللہ نے تمہیں انہی چیزوں کا حکم دیا ہے جو اچھی ہیں اور انہی چیزوں سے منع کیا ہے جو بری ہیں۔

اشاعرہ کا نظریہ یہ ہے کہ افعال کی اچھائی اور برائی کا معیار عقل نہیں ہے کیونکہ افعال داتاً" نہ اچھے ہوتے ہیں اور نہ برے بلکہ شرع جس فعل کے بجا لانے کا حکم دے وہ اچھا ہے اور جس سے منع کرے وہ برا ہے اور عقل یہ تجویز کرنے سے قاصر ہے کہ کون سا فعل اچھا ہے اور کون سا فعل برا ہے کیونکہ حسن و قبح صرف حکم شریعت کے تابع ہے اور حکم شریعت سے قطع نظر کسی شے میں نہ اچھائی ہے نہ برائی۔ اس نظریہ کی رو سے اگر اللہ کسی بری بات کا حکم دے تو وہ اچھی ہو جائے گی اور کسی اچھی بات سے منع کر دے تو وہ بری ہو جائے گی۔ اس کے اوامر و نواہی میں واقعی اچھائی' برائی اور مصلحت کا کارفرما ہونا ضروری نہیں ہے لہٰذا وہ نیکوکار بندوں کو جہنم میں ڈال دے اور بدکاروں کو جنت میں جگہ دے دے یا بندوں پر ایسے احکام عائد کرے جو بشری طاقت سے باہر ہوں تو اس سے نہ اس کے عدل پر حرف آئے گا اور نہ اس کا انصاف مجروح ہو گا اس لئے کہ وہ جو کرے وہ اچھا اور مطابق عدل ہے اور جو نہ کرے وہ برا ہے۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ نفی عدل ہے کیونکہ اس طرح اس کے اوامر و نواہی میں نہ مصلحت کا دخل ہو گا اور نہ عدل کے تقاضوں کا۔ اس کے برعکس حسن و قبح عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ انہی چیزوں کا حکم دیتا ہے جن میں کوئی خوبی پائی جاتی ہے اور انہی چیزوں سے روکتا ہے جن میں برائی مضمر ہوتی ہے۔ لہٰذا نیکوکار کو جہنم میں ڈالنا صریحاً" ظلم ہو گا اور ظلم قبیح ہے اور بندوں کو ایسے افعال کا پابند کرنا جو ان کی طاقت سے باہر ہوں تقاضائے حکمت

کے منافی ہو گا اور جو فعل قبیح یا منافی حکمت ہو وہ اس سے سرزد نہیں ہوتا۔

اشاعرہ اپنے نظریہ کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب اللہ ہر چیز پر حق تصرف رکھتا ہے تو اس کے بعض تصرفات پر پابندی عائد کرنا اس کے دائرہ اختیارات کو محدود کر دینا ہے اور یہ اس کی شان الوہیت کے منافی ہے اشاعرہ کا یہ ایراد اس صورت میں وارد ہو سکتا تھا جب یہ کہا جاتا کہ وہ فعل قبیح یا عبث پر قادر ہی نہیں ہے اور جب کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے ظلم اور دوسرے افعال قبیحہ کا مرتکب نہیں ہوتا کیونکہ یہ چیزیں اس کی شان قدوسیت کے خلاف ہیں تو اس سے نہ اس کی قوت و قدرت محدود ہوتی ہے اور نہ اس کے تصرفات پر پابندی عائد ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

نبوت

حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لم یخل سبحانہ خلقہ من نبی مرسل او کتاب منزل او حجتہ لازمتہ او محجتہ قائمتہ رسل لا تقصر بھم قلتہ عدد ھم ولا کثرہ المکذبین لھم من سابق سمی لہ من بعدہ اوغابر عرفہ من قبلہ۔ (نہج البلاغہ)

اللہ سبحانہ نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی فرستادہ پیغمبر، آسمانی کتاب یا دلیل قطعی یا طریق روشن کے کبھی یونہی نہیں چھوڑا۔ ایسے رسول جنہیں تعداد کی کمی اور جھٹلانے والوں کی کثرت عاجز و درماندہ نہیں کرتی تھی۔ ان میں کوئی سابق تھا جس نے بعد میں آنے والے کا نام و نشان بتایا کوئی بعد میں آیا جسے پہلا پہچنوا چکا تھا۔

انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک حیوانی اور دوسرا عقلی۔ اگر انسان اپنی زندگی کا مقصد دنیوی عیش و تنعم ہی کو قرار دے لے تو اسے اختیار ہے کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ نہ اس کی نفسانی خواہشوں پر گرفت ہو گی اور نہ اس پر کوئی اخلاقی واجتماعی پابندی عائد ہو گی۔ یہ حیوانی زندگی ہے جسے انسانی و عقلی زندگی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے کو ہمہ جہتی آزاد تصور نہ کرے کہ ہر قید و بند کو توڑ کر جو چاہے کرے۔ یہ مادہ سے ماوراء عقلی و روحانی زندگی ہے جو چند حدود و قیود کی پابند ہے یہ حدود و قیود حکومتوں کے وضع کردہ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر حکومت ایسے قوانین نافذ کرتی رہتی ہے جو اخلاقی قدروں کے حامل تصور کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ قانون اور ضابطے آئے دن بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ آج اچھائی کی کچھ قدریں ہیں اور کل ان کی جگہ دوسری قدریں لے لیتی ہیں آج اچھائی اور برائی کا معیار اور ہے اور کل اور ہو گا بلکہ ایک ہی وقت میں ایک معاشرہ میں ایک چیز اچھی سمجھی

جاتی ہے اور دوسرے معاشرہ میں بری اور ایسا متحدہ لائحہ عمل جس پر تمام عقلاء روزگار متفق ہوں نہ ترتیب دیا گیا ہے اور نہ اختلاف طبائع کو دیکھتے ہوئے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی مخصوص طبقہ کو وضع قوانین کا اختیار دے دیا جائے تو وہ ایسے ہی قوانین وضع کرے گا جو اسی طبقہ کے مفاد میں ہوں گے اور اگر ہر شخص کو اس کی عقل و رائے پر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اس کے لئے وہی اچھائی ہے جسے وہ اچھا سمجھے اور وہی برائی ہے جسے وہ برا سمجھے تو پھر نہ نیکی کا کوئی معیار ہو گا اور نہ بدی کا کوئی پیمانہ۔ بلکہ ہر شخص کی اپنی اپنی رائے ہو گی اور اپنا اپنا نظریہ۔ اس کے نتیجہ میں نہ کوئی نصب العین طے پائے گا اور نہ انسانی معاشرہ میں وحدت و اجتماعیت پیدا ہو سکے گی۔ لہٰذا وحدت و اجتماعیت کے لئے ایک ایسا ضابطہ و قانون ناگزیر ہے جو آفاقی و ہمہ گیر مفاد عمومی کا حامل اور حقوق عامہ کے تحفظ کا ضامن ہو ایسا قانون اسی کی طرف سے ہو سکتا ہے جو نوع بشر کے تمام افراد کے مصالح و حکم کا احاطہ کئے ہو اور ان کے سود و زیاں کا علم رکھتا ہو اور وہ صرف خداوند عالم ہے۔ مگر وہ نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ اس سے ہم کلام ہوا جا سکتا ہے اور نہ اس سے براہ راست احکام لئے جاسکتے ہیں جیسا کہ خود اس کا ارشاد ہے۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الاو حیا او من وراء حجاب او یرسل رسلا۔

کسی آدمی کے لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ اس سے ہم کلام ہو مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا فرشتے بھیج کر۔

لہٰذا خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایسے قابل اعتماد وسائط کی ضرورت ہے جو اس سے بذریعہ وحی احکام لیں اور انہیں جوں کا توں اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ اس اخذ و ابلاغ کا نام نبوت و رسالت ہے اور ان وسائط کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ خلاق عالم نے ہر عہد میں ابلاغ احکام و اتمام حجت کے لئے انبیاء بھیجے اور زمین کا کوئی خطہ اور نبی نوع انسان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی نبی ہدایت خلق کے لئے نہ آیا ہو چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ولقد بعثنا فی کل امت رسولا۔

ہم نے ہر قوم میں ایک نہ ایک رسول بھیجا۔

قول مشہور کی بنا پر ان انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ جن میں سے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیھم السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغمبران اولوالعزم تھے۔ پہلے چاروں نبیوں کی شریعتیں ختم ہو چکی ہیں اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت ہمیشہ باقی و برقرار رہنے والی ہے۔ ان تمام انبیاء پر خواہ ان کا ذکر قرآن میں آیا ہو یا نہ آیا ہو ایمان لانا اور انہیں ہر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم سمجھنا ضروری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے اثبات کے لئے قرآن مجید اور آپؐ کی سیرت طیبہ کافی و وافی

ہیں۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس کی بے مثل فصاحت و بلاغت نے عرب کے فصحاء وادباء کی زبانوں کو گنگ کر دیا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے جب اسے خالق کے کلام کی حیثیت سے پیش کیا اس دعوی کے ساتھ کہ اس کی مثل و نظیر لاؤ تو زبان دانوں کی اجتماعی طاقتیں جواب دے گئیں اور زبان آوری کا جوہر دم توڑتا نظر آنے لگا۔ یہ عجز و درماندگی اس کا ثبوت ہے کہ یہ کلام بشری طاقت سے باہر اور آپؐ کی نبوت کا زندہ و پائندہ معجزہ ہے اسی طرح آپؐ کی سیرت آپ کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔ چنانچہ یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپؐ کی زندگی شروع سے آخر تک صداقت و حق پسندی اور دیانت و راستبازی کا مکمل نمونہ تھی۔ یہاں تک کہ کفار و مشرکین دشمنی و عناد کے مظاہرں کے باوجود آپؐ کی راستگوئی و امانت داری پر حرف رکھنے کی جرات نہ کر سکے۔ جب آپؐ کی صدق بیانی مسلم اور ہر شک و شبہہ سے بلند تر ہے تو جس نے زندگی کے کسی دور میں کوئی جھوٹی بات نہ کہی ہو اور نہ کوئی غلط کلمہ اس کی زبان سے نکلا ہو تو اس سے یہ توقع نہیں جا سکتی کہ وہ غلط بیانی سے کام لے گا یا کوئی جھوٹا دعویٰ کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا جوہر صرف صداقت و دیانت ہی نہ تھا بلکہ آپؐ کی سیرت کے جس پہلو پر نظر کی جائے وہ اتنا جذاب اور پر کشش ہے کہ ایک دنیا کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔ آپؐ کی عظمت و رفعت، شرف و فضیلت اور کمال نبوت کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات میں سے چند کلمے بطور مشتے از خروارے درج کئے جاتے ہیں جو ماخذ و حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے حلیۂ مبارک کے بارے میں فرمایا ہے۔

کان حبیبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ سملت الجبین مقرون الحاجبین ادعج العینین سہل الخدین اقنی الانف دقیق المسربہ کث اللحیتہ براق الثنایا کان عنقہ ابریق فضتہ کان لہ شعیرات من لبتہ الی رتہ ملفوفہ کانھا ضیب کافوی لم یکن فی بدنہ شعیرات غیرھالم یکن بالطویل الذاھب ولا بالقصیر النزیہ کان اذا مشی مع الناس غمر ھم نورہ و کان اذا مشی کان ینقلع من صخرا و ینحدر من صبب کان بلور الکعبین لطیف القدمین دقیق الخصر۔ (بحار الانوار ج ۱۰ ص ۵ طبع جدید)

میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی پیشانی کشادہ، ابرو پیوستہ، آنکھیں سرنگیں، رخسار نرم و ہموار، ناک ستواں، سینہ پر رؤوں کی دھاری، ریش مبارک گھنی، دانت چمکیلے، گردن لانبی جیسے چاندی کی صراحی، سینہ سے ناف تک کافور کی ڈلیوں کی طرح کے بال، اس کے علاوہ جسم مبارک پر بال نہ تھے نہ زیادہ طویل القامت تھے اور نہ زیادہ پست قد جب لوگوں کے ہجوم میں نکلتے تو آپ کا نور سب پر چھا جاتا تھا۔ چلتے تھے تو پیروں کو اوپر اٹھا کر گویا بلندی سے نیچے اتر رہے ہوں یا پانی کے بہاؤ میں بہ رہے ہوں۔ پیروں کے دونوں ٹخنے گول پیر نازک اور کمر پتلی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسلی و خاندانی رفعت و سربلندی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

حتی افضت کرامۃ اللہ سبحانہ الی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ فاخرجہ من افضل المعادن منبتا واعز الارومات مغرسا من الشجرہ التی صدع منھا انبیائہ وانتخب منھا امنائہ ۔ عترتہ خیر العتر و اسرتہ خیر الاسر و شجرتہ خیر الشجر۔ (نہج البلاغہ)

یہاں تک کہ یہ شرف الہٰی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ تک پہنچا جنہیں ایسے معدنوں سے کہ جو پھلنے پھولنے کے اعتبار سے بہترین اور ایسی اصلوں سے کہ جو نشو ونما کے لحاظ سے بہت باوقار تھیں پیدا کیا۔ اسی شجرہ سے کہ جس سے انبیاء پیدا کئے اور جس میں سے امین منتخب فرمائے۔ ان کی عترت بہترین عترت اور قبیلہ بہترین قبیلہ اور شجرہ بہترین شجرہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت و برتری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

ما براء اللہ نسمۃ خیرا من محمد صلی اللہ علیہ وآلہ۔ (فصول)

خداوند عالم نے کسی ذی روح کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ سے بہتر خلق نہیں کیا۔

آپؐ کی سادہ زندگی اور سادہ معاشرت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

لقد کان صل اللہ علیہ وآلہ یا کل علی الارض و یجلس جلستہ العبد و یخصف بیدہ نعلہ و یرقع بیدہ ثوبہ و یرکب الحمارالعاری و یردف خلفہ۔ (نہج البلاغہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اور غلاموں کی طرح بیٹھتے تھے۔اپنے ہاتھ سے جوتی ٹانکتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے اور بے پالان کے گدھے پر سوار ہوتے تھے اوراپنے پیچھے کسی کو بٹھا بھی لیتے تھے۔

آپؐ کے اخلاق و اطوار کی شائستگی اور عادات و فضائل کی پاکیزگی کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

ماصافح رسول اللہ صلی اللہ علیہ ولہ احد اقط فنزع یدہ من ید حتی یکون ھوالذی ینزع یدہ وما فاوضہ احد قط فی حاجتہ او حدیث فانصرف حتی یکون الرجل ینصرف ومانا زعہ الحدیث حتی یکون ھوالذی یسکت وما رای مقد ما رجلہ بین یدی جلیس لہ قط۔ (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی سے مصافحہ کرتے تو اس وقت تک اپنا ہاتھ الگ نہ کرتے جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ کھینچتا اور جب کوئی آپ سے کسی حاجت کے متعلق کچھ کہتا یا گفتگو کرتا تو جب تک وہ نہ پلٹتا آپ نہ پلٹتے اور جب تک وہ خاموش نہ ہوتا آپ کلام نہ کرتے اور مجلس میں اپنے کسی ساتھی کے سامنے اپنے پاؤں پھیلانا پسند نہ فرماتے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محاصر و محاسن کا شمار ہو سکتا ہے اور نہ آپؐ کی اخلاقی عظمتوں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے ایک یہودی عالم نے کہا کہ آپ اپنے ابن عم (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خصائل و اوصاف گنوائیں حضرت نے فرمایا کہ پہلے تم دنیا کی چیزوں کی گنتی بتاؤ کہا کہ دنیا کی چیزوں کا شمار ہماری قوت و طاقت سے باہر ہے فرمایا دنیا کی چیزوں کے بارے میں قدرت کا ارشاد ہے **قل متاع الدنیا قلیل** "کہو کہ دنیا کا سازو سامان تھوڑا ہے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و محاسن کے بارے میں فرمایا ہے **انک لعلی خلق عظیم** "تم خلق عظیم پر فائز ہو" جب قلیل کا احاطہ نہیں ہو سکتا تو عظیم کا شمار کیونکر ہو سکتا ہے۔

آپؐ پر نبوت کے اختتام پذیر ہونے کے بارے میں فرمایا۔

فقفی به الرسل و ختم به الوحی۔

آپ کو سب رسولوں کے آخر میں بھیجا اور آپ کے ذریعہ وحی کا سلسلہ ختم کیا۔

امامت

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اللھم لابد لک من حجج فی ارضک حجۃ بعد حجۃ یھدونھم الیٰ دینک ویعلمونھم علمک۔ (وسائل الشیعہ ج ۳ ص ۳۷۹)

بار الہا زمین میں تیرے مقرر کردہ حج میں سے ایک حجت کے بعد دوسری حجت کا ہونا ضروری ہے جو تیرے دین کی طرف لوگوں کی رہنمائی کریں اور تیرے تعلیمات سے انہیں آگاہ کریں۔

امامت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں دینی و دنیوی سربراہی کا نام ہے اور اس منصب پر فائز ہونے والا امام کہلاتا ہے۔ جس کی اطاعت و پیروی افراد امت پر واجب ہے۔ امام کے فرائض میں اسلامی مفاد کے تحفظ، شرعی احکام کے نفاذ اور اجرائے حدود کے ساتھ مسلمانوں کی عملی تربیت اور حقداروں کی حق رسی بھی داخل ہے۔ ان فرائض کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

انه لیس علی الامام الا ماحمل من امربه الابلاغ فی الموعظته والا جتهاد فی النصیحته والاحیاء للسنته و اقامته الحدود علی مستحقیها واصدار السھمان علی اھلھا(نہج البلاغہ)

امام کا فرض تو بس یہ ہے کہ جو کام اسے اپنے پروردگار کی طرف سے سپرد ہوا ہے اسے انجام دے اور وہ یہ ہے کہ پندو نصیحت کی باتیں لوگوں تک پہنچائے، سمجھانے بجھانے میں پوری پوری کوشش کرے۔ سنت کو زندہ رکھے اور جو حد کے سزا وار ہیں ان پر حد جاری کرے اور غصب کئے ہوئے حصوں کو ان کے اصلی وارثوں تک پہنچائے۔

نصب امام کے وجوب میں خوارج کے علاوہ اسلامی مکاتب فکر میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ البتہ طریق نصب میں نظریات مختلف ہیں۔ اہلسنّت کا نظریہ یہ ہے کہ امت پر نصب امام دلیل سمعی کی رو سے واجب ہے۔ معتزلہ اور زیدیہ کہتے ہیں کہ امت پر نصب امام دلیل عقلی کی بنا پر واجب ہے اور امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ امام کا تقرر منجانب اللہ ہوتا ہے اور اس میں جمہورامت کی رائے کا دخل نہیں ہے۔ امام کے منجانب اللہ تقرر پر عقل و نقل دونوں متفق ہیں۔ چنانچہ عقل قطعی طور پر بتلاتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد شریعت کے تحفظ کے لئے کسی ایسے فرد کا تقرر ضروری ہے جو احکام دین کو تبدل و تحریف اور شیرازہ اسلام کو انتشار و پراگندگی سے محفوظ رکھ سکے اور انسانی طبائع کے اختلاف اور آراء کے تباین کو دیکھتے ہوئے اسے عوام کی صوابدید پر چھوڑ دینا عمداً" افتراق و انشار اور باہمی تصادم کو دعوت دینا ہے اس لئے کہ عوام انتخابی الجھیڑوں بکھیروں میں باہمی ٹکراؤ سے بچ کر نہیں رہ سکتے اور جبکہ پہلا چناؤ جو سقیفہ بنی ساعدہ کی چار دیواری میں ہوا وہ دھینگا مشتی سے خالی نہ رہ سکا تو اور انتخابات معرکہ آرائی سے کیا خالی رہیں گے۔ پھر اکثر افراد اپنی رائے کا اظہار اسی کے حق میں کریں گے۔ جس سے ان کا مفاد وابستہ ہو گا یا کوئی خاص لگاؤ ہو گا۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس میں اہلیت و صلاحیت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ لہٰذا ایسی اکثریت کا فیصلہ جو ذاتی اغراض کی سطح سے بلند نہ ہو عقل سلیم کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں ہو سکتا پھر اکثریت کے منتخب کردہ رہنما کی رہنمائی پر اعتماد بھی تو نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جسے منتخب کیا ہے اس سے رہنمائی میں یقیناً غلطیاں ہو سکتی ہیں اور ان غلطیوں سے ہدایت کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ لہٰذا خدا کے مقرر کردہ ہی سے صحیح رہنمائی کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ اس کا ہر قول وعمل منشائے الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہوتا اور قرآن مجید بھی اس امر کا شاہد ہے کہ نصب امام اللہ سے متعلق ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔

ان علینا للھدی ہدایت کے ہم ذمہ دار ہیں۔

جب ہدایت اللہ کے ذمہ ہے تو جن افراد کے ذمہ ہدایت کا نشرو ابلاغ ہو گا ان کا تقرر بھی اللہ کی طرف سے ہونا چاہئے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہدایت اللہ کی طرف سے ہو اور ہادی کا تقرر ہمارے چناؤ پر منحصر ہو اگر ہم راہ ہدایت

کا از خود تعین نہیں کر سکتے تو ہادی و رہنما کا تقرر بھی ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہو گا چنانچہ خداوند عالم نے بندوں کے حق انتخاب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وربک یخلق مایشاء ویختار ما کان لھم الخیرہ۔

تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے ان لوگوں کو چناؤ کا کوئی حق نہیں ہے۔

جب عقل اور قرآن کی رو سے نصب امام ضروری قرار پایا تو لا محالہ اس کی معرفت اور اتباع بھی واجب ہو گا۔ اس لئے کہ اگر اس کا قول و عمل واجب الاتباع نہیں ہو گا تو اس کے نصب کرنے کا فائدہ و نتیجہ ہی کیا اور اتباع اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی معرفت نہ ہو۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام معرفت امام کے وجوب و لزوم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

انما الائمتہ قوام اللہ علی خلقہ و عرفاء ہ علی عبادہ لا یدخل الجنتہ الامن عرفھم ولا یدخل النار الامن انکرھم وانکروہ۔

بلاشبہ آئمہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے نمائندے ہیں اور اس کو بندوں سے پہچنوانے والے ہیں جنت میں وہی لوگ جائیں گے جنہیں ان کی معرفت ہو اور وہ بھی انہیں پہچانیں اور دوزخ میں وہی ڈالے جائیں گے جو نہ انہیں پہچانیں اور نہ وہ ان کو پہچانیں۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وارد ہوا ہے کہ۔

من مات ولم یعرف امام زمانہ فقد مات میتہ جاھلیتہ۔ (شرح عقائد نسفی ص ۱۱۰)

جو شخص اپنے زمانہ کے امام کو پہچانے بغیر مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہ ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں وجود امام ضروری ہے اور اس کی معرفت جاہلیت کی موت سے سپر کا کام دینے والی ہے۔ بعض افراد نے اس مقام پر امام سے قرآن مجید مراد لے کر ضرورت امام اور اس کی معرفت کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ حالانکہ لفظ امام سے قرآن کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ جس طرح لفظ قرآن سے امام کی طرف ذہنی تبادر نہیں ہوتا۔ اگر اس سے قرآن مجید مراد ہوتا تو اس معنی کی تعیین کے لئے قرینہ نصب کرنے کی ضرورت تھی اور جبکہ کوئی قرینہ نہیں ہے تو مفہوم وضعی سے عدول کرنا اور امام سے قرآن مجید مراد لینا صریحاً" دھاندلی ہے۔ جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید مراد لینے کی صورت میں ہر زمانہ کے لئے الگ الگ قرآن ماننا ہوں گے ورنہ زمانہ کی تقیید لغو اور بے معنی قرار پائے گی۔ حالانکہ قرآن ہر دور میں ایک رہا ہے اور ایک رہے گا اور زمانہ کے ساتھ اس میں تبدیلی نہیں آتی کہ یہ کہا جائے کہ فلاں

زمانہ میں فلاں قرآن اور فلاں دور میں فلاں قرآن۔ یہ زمانہ کی قید ظاہر کرتی ہے کہ امام سے مراد وہ ہادی و رہنما ہیں جو یکے بعد دیگرے آئیں گے اور ایک حجت کے بعد دوسری حجت کا ظہور ہوتا رہے گا۔ اس سلسلہ آئمہ کے کسی نہ کسی فرد کا ہر دور میں موجود ہونا ضروری ہے تاکہ حفاظت شریعت اور امت کی رہنمائی کا کام جاری رہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد گیارہ اماموں تک یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور جب پیش آنے والے حوادث و واقعات کے لئے قولی و عملی نمونے پیش کر دئے گئے تو حکمت الٰہیہ کے اقتضا نے آخری فرد کے ظہور کو آخری دور پر اٹھا رکھا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے ان آئمہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ان لیلتہ القدر فی کل سنتہ وانہ ینزل فی تلک اللیلتہ امر السنتہ و ان لذلک الامر ولاہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ قال من ھم فقال انا واحد عشر من صلبی آئمتہ محدثون (فصول ص ۴۸)

ہر سال میں ایک لیلتہ القدر ہوتی ہے اور اس شب میں سال بھر میں رونما ہونے والے امور نازل ہوتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد چند ولی امور ہوں گے (ابن عباس نے) عرض کیا کہ وہ کون ہیں فرمایا میں اور میری نسل سے گیارہ افراد جو امام و محدث ہیں۔

کتب اہلسنّت میں بھی متعدد احادیث ایسی تحریر ہیں جن میں آئمہ و خلفاء کی تعداد بارہ بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں

لا یزال الدین قائما حتی تقوم الساعتہ ویکون علیھم اثنا عشر خلیفہ کلھم من قریش (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۹)

دین ہمیشہ باقی و برقرار رہے گا یہاں تک کہ قیامت آئے اور لوگوں میں بارہ خلفاء گزریں گے جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

جابر ابن سمرہ کہتے ہیں۔

سمعت رسول اللہ قال یکون بعدی اثنا عشر خلیفہ کلھم من قریش (مسند احمد ج ۱ ص ۹۲)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے اور وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

یہ اور اس قبیل کی دوسری حدیثیں آئمہ اہلبیت کے سوا اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں اس لئے کہ اگر ان خلفاء سے خلفاء راشدین مراد لئے جائیں تو ان کی تعداد چار سے آگے نہیں بڑھتی اور اگر ان خلفاء کے ساتھ اموی خلفاء کو شامل کیا جائے تو ان کے آخری خلیفہ مروان ابن محمد پر خلفاء کی تعداد سترہ ہوتی ہے اور صرف اموی خلفاء مراد لئے جائیں تو ان کی تعداد تیرہ ہے اور اگر ان سے خلفاء بنی عباس مراد لئے جائیں تو خلفاء راشدین کو ان کے ساتھ

منسلک کرنے کی صورت میں بھی اور الگ شمار کرنے کی صورت میں بھی ان کی تعداد بارہ سے دگنی تگنی ہو جاتی ہے اور اگر ان میں سے نیک و صالح افراد کا انتخاب کر کے بارہ کی گنتی پوری کی جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان غیر صالح خلفاء کے دور کے مسلمان انہی غیر صالح اور فساق و فجار خلفاء کی معرفت اور اتباع پر مامور تھے یا یہ کہ وہ معرفت کی تکلیف سے مستثنیٰ تھے۔ پہلی صورت میں فساق و غیر صالح افراد قابل اتباع ٹھہریں گے اور یہ عقلاً" و شرعاً" قبیح اور ناقابل قبول ہے اور دوسری صورت میں عموم معرفت کا حکم اپنے عموم پر باقی نہ رہے گا۔

علمائے اہلسنّت نے خلفاء کی تعداد پوری کرنے کی راہ ڈھونڈ نکالی اور بارہ خلیفوں کی ایک فہرست ترتیب دے کر انہیں ان احادیث کا مصداق قرار دے لیا۔ چنانچہ ملا علی قاری نے خلفاء اثنا عشر کی جو فہرست پیش کی ہے وہ یہ ہے۔

الخلفاء الراشدون الاربعتہ و معاویتہ و ابنہ یزید و عبدالملک ابن مروان و اولادہ الاربعہ و بینھم عمر ابن عبدالعزیز (شرح فقہ اکبر ص ۸۴)

چاروں خلفاء راشدین (ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؑ) معاویہ اور اس کا بیٹا یزید، عبدالملک ابن مروان اور اس کے چاروں بیٹے (ولید، سلیمان، یزید اور ہشام) اور عمر ابن عبدالعزیز۔

اس فہرست پر نظر کرنے سے بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف حکومت و اقتدار کا نام خلافت رکھ دیا گیا ہے اور جو بھی برسر اقتدار آجائے وہ خلیفہ و دینی رہنما قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے اور نہ حسن عمل کی۔ بلکہ ہر فاسق و فاجر دینی قیادت کے فرائض سرانجام دے سکتا اور مسند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وارث و جانشین قرار پاسکتا ہے اور علانیہ فسق و فجور کے ارتکاب سے بھی اس کی برطرفی کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ شارح عقائد نسفی تحریر کرتے ہیں۔

لا ینعزل الامام بالفسق والجور لانہ قد ظھر الفسق وانتشر الجور من الائمتہ والامراء بعد الخلفاء الراشدین والسلف کانوا ینقادون لھم ویقمون الجمع والاعیاد باذنھم (شرح در عقائد نسفی ص ۱۱۰)

امام کو اس کے فسق و ظلم کی وجہ سے معزول نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خلفاء راشدین کے بعد آئمہ و امراء علانیہ فسق وجور کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور پہلے لوگ برابر ان کی اطاعت کرتے اور جمعہ و عید کی نمازوں میں ان کے ساتھ شامل ہوتے رہے ہیں۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ظالم و فاسق حکمرانوں کو معزول کرنے کی طاقت کے فقدان یا مصلحت و مفاد کی خاطر عوام کی خاموشی کو ایسے حکمرانوں کی امامت کے جواز کی دلیل قرار دے لیا گیا ہے اور معاویہ یزید اور ولید ایسے افراد کو

آئمہ کی صف میں شمار کیا جاتا ہے جن کے "کارہائے نمایاں" اہل نظر سے مخفی نہیں ہیں۔

یہ حکمران صرف دنیوی فرمانرواؤں کی حیثیت سے مسند حکومت پر متمکن نہ تھے بلکہ خلافت کے نام سے دینی اقتدار بھی اپنے لئے مخصوص کر چکے تھے۔ جو نسل در نسل ان کے خاندان میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ نسلی و خاندانی حکومت اور شہنشاہی و ملوکیت اسلامی نظریہ حکومت کے قطا" خلاف ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس انتخاب کے خلاف پر زور احتجاج کیا جو جمہوریت کے نام سے عمل میں آیا تھا۔ کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ یہ جمہوریت استبداد و ملوکیت کا پیش خیمہ ہے اور جب احتجاج نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا تو خاموشی کو ناگزیر سمجھ کر سکوت اختیار کر لیا اور دینی مصالح کے پیش نظر تصادم و باہم آویزی کی صورت پیدا نہ ہونے دی۔ اسی طرح دوسرے آئمہ اہلبیت کا طرز عمل بھی یہی رہا۔ انہوں نے نہ کسی سیاسی تحریک میں حصہ لیا اور نہ سیاست وقت کا ساتھ دیا' نہ کسی حکومت سے تعاون کیا اور نہ کسی حکومت کے خلاف محاذ قائم کیا اور نہ اپنے خاندان کے ان افراد کی قولا" و عملاً" ہمت افزائی کی جو حکومت وقت کے خلاف میدان میں اتر آئے تھے۔ بلکہ ایک غیر سیاسی فضا میں وہ فرائض جو بحیثیت امام ان پر عائد ہوتے تھے انجام دیتے رہے اور اپنی زندگیاں اسلامی اصولوں کے نشر اور دینی قدروں کے تحفظ کے لئے وقف کر دیں۔ وہ نہ ذاتی اقتدار کے خواہاں تھے اور نہ خاندانی حکومت کے۔ چنانچہ جب ابو مسلم خراسانی نے اموی حکومت کا تختہ الٹ کر امام جعفر صادق علیہ السلام کو حکومت کی پیشکش کی تو آپ نے اسے رد کرتے ہوئے فرمایا۔

ما انت من رجالی ولا الزمان زمانی۔ (کتاب الملل و النحل ص ۱۵۴)

تم نہ میرے آدمی ہو اور نہ زمانہ کے حالات میرے سازگار ہیں۔

اگر امام علیہ السلام کے پیش نظر شخصی یا خاندانی حکومت کا قیام ہوتا تو حکومت قبول کر لیتے یا علویین کی تائید کر کے خاندانی حکومت کی داغ بیل ڈال دیتے۔ مگر پہلی صورت میں حکومت کی پیشکش کرنے والے دنیوی طرز پر تشکیل حکومت کے خواہاں تھے تاکہ ذاتی مفادات حاصل کر سکیں اور یہ ذاتی مفادات اور غلط مقاصد حکومت الٰہیہ کے قیام میں مانع ہوتے اور دوسری صورت میں اولاد علی علیہ السلام کی حکومت تو قائم ہو جاتی مگر حکومت الٰہیہ جس کے آئمہ اہلبیت داعی تھے قائم نہ ہوتی اور آئمہ اہل بیت کا مقصد الٰہی حکومت کو بروئے کار لانا تھا نہ انسانی حکومت کو اور الٰہی حکومت الٰہی نمائندوں ہی کے ذریعہ قائم ہو سکتی ہے۔ اس لئے جہاں دینی قیادت امام سے متعلق ہے وہاں دنیوی امارت بھی امام کا حق ہے تاکہ دین و سیاست کی راہیں الگ الگ نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ جب امیرالمومنین علیہ السلام کو امارت کے ساتھ ظاہری اقتدار بھی حاصل ہوا تو آپؑ نے فرمایا۔

الان اذرجع الحق الی اھلہ و نقل الی منتقلہ۔ (نہج البلاغہ)

اب وہ وقت آیا ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹا ہے اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہوا ہے

لیکن یہ تسلط و اقتدار امامت کے لئے شرط نہیں ہے اور نہ عدم اقتدار سے منصب امامت متاثر ہوتا ہے اگر

اقتدار ہی دلیل امامت ہے تو پھر خلافت و امامت کو تیس سال کی مدت میں محدود کیوں سمجھ لیا گیا جب کہ اس کے بعد بھی اموی و عباسی فرمانروا برسر اقتدار آتے رہے اور ان کے اقتدار کو دلیل خلافت قرار دینے کے بجائے ملک عضوض کہا جاتا ہے اور ان کی حیثیت دنیوی فرمانرواؤں سے زیادہ تسلیم نہیں کی جاتی۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی امامت و خلافت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور ان نصوص کو نظرانداز کر کے اقتدار کو دلیل امامت قرار دے لینا صحیح فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی خلافت و امامت کے سلسلہ میں چند دلائل جو نصوص کا درجہ رکھتے ہیں تحریر کئے جاتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت عشیرہ کے موقع پر فرمایا۔

ان ھذا اخی ووصیی و خلیفتی فیکم فاسمعوالہ واطیعوا (تاریخ طبری ج ۲ ص ۶۳)

یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرا جانشین ہے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امیرالمومنین علیہ السلام کی وصایت و خلافت اور ان کے مفترض الطاعت ہونے کی واضح دلیل ہے۔

غزوہ تبوک کی طرف جاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسی الاانہ لانبی بعدی (صحیح بخاری ج ۳ ص ۵۴)

(اے علی) کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ آپ نبوت کے علاوہ ان تمام مدارج و مراتب پر فائز تھے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل تھے ان مراتب میں نمایاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وزارت و جانشینی کا مرتبہ ہے

چنانچہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد ہے۔

واجعل لی وزیرا من اھلی ھارون اخی اشدد بہ ازری و اشرکہ فی امری کی نسبحک کثیرا و نذکرک کثیرا انک کنت بنا بصیرا

میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر قرار دے اس کے ذریعہ میری پشت قوی کر اور میرے کام میں اسے میرا شریک بنا تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تجھے یاد کریں اور تو ہماری حالت کا نگراں ہے۔

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا کرتے رہے فرمایا۔

قداو تیت سؤلک یا موسی اے موسیٰ تمہارا سوال پورا کر دیا گیا

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں دعا فرمائی۔ چنانچہ اسماء بنت عمیس کہتی ہیں۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول اللھم انی اقول کما قال اخی موسی اللھم اجعل لی وزیرا من اھلی اخی علیا اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کی نسبحک کثیرا و نذکرک کثیرا انک کنت بنا بصیرا (مرقاہ شرح مشکواہ ج ۱۱ ص ۳۴۷)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اے اللہ میں بھی وہی درخواست کرتا ہوں جو میرے بھائی موسیٰ نے کی تھی اے اللہ میرے اہل میں سے میرے بھائی علی کو میرا وزیر بنا اس کے ذریعہ میری پشت مضبوط کر اور میرے کاموں میں اسے میرا شریک ٹھہرا تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تجھے یاد کریں اور تو ہماری حالت دیکھ ہی رہا ہے۔

لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نیابت و وزارت آپ ہی کے پائے نام ہونا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حجتہ الوداع سے پلٹتے ہوئے ایک اجتماع کثیر میں منبر پر بلند ہو کر فرمایا۔

ایھالناس انی تارک فیکم امرین لن تضلوا ان اتبعتمو ھما و ھما کتاب اللہ واھل بیتی عترتی (ثم قال) اتعلمون انی اولی بالمومنین من انفسھم (ثلث مرات) قالو انعم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من کنت مولاہ۔ فعلی مولاہ (متدرک حاکم ج ۳ ص ۱۱۰)

اے لوگو میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ اللہ کی کتاب اور میرے اہلبیت ہیں جو میری عترت ہے (پھر فرمایا) کیا تم جانتے ہو کہ میں مومنین کے نفسوں پر ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہوں (یہ جملہ تین مرتبہ فرمایا) سب نے کہا کہ ہاں اس اقرار کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا میں مولا و آقا ہوں اس کے علی بھی مولا و آقا ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علی علیہ السلام کے مولا ہونے کے اعلان سے پہلے اپنے اولی بالتصرف ہونے کا اقرار لیا تاکہ ذہنوں میں یہ الجھاؤ پیدا نہ ہونے پائے کہ یہاں مولا کے معنی اولی بالتصرف کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتے ہیں۔ اگر یہاں دوست مددگار وغیرہ معنی مراد ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس اعلان سے قبل اپنی

اولویت کا اقرار لینے کی ضرورت ہی کیا تھی اور دوسرے عدم ضلالت کو اہل بیت کے اتباع سے وابستہ کرنے کے بھی یہی معنی ہیں۔ اس لئے کہ جو واجب الاتباع ہو گا وہ اولی بالتصرف حاکم اور امام بھی ہو گا صرف لفظیں الگ الگ ہیں مفہوم دونوں کا ایک ہے۔

ان نصوص کے علاوہ وہ تمام اوصاف بھی بدرجہ اتم آپؑ میں موجود تھے جو امامؑ کے لئے ضروری اور اس کے شایان شان ہیں۔ چنانچہ ان اوصاف میں سے ایک صفت عصمت ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ امام قوانین الٰہیہ کا نگراں اور احکام شرعیہ کا پاسبان ہوتا ہے اور اس فریضہ سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ معصوم ہو۔ اگر خطاکار وغیر معصوم ہو گا تو اس کا غلط طرز عمل احکام شریعت پر اثر انداز ہو کر مفاد امامت کو مجروح کر دے گا اور احکام تغیرو تبدل سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اگر ابلاغ شریعت کے پیش نظر نبی کے لئے عصمت ضروری ہے تو تحفظ شریعت کے پیش نظر امام کے لئے بھی عصمت لازمی ہو گی۔ ان دلائل سے قطع نظر کرتے ہوئے جو حضرتؑ کی عصمت پر شاہد ناطق کی حیثیت رکھتے ہیں صرف آپؑ کی زندگی پر نظر کر لینا ہی آپؑ کی عصمت کے اثبات کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ زندگی کے ابتدائی لمحوں سے لے کر عمر کی آخری ساعتوں تک آپؑ کا کوئی قول و فعل ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جو منافی عصمت ہو بلکہ دشمن و معاند سیاسی اختلاف کے باوجود آپؑ کی پاکدامانی اور بے داغ کردار کا اعتراف کرتے رہے ہیں امیرالمومنین علیہ السلام خود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی عصمت کا شاہد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ماوجد لی کذبتہ فی قول ولا خطلتہ فی عمل (نہج البلاغہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو میری کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ پایا اور نہ میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کے کسی قول یا فعل کو غلط سمجھا ہوتا تو منصب نبوت اور تربیت کی ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ آپؑ کو غلط روش پر متنبہ کرتے اور قول و عمل کی اصلاح فرماتے۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کے خلاف کوئی بات آپؑ کی زبان سے نکلی ہو یا کوئی ایسا فعل سرزد ہوا ہو جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنبیہہ کی ضرورت محسوس کی ہو۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کے ہر قول و عمل کو بنظر استحسان دیکھا اور اس پر تحسین و آفرین کی۔

دوسری صفت علم ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ امام کے فرائض میں شرعی احکام کا بیان' مشکل مسائل کا حل' قضایا کا تصفیہ اور مذاہب باطلہ کی رد بھی داخل ہے اور اس کے لئے مختلف علوم پر احاطہ ضروری ہے اور فصل قضایا میں تو ہر قسم کے علم کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اگر امام علم سے عاری اور مسائل ضروریہ سے بھی ناواقف ہو تو وہ دوسروں کی علمی و دینی رہنمائی سے قاصر رہے گا اور اگر افراد امت میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھتا ہو گا تو پھر

اسے استحقاق امامت ہونا چاہئے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ صحابہؓ میں کوئی بھی آپ کے علمی پایہ تک نہ پہنچ سکا۔ لہٰذا جو اعلم ہو گا وہی امامت اور امت کی قیادت کا اہل ہو گا۔

تیسری صفت ہر جہتی فضیلت ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر کسی صفت میں بھی کوئی اس سے بڑھ کر ہو گا تو اس صفت سے متعلقہ امور کی انجام دہی میں اس کی صوابدید کا پابند ہو گا اور اس صورت میں متبوع ہونے کی بجائے تابع قرار پائے گا اور فاضل کو نظرانداز کرنے سے ترجیح مفضول لازم آئے گی جو عقلاً" قبیح ہے اور ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ انتخاب سے جوہر فضیلت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جاہل منتخب ہو گا تو وہ جاہل ہی رہے گا اور ظالم منتخب ہو گا تو اس کی طبیعت کا تقاضا بدل نہ جائے گا اور فاسق منتخب ہو گا تو انتخاب اس کے اندر صفت عدالت پیدا نہیں کرے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقتدار کی طاقت اسے اور خود سر و مطلق العنان بنا دے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی افضلیت اتنی واضح و آشکارا ہے کہ اس سے وہی انکار کر سکتا ہے جو جوہر پاروں اور سنگریزوں میں امتیاز کرنے سے قاصر ہو۔ چنانچہ تاریخ و حدیث کے صفحات آپ کے فضائل سے چھلک رہے ہیں ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں۔

قال احمد ابن حنبل و اسمعیل ابن اسحق القاضی لم یرو فی فضائل احد من الصحابہ تالا سایند الحسان ماروی فی فضائل علی ابن ابی طالب(استیعاب ج ۲ ص۴۶۶)

احمد ابن حنبل اور اسمٰعیل ابن اسحاق قاضی کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے کسی ایک کے بارے میں اتنے فضائل وارد نہیں ہوئے جتنے صحیح السند علی ابن ابی طالب کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔

غرض امیرالمومنین علیہ السلام اور آئمہ اطہار علیہ السلام جو ہر دور میں اپنے علم و عمل اور فضل و کمال میں منفرد حیثیت کے مالک تھے مقاصد دینیہ کی تکمیل کا فریضہ ادا کرتے رہے اور یہی ان کے منصب امامت کا تقاضا تھا۔ انہوں نے مصیبتوں پر مصیبتیں اٹھائیں، قید و بند کی سختیاں جھیلیں مگر اسلام کے قیام و بقا اور دینی اقدار کے تحفظ میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور اپنے قول و عمل سے رہنمائی فرماتے رہے۔ یہ انہی کی فرض شناسی کا نتیجہ ہے کہ عصبیت و عناد کا غبار اسلام کے صحیح نقوش کو چھپا نہ سکا اور مخالف کی تند و تیز آندھیاں شمع ہدایت کو بجھا نہ سکیں۔

~~ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔

معاد

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اذا رجفت الراجفتہ و حقت بجلا ھا القیامتہ لحق بکل منسک اھلہ و بکل معبود عبدتہ وبکل مطاع اھل طاعتہ فلم یحز فی عدلہ و قسطہ یوئذ خرق بصر فی الھواء ولا ھمس قدم فی الارض الابحقہ۔
(نہج البلاغہ)

جب زمین زلزلہ میں اور قیامت اپنی ہولناکیوں کے ساتھ آجائے گی اور ہر عبادتگاہ سے اس کے پجاری' ہر معبود سے اس کے پرستار اور ہر پیشوا سے اس کے مقتدی ملحق ہو جائیں تو اس وقت فضامیں شگاف کرنے والی نظراور زمین میں قدموں کی ہلکی چاپ کا بدلہ بھی اس کی عدالت گستری و انصاف پروری کے پیش نظر حق و انصاف سے پورا پورا دیا جائے گا۔

دنیا میں کوئی چیز اتنی یقینی نہیں ہے جتنی یقینی و حتمی چیز موت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اسے لفظ یقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

واعبد ربک حتی یا تیک الیقین۔

اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہو یہاں تک کہ تمہارے پاس یقین (موت) آئے

یہ زندگی جو نفس کی آمد و شد پر قائم ہے چراغ سرراہ ہے جسے موت کا جھونکا ایک نہ ایک دن بجھا دے گا۔ جو آئے وہ گزر گئے اور جو ہیں وہ گزر جائیں گے۔ گویا آنا جانے کی تمہید اور پیدا ہونا مرنے کا پیش خیمہ ہے۔ خالق موت و حیات کے سوا سب کو مرنا اور فنا سے ہمکنار ہونا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

کل شئی ھالک الاوجہہ

ذات الہٰی کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

یہ زندگی دم توڑ کر ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔ یہ زندگی عمل کی زندگی ہے اور وہ زندگی جزا و مکافات کی زندگی ہے اور اس کا بگڑنا سنورنا یہاں کے اعمال پر منحصر ہے۔ چنانچہ خلاق عالم ایک دن سب اگلے پچھلے مرنے والوں کو زندہ کرے گا اور حساب و کتاب کے بعد نیک اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا دے گا۔ چنانچہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

ومن یعمل مثقال ذرہ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرہ شرا یرہ

جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ نیکی دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی وہ بدی دیکھے گا۔

اس حشرو نشراور زندگی کی بعد موت کا نام معاد ہے۔ یہ عقیدہ اسلام کے تمام مکاتب فکر کا متفقہ عقیدہ ہے

بلکہ دوسرے مذاہب بھی کسی نہ کسی اعتبار سے قانون مکافات اور نتائج اعمال کے قائل ہیں۔ اگر اختلاف ہے تو صرف طریق کار میں۔ چنانچہ ہنود اور بدھسٹ اواگون کے قائل ہیں اواگون کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتیجہ میں مختلف جونیں بدلتا ہے۔ اگر اس کے اعمال اچھے ہوتے ہیں تو دوبارہ پیدا ہو کر خوشحال و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے اور برے اعمال ہوتے ہیں تو فقر و افلاس اور دریوزہ گری کی زندگی گزارتا ہے یا کسی حیوان کی جون میں جنم لے کر اپنے کئے کی سزا بھگتتا ہے۔ بدھسٹوں کے ہاں یہ سلسلہ نروان (مبداء اول سے اتصال) تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور ہنود کے ہاں یہ سلسلہ کہیں بھی ختم ہونے میں نہیں آتا ہے۔ یہ عقیدہ جیسا کچھ بھی ہے ظاہر ہے تاہم جزاو سزا کا تصور موجود ہے۔ عیسائیوں کے ہاں بھی بنیادی طور پر حشر و نشر کا عقیدہ موجود ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ نظریہ بھی قائم کر لیا ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر چڑھ کر ان کے اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو چکے ہیں جس کے بعد ان سے اعمال کی باز پرس ہو گی اور نہ پاداش گناہ کی سزا۔ صرف اعتراف گناہ نجات کے لئے کافی ہے۔ یہاں بھی عقیدہ معاد کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ قدیم فلاسفہ میں بھی ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے اس عالم کے ماوراء دوسرے عالم کی نشان دہی کی ہے۔

البتہ فلاسفہ کے ایک گروہ نے حیات بعدالموت کو عقلی اعتبار سے ناممکن بتایا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو وہ معدوم ہو جاتا ہے اور اعادہ معدوم محال ہے یہ نظریہ ان کے واہمہ کی پیداوار ہے اور حشر و نشر کو اعادہ معدوم سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ اس لئے کہ موت عدم کا نام نہیں ہے بلکہ صرف روح و بدن کی علیحدگی اور اجزاء کی پراگندگی کا نام ہے اور حشر و نشر کے موقع پر انہی پراگندہ اجزاء کو یکجا کر دیا جائے گا اور اللہ کی قدرت کاملہ کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ وہ متفرق اجزاء کو جمع کر کے ان میں از سر نو زندگی دوڑا دے اور قدرت نے اس کی ایک جھلک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اعجاز نمائی کے سلسلہ میں دکھا بھی دی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

واذ قال ابراہیم رب ارنی کیف تحیی الموتی قال اولم تومن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی قال فخذ اربعتہ من الطیر فصر ھن الیک ثم اجعل علی کل جبل منھن جزوا ثم ادعھن یاتینک سعیا۔

اس واقعہ کو یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو مجھے دکھا دے کہ تو کیونکر مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تمہیں اس کا یقین نہیں۔ کہا یقین تو ہے لیکن اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ فرمایا چار پرندے لو اور انہیں ذبح کرو پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک ٹکڑا ڈال دو اس کے بعد انہیں آواز دو وہ سب کے سب دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے۔

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار مختلف قسم کے پرندے لئے انہیں ذبح کرنے کے بعد ان کے ٹکڑے کئے اور ان ٹکڑوں کو آس پاس کی چوٹیوں پر ڈال دیا اور اس کے بعد انہیں پکارا تو منتشر و پراگندہ اجزاء میں قوت پرواز پیدا ہوئی اور ایک جزو دوسرے جزو سے اس طرح پیوست ہوا کہ ہر پرندہ اپنی پہلی شکل و صورت پر آگیا۔ جس طرح ان بے روح پرندوں کے اجزاء معدوم نہیں ہوئے اسی طرح انسان مرنے کے بعد اگرچہ حیات سے محروم ہو جاتا ہے مگر اس کے اجزاء کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے ہیں خداوند عالم انہی متفرق و پراگندہ اجزاء کو جمع کرے گا اور جس طرح پہلے ان میں روح دوڑا کر انہیں زندگی دی تھی اسی طرح دوبارہ انہیں زندہ کرے گا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

قال من یحیی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاھا اول مرہ۔ وہ کہنے لگا کہ ان ہڈیوں کو جو گل سڑ گئی ہیں کون زندہ کر سکتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ زندگی بخشی تھی۔

جو شخص توحید و رسالت کا عقیدہ رکھتا ہے اس کے لئے معاد کا عقیدہ رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے انہوں نے اللہ کی طرف سے اچھے کاموں کے بجا لانے کا حکم دیا اور برے کاموں سے منع کیا۔ لہذا جنہوں نے اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اچھے کام کئے ان کو جزا ملنا چاہئے اور جنہوں نے اس کے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے برے کام کئے ان کی کوئی سزا ہونا چاہئے اور اگر جزا و سزا نہ ہو تو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ انبیاء و مرسلین بھیجے جائیں اور اگر بھیجے ہی گئے تو اس کا ہماری عملی زندگی پر کیا اثر۔ جبکہ ان کی بات ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں اور پھر اللہ کو مانا جائے تو کیوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا جائے تو کس لئے جب کہ ہمارے افعال و اعمال کا نہ محاسبہ ہونا ہے نہ اچھائیوں کا کوئی انعام ہے اور نہ برائیوں پر سزا و عقوبت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دنیا ہی میں انسان کو اس کے اچھے اور برے کاموں کا بدلہ مل جاتا ہے تو بیشک بعض مجرموں کو اپنے کئے کی سزا دنیا میں مل جاتی ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے بے گناہ شخص کو قتل کر دیتا ہے اور اس خون ناحق کے باوجود قانون کی گرفت سے بچا رہتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کے خرمن میں آگ لگا دیتا ہے اور اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ ایک ایمانداری کو اپنا شعار بناتا ہے اور فقر و افلاس اور بدحالی میں مبتلا رہتا ہے اور دوسرا غصب و خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اور بڑے ٹھاٹ سے زندگی گزارتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مجرموں کو ان کے جرائم اور جرائم پر مرتب ہونے والے اثرات کی سزا دنیا میں نہیں ملتی۔ لہذا عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ ایک رب عالم ہونا چاہئے جہاں انسان کو بدی کی قرار واقعی سزا اور نیکی کا پورا پورا صلہ مل سکے۔

بعض لوگوں کی یہ بھی ذہنی اپج ہے کہ انسانی ضمیر کی تحسین و سرزنش ہی انسان کے افعال کی جزا و سزا ہے۔ چنانچہ جب انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا ضمیر اس کی تحسین کرتا ہے اور کوئی برا کام اس سے سرزد ہوتا ہے تو

اس پر ملامت کرتا ہے اور یہ تحسین نیکی کا اجر اور یہ سرزنش برائی کا بدلہ ہے جو اسی دنیا میں اسے مل جاتا ہے۔ للٰذا جزا و سزا کو آخرت پر اٹھا رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ خیال سراسر فاسد ہے اس لئے کہ ایک شخص کا ضمیر جس فعل پر اس کی ملامت کرتا ہے اسی فعل پر دوسرے کی تحسین کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک چیز قابل تحسین بھی ہے اور لائق سرزنش بھی۔ دوسرے یہ کہ جب انسان پہلی دفعہ کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اور جب دوبارہ اس کا مرتکب ہوتا ہے تو ملامت میں اتنا زور نہیں رہتا جتنا پہلی دفعہ تھا اور جوں جوں اس جرم کو دہرایا جاتا ہے ملامت کم ہوتی جاتی ہے۔ اگر اس ضمیر کی ملامت کو سزا سمجھ لیا جائے تو چاہئے یہ تھا کہ جوں جوں جرم میں اضافہ ہوتا سزا بھی بڑھتی جاتی مگر یہاں اس کے برعکس جرم بڑھتا جاتا ہے اور سزا گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب جرم کی عادت مستحکم ہو جاتی ہے تو سزا ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ضمیر کی تحسین و سرزنش جزا و سزا نہیں ہے بلکہ تحسین نیکیوں کی محرک اور سرزنش برائیوں پر ایک تنبیہہ ہے۔

عقیدہ معاد صرف نظریاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ ہماری دنیوی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان اگر یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے جس میں اچھے اور برے کاموں کا محاسبہ ہوگا تو وہ عواقب و نتائج کو نظر انداز کر کے اپنے اعمال کا رخ متعین نہیں کرتا بلکہ جہاں دنیا کے سود و زیاں پر نظر رکھتا ہے وہاں دائمی نفع و نقصان پر بھی نظر رکھے گا اور اگر یہ نظریہ قائم کرلے کہ بس یہی زندگی ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں ہے نہ حساب و کتاب ہے نہ زندگی کا احتساب نہ اطاعت کی جزا ہے اور نہ معصیت کی سزا تو اس کا طرز عمل ہر قید و بند سے آزاد ہوگا نہ اس کے لئے کوئی نیکی کا محرک رہے گا اور نہ بدی سے کوئی مانع۔ اگرچہ معاشرہ کا خوف اور قانون کا ڈر ایک حد تک نیکیوں کا محرک اور برائیوں سے سد راہ ہوتا ہے مگر جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو اور نہ قانون ہی اپنی گرفت میں لے سکتا ہو وہاں اخروی باز پرس کا ڈر ہی برائیوں سے مانع ہو سکتا ہے۔ اگر سزا کا خوف انسان کے ذہن پر محیط نہ ہو تو وہ برائیوں سے بچنے کی کوشش نہیں کرے گا اور جزا کی توقع نہ ہو تو نیکیوں میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی کہ گناہ کی وقتی لذتوں سے منہ موڑ کر ان نیکیوں کو اختیار کرے جن پر کوئی نتیجہ و اثر مرتب ہونے والا نہیں ہے۔

علی علیہ السلام اور قرآن

امیرالمومنین علیہ السلام ترجمان قرآن اور پاسبان حریم کتاب اللہ تھے دونوں ایک منزل کے راہ سپار اور ایک مقصد کے علمبردار تھے اور اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہے کہ ایک لحہ کے لئے بھی ان میں جدائی تجویز نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

علی مع القران والقران مع علی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۲۴)

علی علیہ السلام قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی علیہ السلام کے ساتھ ہے یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں۔

اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(ا) علی علیہ السلام اور قرآن ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے بے نیاز تصور نہیں کیا جا سکتا۔ علی علیہ السلام قرآن کے تعلیمات و معارف سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور قرآن اپنے مجملات و متشابہات میں علی علیہ السلام کی ترجمانی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا کیونکہ قرآن کا ہر اجمال تفصیل کا اور ہر ابہام تشریح کا محتاج ہے اور عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ متشابہات کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کر کے قرآن کی صحیح مراد تک پہنچ سکیں بلکہ ان کے معنی و مطلب کو وہی بیان کر سکتا ہے جسے علم میں رسوخ و پختگی حاصل ہو۔ چنانچہ ارشاد الہی ہے۔

هوالذی انزل علیک الکتاب منه ایات محکمات من ام الکتاب و اخر متشابهات فاماالذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ماتشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الاالله والراسخون فی العلم۔

وہی وہ خدا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی اس میں کچھ آیتیں محکم ہیں جو کتاب کی بنیاد ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ انہی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں تاکہ فتنہ و انتشار پھیلائیں اور انہیں اپنے من مانے معنی پہنائیں حالانکہ اللہ اور ان لوگوں کے علاوہ جنہیں علم میں پختگی حاصل ہے ان کے اصلی معنی و مطلب کو کوئی نہیں جانتا۔

قراء میں کا ایک گروہ آیہ **وما یعلم تاویله الاالله** میں اللہ پر وقف کرتا ہے اور **والراسخون فی العلم** کا تعلق آیہ **مابعد یقولون امنابه** سے مانتا ہے۔ اس صورت میں علم تاویل اللہ سے مختص قرار پائے گا جس پر اس نے کسی کو مطلع نہیں کیا مگر اس صورت میں ان آیات کی افادیت ختم ہو جائے گی اور ان کے نازل کرنے کا کوئی مقصد و مفاد نہ رہے گا۔ جب ان کا معنی و مفہوم سمجھا ہی نہیں جا سکتا تو انہیں نازل کرنا ایک فعل عبث ہو گا اور چونکہ اللہ سے فعل عبث صادر نہیں ہوتا لہٰذا ان میں کوئی مقصد بھی کارفرما ہو گا اور اس مقصد تک رسائی کے لئے ان آیات کے معانی و مطالب کے جاننے والوں کی ضرورت ہے اور وہ وہی لوگ ہیں جنہیں آیت میں راسخون فی العلم کہا گیا ہے اور وہی قرآن کے حقائق کے اور اس کی تاویل کے جاننے والے ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں عقل بھی یہی فیصلہ کرتی ہے کہ

ایسے افراد کا وجود ناگزیر ہے جو تاویل کا صحیح علم رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ یہ آیت صریحاً" بتلاتی ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی رائے سے آیتوں کا مفہوم متعین کرتے اور ان کی غلط سلط تاویل کر کے لوگوں کو بہکاتے اور فتنہ و انتشار پھیلاتے ہیں اگر ان کج ذہن لوگوں کے مقابلہ میں ایسے افراد موجود نہ ہوں جو صحیح تاویل کی طرف رہنمائی کرنے والے ہوں تو پھر ان غلط کار اور گمراہ لوگوں کے علاوہ کون رہ جاتا ہے کیا اس سے اللہ کی حجت ناتمام نہ رہے گی کہ خود ساختہ تاویلوں کا سہارا لے کر ضلالت و گمراہی پھیلانے والے تو ہوں اور اس ضلالت و فتنہ انگیزی کا سد باب کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر عربی دان راسخ فی العلم ہے اور ان آیتوں کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھ سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ تاویل کے سلسلہ میں اختلاف ہوتا اور مختلف و متضاد اقوال جمع ہو جاتے۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ سب متضاد اقوال صحیح و درست ہیں اور جو بھی اپنے دل سے کوئی تاویل گھڑ لے اور آیتوں کے معنی اپنے مطلب پر ڈھال لے وہ صحیح ہی ہوں گے اگر ایسا ہو تو صحیح و غلط کا امتیاز ختم ہو جائے گا اور تمام فرق باطلہ کو حق پر ماننا ہو گا اس لئے کہ وہ اپنے نظریات کی بنیاد تاویل ہی پر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشبہ اور مجسمہ **الرحمن علی العرش استوی، واضع الفلک باعیننا، یداللہ فوق ایدیھم** وغیرہ آیات سے اپنے عقائد پر دلیل لاتے ہیں اور جبریہ اپنے نظریہ جبر پر آیتہ **خالق کل شئی** سے استدلال کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر تاویل صحیح اور قابل تسلیم نہیں ہو سکتی ان حالات میں ایسی ہستیوں کا وجود ضروری ہے جنہیں قرآن کا ہر جہتی علم ہو اور اس کی صحیح تاویل سے آگاہ ہوں۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے فرض منصبی کے پیش نظر ان ہستیوں کی نشان دہی فرمائی اور انہیں قرآن کا قرین و عدیل اور اس کے اسرار و رموز کا خزینہ دار قرار دیا تاکہ غلط اور صحیح تاویل کے سلسلہ میں ان کی طرف رجوع کیا جا سکے ارشاد نبوی ہے۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ واھل بیتی و انھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۴۸)

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میرے اہل بیت یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں

اور امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں صراحتہ" فرمایا۔

یاعلی انا صاحب التنزیل و انت صاحب التاویل (فصول عالی ص۸۸)

اے علی علیہ السلام میں صاحب تنزیل ہوں اور تم صاحب تاویل ہو۔

امیرالمومنین علیہ السلام خود ہی فرمایا کرتے تھے۔

ھذا کتاب اللہ الصامت وانا کتاب اللہ الناطق (فصول ص ۷۷) وہ خاموش کتاب ہے اور میں بولتا ہوا قرآن ہوں۔

چنانچہ آپؑ کا ہر قول قرآن کا ترجمان اور ہر عمل قرآن کی عملی تفسیر تھا اور انہی قرآنی تعلیمات کے نشرو فروغ کے لئے آپؑ کی زندگی کے لمحات وقف تھے انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں منکرین تنزیل سے پیہم جہاد کئے جو قرآن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکا خود ساختہ کلام سحرو جادو کا کرشمہ اور اساطیر الاولین کہتے تھے اور اپنے زمانہ خلافت میں منکرین تاویل مارقین قاسطین اور ناکثین سے مسلسل جنگیں لڑیں جنہوں نے قرآن کے صحیح تعلیمات کو نظرانداز کر کے اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان منکم من یقاتل علی تاویل القران کما قاتلت علی تنزیلہ (مسند احمد ابن حنبل ج ۳ ص ۸۲) تم میں وہ بھی ہے جو تاویل قرآن پر جنگ کرے گا جس طرح میں نے تنزیل پر جنگ کی ہے۔

اس پر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا وہ ہم ہیں فرمایا نہیں بلکہ وہ ہے جو جوتیاں گانٹھ رہا ہے اور اس وقت حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوتے گانٹھ رہے تھے۔

(۲) تاویل کے لئے تنزیل سے آگاہی ضروری ہے کیونکہ علم تنزیل کے بغیر نہ ناسخ و منسوخ کا پتا چل سکتا ہے اور نہ مجمل و مبین کا، نہ عام و خاص کا علم ہو سکتا ہے اور نہ مطلق و مقید کا، اگر علم تنزیل کے بغیر تاویل کی جائے گی تو تنزیل میں تحریف و تبدل اور تاویل میں غلطی کا امکان رہے گا۔ لہذا جو تاویل سے تماما" و کمالا" آگاہ ہو گا وہ تنزیل سے بھی پوری طرح باخبر ہو گا۔ حضرت علی علیہ السلام جو حسب ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمتاویل کے عالم تھے وہ تنزیل سے بھی پوری طرح آگاہ ہوں گے۔ اگر ایک آیت ایک لفظ اور ایک حرف سے بھی بے خبر فرض کئے جائیں تو نہ ان کی تاویل قابل اعتماد قرار پائے گی اور نہ مکمل قرآن کا ساتھ باقی رہے گا۔ حضرت علی علیہ السلام تنزیل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

سلونی عن کتاب اللہ فواللہ مامن ایتہ الاوانااعلم اللیل نزلت ام بنھار ام فی سھل ام فی جبل (اتقان ج ۲ ص ۳۱۹) کتاب اللہ کے متعلق مجھ سے پوچھو خدا کی قسم میں قرآن کی ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، ہموار زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

(۳) قرآن مجید تمام علوم پر حاوی ہے خواہ شریعت سے متعلق ہوں یا معیشت سے اخلاق سے متعلق ہوں یا

سیاست سے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی۔

ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔

لہٰذا امیرالمومنین جو عدیل قرآن ہیں ان کا دائرہ علم بھی قرآن کے دائرہ علم کی وسعتوں تک پھیلا ہوا ہو گا۔ اگر کسی علم کی حضرتؑ سے نفی کی جائے تو قرآن کو بھی اس علم سے خالی ماننا پڑے گا۔ حالانکہ قرآن تمام علوم کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوے ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

مامن شئی تطلبونہ الا وھو فی القرآن فمن اراد ذلک فیسالنی عنہ (وسائل)

کوئی چیز ایسی نہیں جس کی تمہیں تلاش ہو اور وہ قرآن میں نہ ہو لہٰذا جو اس کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ مجھ سے پوچھ لے۔

(۴) قرآن اللہ کا کلام اور رشد و ہدایت کا پیغام ہے۔ اس میں نہ ضلالت کا شائبہ ہو سکتا ہے نہ خطا و لغزش کا گزر اور نہ غلطی کا امکان اور جو ہمہ وقت قرآن کے ساتھ ہو گا وہ بھی خطاو لغزش سے بری اور گناہ سے پاک ہو گا۔ اگر اس کے لئے خطا و بے راہروی تجویز کی جائے گی تو اسے قرآن سے جدا ماننا پڑے گا۔ لہٰذا جس طرح قرآن محفوظ عن الخطا ہے اسی طرح علی علیہ السلام بھی معصوم عن الخطا ہوں گے اور دونوں طہارت و پاکیزگی اور عظمت و رفعت میں مساوی قرار پائیں گے۔

(۵) قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی دلیل اور ان کی نبوت کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔ اسی طرح علی علیہ السلام برہان نبوت اور معجزہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ نہ قرآن کی کوئی مثال ہو سکتی ہے اور نہ علی علیہ السلام کی کوئی نظیر۔ دونوں اعجازی لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہیں۔ شیخ شہاب الدین تحریر کرتے ہیں۔

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکرم اللہ وجہہ ایتہ من ایات اللہ و معجزہ من معجزات رسول اللہ (مستطرف ج ۱ ص ۱۲۱)

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ' اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت اور رسول اللہ کے معجزوں میں سے ایک معجزہ تھے۔

(۶) قرآن مجید سراپا حق اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس و انزل الفرقان۔

اس نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے توریت و انجیل نازل کی اور حق و باطل میں تمیز دینے والی کتاب اتاری۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کی ذات ایمان و نفاق میں تمیز کرنے والی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لا یحبک الا مومن ولا یبغضک الا منافق (مسند احمد ج ۱ ص ۹۵)

اے علی علیہ السلام تمہیں دوست نہیں رکھے گا مگر مومن اور تمہیں دشمن نہیں رکھے گا مگر منافق۔

جابر ابن عبداللہ انصاری کہتے ہیں۔

ماکنا نعرف المنافقین الا ببغض علی ابن ابی طالب (استیعاب ج ۳ ص ۴۷)

ہم علی ابن ابی طالب سے بغض و عناد کی وجہ سے منافقوں کو پہچان لیا کرتے تھے۔

(۷) قرآن مجید انہی الفاظ و کلمات کا مجموعہ ہے جن سے عربوں کی زبان آشنا اور ان کے روز مرہ میں مستعمل تھے مگر اس کے اسلوب و انداز بیان میں جو بلاغت اور باطن میں جو حقائق و معارف مضمر ہیں ان کی گہرائیوں تک نہ پہنچا جا سکتا ہے اور نہ ان کی بے پایاں وسعتوں کو ناپا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان القران ظاھرہ انیق و باطنہ عمیق لاتفنی عجائبہ ولا تنقضی غرائبہ۔

قرآن کا ظاہر خوشنما اور باطن گہرا ہے نہ اس کے عجائبات مٹنے والے ہیں اور نہ اس کے لطائف ختم ہونے والے ہیں۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کے ظاہر اوصاف کے لحاظ سے انہیں شجاع، سخی، زاہد، عالم وغیرہ کہا جاتا ہے مگر ان اوصاف کی واقعی بلندی کا صحیح اندازہ وہی کر سکتا ہے جو ان صفات میں ان کا ہم پایہ ہو یا ان سے بالاتر ہو اور جو ان کی سطح سے بمراحل پست تر ہو وہ ان اوصاف کی گیرائی و گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

یا علی ما عرف اللہ الا انا وانت وما عرفنی الا اللہ وانت وما عرفک الا اللہ وانا

اے علی علیہ السلام اللہ کو نہیں پہچانا مگر میں نے اور تم نے اور مجھے نہیں پہچانا مگر اللہ نے اور تم نے اور تمہیں نہیں پہچانا مگر اللہ نے اور میں نے۔

(۸) علی علیہ السلام اور قرآن کے باہمی تلازم کا تقاضا یہ ہے کہ وجوب اتباع اور مقام تمسک میں اہمیت کے اعتبار سے دونوں کو ایک سطح پر سمجھا جائے اور ایک کو کافی سمجھ کر دوسرے کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی علیہ السلام کو کافی سمجھ کر قرآن کو چھوڑ دیا جائے یا قرآن کو کافی سمجھ کر علی علیہ السلام سے روگردانی اختیار کر لی جائے تو ایک سے دستبرداری دوسرے سے دستبرداری کو مستلزم ہو گی اور نتیجتہً نہ

علی علیہ السلام سے تمسک رہے گا اور نہ قرآن سے۔ جب اس تلازم کے نتیجہ میں دونوں سے تمسک ضروری ہے تو جس معنی سے قرآن کے ساتھ تمسک لازم ہو گا اسی معنی سے عدیل قرآن علی علیہ السلام سے بھی تمسک واجب ہو گا۔ تمسک بالقرآن کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف قرات و تجوید کی پابندی کے ساتھ اس کی تلاوت کر لی جائے یا اسے حفظ کر لیا جائے یا گلے میں حمائل کی صورت میں لٹکا لیا جائے بلکہ تمسک و وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اوامر و نواہی احکام و ہدایات اور نصائح و مواعظ کے مطابق زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے اسی طرح علی علیہ السلام سے وابستگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف ان کا نام ورد زباں رہے اور ان کے تعلیمات سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے بلکہ وا بستگی کے معنی یہ ہیں کہ ان کے احکام کی پابندی کی جائے اور ان کے نقش قدم کو دلیل راہ بنایا جائے۔ اگر زبان سے وابستگی کا اظہار کیا جائے مگر طور طریقہ وہ اختیار کیا جائے جو ان کے قول و عمل کے خلاف ہو تو یہ تمسک و وابستگی نہیں ہے بلکہ سراسر انحراف و برگشتگی ہے۔

جمع قرآن

امیرالمومنین علیہ السلام کا پہلا علمی و دینی کارنامہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ظہور میں آیا وہ قرآن کی ترتیب و جمع آوری ہے۔ اگرچہ جو آیت نازل ہوتی تھی بعض صحابہ اسے ضبط تحریر میں لے آتے تھے مگر یہ آیتیں درخت خرما کی چھال' لکڑی اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھی جاتی تھیں۔ جن میں نظم و ترتیب کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان متفرق اجزاء کو ترتیب نزول کے مطابق یکجا کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور تمام مشاغل سے دستبردار ہو کر ہمہ تن قرآن کی ترتیب و تدوین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسے ترتیب نزول کے مطابق جمع کر کے اسلام کی بنیادی ضرورت کی تکمیل کی۔ محمد ابن سیرین کہتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا۔

آلیت ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلوۃ حتی اجمع القرآن۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۳۰)

میں نے قسم کے ذریعہ اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی ہے کہ نماز کے علاوہ عبا نہ اوڑھوں گا جب تک قرآن جمع نہ کر لوں۔

صحابہ کے پاس قرآن کے جو اجزاء غیر مرتب صورت میں تھے انہیں ترتیب نزولی کے مطابق مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی چنانچہ سورہ فاتحہ کے بعد چار طویل سورتیں مدنی ہیں اور اس کے بعد بعض مدنی سورتوں میں مکی آیتیں اور مکی سورتوں میں مدنی آیتیں ملی جلی ہوئی ہیں۔ بعض مدنی آیتیں مکی آیتوں سے پہلے اور بعض منسوخ آیتیں ناسخ آیتوں کے بعد درج ہیں چنانچہ بیوہ ہونے والی عورتوں کے بارے میں پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیتہ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج

وہ لوگ جو بیویاں چھوڑ کر دنیا سے جا رہے ہوں انہیں اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کرنا چاہئے کہ انہیں گھر سے نکالے بغیر ایک سال تک نان و نفقہ دیا جائے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ابتدا میں بیوہ ہونے والی عورتوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے متوفی شوہروں کے گھروں میں ایک سال تک رہیں۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ ناسخ آیت نازل ہوئی۔

والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعتہ اشھر و عشرا۔

جو لوگ تم میں سے بیویاں چھوڑ کر مر جائیں تو بیویاں چار مہینے دس دن تک اپنے کو روکیں۔

یہ دونوں آیتیں سورہ بقرہ کی ہیں مگر ناسخ آیت پہلے ہے اور منسوخ آیت بعد میں حالانکہ تنزیل کے اعتبار سے اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا۔

قرآن مجید کی جمع آوری ترتیب نزولی کے مطابق وہی کر سکتا تھا جو ترتیب آیات سے کما حقہ واقف ہوتا اور امیرالمومنین علیہ السلام کے علاوہ ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ہر ہر آیت کے بارے میں تفصیلی علم رکھتا ہو۔ آپ ہر آیت کے شان نزول، محل نزول اور وقت نزول سے آگاہ تھے اور جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی اسے قلمبند کر لیتے تھے چنانچہ آپؑ خود فرماتے ہیں۔

ان کل آیتہ انزلھا اللہ علی نبیہ عندی باطلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وخط یدی۔ (فصول حر عاملی ص ۶۵)

خداوند عالم نے ہر وہ آیت جو اپنے نبی پر نازل کی وہ میرے پاس ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے لکھوایا اور میں نے اپنے ہاتھ سے قلمبند کیا۔

آپؑ پیغمبر اکرم کی زندگی میں قرآن مجید حفظ بھی کر چکے تھے اور وہ حفظ اسی ترتیب کے مطابق ہو گا جس ترتیب سے قرآن نازل ہوا تھا لہٰذا طبعاً" تدوین قرآن میں ترتیب نزول کو ملحوظ رکھا ہو گا کیونکہ سور و آیات کی ترتیب کے بدل دینے کا کوئی داعی نہ تھا۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

قدورد عن علی انہ جمع القرآن علی ترتیب النزول عقب موت النبی۔ (اتقان ج ۱ ص ۷۴)

حضرت علی علیہ السلام سے وارد ہوا ہے کہ آپ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ترتیب نزول کے مطابق قرآن مجید جمع کیا۔

حضرتؑ کا جمع کردہ قرآن یقیناً" ان تمام فوائد کا حامل ہو گا جو کسی کتاب کی ترتیب کے برقرار رہنے پر مرتب

ہوسکتے ہیں۔ بہتر تو یہی تھا کہ اسی ترتیب کو قائم رکھا جاتا مگر اس کی ترویج خلاف مصلحت سمجھی گئی اور از سرنو اس کی ترتیب ضروری قرار دے لی گئی۔ حضرتؑ نے اپنے جمع کردہ قرآن پر اصرار مناسب نہ سمجھا اور اس خیال سے کہ وحدت اسلامی کو دھچکا نہ لگے اسی کو واجب العمل قرار دیا۔ چنانچہ اس قرآن کے بارے میں فرمایا۔

اعلموا ان هذا القرآن هوالنا صح الذی لا یغش والهادی الذی لایضل والمحدث الذی لا یکذب۔ (نہج البلاغہ)

یاد رکھو کہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو گمراہ نہیں کرتا اور ایسا بیان کرنے والا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔

یہ اور اس قبیل کے دوسرے توثیقات کے بعد موجودہ قرآن ہمارے لئے حجت و سند ہے خواہ اس کی ترتیب کچھ ہو کیونکہ ترتیب کے بدل جانے سے اعتبار و استناد پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ معانی و مطالب میں چنداں فرق آتا ہے جب کہ وہ کمی و زیادتی سے پاک اور تحریف و تبدل سے محفوظ ہے اور یہی علماء شیعہ کا مسلک رہا ہے چنانچہ شیخ صدوق رحمتہ اللہ تحریر کرتے ہیں۔

اعتقادنا ان القرآن الذی انزل اللہ تعالی علی نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ھومابین الدفتین وھو مافی ایدی الناس لیس باکثر من ذلک۔ (اعتقادیہ ص ۱۵۰)

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل فرمایا وہ وہی ہے جو دو دفتیوں کے درمیاں ہے اور عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے زائد نہیں ہے۔

اسی طرح شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی نے التبیان فی علوم القرآن میں، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے مسائل طرابلسیات، میں علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں، سید محسن بغدادی نے شرح وافیہ میں، شیخ جواد بلاغی نے آلاء الرحمٰن میں اور دیگر اکابر محققین نے اپنے مصنفات میں عدم تحریف قرآن کی صراحت کی ہے۔

قرأت قرآن

قرآن مجید کی ایک ایک لفظ وحی منزل ہے جس کے حروف و الفاظ میں رد و بدل کا اختیار نہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے اور نہ کسی اور کو۔ چنانچہ ارشاد الہی ہے۔

قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الامایوحی الی۔ اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہہ دو کہ مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے قرآن کو بدل ڈالوں میں تو اسی کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

مگر قرآن مجید میں مختلف قرأتوں کے جواز سے رد و بدل کی گنجائش پیدا کر دی گئی۔ یوں تو یہ قرأتیں متعدد ہیں مگر تیسری صدی ہجری میں ان قرأتوں کو سات میں محدود کر لیا گیا جو قراء سبعہ کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے جواز میں یہ حدیث نبویؐ پیش کی جاتی ہے کہ **انزل القرن علی علیہ السلام سبعتہ احرف** قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ ان سات حرفوں سے سات قرأتیں مراد لی جاتی ہیں اور ان ساتوں قرأتوں کو متواتر مانا جاتا ہے جو اللہ نے نازل فرمائیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبان پر جاری ہوئیں۔ حالانکہ سات حرفوں سے سات قرأتیں مراد لینے کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ ان کے تواتر پر کوئی دلیل قائم ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو جب حضرت عثمانؓ نے تمام مسلمانوں کو ایک قرات پر جمع کر کے بقیہ قرآنوں کو جلا دیا تو اس پر صحابہ احتجاج کرتے اور ایک قرأت کی پابندی کے خلاف آواز اٹھاتے مگر کسی طرف سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ البتہ ان کے قرآن جلانے پر مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور معترض ہوئی۔ بہرحال یہ اختلاف تنزیلی نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف اس لئے رونما ہوا کہ ان قاریوں کا طریقہ تلفظ مختلف تھا۔ جس سے ایک حرف دوسرے قریب المخرج حرف سے بدل جاتا تھا جیسے صراط اور سراط یا آواز کو ذرا کھینچنے سے ایک حرف کی کمی بیشی ہو جاتی تھی جیسے مالک یوم الدین اور ملک یوم الدین یا اس وجہ سے کہ اس دور میں قرآن کی کتابت نقطوں اور اعرابی حرکتوں سے معرا ہوتی تھی، جس سے لفظ کی ہیئت میں فرق آجاتا تھا جیسے **یطھرن** اور **یطھرن** یا ان نسخوں میں کتابت کے اعتبار سے اختلاف ہو گا جو حضرت عثمانؓ نے لکھوا کر مکہ، مدینہ، شام، بصرہ، کوفہ، یمن اور بحرین بھجوائے تھے ان شہروں کے باشندے اپنے ہاں کے قاریوں کی قراءت پر اعتماد کرتے تھے اور انہی کی قرات کے مطابق پڑھتے تھے چنانچہ اہل مکہ ابن کثیر کی قرأت کے، اہل مدینہ نافع کی قرأت کے، اہل شام ابن عامر کی قرأت، اہل کوفہ حمزہ و عاصم کی قرأت کے اور اہل بصرہ ابو عمرو اور یعقوب کی قرأت کے پابند تھے البتہ تیسری صدی کے آغاز میں ابن مجاہد نے یعقوب کے بجائے کسائی کی قراءت کو ترجیح دی۔

ان قراء میں سے اکثر کا سلسلہ تلمذ امیرالمومنین علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ابو عمرو

اور عاصم نے ابو عبدالرحمٰن سے قراءت حاصل کی اور ابو عبدالرحمٰن کہتے ہیں **قرات القران کلہ ...... علی ابن ابی طالب** "میں نے پورا قرآن علی ابن ابی طالبؑ سے پڑھا" حمزہ اور کسائی ابن مسعود کی قراءت پر اعتماد کرتے تھے اور ابن مسعود کا قول ہے کہ **مارائت اقراء من علی ابن ابی طالب** "میں نے علی ابن ابی طالبؑ سے بڑے کوئی قاری قرآن نہیں دیکھا" ابن کثیر نافع اور ابو عمرو کی اکثر قرأتیں ابن عباس تک منتہی ہوتی ہیں اور ابن عباس نے ابی ابن کعب اور علی ابن ابی طالب سے قرآن پڑھا تھا۔ غرض ان قراء میں سے اکثر کی بازگشت حضرتؑ کی طرف ہے چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی نے تحریر کیا ہے۔

اذا رجعت الی کتب القرآن وجدت آئمتہ القراء کلھم یرجعون الیہ کابی عمرو ابن العلا و عاصم ابن النجود وغیر ھمالانھم یرجعون الی ابی عبدالرحمن ابن السلمی القاری و ابوعبدالرحمن کان تلمیذ وعنہ اخذ القرآن فقد صار ھذا الفن من الفنون التی ینتھی الیہ۔ (مقدمہ شرح ص ۷)

اگر ان کتابوں پر نظر کرو جو قرآن مجید کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں تو تم دیکھو گےؑ کہ تمام آئمہ قراءت حضرت علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسے ابو عمرو ابن العلاء اور عاصم وغیرہ اس طرح کہ یہ قراء ابو عبدالرحمن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ابو عبدالرحمن حضرت کے شاگرد تھے اور انہی سے درس قرآن لیا تھا لہٰذا یہ فن بھی انہی فنون میں شمار ہو گا جو حضرت تک منتہی ہوتے ہیں۔

اگرچہ ان قراء میں اکثر کا سلسلہ قراءت حضرتؑ تک منتہی ہوتا ہے مگر ان کی قرأتوں کے اختلاف کو دیکھ کر یہ کہنا پڑے گا کہ انہوں نے وہی قراءتیں حضرتؑ سے لی ہوں گی جن پر وہ متفق تھے اور کچھ قرأتوں کے سلسلہ میں دوسروں سے استفادہ کیا ہو گا یا اپنے اجتہاد و رائے سے کوئی قرأت مقرر کر لی ہو گی ایسا نہیں ہے کہ ان کی ہر قرأت حضرتؑ سے نسبت رکھتی ہو اور ان سے سیکھی گئی ہو۔ اس لئے کہ قرآن کی تنزیلی قرأت ایک ہی ہے جس میں متعدد قرأتوں کی صحت کی گنجائش نہیں ہے اور نہ متداول اول قرأت کے علاوہ دوسرے قراء کی قرأتوں پر اعتماد و وثوق صحیح ہے۔ البتہ اگر آئمہ معصومین علیہ السلام میں سے کسی نے کسی قرأت کی توثیق کر دی ہو تو وہ صحیح قرار دی جائے گی۔

نقاط و اعراب قرآن

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں حروف منقوطہ پر نقطے دینے اور اعراب لگانے کا طریقہ مرسوم نہ تھا اور اس دور کی تمام تحریریں نقطوں سے عاری اور اعراب سے خالی ہوتی تھیں چنانچہ قرآن مجید کے حروف بھی نقطوں اور اعرابی علامتوں کے بغیر لکھے جاتے تھے۔ وہ لوگ جو کتابت قرآن پر مامور ہوتے تھے وہ نقطوں سے آگاہ ہی نہ

تھے کہ ایک شکل و صورت والے حرفوں پر امتیاز کے لئے نقطے لگاتے اور نہ عربوں کو اس کی چنداں احتیاج تھی وہ نقطوں کی ضرورت محسوس کئے بغیر پڑھ لیتے تھے اور موقع و محل سے سمجھ لیتے تھے کہ اس مقام پر کون سا حرف ہو گا اور اس کی اعرابی حرکت کیا ہونا چاہئے مگر غیر عربوں کے لئے نقطوں کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت انتہائی دشوار تھی کیونکہ منفرد شکل و صورت رکھنے والے حرفوں کے علاوہ متحد الاشکال حروف میں ان کے لئے اشتباہ کا ہونا ضروری تھا۔ جیسے ت اور ث، س اور ش، ص اور ض، ع اور غ وغیرہ۔ ابوالا سود دئلی نے اس طرف توجہ کی اور قرآن مجید کے حروف پر نقطے لگائے۔ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

ابوالاسود اول من نقطه المصحف۔ (المزہر ج ۲ ص ۳۹۸) ابوالاسود نے سب سے پہلے قرآن مجید پر نقطے لگائے۔

یہ نقطے متحد الاشکال حروف کے باہمی امتیاز کے لئے بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ حروف جو ایک مخصوص اور انفرادی شکل رکھتے ہیں جیسے ا ک ل م و ہ ان پر نقطوں کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور وہ حروف جو ایک ہی شکل و صورت رکھتے ہیں جیسے ب ت ث یا مرکب ہونے کی صورت میں ہم شکل ہو جاتے ہیں جیسے ف ق ان میں نقطوں کے ذریعہ امتیاز پیدا کیا گیا اور ی چونکہ غیر مخلوط ہونے کی صورت میں منفرد شکل رکھتی ہے اس لئے اس پر نقطے نہیں دئے جاتے اور مرکب ہونے کی صورت میں چونکہ اس کی شکل منفرد نہیں رہتی اس لئے نقطے لکھے جاتے ہیں۔ ب اور ی دو حروف ایسے ہیں جن کے نیچے نقطے دئے جاتے ہیں کیونکہ اوپر نقطے لکھنے کی صورت میں ب اور ن میں فرق نہ رہتا اور ی اور ت میں امتیاز ختم ہو جاتا۔ اسی طرح زیر زبر اور پیش تینوں حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لئے بھی انہوں نے اعرابی نقطوں کی تشکیل کی اس طرح کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ہر حرکت کے ادا کرتے وقت منہ کی ایک خاص شکل بن جاتی ہے تو اپنے کاتب سے کہا کہ تم میرے انداز تلفظ کو دیکھو اگر کسی حرف کے تلفظ میں میرا منہ کھل جائے تو تم اس حرف کے اوپر ایک نقطہ ڈال دینا اور جس حرف کے ادا کرنے میں میرے دونوں لب مل جائیں تو اس کے آگے ایک نقطہ لگا دینا اور اگر آواز کا رخ نیچے کی طرف ہو تو تم اس حرف کے نیچے نقطہ لکھ دینا اس طرح بالترتیب زبر پیش اور زیر کی حرکتوں کو ان نقطوں سے واضح کیا اور بعد میں نقطوں کے بجائے اعرابی حرکات ــَــ ــُــ ــِــ کی صورت میں یہ تینوں حرکتیں ظاہر کی گئیں۔ ان اعرابی اشکال کے موجد خلیل ابن احمد فرہیدی متوفی ۱۷۰ھ تھے۔ ابوالاسود کا یہ کارنامہ بھی امیرالمومنین علیہ السلام کا کارنامہ ہے کیونکہ ابوالاسود نے یہ طریق کار حضرت ہی سے سیکھا تھا۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں۔

اول من وضع العربیۃ و نقط المصاحف ابوالاسود و قلسئل عمن نہج لہ الطریق فقال تلقیتہ عن علی ابن ابی طالب۔ (اصابہ ج ۲ ص ۲۴۳)

جس نے سب سے پہلے علوم عربیہ وضع کئے اور قرآن میں نقطے لگائے وہ ابوالاسود تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ طریقہ کس سے سیکھا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں نے اسے علی ابن ابی طالب سے

حاصل کیا ہے۔

قرآن مجید کی زریں خدمات کے سلسلہ میں حضرتؑ کی یہ خدمت بھی ایک بلند درجہ رکھتی ہے۔ آپؑ نے قراءت قرآن کی دشواریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے شاگرد ابوالاسود کو نقاط کی تعلیم دی۔ جس کی وجہ سے نہ صرف غیر عربوں کے لئے تلاوت قرآن کی راہیں کھلیں بلکہ خود عربوں کے لئے بھی آسانی و سہولت پیدا ہو گئی۔

کتابت و املاء قرآن

تحریر و املاء کا بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ الفاظ کو اسی طرح ضبط تحریر میں لایا جائے جس طرح ان کا تلفظ کیا جاتا ہے۔ مگر عربی زبان میں بعض الفاظ کے رسم الخط میں ایک آدھ حرف زیادہ کر دیا جاتا ہے جو تلفظ میں نہیں آتا جیسے عمرو میں واؤ تاکہ لفظ عمر اور عمر میں فرق ہو سکے اسی طرح واو جمع کے بعد الف لکھ دیا جاتا ہے تاکہ واو جمع اور واو غیر جمع میں امتیاز کیا جا سکے مگر قرآن مجید کے رسم الخط میں اس عام قاعدہ کی پابندی کہیں کہیں نہیں ہے چنانچہ بعض مقامات پر ایسی واو کے بعد بھی الف لکھ دیا گیا ہے جو واو جمع نہیں ہے جیسے یدعوا اور کہیں واو جمع کے بعد الف نہیں لکھا گیا جیسے **وباء وبغضب من الله** یونہی **لا او ضعوا** اور **لاذبحت** میں لا کے بعد الف زائد ہے اس لئے کہ یہ لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام تاکید ہے جس کے فعل متصل سے یہ الف بھی پڑھنے میں نہیں آتا یونہی بعض جگہوں پر وہ تا جو حالت وقف میں ہا ہو جاتی ہے لمبی تا کی صورت میں لکھی ہوتی ہے جیسے نعمت رحمت کلمت حالانکہ وہ ہا کی صورت میں لکھی جاتی ہے۔

اس رسم الخط کا آغاز چونکہ قرن اول میں ہو چکا تھا اس لئے اس رسم الخط کی پابندی ضروری قرار دے لی گئی تاکہ قرآن مجید کے نسخوں میں خط و املاء کے اعتبار سے اختلاف نہ ہونے پائے۔ ابن خلدون تحریر کرتے ہیں۔

رسمه الصحابه بخطوطهم و كانت غير مستحكم فى الاجاده فخالف الكثير من رسومهم ما اقتضته رسوم صاعته الخط عند اهلها ثم اقتفى التابعون من السلف رسمهم فيها تبركا بمارسمه اصحابه رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (مقدمہ ص ۲۹۴)

صحابہ نے اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کے نسخے قلمبند کئے لیکن ان کا خط فنی اعتبار سے ناقص و کمزور تھا چنانچہ بہت سی جگہوں پر ان کا رسم الخط اہل فن کے رسم الخط کے خلاف ہے پھر بعد کے آنے والوں نے تبرکاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہی کے رسم الخط کو اختیار کیا۔

قرآن مجید کو تحریری شکل میں لانے کا اہتمام و انصرام خود پیغمبر اکرم نے کیا تھا اور اسے لوگوں کی قوت حافظہ پر چھوڑ دینے کے بجائے احاطہ تحریر میں لا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

و آلہ وسلم نے چند پڑھے لکھے لوگوں کو کتابت وحی پر مامور فرمایا اور جو آیت نازل ہوتی اسے فوراً لکھوا دیتے۔ صدر اول میں چونکہ نوشت و خواند پر قدرت رکھنے والے چند ہی افراد تھے اس لئے کچھ لوگوں سے کتابت وحی اور تحریر مراسلات دونوں کام لئے جاتے اور کچھ لوگوں سے صرف خطوط و رسائل لکھوائے جاتے۔ بعض مؤلفین نے کاتبان وحی اور کاتبان رسائل و خطوط کو ایک ہی عنوان کے تحت درج کر دیا ہے جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ان میں کاتب وحی کون تھا اور کاتب خطوط و رسائل کون۔ اسی سے کچھ لوگوں کو اشتباہ ہو گیا اور انہوں نے معاویہ ابن ابی سفیان کو جو خطوط و رسائل لکھتا تھا اور وہ بھی گاہے گاہے' کاتب وحی قرار دے لیا حالانکہ اس کا کاتب وحی ہونا واقعات کی روشنی میں بعید معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لایا اور اسلام لانے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بجائے مکہ ہی میں رہا اور نزول قرآن کا آغاز ابتدائے بعثت سے ہو چکا تھا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کبھار مدینہ آتا ہو اور اس سے خطوط و رسائل کے سلسلہ میں تحریری کام بھی لے لیا جاتا ہو۔چنانچہ مورخین نے اسے صرف کاتب رسائل وخطوط بھی لکھا ہے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

وکان احدالکتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۳۶)

معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں میں سے ایک کاتب تھے۔

ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے۔

قال المدائنی کان زید ابن ثابت یکتب الوحی وکان معاویہ یکتب للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیما بینہ و بین العرب۔ (اصابہ ج ۳ ص ۴۱۳)

مدائنی کہتے ہیں کہ زید ابن ثابت کتابت وحی کرتے تھے اور معاویہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عربوں کے درمیان مراسلات کے سلسلہ میں تحریری کام کرتے تھے۔

محمد ابن عبدوس جہشیاری نے تحریر کیا ہے۔

وکان خالد ابن سعید ابن العاص و معاویہ ابن ابوسفیان یکتبان بین یدیہ فی حوائجہ۔ (کتاب الوزراء والکتاب ص ۱۲)

خالد ابن سعید ابن عاص اور معاویہ ابن ابی سفیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوائج و ضروریات کے سلسلہ میں تحریری خدمت بجا لاتے تھے۔

علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

تتفق الاخبار علی کتابته للنبی ولا تتفق علی کتابته للوحی۔ (معاویہ ابن ابی سفیان فی المیزان ص ۱۶۴)

اس پر روایات کا اتفاق ہے کہ معاویہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحریری کام کرتے تھے مگر ان کے کاتب وحی ہونے پر روایات متفق نہیں ہیں۔

مسعودی تحریر کرتے ہیں۔

کتب له صلی الله علیه وآله وسلم قبل وفاته بشهور فاشادو اسن ذکره و رفعوا من منزلته بان جعلوه کاتبا للوحی۔ (مروج الذہب ج ۲ ص ۴۷)

معاویہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے چند ماہ قبل آپؐ کا کچھ تحریری کام کیا مگر عوام نے ان کا ذکر اتنا اچھالا اور ان کا درجہ اتنا بلند کر دیا کہ انہیں کاتب وحی قرار دے لیا۔

ابن عبد ربہ الاندلسی نے عقد الفرید میں حضرت عثمانؓ کو بھی کاتب وحی لکھ دیا ہے مگر دوسرے ماخذ طبری' اصابہ' استیعاب' سیرہ حلبیہ وغیرہ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی طرح کی خود ساختہ بات ہے جس طرح معاویہ کا کاتب وحی ہونا بے اساس ہے۔ تاہم جنہوں نے کتابت وحی کے سلسلہ میں کام کیا ان کے نام کتب تاریخ میں درج ہیں مگر ان میں کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر کاملاً" و کمالاً" قرآن تحریر کیا ہو بلکہ سبھی متفرق آیتوں کے کاتب تھے۔ البتہ امیرالمومنین علیہ السلام جو اکثر اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں موجود رہتے تھے اور جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں لکھوا دیتے تھے اور اگر نزول وحی کے موقع پر موجود نہ ہوتے تو دوسرے موقع پر انہیں لکھوا دیا کرتے تھے۔ ابن شہرآشوب تحریر کرتے ہیں۔

کان النبی اذا نزل علیه الوحی لیلالم یصبح حتی یخبربه علیا و اذا نزل علیه نهارا لم یمس حتی یخبربه علیا۔(مناقب)

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رات کو وحی نازل ہوتی تو صبح ہونے سے پہلے علی علیہ السلام کو بتا دیتے اور جب دن کو وحی نازل ہوتی تو شام سے پہلے علی علیہ السلام کو آگاہ کر دیتے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں کتابت وحی کا فریضہ انجام دیا اور آپؐ کی رحلت کے بعد قرآن کی نزولی ترتیب قائم کی اور صحت کتابت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ کاتبان قرآن کو متنبہ کرتے رہتے کہ تحریر واضح اور اصول کتابت کے مطابق ہو تاکہ پڑھنے میں آسانی رہے اور الفاظ میں اشتباہ نہ ہونے پائے۔ ابو حکیمہ بیان کرتے ہیں کہ

كنت اكتب المصاحف فمربى على ابن ابى طالب كرم الله وجهه فقال اجلل قلمك فقصمت من قلمى قصمته فقال هكذانوره كما نوره الله (عقد الفرید ج ۳ ص ۲۷)

میں قرآن مجید تحریر کیا کرتا تھا ایک مرتبہ علی ابن ابی طالب کا میری طرف سے گزر ہوا آپ نے فرمایا قلم کو جلی رکھو میں نے قلم کی نوک کاٹ ڈالی فرمایا کہ جس طرح اللہ نے اسے روشن کیا ہے اسی طرح تم بھی اسے روشن و نمایاں کرو۔

انصار لفظ تابوت کی آخری تا کو ھا اور قریش تا پڑھتے تھے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

قال القاسم ابن معين لم تختلف لغته قريش والانصار فى شئى من القران الا فى التابوت فلغته قريش بالتاء ولغته الانصار بالهاء (المزہرج ۲ ص ۷۳)

قاسم ابن معین کہتے ہیں کہ لغت قرآن کے سلسلہ میں قریش اور انصار میں کوئی اختلاف نہ تھا سوائے لفظ تابوت کے قریش اسے تا کے ساتھ پڑھتے تھے اور انصار ھا کے ساتھ۔

ایک مرتبہ زید کاتب نے حضرت کے سامنے لفظ تابوت کو ہا کے ساتھ پڑھا تو آپ نے فرمایا کہ اسے لانبی تا کے ساتھ التابوت لکھو تاکہ اسے ہا نہ پڑھا جائے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے قرآن مجید کے متعدد نسخے اپنے ہاتھ سے قلمبند کئے اور بعض اجزاء دستبرد زمانہ سے اب تک محفوظ چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ مکتبہ رضویہ مشہد میں چند سورتوں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے جس کے ۹۲ اوراق ہیں اور ایک مجموعہ سورہ ھود سے سورہ کھف تک ہے جس کے ۶۸ اوراق ہیں اور اس کے نیچے کتبہ علی ابن ابی طالب تحریر ہے اسی طرح مکتبہ نجف میں ایک قرآن مجید موجود ہے جس کے آخر میں تحریر ہے۔

كتبه على ابن ابى طالب فى سنته اربعين من الهجره (اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۷۶)

علی ابن ابی طالب نے ۴۰ ھ میں تحریر کیا۔

علامہ رافعی نے لکھا ہے۔

فى فهرست لابن النديم انه راى عند ابى يعلى حمزه الحسنى مصحفا بخط على يتوراثه بنو حسن۔ (اعجاز القرآن ص ۳۲)

ابن ندیم نے فہرست میں لکھا ہے کہ انہوں نے ابو یعلی حمزہ حسنی کے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور وہ اولاد حسن میں وراثۃً منتقل ہوتا رہتا ہے۔

تفسیر قرآن

قرآن مجید انہی الفاظ و کلمات پر مشتمل ہے جو عرب میں رائج اور زبانوں پر جاری و ساری تھے۔ مگر لفظوں کی ترتیب و ترکیب اور بیان کے طرز واسلوب میں وہ حسن کارفرما ہے جس نے اسے اعجازی حیثیت دے دی اور عرب کے سخن طراز و سحر بیان اس کی قوت اعجاز سے انکار نہ کر سکے۔ قرآن مجید صرف لفظوں کی ترتیب و تنظیم اور بلاغت کے اعتبار ہی سے معجزہ نہیں ہے بلکہ جس پہلو سے دیکھا جائے معجزہ اور انسانی قدرت سے بالاتر ہے۔ فصحاو بلغاء کے لئے بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے حکماء کے لئے حکمت اور طریق و استدلال کے لحاظ سے معجزہ ہے' قانون دانوں کے لئے قوانین کی آفاقیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے معجزہ ہے' سیاست دانوں کے لئے سیاسی اصولوں کی نوعیت کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اسی طرح اخلاقی تعلیمات' تشریعی نظریات اور علمی اکتشافات کے لحاظ سے معجزہ خالدہ ہے۔

قرآن مجید کے انہی مطالب و مضامین کی توضیح اور اس کی لفظی و معنوی تشریح کا نام تفسیر ہے۔ ایک عربی دان الفاظ قرآن کے معانی تو سمجھ سکتا ہے مگر اس کے مجملات اور دقائق و نکات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روشنی حاصل کی جائے یا ان ہستیوں کے آثار سے استفادہ کیا جائے جو اس سرچشمہ نبوت علیہ السلام سے براہ راست سیراب ہوئے اور حاملان علم کتاب قرار پائے اگر ان سے بے نیاز رہ کر تفسیر کی جائے گی تو وہ ذاتی آراء کا مجموعہ ہو گی تفسیر نہ ہو گی اس لئے کہ تفسیر نام ہے مراد الٰہی کی توضیح کا اور ظن و رائے سے مراد الٰہی تک پہنچا نہیں جا سکتا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اگرچہ چند صحابہ قرآنی مطالب پر نظر رکھتے تھے مگر حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں اتفاق رائے ہے کہ وہ تفسیر میں یکتا اور قرآن فہمی میں یگانہ روزگار تھے اور صحابہ میں کوئی بھی ان کا ہم پایہ و ہمسر نہ تھا۔ کیونکہ فہم قرآن کے صحیح ذوق کے ساتھ درسگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تعلیم و تربیت پانے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے فیوض سے مستفید ہونے کا جتنا موقع انہیں ملا وہ کسی اور کو نہ مل سکا۔ آپؑ قرآن کے محل نزول 'تاریخ نزول' عام و خاص' مطلق و مقید' مجمل و مبین' ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ سے پوری طرح آگاہ اور اس کے اسرار و غوامض اور دقائق و معارف پر کماحقہ حاوی تھے۔ آپؑ اپنے خطبات میں بھی ان مطالب پر روشنی ڈالتے اور انہیں تحریر میں بھی لائے چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو قرآن مرتب کیا وہ ایک تفسیری حیثیت رکھتا تھا اور تنزیلی و تاویلی تشریحات پر مشتمل تھا۔ محمد ابن سیرین کہتے ہیں۔

لو اصبت ذلک الکتاب کان فیہ العلم۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ج ۲ ص ۱۹۹)

اگر وہ کتاب مجھے مل جاتی تو اس سے علم کا ایک ذخیرہ دستیاب ہوتا۔

اس تفسیر کے دسترس سے باہر ہونے کے باوجود کتب تفاسیر میں آپ کے تفسیری کلمات اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اس دور کے مسلمانوں میں سے کسی ایک سے بھی اتنے اقوال مروی نہیں ہیں۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

ولا احفظ عن ابی بکر رضی اللہ عنہ الا آثار واقلیلتہ جدالا تکاد تجاوز العشرہ واما علی فروی عنہ الکثیر۔ (اتقان ج ۲ ص ۳۲۸)

میں تفسیر کے سلسلہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آثار بہت ہی کم پاتا ہوں اور جو ہیں وہ کسی صورت میں دس سے زیادہ نہیں البتہ حضرت علی علیہ السلام سے بہت زیادہ تفسیری اقوال مروی ہیں۔

دوسرے خلفاء کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

والروایہ عن الثلثہ نزرہ جدا۔ (اتقان ج ۲ ص ۳۲۸)

خلفاء ثلثہ سے تفسیر کی روایات بہت کم ہیں۔

بہرحال امیرالمومنین علیہ السلام کو جہاں تفسیر میں نمایاں امتیاز حاصل ہے وہاں اس کی تدوین میں بھی تقدم حاصل ہے اور وہ افراد جنہوں نے تفسیر کی تدوین کی یا تفسیر میں شہرت پائی ان کا سلسلہ تلمذ بھی آپ تک منتہی ہوتا ہے چنانچہ ان میں سے ایک مشہور مفسر ابن عباس ہیں جنہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا دی تھی کہ۔

علمہ الحکمت و تاویل الکتاب۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۶۵)

خدایا اسے حکمت اور کتاب کی تاویل کا علم عطا کر۔

ابن عباس کی طرف منسوب ایک تفسیر تنویر المقباس مطبوعہ صورت میں موجود ہے مگر یہ خود ان کی مدون کردہ نہیں ہے بلکہ جو تفسیری روایات ان کی طرف منسوب ہیں انہیں ابو طاہر محمد ابن یعقوب فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ ھ نے جمع کر دیا ہے۔ ابن عباس کا قول ہے۔

کلما لکلمت بہ فی التفسیر فانما اخذتہ عن علی کرم اللہ وجھہ۔ (سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۴)

میں نے تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ میں نے حضرت علی علیہ السلام سے اخذ کیا ہے۔

دوسرے میثم ابن یحیٰ تمار ہیں جنہوں نے امیرالمومنین علیہ السلام سے قرآن پڑھا اور علم تاویل سیکھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک موقع پر ابن عباس سے کہا۔

یا ابن عباس سلنی ماشئت من تفسیر القرآن فانی قرأت تنزیلہ علی امیرالمومنین فعلمنی تاویلہ۔
(بحارالانوار ج ۹ ص ۶۳۰)

اے ابن عباس تفسیر قرآن کے بارے میں جو پوچھنا چاہو مجھ سے پوچھو میں نے امیرالمومنین علیہ السلام سے قرآن پڑھا ہے اور انہوں نے مجھے تاویل قرآن کی تعلیم دی ہے۔

ابن عباس نے قلم دوات طلب کر کے ان کے افادات کو قلمبند کر لیا۔

جابر ابن عبداللہ انصاری اور ابی ابن کعب نے بھی حضرتؑ سے استفادہ کیا اور طبقہ اولیٰ کے مفسیرین میں سے سعید ابن جبیر' ابو صالح بصری اور طاوس ابن کیسان یمانی ابن عباس کے واسطے سے حضرتؑ کے فیوض علمیہ سے مستفید ہو کر علم تفسیر میں نامور ہوئے۔

ذیل میں حضرتؑ کے کلمات کی روشنی میں سورہ فاتحہ کا ایک تفسیری خاکہ درج کیا جاتا ہے۔

تفسیر سورہ فاتحہ

سورہ فاتحہ قرآن مجید کا پہلا سورہ ہے جو فاتحہ الکتاب' ام القرآن اور سبع مثانی کے نام سے موسوم ہے۔ اسے فاتحہ الکتاب قرآن مجید کا افتتاحیہ ہونے کی بنا پر کہا گیا ہے اور ام القرآن اس لئے کہ یہ سورہ تمام مطالب قرآنی کا خلاصہ اپنے اندر رکھتا ہے اور سبع مثانی (سات دہرائی جانے والی آیتیں) اس وجہ سے کہ ہر نماز کی پہلی اور دوسری رکعت میں اس کا دہرانا واجب ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

ولقد اتیناک سبعا من المثانی۔ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی آیتیں دی ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ۔

السبع المثانی فاتحہ الکتاب۔ سبع مثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے۔

بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی لکھا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوا اور ایک دفعہ مدینہ میں اور اسی تکرار نزول کی وجہ سے اسے سبع مثانی کہا گیا ہے۔ لیکن اکثر کے نزدیک یہ سورہ مکی ہے اور یہی امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے چنانچہ ابن جوزی نے تحریر کیا ہے۔

انها مکیہ و ہو مروی عن علی ابن ابی طالب۔ (زاد المسیر ج ۱ ص ۱۰)

سورہ فاتحہ مکی ہے اور یہ قول علی ابن ابی طالب سے مروی ہے۔

حضرتؑ کا یہ قول ہی مشہور و معتبر ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ سبعا من المثانی جس سے مراد سورہ فاتحہ ہے سورہ حجر کی آیت ہے اور سورہ حجر بالاتفاق مکی ہے لہٰذا سورہ فاتحہ کو بھی مکی ہونا چاہئے اور اس لئے بھی کہ سورہ فاتحہ نماز کا لازمی جزو ہے اور نماز مکہ ہی میں شروع ہو چکی تھی۔

یہ سورہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

انہ سئل عن السبع المثانی فقال الحمد للہ رب العالمین فقیل لہ انما ھی ست یات فقال بسم اللہ الرحمن الرحیم ایتہ۔ (اتقان ج ۱ ص ۷۹)

حضرت علی علیہ السلام سے سبع مثانی کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد سورہ الحمد ہے کہا گیا کہ اس کی چھ آیتیں ہیں فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی تو ایک آیت ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جزو قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فاتحہ الکتاب سبع آیات ولھن بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ (تفسیر بیضاوی ص ۳)

سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور ان میں کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔

جو لوگ بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جزو نہیں سمجھتے وہ سات آیتوں کی گنتی اس طرح پوری کرتے ہیں کہ صراط الذین انعمت علیھم کو چھٹی آیت اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کو ساتویں آیت قرار دیتے ہیں اور جو اسے جزو سورہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک یہ ایک ہی آیت ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ظاہر ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی پہلی آیت اور اس کا جزو ہے بلکہ دوسرے سوروں میں بھی اس کی حیثیت جزو سورہ اور مستقل آیت کی ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

والتسمیہ فی اول کل سورہ ایہ منہا و انما کان یعرف انقضاء السورہ بنزولہا۔ (صافی)

ہر سورہ میں بسم اللہ اس سورہ کی ایک آیت ہے اور اس کے نازل ہونے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلا سورہ ختم ہو گیا ہے۔

البتہ سورۂ برأت کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لم ینزل بسم اللہ الرحمن الرحیم علی واس سورہ برأتہ لاف بسم اللہ الامان والرحمتہ ونزلت برأتہ لرفع الامان و للسیف۔ (جوامع الجامع طبرسی)

سورہ برأت کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہے اس لئے کہ بسم اللہ امان و رحمت کے لئے ہے اور سورہ برأت امان کی برطرفی اور تلوار کے لئے نازل ہوا ہے۔

بہرحال بسم اللہ سورہ فاتحہ کا ایک جزو ہے جسے نماز میں سورہ فاتحہ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ سورہ فاتحہ نماز کا لازمی جز ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ **لاصلواہ الابفاتحہ الکتاب** (سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی) اور بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے جس کے بغیر سورت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے کچھ لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ سورہ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ نہیں پڑھتے آپ نے اس پر بگڑ کر فرمایا۔

ھی ایتہ من کتاب اللہ انساھم ایاھا الشیطان۔ (تفسیر برہان)

بسم اللہ قرآن کی آیت ہے اور شیطان نے یہ آیت انہیں بھلا دی ہے۔

صحابہ بسم اللہ کو نہ صرف سورہ فاتحہ کا بلکہ سورہ برأت کے علاوہ ہر سورت کا جزو سمجھتے تھے اور فرادی و باجماعت نمازوں میں برابر پڑھتے اور سنتے آئے تھے۔ اسی لئے جب معاویہ نے مدینہ میں نماز بالجہر پڑھائی اور سورہ فاتحہ کے بعد دوسرا سورہ بغیر بسم اللہ کے پڑھ دیا تو ہر طرف سے انصار و مہاجرین کی آوازیں آئیں کہ۔

یا معاویہ اسرقت الصلواہ ام نسیت۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۳۳)

اے معاویہ تم نے نماز میں چوری کی ہے یا بھول کر ایسا کیا ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام تمام نمازوں میں وہ جہری ہوں یا اخفاتی بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ فخرالدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان علیا کان مذھبہ الجھر ببسم اللہ فی جمیع الصلوات۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۹)

حضرت علی علیہ السلام کا مسلک جہر تھا اور وہ تمام نمازوں میں بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

یہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلک اور ان کا طرز عمل تھا۔ چنانچہ ابو ہریرہ دوسی کہتے ہیں۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم یجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔

ابن عباس کہتے ہیں۔

كان رسول الله عليه واله وسلم يجهر بسم الله الرحمن الرحيم۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۰۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔

انس ابن مالک کہتے ہیں کہ۔

صليت خلف النبي صلى الله عليه واله وسلم و خلفه ابی بکر و خلفه عمروخلف عثمان و خلف علی فکلهم کانوا یجهرون بقراۃ بسم الله الرحمن الرحيم۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۳۴)

میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں اور ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ اور حضرت علی علیہ السلام کی بھی اقتداء کی ہے اور سب کے سب بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

سورہ فاتحہ اگرچہ سات آیتوں کا مختصر سا سورہ ہے مگر ان تمام تعلیمات پر حاوی ہے جو قرآن مجید میں بہ تفصیل بیان ہوئے ہیں قرآن مجید کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ اعتقاد اور عمل ہے۔ اعتقاد کا تعلق مبداء و معاد سے ہے اور عمل کا تعلق عبادت و استداد سے۔ چنانچہ **الحمد للہ** میں مبداء کائنات کا ذکر ہے جو اپنے صفات کمالیہ کی بنا پر ہر ستائش کا سزاوار ہے اور **رب العالمین** میں اس کی صفت ربوبیت کا اور **الرحمن الرحیم** میں اس کی صفت رحمت کا اور **مالک یوم الدین** میں اس کی صفت عدالت اور جزا و مکافات کے قانون کا تذکرہ ہے اور **ایاک نعبدو ایاک نستعین** میں اس کی عبادت و پرستش اور اس سے استعانت کا اعتراف ہے اور **اهدنا الصراط المستقیم** میں اس سے ہدایت و استقامت کی طلب و خواہش ہے کیونکہ وہی ہدایت کی توفیق دیتا اور رہنمائی کا سروسامان کرتا ہے۔ پھر اطاعت و عصیان کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا ہے پہلا گروہ وہ جو راہ راست پر ثابت قدم ہے یہ انعام یافتہ گروہ ہے کیونکہ ہدایت اور ہدایت پر ثبات سب سے بڑا انعام ہے اور دوسرا گروہ وہ جو ہوائے نفس کے زیر اثر عمداً حق سے روگرداں ہے یہ گروہ وہ ہے جو اپنی کجروی و کج ذہنی کے نتیجہ میں غضب الٰہی کا مستحق ہے اور تیسرہ گروہ وہ جو اپنی کوتاہی کی بنا پر گمراہی میں پڑا ہوا ہے پہلے گروہ کی طرف **صراط الذین انعمت علیهم** سے اور دوسرے گروہ کی طرف **غیر المغضوب علیهم** سے اور تیسرے گروہ کی طرف **ولاالضالین** سے اشارہ کیا ہے اس طرح اعتقاد و عمل اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج و اثرات کا اس میں ذکر آگیا ہے اور یہی اعتقاد کی پختگی اور عمل کی درستی' قرآن کا بنیادی مقصد ہے جو اس سورہ میں اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس سورہ کی جامعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

علم القران کله فی سوره الفاتحه۔ (بحارالانوار)

قرآن کا پورا علم سورہ فاتحہ میں سمو دیا گیا ہے

سورہ فاتحہ میں قرآنی معارف راز سربستہ کی صورت میں موجود ہیں مگر عام اہل علم ظواہر الفاظ کی حد تک معانی کی نقاب کشائی کر سکتے ہیں اور اس کے بواطن کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ کر اس کے حکم و اسرار کا استخراج ان

کے بس کی بات نہیں ہے یہ راسخون فی العلم اور وارثان علم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام ہے کہ وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے علوم و معارف کے دفتر ترتیب دیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابن عباس رات کے وقت امیرالمومنین علیہ السلام کے ہاں آئے اور تفسیر قرآن کے متعلق کچھ سمجھنا چاہا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ قرآن کا پہلا سورہ کون سا ہے کہا سورہ فاتحہ فرمایا سورہ فاتحہ کی ابتداء کیا ہے کہا بسم اللہ فرمایا بسم اللہ کی ابتداء کیا ہے کہا بسم فرمایا بسم کی ابتداء کیا ہے کہا با اس کے بعد حضرتؑ نے با کی تفسیر کرنا شروع کی یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور یہ کہہ کر سلسلہ بیان ختم کیا کہ

لوز ادنا اللیل لزدنا۔ (تفسیر برہان)

اگر رات میں اور گنجائش ہوتی تو ہم اور بیان کرتے۔

حضرتؑ کا مشہور قول ہے کہ۔

لوشئت لاوقرت سبعین بعیرامن تفسیر فاتحہ الکتاب۔ (احیاء العلوم ج ۱ ص ۲۶۰)

اگر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان کروں تو ستر اونٹوں کے بار کے برابر ہو جائے۔

اب اس سورہ کی ہر آیت کے ذیل میں حضرتؑ کا ایک ایک تفسیری قول درج کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم "خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن و رحیم ہے" آیت کے شروع میں با حرف جار اور اسم مجرور ہے۔ کلام عرب میں جارو مجرور کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے یہاں لفظ ابتداء قرار دیا گیا ہے اسی تعلق کی بنا پر بسم اللہ کا ترجمہ "اللہ کے نام پر شروع کرتا ہوں" کیا جاتا ہے۔ حضرت نے اس کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا۔

استعین علی اموری کلھا باللہ الذی لاتحق العبادہ الالہ المغیث اذا استغیث و المجیب اذا دعی۔ (صافی)

میں ہر کام میں اس اللہ سے مانگتا ہوں جس کے علاوہ کوئی عبادت کا سزاوار نہیں مدد ہے جب اس سے فریاد کی جاتی ہے تو فریاد کو پہنچتا ہے اور جب اسے پکارا جاتا ہے تو سنتا ہے۔

الحمدللہ "تمام تعریف اللہ کے لئے ہے" حمد کے معنی توصیف و ثناء کے ہیں اور اللہ کی ان گنت نعمتوں اور بے پایاں احسانوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تحمید و ستائش کی جائے اور یہ حمد و ستائش ایک طرح سے اعتراف ہے اس کے انعامات و احسانات کا چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ سے الحمد للہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؑ نے فرمایا۔

ان اللہ عرف عبادہ بعض نعمہ علیھم جملا اذ لا یقدرون علی معرفتہ جمیعھا بالتفصیل لانھا اکثر من ان تحصی اوتعرف فقال قولوا الحمد للہ علی ماانعم بہ علینا۔ (صافی)

اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی نعمتیں اجمالی طور پر پہچنوائی ہیں اور یہ بات ان کے بس میں نہیں ہے کہ اس کی تمام نعمتوں کو بالتفصیل پہچان سکیں اس لئے کہ نہ ان کا شمار ہو سکتا ہے اور نہ انہیں جانا جا سکتا ہے لہٰذا اس نے فرمایا کہ تم یہ کہو کہ تمام حمد اللہ کے لئے ہے ان انعامات کے مقابلہ میں جو اس نے ہمیں دئے ہیں۔

اللہ اس ان دیکھی اور غیر محسوس ہستی کا اسم ذات ہے جس کے ادراک سے بشری عقول عاجز اور انسانی حواس درماندہ ہیں، وہ ہمارے ادراک سے بالاتر ہے اور جوں جوں اس ذات مجرد کے بارے میں غور و خوض کیا جاتا ہے حیرت و سرگشتگی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اللہ معناہ المعبود الذی یالہ فیہ الخلق۔ (توحید صدوق)

اللہ سے مراد وہ معبود ہے جس کے بارے میں کائنات حیران و سرگرداں ہے۔

اگرچہ وہ تعقل و ادراک کے حدود سے باہر ہے مگر انسان کائنات کو دیکھ کر خالق کائنات کا شعوری احساس رکھتا ہے اور اسے آخری امید گاہ سمجھ کر اپنی حاجتیں اس سے وابستہ کرتا ہے حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ھوالذی یتالہ الیہ کل مخلوق عندالحوائج ولشدائد اذا انقطع المرجاء من کل من دونہ وتقطع الاسباب من جمیع من سواہ۔ (صافی)

جب سب سے امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں اور کوئی وسیلہ و ذریعہ باقی نہیں رہتا تو اللہ وہ ہے جس کی طرف ہر مخلوق حاجت روائی و مشکل کشائی میں رجوع کرتی ہے۔

رب العالمین "وہ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے" رب صفت مشبہ بمعنی اسم فاعل ہے جس کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہی تمام خلق کائنات کا پالنے والا اور ہر ایک کے حسب حال و حسب ضرورت زندگی و بقا کا سامان مہیا کرنے والا ہے۔ حضرتؑ نے لفظ رب کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

مالکھم وخالقھم وسائق ارزاقھم الیھم من حیث یعلمون ولا یعلمون۔ (برہان)

وہ تمام خلائق کا مالک خالق اور جانی اور انجانی جگہوں سے رزق پہنچانے والا ہے۔

عربی زبان میں، مالک کے لئے رب کی لفظ عام طور پر استعمال ہوتی ہے اللہ کے لئے اس کا استعمال اضافت کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور بغیر اضافت کے بھی اور اللہ کے علاوہ دوسروں کے لئے اس کا استعمال اضافت کے ساتھ ہو

گا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

قال ارجع الی ربک۔ (یوسف نے) کہا اپنے مالک کے پاس پلٹ جاو۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے کہا۔

ارب غنم انت ام رب ابل۔ کیا تم بکریوں کے مالک ہو یا اونٹوں کے۔

ایک عرب شاعر نے کہا ہے۔

فاذا انتشیت فاننی رب الخور نق والسدیر

جب میں نشہ کی حالت میں ہوتا ہوں تو میں اپنے کو شاہان حیرہ کے خورنق و سدیر کا مالک سمجھتا ہوں۔

واذا صحوت فاننی رب الشو یھتہ والبعیر۔

اور جب ہوش میں آتا ہوں تو بکریوں اور اونٹوں کا مالک رہ جاتا ہوں۔

مالک کو رب اس لئے کہا جاتا ہے کہ مالک ہی اپنی زیر ملکیت اشیاء کی دیکھ بھال کرتا اور ان کی زندگی و بقا کا نگراں ہوتا ہے دوسری لفظ خالق ہے۔ بظاہر خلق اور ربوبیت دو الگ الگ صفتیں ہیں اور خلق سے ربوبیت کا مفہوم نہیں نکلتا مگر حقیقت یہ ہے کہ جہاں تخلیق کسی مقصد کے پیش نظر ہو گی وہاں ربوبیت کی کارفرمائی بھی لازماً ہو گی۔ چنانچہ یہ صفت ربوبیت ہی کا تقاضا تھا کہ اس نے کائنات کو پیدا کیا تاکہ اس کی ربوبیت کا فیضان جاری و ساری ہو اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ اس سے بہرہ یاب ہو۔ لہٰذا اللہ کی صفت تخلیق سے ربوبیت کو اور ربوبیت سے تخلیق کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تیسری لفظ رازق ہے۔ رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے زندگی و وجود کی بقا اور نشو و نما کی تکمیل وابستہ ہے۔ ان چیزوں کے مہیا کرنے کا نام رازقیت ہے اور ان اشیاء کے تسلسل کا نام ربوبیت ہے لہٰذا جو رزق رسانی سے تربیت و پرورش کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہے وہ رازق بھی ہو گا۔

الرحمن الرحیم "جو رحمٰن اور رحیم ہے" رحمن اور رحیم دونوں کا ماخذ رحم ہے جو اللہ کی صفت رحمت کا پتا دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رحمٰن اس رحمت کو بتاتا ہے جو عام اور سب کو شامل ہے اور رحیم اس رحمت کی خبر دیتا ہے جو مومنین سے مخصوص ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الرحمن الذی یرحم ببسط الرزق علینا لا جمیع بنافی دینا و دنیانا و اخرتنا۔ (توحید صدوق)

رزق کے پھیلاؤ کی بنا پر وہ رحمٰن ہے اور دین و دنیا میں توفیق دینا اور آخرت کی کامیابی عطا کرنے کی بنا پر وہ رحیم ہے۔

خداوند عالم کی وہ رحمت جو دنیا میں جاری و ساری ہے عمومیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اس نے دنیوی سامان معیشت کو طبیعی قوانین کے تابع رکھا ہے اور ان قوانین کے نتائج سب کے لئے یکساں قرار دیئے ہیں خواہ کوئی کافر ہو یا مسلمان، مطیع ہو یا نا فرمان۔ دنیوی نعمتوں سے استفادہ کا موقع جس طرح ایک مومن و مسلم کو حاصل ہے اسی طرح ایک کافر کو بھی میسر ہے۔ دونوں کے لئے سرو سامان زندگی موجود اور رزق و روزی کے اسباب فراہم ہیں اور اس کی عمومی رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بلا امتیاز کفرو اسلام سب کی پرورش کا سرو سامان کرے اور اس کی خصوصی رحمت مومنین تک محدود ہے کہ دنیا میں انہیں ایمان و عمل صالح کی توفیق بخشی اور آخرت میں فوز و کامرانی ان کے پائے نام کی۔ اگرچہ دنیا میں انہیں تکالیف و شدائد کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے مگر یہ رنج و زحمت اور دنیوی خوشی ہی سے محرومی اللہ کی غضبناکی کا نتیجہ نہیں ہے کہ انہیں اخروی رحمت سے محروم قرار دے لیا جائے اور کفار پر دنیوی نعمتوں کی فراوانی ان سے خوشنودی کا اظہار نہیں ہے کہ آخرت میں اس کے غضب سے بچ جائیں۔ خدا وند عالم کی ذات غضب و رحمت دونوں کی مظہر ہے اسے ایک جگہ رحمت کے تقاضوں کو بروئے کار لانا' دوسری جگہ غضب کے اظہار سے مانع نہیں ہوتا اور ایک جگہ کی نمود دوسری جگہ رحمت کی کارفرمائی سے عناں گیر نہیں ہوتی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

لایشغلہ غضب عن رحمتہ ولا تلھیہ رحمتہ من عتابہ۔(نہج البلاغہ)

غضب کے شرارے اسے رحمت کے فیضان سے روکتے نہیں ہیں اور نہ رحمت کی فراوانی اسے سزا و عقاب سے غافل کرتی ہے۔

مالک یوم الدین "وہ روز جزا کا مالک ہے" دین کے معنی جزاو مکافات کے ہیں اور یوم الدین سے مراد یوم حشر ہے۔ جس میں اچھے کاموں کی جزا اور برے کاموں کی سزا دی جائے گی۔ اس دن تمام اختیارات اللہ کو ہوں گے اور ہر چیز اسی کے قبضہ قدرت میں ہو گی۔ یوں تو دنیا و آخرت میں اللہ ہی مالک و مختار ہے مگر آیت میں یوم آخرت کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ دنیا میں اللہ کے علاوہ انسان بھی مالک کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں اگرچہ ان کی ملکیت چند روزہ اور عارضی ہوتی ہے اور آخرت میں تو صرف اللہ ہی ہر لحاظ سے مالک ہو گا اور اس کے علاوہ نہ کوئی مالک ہو گا اور نہ کوئی صاحب اختیار و قدرت۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انہ یملک نواصی الخلق یوم القیامتہ۔(بحار)

قیامت کے دن تمام مخلوقات اسی کے قبضہ قدرت میں جکڑی بندھی ہو گی۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" اس آیت میں عبادت و استعانت دونوں کا حصر اللہ کی ذات میں کیا گیا ہے یعنی صرف وہی عبادت کا سزاوار ہے اور بس اسی سے مدد مانگی جا

سکتی ہے۔ اگر اس کی مدد کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو نہ عبادت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی نیک کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے عبادت کرتا ہے مگر اعضاء و جوارح اور قوت و طاقت اسی کی دی ہوئی ہے اور عمل خیر کی توفیق بھی اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہٰذا عبادت کے ساتھ استعانت کے پیوند کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اس عبادت کے بجا لانے کی توفیق اور قوت و طاقت کی بحالی بھی اسی سے طلب کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کی توفیق و اعانت نہ ہو تو نہ شیطان کے وسوسوں اور نفس کی چیرہ دستیوں سے بچا جا سکتا ہے اور نہ عبادت و اعمال خیر کو اتمام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ وہ مستقلاً" اعمال و عبادات بجا لاتا ہے اور اس میں اللہ کی مدد و توفیق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے وہ مفوضہ کے طریق کار کا پیرو ہو گا اور جو معبود حقیقی کی پرستش میں دوسروں کو بھی شریک کرے وہ شرک کا مرتکب قرار پائے گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

انا نعبد اللہ ولا نشرک بہ شیاء و انا نستعین باللہ عزو جل علی الشیطان الرجیم۔

ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے اور شیطان مردود کے خلاف اس سے مدد چاہتے ہیں۔

اھدنا الصراط المستقیم "ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما" ہدایت کے معنی رہبری و رہنمائی کے ہیں اور صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے جو ٹیڑھی میڑھی راہوں میں سیدھی راہ ہے اور اسی راہ کی طرف ہدایت و رہنمائی کی برکات میں دعا مانگی جاتی ہے۔ اس ہدایت طلبی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دعا مانگنے والا صراط مستقیم پر نہیں ہے یا اسے صراط مستقیم پر ہونے میں شبہ ہے بلکہ یہاں ہدایت کے معنی ثبات و استقامت کے ہیں اگر ایک شخص دوسرے آدمی سے جو بیٹھا ہوا ہو یہ کہے کہ میرے واپس آنے تک بیٹھے رہو تو اس کے یہ معنی نہیں لئے جائیں گے کہ وہ بیٹھا ہوا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہو گا کہ جس طرح بیٹھا ہے اسی طرح بیٹھا رہے اسی طرح اللہ سے طلب ہدایت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تو نے پہلے ہماری رہنمائی کی ہے اسی طرح ہر لحظہ و ہر آن ہماری ہدایت کا سلسلہ جاری رکھ اور ہمیں راہ حق پر ثبات کی توفیق دے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے۔

اوجعلنا توفیقک الذی اطعناک بہ فی ماضی ایامنا حتی نطیعک فی مستقبل اعمارنا۔ (صافی)

اپنی اس توفیق کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھ جس کے ذریعہ ہم نے اپنے گزشتہ دنوں میں تیری اطاعت کی یہاں تک کہ ہم اپنی زندگی کے آنے والے دنوں میں تیری اطاعت کرتے رہیں۔

اس معنی کی شاہد یہ آیت قرآنی ہے۔

وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعو السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔

اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے تم اسی پر چلتے رہو اور دوسری راہوں پر نہ چلنے لگو کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر پراگندہ و منتشر کر دیں۔

اللہ نے پہلے صراط مستقیم کے متعلق یہ بتایا کہ وہ سیدھا راستہ ہے جس میں کوئی کجی' الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے اور پھر اس کی پیروی کا حکم دیا اور پیروی کے معنی یہی ہیں کہ اس پر ثبات قدم کے ساتھ جما جائے تاکہ ٹیڑھی ترچھی راہوں میں بھٹکنے سے محفوظ رہیں۔

صراط الذین انعمت علیھم "ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے" آیت کے اس جزو میں صراط مستقیم کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ کے انعامات ہوئے۔ یہ انعامات مال و زر' جاہ و حشم اور شاہی و فرمانروائی کی صورت میں نہ تھے کہ دولتمندوں اور شہنشاہوں کے طریق کار کی روشنی میں صراط مستقیم کا سراغ لگایا جائے بلکہ یہ نبیوں' راستبازوں' شہیدوں اور نیک بندوں کی شاہراہ ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ھم الذین قال اللہ تعالی من یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین والصدیقین والشھداء والصالحین و حسن اولئک رفیقا۔

وہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یہ انعام یافتہ گروہ نبیوں صدیقوں شہیدوں اور نیکو کار بندوں کا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

غیر المغضوب علیھم ولاالضالین "نہ ان کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے" یہ صراط مستقیم کی دوسری پہچان ہے یعنی سیدھی راہ وہ ہو گی جو مورد غضب قرار پانے والوں اور گمراہ ہونے والوں کی راہ نہ ہو۔ مغضوبین سے مراد وہ گروہ ہے جو حق کو جاننے پہچاننے کے باوجود حق کو ماننے سے انکار کرے اور ضالین کا گروہ وہ ہے جو حق کو پہچاننے کی کوشش ہی نہ کرے اور تحقیق حق کے بجائے جس عقیدہ پر ہے اسی عقیدہ پر جما رہے۔ پہلا گروہ یہود کا ہے جن کا رویہ اسلام کے خلاف ہمیشہ معاندانہ رہا اور حق کو سمجھنے کے باوجود عمداً" حق سے انحراف کرتے رہے اور اسی انکار و عناد کے نتیجہ میں غضب الہی کے مستحق قرار پائے اور دوسرا گروہ نصاریٰ کا ہے جن کا طرز عمل اگرچہ معاندانہ نہ تھا مگر وہ عصبیت کا شکار ہو گئے اور راہ حق سے بھٹک کر گمراہی میں پڑے رہے۔ یہ دونوں گروہ

مغضوبین و ضالین کا واضح مصداق ہیں۔ چنانچہ قیصر روم نے امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ سورہ فاتحہ میں جنہیں مغضوبین اور ضالین کہا گیا ہے وہ کون لوگ ہیں حضرتؑ نے جواب میں فرمایا کہ مغضوبین سے مراد یہود ہیں جیسا کہ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔

وباء و بغضب من اللہ۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔

اور ضالین سے مراد نصاری ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وضلوا عن سواء السبیل۔ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

حضرتؑ نے مغضوبین و ضالین کے تحت یہود و نصاری کا ذکر ان کے مغضوبیت و گمراہی میں نمایاں ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ مغضوبین سے مراد صرف یہود اور ضالین سے مراد صرف نصاریٰ ہیں بلکہ جو بھی حق کو سمجھنے کے باوجود حق سے منہ موڑے وہ مغضوب ہو گا اور جو بھی حق کو تلاش کرنے کے بجائے باطل عقیدہ پر جما رہے وہ گمراہ ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

کل من کفر باللہ فھو مغضوب علیھم و ضال عن سبیل اللہ۔ (صافی) جو بھی اللہ کے ساتھ کفر اختیار کرے وہ غضب ہی کا مستحق اور اللہ کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

اس سورہ کے معانی جو حضرتؑ کے ارشادات کی روشنی میں درج کئے گئے ہیں وہ سرچشمہ و ماخذ ہیں ان تمام بنیادی مطالب اور تفصیلات کا جو کتب تفاسیر میں تحریر ہیں۔

تنویع قرآن

امیرالمومنین علیہ السلام جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد قرآن مجید کے علوم و معارف اور آیات کے معانی و مطالب پر سب سے زیادہ گہری نظر رکھتے تھے انہوں نے جہاں ترتیب نزول کے مطابق قرآن کی جمع آوری فرمائی وہاں معانی و مطالب کے لحاظ سے آیات کی ترتیب و تدوین بھی فرمائی اور ناسخ و منسوخ، عام و خاص، مطلق و مقید، رخص و عزائم، محکم و متشابہ، عبر و امثال، مجمل و مبین وغیرہ کے تحت مندرجات قرآن کے الگ ابواب ترتیب دیئے اور قرآنی علوم، شرح و بسط سے بیان کئے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بنیادی اقسام کے سلسلہ میں فرمایا۔

ان اللہ تبارک و تعالی انزل القرآن علی سبعۃ اقسام کل قسم منھا کاف شاف وھی امرونھی و ترغیب و ترھیب و جدل و مثل وقصص۔(صافی)

خداوند تبارک تعالی نے قرآن مجید کو سات قسموں پر نازل کیا ہے اور ہر قسم اپنی مقام پر کافی و شافی ہے اور وہ سات قسمیں یہ ہیں امر' نہی' ترغیب' تخویف' مجادلہ' امثال اور قصص۔

اس اجمالی تقسیم کے بعد آیات کی ساٹھ قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ محمد ابن ابراہیم ابن جعفر کی تفسیر جو حضرتؑ کے ارشادات پر مشتمل ہے اور بحارالانوار کی انیسویں جلد میں چھبیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے ان ساٹھ اقسام کا تفصیلی بیان موجود ہے مثلاً" قرآنی آیات میں کہاں لفظ عام اور معنی خاص ہیں اور کہاں لفظ خاص اور معنی عام ہیں کہاں پر لفظ واحد اور معنی جمع کے ہیں اور کہاں پر لفظ جمع ہے اور معنی واحد کے ہیں' کہاں پر لفظ ماضی ہے اور معنی مستقبل کے ہیں' کہاں پر الفاظ مختلف اور معانی متفق ہیں اور کہاں پر الفاظ متفق اور معانی مختلف ہیں' اس طرح کہ ایک آیت میں ایک لفظ کے معنی کچھ اور ہیں اور دوسری آیت میں کچھ اور مثلاً" لفظ خلق مختلف جگہوں پر چار معنوں میں' لفظ فتنہ پانچ معنوں میں' لفظ نور چھ معنوں میں' لفظ وحی سات معنوں میں اور لفظ قضا دس معنوں میں وارد ہوا ہے۔ یونہی لفظ امت ضلال' ظلم' شرک وغیرہ کے مختلف معانی ان کے مواقع استعمال کے لحاظ سے بیان فرمائے ہیں اور ہر معنی کے سلسلہ میں ایک یا چند آیتیں بطور استشہاد پیش کی ہیں۔ اسی طرح مختلف فرقوں' بت پرست' مجوس' نصاریٰ' یہود' ملاحدہ' جبریہ' دہریہ وغیرہ کے عقائد باطلہ کی رد میں جو آیتیں وارد ہوئی ہیں انہیں الگ الگ عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ بلا شبہ قرآنی آیات کی تنویع اور معانی و مطالب کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی بنیاد آپؑ کے ہاتھوں پڑی اور جن لوگوں نے معانی قرآن' علوم قرآن اور احکام قرآن کے سلسلہ میں کام کیا ہے ان سب پر آپؑ کو تقدم حاصل ہے۔

علم التجوید

اصطلاح قراء میں تجوید کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ قرآن کو اس طرح پڑھا جائے کہ حروف اپنی صوتی کیفیت کے ساتھ اپنے مخارج سے ادا ہوں اور جس مقام پر وقف ہونا چاہیئے وہاں وقف کیا جائے اور جہاں وقف نہ ہونا چاہیئے وہاں وقف نہ کیا جائے۔ یہ علم اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے لئے وہ عرب کا باشندہ ہو یا عجم کا نماز میں قرآن کی تلاوت صحیح تلفظ کے ساتھ ضروری ہے۔ اگر ادائے حروف میں صوتی کیفیت اور مخارج کا لحاظ نہ کیا جائے تو بعض حروف دوسرے حروف سے مشتبہ ہو جائیں گے جیسے ط اور ت' ہ اور ح' ض اور ذ' وغیرہ۔ جس کے یا تو معنی میں تغیر پیدا ہو جائے گا یا لفظ ہی بے معنی ہو جائے گا۔ اس لئے نماز کی صحت اور قرآن کے

لفظی و معنوی تحفظ کے لئے حروف کی صحیح ادائیگی اور وقف شناسی ضروری ہے۔

وقف یہ ہے کہ کسی کلمہ کے آخری حرف پر سانس روک کر ٹھہرایا جائے یا متحرک کو ساکن کر دیا جائے یا گول ت کو ہ سے یا تنوین مفتوح کو الف سے بدل دیا جائے۔ ایسے کلمہ پر وقف کرنا جسے اپنے مابعد سے نہ لفظی تعلق ہو اور نہ معنوی وقف تام کہلاتا ہے جیسے **اولئک هم المفلحون** اگر مابعد سے معنوی تعلق ہو اور لفظی تعلق نہ ہو تو یہ وقف کافی ہے جیسے **لا ریب فیه** اگر مابعد سے صرف لفظی تعلق ہو تو وقف حسن ہے جیسے الحمد للہ اور اگر مابعد سے لفظی و معنوی دونوں طرح کا تعلق ہو تو یہ وقف قبیح ہے جیسے الحمد پر وقف کیا جائے۔ تلاوت میں یہ امر ملحوظ ہونا چاہئے کہ کہاں پر وقف لازم ہے' کہاں پر اولیٰ' کہاں پر جائز اور کہاں پر قبیح۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہاں پر آیت تمام ہے یا ناتمام ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام حفظ قرآن کے ساتھ ادائے حروف و صحت تلفظ پر پورا اقتدار رکھتے اور اوقاف کی پابندی کرتے تھے اور ترتیل قرآن کے معنی بھی یہی ہیں کہ تلاوت میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔ چنانچہ آپ سے **ورتل القرآن ترتیلا** (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو) کے معنی دریافت کئے گئے تو آپؑ نے نہ فرمایا۔

هو حفظ الوقوف وبيان الحروف(صافی)	ترتیل کے معنی اوقاف کی پابندی اور حروف کی صحیح ادائیگی کے ہیں۔

حفظ وقوف سے مراد وقف تام و وقف حسن کی پابندی ہے اور بیان حروف سے مراد یہ ہے کہ جن حروف کے تلفظ میں بھرپور آواز کے نکالنے کی ضرورت ہے انہیں بھرپور آواز سے پڑھا جائے اور جن میں ہلکی اور باریک آواز کے نکالنے کی ضرورت ہے ان میں باریک آواز نکالی جائے اور جہاں زبان کو اوپر اٹھانے کی ضرورت ہے وہاں اوپر اٹھائی جائے اور جہاں نیچے لانے کی ضرورت ہے وہاں نیچے لایا جائے اور تمام حروف کو ان کے مخارج سے اس طرح ادا کیا جائے کہ ان متعلقہ کیفیات پورے طور پر نمایاں ہو جائیں اور ایک حرف سے دوسرے حرف مشتبہ نہ ہونے پائے۔

آداب تلاوت

قرآن مجید، حکم و معارف اور عبرو مواعظ کا معدن اور اخلاق و آداب اور شرعی احکام کا مآخذ ہے۔ اس لئے اس کے تعلیمات کو تازہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تلاوت و تکرار کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

فاقرو اما تیسر من القرآن۔ جتنا قرآن باسانی پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

قرآن مجید کی تلاوت عبادات میں شامل ہے اور دوسری عبادات کی طرح اس کی تلاوت کے بھی کچھ آداب ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ قرآن کی تلاوت اور دوسری کتابوں کے پڑھنے میں فرق وامتیاز رہے۔ یہ آداب کچھ قاریؑ قرآن سے متعلق ہیں کچھ عمومی تلاوت سے، کچھ مخصوص سورتوں اور آیتوں کی تلاوت سے اور کچھ ختم قرآن سے۔ ذیل میں حضرتؑ کے چند ارشادات آداب تلاوت کے سلسلہ میں درج کئے جاتے ہیں۔

قاری قرآن کو چاہئے کہ وہ وضو و طہارت کے ساتھ تلاوت کرے کیونکہ قرآن مجید کے حروف کو بغیر وضو کے چھونا جائز نہیں ہے اور اس کی حرمت و تقدیس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایقرء العاقل القرآن اذا کان علی غیر طهر حتی یتطهر له(تحف العقول) جب تک کوئی عاقل و ذی شعور طہارت و پاکیزگی کی حالت میں نہ ہو قرآن کی تلاوت نہ کرے۔

حروف و الفاظ قرآن صاف ادا کرے۔ اس طرح کہ مد، قصر، غنہ وغیرہ نمایاں ہوں اور اتنا تیز نہ پڑھے کہ الفاظ خلط ملط ہو جائیں اور نہ اتنا رک رک کر کہ مرتبط الفاظ کی کڑیاں الگ ہو جائیں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

بینه تبیینا ولا تهذه هذ الشعرولا تنشره نثره الرمل ولکن فزعو اقلو بکم القاسیته ولا یکن هم بختم اخر السوره۔ (مقدمہ صافی) قرآن کے الفاظ کو واضح طور پر ظاہر کرو اور شعروں کی طرح جلد جلد نہ پڑھو اور نہ اس کے الفاظ کو ریت کے ذروں کی طرح بکھیرو بلکہ اپنے سخت دلوں میں خوف کا جذبہ پیدا کرو اور یہ طے نہ کرلو کہ بہرحال سورہ کو ختم کرنا ہے۔

قرآن کی تلاوت کے ساتھ اس کے معانی پر نظر رکھے اور اس کے مطالب و مقاصد میں غور و خوض کرے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها۔

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔

جب مسبحات اخیرہ، سورہ حدید، حشر، صف، جمعہ، تغابن اور اعلی پڑھے تو **سبحان اللہ الاعلی** کہے اور جب سورہ التین پڑھے تو آخر میں **و نحن علی ذلک من الشاھدین** کہے اور جب **قولوا امنا باللہ** پڑھے تو **امنا باللہ** کہے اور جب آیہ **ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی** پڑھے تو جس حالت میں ہو درود پڑھے اور جب قرآن ختم کرے تو دعائے ختم قرآن پڑھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام ختم قرآن کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللھم اشرح بالقرآن صدری واستعمل بالقرآن بدنی و نور بالقرآن بصری و اخلق بالقرآن لسانی و اعنی علیہ ماابقیتنی فانہ لاحول ولا قوہ الابک۔
(بحارالانوار)

بارالہا قرآن کے ذریعہ میرا سینہ کشادہ کر قرآن کے ذریعہ میرے بدن کو مصروف عمل رکھ قرآن کے ذریعہ میری آنکھوں کو روشن کر اور قرآن کو میرا ورد زباں قرار دے اور جب تک تو مجھے زندہ رکھے اس سلسلہ میں میری مدد فرما کیونکہ قوت و توانائی کا سہارا ہے تو تو ہے۔

قرآنی استخراج واستنباط

امیرالمومنین علیہ السلام قرآن مجید سے اخذ و استنباط احکام میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے اور جب کسی پیچیدہ مسئلہ میں ذہنی قوتیں سپر انداختہ اور فہم و فراست کی طاقتیں مضمحل ہو جاتی تھیں تو آپ کا ذہن فوراً" قرآن کی طرف پلٹتا اور مشکل سے مشکل مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کردیتے اس طرح کہ نہ کسی کو لب کشائی کی جرأت ہوتی اور نہ قوت استدلال کے سامنے سوال و جواب کی نوبت آتی۔ گویا قرآن مجید کا ایک ایک مخفی گوشہ اپنے تمام حقائق و معارف کے ساتھ آپؑ کی نظروں کے سامنے اس طرح روشن تھا جس طرح چشم بینا کے سامنے آفتاب کا طلوع اور سپیدہ سحر کی نمود۔ اس سلسلہ کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جن سے آپؑ کے ذہنی استحضاء اور قرآن پر ہمہ جہتی عبور کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک شخص نے آپ سے کہا کہ یاامیرالمومنین جن لوگوں سے ہم برسرپیکار ہیں انہیں کس نام سے یاد کریں جبکہ ہم اور وہ ایک ہی نبی کی امت ہیں ہمارا ان کا روزہ و نماز ایک اور حج ایک ہے۔ فرمایا اسی نام سے یاد کرو جس نام سے اللہ نے انہیں اپنی کتاب میں یاد کیا ہے۔ کہا کہ مجھے تو کتاب اللہ کی ہربات کا علم نہیں ہے۔ فرمایا کیا تم نے یہ ارشاد خداوندی نہیں سنا؟

ولو شاء اللہ ما اقتتل الذین من بعد ماجائتھم البینات ولکن اختلفوا فمنھم من امن ومنھم من کفر۔

اگر خدا چاہتا تو وہ لوگ آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن معجزے آچکے تھے مگر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا ان میں سے بعض ایمان لائے اور بعض کافر ہوئے۔

ابن کواء نے حضرتؑ سے پوچھا کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بھی اللہ کسی سے ہم کلام ہوا ہے؟ فرمایا کہ ہاں اللہ نے ہر نیک و بد سے کلام کیا ہے اور سب نے جواب بھی دیا ہے۔ کہا کہ وہ کیسے؟ فرمایا کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیت نہیں پڑھی؟

واذ اخذ ربک من بنی آد م من ظھورھم ذریتھم والشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلی شھدنا۔

اے رسول لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پشتوں سے پیدا ہونے والی نسلوں سے عہد لیا اور انہیں خود ان کے نفسوں پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں سب نے کہا ہاں ہم اس کے گواہ ہیں۔

حضرتؑ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ نماز سے فارغ ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ کیا اللہ ہر جگہ موجود نہیں ہے؟ فرمایا ہاں وہ ہر جگہ ہے۔ کہا پھر کیا ضرورت ہے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جائے؟ فرمایا کیا تم نے اس آیت کی تلاوت نہیں کی؟

وفی السماء رزقکم وما توعدون۔

آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ چیزیں جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

جب رزق اوران چیزوں کا جن کا اللہ نے وعدہ کیا ہے محل آسمان ہے تو رزق اور وعدہ کی ہوئی چیزیں بھی وہیں سے طلب کی جائیں گی۔ قیصر روم نے معاویہ سے دریافت کیا کہ لاشئے کیا ہے؟ اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو عمرو ابن عاص نے کہا کہ یہ علی علیہ السلام ہی بتا سکیں گے۔ تم کسی شخص کو ایک گھوڑا دے کر ان کے پاس بھیجو اور وہ ان سے یہ کہے کہ یہ گھوڑا فروخت کے لئے ہے اور جب وہ قیمت دریافت کریں تو وہ لاشئے بتائے اور وہ جو جواب دیں گے اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کا ایک آدمی گھوڑا لے کر حضرتؑ کے پاس آیا اور بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپؑ نے قیمت پوچھی تو اس نے کہا لاشے۔ حضرتؑ نے قنبر سے کہا کہ گھوڑا لے لو اور اسے صحرا میں لے جا کر سراب (وہ چمکتی ہوئی ریت جس پر پانی کا دھوکا ہوتا ہے) دکھاؤ کہ وہ لاشے ہے اور یہ آیت پڑھی۔

یحسبہ الظمان ماء حتی اذا جاءہ لم یجدہ شیئا۔ پیاسا اسے پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اسے کچھ بھی نہ پایا۔

حضرتؑ سے ایک شخص نے درد شکم کی۔ شکایت کی فرمایا کہ تم اپنی بیوی سے کچھ رقم لو اور اس سے شہد خریدو اور اس میں بارش کا پانی ملا کر پیو۔ پھر فرمایا کہ قرآن مجید میں بارش کے پانی کے بارے میں ارشاد ہے۔

وانزلنا من السماء ماء مبارکا۔ ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا ہے۔

اور شہد کے بارے میں ارشاد ہے۔

یخرج من بطونہا شراب مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس۔ مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جو مختلف رنگوں کی ہوتی ہے اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

اور بیوی کے مہر سے اس کی رضامندی سے لی ہوئی رقم کے بارے میں ارشاد ہے۔

فان طبن لکم عن شئی منہ نفسا فکلوا ھنیأ مریئا۔ اگر تمہاری عورتیں دلی رضامندی سے تمہیں اپنے مال میں سے کچھ دیں تو اسے پاکیزہ و گوارا سمجھ کر کھاؤ برتو

لہٰذا جب کسی گوارا چیز کے ساتھ برکت اور شفا شریک ہو گی تو تم انشاء اللہ شفایاب ہو جاؤ گے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ عذاب خدا سے دو چیزیں باعث امان تھیں! ایک ان میں سے اٹھ گئی مگر دوسری تمہارے پاس موجود ہے لہٰذا اسے مضبوطی سے تھامے رہو۔ وہ امان جو اٹھالی گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم۔ اللہ ان لوگوں پر عذاب نہیں کرے گا جب تک تم ان میں موجود ہو۔

اور وہ امان جو باقی ہے وہ توبہ و استغفار ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون۔ اللہ ان لوگوں پر عذاب نہیں کرے گا جبکہ یہ لوگ توبہ و استغفار کر رہے ہوں گے

علامہ سید رضی نے کہا ہے کہ یہ بہترین استخراج ہے۔

راس الجالوت نے حضرتؑ سے دریافت کیا کہ تمام اشیاء کی اصل کیا ہے۔ فرمایا پانی اور اس آیت کی تلاوت

کی۔

وجعلنا من الماء کل شئی حی۔ ہم نے ہر ذی حیات کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

خواص سور و آیات

قرآن مجید اپنے اسلوب بیان اور حقائق آفرین مطالب کے اعتبار ہی سے معجزہ نہیں ہے بلکہ اپنے گونا گوں خواص و اثرات کے لحاظ سے بھی اعجازی شان کا حامل ہے اور موثر حقیقی نے جس طرح ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ قرار دیا ہے اسی طرح قرآن کے الفاظ و حروف میں خواص و اثرات ودیعت کئے ہیں۔ چنانچہ اس کے سور و آیات ہر مصیبت کی سپر' ہر دکھ کا مداوا اور ہر درد کی دوا ہیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

خیر الدواء القرآن ۔(اتقان ص ۵۱۸) بہترین دوا قرآن ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے جہاں قرآن کے معانی و مطالب اور تفسیری نکات پر روشنی ڈالی ہے وہاں سور و آیات کے خواص و اثرات بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے چند خواص تحریر کئے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص رات کو سوتے وقت سورہ اخلاص پڑھے تو اللہ اپنے فرشتوں کے ذریعہ اس کی حفاظت و نگہداشت کرے گا۔ اگر کوئی فقیر و نادار ہو تو جب اپنے گھر میں قدم رکھے تو گھر والوں پر سلام کرے اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو **السلام علینا من ربنا** کہے اور سورہ **قل ھو اللہ احد** کی تلاوت کرے انشاء اللہ فقر و تنگدستی سے نجات پائے گا۔

اگر کوئی شخص ہر جمعہ کو سورہ نساء کی تلاوت کرے تو فشار قبر سے محفوظ رہے گا۔
اگر کوئی سفر پر جائے تو سوار ہوتے وقت سورہ زخرف کی یہ آیت پڑھے انشاء اللہ سفر پر امن رہے گا۔

سبحان الذی سخرلنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ پاک ہے وہ خدا جس نے اسے ہمارے تابع فرمان کیا حالانکہ ہم ایسے نہ تھے کہ اس پر قابو پاتے اور ہمیں یقیناً اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔

اگر کسی شخص کو کوئی حاجت درپیش ہو تو وہ پنجشبہ کے دن صبح کے وقت گھر سے نکلے اور سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی اس آیت **ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنھار** کی تلاوت **انک لا تخلف المیعاد** تک کرے اور اس کے بعد آیۃ الکرسی' سورہ قدر اور سورہ فاتحہ پڑھے انشاء اللہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔
اگر کسی کی آنکھ دکھنے میں آئے تو آیۃ الکرسی کی تلاوت کرے۔

اگر کوئی شخص سورہ اعراف کی آیت **ان ولی اللہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین** کی تلاوت کرے تو وہ ڈوبنے اور جلنے سے محفوظ رہے گا۔

اگر کوئی شخص سورہ ہود کی یہ آیت پڑھے تو ڈوبنے سے محفوظ رہے گا۔

بسم اللہ مجرھا و مرسھا ان ربی لغفور رحیم

اللہ ہی کے نام سے اس کا بہنا اور ٹھہرنا ہے بیشک میرا پروردگار غفور و رحیم ہے

اگر کوئی شخص سورہ والصفت کی یہ آیت پڑھے تو بچھو وغیرہ کے ڈسنے سے محفوظ رہے گا۔

سلام علی نوح فی العالمین کذلک نجزی المحسنین انہ من عباء نا المومنین۔

تمام جہانوں میں نوح پر سلام ہے ہم نیکی کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں بیشک نوح ایماندار بندوں میں سے تھے۔

اگر کوئی شخص سوتے وقت سورہ بنی اسرائیل کی آیت **قل ادعو اللہ او ادعوا الرحمن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی** کی تلاوت **کبرہ تکبیرا** تک کرے تو چوری سے محفوظ رہے گا۔

جو شخص طلوع آفتاب سے پہلے گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص اور گیارہ مرتبہ سورہ قدر پڑھے وہ اس دن گناہوں سے بچ کر رہے گا۔

اگر کوئی شخص سورہ توبہ کی یہ آیت پڑھے تو درندوں کے حملہ سے محفوظ رہے گا۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمومنین روف رحیم فان تولو افقل حسبی اللہ لاالہ الا ھو علیہ توکلت و ھو رب العرش العظیم۔

تم میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا جسے تمہارا تکلیف اٹھانا شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا انتہائی خواہشمند اور ایمانداروں پر بہت شفیق و مہرباں ہے اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرلیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لئے اللہ کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے اسی پر بھروسا کیا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

اگر کوئی شخص سورہ یونس کی آیت **ان ربکم الذی خلق السموات والارض** کی تلاوت **تبارک اللہ رب العالمین** تک کرے تو وہ پرخطر صحراؤں میں آفات سے محفوظ رہے گا۔

اگر کوئی جانور منہ زوری دکھائے تو اس کے دائیں کان میں سورہ آل عمران کی یہ آیت پڑھی جائے۔

ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعا و کرھا والیہ یرجعون۔	جو مخلوق آسمان میں ہے اور جو لوگ زمین میں ہیں خوشی سے ہو یا ناخوشی سے سب اس کے آگے سرنگوں ہیں اور آخر سب اسی کی طرف پلٹیں گے۔

تدوین حدیث

قرآن مجید کی طرح احادیث بھی شرعی اوامر و نواہی کا سرچشمہ اور دینی احکام کا اہم ماخذ ہیں۔ اگر حدیث کو قابل عمل اور درخود اعتناء نہ سمجھا جائے تو قرآن کی افادیت بھی مضمحل ہو جائے گی اس لئے کہ قرآن کے اکثر احکام مجمل اور شرح طلب ہیں جنہیں احادیث ہی کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر احادیث کو نظرانداز کر کے قرآن کے مفہوم کو اپنی رائے سے متعین کرنے کی اجازت ہوتی تو نماز' روزہ' حج وغیرہ احکام کی کوئی واضح صورت ہی باقی نہ رہتی اور نہ اسلامی اصطلاحات کا کوئی خاص مفہوم متعین ہوتا۔ بلکہ ہر شخص ان اصطلاحات کی من مانی تشریح کر کے یہ سمجھ لیتا کہ وہ قرآن کے اوامر پر عمل پیرا ہے اور اس کے احکام سے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ بیشک قرآن ایک جامع دستاویز ہے مگر اس میں اکثر احکام اجمالا" بیان ہوئے ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد الہی ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم۔	ہم نے تم پر قرآن اتارا تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم انہیں واضح طور سے بیان کرو۔

قرآن کے اسی اجمال و ابہام کی بنا پر جب امیرالمومنین علیہ السلام نے ابن عباس کو خوارج سے گفتگو کے لئے بھیجا تو ان سے فرمایا۔

لاتخاصمھم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوہ تقول ویقولون ولکن ماجحھم بالسنتہ فانھم لن یجدوا عنھا محیصا۔ (نہج البلاغہ)	تم ان سے قرآن کی رو سے بحث نہ کرنا کیونکہ قرآن بہت سے معانی کا حامل ہوتا ہے اور بہت سی وجہیں رکھتا ہے تم اپنی کہتے رہو گے اور وہ اپنی کہتے رہیں گے بلکہ تم حدیث سے ان کے سامنے استدلال کرنا وہ اس کے بعد گریز کی کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔

بہرحال احادیث کی اہمیت وافادیت ناقابل انکار ہے اوراس اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن کی ترتیب و تدوین کے ساتھ احادیث کی بھی جمع آوری کی جاتی اور یہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسلمانوں ہی کا فریضہ تھا کہ وہ

احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حفظ کا سرو ساماں کرتے اور انہیں ضبط تحریر میں لا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیتے۔ مگر ادھر متوجہ ہونے کے بجائے ان کی توجہ ملکی فتوحات پر مرکوز ہو گئی اور کچھ لوگوں نے انفرادی طور پر احادیث کو قلمبند کیا ہو تو کیا ہو مگر اجتماعی طور پر کوئی کام نہ ہو سکا۔ بلکہ یہ اختلاف اٹھ کھڑا ہوا کہ آیا احادیث کو تحریری شکل میں لانا چاہئے یا نہیں۔ یہ اختلاف صحابہ میں بھی تھا اور تابعین میں بھی۔ آخر تابعین کے آخری دور میں یہ اختلاف برطرف ہوا اور اس پر اتفاق رائے ہوا کہ احادیث کو عوام کے حافظہ پر چھوڑنے کے بجائے تحریر میں لانا مستحسن عمل ہے۔ ان لوگوں میں جو تحریر حدیث کی مخالفت میں پیش پیش تھے ایک حضرت عمرؓ بھی تھے چنانچہ جب صحابہ نے انہیں احکام و سنن نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تدوین کا مشورہ دیا تو انہوں نے کہا۔

انی اردت ان اکتب السنن وانی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیها وتر کوا کتاب اللہ وانی واللہ لا البس کتاب اللہ بشئی ابدا۔(تدریب الداوی ج ۲ ص ۶۷)

میرا ارادہ تھا کہ میں سنن نبویہ کو تحریر میں لاؤں مگر مجھے پہلے لوگ یاد آگئے جنہوں نے کتابیں لکھیں اور ہمہ تن انہی کتابوں کے ہو کر رہ گئے اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا خدا کی قسم میں کوئی چیز تحریر میں لا کر کتاب اللہ کو مشتبہ نہیں ہونے دوں گا۔

بلکہ انہوں نے روایت حدیث پر بھی بڑی حد تک پابندی عائد کر دی تھی اور ابن مسعودؓ ابوالدرداء اور ابو ذر غفاریؓ کو اس جرم میں کہ وہ احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بیان کرتے ہیں قید کر دیا تھا اور ابو ہریرہ کو روایت حدیث پر شہربدر کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کچھ حدیثیں جمع کی تھیں مگر انہیں ضائع کر دیا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میرے والد نے پانچ سو حدیثیں قلمبند کی تھیں۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ بڑے بے چین ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو کوئی تکلیف ہے یا کوئی پریشان کن خبر سنی ہے۔ انہوں نے اس وقت تو کچھ نہ کہا جب صبح ہوئی تو مجھے بلا کر کہا۔

ای بنیتہ هلمی الاحادیث التی عندک فجئتہ بها وزعا بنار فحر قها فقلت لا احرقتها قال خشمت ان اموت وهی عندی فیکون فیها احادیث من رجل قد استمنتہ ووتقت ولم یکن کما حدثنی۔ (تذکرہ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۵)

اے بیٹی وہ حدیثیں لاؤ جو تمہارے پاس ہیں میں وہ حدیثیں لے کر آئی تو انہوں نے آگ منگوائی اور انہیں جلا دیا میں نے کہا کہ آپ نے انہیں کیوں جلایا ہے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ حدیثیں میرے پاس رہیں اوران میں ایسی حدیثیں بھی ہوں جو مجھ سے قابل اعتماد لوگوں نے بیان کی ہوں مگر وہ ویسی نہ ہوں جیسے انہوں نے روایت کی ہوں۔

حضرت ابو بکرؓ نے اس مجموعہ میں وہی احادیث درج کی ہوں گی جنہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے

بالمشافہ سنا ہو گا یا ان لوگوں سے سماعت کی ہو گی جنہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا ہو گا اور وہ سب صحابہ ہی تھے جن کی عدالت و راستگوئی پر حرف رکھنا مسلک جمہور کے خلاف ہے پھر خدا جانے انہوں نے کیوں ان کی روایت کردہ احادیث کو قابل وثوق و اعتماد نہ سمجھا اور انہیں جلا کر ناپید کر دینا ضروری خیال کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے نواسے عروہ ابن زبیر نے بھی حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا مگر اسے بے ضرورت سمجھ کر جلا دیا۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں۔

قال معمر عن هشام ان اباه حرق کتبا فیها فقه۔ (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۸۳)

معمر کہتے ہیں کہ مجھ سے ہشام نے بیان کیا کہ ان کے باپ عروہ نے دینی علوم کی تمام کتابیں جلا دیں۔

عروہ خود کہتے ہیں۔

کنا نقول لانتخذ کتابا مع کتاب الله فمحوت کتبی (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۸۳)

ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب نہ رکھنا چاہئے چنانچہ میں نے تمام نوشتوں کو مٹا دیا۔

جب روایت حدیث کی اجازت ہی نہ تھی اور جو چند ایک مجموعے تھے وہ بھی ضائع کئے جا رہے تھے تو پھر تدوین حدیث کی مزید گنجائش کیسے نکل سکتی تھی۔

امیرالمومنین علیہ السلام جہاں تنزیل و تاویل قرآن پر عبور تام رکھتے تھے وہاں احادیث سے بھی پوری طرح باخبر تھے کیونکہ اقوال و ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے براہ راست سننے اور ان سے مستفید ہونے کے جتنے مواقع انہیں ملے وہ کسی اور کو میسر نہیں ہوئے۔ چنانچہ آپ سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ سب سے زیادہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بیان کرتے ہیں فرمایا۔

انی کنت اذا سئلته انبانی و اذا سکت ابتداء نی۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۳۸)

میں آنحضرت سے کوئی چیز دریافت کرتا تو وہ مجھے بتاتے اور خاموش رہتا تو وہ خود مجھ سے بیان کرتے۔

حضرتؑ اس خیال سے کہ احادیث و آثار نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مٹنے نہ پائیں اور یہ علم و ہدایت کا سرمایہ زندہ و پائندہ رہے لوگوں کو یہ تاکید کرتے تھے کہ۔

تذاکروا الحدیث فانکم الاتفعلوا (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۵)

ایک دوسرے سے احادیث بیان کرتے رہو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو حدیث کے آثار مٹ جائیں گے۔

اس کے علاوہ انہیں ضبط تحریر میں لانا بھی ضروری سمجھتے تھے تاکہ ان کے حفظ وبقا کا ساماں ہو سکے۔ چنانچہ

قرآن مجید کی جمع آوری کے ساتھ حدیث کی ترتیب و تدوین کا بھی اہتمام کیا اگرچہ ابورافع' ابوذرغفاری' سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور چند دوسرے افراد نے کچھ حدیثیں قلمبند کیں مگر اس میں سبقت و تقدم کا شرف آپؑ ہی کو حاصل ہے۔ آپؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں حدیث کی تدوین شروع کر دی تھی اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل ایک صحیفہ قلمبند کیا تھا۔ اس صحیفہ کا تذکرہ صحیح بخاری و مسلم میں بھی ہے۔ چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے تحریر کیا ہے۔

عن ابی جحیفتہ قال قلت لعلی ھل عند کم کتاب قال لاالاکتاب اللہ اوفھم اعطیہ رجل مسلم او مافی ھذہ الصحیفتہ۔ (صحیح بخاری ا ص ۶۹)

ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی کتاب ہے فرمایا اللہ کی کتاب ہے یا وہ قوت فہم ہے جو ایک مرد مسلمان کو عطا کی گئی ہے یا وہ جو اس صحیفہ میں تحریر ہے۔

یہ حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھواتے تھے اور آپؑ قلمبند کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ صدوق نے تحریر کیا ہے کہ محمد ابن ذکریا غلابی نے ایک طویل حدیث کے بارے میں شعیب ابن واقدمزنی سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ۔

انہ جمع ھذا الحدیث من الکتاب الذی ھو املاء رسول اللہ وخط علی ابن ابی طالب۔ (امالی صدوق ص ۲۶)

انہوں نے یہ حدیث اس کتاب سے لی ہے جو رسول اللہ نے لکھوائی اور علی ابن ابی طالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

حضرتؑ کا یہ تحریر کردہ صحیفہ دنیائے اسلام کا پہلا مجموعہ حدیث ہے۔ چنانچہ آقائے بزرگ محسن طہرانی رحمتہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

ھذا اول کتاب کتب فی الاسلام من کلام البشر واملاء النبی و خط الوصی۔ (الذریعہ ج ۲ ص ۳۰۹)

یہ دنیائے اسلام میں کلام بشر کی پہلی کتاب ہے جسے نبی اکرم نے لکھوایا اور آپ کے وصی علی ابن ابی طالب نے قلمبند کیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی یہ کتاب آئمہ اہلبیت کے پاس موجود رہی ہے اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے مختلف مواقع پر مسائل شرعیہ کے سلسلہ میں اس کا حوالہ دیا ہے اور اسے کتاب علی صحیفہ الفرائض اور جامعہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان عندنا لصیفۃ یقال لھا الجامعۃ ما من حلال او حرام الا وھو فیھا۔ (فصول ص ۶۳)

ہمارے پاس ایک صحیفہ ہے جسے جامعہ کہا جاتا ہے اور اس میں ہر حلال اور ہر حرام کا ذکر ہے۔

تنویع حدیث

حدیث کا نشر و شیوع رواۃ حدیث کے واسطہ سے ہوا۔ اس طرح کہ فلاں نے فلاں سے سنا اور فلاں نے فلاں سے بیان کیا۔ اس نام بنام سلسلہ رواۃ کو سند کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ سند ہی وہ معیار ہے جس پر حدیث کو پرکھا اور صحیح و سقیم کو جانچا جا سکتا ہے۔ اگر حدیث کے رواۃ ثقہ و راستگو ہوں گے تو حدیث بھی قابل وثوق و اعتماد قرار پائے گی اور اگر ان کی عدالت مشتبہ اور صدق بیانی مشکوک ہو گی تو حدیث بھی اعتماد و وثوق کے پایہ سے گر جائے گی۔ اس لئے ہر حدیث کو ایک سطح پر سمجھا نہیں جا سکتا بلکہ کچھ قابل اعتماد و وثوق ہوں گی اور کچھ متروک و ساقط الاعتبار۔ اس کی صحت یا عدم صحت پر اس وقت تک حکم نہیں لگایا جا سکتا جب تک سلسلہ سند کے رواۃ کو پرکھ نہ لیا جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام لوگوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ متن حدیث کے ساتھ راوی یا رواۃ کا بھی ذکر کریں تاکہ حدیث کی صحت کو پرکھا جا سکے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا حد ثتم بحدیث فاسند وہ الی الذی حد ثکم فان کان حقا فلکم وان کان کذبا فعلیہ۔ (وسائل الشیعہ ج ۳ ص ۳۷۷)

جب حدیث بیان کرو تو جس نے تم سے وہ حدیث بیان کی ہے اس کی سند کا بھی ذکر کرو اگر وہ صحیح ہو گی تو تمہیں فائدہ پہنچے گا اور جھوٹ ہو گی تو اس کا مظلمہ بیان کرنے والے پر ہو گا۔

حدیث کو بیان کرتے وقت یہ اطمینان ہونا چاہئے کہ راوی دروغ گو اور غلط کار تو نہیں ہے تاکہ صحیح و غلط میں تفریق اور موضوع احادیث کے نشر کا سدباب ہو سکے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کسی حدیث کو اس کے راوی کی صدق بیانی پر اطمینان کئے بغیر قبول نہ کرتے تھے۔ امام ذہبی تحریر کرتے ہیں۔

کان علی کرم اللہ وجھہ اماما متحریا فی الاخذ بحیث انہ یستحلف من یحدثہ الحدیث۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۰)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پورا اطمینان کرنے کے بعد حدیث کو قبول کرتے تھے اس طرح کہ وہ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لے لیتے تھے۔

علماء متقدمین کے نزدیک صحت و سقم کے لحاظ سے حدیث کے مراتب میں تفریق مسلم تھی مگر انہوں نے اقسام حدیث کے لئے کوئی خاص اصطلاحی نام وضع نہیں کئے۔ علماء متاخرین میں سب سے پہلے السید جمال الدین الحسنی

متوفی ۶۷۳ھ نے احادیث کو راوی کے ایمان عدالت اور قوت حفظ و ضبط کے اعتبار سے چار بنیادی قسموں پر تقسیم کیا اور انہیں صحیح، حسن، موثق اور ضعیف کے نام سے موسوم کیا۔

صحیح وہ ہے جس کے سلسلہ سند میں تمام رواہ ثقہ و معتمد امامی المذہب ہوں۔

حسن وہ ہے جس کے سلسلہ سند میں تمام رواہ امامی المسلک اور ممدوح ہوں مگر ان کی عدالت حد وثوق تک نہ پہنچی ہو۔

موثق وہ ہے جس کے سلسلہ سند میں تمام یا بعض عقیدۃً امامی نہ ہوں مگر ان کی صدق بیانی پر اعتماد ہو۔

ضعیف وہ ہی جس کے رواہ میں مذکور بالا تینوں قسموں کے شرائط نہ پائے جاتے ہوں۔

اس تنویع حدیث کی بنیاد بھی امیرالمومنین علیہ السلام کے ہاتھوں قائم ہوئی اور آپ نے رواہ حدیث کے حالات و اوصاف پر ایک جامع تبصرہ فرماتے ہوئے انہیں چار قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ یہ تبصرہ سلیم ابن قیس ہلالی کی روایت سے نہج البلاغہ اور کافی باب اختلاف الحدیث میں درج ہے۔ اس تبصرہ کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

رجل منافق مظهر للایمان متصنع بالاسلام لایتاثم ولا یتحرج یکذب علی رسول الله صلی علیه وله متعلدا۔

ایک تو وہ جس کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ وہ ایمان کی نمائش کرتا ہے اور مسلمانوں کی سی وضع قطع بنا لیتا ہے نہ گناہ کرنے سے گھبراتا ہے اور نہ کسی افتاد میں پڑنے سے جھجکتا ہے وہ جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

ورجل سمع من رسول الله شیئالم یحفظه علی وجهه فوهم فیه ولم یتعمد کذبا فهو فی یدیه ویرویه ویعمل به ویقول انا سمعته من رسول الله علیه وآله

دوسرا شخص وہ ہے جس نے تھوڑا بہت رسول اللہ سے سنا لیکن جوں کا توں اسے یاد نہ رکھ سکا اور اس میں اسے سہو ہو گیا یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا یہی کچھ اس کے دسترس میں ہے اسے ہی دوسروں سے بیان کرتا ہے اور اسی پر خود بھی عمل پیرا ہے اور کہتا بھی یہی ہے کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے

ورجل ثالث سمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ شیئا یا مربہ ثم نہی عنہ وھو لایعلم اوسمعہ ینھی عن شئی ثم امر بہ و ھولا یعلم۔

تیسرا شخص وہ ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی زبان سے سنا کہ آپ نے ایک چیز کے بجا لانے کا حکم دیا ہے پھر پیغمبر نے تو اس سے روک دیا لیکن یہ اسے معلوم نہ ہو سکا یا یوں کہ اس نے پیغمبر کو ایک چیز سے منع کرتے ہوئے سنا پھر آپ نے تو اس کی اجازت دے دی لیکن اس کے علم میں یہ چیز نہ آسکی۔

واخر رابع لم یکذب علی اللہ ولا علی رسولہ مبغض للکذب خوفامن اللہ و تعظیما لرسول اللہ صلی اللہ علیہ و الہ ولم یھم بل حفظ ما سمع علی وجھہ فجاء بہ علی ما سمعہ لم یزد فیہ ولم ینقص منہ۔

چوتھا شخص وہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خوف خدا اور عظمت رسول کے پیش نظر کذب سے نفرت کرتا ہے اس کی یادداشت میں غلطی واقع نہیں ہوئی بلکہ جس طرح سنا اسی طرح اسے یاد رکھا اور اسی طرح اسے بیان کیا نہ اس میں کچھ بڑھایا اور نہ اس میں سے کچھ گھٹایا۔

حدیث کے سلسلہ سند کو دیکھنے کے ساتھ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ حدیث قرآن کے کسی حکم کے منافی تو نہیں ہے یا کسی مشہور و معتبر حدیث سے متعارض تو نہیں ہے یا شریعت کے کسی مسلمہ اصول کے خلاف تو نہیں ہے یا عقل کے قطعی فیصلہ کی مخالف تو نہیں ہے یا اس سے انبیاء و آئمہ کی عظمت و تقدیس پر حرف تو نہیں آتا۔ یہ وجوہ بھی صحیح و سقیم میں امتیاز کا ایک ذریعہ ہیں لہٰذا حدیث کو روایتہ" پرکھنے کے ساتھ درایتہ" بھی اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح و غلط میں تفریق کی جا سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اعقلو الخبر اذا سمعتوہ عقل رعایتہ لا عقل روایتہ فان رواہ العلم کثیر و رعاتہ قلیل۔(نہج البلاغہ)

جب کوئی حدیث سنو تو اسے عقل کے معیار پر پرکھ لو صرف نقل الفاظ پر بس نہ کرو کیونکہ علم کے نقل کرنے والے تو بہت ہیں اور اس میں غور و فکر کرنے والے کم ہیں۔

کلیات فقہیہ

اسلام ایک مکمل اور دائمی شریعت ہے جس کے احکام و قوانین ہر دور کے عصری تقاضوں پر پورے اترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جس طرح آج سے چودہ سو برس پہلے قابل عمل و نفاذ تھے اسی طرح آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے کیونکہ یہ آخری شریعت ہے جس کی تکمیل آخری نبی کے ذریعہ ہوئی اب نہ کوئی نئی شریعت آئے گی اور نہ کوئی نبی اور رسول مبعوث ہو گا جو شریعت کو تبدیل کر کے نئے احکام کا اجراء کرے۔ اگرچہ زمانہ تشریع کے بعد کثرت سے جدید مسائل پیدا ہوئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ ہر جزئی مسئلہ کا تفصیلی حکم بیان کیا جاتا مگر شریعت اسلام نے ایسے قواعد و کلیات بیان کر دئے ہیں جن سے ان جزئیات اور پیش آمدہ مسائل میں عملی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور موقع و محل کے اعتبار سے احکام اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اس اخذ و استنباط کا تعلق علم فقہ سے ہے۔ فقہ کے لغوی معنی فہم و دانش کے ہیں اور قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔

فما لھو لاء القوم لا یفقھون حدیثا۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں۔

اور اصطلاح شرع میں شرعی مدارک و ماخذ سے فروعی احکام کے استخراج کا نام ہے۔ یہ اخذ و استنباط کی قوت چند افراد تک محدود اور اس کی ضرورت کسی خاص دور سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں اس کی احتیاج رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی تاکہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور روز افزوں ضروریات کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کیا جا سکے اور فکری تعطل اور فقہی جمود پیدا نہ ہونے پائے۔ ان فقہی احکام کے مآخذ چار ہیں۔ قرآن، حدیث، عقل اور اجماع

قرآن مجید ان فقہی و اسلامی احکام کا سب سے اہم مآخذ ہے۔ اس میں عبادات و معاملات، حدود و تعزیرات، حقوق اللہ وحقوق العباد، اوامر و نواہی اور انسانی زندگی کی رہنمائی کے تمام اصول و ضوابط درج ہیں جو ناقابل ترمیم ہر مسلمان کے لئے واجب العمل ہیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں

علیک بقرائة القرآن والعمل بما فیه ولزوم فرائضه و شرائعه و حلاله و حرامه وامره ونهیه۔ (الفقیه) تمہارے لئے ضروری ہے کہ قرآن پڑھو اس کے تعلیمات پر عمل کرو اور اس کے فرائض و احکام حلال و حرام اور امر و نہی کے پابند رہو۔

قرآن مجید کی کچھ آیتیں مجمل و مبہم ہیں اور کچھ آیتوں کے معنی واضح اور متعین ہیں وہ آیتیں جن کے معنی

مجمل اور محتاج تشریح ہیں ان کی تفسیر و تاویل احادیث و اقوال معصومین علیہ السلام کی روشنی میں کی جائے گی۔ اپنی رائے سے معنی کا تعین کرنا درست نہیں ہے اور وہ آیتیں جن کے معنی متعین ہیں ان کے ظاہر مفہوم پر عمل کیا جائے گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

کل ایتہ محکمتہ نزلت فی تحریم شئی من الامور المتعارفتہ التی کانت فی ایام العرب تاویلھا فی تنزیلھا فلیس یحتاج فیھا الی تفسیر اکثر من تاویلھا۔ (فصول حرعاملی ص ۸۴)

ہر وہ محکم آیت جو عرب میں متعارف اور جانی پہچانی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کو حرام قرار دینے کے لئے نازل ہوئی ہو اس کا مفہوم قرآنی الفاظ میں موجود ہے لہٰذا اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس کے معنی کا جاننا کافی ہے کسی تفسیر کی احتیاج نہیں ہے۔

حدیث اس قول یا فعل یا کسی فعل پر رضا مندانہ سکوت کا نام ہے جو رسول خدایا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئمہ اہل بیت علیہ السلام میں سے کسی امام سے منقول ہو۔ ہر وہ حدیث جو باعتبار سند متواتر ہو یا اس کے رواہ ثقہ و راستگو ہوں یا اس کی صحت کے قرائن موجود ہوں وہ حجت و سند ہے۔ لیکن وہ حدیث جو قول مشہور کے خلاف یا علماء نے اس سے اعراض کیا ہو یا اس کے رواہ پایہ اعتبار سے ساقط ہوں اسے دلیل کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول فالرد الی اللہ الاخذ بمحکمہ کتابہ والرد الی الرسول الاخذ بسنتہ الجامعہ غیر المتفرقہ۔(وافی)

اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محکم آیتوں پر عمل کیا جائے اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ان متفق علیہ ارشادات پر عمل کیا جائے جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

عقل اس قوت کا نام ہے جو دیکھی بھالی چیزوں سے ان دیکھی چیزوں پر حکم لگاتی اور اچھی اور بری باتوں میں امتیاز کرتی ہے۔ اگرچہ شرع کا کوئی حکم خلاف عقل نہیں ہوتا مگر یہ ضروری نہیں کہ عقل ہر حکم شرعی کی حکمت و مصلحت کا احاطہ کر سکے بلکہ اکثر احکام، عقل کی دسترس سے باہر ہیں اور عقل ان پر حکم لگانے سے قاصر ہے۔ اس طرح کے احکام، احکام تعبدی کہلاتے ہیں جو شارع کے ذریعہ معلوم کئے جاتے ہیں جیسے نماز کی مخصوص ہیئت، رکعتوں کی تعداد اور قیام و قعود اور رکوع و سجود کی کیفیت۔ البتہ جن چیزوں کی اچھائی یا برائی پر عقل حکم لگاتی ہے ان کے بارے میں عقل کا فیصلہ قطعی سمجھا جائے گا جیسے صدق بیانی، ایفائے عہد اور امانت داری کا اچھا اور قابل

تعریف ہونا اور خیانت، غصب اور دروغ گوئی کا برا اور لائق نفرین ہونا۔

اجماع یہ ہے کہ کسی حکم شرعی پر فقہاء امت کا اتفاق رائے ہو اگر کسی مسئلہ پر ان کا اتفاق ہو گا تو اس اتفاق کو سند سمجھا جائے گا اگرچہ کتاب و سنت سے اس کا مآخذ معلوم نہ ہو سکے کیونکہ یہ اتفاق فقہاء اس امر سے کاشف ہے کہ امام بھی اس رائے سے متفق ہیں۔ چنانچہ اگر ایک ہی استاد کے شاگرد کسی امر پر متفق ہوں اور یہ بھی علم ہو کہ وہ استاد کی رائے کے خلاف نہیں جاتے تو ان سب کا یک رائے ہونا اس امر کا ثبوت ہو گا کہ ان کے استاد کا مسلک بھی یہی رہا ہو گا اور اجماع کے استناد کا اصل محور یہی کشف و یقین ہے۔ گویا اجماع خود دلیل نہیں ہے بلکہ کشف رائے معصوم علیہ السلام کا ایک ذریعہ اور دلیل کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

اگر ان مآخذ میں سے کسی شے کا حکم معلوم نہ ہو سکے اور ترک و عمل میں تردد ہو تو اس صورت میں اصول علمیہ و استصحاب، احتیاط براءت اور تخییر میں سے کسی ایک ضابطہ سے رہنمائی حاصل کی جائے گی یہ قواعد و ضوابط اگرچہ قطعی و یقینی نہیں ہیں مگر ان کے اعتبار و استناد پر ادلہ قطعیہ قائم ہیں۔

استصحاب یہ ہے کہ کسی شے کو اس کے سابقہ حکم پر جبکہ اس کے خلاف کا علم نہ ہو باقی و برقرار رکھا جائے مثلاً" کسی شے کی طہارت کا یقین ہو اور پھر طہارت میں شک پیدا ہو تو اس شک کی طرف التفات نہ کیا جائے اور اسے سابقہ حکم طہارت پر علی حالہ باقی سمجھا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس اصل و ضابطہ کے بارے میں فرمایا ہے۔

من کان علی یقین فشک فلیمض علی یقینہ فان الشک لاینقض الیقین۔(فصول حر عاملی)

جس شخص کو کسی بات کا یقین ہو اور پھر شک سے دو چار ہو تو اسے اپنے علم و یقین پر باقی رہنا چاہئے اس لئے کہ شک یقین کو زائل نہیں کر سکتا۔

احتیاط یہ ہے کہ ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے جس سے تکلیف شرعی سے عہدہ برآ ہونے کا یقین ہو جائے مثلاً" کسی امر میں شک ہو کہ وہ واجب ہے یا مستحب تو اسے بجا لایا جائے یا کسی امر میں شک ہو کہ وہ حرام ہے یا مباح تو اسے ترک کیا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اخوک دینک فاحتط لدینک بما شئت۔(امالی مفید)

تمہارا دین تمہارے لئے بمنزلہ بھائی کے ہے لہذا جس طرح ہو دین میں احتیاط سے کام لو۔

برأت یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ اس پر عمل کرنا چاہئے یا اسے ترک کرنا چاہئے تو اس صورت میں عدم دلیل کو دلیل نفی قرار دے کر اسے مورد تکلیف نہ قرار دیا جائے اور اسے جائز و مباح سمجھا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

سکت لجم عن اشیاء ولم یدعها نسیانا فلاتتکلفو ھا۔(نہج البلاغہ) — اللہ نے جن چند چیزوں کا حکم بیان نہیں کیا انہیں بھولے سے نہیں چھوڑا لہٰذا ان کا بار اٹھانے کی کوشش نہ کرو۔

تخییر یہ ہے کہ شارع کی طرف سے فعل یا ترک کی پابندی کا یقین ہو مگر یہ علم نہ ہو کہ یہ پابندی فعل کی صورت میں ہے یا ترک کی صورت میں اور احتیاط کی بھی کوئی صورت نہ ہو تو پھر اختیار ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر چاہے عمل کرے۔

ایک گروہ نے قیاس و رائے اور استحسان و استصلاح ایسے خود ساختہ اصول کو بھی ماخذ کا درجہ دے دیا ہے ان میں قیاس سر فہرست ہے اور اکثر پیش آئندہ مسائل کا مآخذ اسے قرار دے لیا گیا ہے۔ قیاس کو منطقی اصطلاح میں تمثیل کہا جاتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شے کا حکم دوسری شے پر جاری کر دیا جائے اس بنا پر کہ ان دونوں میں ایک مشترک وصف پایا جاتا ہے جو بظاہر علت حکم ہے۔

اس قیاس کے اعتبار و استناد پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے اور نہ امر مشترک کو علت حکم قرار دینے کا کوئی جواز ہے کیونکہ شرع اسلام میں دو متماثل چیزوں کے احکام جدا جدا بھی ہوتے ہیں جیسے چوری اور غصب دونوں غیر کا مال ہتھیا لینے میں متماثل ہیں مگر چوری میں ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اور غصب میں یہ حکم نہیں ہے اور دو مختلف چیزوں کا حکم ایک بھی ہوتا ہے جیسے زناء محصنہ اور ارتداد دو الگ چیزیں ہیں مگر ان دونوں کا حکم ایک ہے اور وہ سزائے موت ہے لہٰذا وصف میں اشتراک، حکم میں اشتراک کو اور حکم میں اشتراک، وصف میں اشتراک کو مستلزم نہ ہو گا لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ امر مشترک کو علت حکم ٹھہرا کر قیاس ایسی غیر یقینی چیز کو شرعی حکم کا مدرک قرار دے لیا جائے جب کہ کسی حکم کو اس وقت تک حکم شرعی تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ خود قطعی نہ ہو یا اس کے اعتبار و اسناد پر دلیل قطعی قائم نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

لا تقف مالیس لک بہ علم۔ — جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس پر عمل کی بنیاد نہ رکھو۔

آئمہ اہل بیت علیہ السلام نے دین میں قیاس آرائی و رائے زنی سے بشدت منع کیا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تقیسوا الدین فان من الدین مالا یقاس و سیاتی اقوام یقیسون فهم اعداء الدین واول من قاس ابلیس۔(وسائل الشیعہ)

دین میں قیاس نہ کرو اس لئے کہ دین میں قیاس کا دخل نہیں ہے البتہ ایک گروہ ایسا آئے گا جو قیاس سے کام لے گا وہ دین کا دشمن ہے جس نے سب سے پہلے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔

فقہ اسلامی میں عبادات' عقود' ایقاعات اور احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ عبادت کے معنی بندگی و پرستش کے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ عقود وہ ہیں جن میں دو طرف سے مخصوص الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے جیسے نکاح اور بیع و شراء وغیرہ۔ ایقاعات وہ ہیں جن میں ایک ہی طرف سے مخصوص الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے طلاق اور احکام وہ ہیں جن میں الفاظ کی احتیاج نہیں ہوتی جیسے میراث' دیت وغیرہ۔

ذیل میں فقہی عناوین کے تحت امیرالمومنین علیہ السلام کے جستہ جستہ اقوال اور مختلف قضایا درج کئے جاتے ہیں یہ اقوال مآخذ کا اور قضایا نظائر اور رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔

باب الطہارت

یوں تو ہر مذہب اور ہر معاشرہ میں صفائی و پاکیزگی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو نہ صرف معاشرتی اعتبار سے اہمیت دی ہے بلکہ اسے عبادات کا جزو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اکثر عبادات و اعمال کی صحت کے لئے طہارت شرط اور ان کی بجا آوری کے لئے لباس' جسم اور جگہ کی پاکیزگی لازمی ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب التوابین و یحب متطھرین۔ خدا توبہ کرنے والوں اور پاک و پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام طہارت کو اسلام کا شعار اور ایمان کا جزو سمجھتے تھے۔ چنانچہ حجر[1] ابن عدی کا ایک غلام بیان کرتا ہے کہ میں نے حجر سے کہا کہ میں نے آپ کے بیٹے کو دیکھا کہ وہ بیت الخلاء میں داخل ہوا اور طہارت کے بغیر باہر نکل آیا۔ حجر نے کہا کہ تم طاقچہ پر سے فلاں صحیفہ اٹھا لاؤ میں نے وہ صحیفہ پیش کیا تو انہوں نے اس صحیفہ میں سے پڑھا۔

ھذا ما سمعت علی ابن ابی طالب یذکر الطھور نصف الایمان۔ (طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۲۰) میں نے علی ابن ابی طالب کو فرماتے سنا کہ طہارت نصف ایمان ہے۔

پانی نجاست کو دور کرنے کا ذریعہ ہے اور قابل تطہیر اشیاء کو پاک کرتا ہے۔ اگر وہ کم از کم اتنی جگہ گھیرے جس کا طول' عرض اور گہراؤ ہر ایک ساڑھے تین بالشت ہو تو وہ نجس شے کے ملنے سے نجس نہیں ہو گا اور اگر اس کا

---

[1] حجر نام اور ابو عبدالرحمن کنیت تھی۔ پیغمبر اکرم کے صحابی اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے

کان حجر من فضلاء الصحابہ (استیعاب) جو پیغمبر کے فاضل صحابہ میں سے تھے۔

کوفہ کے رہنے والے اور امیرالمومنین کے ثقہ اصحاب اور رواۃ حدیث میں سے تھے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے۔

وکان ثقتہ معروفا لم یرو عن غیر علی شیا (طبقات ج ۶ ص ۲۲) حجر معتمد علیہ اور جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انہوں نے حضرت علی کے علاوہ کسی اور سے نقل روایت نہیں کی۔

۵۱ھ میں معاویہ نے حضرت علیؑ سے وابستگی کے جرم میں انہیں قتل کروا دیا اور دمشق سے چھ میل کے فاصلہ پر مقام مرج عذراء میں دفن ہوئے۔

رنگ یا بو یا ذائقہ متاثر ہو جائے تو وہ نجس قرار پائے گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے ایسے پانی کے بارے میں فرمایا۔

یتوضاء منہ ویشرب منہ مالم یتغیر اوصافہ طعمہ ولونہ وریحہ۔ (مستدرک الوسائل) جب تک اس کا ذائقہ رنگ اور بو متغیر نہ ہو اس سے وضو بھی کیا جا سکتا ہے اور پیا بھی جا سکتا ہے۔

وہ پانی جو زمین سے ابلتا رہتا ہے جیسے کنواں، چشمہ، دریا وغیرہ اگر نجس شے کے ملنے سے اس میں تغیر پیدا نہ ہو تو وہ نجس، نجس ہو گا خواہ مذکورہ بالا مقدار سے کم ہو۔ حضرت ؑ کا قول ہے۔

الماء الجاری لا ینجسہ شئی۔ (مستدرک الوسائل) آب جاری کو کوئی چیز نجس نہیں کرتی

کسی چیز کو اس وقت تک نجس نہیں قرار دیا جائے گا جب تک اس کے نجس ہونے کا علم نہ ہو جائے۔ اگر طہارت کا ادنی احتمال بھی ہو تو اس کی سابقہ حالت پر نظر کرتے ہوئے اسے پاک سمجھا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

مالابالی اصابنی بول ام ماء اذا لم اعلم ۔ (فصول حرعاملی) میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ مجھ پر پانی کے چھینٹے پڑے ہیں یا پیشاب کے جب تک مجھے اس کا علم نہ ہو جائے۔

اس ظاہری نجاست کے علاوہ جس کا ازالہ پانی اور دوسرے مطہرات سے ہو سکتا ہے ایک باطنی نجاست بھی ہے جسے حدث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ازالہ کے لئے وضو یا غسل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے لئے وضو کی ضرورت ہو اسے حدث اصغر کہا جاتا ہے اور جس کے لئے غسل کی احتیاج ہو اسے حدث اکبر کہتے ہیں اور در صورتیکہ وضو یا غسل ممکن نہ ہو تو پھر وضو یا غسل کے عوض تیمم کیا جائے گا۔

وضو چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے کناروں تک دھونے اور سر کے اگلے حصہ اور دونوں پیروں پر مسح کرنے کا نام ہے۔ وافی و وسائل میں ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے محمد ابن حنیفہ سے وضو کے لئے پانی طلب کیا جب وہ پانی لائے تو آپ نے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور دونوں ہاتھوں کو دھویا اور دھوتے وقت یہ دعا پڑھی۔

بسم اللہ والحمد للہ الذی جعل الماء طھورا ولم یجعلہ نجسا۔ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اور تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے پانی کو نہایت پاک بنایا اور نجس نہیں قرار دیا۔

پھر کلی کی اور کلی کرتے وقت یہ دعا پڑھی۔

اللھم انطق لسانی بذکرک واجعلنی ممن ترضی عنہ۔

بارالہا میری زبان کو اپنے ذکر کے ساتھ گویا رکھ اور مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے جن سے تو راضی و خوشنود ہے۔

پھر ناک میں پانی ڈالا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم لاتحرم علی ریح الجنت واجعلنی ممن یشم ریحھا وطیبھا وریحانھا۔

خدایا مجھے جنت کی خوشبو سے محروم نہ کرنا اور ان لوگوں میں سے قرار دینا جن کے مشام میں جنت کے پھولوں کی خوشبو اور مہک پہنچے گی۔

پھر چہرے کو دھویا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم بیض وجھی یوم تسو دفیہ الوجوہ ولا تسود وجھی یوم تبیض فیہ الوجوہ۔

اے خدا میرے چہرے کو روشن کرنا اس دن جب چہرے سیاہ فام ہوں گے اور میرے چہرے کو سیاہ فام نہ کرنا اس دن جب چہرے روشن ہوں گے۔

پھر دائیں ہاتھ کو کہنیوں سمیت دھویا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم اعطنی کتابی بیمینی والخلد بیساری۔

اے خدا میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دینا اور جنت بائیں ہاتھ میں۔

پھر بائیں ہاتھ کو اسی طرح دھویا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم لا تعطنی کتابی بشمالی ولا تجعلھا مغلولہ الی عنقی و اعوذبک من مقطعات النیزان۔

اے خدا میرا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں نہ دینا اور میرے ہاتھوں کو گردن سے بندھا ہوا قرار نہ دینا اور میں آگ کے کپڑوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

پھر سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم غشنی برحمتک وبرکاتک وعفوک۔

اے خدا مجھے اپنی رحمت برکت اور عفو میں ڈھانپ لے۔

پھر دونوں پیروں پر مسح کیا اور مسح کرتے وقت یہ دعا پڑھی۔

اللهم ثبت قدمی علی الصراط یوم تزل فیه الاقدام واجعل سعیی فیما یرضیک عنی۔

بار الہا صراط پر میرے قدموں کو ثبات بخشنا اس دن کہ جب قدم اس پر سے پھسلیں گے اور میری کوشش کو انہی کاموں کے لئے وقف کر دے جو تجھے راضی کریں۔

قرآن مجید میں وضو کی یہی ترتیب بیان ہوئی ہے اور مسح سر کے ساتھ پیروں کے مسح کا صریحاً" حکم ہے مگر ایک گروہ مسح کی بجائے پیروں کے دھونے کو جزو وضو قرار دیتا ہے اور پیروں میں موزے ہوں تو ان پر مسح کے جواز کا قائل ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام موزوں پر مسح کو غلط سمجھتے تھے چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

ولئن امسح علی ظھر حمار احب الی ان امسح علی الخفین۔(متدرک الوسائل)

میں موزوں پر مسح کرنے سے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ گدھے کی پیٹھ پر مسح کروں۔

ایک دوسری روایت میں یہ فرمایا کہ۔

لا نمسح علی الخفین ومن کان من شیعتنا فلیقتد بنا ولیستنن بستنا۔ (وافی)

ہم موزوں پر مسح نہیں کرتے اور جو شخص ہمارے شیعوں میں سے ہو اسے ہماری پیروی کرنا چاہئے اور ہمارے طریقہ پر چلنا چاہئے۔

اگر اعضاء وضو میں سے کسی عضو پر زخم کی وجہ سے دوا لگی ہو یا پٹی بندھی ہو اور اسے کھولنا اور اس پر پانی ڈالنا باعث ضرر ہو تو اس عضو کے کھلے حصہ کو دھونے کے بعد اس زخم یا پٹی پر گیلے ہاتھوں سے مسح کرے۔ اگر زخم کی جگہ نجس ہواور اسے پاک نہ کیا جا سکتا ہو تو اس پر پاک کپڑا رکھے اور اس پر ہاتھ پھیرلے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من کان بہ جرح و علیہ عصایب فانہ یجزی عنہ اذا توضا ان یمسح علی العصایب۔ (متدرک الوسائل)

جس شخص کے زخم ہو اور اس زخم پر پٹی بندھی ہو تو اس کے لئے وضو میں پٹی پر مسح کرلینا کافی ہے۔

غسل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سر و گردن کو دھویا جائے پھر جسم کا دایاں حصہ اور پھر بایاں حصہ یا حوض وغیرہ میں ایک دم غوطہ لگایا جائے۔ غسل کی دو قسمیں ہیں غسل واجب اور غسل مسنون۔ اغسال واجبہ میں سے ایک غسل جنابت ہے جو مادہ منویہ کے نکلنے سے واجب ہوتا ہے خواہ مباشرت سے نکلے یا احتلام کے ذریعہ سوتے میں نکلے یا جاگتے میں' قصداً" نکلے یا بغیر قصد و ارادہ کے بلکہ زن و مرد کے اعضاء اگر اس طرح ملیں کہ سر حشفہ تک دخول ہو جائے جب بھی غسل واجب ہو گا خواہ مادہ منویہ کا اخراج نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمر ابن خطابؓ نے یہ مسئلہ صحابہ کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ اگر کوئی شخص مباشرت کرے اور مادہ منویہ خارج نہ ہو تو کیا اس پر غسل واجب ہو گا۔

کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ آخر میں امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا آپؑ نے فرمایا۔

اتو جبون علیہ الجلد والرجم ولا توجبون علیہ صاع من ماء فقد وجب علیہ الغسل۔ (وانی)

تم ایسے شخص کے لئے دروں اور سنگساری کی سزا تو تجویز کرتے ہو اور غسل کے لئے ایک صاع پانی ضروری نہیں سمجھتے اس پر غسل واجب ہے۔

اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ محتلم ہوا ہے اور بیدار ہونے پر جسم یا لباس میں تری نہ پائے تو اس پر غسل واجب نہیں ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

انما الغسل من الماء الاکبر فاذ ارأی فی منامہ ولم یرالما ولاکبر فلیس علیہ غسل۔ (وانی)

غسل مادہ منویہ کے خارج ہونے سے عائد ہوتا ہے اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ محتلم ہوا ہے اور بیدار ہونے پر کچھ نہ دیکھے تو اس پر غسل واجب نہیں ہے۔

دوسرا غسل مس میت ہے جو میت کو غسل سے قبل اور سرد ہونے کے بعد چھونے سے واجب ہوتا ہے اہلسنّت کے نزدیک غسل مس میت واجب نہیں ہے مگر فرقہ امامیہ کے نزدیک واجب ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ جب امیرالمومنین علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا تو کیا خود بھی غسل کیا؟ آپؑ نے فرمایا۔

النبی طاھر مطھر ولکن امیرالمومنین فعلہ و جرت بہ السنتہ۔ (وانی)

پیغمبر اکرم پاک و پاکیزہ تھے اس کے باوجود امیرالمومنین علیہ السلام نے غسل کیا اور (ان کے اوصیاء کے بارے میں بھی) یہی سنت جاری و ساری ہے۔

اغسال مسنونہ متعدد ہیں ان میں سے غسل جمعہ کے بارے میں بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کسی کو اس کی سستی و سہل انگاری پر تنبیہہ کرتے تو فرماتے۔

واللہ لانت اعجز من تارک الغسل یوم الجمعہ۔ (وانی)

خدا کی قسم تم تو اس شخص سے بھی گئے گزرے ہو جو جمعہ کے دن بھی غسل نہیں کرتا۔

تیمم یہ ہے کہ اگر وضو یا غسل کے لئے پانی نہ ہو یا پانی ہو اور وضو یا غسل کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی امر استعمال سے مانع ہو تو دونوں ہاتھ مٹی وغیرہ پر مار کر پیشانی اور دونوں ہاتھوں پر مسح کرے۔ اگر اثنائے سفر میں وضو یا غسل کے لئے پانی نہ ہو تو پانی کی جستجو کرے۔ اس طرح کہ اگر زمین پتھریلی اور ناہموار ہو تو چاروں سمتوں میں اتنی دور

تک جائے جتنی دور کمان سے رہا کیا ہوا تیر جاتا ہے اور اگر زمین ہموار ہو تو اس سے دوگنی مسافت تک جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

یطلب الماء فی السفر ان کان الحزونتہ فغلوہ و ان کانت سھولۃ فغلو تین۔(الوسائل الشیعہ)

سفر میں پانی کی تلاش کی جائے اگر زمین سنگلاخ و ناہموار ہو تو ایک تیر کے فاصلہ تک اور نرم و ہموار ہو تو دو تیروں کے فاصلہ تک۔

تیمم اجزائے زمین، مٹی، پتھر، ریت اور گچ پر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کیا گچ اور چونے پر تیمم کیا جا سکتا ہے؟ فرمایا ہاں۔ پھر پوچھا کہ کیا راکھ پر بھی تیمم ہو سکتا ہے؟ فرمایا۔

لالانہ لایخرج من الارض انما یخرج من الشجر۔ (وسائل الشیعہ)

نہیں اس لئے کہ وہ زمین سے نہیں نکلتی بلکہ درخت (کی لکڑی کے جلنے) سے بنتی ہے۔

اگر ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہو اور ان چیزوں میں سے کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو پھر کپڑوں اور دوسری چیزوں کو جھاڑ کر غبار جمع کرے اور اس پر تیمم کرے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من اخذتہ السما و شدید ہ والارض مبتلہ وارادان یتیمم فلینفض سرجد اوا کافہ فیتیمم بغبارہ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر شدید بارش کی وجہ سے زمین تر بتر ہو جائے اور تیمم کا ارادہ ہو تو زین جھول کو جھاڑ کر غبار اکٹھا کرے اور اس پر تیمم کرے۔

اگر کسی عذر کی بنا پر یا پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کرے تو جب عذر برطرف ہو جائے یا پانی مل جائے تو تیمم باطل ہو جائے گا۔ حضرتؑ کا قول ہے۔

اذامر بالماء او وجدہ انتقض تیممہ۔ (مستدرک الوسائل)

جب پانی کے قریب سے گزرے یا پانی پالے تو تیمم ٹوٹ جائے گا۔

اگر تیمم سے نماز شروع کر دے اور پہلی رکعت میں رکوع سے پہلے پانی نظر آجائے تو نماز کو قطع کر دے اور وضو کر کے از سر نو نماز پڑھے اور اگر رکوع میں پہنچ گیا ہو تو نماز کو اختتام تک پہنچائے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان دخل فی الصلواہ ثم وجد الماء فینصرف فتوضاء ویصلی ان لم یکن رکع فان رکع مضی فی صلواتہ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر نماز شروع کر دے اور پھر پانی پالے تو اگر اس نے رکوع نہیں کیا تو وضو کرے اور نماز پڑھے اور اگر رکوع کر لیا ہے تو نماز کو جاری رکھے۔

اگر پانی کے مل جانے کی توقع ہو تو نماز کو آخر وقت کے لئے اٹھا رکھے۔ اگر پانی مل جائے تو بہتر ورنہ تیمم

سے نماز ادا کرے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لاینبغی ان تیمم من لم یجد الماء الا فی اخرالوقت۔ جسے پانی نہ ملے اسے چاہئے کہ نماز کے آخر وقت تیمم کرے۔
(مستدرک الوسائل)

باب الصلواۃ

صلواۃ اس عبادت کو کہتے ہیں جو قیام و قعود، رکوع و سجود اور قراءت سورو اذکار سے صورت پذیر ہوتی ہے اور نماز کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ نماز تمام عبادات میں سب سے اہم عبادت اور اعمال میں سب سے بہتر عمل ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اوصیکم بالصلواہ وحفظها فانها خیرالعمل وهی عمود دینکم۔ (مستدرک الوسائل)

میں تمہیں نماز اور اس کی پابندی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ بہترین عمل اور تمہارے دین کا ستون ہے۔

نماز کے لئے ضروری ہے کہ لباس اور جگہ غصبی نہ ہو۔ اگر یہ چیزیں شرعی جواز کے بغیر حاصل کی گئی ہوں گی تو ان میں نماز صحیح نہ ہو گی۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انظر فیما تصلی وعلی ماتصلی ان لم یکن من حله ووجهه فلا قبول۔ (فصول حر عاملی)

یہ دیکھو کہ تم کس چیز میں اور کس چیز پر نماز پڑھ رہے ہو اگر یہ چیزیں حلال اور صحیح طریق سے حاصل نہ کی گئی ہوں گی تو نماز قابل قبول نہ ہو گی۔

نماز سے پہلے اذان و اقامت کہنا مستحب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من صلی باذان و اقامته صلی خلفه صفان من الملئکته ومن صلی باقامته صلی خلفه صف۔ (فصول حر عاملی)

جو شخص اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھے اس کے پیچھے فرشتوں کی دو صفیں نماز ادا کرتی ہیں اور جو شخص صرف اقامت کے ساتھ نماز پڑھے اس کے پیچھے فرشتوں کی ایک صف نماز پڑھتی ہے۔

جب موذن اذان دے رہا ہو تو اس کے ساتھ ساتھ کلمات اذان کو دہرانا چاہئے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اس سے رزق میں وسعت آتی ہے اور تنگدستی دور ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت آئے جب نماز جماعت ختم ہو چکی ہو اور ابھی صفیں منتشر نہ ہوئی ہوں تو اس صورت میں اذان و اقامت ساقط ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اذا دخل رجل المسجد وقد علی اهله فلا یوذنن ولایقیمن۔ (وسائل الشیعہ)

جب کوئی شخص مسجد میں آئے اور نمازی نماز پڑھ چکے ہوں تو وہ اذان و اقامت نہ کہے۔

نمازوں کو ان کے مقررہ اوقات میں ادا کرنا چاہئے اس طرح کہ نہ وقت سے پہلے پڑھے اور نہ وقت گزار

دے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

صل الصلواہ لو قتھا الموقت لھا ولاتعجل وقتھا لفراغ ولاتوخرھاعن وقتھا لاشتغال۔ (نہج البلاغہ)

نماز کو اس کے مقررہ و وقت پر ادا کرو اور فراغت حاصل کرنے لئے قبل از وقت نہ پڑھو اور نہ مشغولیت کی وجہ سے اس میں تاخیر کرو۔

اگر کسی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو جائے اور صرف ایک رکعت کے ادا کرنے کا وقت رہ جائے تو ادا کی نیت سے نماز پڑھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من ادرک من الصلواہ رکعتہ قبل طلوع الشمس فقد ادرک الصلواہ قامتہ۔ (فصول)

جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی اس کی نماز پوری ہو گئی۔

ہر مسلمان پر شب و روز میں ظہر' عصر' مغرب' عشاء' اور صبح کی نمازیں واجب ہیں۔ حضرتؑ نے ان نمازوں کے اوقات' فضیلت اور تعداد رکعات کے بارے میں فرمایا ہے۔

ان فرض صلواہ الظھر اربع و فقتھا بعد زوال الشمس و وقت صلاہ العصر آخر وقت الظھر الی وقت مھبط الشمس وان المغرب ثلث رکعات وقتھا حین وقت الغروب الی ادبار الشفق والحمرہ وان وقت صلاہ العشاء الاخرہ ھی اربع رکعات واول وقتھا حین اشتباک النجوم وغیبوبتہ الشفق وانبساط الظلام الی ثلث اللیل والصبح رکعتان و وقتھا طلوع الفجرا الی اسفارالصبح۔ (وسائل الشیعہ)

نماز ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور اس کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہے اور نماز عصر کا وقت ظہر کے وقت آخر سے سورج کے افق مغرب کی طرف جھکاؤ تک ہے اور مغرب کی تین رکعتیں ہیں اور اس کا وقت غروب آفتاب سے شفق کے اوجھل اور مغرب کی سرخی کے زائل ہونے تک ہے اور عشاء کی چار رکعتیں ہیں اور اس کا وقت ستاروں کے جال بچھنے مغرب کی سمت کی سرخی کے غائب ہونے اور تاریکی کے پھیلاؤ سے تہائی رات تک ہے اور صبح کی دو رکعتیں ہیں اور اس کا وقت طلوع فجر سے مشرق کی سمت سے سرخی کے ظاہر ہونے تک ہے۔

یہ پانچوں نمازیں سترہ رکعتوں اور پچانویں تکبیروں پر مشتمل ہیں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

خمس وتسعون تکبیرہ فی الیوم واللیلتہ للصلوات منھا تکبیر القنوت۔ (فصول)

ہر شب روز میں نمازوں کی پچانویں تکبیریں ہیں ان میں قنوت کی تکبیریں بھی شامل ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ صبح کی دو رکعتوں میں گیارہ تکبیریں' ظہر کی چار رکعتوں میں اکیس' عصر کی چار

رکعتوں میں اکیس، مغرب کی تین رکعتوں میں سولہ اور عشاء کی چار رکعتوں میں اکیس اور پانچ تکبیریں، پانچ قنوتوں کی، یہ کل بچانوے تکبیریں ہوئیں۔ نماز کی پہلی تکبیر سے جسے تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں نماز شروع ہوتی ہے اور سلام پر ختم ہو جاتی ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

تحریمها التکبیر و تحلیلها التسلیم۔ (وسائل الشیعہ) نماز کی پابندی کا آغاز تکبیر سے ہوتا ہے اور سلام سے پابندی بر طرف ہو جاتی ہے۔

تکبیرۃ الاحرام اور دوسری تکبیروں کے وقت دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھانا چاہئے۔ چنانچہ حضرتؑ نے وانحر کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

النحر رفع الیدین فی الصلاہ نحوالوجہ۔ (مستدرک الوسائل) نحر سے یہ مراد ہے کہ نماز میں دونوں ہاتھوں کو چہرے کی طرف بلند کیا جائے۔

اور اسے عبودیت کا شعار قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

رفع الیدین فی التکبیر هوالعبودیتہ۔ (وسائل) تکبیر کے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھانا عبودیت کا شعار ہے۔

• تکبیرۃ الاحرام کے وقت جسم میں جھکاؤ نہ ہونا چاہئے بلکہ بالکل سیدھا رو بقبلہ کھڑا ہونا چاہئے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من لم لقم صلبہ فی الصلواہ فلا صلواہ لہ۔ (وسائل الشیعہ) جو شخص کمر کے جھکاؤ کے بغیر سیدھا کھڑا نہیں ہوتا اس کی نماز نہیں ہے۔

حالت قیام میں سورہ فاتحہ اور ایک دوسرا سورہ پڑھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام اکثر سورہ اخلاص پڑھتے تھے۔ چنانچہ عمران ابن حصین بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک لشکر حضرت علی علیہ السلام کی قیادت میں بھیجا جب لشکر پلٹ کر آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں پوچھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ اور تو تمام باتیں معمول کے مطابق تھیں مگر یہ بات نئی تھی کہ آپ جب بھی نماز پڑھاتے تو سورہ اخلاص ضرور پڑھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ میں اس سورہ کو دوست رکھتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

مااحببتها حتی احبک اللہ۔ (مجمع البیان) تم اسے اس لئے دوست رکھتے ہو کہ اللہ تمہیں دوست رکھتا ہے۔

قیام کے بعد رکوع کرے اس طرح کے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر اتنا جھکے کہ سر کمر کے جھکاؤ کے برابر ہو جائے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان علیا کان یعتدل فی الرکوع مستویا حتی یقال لوصب الماء علی ظهره لاستمسک۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام رکوع میں اتنا جھکتے کہ کمر کی سطح بالکل برابر ہو جاتی یہاں تک کہ یہ کہا جاتا کہ اگر پشت پر پانی ڈالا جائے تو وہ وہیں پر رک جائے۔

رکوع میں ذکر واجب ہے اگر عمداً ترک کرے گا تو نماز باطل ہو گی اور اگر بھولے سے ایسا ہو تو نماز صحیح ہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے رکوع کیا مگر ذکر رکوع بھول گیا کیا اس کی نماز ہو گئی فرمایا۔

تمت صلاتہ۔ (وسائل الشیعہ)

ہاں اس کی نماز ہو گئی۔

رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو اور پھر دو سجدے بجا لائے اور دوسرے سجدہ کے بعد سیدھا اٹھنے کے بجائے کچھ وقفہ کے لئے بیٹھے اور پھر کھڑا ہو۔ اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں۔

کان امیر المومنین اذا رفع راسہ من السجود قعد حتی یطمئن ثم یقوم۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو سکون و اطمینان سے بیٹھتے پھر کھڑے ہوتے۔

جب سجدوں سے فارغ ہو کر کھڑا ہونے لگے تو **بحول اللہ وقوتہ اقوم واقعد** (میں اللہ کی دی ہوئی قوت و طاقت سے اٹھتا بیٹھتا ہوں) کہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

کان امیرالمومنین یبرء من القدریۃ فی کل رکعتہ ویقول بحول اللہ وقوتہ اقوم واقعد۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام فرقہ قدریہ سے اظہار برائت کرتے ہوئے ہر رکعت میں **بحول اللہ وقوتہ اقوم و اقعد** پڑھتے۔

دوسری رکعت میں رکوع میں جانے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت پڑھے۔ عبدالرحمن ابن اسود کاہلی کہتے ہیں۔

صلی بنا علی ابن ابی طالب علیہ السلام فی مسجد بنی کاهل الفجر فقنت بنا۔ (مستدرک الوسائل)

علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مسجد بنی کاہل میں نماز پڑھائی اور اس میں دعائے قنوت پڑھی۔

جب نماز ختم کرے تو تسبیح فاطمہ (سلام اللہ علیہا) پڑھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم دی کہ ہم ہر نماز کے بعد ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھا کریں۔ اس ارشاد نبوی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد میں نے اسے کبھی ترک نہیں کیا۔

تسبیح و تعقیبات سے فارغ ہو کر دعا مانگے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا فرغ احد کم من الصلواہ فلیرفع یدیہ الی السماء ولینصب فی الدعاء۔ (متدرک الوسائل)

جب تم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو تو اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا مانگے۔

دعا کے بعد سجدہ شکر بجا لائے۔ میثم تمار کہتے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے مسجد جعفی میں نماز ادا کی اور تسبیح و دعا کے بعد

سجد و عفہ وقال العفو ساہ سرہ (متدرک الوسائل)

آپ نے خاک پیشانی رکھ کر سجدہ کیا ور سو مرتبہ العفو کہا۔

نماز کے چند مبطلات ہیں۔ چنانچہ اگر دوران نماز میں ریح وغیرہ صادر ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ لہٰذا پھر سے وضو کر کے نماز پڑھے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من احدث فی صلواتہ فلیقطع ولیبدی۔(متدرک الوسائل)

اگر نماز میں حدث صادر ہو تو نماز کو قطع کر دے اور از سر نو نماز پڑھے۔

اگر نماز پڑھتے ہوئے آنکھ لگ جائے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذ اغلبتک عینک وانت فی الصلواہ فاقطع ونم۔ (وسائل الشیعہ)

جب نماز میں تمہاری آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہو جائے تو نماز قطع کر دو اور سو جاؤ۔

اگر نماز میں قرآن یا دعا کے علاوہ کوئی دو حرفی لفظ خواہ با معنی ہو یا بے معنی یا یک حرفی لفظ جو با معنی ہو زبان سے نکالے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ حضرت فرماتے ہیں۔

من تکلم فی صلواتہ اعاد۔(متدرک الوسائل)

جو نماز میں کلام کرے وہ پھر سے نماز پڑھے۔

نماز میں قہقہ لگا کر ہنسنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا يقطع الصلواه التبسم ويقطعها القهقهه۔ (بحار ج ۱۰ ص ۱۰۷)

تبسم سے نماز باطل نہیں ہوتی البتہ قہقہ لگانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔

نماز میں ہاتھوں کو نہ باندھے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا يجمع المسلم يديه في صلواته وهو قائم بين يديه يتشبه باهل الكفر يعنى المجوس۔ (وسائل الشیعہ)

مسلمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ نماز میں ہاتھ باندھے اور مجوسیوں کے سے طرز عمل کے ساتھ اللہ کے سامنے کھڑا ہو۔

ان چیزوں کے علاوہ بھی چند چیزیں ایسی ہیں جن سے اگرچہ نماز باطل نہیں ہوتی تاہم ان کے مکروہ ہونے کی بنا پر ان سے اجتناب کرنا چاہئے۔ ان مکروہات میں سے ایک یہ ہے کہ نماز میں سر کو ادھر ادھر حرکت نہ دے اور نہ دائیں بائیں دیکھے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

الالتفات في الصلواه اختلاس من الشيطان فاياكم والالتفات في الصلواه۔ (وسائل الشیعہ)

نماز میں ادھر ادھر مڑنا شیطان کے تسلط کا نتیجہ ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرو۔

نماز میں بے معنی و بیکار حرکات سے اجتناب کرے۔ اس لئے کہ یہ چیز خضوع و خشوع اور رجوع الی اللہ کے منافی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لايعبث الرجل في صلواته بلحيته ولا بما يشغله عن صلواته۔ (وسائل شیعہ)

آدمی نماز میں ڈاڑھی سے نہ کھیلے اور نہ ایسی حرکت کرے جو اس کی توجہ نماز سے ہٹا دے۔

اگر نماز پڑھتے ہوئے انسان یا حیوان سامنے سے گزرے تو اگرچہ اس سے نماز میں خلل پیدا نہیں ہوتا تاہم جہاں تک ہو سکے اس کی روک تھام کرے۔ چنانچہ حضرتؑ سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور اس کے سامنے سے عورت، مرد اور جانور سب گزرتے ہیں اسے کیا کرنا چاہئے فرمایا۔

ان الصلواة لا يقطعها شئی ولكن ادرو اما استطعتم۔ (حرعاملی)

(ان چیزوں میں سے) کوئی چیز نماز کو باطل نہیں کرتی لیکن جہاں تک ہو سکے انہیں روکنے کی کوشش کرو۔

لوہے کے ہتھیار تلوار وغیرہ سجا کر نماز پڑھے اور نہ تلوار اپنے سامنے رکھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایصلی احد کم وبین یدیہ سیف فان للقبلت امن ۔ (علل الشرائع)

تم میں سے کوئی شخص نماز کے دوران تلوار اپنے سامنے نہ رکھے اس لئے کہ سمت قبلہ امن کا نشان ہے۔

نماز کے چند آداب ہیں کچھ ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ باطن سے۔ ظاہری آداب یہ ہیں کہ تمام اعمال و ارکان سکون و طمانیت سے بجا لائے۔ ادھر ادھر جھانکنے کے بجائے نظر جائے سجدہ پر رکھے۔ نماز کے لئے متبرک مقامات مساجد یا مشاہد کا انتخاب کرے اور پاک و پاکیزہ اور بقدر وسعت اچھا لباس پہنے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

النظیف من الشیاب یذھب الھم والحزن وھو طھور للصلواہ۔

نظیف و پاکیزہ لباس غم و حزن کو دور کرتا ہے اور نماز کے لئے پاکیزگی کا باعث ہے۔

باطنی آداب یہ ہیں کہ صرف الفاظ کے دہرانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے معانی کو سمجھے اور حضور قلب کے ساتھ تمام ارکان بجا لائے۔ خیالات کو ادھر ادھر بھٹکنے نہ دے۔ عجز و فروتنی کی کیفیت پیدا کرے اور یہ تصور کرے کہ وہ اس سلطان السلاطین کے روبرو کھڑا ہے جو ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور باطن پر بھی نظر رکھتا ہے۔ کوئی چیز اس سے ڈھکی چھپی ہوئی اور اس کے دائرہ اختیار و اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ اگر نماز میں توجہ و یکسوئی نہ ہو تو وہ در حقیقت نماز ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز صرف سیدھا کھڑا ہونے' رکوع میں جھکنے اور سجدہ میں سر رکھنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جب تک ان اعمال و اذکار کے پیکر میں روح اخلاص کار فرما نہ ہو گی وہ نماز' نماز کہے جانے کے قابل نہ ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیست الصلواہ قیامک و قعودک انما الصلواہ اخلاصک

نماز تمہارے اٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں ہے بلکہ نماز وہ ہے جس میں خلوص نیت ہو۔

خشوع و نیت اخلاص روح اعمال است | عمل چو دور شد از روح طاعش مشمار

امیرالمومنین علیہ السلام سے نماز کے مختلف اعمال کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو آپ ان کی ظاہری ہیئت و صورت کے بیان کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان کے اسرار و حکم کی بھی نشاندہی کرتے۔ چنانچہ آپؑ سے تکبیرۃ الاحرام کے معنی پوچھے گئے تو آپؑ نے فرمایا۔

اللہ اکبر یعنی الواحد الاحد الذی لیس کمثلہ شئی ولا یلتبس بالا جناس ولا یدرک بالحواس۔ (علل الشرائع)

اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ واحد و یکتا ہے نہ اس کے مانند کوئی شے ہے نہ کسی جنس سے اس کا اشتباہ ہو سکتا ہے۔ اور نہ وہ حواس سے جانا جا سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اس اعتبار سے بزرگ و برتر ہے کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ کوئی مثل نہ حواس سے جانا جا سکتا ہے اور نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کسی کے مشابہ ہو گا یا کوئی اس سے مماثل ہو گا تو وہ اس کی سطح پر آجائے گا اور یہ اس کی بزرگی و کبریائی کے منافی ہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ رکوع میں گردن کو خم کرنے کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ۔

آمنت بوحدانیتک ولو ضربت عنقی۔ (علل الشرائع)

میں اللہ کی وحدت و یکتائی پر ایمان لایا ہوں (اور اس سے منحرف نہیں ہوں گا) خواہ میری گردن کاٹ دی جائے۔

آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ سجدہ کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ پہلا سجدہ اس امر کا اعتراف ہے کہ "**اللھم انک منھا خلقتنا**" بارالہا تو نے ہمیں زمین سے پیدا کیا ہے "اور سجدہ سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں "**منھا اخرجتنا**" اسی زمین سے تو نے ہمیں نکالا ہے" اور دوسرے سجدہ کے معنی یہ ہیں **ومنھا تعیدنا**؟ اسی زمین کی طرف تو ہمیں پلٹائے گا" اور اس سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں **ومنھا تخرجنا تارہ اخری** اسی زمین سے تو ہمیں دوبارہ اٹھائے گا۔ حضرت نے ان جوابات میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

منھا خلقنا کم وفیھا نعید کم ومنھا نخرجکم تارہ اخری۔

ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف پلٹائیں گے اور اسی سے دوسری بار تمہیں نکالیں گے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ تشہد میں دایاں پیر بائیں پیر پر کیوں رکھا جاتا ہے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ۔

اللھم امت الباطل و اقم الحق۔

خدایا باطل کو نیست و نابود کر اور حق کو قائم و برقرار رکھ۔

پوچھا گیا کہ آخر نماز میں السلام علیکم کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ امام جماعت اللہ کی اس نوید کی ترجمانی کرتا ہے کہ۔

امان لکم من عذاب اللہ یوم القیامتہ۔ (الفقیہ)

قیامت کے دن تمہارے لئے عذاب سے امان و سلامتی ہے۔

باب الصوم

ماہ رمضان میں ہر بالغ و عاقل مسلمان پر طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا واجب ہے۔ روزہ ایک طرح سے زکواۃ بدن ہے جو قوت صبر' ضبط نفس اور ترک خواہشات ایسے اوصاف کی تخلیق میں قوی ترین اور مؤثر ہے۔ روزہ خداوند عالم کی خوشنودی کا باعث اور عذاب جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

صوم شهر رمضان جنته من النار۔ (مستدرک الوسائل)

ماہ رمضان کے روزے جہنم کی آگ سے سپر کا کام دیں گے۔

ماہ رمضان کا چاند رویت سے یا شعبان کے تیس دن پورے ہونے سے ثابت ہو گا لہٰذا جب ماہ رمضان کا چاند نظر آئے روزہ رکھا جائے اور جب شوال کا چاند دکھائی دے روزہ چھوڑ دیا جائے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

صم لرویته و افطر لرویته وایاک والشک وانظن فان خفی علیکم فاتموا الشهر الاول ثلثین۔ (وسائل الشیعہ)

چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور چاند دیکھو تو روزہ چھوڑ دو اور شک و ظن پر بنا نہ کرو اگر رویت مخفی رہے تو پہلے مہینے کے تیس دن پورے کرو۔

اگر تیس دن پورے نہ ہوں اور چاند بھی نہ دیکھے تو دو عادل گواہوں کی شہادت پر رویت تسلیم کی جائے گی حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاتجوز شهاده النساء فی رویته الهلال ولا یجوز الا شهاده رجلین عدلین۔ (وافی)

رویت ہلال کے سلسلہ میں دو عادل مردوں کی گواہی معتبر ہے اور عورتوں کی گواہی قابل قبول نہ ہو گی۔

اگر ان چیزوں میں سے کسی ایک سے رویت ثابت نہ ہو اور عمومی شہرت بھی نہ ہو تو ماہ رمضان کی نیت سے روزہ رکھنے کا جواز نہیں ہے البتہ قضا یا استحباب کی نیت سے روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے یوم الشک کے روزہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لان اصوم یوما من شعبان احب الی من ان افطر یوما من شهر رمضان۔ (وافی)

شعبان کا ایک روزہ رکھ لینا مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں ماہ رمضان میں ایک دن بغیر روزہ کے رہوں۔

مطلب یہ ہے کہ یوم الشک کا روزہ آخر شعبان کی نیت سے رکھنا بے روزہ رہنے سے بہتر ہے اس لئے کہ

اگر آخر شعبان کی نیت سے روزہ رکھا جائے اور واقع میں بھی آخر شعبان ہو تو وہ روزہ مستحبی قرار پائے گا اور اگر روزہ نہ رکھا جائے اور واقع میں ماہ رمضان شروع ہو چکا ہو تو ماہ رمضان کے روزوں میں سے ایک روزہ چھوٹ جائے گا۔ اگرچہ اس کے چھوٹنے پر کوئی گرفت نہ ہو گی کیونکہ ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم نہیں ہو سکا اور احکام شرعیہ علم و یقین پر مترتب ہوتے ہیں لہٰذا جب تک شعبان کے ختم ہونے اور ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم نہ ہو جائے ماہ رمضان کی نیت سے روزہ صحیح نہیں ہو گا بلکہ بعد میں اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ واقع میں ماہ رمضان شروع ہو چکا تھا جب بھی روزہ باطل ہو گا اور قضا واجب ہو گی۔

اگر روزہ دار روزہ میں بھولے چوکے سے کچھ کھا پی لے تو اسے یہ سمجھ کر کہ اب تو کھا پی چکا ہوں روزہ کو ختم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ روزہ میں بھول چوک معاف ہے۔ چنانچہ حضرتؐ کا ارشاد ہے۔

من صام فنسی فاکل و شرب فلا یفطر من اجل انہ نسی فانما ھو رزق رزقہ اللہ فلیتم صومہ۔ (وافی)

جو شخص روزہ رکھے اور بھول کر کھا پی لے تو اسے اس خیال سے روزہ نہیں چھوڑنا چاہئے کہ وہ بھول گیا یہ تو ایک رزق تھا جو اللہ نے اسے دیا اسے روزہ پورا کرنا چاہئے۔

روزہ کی حالت میں مسواک کی جاسکتی ہے بلکہ بہتر ہے۔ چنانچہ کتب احادیث میں ہے کہ۔

کان علی یستاک وھو صائم فی اول النھار وفی آخرہ فی شھر رمضان۔ (وسائل)

حضرت علیؑ ماہ رمضان میں روزہ کی حالت میں صبح و شام دونوں وقت مسواک کرتے تھے۔

حضرتؐ دودھ سے روزہ افطار کرنا پسند کرتے تھے اور جب روزہ افطار کرتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔

بسم اللہ اللھم لک صمنا و علی رزقک افطرنا فتقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ (وافی)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اے اللہ ہم نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے رزق سے افطار کیا تو اسے قبول فرما بیشک تو (دعاؤں کا) سننے والا اور (نیتوں کا) جاننے والا ہے۔

باب الحج

حج چند اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو مکہ معظمہ میں مخصوص دنوں میں بجا لائے جاتے ہیں مکہ اور اطراف مکہ کے رہنے والوں پر حج افراد اور حج قران واجب ہے اور جو مکہ اور اطراف مکہ کے رہنے والے نہ ہوں ان پر حج تمتع واجب ہے جس میں عمرہ حج ہی کا ایک جزو ہوتا ہے حج تمتع میں پہلے عمرہ تمتع کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور طواف و سعی اور تقصیر کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور پھر آٹھ ذی الحجہ کو حج کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور وقوف عرفات و مشعر الحرام اور رمی جمرات وغیرہ اعمال حج بجا لائے جاتے ہیں اس حج تمتع کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے۔

فمن تمتع بالعمره الی الحج فما استیسر من الهدی۔ جو شخص حج تمتع کا عمرہ بجا لائے تو جیسی قربانی ممکن ہو کرے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر حکم دیا کہ جن لوگوں کے ہمراہ قربانی کے جانور نہیں ہیں وہ احرام کھول دیں اور حج تمتع بجا لائیں اور عمرہ کو حج میں شامل کرنے کا حکم دیا۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

دخلت العمره فی الحج الی یوم القیامته۔ اب قیامت تک عمرہ حج میں شامل کر دیا گیا ہے۔ (صحیح ترمذی ج ۱ ص ۱۴۴)

کچھ لوگوں کی طبیعتوں پر یہ حکم گراں گزرا اور کچھ لوگوں نے علانیہ اس کی مخالفت کی کیونکہ قبل اسلام حج ماہ ذی الحجہ میں اور عمرہ ماہ رجب میں بجا لایا جاتا تھا اور وہ اسی سابقہ طرز عمل سے مانوس تھے جسے چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بار بار کہنے سے احرام تو کھول دئے مگر آپ کے بعد کھل کر اس کی مخالفت کی گئی۔ ان مخالفت کرنے والوں میں حضرت عمرؓ پیش پیش تھے جنہوں نے حکم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف حرمت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی انہی کا تتبع کیا اور اس سے مانع ہوئے حالانکہ امیرالمومنین علیہ السلام نے انہیں ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس کی خلاف ورزی سے منع کیا مگر وہ اپنی رائے پر جمے رہے۔ چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری تحریر کرتے ہیں۔

اختلف علی و عثمان بعسفان فی المتعۃ فقال علی ماترید ان تنھی عن امر فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال عثمان دعنی عنک۔ (صحیح بخاری پارہ ۶ ص ۸۲)

حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عثمان نے مقام عسفان میں حج تمتع کے بارے میں اختلاف کیا حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تمہارا مقصد کیا ہے کہ تم اس امر سے منع کرتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔ حضرت عثمان نے کہا کہ اس ذکر کو چھوڑئے۔

ایک شخص نے عبداللہ ابن عمر سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ جائز ہے اس نے کہا کہ آپ کے والد حضرت عمرؓ تو اس سے منع کرتے تھے عبداللہ نے کہا۔

رأیت ان کان ابی نھی عنھا وصنعھا رسول اللہ امرا یتبع ام امر رسول اللہ فقال الرجل بل امر رسول اللہ فقال لقد صنعھا رسول اللہ۔ (ترمذی ج ۱ ص ۱۳۲)

تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میرے باپ نے حج تمتع سے منع کیا اور رسول اللہ نے اس کا حکم دیا تو میرے باپ کی پیروی کی جائے گی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی کہا کہ پیروی تو حکم رسول ہی کی ہوگی عبداللہ ابن عمر نے کہا کہ پھر حج تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے نافذ ہوا۔

اعمال حج میں پہلا عمل یہ ہے کہ میقات پر پہنچ کر عمرہ تمتع کی نیت سے احرام باندھا جائے اور صدائے تلبیہ بلند کی جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

جاء جبرئیل الی النبی فقال لہ ان التلبیہ شعار المحرم فارفع صوتک للتلبیہ۔ (الفقیہ)

جبرئیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ احرام باندھنے والے کا شعار تلبیہ ہے لہٰذا بلند آواز سے تلبیہ کہو۔

اور اگر گونگا ہو تو زبان کو حرکت دے اور ہاتھ سے اشارہ کرے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

یجزیہ تحریک لسانہ واشارہ باصبعہ۔ (مستدرک الوسائل)

اس کے لئے زبان کو حرکت دینا اور انگلی سے اشارہ کرنا کافی ہے۔

جامہ احرام سفید ہو یا رنگین دونوں میں احرام باندھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے عبداللہ ابن جعفر کو رنگین احرام باندھے دیکھا تو اس پر اعتراض کیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہمیں سنن واحکام کی تعلیم دینے کی

ضرورت نہیں ہے۔ رنگین لباس میں احرام باندھا جاسکتا ہے اور اس پر اعتراض غلط ہے۔

احرام کی حالت میں چند چیزیں ممنوع و حرام ہیں۔ حضرت ؑ فرماتے ہیں۔

ان المحرم ممنوع من الصید والجماع والطیب ولبس الثیاب المخیطہ۔ (مستدرک الوسائل)

احرام باندھنے والے کے لئے شکار کرنا عورت کے قریب جانا خوشبو لگانا اور سلے ہوئے کپڑے پہننا منع ہے۔

صید سے مراد صحرائی جانوروں کا شکار ہے چنانچہ احرام کی حالت میں شکار کرنا شکار کے سلسلہ میں مدد دینا شکار بتلانا اور اس کا گوشت کھانا حرام ہے خواہ شکار کرنے والا احرام باندھے ہوئے نہ ہو۔ علامہ مجلسی نے بحار میں مسند احمد ابن حنبل سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ اور ان کے چند ہمراہی احرام باندھے ہوئے تھے کہ ایک عراقی نے چند بھنے ہوئے تیتر ان کے سامنے پیش کئے حضرت عثمانؓ نے اپنے ہمراہیوں سے کھانے کے لئے کہا مگر انہوں نے انکار کیا حضرت عثمانؓ نے کہا کہ بیشک یہ شکار ہے مگر شکار کرنے والا احرام باندھے ہوئے نہ تھا اور نہ ہم نے اسے شکار کرنے کے لئے کہا تھا ان لوگوں نے کہا کہ حضرت علی علیہ السلام اسے جائز نہیں سمجھتے چنانچہ حضرتؑ کی طرف رجوع کیا گیا آپ نے فرمایا کہ تم میں ضرور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اس واقعہ کی گواہی دیں گے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احرام باندھے ہوئے تھے تو کچھ لوگ ایک وحشی جانور کی ران آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے آپؐ نے فرمایا کہ ہم محرم ہیں یہ ان لوگوں کو دو جو احرام باندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اس واقعہ کی بارہ صحابیوں نے گواہی دی۔ حضرت عثمانؓ سے کوئی جواب بن نہ پڑا پیچ و تاب کھا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے خیمہ میں چلے آئے۔

محرم کے لئے صحرائی جانوروں کے انڈے اٹھانا اور انہیں کھانا بھی حرام ہے خواہ وہ حدود حرم میں داخل ہوا ہو یا داخل نہ ہوا ہو۔ محمد ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے جامع دمشق میں ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ اور اس سے کہا کہ تم نے ایک زمانہ دیکھا ہے کوئی دیکھا سنا واقعہ بیان کرو اس نے کہا کہ ہم ایک مرتبہ حج کے لئے گئے اور احرام باندھنے کے بعد شترمرغ کے کچھ انڈے اٹھالئے جب فریضہ حج سے فارغ ہو کر واپس آئے تو حضرت عمرؓ سے اس کا ذکر کیا وہ ہمیں حضرت علی علیہ السلام کے پاس لے گئے اور ان سے کہا کہ ان لوگوں نے احرام باندھنے کے بعد شترمرغ کے انڈے اٹھالئے تھے ان کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ انہوں نے جتنے انڈے اٹھائے تھے اتنے نر اونٹوں کو اونٹنیوں پر چھوڑیں اور ان سے جو بچے پیدا ہوں وہ کفارہ میں دے دیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اونٹنی گابھن نہیں ہوتی فرمایا کہ انڈے بھی تو گندے نکل آیا کرتے ہیں۔

محرم پر صرف صحرائی جانوروں کا شکار کرنا اور کھانا حرام ہے۔ اگر دریائی جانور کا شکار کرے یا کھائے تو اس

میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاباس ان یصید المحرم الحیتان۔ (مستدرک الوسائل)
اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ محرم مچھلی کا شکار کرے۔

عورت سے جہاں مباشرت حرام ہے وہاں نکاح پڑھنا اور نکاح کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

المحرم لا ینکح ولا ینکح فان نکح فنکاحہ باطل۔ (مستدرک الوسائل)
محرم نہ نکاح پڑھے اور نہ خود نکاح کرے اگر نکاح کرے گا تو نکاح باطل ہو گا۔

خوشبو لگانا جہاں ممنوع ہے وہاں خوشبو سونگھنا اور عطر فروش کے پاس جہاں عطر کی خوشبو آرہی ہو بیٹھنا بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے پوچھا گیا کہ کیا حالت احرام میں عطر فروش کے پاس بیٹھا جا سکتا ہے۔ فرمایا۔

لاالا ان یکون ماوا (مستدرک الوسائل)
نہیں مگر اس کی طرف سے گزر سکتا ہے۔

احرام کی حالت میں ناخن اور بال کاٹنا منع ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان المحرم ممنوع من تقلیم الاظفار و حلق الراس۔ (مستدرک الوسائل)
محرم کے لئے ناخن کاٹنا اور سر مونڈنا منع ہے۔

احرام کی حالت میں گالی گلوچ بکنا لڑائی جھگڑا کرنا اور اپنی برتری جتلانا جائز نہیں ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

التنزہ عن کل شئی نھی اللہ عنہ من الرفث والفسوق والجدال وان لا یمازی بہ رفیقا وغیرہ۔ (مستدرک الوسائل)
محرم کو ان چیزوں سے بچنا چاہئے جن سے اللہ سبحانہ نے منع کیا ہے نہ عورت کے قریب جائے نہ گناہ و فسق کے کام کرے اور نہ لڑائی جھگڑا کرے اور نہ اپنے ہمراہی اور نہ کسی اور پر اپنی برتری جتلائے۔

جب محرم مکہ میں وارد ہو تو عمرہ تمتع کی نیت سے طواف کرے۔ طواف کی صورت یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اور چکر کا آغاز حجر اسود سے کرے اگر کوئی شخص بھولے سے سات چکروں سے آگے بڑھ جائے تو اگر آٹھواں چکر تمام کرنے کے بعد اسے یاد آئے تو چاہے تو اس زیادتی کو شمار نہ کرے اور طواف تمام کر دے۔ اور چاہے تو طواف مستحب کی نیت سے چھ چکر اور لگائے اس طرح پہلے سات چکر طواف واجب کے ہوں گے اور دوسرے سات چکر طواف مستحب کے شمار ہوں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا طاف الرجل بالبیت ثمانیۃ اشواط الفریضۃ فاستیقن ثمانیۃ اضاف الیھا ستا۔ (وافی)

جب کوئی شخص خانہ کعبہ کے گرد طواف واجب کے (سات کے بجائے) آٹھ چکر لگائے اور اسے چکروں کے آٹھ ہونے کا یقین ہو جائے تو چھ چکر اور لگا لے۔

طواف کے بعد نماز طواف پڑھے اور سعی و تقصیر کے بعد احرام کھول کر عمرہ تمام کردے پھر آٹھ ذی الحجہ کو حج کی نیت سے احرام باندھے اور نو ذی الحجہ کو عرفات میں غروب آفتاب تک وقوف کرے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ دفع من عرفۃ حین غربت الشمس۔ (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ جب سورج غروب ہوا تو عرفات سے روانہ ہوئے۔

عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ میں طلوع آفتاب تک وقوف کرے اور وہیں پر مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لما دفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ من عرفات مرجعتی الزدلفۃ فجمع بھابین الصلواتین باذان و اقامتین۔ (مستدرک الوسائل)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ عرفات سے مزدلفہ میں آئے تو آپ نے دونوں نمازوں کو جمع کیا اور دونوں کے لئے ایک اذان اور دو اقامتیں کہیں۔

دس ذی الحجہ کو مزدلفہ سے منیٰ میں آئے اور جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد قربانی دے۔ قربانی کے جانور کو لاغر، کمزور اور عیب دار نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرتؑ نے۔

نھی ان الا ضحیۃ بمکسور القرن والعرجاء المبین عرجھا والمھز ولما لبین ھزالھا و المقطوعۃ الاذان المصطلمۃ۔ (مستدرک الوسائل)

اس جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے جس کا سینگ ٹوٹا ہوا ہو یا نمایاں طور پر لنگڑاتا ہو یا نمایاں طور پر لاغر و کمزور ہو یا کان کٹا ہوا ہو۔

جب قربانی کر چکے تو اگر اس سے پہلے حج کر چکا ہے تو تھوڑے سے بال کٹوا لینا کافی ہے اور اگر پہلا حج ہو تو سر منڈوانا واجب ہے اور اگر سر پر بال نہ ہوں تو پھر بھی سر پر استرا پھیر لینا چاہیے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الاقرع رسم الموسی علی راسہ۔ (وافی)

گنجا آدمی اپنے سر پر استرا پھیر لے۔

اسی دن اعمال منیٰ سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ میں آئے اور طواف زیارت و نماز طواف بجا لائے۔ چنانچہ حضرتؑ نے آیہ قرآنی "**ولیطوفوا بالبیت العتیق** ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کریں"۔ کی تفسیر میں فرمایا۔

هو طواف الزيارة بعد الذبح والحلق۔ (مستدرک الوسائل)

اس سے مراد طواف زیارت ہے جو قربانی اور سر منڈوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور طواف النساء دو رکعت نماز سمیت بجا لائے اور پھر منیٰ میں پلٹ آئے اور گیارھویں اور بارھویں رات منیٰ میں گزارے۔ چنانچہ حضرتؑ نے۔

نهى ان يبيت احد من الحجيج ليالي منى الا بمنى۔ (مستدرک الوسائل)

اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات منیٰ سے باہر گزارے۔

گیارھویں اور بارھویں ذی الحجہ کو رمی جمرات کرے اور بارھویں ذی الحجہ کو ظہر کے بعد منیٰ سے چل دے جس کے بعد حج تمام ہو جائے گا۔

باب الزکواۃ

زکواۃ ایک مالی عبادت ہے جو ہر صاحب نصاب پر مقررہ مقدار میں واجب ہے۔ یہ اسلام کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے اس کا تارک فاسق اور منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان الزکواۃ جعلت مع الصلواۃ قربانا لا ھل الاسلام ومن لم یعطھا طیب النفس بھا یرجو بھا من الثمن ما ھو افضل منھا فانہ جاھل بالسنتہ مغبون الاجرضال العمر طویل الندم بترک امر اللہ عزوجل والرغبتہ عما علیہ ضالحو عباداللہ۔ (وافی)

اہل اسلام کے لئے نماز کے ساتھ زکواۃ کو تقرب خداوندی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جو شخص بہتر اجر کی امید رکھتے ہوئے قلبی رضا مندی کے ساتھ زکواۃ ادا نہیں کرتا وہ حکم خدا کی خلاف ورزی اور اللہ کے نیک بندوں کے طریق کار سے روگردانی کی وجہ سے سنت سے بے خبر اجر کے اعتبار سے نقصان رسیدہ گمراہی میں عمر کھونے والا اور طویل ندامت و پشیمانی اٹھانے والا ہے۔

زکواۃ نو چیزوں پر واجب ہے۔ سونا' چاندی' گیہوں' جو' کشمش' کھجور' اونٹ' گائے' بیل اور گوسفند (بھیڑ' بکری' دنبہ) سونے' چاندی اور چوپایوں پر زکواۃ اس وقت عائد ہو گی جب وہ گیارہ مہینے ایک آدمی کی ملکیت میں رہیں اور بارھواں مہینہ شروع ہو گا تو زکواۃ دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس فی مال مستفاد زکواہ حتی یحول علیہ الحول۔ (مستدرک الوسائل)

حاصل کردہ مال پر زکواۃ نہیں ہے جب تک اس پر حول نہ گزرے۔

سونے اور چاندی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سکہ کی صورت میں ہوں۔ اگر سونے کا سکہ ہو تو اس کا پہلا نصاب بیس دینار (پانچ تولے ساڑھے سات ماشے) ہے اور چاندی کا سکہ ہو تو اس کا پہلا نصاب دو سو درہم (اناپلیس تولے ساڑھے دس ماشے) ہے اگر اس مقدار سے کم ہوں تو زکواۃ واجب نہ ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من کان عندہ ذھب لا یبلغ عشرین دینار اوفضتہ لا تبلغ مائی درھم فلیس علیہ زکواۃ۔ (مستدرک الوسائل)

جس کے پاس سونے کے بیس دینار یا چاندی کے دو سو درہم نہ ہوں اس پر زکواۃ نہیں ہے۔

جب سونے یا چاندی کے سکے بقدر نصاب ہوں تو ۴۰ زکواۃ کے طور پر دینا واجب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان کان مالہ فضل علی مائی درهم فلیعط خمسۃ دراهم۔ (مستدرک الوسائل)

جس کا مال دو سو درہم تک بڑھ جائے وہ پانچ درہم (بطور زکواۃ) دے۔

اگر کسی کے پاس سونے اور چاندی کے سکے ہوں اور وہ اپنے مقررہ نصاب سے کم ہوں تو ان پر زکواۃ نہیں ہے۔ اگرچہ ان دونوں کی مجموعی مالیت بقدر نصاب ہو یا نصاب سے بڑھ جاتی ہو۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یجب علیہ ان یضم الذهب الی الفضۃ (مستدرک الوسائل)

زکواۃ دینے والے ضروری نہیں ہے کہ وہ سونے کو چاندی سے منضم کرے۔

گیہوں، جو، کشمش اور خرما پر زکواۃ اس وقت واجب ہو گی جب وہ بقدر نصاب ہوں اور ان کا نصاب ۳۰۰ صاع یعنی اکیس من چوبیس سیر ہے۔ اگر یہ چیزیں بارش یا سیلاب سے سینچی گئی ہوں تو زکواۃ ۱۰را ہو گی اور اگر ڈول یا رہٹ وغیرہ سے آبپاشی کی گئی ہو تو زکواۃ ۲۰را ہو گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ماسقت السماء او سقی سیحافقیہ العشر وما سقی بالغرب اوالدالیۃ ففیہ نصف العشر۔ (مستدرک الوسائل)

جو بارش یا زمین پر بہنے والے پانی سے سیراب ہو اس کی زکواۃ دسواں حصہ ہے اور جو ڈول یا رہٹ سے سیراب کی جائے اس کی زکواۃ بیسواں حصہ ہے۔

چوپایوں میں حول و نصاب کے علاوہ دو شرطیں زائد ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سال بھر چراگاہوں میں چریں اور مالک پر ان کی خوراک کا بار نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان سے بار برداری، کھیتی باڑی، آب کشی وغیرہ کا کام نہ لیا جاتاہو۔

اونٹوں کا پہلا نصاب پانچ ہے۔ پانچ اونٹوں پر ایک بھیڑ یا بکری دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا بلغ مالہ خمسا من الابل ففیھا شاۃ (مستدرک الوسائل)

جب اونٹوں کی تعداد پانچ تک پہنچ جائے تو ایک بکری بطور زکواۃ دی جائے گی۔

گائے، بیل کا پہلا نصاب تیس ہے۔ تیس گائے، بیلوں پر ایک بچھڑا یا ایک بچھڑی جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو بطور زکواۃ دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس فی البقر شئی حتی یبلغ ثلثین فاذا بلغت ثلثین و کانت سائمۃ لیست من العوامل ففیھا تبیع اوتبیعتہ (مستدرک الوسائل)

جب تک گائے بیل کی تعداد تیس نہ ہو جائے ان پر زکواۃ نہیں ہے اور جب ان کی گنتی تیس ہو جائے اور وہ چرائی پر بسر کرتی ہوں اور بیکار ہوں تو ان کی زکواۃ ایک بچھڑا یا ایک بچھڑی ہے جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔

بھیڑ، بکریوں کا پہلا نصاب، چالیس ہے چالیس بھیڑوں پر ایک بھیڑ زکواۃ میں دی جائے گی۔

باب الخمس

خمس بھی ایک مالی فریضہ ہے جس کی ادائیگی لازم و واجب ہے۔ خمس اولاد عبدالمطلب ہی کو دیا جائے گا کیونکہ شارع نے ان کے لئے زکواۃ کو حرام کیا ہے اور اس کا عوض خمس کی صورت میں دیا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

نحن واللہ عنی بزوی القربی والذین قرنھم اللہ بنفسہ ونبیہ فقال فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی و الیتمی والمساکین وابن لسبیل منا خادتہ ولم یجعل لنا فی سم الصدقہ تضیبا اکرم اللہ نبیہ و اکرمنا ان یطعمنااو ساخ ایدی الناس۔ (وافی)

خدا کی قسم (قرآن مجید میں) ذوی القربی سے ہم ہی مراد ہیں جنہیں اللہ نے اپنے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ (خمس میں) شریک کیا ہے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے مال کا پانچواں حصہ اللہ رسول اور قرابتداروں یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے" یہ سب ہم ہی میں سے ہیں اللہ نے ہمارے لئے صدقہ میں حصہ نہیں رکھا اور ہمیں اس سے بالا تر قرار دیا ہے کہ ہمیں لوگوں کے ہاتھوں کا میل کھلائے۔

خمس جنگ کے ذریعہ حاصل ہونے والے اموال، کانوں سے نکلنے والی اشیاء، دفینوں اور سمندر میں غوطہ لگا کر دستیاب ہونے والی چیزوں پر واجب ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الخمس یجری من اربعتہ وجوہ من الغنائم التی یصیبھا المسلمون من المشرکین و من المعادن ومن الکنوز ومن الغوص۔ (وسائل الشیعہ)

خمس چار وجوہ پر عائد ہوتا ہے اس مال پر جو مسلمانوں کو (جنگ کے دوران) مشرکوں سے دستیاب ہو اور کانوں اور دفینوں سے جو چیزیں ملیں اور غوطہ لگا کر جو اشیاء حاصل ہوں۔

ان اشیاء کے علاوہ ذرائع کسب و معیشت سے سال کے اخراجات وضع کرنے کے بعد جو بچے اور اس زمین سے جو کافر ذمی مسلمان سے خریدے اور اس مال میں سے جس میں حلال و حرام ملا جلا ہو خمس نکالنا ضروری ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام سے عرض کیا کہ یاامیرالمومنین میں حلال و حرام کا امتیاز کئے بغیر کمائی کرتا رہا ہوں اور بعد میں تائب ہو چکا ہوں اور میرے پاس مال حلال بھی ہے اور مال حرام بھی مگر میں ان دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتا اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حضرتؑ نے فرمایا۔

اخرج خمس مالک فان اللہ عزو جل قد رضی عن الانسان بالخمس وسائر المال کلہ لک حلال۔ (الفقیہ)

اپنے مال میں سے خمس نکال ڈالو باقی مال تمہارے لئے حلال ہے اس لئے کہ خدائے بزرگ و برتر خمس دینے پر آدمی سے راضی ہو جاتا ہے۔

خمس کی تقسیم اس طرح ہو گی کہ اس کے چھ حصے کئے جائیں گے تین حصے اللہ' رسول اور امام کے یہ حصے سہم امام کہلاتے ہیں اور تین حصے اولاد عبدالمطلب کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے یہ حصے سہم سادات کہلاتے ہیں پہلے تینوں حصوں کے مالک امام زمانہ علیہ السلام ہیں اور ان کی غیبت میں یہ تینوں حصے مجتہد جامع الشرائط کے سپرد کئے جائیں گے تاکہ وہ ان موارد پر صرف کرے جن سے دین کو نشرو فروغ حاصل ہواور بقیہ تین حصے بنی ہاشم کے یتیموں فقیروں اور ان مسافروں کو جو مسافرت میں ضرورت مند ہو گئے ہوں دیئے جائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

هذا الخمس علی ستة اجزاء فیاخذ الامام منها سهم الله وسهم الرسول وسهم ذی القربی ثم یقسم الثلثة السهام الباقیة بین یتامی آل محمد ومساکینهم وابناء سبیلهم۔ (وسائل الشیعہ)

خمس کے چھ حصے ہیں اللہ رسول اور ذی القربی کا حصہ یہ تینوں حصے امام لے گا اور باقی تین حصے سادات کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کئے جائیں گے۔

باب الجہاد

کفار و مشرکین اور امام برحق سے بغاوت کرنے والوں کے خلاف حرب و پیکار کا نام جہاد ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس سے حوزہ اسلام کو دشمن کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا جا سکتا اور اسلام کی ترقی و ترویج کی راہیں ہموار کی جا سکتی ہیں۔ اگر دشمن کی قوت و طاقت کو کچلا اور ان کے شرانگیز اقدامات کو روکا نہ جائے تو نہ دین فروغ پا سکتا ہے اور نہ امن و سکون بحال ہو سکتا ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

واللہ ماصلحت دنیا ولا دین الابہ۔ (وافی)

خدا کی قسم جہاد کے بغیر نہ دنیا سدھر سکتی ہے اور نہ دین۔

جہاد کے صحیح مورد و محل کی تشخیص نبی یا امام ہی کر سکتا ہے اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اذن امام علیہ السلام ضروری ہے تاکہ غلط کشت و خون سے محفوظ رہا جا سکے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یا کمیل لاغزو الامع امام عادل۔ (مستدرک الوسائل)

اے کمیل جہاد امام عادل ہی کے ساتھ ہو کر کیا جا سکتا ہے۔

جہاد صرف بالغ اور آزاد مردوں پر واجب ہوتا ہے اور غلاموں، عورتوں اور بچوں پر سے ساقط ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لیس علی العبید جہاد ما استغنو اعنھم ولا علی النساء ولا علی من لم یبلغ الحلم۔ (مستدرک الوسائل)

غلاموں پر جبکہ ان کے بغیر کام نکل سکتا ہو اور عورتوں اور نابالغ بچوں پر جہاد واجب نہیں ہے۔

جہاد سے منہ موڑنا غضب الٰہی کا باعث اور میدان جنگ سے فرار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الفرار من الزحف من الکبائر۔ (مستدرک الوسائل)

جنگ سے فرار کبائر میں داخل ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے فرار کو کفر سے بھی تعبیر کیا ہے چنانچہ جنگ احد میں جب رسول اللہ نے لوگوں کو میدان چھوڑتے دیکھا تو حضرت علی علیہ السلام سے کہا اے علی علیہ السلام تم ان بھاگنے والوں کے ساتھ کیوں نہیں گئے آپؑ نے کہا۔

یا رسول اللہ ارجع کافر ابعد اسلامی۔ (مستدرک الوسائل)

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا اسلام کے بعد میں کفر کی طرف پلٹ جاتا۔

یونہی دشمن کے آگے ہتھیار ڈالنا اور اپنے کو اس کے حوالے کر دینا حمیت اسلامی کے خلاف ہے ایسے لوگوں کو قید و بند سے آزاد کرانے کے لئے فدیہ بیت المال سے نہیں دیا جائے گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

من استا سرمن غیر جراحتہ مثقلہ فلا یفدی من بیت المال ولکن یفدی من مالہ ان احب اھلہ۔ (وافی)

جو شخص شدید زخمی ہوئے بغیر خود کو دشمن کے قبضہ میں دے دے تو اسے آزاد کرانے کے لئے فدیہ کی رقم بیت المال سے نہیں دی جائے گی البتہ اس کے گھر والے چاہیں تو اس کے مال میں سے دے سکتے ہیں۔

جن لوگوں کے مقابلہ میں محاذ جنگ قائم کیا جاتا ہے وہ تین گروہوں پر منقسم ہیں۔

پہلا گروہ کفار و مشرکین کا ہے ان کے مقابلہ میں اترنے سے پہلے ضروری ہے کہ انہیں اسلام لانے کے لئے کہا جائے۔ اگر وہ دعوت اسلام رد کر دیں تو پھر ان سے جنگ کا جواز پیدا ہو جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایغزی قوم حتی یدعوا۔ (مستدرک الوسائل)

جب تک کفار کو دعوت اسلام نہ دی جائے ان سے جنگ نہیں کی جائے گی۔

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن روانہ کیا تو فرمایا۔

یا علی لاتقاتل احدا حتی تدعوہ الی الاسلام۔ (وافی)

اے علی علیہ السلام جب تک اسلام کی دعوت نہ دے لو کسی سے جنگ نہ چھیڑو۔

اسلام نے جنگ و قتال میں ان حربوں سے بشدت منع کیا ہے جو دور جاہلیت میں بروئے کار لائے جاتے تھے چنانچہ دشمن کی ہلاکت و تباہی کے لئے کنوؤں چشموں اور جانوروں کو سیراب کرنے والے تالابوں میں زہر کی آمیزش کر دی جاتی تھی۔ اسلام نے اس کی قطعا" اجازت نہیں دی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

نھی رسول اللہ ان یلقی السم فی بلاد المشرکین۔ (وافی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے شہروں میں زہر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں حریف کے لاشہ کو عریاں کر کے گھسیٹا جاتا اور ناک کان اور دوسرے اعضاء کاٹ کر گلے

میں آویزاں کئے جاتے۔ اسلام اس قسم کی بہیمانہ حرکات کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

لاتکشفوا عورۃ ولا تمثلوا القتیل۔ (وافی)

کسی کی پردہ داری نہ کرو اور نہ مرنے کے بعد کسی کے اعضاء و جوارح کاٹو

دشمن کو امان دینے اور جان کے تحفظ کا وعدہ کرنے کے بعد اس پر ہاتھ اٹھانا ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من ائتمن رجلا علی دمہ ثم خاس بہ فانا من القاتل بری وان کان المقتول فی النار۔ (وافی)

جو کسی کو امان دے اور پھر دھوکے سے اسے قتل کر دے تو میں اس سے بیزار ہوں اگرچہ مقتول دوزخ ہی میں جائے گا۔

دوسرا گروہ اہل کتاب (یہود، نصاری اور مجوس) کا ہے اگر یہ دعوت اسلام قبول کر لیں تو بہتر ورنہ ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اگر جزیہ سے انکار کر دیں یا جزیہ قبول کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی کریں تو ان سے جنگ کی جائے گی اور درصورتیکہ معاہدہ کے پابند رہیں ان کے مال و جان کی حفاظت کی جائے گی اور ان سے جنگ کرنا جائز نہ ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اوفو البعھد من عاھد تم۔ (مستدرک الوسائل)

جن سے کوئی معاہدہ کیا ہو اس معاہدہ کو پورا کرو۔

تیسرا گروہ ان باغیوں کا ہے جو امام برحق کے خلاف آمادہ بغاوت ہو کر میدان جنگ میں اتر آئیں ان باغیوں میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کے پیچھے فوجی طاقت کا ذخیرہ نہ ہو جیسے اصحاب جمل کہ ان کے پیچھے نہ قوت و طاقت تھی اور نہ انہیں تسلط و اقتدار حاصل تھا کہ وہاں سے انہیں کمک پہنچ سکتی ان کے بارے میں حضرتؑ کا طرز عمل یہ رہا کہ جب تک ان کی طرف سے ابتداء نہیں ہوئی آپ نے اپنی سپاہ کو لڑنے کی اجازت نہیں دی اور اسے ہدایات دیتے ہوئے فرمایا۔

لاتقا تلو ھم حتی یبدؤ کم فانکم بحمداللہ علی حجتہ وترککم ایاھم حتی یبدؤ کم حجتہ اخری لکم علیھم۔ (مستدرک الوسائل)

جب تک وہ پہل نہ کریں تم ان سے جنگ نہ کرنا کیونکہ تم بحمداللہ دلیل و حجت رکھتے ہو اور تمہارا انہیں چھوڑ دینا کہ وہ پہل کریں یہ ان پر دوسری حجت ہو گی۔

ان باغیوں کے پسپا ہونے کے بعد بھاگنے والوں کا تعاقب کرنے، زخمیوں کو ٹھکانے لگانے اور اسیروں کو قتل

کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے جنگ کے فوراً بعد اعلان کیا۔

لا تجیزو اعلی جریح ولا تتبعوا مدبرا ومن اغلق بابہ فھو آمن ومن القی سلاحہ فھو آمن۔ (وافی)

کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا کسی پیٹھ پھرانے والے کا پیچھا نہ کرنا جو دروازہ بند کر لے اور جو ہتھیار رکھ دے وہ محفوظ ہے۔

ان کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز بنانے کا بھی جواز نہیں ہے چنانچہ جنگ جمل کے خاتمہ پر کچھ لوگوں نے حضرتؑ سے کہا کہ ان باغیوں کے بال بچوں اور عورتوں کو ہماری غلامی و کنیزی میں دے دیجئے۔ آپؑ نے فرمایا۔

لیس لکم علیھن ولا علی الذراری من سبیل۔ (مستدرک الوسائل)

تمہیں عورتوں اور ان کی آل اولاد پر حق تصرف نہیں ہے۔

اس پر ان لوگوں نے تکرار کیا تو فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اپنی ماں عائشہؓ کو اپنے حصہ میں لینا چاہتا ہے یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔

ان کے املاک و اموال کو بھی نہیں لیا جا سکتا۔ البتہ وہ چیزیں جن سے انہوں نے جنگ میں مدد لی ہو اور میدان جنگ میں چھوڑ گئے ہوں انہیں قبضہ میں لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اپنے لشکر والوں سے فرمایا۔

ما اجلبوا بہ علیکم واستعانوا بہ علی حربکم وضمہ عسکر ھم و حواہ فھو لکم۔ (مستدرک الوسائل)

جن چیزوں کے ساتھ انہوں نے تم پر لشکر کشی کی ہے اور جنگ میں مدد لی ہے اور جو چیزیں میدان جنگ میں ہوں وہ تمہاری ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس استحقاق سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور ان پر ایک طرح کا احسان کرتے ہوئے جنگ میں سمیٹا ہوا مال بھی واپس کروا دیا۔ چنانچہ جنگ کے بعد آپ نے موسیٰ ابن طلحہ کو نام لے کر پکارا۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ اسے قتل کرنے کے لئے پکارا جا رہا ہے۔ وہ لرزاں و ترساں حضرتؑ کے سامنے حاضر ہوا آپؑ نے فرمایا اے موسیٰ اللہ سے استغفار کرو اس نے توبہ و استغفار کی اس کے بعد آپؑ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

اذھب حیث شئت وما وجدت فی عسکرنا من سلاح اوکراع فخذہ واتق اللہ فیما تستقبل من امرک واجلس فی بیتک۔ (مستدرک الوسائل)

جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ اور ہمارے لشکر میں اپنے ہتھیار اور چوپائے دیکھو تو وہ بھی لے لو اور پیش آئند حالات میں اللہ سے ڈرو اور اپنے گھر میں جا کر بیٹھو۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کے پیچھے قوت و طاقت ہو جیسے اہل شام ان کی پشت پر امیر شام تھا جو تسلط و اقتدار

رکھتا تھا اور شام کا علاقہ اس کے زیر تصرف تھا جہاں سے مزید کمک بھی حاصل کی جا سکتی تھی اور شکست و ہزیمت کی صورت میں انہیں پناہ بھی مل سکتی تھی۔ اس لئے انہیں صرف منتشر کر دینا کافی نہ تھا کیونکہ منتشر ہونے کے بعد وہ اپنی کھوئی ہوئی قوت و طاقت کو دوبارہ جمع کر کے صف آرا ہو سکتے۔ تھے اس بنا پر امکانی حدود تک ان کی سرکوبی ضروری تھی چنانچہ حضرتؑ نے ان کے بارے میں فرمایا۔

یقاتل اهل البغی ویقتلون بکل ما یقتل به المشرکون ویستعان بکل ما امکن ان یستعان به علیهم من اهل القبلة ویوسرون کما یوسرالمشرکون اذا قدر علیهم۔ (مستدرک الوسائل)

باغیوں سے جنگ کی جائے گی اور ہر اس چیز سے انہیں قتل کیا جائے گا جس سے مشرکین کو قتل کیا جاتا ہے اور ان کے خلاف اہل قبلہ سے ہر ممکن مدد لی جائے گی اور جہاں تک بس چلے گا انہیں مشرکوں کی طرح اسیر بنایا جائے گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے دور خلافت کے غزوات اس امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اگر اسلام لانے کے بعد کچھ لوگ جمیعت یا اقتدار کا سہارا لے کر امام برحق کے خلاف بغاوت پر اتر آئیں تو ان سے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے اور کن لوگوں کو منتشر و پراگندہ کر دینا کافی ہے اور کن لوگوں کا استیصال ضروری ہے اور ان کے املاک و اموال اور اسراء سے کیا سلوک کیا جانا چاہئے۔ اگر حضرت کا یہ طرز عمل سامنے نہ ہوتا تو یہ معلوم نہ ہوتا کہ باغیوں سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اسلامی طریق کار کیا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

لو لم یقاتلهم علی علیه السلام لم یدر احد بعده کیف یسیر۔ (وافی)

اگر علی علیہ السلام ان لوگوں سے جنگ و قتال نہ کرتے تو کسی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اگر آپ کے بعد یہ صورت پیش آئے تو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

نیکی کا حکم دینا امر بالمعروف اور برائی سے منع کرنا نہی عن المنکر کہلاتا ہے۔ یہ اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ ہے کیونکہ اسلام کا مقصد اولین نیکی کا شیوع اور برائی کا انسداد ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کا یہی ذریعہ ہے کہ ہر شخص جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو نیکی کی راہ دکھائے اور برائی سے روکے تاکہ اسلامی خطوط پر ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل ہو سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

غایتہ الدین الامر با لمعروف والنھی عن المنکر۔ (الغرر آمدی)
دین کی غرض و غایت یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے منع کیا جائے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی افادیت ایک فرد یا چند افراد تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک روشن منارہ ہے۔ جس کی روشنی چار سو پھیلتی اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو منزل کی راہ دکھاتی ہے۔ اسی ہمہ گیرافادیت کی بنا پر اسے دوسرے اعمال پر فوقیت دی گئی ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الامر با لمعروف افضل اعمال الخلق۔ (مستدرک الوسائل)
اعمال خلق میں بہترین عمل امر بالمعروف ہے۔

ہر شخص کو بقدر امکان اپنا یہ فرض ادا کرنا چاہئے اگر قوت و طاقت رکھتا ہو تو زور بازو سے برائیوں کی روک تھام کرے۔ اگر ہاتھ سے منع کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے کہے سنے اور اگر زبان میں بھی جرأت اظہار نہ ہو تو دل سے برا سمجھے اور اپنے تیوروں سے اظہار تنفر کرے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

من ترک انکار المنکر بقلبہ ویدہ ولسانہ فھو میت بین الاحیاء۔ (وافی)
جو شخص دل' ہاتھ اور زبان سے نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے وہ زندوں میں چلتی پھرتی لاش ہے۔

قلبی تنفر اگرچہ نہی عن المنکر کا ادنی درجہ ہے مگر یہ بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کے احساسات مردہ نہ ہوں تو دوسروں کی پیشانیوں کی شکنیں اور ان کا تنفرانہ رویہ دیکھ کر اپنے اندر محاسبہ کا ایک جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایک وقت اسے برائیوں سے دستبردار ہونے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر امیرالمومنین علیہ السلام نے عصیاں کاروں سے خندہ روئی و کشادہ پیشانی سے پیش آنے سے منع فرمایا ہے تاکہ ان کا ضمیر انہیں جھنجھوڑے اور گناہ کے ارتکاب کی جرأت و جسارت نہ بڑھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ادنی الانکار ان تلقی اھل المعاصی بوجوہ مکفھرہ۔ (تہذیب)

نہی عن المنکر کا ادنی درجہ یہ ہے کہ بدکرداروں سے تیوریاں چڑھا کر پیش آؤ۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فائدہ ہی کیا جب کہ ہر شخص اپنے افعال و اعمال کا خود جوابدہ ہے۔ اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے اور کوئی برے کام کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ خود ہی اس کی پاداش سے دوچار ہوتا ہے۔ ہمیں نہ کسی کے اچھے کاموں سے فائدہ پہنچتا ہے اور نہ کسی کے برے کاموں سے نقصان لہٰذا کسی اچھائی کا حکم دے کر یا برائی سے منع کر کے اس کے کاموں میں دخل انداز ہونے اور اس کی خفگی و ناراضگی مول لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ نظریہ سراسر غلط ہے اس لئے کہ ایک غلط معاشرہ میں انسان خود بھی بے راہ ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اگر برائیوں کی آلودگیوں سے پاک و صاف رہنا بھی چاہے تو اس کے لئے معاشرہ کے گرد و پیش کے اثرات سے بچ نکلنا انتہائی مشکل ہو گا۔ اس لئے کہ اچھی زندگی اچھے ماحول میں پروان چڑھتی ہے اور غیر اخلاقی ماحول میں اخلاقی زندگی کی سانسیں اکھڑ جاتی ہیں اور اچھا معاشرہ اسی صورت میں تشکیل پذیر ہو سکتا ہے جب اپنی سود و بہبود کے ساتھ دوسروں کی صلاح و فلاح کی بھی فکر کی جائے اور نیکی کو فروغ دینے اور برائی کو ختم کرنے کے لئے امکانی مساعی سے دریغ نہ کیا جائے۔ تاکہ جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ اخلاقی برائیوں سے پاک و صاف رہے۔ اگر نیکی کی طرف دعوت دینے اور برائی کو روکنے کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر برائیوں کے سیل رواں پر بند نہ باندھا جا سکے گا اور ہر قسم کی برائی اپنے عروج پر پہنچ جائے گی اور جس معاشرہ میں برائیاں عام ہو جائیں وہ قانون فطرت کے ماتحت تباہ و برباد ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ظالم حکمرانوں کے شکنجے میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تترکوا الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فیولی اللہ اسور کم شرار کم ثم تدعون فلا یستجاب لکم دعاؤ کم۔ (مستدرک الوسائل)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک نہ کرو ورنہ تم میں سے بد ترین لوگوں کو اللہ تم پر مسلط کر دے گا پھر دعائیں مانگتے رہو گے اور تمہاری دعائیں شرف قبولیت حاصل نہ کریں گی۔

ولایت و برائت

ولایت کے معنی یہ ہیں کہ دوستان خدا (انبیاء و آئمہ) سے محبت و دوستی رکھی جائے اور براءت کے معنی یہ ہیں کہ دشمنان خدا (کفار و منافقین) سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ اس ولایت و براءت کو تولا و تبرا سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کہ دوستان خدا و دشمنان خدا دونوں ایک

دوسرے کی ضد اور ان کے اطوار و اعمال ایک دوسرے کے مخالف و متضاد ہیں۔ اس لئے ایک سے وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک سے دوستی کا دم بھرا جائے اور اس کے دشمن سے بھی دوستی کی پینگیں بڑھائی جائیں بلکہ ایک سے ملا جائے گا تو دوسرے کو چھوڑنا پڑے گا کیونکہ دوست کا دشمن اور دشمن کا دوست' دوست نہیں ہو سکتا کہ دونوں سے رابطہ اتحاد و الفت قائم رکھا جا سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اصدقاؤک ثلاثہ واعداؤک ثلاثہ فاصد قاؤک صدیقک و صدیق صدیقک وعدو عدوک واعداؤک فعدوک وعدو صدیقک و صدیق عدوک۔ (نہج البلاغہ)

تین قسم کے تمہارے دوست ہیں اور تین قسم کے دشمن' دوست یہ ہیں تمہارا دوست تمہارے دوست کا دوست اور تمہارے دشمن کا دشمن اور دشمن یہ ہیں تمہارا دشمن تمہارے دوست کا دشمن اور تمہارے دشمن کا دوست۔

ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو بھی دوست رکھتا ہوں اور فلاں شخص کو بھی۔ آپؑ نے یہ سنا تو فرمایا۔

الآن انت اعور اما ان تعمی و اما ان تبصر۔

اس صورت میں تم یک چشم ہو یا دوسری آنکھ کو پھوڑ کر نابینا ہو جاؤ یا دونوں آنکھوں سے دیکھو۔

مقصد یہ تھا کہ اگر میرے ساتھ میرے دشمن و مخالف کو بھی دوست رکھتے ہو تو مجھے بھی دشمن رکھو اور اس طرح مکمل طور پر اندھے ہو جاؤ یا صرف مجھے دوست رکھو اور پورے بینا و بابصیرت ہو جاؤ۔

ایک طبقہ سے دوستی اور اس کے حریف و مخالف طبقہ سے اظہار بیزاری میں یہ حکمت مضمر ہے کہ انسان جس کو دوست رکھتا ہے اس کے طرز بود و ماند' رفتار و گفتار اور عمل و کردار کو بھی دوست رکھتا ہے اور جس کی طرف سے تنفر رکھتا ہے اس کے حرکات و سکنات کو بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے لہٰذا جسے دوست رکھے گا اس کے اخلاق و عادات اور افعال و اعمال کی پیروی بھی کرے گا اور جس سے متنفر ہو گا اس کے طور طریقوں سے بھی اجتناب برتے گا۔

اسلام میں اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و وابستگی کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ ان کے قول و فعل کا اتباع کیا جائے اور ان کے مخالفین کے طرز عمل سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ کیونکہ محبت کا تقاضا اتباع ہے اگر ہم محبت اہل بیت کا دعویٰ کریں اور ان کے احکام کی پابندی نہ کریں یا ان کے دشمنوں سے اظہار نفرت کریں اور طرز عمل انہی کا سا اختیار کریں تو ہم نے نہ محبت کے تقاضوں کو پورا کیا اور نہ نفرت و بیزاری کے تقاضوں سے

عہدہ برآ ہوئے۔ اس لئے کہ اتباع ہے تو محبت و دوستی بھی ہے اور اتباع نہیں تو محبت و دوستی بے سند ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اتباع کو محبت کا معیار قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

من احبنا فليعمل بعملنا۔

جو ہمیں دوست رکھتا ہے اسے چاہئے کہ ہمارے اعمال کے مطابق عمل کرے۔

باب التجارة

تجارت کے معنی خرید و فروخت اور تبادلہ اشیاء کے ہیں اور یہ اجتماعی زندگی کے لئے از بس ضروری ہے کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے تمام ضروریات خود مہیا نہیں کر سکتا۔ بلکہ ایک گروہ کی پیدا کردہ چیزیں ہم استعمال کرتے ہیں اور ہماری پیدا کردہ اشیاء دوسروں کے استعمال میں آتی ہیں اور اس طرح معاشرہ کے تمام افراد باہمی احتیاج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ابتداء میں اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ہوتا تھا۔ پھر اشیاء کا تبادلہ سکہ سے شروع ہوا۔ جس میں طلب و رسد کے رد عمل سے اتار چڑھاو اور قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ خرید و فروخت کبھی اپنی ضرورت اور ذاتی استعمال کے لئے ہوتی ہے اور کبھی کار و کسب کے لئے تاکہ اپنے ضروریات کے لئے نفع کمانے کے ساتھ دوسروں کے ہاتھوں میں ان کی مطلوبہ اشیاء بآسانی پہنچ سکیں۔

اسلام نے فقرو احتیاج کو دور کرنے کے لئے حتی المقدور سعی و طلب لازم و واجب قرار دی ہے۔ تاکہ انسان اپنی اقتصادی حالت بہتر بنائے اور اہل و عیال کی کفالت کے ساتھ مالی عبادات، زکواۃ، خمس، حج وغیرہ بجا لا سکے۔ ان ذرائع معیشت میں سر فہرست تجارت ہے جو آسودہ حالی اور مالی وسعت کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

تعرضو اللتجارہ فان فیها غناکم عما فی ایدی الناس۔ (وافی)

تجارت کرو اس لئے کہ تجارت تمہیں ان چیزوں سے مستغنی بنا دے گی جو دوسروں کے ہاتھوں میں ہیں۔

تجارت کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے تجارت کے احکام سیکھ لئے جائیں تاکہ بیع و ربا میں فرق اور جائز و ناجائز میں امتیاز کر سکے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام سے کہا کہ میرا ارادہ کاروبار کرنے کا ہے۔ فرمایا کیا دین کے احکام میں تمہیں کچھ سوجھ بوجھ ہے کہا کہ بعد میں ایسا ہو جائے گا-آپؑ نے فرمایا۔

ویحک الفقہ ثم المتجر فانہ من باع واشتری ولم یسئل عن حرام و حلال ارتطم فی الربوا ثم ارتطم۔ (دعائم الاسلام)

پہلے مسائل سیکھو پھر تجارت کرو کیونکہ جو شخص خرید و فروخت کرتا ہے اور حرام و حلال کے بارے میں دریافت نہیں کرتا وہ سود میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

ذیل میں خرید و فروخت کے چند احکام حضرتؑ کے ارشادات کی روشنی میں درج کئے جاتے ہیں۔

نجس العین اشیاء کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

بائع الخبیثات و مشتر بها فی الاثم سواء۔ (مستدرک الوسائل) ناپاک چیزوں کا بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔

جن چیزوں کی خرید و فروخت ناجائز ہے ان کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو گی اس میں بھی تصرف ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من السحت ثمن المیتته و ثمن الکلب و ثمن الخنزیر۔ (مستدرک الوسائل) مردار کتے اور خنزیر کی فروخت کی رقم حرام ہے۔

البتہ شکاری کتے کی بیع جائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا باس بثمن کلب الصید۔ (مستدرک الوسائل) شکاری کتے کی رقم فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آلات لہو و لعب کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ومن السحت ثمن الشطرنج والنرو۔ (مستدرک الوسائل) شطرنج اور نرو کی رقم فروخت حرام ہے۔

اگر کوئی پاک چیز نجس ہو جائے اور اس کا پاک کرنا ممکن نہ ہو تو اسے ایسے کام کے لئے جس میں طہارت شرط نہ ہو فروخت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے نجس ہو جانے والے تیل کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

یبیعہ لمن یعملہ صابونا۔ (مستدرک الوسائل) ایسے شخص کے ہاتھ بیچ ڈالے جو اسے صابن بنانے کے کام میں لانا چاہتا ہو۔

اگر مالک اپنے مملوکہ مال کو خریدار کے سپرد کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ بیع صحیح نہ ہو گی۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لایجوز بیع العبد الآبق والدابته الضالته۔ (مستدرک الوسائل) بھاگے ہوئے غلام اور گم شدہ جانور کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

جو چیز بیچی جائے اور جو چیز اس کے تبادلہ میں لی جائے وہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بائع و مشتری کے علم

میں ہونا چاہئے۔ اگر اس کا وزن یا پیائش یا عدد معلوم نہ ہو گا تو بیع جائز نہ ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ وہ مچھلی جو کسی جوہڑ وغیرہ میں ہو یا وہ دودھ جو تھنوں کے اندر ہو یا وہ اون جو بھیڑ' بکری سے الگ نہ کی گئی ہو اس کی بیع جائز ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔

هذا كله لايجوز لانه مجهول غير معروف يقل اويكثر۔ (مستدرک الوسائل)

ان تمام چیزوں کی بیع ناجائز ہے خواہ کم ہوں یا زیادہ کیونکہ (وزن و مقدار میں) انجانی ہیں۔

دو شخص حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اپنے اس ساتھی کے ہاتھ چند ٹوکریاں فروخت کیں اور ان میں سے پانچ ٹوکریاں مستثنیٰ کر دیں۔ ان میں کچھ بڑھیا ہیں اور کچھ گھٹیا۔ کیا یہ بیع صحیح ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ بیع فاسد ہے۔ کیونکہ جن ٹوکریوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا وہ متعین و معلوم نہ تھیں۔

جب ایک جنس کو جو تول یا ناپ سے بکتی ہو اسی جنس کے عوض بیچا جائے تو دونوں جنسوں کو مساوی و ہموزن ہونا چاہئے اور اگر کمی بیشی کے ساتھ فروخت کیا جائے گا تو یہ زیادتی ربا میں شمار ہو گی مثلاً" ایک من گیہوں کو ایک من ایک سیر گیہوں کے عوض بیچا جائے تو ایک سیر ربا قرار پائے گااور ربا حرام ہے۔ لہٰذا جنس کا اسی جنس سے کمی بیشی کے ساتھ معاملہ صحیح نہ ہو گا۔ اسی طرح اگر دونوں جنسیں ناپ تول میں برابر ہوں مگر ایک جنس نقد ہو اور ایک جنس ادھار مثلاً" آج ایک من جو دیا جائے اور اس کے عوض ایک من جو یا ایک من گیہوں کچھ عرصہ کے بعد دینا قرار پائے تو یہ بیع بھی صحیح نہ ہو گی اس لئے کہ زیادتی خواہ مقدار میں ہو یا مدت کے اعتبار سے ہو وہ ربا میں شمار ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لاتبع الحنطته بالشعير الايدا بيد ولاتبع قيفزا من حنطه بقفزين من شعير۔ (وافی)

گیہوں کو جو کے عوض نہ بیچو مگر اس طرح کہ ایک ہاتھ سے دو اور ایک ہاتھ سے لو اور گیہوں کی ایک مقدار کو جو کی دوگنی مقدار کے عوض فروخت نہ کرو۔

حضرتؑ نے گیہوں اور جو کے تبادلہ کا ذکر فرمایا ہے اور گیہوں اور جو سودی معاملات میں ایک ہی جنس شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کافی میں ہے۔

كان امير المومنين عليه السلام يعد الشعير بالحنطته۔

امیرالمومنین علیہ السلام گیہوں اور جو کو ایک ہی جنس شمار کرتے تھے۔

اگر سونے کو سونے یا چاندی کے عوض یا چاندی کو چاندی یا سونے کے عوض فروخت کیا جائے تو یہ معاملہ اس صورت میں صحیح ہو گا جب بائع و مشتری ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے مال ایک دوسرے کے سپرد کر دیں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یبتاع رجل فضتہ بذھب الایدا بید ولا یبتاع ذھبا بفضتہ الایدا بید۔ (وافی)

کوئی چاندی کو سونے کے بدلے اور سونے کو چاندی کے عوض نہ خریدے مگر موقع ہی پر ایک ہاتھ سے دے اور ایک ہاتھ سے لے۔

اگر خریدار قیمت ادا کر دے اور مال کچھ عرصہ کے بعد دینا قرار پائے تو یہ بیع سلف ہے جو اس صورت میں صحیح ہے جب مال کی مقدار اور مال دینے کی مدت متعین ہو۔ اگر مدت کی تعیین نہ ہو مثلاً" یہ کہہ دیا جائے کہ جب فصل کٹے گی یا جب فصل اٹھائی جائے گی تو مال دیا جائے گا تو یہ مدت مبہم ہو گی اور معاملہ صحیح نہ ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا باس بالبیع السلف بکیل معلوم الی اجل معلوم ولا یسلم الی دیاس او حصاد۔ (وافی)

بیع سلف میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر مال کی مقدار اور مدت مقرر ہونا چاہئے فصل کے کٹنے یا بالیوں سے دانوں کے نکلنے پر نہ چھوڑا جائے۔

اگر بائع مقررہ وقت پر مال مہیا نہ کر سکے اور خریدار مزید توقف نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے اور اگر بائع بازار کے اتار چڑھاؤ کے پیش نظر اس رقم پر کچھ اضافہ کر کے دینا چاہے تو وہ اضافہ ربا میں شمار ہو گا۔ لہٰذا اس کا لینا جائز نہ ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

من اشتری طعاما او علفا الی اجل فان لم یجد شرطہ واخنور قالا محالہ قبل ان یاخذ شرط فلا یا خذ الا راس مالہ۔ (استبصار)

جو شخص مدت کی تعیین کے ساتھ غلہ یا چارہ خریدے اور وقت پر یہ چیزیں حسب معاہدہ مہیا نہ ہو سکیں اور مزید توقف نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ صرف اصل رقم کے واپس لینے کا مجاز ہو گا۔

اگر خریدار بائع کو پابند کرنے کے لئے کچھ رقم پیشگی دے تو یہ رقم قیمت میں وضع ہو گی اور معاملہ صحیح قرار پائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یحوز العربون الاان یکون ھنا من الثمن (تہذیب)

پیشگی دی ہوئی رقم اسی صورت میں جائز ہو گی جب وہ قیمت میں شامل کی جائے۔

باب الودیعہ

کسی کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھنا ودیعت کہلاتا ہے۔ جب امین اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لے تو اس پر اس کی حفاظت لازم اور مالک کے طلب کرنے پر فوراً واپس کرنا ضروری ہے خواہ امانت رکھوانے والا مسلمان ہو یا کافر۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا ایمان لمن لا دیانۃ لہ۔ (مستدرک الوسائل) جس میں امانتداری نہیں وہ ایمان سے عاری ہے۔

اگر حفاظت کے سروساماں کے باوجود وہ چیز ضائع ہو جائے تو امانت رکھنے والا اس کا ضامن نہ ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لیس علی المؤتمن ضمان۔ (مستدرک الوسائل) امانت رکھنے والا (کھو جانے کی صورت میں) ضامن نہیں ہے۔

ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام غسل کے لئے حمام میں گئے اور کپڑے حمام کے مالک کے پاس رکھ دیئے۔ جب نہا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ کپڑے غائب ہیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ کپڑے حمام والے کے پاس بطور امانت تھے لہٰذا وہ ضامن نہیں ہے۔

دو آدمیوں نے کسی کے پاس کچھ رقم امانت رکھوائی۔ ایک کا ایک دینار تھا اور دوسرے کے دو دینار۔ ان میں سے ایک دینار کھو گیا۔ یہ معاملہ حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ جس کے دو دینار تھے اسے ایک دینار دے دیا جائے اور دوسرا دینار دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کیا جائے۔

حضرتؑ نے یہ فیصلہ اس بنا پر کیا کہ یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ ایک دینار والے کا دینار ضائع ہوا ہے یا دو دینار والے کا۔ مگر ایک دینار بہرحال دو دینار والے کا تھا اس لئے ایک دینار اسے دے دیا گیا اور دوسرے دینار کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کس کا ہے۔ لہٰذا وہ دونوں میں آدھوں آدھ بانٹ دیا گیا کیونکہ تقاضائے عدل کو بروئے کار لانے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہ تھی۔

دو آدمیوں نے ایک قرشیہ عورت کے پاس سو دینار بطور امانت رکھے اور کہا کہ اگر ہم دونوں ایک ساتھ آئیں تو یہ امانت واپس کی جائے اور اگر ہم میں سے ایک آئے تو اسے یہ رقم نہ دی جائے۔ جب اس امانت پر ایک سال کا عرصہ گزرا تو ان میں سے ایک اس قرشیہ کے پاس آیا اور کہا کہ میرا ساتھی انتقال کر چکا ہے لہٰذا وہ امانت مجھے واپس دی جائے۔ اس قرشیہ نے کہا کہ یہ معاہدہ کے خلاف ہے اور رقم کے دینے سے انکار کیا۔ جب اس نے اصرار

کیا اور اس قرشیہ کے عزیز و اقارب سے بھی کہلوایا تو اس نے وہ دینار اس کے حوالے کر دیئے۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد دوسرا آدمی اس قرشیہ کے پاس آیا اور امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا اس نے کہا کہ تمہارا ساتھی یہ کہہ کر امانت واپس لے جا چکا ہے کہ تم مر چکے ہو۔ کہا کہ میں تمہارے سامنے زندہ و سلامت موجود ہوں وہ دینار میرے حوالے کرو جب یہ جھگڑا بڑھا تو تصفیہ کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ حضرت عمرؓ نے اس قرشیہ کے خلاف فیصلہ کیا اور اسے ادائے امانت کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس قرشیہ نے کہا کہ آپ اس کا فیصلہ حضرت علیؑ کے سپرد کریں وہ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ جب یہ معاملہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا تو آپ سمجھ گئے کہ ان دونوں نے دوبارہ رقم وصول کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا ہے۔ آپؑ نے اس شخص سے کہا کہ کیا تم نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ تم دونوں ایک ساتھ آؤ گے تو امانت کے واپس لینے کے حقدار ہو گے۔ کہا کہ ہاں یہ طے پایا تھا۔ فرمایا کہ پھر تم اپنے ساتھی کو لاؤ اور اپنی امانت واپس لے جاؤ۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اس کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گیا۔

باب الوصیتہ

وصیت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسی چیز کی سفارش کر جائے جس پر اپنے مرنے کے بعد عملدرآمد چاہے۔ اس وصیت کا تعلق کبھی کسی کام کی انجام دہی سے ہوتا ہے جیسے تجہیز و تکفین' ادائے صوم و صلواۃ وغیرہ اور کبھی مال سے تعلق ہوتا ہے۔ جیسے یہ کہ اس کے مرنے کے بعد فلاں شخص کو اتنا مال دیا جائے۔ اسلام نے امور خیر کے سلسلہ میں اگرچہ وصیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ مگر اس کے ساتھ وارثوں کے مالی حقوق کا تحفظ بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس طرح کہ ترکہ کی ایک تہائی سے زائد کی وصیت کو ناقابل عمل قرار دیا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

من اوصی بوصیتہ نفذت من ثلثہ۔ (متدرک الوسائل)

جو شخص وصیت کرے تو وہ اس کے ترکہ کے تہائی حصہ میں نافذ ہو گی۔

البتہ اگر وارث اجازت دے دیں تو ایک تہائی سے زائد میں بھی وصیت کا نفاذ ہو سکتا ہے اور در صورتیکہ مرنے والے کا کوئی وارث ہی نہ ہو تو وہ تمام مال کی وصیت کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اس شخص کے بارے میں جس کا دور و نزدیک کا کوئی رشتہ دار نہ تھا فرمایا۔

یوصی بما لہ حیث شاء من المسلمین فی المساکین وابن السبیل۔ (متدرک الوسائل)

وہ مسلمان کے ناداروں اور مسافروں کے لئے جہاں چاہے اپنے مال کے بارے میں وصیت کرے۔

اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو مخارج تجہیز و تکفین اور ادائے قرض کے بعد وصیت پر عمل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اول مایبداء من ترکتہ المیت بعد الکفن بالدین ثم الوصیتہ ثم المیراث۔ (متدرک الوسائل)

دفن و کفن کے اخراجات کے بعد میت کے ترکہ میں سے پہلے قرضہ ادا کیا جائے گا پھر وصیت پر عمل ہو گا اور پھر میراث کی نوبت آئے گی۔

اگر وصیت کرنے والا تہائی مال کی وصیت کرے اور پھر غلطی سے کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے تو اس کی دیت کے تہائی حصہ میں بھی وصیت نافذ ہو گی۔ چنانچہ ایک ایسے شخص کے بارے میں حضرتؑ نے فرمایا۔

ثلث دیتہ داخل فی وصیتہ۔ (متدرک الوسائل)

دیت کا تہائی حصہ بھی وصیت میں داخل ہو گا۔

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مرنے والا میرے لئے اتنے مال کی وصیت کر گیا ہے تو اس کا دعویٰ دو

مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں یا چار عورتوں کی گواہی سے ثابت ہو گا اور اگر تین عورتیں گواہی دیں تو تین چوتھائی میں، دو عورتیں گواہی دیں تو نصف میں اور ایک عورت گواہی دے تو ایک چوتھائی میں وصیت نافذ ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے وصیت کا ایک دعویٰ پیش ہوا اور وصیت کی گواہی ایک عورت نے دی۔ آپؑ نے ایک چوتھائی میں وصیت نافذ کی اور تین چوتھائی میں اسے کالعدم قرار دیا۔

اگر وصیت مبہم الفاظ میں ہو اس طرح کہ واضح طور پر مال کی مقدار معین کرنے کے بجائے یہ کہے کہ میرے مال میں سے ایک سہم (حصہ) یا ایک جزء یا ایک شے صدقہ کر دی جائے یا فلاں شخص کو دی جائے تو پہلی صورت میں مال کا آٹھواں حصہ حسب وصیت صرف کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مال کا ایک حصہ صدقہ کر دیا جائے مگر حصہ کی تعیین نہ کی اس کے وارثوں نے حضرتؑ کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ مال کا آٹھواں حصہ صدقہ میں دے دیا جائے اور اس آیت کی تلاوت کی۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمولفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل۔

صدقہ فقیروں محتاجوں اور اس کے کارندوں کے لئے ہے اور ان کے لئے جن کی دلجوئی مقصود ہے اور غلاموں کو چھڑانے قرضداروں کا قرضہ چکانے خدا کی راہ میں صرف کرنے اور پردیسیوں کے لئے۔

پھر فرمایا کہ اس آیت میں صدقات کے آٹھ حصے بیان کئے گئے ہیں لہٰذا مال کا ایک حصہ اس کا آٹھواں حصہ ہو گا۔

دوسری صورت میں ساتواں حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنے مال کے ایک جزء کی وصیت کی مگر اس جزء کی مقدار بیان نہ کی اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں میں جزء کے بارے میں اختلاف ہوا جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تو حضرتؑ سے استفسار کیا آپؑ نے فرمایا کہ اس کے مال کا ساتواں حصہ وصیت کے مطابق صرف کیا جائے اور یہ آیت پڑھی۔

لها سبعة ابواب لکل باب منهم جزء مقسوم۔

اس کے سات دروازے ہوں گے ان میں سے ہر گروہ کے حصے میں ایک دروازہ آئے گا۔

پھر فرمایا کہ اس آیت میں ساتویں حصے پر جزء کا اطلاق ہوا ہے۔

تیسری صورت میں چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنے مال میں سے شے کی وصیت کی ہے اس شے کا اطلاق کتنی مقدار پر ہو گا۔ آپؑ نے فرمایا۔

الشئی فی کتاب علی واحد من ستتہ۔ (الفقیہ) کتاب علی میں شے سے مراد چھٹا حصہ ہے۔

ایک شخص نے وصیت کی کہ میرے بعد میرے قدیم غلاموں کو آزاد کر دیا جائے مگر وارث یہ طے نہ کر سکے کہ کتنی مدت کے گزرنے پر وہ قدیم کہے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے حضرتؑ کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ ہر وہ غلام آزاد کر دیا جائے جو چھ مہینے تک اس کی ملکیت میں رہ چکا ہو اور اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

والقمر قدرنا منازل حتی عاد کالعرجون القدیم۔ ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند پلٹ آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قدیم کا اطلاق چھ ماہ کے گزرنے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ شاخ خرما کو قدیم کہا گیا ہے اور اس پر سے پھل اتار لینے کے بعد اس کے خشک ہونے اور پرانی صورت اختیار کرنے میں چھ ماہ لگتے ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے وصیت کی کہ اس کے غلاموں میں سے ایک تہائی غلام آزاد کر دئے جائیں۔ ان میں سے کسے آزاد کیا جائے اور کسے غلامی میں رہنے دیا جائے۔ فرمایا کہ۔

کان علی علیہ السلام یسھم بینھم۔ (ارشاد) حضرت علی اس صورت میں ان میں قرعہ ڈالتے تھے۔

ایک شخص نے اپنے ایک رفیق کو دس ہزار درہم دئے اور اسے وصیت کی کہ جب میرا بیٹا بالغ ہو جائے تو جو تم چاہو وہ اسے دے دینا۔ جب وہ بچہ بالغ ہوا تو اس نے حضرتؑ سے فیصلہ چاہا۔ آپؑ نے وصی کو بلا کر دریافت کیا کہ تم اسے کیا دینا چاہتے ہو۔ کہا ایک ہزار درہم۔ فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم نو ہزار چاہتے ہو اور اس کے باپ کی وصیت یہ تھی کہ جو تم چاہو وہ اسے دینا۔ لہذا نو ہزار درہم اسے دو اور ایک ہزار درہم تم لو۔

باب المیراث

قبل اسلام عرب میں میراث کا حقدار صرف بڑے لڑکے کو سمجھا جاتا تھا اور دوسری اولاد محروم رہتی تھی اور جس دولت کو مختلف ہاتھوں میں بٹنا چاہیئے تھا وہ ایک ہاتھ سے نکل کر پھر ایک ہاتھ میں جمع ہو جاتی تھی۔ جس سے سرمایہ داری کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور معاشرتی برائیاں فروغ پاتی تھیں اور بیویوں کو میراث دئے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خود ان کا شمار متروکہ اموال میں ہوتا تھا۔ جن پر مرنے والے کے ورثاء قابض و متصرف ہو جاتے تھے۔ بعض دوسرے مذاہب میں بھی صرف اولاد نرینہ وارث ہوتی ہے اور لڑکیوں کو ورثہ نہیں دیا جاتا۔ مگر اسلام کا طریق کار ان مذاہب کے طریق کار سے مختلف ہے اور گردش زر کے اصول پر مبنی ہے۔ تاکہ ایک متوازن و معتدل معاشی نظام تشکیل پا سکے۔ اس نے کسی کو حق میراث سے محروم نہیں کیا۔ عورت کو باپ کا ترکہ بھی دلوایا ہے اور شوہر کا بھی اور اولاد چھوٹی ہو یا بڑی، لڑکی ہو یا لڑکا سب کا حصہ رکھا ہے اور کسی کو نظرانداز نہیں کیا۔ کیونکہ تمام اولاد تعلق و قرابت کے اعتبار سے برابر ہوتی ہے اور قرابت ہی سے میراث کا استحقاق پیدا ہوتا ہے قرابت کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی قریب ہوتا ہے اور کوئی قریب تر۔ اسی تفاوت اور قرابت کے درجات کے اعتبار سے وارثوں کے طبقے مقرر کئے ہیں اور میراث کے ضوابط ترتیب دیئے ہیں۔ البتہ چند امور ارث سے محرومی کا باعث ہوتے ہیں۔ ان امور کو موانع ارث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پہلا مانع کفر ہے۔ اگر وارث غیر مسلم ہو تو وہ مسلمان کا ورثہ نہیں پائے گا۔ البتہ مسلمان غیر مسلم کا وارث ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المسلم یرث الذمی والذمی لایرث المسلم۔ (مستدرک الوسائل)

مسلمان کافر کا وارث ہو گا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو گا۔

دوسرا مانع غلامی ہے۔ اگر وارث غلام ہو تو وہ ورثہ سے محروم رہے گا اور درصورتیکہ غلام کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو تو مورث کے مال سے خرید کر اسے آزاد کر دیا جائے گا اور پھر بقیہ مال اسے ورثتہ" دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ سے ایک شخص کے بارے میں جس کا وارث فقط ایک غلام تھا دریافت کیا گیا۔ آپؑ نے فرمایا۔

یشتری من ترکتہ فیعتق ویعطی باقی الترکتہ۔ (مستدرک الوسائل)

مرنے والے کے ترکہ میں سے اسے خرید کر آزاد کر دیا جائے اور باقی ترکہ اسے دے دیا جائے۔

اگر میراث کے تقسیم ہونے سے پہلے کافر مسلمان ہو جائے یا غلام آزاد کر دیا جائے تو انہیں میراث دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے ان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لہا حظہما منہ وان کان ذلک بعد موت المیت سالم یقسم المیراث فاذا قسم فلاحظ لہما فیہ۔ (مستدرک الوسائل)

وہ دونوں ترکہ میں سے حصہ پائیں گے اگرچہ ان کا اسلام اور آزادی مورث کے مرنے کے بعد ہو بشرطیکہ میراث تقسیم نہ ہوئی ہو اور اگر تقسیم ہو چکی ہو تو پھر ان کا حصہ نہیں ہو گا۔

تیسرا مانع قتل ہے۔ اگر وارث اپنے مورث کو عمداً قتل کر دے تو وہ ورثہ سے محروم قرار پائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

القاتل لا یرث ممن قتلہ۔ (مستدرک الوسائل)

قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو گا۔

اگر قتل غلطی سے واقع ہوا ہو تو اس صورت میں ورثہ سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ حضرتؑ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

ان کان خطاء فان لہ میراثہا وان کان قتلہا متعمدا" فلا یرثہا۔ (استبصار)

اگر ماں کو غلطی سے قتل کر دیا ہے تو اس کا وارث ہو گا اور اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہے تو وارث نہیں ہو گا۔

قرابت و عزیز داری کی بنا پر ورثہ پانے والوں کے تین طبقے ہیں۔

پہلے طبقہ میں ماں' باپ اور بیٹا' بیٹی ہیں اور اگر بیٹا' بیٹی نہ ہو تو ان کی اولاد' ان کے قائم مقام ہو گی۔ ان میں سے کسی ایک فرد کے ہوتے ہوئے کوئی اور ترکہ کا حقدار نہ ہو گا۔ البتہ بیوی شوہر کے ترکہ میں سے اور شوہر بیوی کے ترکہ میں سے مقررہ حصہ لے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یرث مع الولد الا الابوان والزوج والمراۃ۔ (وافی)

اولاد کے ساتھ ماں باپ بیوی اور شوہر کے علاوہ اور کوئی ورثہ نہ پائے گا۔

اگر مرنے والے کا صرف ایک لڑکا ہو تو تمام مال اسے ملے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان لم یترک غیر ولد واحد فالمیراث کلہ لہ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر مرنے والا ایک لڑکے کے علاوہ کوئی وارث نہ چھوڑے تو وہ لڑکا تمام مال کا وارث ہو گا۔

اگر مرنے والے کی اکیلی لڑکی ہو تو اسے آدھا ترکہ مقررہ حصہ کی بنا پر اور آدھا حصہ قرابت کی بنا پر دیا جائے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان ترک بنتا واحدہ فللہ بنتہ النصف بالمیراث المسمی ویرد علیھا النصف الثانی بالرحم۔ (مستدرک الوسائل)

اگر مرنے والا ایک لڑکی چھوڑ جائے تو اسے نصف مقررہ حصہ کی بنا پر اور بقیہ نصف قرابت کی بنا پر ملے گا۔

اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکہ میں سے دو تہائی مقررہ حصہ کی بنا پر اور بقیہ ایک تہائی قرابت کی بنا پر دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان ترک ابنتین فلکل واحدہ منھما الثلث بالمیراث کما قال اللہ عزو جل ویرد علیھما الثلث الباقی بالرحم۔ (مستدرک الوسائل)

اگر دو بیٹیاں چھوڑ جائے تو ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک تہائی مقررہ حصہ کی بنا پر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے دی جائے گی اور بقیہ ایک تہائی قرابت کی بنا پر۔

اہلسنّت کے نزدیک ایک لڑکی کو اس کا مقررہ حصہ نصف اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیوں کو ان کا مقررہ حصہ دو تہائی دینے کے بعد بقیہ پدری رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس کا نام **تعصیب** ہے جو مذہب شیعہ میں باطل ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اذا کان وارث ممن لہ فریضتہ فھو احق بالمال۔ (وافی)

اگر کسی وارث کا حصہ مقرر ہو تو فریضہ سے زائد کا بھی وہی حقدار ہو گا۔

اگر کسی کے اولاد نہ ہو اور وارث صرف ماں باپ ہوں تو ترکہ کو تین حصوں پر تقسیم کر کے دو تہائی باپ کو اور ایک تہائی ماں کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ قال فی الرجل اذا ترک ابویہ فلامہ الثلث و للاب الثلثان۔ (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص ماں باپ چھوڑ جائے تو ماں کا حصہ ایک تہائی اور باپ کا حصہ دو تہائی ہو گا۔

اگر ماں باپ کے ساتھ مرنے والے کے دو بھائی یا چار بہنیں یا ایک بھائی اور دو بہنیں حقیقی یا پدری ہوں تو اگرچہ ماں باپ کی موجودگی کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں ملے گا مگر ان کا وجود ماں کے لئے تہائی ترکہ سے مانع ہو گا۔ اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ اور باپ کو بقیہ پانچ حصے دیئے جائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایحجب الام عن الثلث الا الولد والاخوہ۔ (وافی)

مرنے والے کی اولاد اور بھائی ماں کے لئے ایک تہائی سے مانع ہوتے ہیں۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور ماں باپ چھوڑے تو ترکہ کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو ایک حصہ ماں کو اور ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی خمسته اسهم فما اصاب ثلثته فللابنته وما اصاب سهین فللابوین۔ (وسائل الشیعہ)

مال کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو ایک حصہ باپ کو اور ایک حصہ ماں کو ملے گا۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور باپ چھوڑے تو ترکہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی اربعته اسهم فما اصاب ثلثته فللابنته وما اصاب سهما فللاب۔ (وسائل الشیعہ)

مال کو چار حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ باپ کو ملے گا۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور ماں چھوڑے تو ترکہ کو چار حصوں پر تقسیم کر کے تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ ماں کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی اربعته اسهم فما اصاب ثلثه اسهم فللابنته وما اصاب سهما فللام۔ (وسائل الشیعہ)

ترکہ کو چار حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ ماں کو ملے گا۔

اگر کوئی عورت، شوہر ماں اور باپ چھوڑے تو اس کے ترکہ کو چھ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے شوہر کو اور دو حصے ماں کو ملیں گے اور باقی ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

امرأۃ ماتت و ترکت زوجها وابویها فللزوج النصف ثلثته اسهم وللام الثلث تاما سهمان وللاب السدس سهم۔ (وافی)

جو عورت مر جائے اور اپنے پیچھے شوہر اور ماں باپ چھوڑ جائے تو اس کے ترکہ میں سے شوہر کو چھ حصوں میں سے آدھا، ماں کو تہائی اور باپ کو چھٹا حصہ ملے گا۔

اگر وارثوں میں ماں باپ اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں اور شوہر یا بیوی ہو تو شوہر کو اس کا چوتھائی حصہ یا بیوی کو اس کا آٹھواں حصہ اور ماں اور باپ ہر ایک کو چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی لڑکیوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ عبیدہ سلمانی کہتے ہیں کہ۔

انہ اعطی الزوج الربع مع الابنتین وللابوین السد سین والباقی رد علی البنتین۔ (وسائل الشیعہ)

حضرت نے دو لڑکیوں کی موجودگی میں شوہر کو چوتھائی حصہ اور ماں اور باپ کو چھٹا چھٹا حصہ دیا اور باقی دونوں لڑکیوں کو دے دیا۔

ان حصص کی تقسیم کا طریقہ یہ ہو گا کہ ترکہ کو چوبیس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ چھ حصے شوہر کو' چار حصے باپ کو' چار حصے ماں کو اور دس حصے دونوں لڑکیوں کو دیئے جائیں گے۔ جو ان میں مساوی تقسیم ہوں گے اور اگر شوہر کے بجائے بیوی ہو تو چوبیس حصوں میں سے تین حصے بیوی کو' چار حصے باپ کو' چار حصے ماں کو اور باقی تیرہ حصے دونوں لڑکیوں میں برابر تقسیم ہوں گے۔

مقررہ حصص کے اعتبار سے ماں باپ کا حصہ ایک تہائی اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیوں کا حصہ دو تہائی ہوتا ہے۔ مگر انہیں ان کا مقررہ حصہ دے دینے کے بعد بیوی یا شوہر کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لڑکیوں کے حصہ میں سے شوہر یا بیوی کے حصہ کے بقدر کمی کر کے شوہر یا بیوی کا حصہ نکالا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی صورت میں شوہر کی شمولیت کی وجہ سے لڑکیوں کے حصہ میں سے چھ حصوں کی اور دوسری صورت میں بیوی کی شمولیت کی وجہ سے تین حصوں کی کمی کر دی گئی ہے۔ یہ کمی ماں' باپ اور شوہر یا بیوی کے حصہ میں نہیں ہو گی۔ اہلسنت کے نزدیک اس کمی کو پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اصل فریضہ کو بڑھا کر تمام ورثاء کے حصوں میں کمی کر دی جاتی ہے۔ تاکہ بیوی یا شوہر کا حصہ نکل سکے مثلاً" جب ماں باپ اور دو لڑکیوں کے ساتھ بیوی ہو تو اصل ترکہ کو چوبیس پر تقسیم کرنے کے بجائے اس پر تین کا اضافہ کر کے ستائیس حصے قرار دے لئے جاتے ہیں۔ جن میں سے آٹھ ماں' باپ کو سولہ دونوں لڑکیوں کو اور تین حصے بیوی کو دے کر تقسیم حصص کی تکمیل کر لی جاتی ہے۔ مگر اصل فریضہ پر تین بڑھا دینے کے نتیجہ میں ہر ایک کے حصہ میں کمی واقع ہو گی یہ کمی جو تمام وارثوں کے حصہ میں ہوتی ہے "عول" کہلاتی ہے اور عول مذہب امامیہ میں باطل ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان السہام لاتعول۔ (وافی)

تمام ورثاء کے حصے میں کمی نہیں کی جاتی۔

اگر میت کے ورثاء میں ماں کے ساتھ حقیقی یا پدری یا مادری بھائی ہوں تو تمام ترکہ ماں کو ملے گا اور بھائیوں کو طبقہ مابعد میں ہونے کی بنا پر کچھ نہیں ملے گا۔ چنانچہ حماد ابن عثمان کہتے ہیں کہ میں نے امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک شخص ماں اور بھائی چھوڑ گیا۔ ان کے حصص کی تقسیم کیسے ہو گی۔ آپ نے فرمایا کہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ترکہ اسے دیتے تھے جو میت سے زیادہ نزدیک ہوتا تھا۔ حماد نے کہا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔ فرمایا۔

قد اخبرتک ان علیا کان یعطی المال الاقرب فالاقرب۔ (وسائل الشیعہ)

میں تمہیں بتا چکا کہ علی ابن ابی طالب ترکہ قریب تر کو دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ یہاں پر درج کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے ماں کے ساتھ پہلے مادری بھائیوں کو اور پھر حقیقی بھائیوں کو شریک قرار دے لیا۔ چنانچہ **ابن شیبہ** اور بیہقی نے اپنے سنن میں تحریر کیا ہے کہ کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ایک عورت نے شوہر' ماں' دو مادری اور دو حقیقی بھائی چھوڑے ہیں' آپ ان کے حصص کی تعیین کر کے مال تقسیم کر دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آدھا حصہ شوہر کو' چھٹا حصہ ماں کو اور باقی ایک تہائی دونوں مادری بھائیوں کو دے دیا جائے۔ میت کے حقیقی بھائیوں نے یہ سنا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ آپ نے دونوں مادری بھائیوں کو چھٹا چھٹا حصہ دلوایا ہے اور ہمیں محروم کر دیا ہے حالانکہ جس قرابت کی بنا پر انہیں ترکہ دلوایا ہے اس قرابت میں ہم بھی شریک ہیں۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کی بات وزن رکھتی ہے کہا کہ اچھا نصف شوہر کو چھٹا حصہ ماں کو اور باقی حقیقی اور مادری بھائیوں میں مساوی تقسیم کر دیا جائے۔ ایک شخص نے یہ تضاد و اختلاف دیکھا تو کہا کہ آپ نے پہلے تو حقیقی بھائیوں کو محروم الارث قرار دیا اور پھر انہیں ورثاء میں شریک کر لیا یہ کیوں؟ کہا کہ پہلا حکم پہلے دن کے لئے تھا اور دوسرا حکم دوسرے دن کے لئے ہے۔ اس موقع پر یہ نہیں کہتے کہ پہلا حکم اشتباہ کی بنا پر تھا اور دوسرا حکم صحیح ہے بلکہ ایک طرح سے دونوں فیصلوں کو صحیح قرار دیتے ہیں اور پہلے حکم کی تردید ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی بنا پر مشہور فقہا' ابو حنیفہ' احمد' زفر اور ابن ابی لیلی نے حضرت عمرؓ کے پہلے قول کو اختیار کیا اور مالک اور شافعی نے دوسرے قول کو قبول کیا اور اس طرح تضاد بیانی نے فقہی اختلاف کی بنیاد رکھ دی۔ حالانکہ حضرت عمرؓ اگر آیہ قرآنی **واولو الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ** "جو لوگ آپس میں قرابت رکھتے ہیں وہ کتاب اللہ کی رو سے ایک دوسرے کے ترکہ کے زیادہ حقدار ہیں" پر نظر کرتے تو نہ مادری بھائیوں کو ترکہ دلواتے اور نہ حقیقی بھائیوں کو اس لئے کہ ماں طبقہ اولیٰ میں ہے اور اس کی موجودگی میں بھائیوں کو وہ مادری ہوں یا حقیقی ترکہ میں سے کچھ نہیں ملتا۔ البتہ بیوی اور شوہر ہر طبقہ کے ساتھ اپنے مقررہ حصے کے وارث ہوتے ہیں۔ لہٰذا نصف ترکہ شوہر کو ملے گا اور نصف ماں کو۔

دوسرا طبقہ دادا' دادی' نانا' نانی اور بھائی بہن کا ہے۔ اگر دادا' دادی نہ ہوں تو پڑدادا' پڑدادی اور بھائی بہن نہ ہوں تو بھتیجے بھانجے وارث ہوں گے۔ یونہی اس سلسلہ بالا و پائین میں جو مرنے والے سے زیادہ نزدیک ہو گا وہ ورثہ پائے گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان کل ذی رحم بمنزلہ الرحم الذی یجربہ الا ان یکون وارث اقرب الی المیت فیحجبہ۔ (وافی)

ہر قرابتدار اس فرد کی جگہ لیتا ہے جس کے واسطہ سے اسے قرابت حاصل ہوئی ہو مگر یہ کہ کوئی وارث میت سے قریب تر ہو اس صورت میں اقرب اس

کے وارث ہونے میں حائل ہو گا۔

اگر مرنے والے کے سگے بھائی' بہن بھی ہوں اور پدری بھائی' بہن بھی تو صرف سگے بھائی' بہن وارث ہوں گے اور پدری بھائی بہن کچھ نہیں پائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اعیان بنی الام یرثون دون بنی العلات (وسائل الشیعہ)
سگے بھائی وارث ہوں گے اور سوتیلی ماں کی اولاد وارث نہ ہو گی۔

اگر بھائی کے ساتھ دادا بھی ہو تو دونوں نصف نصف کے وارث ہوں گے اور اگر دادا کے ساتھ متعدد بھائی ہوں تو سب کا حصہ مساوی ہو گا۔ چنانچہ ابن عباس کہتے ہیں۔

کتب الی علی ابن ابی طالب فی ستۃ اخوۃ وجد ان اجعلہ کاحدھم۔ (وسائل الشیعہ)
علی ابن ابی طالب نے چھ بھائیوں اور دادا کی میراث کے بارے میں مجھے تحریر فرمایا کہ میں دادا کو وہی حصہ دوں جو ہر بھائی کا ہے۔

اگر سگے بھائی نہ ہوں تو پدری بھائی' دادا کے ساتھ برابر کے وارث ہوں گے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کان علی یورث الاخ من الاب مع الجد۔ (وافی)
حضرت علی دادا کے ساتھ پدری بھائی کو وارث قرار دیتے تھے۔

اگر میت کے بھائی' بہن نہ ہوں تو ان کی اولاد وہ حصہ لے گی جو ان کے ماں' باپ کا تھا۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان علیا علیہ السلام کان یورث ابن الاخ مع الجد میراث ابیہ۔ (وافی)
علی علیہ السلام دادا کے ساتھ بھتیجے کو اس کے باپ کا حصہ دلواتے۔

اگر دادا کے ساتھ ایک مادری بھائی یا بہن ہو تو اسے چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی دادا کو اور اگر متعدد ہوں تو انہیں ایک تہائی دیا جائے گا اور دو تہائی دادا کو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان الاخوۃ من الام یرثون مع لجد الثلث۔ (وسائل الشیعہ)
دادا کے ساتھ مادری بھائیوں کو ایک تہائی ترکہ دیا جائے گا۔

تیسرے طبقہ میں چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ ہیں۔ اگر پہلے اور دوسرے طبقہ کے وارث نہ ہوں تو انہیں

میراث ملے گی۔

اگر مرنے والے کے وارث صرف چچا اور ماموں ہوں تو دو تہائی ترکہ چچا اور ایک تہائی ماموں کو ملے گا۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص مرگیا اور اس نے چچا اور ماموں چھوڑے اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہو گا۔ فرمایا۔

العم الثلثان وللخال الثلث۔ (مستدرک الوسائل) دو تہائی چچا کو اور ایک تہائی ماموں کو دی جائے گی۔

اگر مرنے والے کے وارث پھوپھی اور خالہ ہوں تو دو تہائی پھوپھی اور ایک تہائی خالہ کو دی جائے گی حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

للعمته الثلثان وللخالته الثلث۔ (مستدرک الوسائل) دو تہائی پھوپھی اور ایک تہائی خالہ پائے گی۔

اگر مرنے والے کے چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ نہ ہوں تو ان کا حصہ ان کی اولاد کو ملے گا البتہ اگر کسی کا باپ کی طرف سے چچا ہو اور ایسے چچا کی اولاد بھی ہو جو ماں باپ دونوں کی طرف سے چچا ہوتا ہے تو اس صورت میں ترکہ صرف سگے چچا کی اولاد کو ملے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اعیان بنی الام اقرب من بنی العلات۔ (وسائل الشیعہ) پدری و مادری رشتہ دار پدری رشتہ داروں سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

شوہر اور بیوی ہر طبقہ میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ اگر شوہر کے اولاد ہو تو اس کے ترکہ میں سے بیوی کو آٹھواں حصہ اور اولاد نہ ہو تو چوتھائی حصہ دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایزاد الزوج علی النصف و نما ینقص من الربع ولا تزا والمراۃ علی الربع ولا تنقص من الثمن۔ (وسائل الشیعہ) شوہر کا حصہ نصف ترکہ سے زائد نہیں ہوتا اور ایک چوتھائی سے کم نہیں ہوتا اور عورت کا حصہ ایک چوتھائی سے زائد اور آٹھویں حصہ سے کم نہیں ہوتا۔

اگر بیویاں متعدد ہوں تو چوتھے یا آٹھویں حصہ کو ان پر مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان کن اربعا او دون ذلک فھن فیہ سواء۔ (وسائل الشیعہ) اگر بیویاں چار یا اس سے کم ہوں ان کے مقررہ حصہ میں سب کا حصہ مساوی ہو گا۔

اگر بیوی کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو تو بیوی صرف اپنا مقررہ حصہ لے گی اور باقی تین چوتھائی حق امام علیہ

السلام ہے اور اگر وارث صرف شوہر ہو تو وہ تمام ترکہ لے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الزوج یحوز المال کلہ اذا لم یکن غیرہ۔ (وافی)

اگر شوہر کے علاوہ کوئی اور وارث نہ ہو تو وہ تمام مال لے گا۔

اگر شوہر نے بیوی سے مجامعت نہ کی ہو جب بھی شوہر بیوی کا اور بیوی شوہر کی وارث ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص مرگیا اور غیر مدخولہ بیوی چھوڑ گیا۔ کیا وہ عدہ رکھے گی؟ فرمایا۔

نعم علیھا العدہ ولھا المیراث کاملہ۔ (مستدرک الوسائل)

ہاں وہ عدہ بھی رکھے گی اور پوری میراث بھی پائے گی۔

اگر طلاق رجعی واقع ہونے کے بعد شوہر یا بیوی مدت عدہ کے اندر مر جائے تو دونوں میں جو زندہ ہو وہ دوسرے کا وارث ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ھی ترث و تورث ماکانت فی الد م فی التطلیقتین الاولتین۔ (مستدرک الوسائل)

جب تک عورت پہلی یا دوسری طلاق کے عدہ کے اندر ہو شوہر کی وارث ہو گی اور شوہر بھی اس کا وارث ہو گا۔

ایک مرتبہ ایک عورت اپنی سوت کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے پاس آئی اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی تھی اور طلاق کے تھوڑے عرصے بعد انتقال کر گیا۔ میری مدت عدہ ابھی ختم نہیں ہوئی لہٰذا اس کے ترکہ میں سے مجھے حصہ ملنا چاہئے۔ حضرت عثمانؓ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے کہا کہ اس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا جائے۔ جب حضرتؑ کی طرف رجوع کیا گیا تو آپؑ نے اس عورت کا دعویٰ سننے کے بعد فرمایا کہ اس سے قسم لی جائے کہ اس نے طلاق کے بعد تین حیض نہیں دیکھے۔ اگر یہ قسم کھائے تو اسے ترکہ میں سے اس کا حصہ دیا جائے۔ اس عورت نے قسم کھانے سے انکار کیا اور میراث سے دستبردار ہو گئی۔

بیوی کو باغ، کھیت، مکان وغیرہ کی زمین سے کچھ نہیں ملے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان النساء لیس لھن من عقار الرجل اذا توفی عنھن شئی۔ (وسائل الشیعہ)

شوہر اگر بیوہ چھوڑ کر مر جائے تو اسے شوہر کی زمین سے ترکہ نہیں ملے گا۔

اگر وارثوں میں کوئی ہیجڑا ہو اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ مردوں میں شامل ہے یا عورتوں میں تو اگر وہ مردانہ عضو سے پیشاب کرتا ہو تو اسے مرد قرار دے کر مردوں والا حصہ دیا جائے گا اور زنانہ عضو سے پیشاب کرتا ہو تو اسے عورتوں والا حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کان امیرالمومنین علیہ السلام یورث الخنثی من حیث یبول۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام ہیجڑے کو جس عضو سے پیشاب کرتا تھا اس کے اعتبار سے میراث دیتے تھے۔

ایک مرتبہ چند شامی حضرتؑ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم ایک الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپؑ سے اس کا حل چاہتے ہیں۔ فرمایا وہ الجھن کیا ہے۔ کہا کہ ہمارا باپ مال کثیر چھوڑ کر مرگیا ہے اور ہم چند بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک کے اندر عورت و مرد دونوں کی علامتیں موجود ہیں۔ ہم نے اسے دوسرے بھائیوں سے آدھا حصہ دینا چاہا مگر وہ مصر ہے کہ اسے دوسرے بھائیوں کے مساوی حصہ دیا جائے۔ فرمایا کہ تم نے اس کا حل معاویہ سے بھی دریافت کیا ہے۔ کہا کہ ہم ان کے پاس گئے تھے مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اور ہمیں مشورہ دیا کہ ہم آپؑ کی طرف رجوع کریں اور یہ ظاہر نہ کریں کہ ہم ان کے ایما سے آپؑ کے ہاں آئے ہیں۔ حضرتؑ نے یہ سنا تو فرمایا۔

لعن اللہ قوما یرضون بقضاء نا و یطعنون علینا فی دیننا۔ (مستدرک الوسائل)

ان لوگوں پر اللہ کی پھٹکار ہو جو ہمارے فیصلوں پر تو راضی ہو جاتے ہیں اور دین کے سلسلہ میں ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔

تم ایسا کرو کہ اپنے بھائی سے کہو کہ وہ پیشاب کرے اگر پیشاب مردانہ عضو سے نکلے تو اسے مرد قرار دے کر پورا حصہ دو اور اگر زنانہ عضو سے پیشاب کرے تو اسے آدھا حصہ دو۔ جب ایسا کیا گیا تو اس نے مردانہ عضو سے پیشاب کیا۔ جس پر حضرتؑ نے اسے دوسرے بھائیوں کے برابر میراث کا حقدار قرار دیا۔

اگر مردانہ و زنانہ دونوں جگہوں سے پیشاب نکلتا ہو تو پھر جس عضو سے پہلے پیشاب نکلتا ہو اس کے مطابق اسے میراث دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا بال منھما جمیعا ورث بایھما سبق۔ (مستدرک الوسائل)

اگر دونوں جگہوں سے پیشاب کرے تو اس عضو کا اعتبار کیا جائے گا جس سے پہلے پیشاب نکلے۔

اگر ان علامات سے تشخیص نہ ہو سکے اور یہ طے نہ کیا جا سکے کہ وہ مردوں کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے یا عورتوں کے۔ تو ایک دفعہ اسے مرد فرض کر کے اور ایک دفعہ عورت فرض کر کے حصہ نکالا جائے اور پھر ان دونوں حصوں کا نصف اسے دیا جائے مثلاً" کسی کا وارث ایک لڑکا ہو اور ایک ہیجڑا تو اس ہیجڑے کو لڑکا ہونے کی صورت میں بارہ حصوں میں سے چھ حصے ملتے اور لڑکی ہونے کی صورت میں چار حصے ملتے۔ لہٰذا پہلے اسے چھ حصوں کا نصف یعنی تین حصے دیئے جائیں گے اور پھر چار حصوں کا نصف یعنی دو حصے اسے دیئے جائیں گے اس طرح لڑکے کو سات حصے اور ہیجڑے کو پانچ حصے ملیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فان خرجا جمیعا ورث نصف میراث الرجل و نصف میراث المراہ (مستدرک الوسائل)

اگر دونوں جگہوں سے ایک ساتھ پیشاب نکلتا ہو تو اسے آدھا حصہ مرد کی میراث کا اور آدھا حصہ عورت کی میراث کا دیا جائے گا۔

اگر ہیجڑا پیدا ہونے کے بعد مرجائے اور پیشاب کرنے کی نوبت ہی نہ آئے تو اس صورت میں عورت و مرد دنوں کے حصہ کا نصف نصف اس کی طرف منتقل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فان لم یبل من واحد منھما حتی یموت فنصف میراث المراہ و نصف میراث الرجل۔ (وسائل الشیعہ)

اگر کسی ایک جگہ سے بھی پیشاب نہ کرے یہاں تک کہ مرجائے تو آدھی میراث عورت کے اعتبار سے اور آدھی میراث مرد کے اعتبار سے اس کی طرف منتقل کی جائے گی۔

اگر کسی مولود کے دو سر اور ایک دھڑ ہو تو اگر دونوں سر ایک ساتھ بیدار ہوں تو ایک کی ورنہ دو کی میراث پائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کے دور خلافت میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کے دو سر تھے۔ آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ وہ میراث کے سلسلہ میں ایک تصور ہو گا یا دو۔ فرمایا کہ جب وہ سوئے تو شور مچا کر اسے بیدار کرو اگر ان میں سے ایک سوتا رہے اور ایک جاگ اٹھے تو دو کی میراث پائے گا اور اگر دونوں سر بیک وقت بیدار ہوں تو ایک کی میراث پائے گا۔

اگر دو یا چند افراد جن میں باہمی توارث ہو ڈوب کر یا کسی دیوار کے نیچے دب کر مرجائیں اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلے کون مرا ہے تو انہیں آپس میں ایک دوسرے کا وارث قرار دے کر ان کا مقررہ حصہ ان کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ جو مرنے والوں کے زندہ وارثوں میں تقسیم ہو گا۔ چنانچہ ایک مرد اور اس کی بیوی گھر کی چھت بیٹھنے سے ہلاک ہو گئے۔ حضرتؑ سے ان کی میراث کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ تو آپؑ نے فرمایا۔

یرث کل واحد منھما زوجہ۔ (وسائل الشیعہ)

دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

یہ باہمی توارث صرف اس مال میں ہو گا جو مرنے سے پہلے ان کی ملکیت میں تھا اور وہ مال جواب ان کی طرف منتقل ہوا ہے اس میں توارث نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایک ہی گھر کے چند افراد دریا میں غرق ہو گئے۔ حضرتؑ سے ان کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپؑ نے فرمایا۔

یورث ھولاء من ھولاء و ھولاء من ھولاء ولا یرث ھولاء مما ورثوا من ھولاء شیاء ولا یورث ھولاء مما ورثوا من ھولاء شیاء۔ (وسائل الشیعہ)

ان میں ہر ایک دوسرے کا وارث ہو گا لیکن جو مال اب ان کی طرف منتقل ہوا ہے اس میں ایک دوسرے کا وارث نہیں ہو گا۔

اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلے کون مرا ہے لیکن آثار و قرائن سے یہ ظاہر ہو کہ ان میں سے فلاں پہلے مرا ہو گا اور فلاں بعد میں تو بعد میں مرنے والے کو وارث قرار دیا جائے گا چنانچہ ایک عورت اور ایک مرد طاعون میں مبتلا ہو کر ایک بستر پر مردہ پائے گئے۔ اس صورت میں کہ مرد کے ہاتھ پیر عورت کے اوپر تھے۔ حضرتؑ نے اس عورت کی میراث مرد کو منتقل کی اور فرمایا۔

انہ مات بعدھا۔ (وسائل الشیعہ)

مرد عورت کے بعد مرا ہے۔

یہ بظاہر اس لئے کہ مرد کے ہاتھ پیر کا عورت کے اوپر ہونا اس امر کا قرینہ تھا کہ وہ بعد میں مرا ہے۔ حضرتؑ نے ایک مورد پر قرعہ سے بھی کام لے کر وارث کی تعیین کی ہے۔ چنانچہ یمن میں ایک مکان کی چھت بیٹھ گئی اور گھر کے تمام افراد اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے۔ مگر دو بچے زندہ بچ رہے ان میں ایک آزاد تھا اور ایک غلام۔ مگر آزاد اور غلام کی تمیز نہ ہو سکی۔ حضرت کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا۔ آپؑ نے قرعہ ڈالا اور ایک کو آزاد قرار دے کر وارث ٹھہرایا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔

باب الیمین

یمین کے معنی قسم و سوگند کے ہیں۔ قسم کبھی کسی امر کے وقوع کی یقین دہانی کے لئے اور کبھی کسی فعل یا ترک کی پابندی اپنے اوپر عائد کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے۔ وہ قسم جو کسی واقعہ کی یقین دہانی کے لئے ہو اگر خلاف واقع ہو تو قسم کھانے والا گنہگار ہو گا۔ اس لئے کہ سچی قسم کھانا مکروہ اور جھوٹی قسم کھانا حرام ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان الیمین الکاذبۃ وقطیعۃ الرحم تذران الدیار بلاقع من اھلھا۔ (مستدرک الوسائل)

جھوٹی قسم اور قطع رحمی گھروں کو ان کے رہنے والوں سے خالی و ویران کر دیتی ہے۔

اور وہ قسم جس کے ذریعہ انسان مستقبل میں اپنے کو پابند کرتا ہے۔ اگر اس کی پابندی نہ کرے تو اس پر کفارہ عائد ہو گا۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے اور یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے۔ یہ قسم "**یمین العقد**" کہلاتی ہے اور صرف اللہ اور اس کے مخصوص اسماء ہی سے منعقد ہوتی ہے۔ اگر اللہ کے اسماء کے علاوہ کسی اور نام کی قسم کھائی جائے یا صرف کہا جائے کہ میں قسم کھاتا ہوں یا حلف اٹھاتا ہوں تو قسم منعقد نہ ہو گی۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اذا قال الرجل اقسمت او حلفت فلیس بشئی حتی یقول اقسمت باللہ او حلفت باللہ۔ (وافی)

جب کوئی شخص یہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں یا حلف اٹھاتا ہوں تو یہ قسم نہ ہو گی قسم اس وقت ہو گی جب یہ کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں یا اللہ کے نام پر حلف اٹھاتا ہوں۔

قسم کے انعقاد کے لئے ضروری ہے کہ قسم کے الفاظ زبان پر جاری کئے جائیں۔ لیکن قسم کھانے والا گونگا ہو تو اشارہ سے قسم کھائی جا سکتی ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام دعاوی و خصومات میں گونگے سے اس طرح قسم لیتے تھے کہ کاغذ کے پرزہ پر قسم کے الفاظ تحریر کرتے اور اسے پانی میں گھول دیتے اور اسے پینے کے لئے کہتے اگر وہ پی لیتا تو اسے قسم قرار دیتے اور پینے سے انکار کرتا تو اسے قسم سے انکار سمجھتے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے ایک گونگے کو پیش کیا اور کہا کہ اس نے مجھ سے کچھ رقم بطور قرض لی تھی اور اب قرض سے انکار کرتا ہے۔ حضرتؑ نے قرض خواہ سے ثبوت طلب کیا مگر اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس صورت میں گونگے پر قسم عائد ہوتی تھی۔ حضرتؑ نے اس گونگے کے بھائی کو بلا کر اس کے پاس بٹھا دیا اور قرآن مجید طلب کر کے اس گونگے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اس نے سر آسمان کی طرف اٹھایا اور اشارہ سے بتایا کہ یہ کتاب اللہ ہے۔ پھر آپ نے کاغذ کے پرزے پر قسم کے الفاظ تحریر کئے اور اسے پانی سے دھویا اور اس سے کہا کہ یہ پانی پی لو۔ اس نے پینے سے انکار کیا۔ حضرتؑ

نے فرمایا کہ یہ قسم سے انکار ہے۔ لہٰذا قرضہ اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔

قسم کے موقع پر تبرکاً" انشاء اللہ کہنا مستحب ہے اور اگر قسم کے موقع پر انشاء اللہ نہ کہے تو جب یاد آئے کہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الاستشناء فی الیمین متی ماذ کر بعد وان کان بعد اربعین صباحا(ثم تلا هذه الایته) واذکرر بک اذا نسیت۔ (مستدرک الوسائل)

جب بھی یاد آئے قسم کے سلسلہ میں انشاء اللہ کہے اگرچہ چالیس دنوں کے بعد یاد آئے (پھر اس آیت کی تلاوت کی) اپنے پروردگار کا ذکر کرو جب تم بھول جاؤ۔

اگر انشاء اللہ بطور تبرک نہ کہے بلکہ واقعاً" قسم کو مشیت الہٰی پر معلق کرے تو اس صورت میں قسم کی خلاف ورزی پر کفارہ نہ ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من استشنی فی الیمین فلا حنث ولا کفارہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو شخص قسم کو اللہ کی مشیت سے وابستہ کرے وہ قسم شکنی کا مرتکب نہ سمجھا جائے گا اور نہ اس پر کفارہ عائد ہو گا۔

باب النذر والعہد

نذر یہ ہے کہ انسان کسی ایسی چیز پر عمل پیرا ہونے یا اس سے اجتناب کرنے کی پابندی مخصوص الفاظ کے ذریعہ اپنے اوپر عائد کرے جس کا کرنا اور نہ کرنا اس کے دسترس میں ہو اور اس میں شرعاً رجحان بھی پایا جاتا ہو۔ لہٰذا کسی مستحب و واجب کے ترک کرنے یا کسی مکروہ و حرام کے بجا لانے کی نذر مانی جائے گی تو نذر صحیح نہ ہو گی۔امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا نذر فی معصیت۔(وسائل الشیعہ)　　　　معصیت کے کاموں میں نذر نہیں مانی جائے گی

ایک شخص نے حضرتؑ سے کہا کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر میں فلاں کام سے باز نہ رہا تو اپنے بیٹے کو مقام ابرہیم علیہ السلام پر ذبح کروں گا۔ مگر میں اس فعل کا مرتکب ہوا ہوں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ تم ایک مینڈھا ذبح کرو اور اس کا گوشت مسکینوں اور ناداروں پر صدقہ کر دو۔

صاحب استبصار و وسائل نے تحریر کیا ہے کہ اسے استحباب پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ فعل ناجائز تھا اور فعل ناجائز میں نذر منعقد نہیں ہوتی۔

ایک عورت نے نذر مانی کہ وہ اپنے چاروں ہاتھ پیروں پر چل کر طواف کرے گی۔ حضرتؑ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ سات چکر اپنے دونوں ہاتھوں کے لئے اور سات چکر اپنے دونوں پیروں کی لئے لگائے۔

یہ حکم بھی استحباب پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ صورت طواف غیر مشروع ہے جو نذر کے انعقاد سے مانع ہے۔

نذر کا اس طرح ادا کرنا واجب ہے جس طرح مانی گئی ہو۔ لہٰذا کوئی شخص حج یا زیارت کے لئے پیادہ پا جانے کی نذر مانے تو اسے پیادہ پا ہی جانا ہو گا۔ اگر سوار ہو کر جائے گا تو نذر سے عہدہ برآ نہ ہو گا۔ البتہ اگر راہ میں دریا حائل ہو جائے جسے کشتی کے بغیر عبور نہ کیا جا سکتا ہو تو کشتی پر سوار ہو سکتا ہے۔ مگر جہاں تک ممکن ہو کشتی میں کھڑا رہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے پیادہ پا حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر راستے میں نہر پڑتی ہے اس صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے فرمایا کہ وہ کشتی میں کھڑا ہو کر نہر کو عبور کرے۔

یہ اس صورت میں جب اسے یہ علم نہ ہو کہ راستے میں نہر یا دریا سے واسطہ پڑے گا اور اگر اسے یہ معلوم ہو کہ راستے میں دریا پڑتا ہے اور اسے کشتی کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا اور خشکی کا کوئی متبادل راستہ بھی نہیں ہے تو

یہ نذر منعقد نہ ہو گی کیونکہ نذر کے لئے ضروری ہے کہ اس پر مقدرت ہو۔

اگر روزہ، نماز یا صدقہ کی نذر مانے اور تعداد یا مقدار کی تعیین نہ کرے تو اتنی مقدار یا تعداد میں اسے ادا کرے جس پر روزہ، نماز یا صدقہ صادق آ سکے مثلاً" روزہ کی نذر مانے اور عدد کی تعیین نہ کرے تو ایک روزہ رکھنا یا نماز کی نذر مانے تو دو رکعت نماز پڑھ لینا یا صدقہ کی منت مانے تو کسی مسکین کو ایک روٹی دے دینا نذر سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی ہے اور اگر صرف نذر مانے اور کسی شے کی تعیین نہ کرے تو اس صورت میں مذکورہ چیزوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا کافی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے نذر مانی اور کسی چیز کی تعیین نہیں کی اسے کیا کرنا چاہئے فرمایا۔

ان شاء صلی رکعتین وان شاء صام یوما وان شاء تصدق برغیف(وسائل الشیعہ) — چاہے دو رکعت نماز پڑھے چاہے ایک دن روزہ رکھے اور چاہے ایک روٹی صدقہ کر دے۔

صاحب وسائل نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے۔

ایک شخص نے نذر مانی کہ **ان یصوم حینا** (وہ ایک حین (وقت) تک روزہ رکھے گا) مگر حین کی تعیین نہ کی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ چھ ماہ روزے رکھے اور اس آیت کی تلاوت کی۔

توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔ — وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہمہ وقت پھل دیتا ہے

اور یہ چھ مہینے کا عرصہ ہوتا ہے۔

عہد یہ ہے کہ اللہ کے نام پر کسی کام کے انجام دینے یا ترک کرنے کی پابندی اپنے اوپر عائد کرے۔ اگرچہ وہ امر مباح ہو۔ اس لئے کہ عہد میں رجحان کا اعتبار نہیں ہے۔ تاہم جس چیز کا عہد کیا جائے اس کی سمت مخالف کو اس سے اولیٰ و بہتر نہ ہونا چاہئے۔ عہد کے احکام بھی وہی ہیں جو نذر کے ہیں اور اس کی پابندی بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح نذر کی پابندی واجب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من دلائل الایمان الوفاء بالعھد۔(مستدرک الوسائل) — ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت وفائے عہد ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے ارادہ و اختیار سے نذر یا عہد پر عمل نہ کرے تو اس پر کفارہ عائد ہو گا۔

باب الصید

اسلام نے غذائی ضروریات کے پیش نظر شکار کی اجازت دی ہے۔ کیونکہ بعض علاقوں میں غذا کا انحصار ہی شکار پر ہوتا ہے۔ لہٰذا ضرورت کی بنا پر شکار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے مشغلہ یا تفریح طبع کے طور پر اختیار نہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ بے مقصد اتلاف جان غیر مستحسن عمل ہے۔

شکار صرف سدھائے ہوئے کتوں اور چھری تلوار اور تیر ایسے کاٹنے والے ہتھیاروں سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے آیہ قرآنی **وما علمتم من الجوارح مکلبین۔** (وہ شکاری جانور جو تم نے شکار کے لئے سدھائے ہوں) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

ھی الکلاب (مستدرک الوسائل)

شکاری جانوروں سے مراد کتے ہیں۔

کتوں کے شکار کئے ہوئے جانور ان شرائط کے ماتحت حلال ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں درج ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کتے کو شکار کے پیچھے چھوڑنے والا مسلمان ہو خواہ اس کا سدھانے والا غیر مسلم ہو۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان ارسلہ المسلم جاز اکل ما امسک وان لم یکن علمہ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر مسلمان، کتے کو شکار پر چھوڑے تو اس شکار کا کھانا جائز ہو گا اگرچہ سدھانے والا مسلمان نہ ہو۔

اگر کتا شکار پر جھپٹے اور مالک کے پہنچنے پر وہ زندہ ہو تو اگر ذبح کرنے کا وقت ہو تو اسے ذبح کئے بغیر کھانا جائز نہیں ہے اور اگر دم توڑ چکا ہو تو حلال ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ما امسکت الکلاب المعلمہ اکل وان قتلتہ (مستدرک الوسائل)

سدھائے ہوئے کتوں کا کیا ہوا شکار کھایا جا سکے گا اگرچہ اسے جان سے ختم کر دیا ہو۔

اگر شکرہ، عقاب، باز، چیتا، تیندوا وغیرہ کے ذریعہ کسی جانور کا شکار کیا جائے اور دم توڑنے سے پہلے اسے ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہو گا اور ذبح کرنے سے پہلے مرجائے تو حرام ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

مااخذ البازی والصقر فقتل فلا تاکل منہ الاما ادرکت ذکواتہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو شکار باز یا شکرہ کرے اور اسے مار ڈالے وہ نہ کھاؤ مگر یہ کہ تم اسے زندہ پاؤ اور اسے ذبح کر لو۔

اسی طرح اگر شکار جال میں پھنس کر دم توڑ دے تو وہ حلال نہ ہو گا اور اگر اسے زندہ نکال کر ذبح کر لیا

جائے تو اس کا کھانا حلال ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ماأخذت الحبالة من صيد فقطعت منه يدا او رجلا فذروه فانه ميت وكلوا مما ادركتم حيا و ذكر تم اسم الله عليه۔ (وسائل الشیعہ)

جو شکار جال میں پھنس جائے اور اس کا ہاتھ یا پیر ٹوٹ کر الگ ہو جائے تو اسے چھوڑ دو' وہ مردار ہے اور اگر اسے زندہ پاؤ اور اللہ کا نام لے کر اسے ذبح کرو تو اس میں سے کھاؤ۔

اگر کسی جانور کا شکار ہتھیار سے کیا جائے تو اسے دھار دار ہونا چاہئے اور ایسے اوزار سے شکار حلال نہ ہو گا جو کاٹنے کے بجائے کچل دینے والا ہو خواہ وہ اینٹ پتھر ہو یا ایسی گولی جو کاٹنے کے بجائے کچل دینے والی ہو البتہ اگر اسے زندہ پکڑ کر ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لاتاكل ماقتل الحجر والبندق والمعراض الا ما ذكيت۔(وسائل الشیعہ)

وہ شکار جو پتھر غلیل یا بے پھل کے تیر سے کیا جائے وہ اسی صورت میں حلال ہو گا جب اسے زندہ پا کر ذبح کر لو۔

اگر کسی جانور پر تیر چلایا جائے اور وہ لڑکھڑا کر بلندی سے نیچے گرے یا پانی یا آگ میں جا پڑے تو زندہ ہونے کی صورت میں اسے ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو گا اور مر جائے اور یہ شک ہو کہ اس کی موت صرف تیر سے نہیں ہوئی تو اس کا کھانا جائز نہ ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ نے ایسے شکار کے بارے میں فرمایا۔

لا يؤكل الا ان يدرك ذكوته۔(مستدرک الوسائل)

اس کا کھانا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ اسے ذبح کر لیا جائے۔

جب ٹڈی کو زندہ پکڑ لیا جائے تو بے روح ہونے کے بعد اس کا کھانا حلال ہے یا مچھلی کو زندہ پانی سے نکال لیا جائے یا خود بخود پانی سے باہر نکل آئے اور اسے زندہ پکڑ لیا جائے تو اس کا کھانا جائز ہے کیونکہ ٹڈی کو زندہ پکڑ لینا اور مچھلی کو زندہ پانی سے نکال لینا ہی ان کے لئے ذبح ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الجراد ذكى والحيتان ذكى كله وما هلك فى البحر فلاتاكل۔(وسائل الشیعہ)

ٹڈی اور مچھلی کا پکڑا جانا ہی ان کا ذبح ہونا ہے لہٰذا انہیں کھاؤ اور جو مچھلی پانی میں مر جائے وہ نہ کھاؤ۔

اگر کسی پرندے کے پر کٹے ہوئے ہوں تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے۔ لہٰذا اسے پکڑ لیا جائے اور اس کے مالک کا علم ہو جائے تو اس کے سپرد کرنا ضروری ہے اور اگر اس کے پر صحیح و سالم ہوں اور یہ علم نہ ہو کہ وہ کسی کی ملکیت ہے تو وہ حلال ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان الطائر اذا ملک جناحیہ فھو صید و ھو حلال لمن اخذہ ۔(وسائل الشیعہ)

وہ پرندہ جو پرواز کر سکتا ہو وہ شکار ہے اور جو اسے پکڑے وہ اس کے لئے حلال ہے۔

اگر کوئی شخص پرندے کا پیچھا کرے تو جب تک اسے پکڑ نہ لے اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک پرندے کو دیکھا اور اسے پکڑنے کے لئے اس کا پیچھا کیا وہ پرندہ ایک درخت پر بیٹھ گیا اور ایک دوسرے آدمی نے اسے پکڑ لیا۔ پہلے شخص نے کہا کہ یہ میرا شکار ہے اس لئے کہ میں نے اس کا پیچھا کیا ہے اور دوسرے نے کہا کہ یہ میرا شکار ہے کیونکہ میں نے اسے پکڑا ہے۔ یہ قضیہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا تو آپؑ نے فرمایا۔

للعین مارأت ولليد مااخذت ۔(وسائل الشیعہ)

آنکھ کا حصہ وہ ہے جو اس نے دیکھا اور ہاتھ کا حصہ وہ ہے جو اس نے پکڑا۔

باب الاطعمتہ والاشربہ

یہ امر مشاہدہ و تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسانی طبائع پر غذائی اثرات طاری ہوتے ہیں اور وہ جس قسم کی غذا کھاتا ہے اسی قسم کے اچھے یا برے اثرات ظہور میں آتے ہیں۔ اگر غذا صاف ستھری اور پاک ہو گی تو صحت و اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا اور غلیظ و ناپاک ہو گی تو برے اثرات مرتب ہوں گے۔ چنانچہ شراب جسے اسلام نے حرام کیا ہے انتہائی مضر و مہلک ثابت ہو چکی ہے اور طب جدید نے الکحل کو جو شراب کا اہم جزو ہے زہر قاتل قرار دیا ہے جو زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح خنزیر کا گوشت کھانے سے ایسے خلیوں[1] کی تولید ہوتی ہے جو بے حیائی و بے غیرتی کے محرک ہوتے ہیں اور مردار جانور یا ایسے حیوان کا گوشت کھانے سے جس کا گلا گھونٹا گیا ہو ایسے خلئے پیدا ہوتے ہیں جو اعضاء بدن کے لئے مضر و نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسے جانوروں میں دوران خون رک جاتا ہے اور خون کے کثیف ذرے رگوں میں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں جو گوشت کو مسموم کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ذبیحہ جانور کا خون چونکہ ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی نکل جاتا ہے اس لئے گوشت مضر اور مسمی اجزاء سے پاک و صاف رہتا ہے۔ یونہی گوشت خوار حیوانوں کا گوشت کھانے سے نظام ہضم درہم و برہم ہو جاتا ہے کیونکہ گوشت خوار جانوروں کے گوشت میں عفونت و گندگی پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی معدہ اسے قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان تو انسان' گوشت خوار حیوان بھی گوشت خوار جانوروں کی طرف رخ نہیں کرتے اور عموماً" انہی جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جو سبزی خوار ہوتے ہیں۔ اسلام نے انہی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جن سے جسم کی صحیح نشو و نما ہوتی ہے اور انہی اشیاء کو حرام کیا ہے جن میں ضرر و نقصان مضمر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے مفاد و مضرت کو نظر انداز کر کے جس چیز کو چاہا حلال کر دیا ہو اور جس چیز کو چاہا حرام کر دیا ہو۔ کیونکہ یہ اسلام کی حکمت پسندی و مصلحت آفرینی کے منافی ہے۔ اسلام میں بہت سی چیزیں حرام ہیں اور بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کے کھانے پینے کی اجازت ہے اور اکثر حلال و حرام چیزوں کو بیان کر دیا ہے اور جن چیزوں کی حلت و حرمت پر نص نہیں کی ان کے واضح علامات بیان کر

---

[1] زندگی کی اکائی کو جس میں مادہ حیات سمویا ہوتا ہے خلیہ کہا جاتا ہے یہ خود بھی ایک زندہ جسم ہے اور تمام زندہ اجسام انہی خلیوں کی ترکیب و ترتیب سے وجود میں آتے ہیں ان خلیوں میں مسلسل تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور تعمیر و تخریب کا عمل جاری رہتا ہے اگر ٹوٹنے والے خلیوں کی جگہ دوسرے خلئے پیدا نہ ہوں تو نشوونما کا سلسلہ رک جائے اور زندگی کی لو دم توڑ دے۔ ان خلیوں کی تولید ہوا' پانی اور غذا سے وابستہ ہے اگر ہوا' پانی اور غذا میسر نہ آئے تو نہ ان خلیوں کی تخلیق ہو گی اور نہ قوت توانائی اور زندگی برقرار رہے گی۔ کیونکہ یہ خلئے ہی وٹامن اور پروٹین حاصل کر کے جسم کو توانا اور صحت مند رکھتے ہیں۔

دیئے ہیں جن سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ ذیل میں امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشادات کی روشنی میں چند حلال و حرام چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دریائی جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے اور وہ بھی وہ جس پر چھلکے ہوں۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الا لا تاکلو اولا تبیعو امالم یکن له قشر۔ (وسائل الشیعہ) خبردار وہ مچھلی نہ کھانا اور نہ بیچنا جس پر چھلکے نہ ہوں۔

وہ مچھلی جو مچھلی کے پیٹ سے نکلے حلال ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں کا کھانا حلال ہے۔

وہ مچھلی جو پانی کے اندر مرجائے حرام ہے خواہ اس پر چھلکے ہوں۔ چنانچہ حضرتؑ سے منقول ہے کہ۔

انه نهی من المطافی۔ (مستدرک الوسائل) حضرت نے اس مچھلی کے کھانے سے منع فرمایا ہے جو پانی کے اندر مرجائے۔

صحرائی حیوانوں میں ہرن' گائے وغیرہ کے علاوہ دوسرے جانور حرام ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے ہاتھی' ریچھ اور بندر کے گوشت کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔

لیس هذا من بهیمته الانعام التی تؤکل۔ (وسائل الشیعہ) یہ ان چوپاؤں میں داخل نہیں ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

اسی طرح وہ درندے جو ناخنوں اور دانتوں سے چیر پھاڑ دیتے ہیں اور وہ پرندے جو چنگال رکھتے ہیں جیسے باز' شکرہ' شاہین وغیرہ حرام ہیں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اتقوا کل ذی ناب من السباع و مخلب من الطیر۔ (وسائل الشیعہ) دانتوں سے چیرنے پھاڑنے والے درندوں اور چنگال رکھنے والے پرندوں کے گوشت سے اجتناب کرو۔

وہ پرندے جن کی حلت و حرمت پر نص نہ ہو ان کی حلت و حرمت کو دو علامتوں سے جانا جا سکتا ہے۔ پہلی علامت یہ ہے کہ اگر پرواز کے وقت اپنے پروں کو پھیلاتے ہوں اور یہ پھیلاؤ پروں کے پھڑ پھڑانے سے زیادہ ہو تو وہ حرام ہیں اور اگر پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوں اور یہ پھڑ پھڑانا پروں کو پھیلانے سے زیادہ ہو تو وہ حلال ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

کل مادف ولا تاکل ماصف۔ (وسائل الشیعہ)
جو اڑتے ہوئے پروں کو پھڑ پھڑائیں وہ کھاؤ اور جو پروں کو پھیلائیں وہ نہ کھاؤ۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اگر اس میں پوٹا یا سنگدانہ ہو یا اس کے پیروں کے عقبی حصہ میں کانٹا سا ہو تو وہ حلال ہے اور اگر ان علامتوں میں سے کوئی علامت نہ ہو تو وہ حرام ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

تنزھوا عن اکل الطیر الذی لیست لہ قانصتہ ولا صیصیتہ ولا حوصلہ۔ (وسائل الشیعہ)
ان پرندوں کے گوشت سے اجتناب کرو جن میں سنگدانہ یا پیروں کے عقبی حصہ میں کانٹا اور پوٹا نہ ہو۔

بعض صورتوں میں حلال جانور بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اس حرمت کے تین سبب ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ بھیڑ، بکری، گائے یا اونٹ کا بچہ مادہ خنزیر کا دودھ اتنی مقدار میں پئے جس سے گوشت پیدا ہو اور ہڈیوں میں مضبوطی آئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاتا کلہ من لحم حمل رضع من لبن خنزیرہ۔ (وسائل الشیعہ)
اس بھیڑ، بکری کے بچہ کا گوشت نہ کھاؤ جس نے سورنی کا دودھ پیا ہو۔

اگر اتنی کم مقدار میں پئے کہ جس سے ہڈیوں میں مضبوطی نہ آئے تو اس کا گوشت اور دودھ مکروہ ہے۔ یہ کراہت استبراء سے زائل ہو جاتی ہے اس استبراء کی صورت یہ ہے کہ اگر وہ دودھ کے بغیر رہ سکتا ہو تو سات دن تک اسے چارہ وغیرہ دیا جائے اور اگر دودھ کے بغیر نہ رہ سکتا ہو تو اسے بکری وغیرہ کے تھنوں پر چھوڑا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ سے ایسے جانور کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

قید وہ واعلفوہ الکسب والنوی والشعیر والخبزان کان استغنی عن اللبن وان لم یکن استغنی عن اللبن فیلقی علی ضرع شاہ سبعہ ایام ثم یوکل لحمہ۔ (وسائل الشیعہ)
اسے بند رکھو اگر اسے دودھ کی احتیاج نہ ہو تو اسے کھل، گٹھلیاں، جو، روٹی کھانے کو دو اور اگر اسے دودھ کی ضرورت ہو تو اسے سات دن تک بکری کے تھنوں پر چھوڑو پھر اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ وطی کا مرتکب ہو جب وطی ثابت ہو جائے تو اس کا گوشت اور دودھ حرام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے ایسے چوپائے کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔

حرام لحمھا ولبنھا۔ (وسائل الشیعہ)
اس کا گوشت اور دودھ حرام ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ اس کی غذا انسانی فضلہ ہو۔ ایسا جانور اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک اتنا

عرصہ نہ گذر جائے کہ نجاست کے اثرات زائل ہو جائیں۔ یہ عرصہ جسے شرعی اصطلاح میں استبراء کہا جاتا ہے مختلف جانوروں کی جسامت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الدجاجته الجلالته لا یوکل لحمها حتی تقید ثلثه ایام وللبط الجلالته بخمسته ایام والشاة الجلاله عشرین یوما والناقه الجلاله اربعین یوما۔ (وسائل الشیعہ)

نجاست خوار مرغی، بطخ، بکری، گائے اور اونٹنی کا گوشت اس وقت تک کھایا نہیں جائے گا جب تک ان نجاست خوار جانوروں کو بالترتیب تین، پانچ، دس، بیس اور چالیس دن تک بند نہ رکھا جائے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ نجس غذا اپنا اثر چھوڑجاتی ہے اور وہ ایسا اثر ہے جو غذا کے تحلیل ہونے سے زائل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ازالہ اس غذا سے پیدا ہونے والے اثرات یعنی خلیوں کے ازالہ پر منحصر ہے اور اس ازالہ کی مدت مختلف حیوانات کی جسامت اور غذا کی مقدار کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ جو حضرت کے ارشاد کے مطابق تین دن سے لے کر چالیس دن تک ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مدت سے تحلیل غذا کی مدت مراد نہیں لی جا سکتی کیونکہ وہ چند گھنٹوں سے زائد نہیں ہوتی۔ بلکہ غذا سے پیدا ہونے والے خلیوں کے بارے ہی میں ہو سکتی ہے جن کے ٹوٹنے اور ان کی جگہ پر نئے خلیوں کے پیدا ہونے میں تین دن سے لے کر چالیس دن تک کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے اس دور میں ان غیر مرئی خلیوں کی نشاندہی کی کہ جب نہ خلیوں کا کسی کو علم تھا اور نہ ان کا کوئی تصور پیدا ہوا تھا۔

حلال جانوروں میں چند چیزیں حرام بھی ہوتی ہیں۔ جن سے اجتناب کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام کوفہ کے بازار میں آئے اور قصابوں کو خون، غدود، حرام مغز، خصتین، قضیب اور تلی وغیرہ کے فروخت کرنے سے منع کیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام تلی اور کلیجی میں فرق ہی کیا ہے دونوں ایک ہی تو ہیں فرمایا کہ ایسا نہیں ہے پھر ان دونوں کا فرق ظاہر کرنے کے لئے دو برتن منگوائے ایک میں کلیجی کو اور دوسرے میں تلی کو رکھا اور ان دونوں پر پانی ڈالا کچھ دیر کے بعد دیکھا گیا کہ تلی خون بن کر پانی میں مخلوط ہو گئی ہے اور بالائی پوست اور رگوں کے سوا اس میں کچھ نہیں رہا اور کلیجی کے اجزاء جوں کے توں باقی ہیں صرف اس کی رنگت سفید ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ ان دونوں میں یہی فرق ہے کہ کلیجی گوشت ہے اور تلی خون ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے کہ۔

لاتکلوا الطحال فانه بیت الدم الفاسد۔ (وسائل الشیعہ)

تلی نہ کھاؤ اس لئے کہ یہ فاسد خون ہے جو منجمد ہو گیا ہے۔

شراب خواہ انگور سے بنائی گئی ہو یا کھجور سے یا جو سے اس کا پینا کشید کرنا بیچنا سب حرام ہے۔ امیرالمومنین

علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

مد من الخمر یلقی اللہ حین یلقاہ کعابد و ثن۔ (وسائل الشیعہ)

شراب خوار جب اللہ کے حضور میں آئے گا تو بت پرستوں میں شمار ہو گا۔

حضرت سے کہا گیا کہ آپ کا خیال یہ ہے کہ شراب نوشی' زنا اور چوری سے بڑھ کر جرم ہے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے اس لئے کہ زانی' زنا تک محدود رہتا ہے اور شراب خوار جب نشہ میں مست ہوتا ہے تو زنا' چوری اور قتل تک کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

انگور کا پانی جسے عصیر عنبی کہا جاتا ہے جب جوش کھا جائے تو اس وقت تک اس کا استعمال جائز نہیں ہے جب تک اس کا دو تہائی حصہ جل نہ جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اسوء ابن قرطبہ کو تحریر فرمایا۔

واطبخ للمسلمین قبلک من الطلاما یذھب ثلثاہ و یبقی ثلثہ۔ (بحارالانوار)

انگور کا پانی مسلمانوں کے لئے جوش دو اس طرح کہ اس کے دو حصے جل جائیں اور ایک حصہ باقی رہ جائے۔ ....

اس کی وجہ یہ ہے کہ دو تہائی حصہ جلنے کے بعد وہ شیرہ ہو جائے گا اور دو تہائی حصہ کے خشک ہونے سے پہلے اسے رکھا رہنے دیا جائے تو اس میں نشہ آور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

باب النکاح

انسان طبعاً اجتماعی زندگی کا محتاج ہے اس کے بغیر نہ معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے اور نہ متمدن زندگی کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اس اجتماعی حیات کا ابتدائی مقام گھر ہے اور گھر کی تشکیل عائلی زندگی سے وابستہ ہے۔ اسی سے اولاد، کنبہ اور قوم و قبیلہ وجود میں آتا ہے اور نسل انسانی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ بیشک ازدواجی زندگی سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں مگر ان ذمہ داریوں کے ساتھ جو ماحول اس کے گرد و پیش تعمیر ہوتا ہے وہ اسے ان ذمہ داریوں کی تلخی کا احساس نہیں ہونے دیتا اور وہ خوشدلی سے اہل و عیال کی کفالت اور اولاد کی تربیت کا بار اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسان تجرو کی زندگی بسر کرے تو وہ ذہنی پراگندگی و پریشاں خیالی کا شکار ہو جاتا ہے اور عبادات و فرائض میں دلجمعی و یکسوئی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اسلام نے متاہل کی عبادت کو غیر متاہل کی عبادت پر فوقیت دی ہے اور بقائے نسل کے لئے ازدواجی زندگی پر زور دیا ہے۔ اس کے ساتھ چند پابندیاں بھی عائد کی ہیں اور جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی حد بندی کر دی ہے تاکہ خواہشات کی تکمیل ہو تو مقررہ حدود کے اندر اور احکام کی پابندی کے ساتھ۔ ان احکام میں سے چند احکام تحریر کئے جاتے ہیں۔

اگر باپ یا دادا اپنے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دے تو وہ عقد لازم ہو گا اور لڑکے اور لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد اس نکاح کو رد کرنے کا اختیار نہ ہو گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

تزویج الآباد علی البنین والبنات جائز اذا کانو اصغار اولیس لهم خیار اذا کبروا۔ (مستدرک الوسائل)

باپ دادا کا اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو بیاہ دینا جائز ہے جبکہ وہ نابالغ ہوں اور بالغ ہونے کے بعد (انہیں عقد کو ختم کرنے کا) اختیار نہ ہو گا۔

اگر لڑکی بالغ ہو تو اس سے پوچھے بغیر باپ کو اس کا عقد نہ کرنا چاہیئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاینکح احد کم ابنته حتی لیستامرها فی نفسها فهی اعلم بنفسها۔ (مستدرک الوسائل)

کوئی شخص اپنی لڑکی کا نکاح اس وقت تک نہ کرے جب تک لڑکی سے اس کی آزادنہ رائے دریافت نہ کر لے کیونکہ وہ اپنے حالات سے زیادہ واقف ہے۔

اگر کوئی عورت دو آدمیوں کو اپنا وکیل نکاح قرار دے اور ان میں سے ایک ایک سے اور دوسرا دوسرے شخص سے اس کا نکاح پڑھ دے تو پہلا نکاح صحیح ہو گا اور دوسرا باطل۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا وکلت المرأۃ الولیین فوضت الیھما فانکحھا لکل واحد منھما رجلا فالنکاح الاول۔ (مستدرک الوسائل)

جب کوئی عورت دو آدمیوں کو نکاح کا اختیار سونپ کر اپنا وکیل بنائے اور وہ دونوں اس کا نکاح کر دیں تو پہلے آدمی سے نکاح صحیح ہو گا۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق رجعی دے دے تو مدت عدہ کے اندر اس کی بہن سے عقد نہیں کر سکتا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا طلق الرجل المراہ لم یتزوج اختھا حتی تنقضی عدتھا (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دے تو اس کا عدہ گزرنے سے پہلے اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور پھر وفات پا جائے یا اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس مرد کے بیٹوں پر حرام رہے گی خواہ ہم بستری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا نکح الرجل امرأۃ ثم توفی عنھا اوطلقھا لم تحل لا حد من والدہ کان دخل بھا اولم یدخل۔ (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے پھر مر جائے یا اسے طلاق دے تو وہ اس شخص کی اولاد پر حلال نہ ہو گی خواہ اس نے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے عقد کرے تو اس عورت کی ماں اس شخص پر حرام ہو جائے گی خواہ ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو اور اس کی بیٹی بھی حرام رہے گی درصورتیکہ اس سے ہم بستری ہو چکی ہو۔

ایک مرتبہ ابن مسعود سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے عقد کیا اور ہم بستری کی نوبت نہ آئی تھی کہ انتقال کر گئی کیا وہ شخص اس کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے کہا کہ ہاں اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے اور صورت مسئلہ اور اپنا جواب بیان کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ تم نے یہ حکم کہاں سے اخذ کیا ہے کہا قرآن مجید کی اس آیت سے۔

وامھات نساء کم وربائبکم اللاتی فی حجور کم من نساء اللاتی و دخلتم بھن فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم۔

(تم پر حرام کی گئی ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں اور وہ لے پالک لڑکیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم ہم بستری کر چکے ہو اور اگر تم نے ان بیویوں سے ہم بستری نہ کی ہو تو ان لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ لے پالک لڑکیوں کے بارے میں تو آیت میں یہ قید ہے کہ وہ اس صورت میں حرام ہوں گی جب ان کی ماؤں سے ہم بستری ہو چکی ہو مگر بیویوں کی ماؤں کے بارے میں تو یہ قید نہیں ہے لہٰذا بیویوں کے عقد میں آجانے کے بعد ان کی مائیں حرام ہو جائیں گی خواہ ہم بستری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اگر کوئی عورت ایسے مرد سے عقد کر لے جو اپنے کو آزاد ظاہر کرے اور اس کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ غلام ہے تو عورت کو فسخ نکاح کا حق ہے۔ چنانچہ ایک غلام نے اپنے کو آزاد ظاہر کر کے ایک آزاد عورت سے عقد کر لیا جب اس کا انکشاف ہوا تو اس نے امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ عورت چاہے تو نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اگر کسی لڑکی کا ولی اس کے ایسے عیب کو چھپا کر جو موجب فسخ ہوتا ہے کسی شخص سے نکاح کر دے تو وہ شخص اس عورت کے ولی سے مہر کی واپسی کا حق رکھتا ہے۔ کیونکہ اس نے فریب و تدلیس کاری سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک لڑکی کے ولی نے یہ جانتے ہوئے کہ لڑکی مبروص ہے ایک شخص سے بیاہ دی جب اسے علم ہوا تو اس نے حضرتؑ کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اس عورت کا مہر اس کے ولی کے ذمہ ہے۔

اگر کوئی شخص خواستگاری کے موقع پر ایسے الفاظ کہے جن سے تبادر کچھ اور ہوتا ہو اور مراد وہ ہو جس کی طرف تبادر نہیں ہوتا مگر الفاظ اسے بھی شامل ہوں تو اس پر تدلیس کا حکم جاری نہ ہو گا۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک اجنبی قبیلہ میں خواستگاری کی تو انہوں نے پوچھا کہ تم کیا کاروبار کرتے ہو کہا کہ میں چوپاؤں کی خرید و فروخت کا دھندا کرتا ہوں جب نکاح ہو چکا تو معلوم ہوا کہ وہ بلیاں بیچتا ہے۔ یہ معاملہ امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ بلیاں بھی چوپاؤں میں داخل ہیں۔

اس مبحث کے ذیل میں چند مسائل جو ولادت اور اولاد سے تعلق رکھتے ہیں درج کئے جاتے ہیں۔

اگر کسی عورت کے ہاں مباشرت کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو وہ اسی کے شوہر کا قرار پائے گا اور چھ ماہ کی مدت سے قبل اس طرح پیدا ہو کہ نمو کا کوئی درجہ باقی نہ ہو تو اس کے شوہر کا قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تلد المراۃ لاقل من ستۃ اشھر۔ (وسائل الشیعہ)

عورت چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ نہیں جنتی۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس کے ہاں نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اس عورت کو غلط کار قرار دے کر سنگسار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ حمل اور دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وحملہ و فصالہ ثلثون شہرا۔ اس کے پیٹ میں رہنے اور اس کی دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے۔

اور دودھ پلانے کی مدت دو سال یعنی چوبیس مہینے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین۔ مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلائیں۔

جب تیس مہینوں سے چوبیس مہینے دودھ پلائی کے منہا کئے جائیں گے تو باقی چھ مہینے بچیں گے اور یہ حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ لہٰذا یہ بچہ اسی عورت کے شوہر کا ہے۔

اگر شوہر مباشرت کر چکا ہو اور بچے کا الحاق اس سے ہو سکتا ہو تو اسی کا بچہ قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک بوڑھے شخص نے ایک جوان عورت سے عقد کیا اور مقاربت کی حالت میں مرگیا وہ عورت حاملہ ہو گئی اور نو مہینے کے بعد بچہ جنا۔ جب اس بچے نے ہوش سنبھالا تو اس بوڑھے کے دوسرے بیٹوں نے حضرت عمرؓ کے پاس مرافعہ دائر کیا اور کہا کہ یہ بچہ ان کے باپ کا نہیں ہے بلکہ اس کی ماں نے غلط کاری کے نتیجہ میں اسے جنا ہے اور چند گواہ بھی پیش کر دیئے۔ حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا اس عورت نے یہ حکم سنا تو امیرالمومنینؑ سے فریاد کی اور اپنے عقد اور ازدواجی تعلق کی کیفیت بیان کی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ عورت ہر چیز واضح طور سے بتاتی ہے لہٰذا اسے سزا دینے میں جلدی نہ کی جائے۔ دوسرے دن آپ نے چند بچوں کو جمع کیا اور اس بچے سے کہا کہ تم ان بچوں کے ساتھ مل کر کھیلو جب وہ بچے کھیلنے لگے تو آپ نے ایک دم حکم دیا کہ سب بیٹھ جائیں وہ بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ان کے بیٹھتے ہی پھر حکم دیا کہ کھڑے ہو جائیں تمام بچے فوراً کھڑے ہو گئے مگر اس بچے نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے اور ہاتھوں کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ اسی مرنے والے بوڑھے کا بیٹا ہے لہٰذا اس کے ترکہ میں سے اسے حصہ دیا جائے اور اس کے بھائیوں کو افترا پردازی کی سزا دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپؑ نے یہ فیصلہ کس بنا پر کیا ہے فرمایا کہ اس کا ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہونا بتاتا ہے کہ یہ اسی کمزور اور ضعیف باپ کا بیٹا ہے۔

حضرتؑ نے اس بچے کی کمزوری و ناتوانی کو اس بوڑھے کی اولاد ہونے کے ثبوت میں پیش کیا یہ صرف ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے تھا ورنہ قول پیغمبرؐ **الولد للفراش۔** (بچہ اسی کا ہو گا جس کے بستر پر پیدا ہو) اس امر کی واضح دلیل ہے کہ وہ بچہ اسی بوڑھے کا ہے۔

اگر کوئی شخص مادہ منویہ باہر پھینکے اور پیشاب کئے بغیر پھر اسی صورت سے مقاربت کرے اور بچہ پیدا ہو جائے تو وہ اسی کا بچہ ہو گا کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ پہلی مباشرت کے نتیجہ میں کچھ اجزاء منویہ نالی کے اندر رہ گئے ہوں جو انعقاد حمل کا باعث ہوئے ہوں۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ سے عرض کیا کہ میں مقاربت کے موقع پر مادہ منویہ باہر پھینکتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ تم نے مقاربت کے بعد دوبارہ

مقاربت کی تھی۔ کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ کیا دوسری مقاربت سے پہلے پیشاب کیا تھا۔ کہا نہیں فرمایا کہ وہ بچہ تمہارا ہے۔

اگر ماں باپ اور بچے کی رنگت میں فرق ہو تو بچے کو ناجائز اولاد قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے کہ بعض اوقات خارجی اسباب کے زیر اثر رنگت میں تفاوت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حبشی مرد اپنی حبشیہ بیوی کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں سیاہ فام ہوں اور میری بیوی بھی سیاہ فام ہے اس نے ایک بچہ جنا ہے جو سرخ رنگ کا ہے۔ حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر اس عورت نے کہا کہ میں کسی خیانت کی مرتکب نہیں ہوئی۔ یہ لڑکا اسی کا ہے۔ حضرت عمرؓ حیران و پریشان ہوئے اور کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ آخر امیرالمومنینؑ کی طرف رجوع کیا گیا آپ نے اس مرد سے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں تو تم صحیح صحیح جواب دو گے۔ اس نے کہا کہ ہاں فرمایا کہ تم نے اپنی بیوی سے حالت حیض میں مقاربت تو نہیں کی۔ اس نے اس کا اعتراف کیا۔ فرمایا کہ جب نطفہ خون کے ساتھ ملا تو اس سے ایسا بچہ پیدا ہوا جو سرخ رنگت لئے ہوئے ہے لہٰذا تم اس کے بیٹا ہونے سے انکار نہ کرو یہ تمہاری غلطی کا نتیجہ ہے اس میں تمہاری بیوی کا کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرتؑ نے بعض صورتوں میں طبیعی آثار کی بنا پر بھی اولاد کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ ایک شخص قاضی شریح کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں آدمی دو عورتیں ایک آزاد اور ایک کنیز میرے پاس چھوڑ گیا۔ ان دونوں کے ہاں ولادت ہوئی ایک کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور ایک کے ہاں لڑکی۔ مگر وہ دونوں لڑکی سے انکار کرتی ہیں اور ہر ایک یہ کہتی ہے کہ اس کی کوکھ سے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ شریح کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اور حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا حضرتؑ نے ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور فرمایا کہ اس کا فیصلہ اس تنکے کے اٹھانے سے بھی آسان تر ہے پھر آپ نے ان دونوں عورتوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ الگ الگ پیالیوں میں اپنا دودھ نکالیں جب انہوں نے دودھ نکالا تو حضرت نے دونوں کا دودھ الگ الگ تولا ایک کا دودھ بھاری اور دوسری کا دودھ ہلکا نکلا۔ جس کا دودھ بھاری تھا اس کے حوالے لڑکا کیا اور جس کا دودھ ہلکا تھا اسے لڑکی دی اور فرمایا کہ جس طرح لڑکی لڑکے کے مقابلہ میں میراث' دیت' شہادت اور عقل میں کمتر ہوتی ہے اسی طرح اس کے دودھ کا وزن بھی لڑکے کے دودھ سے ہلکا ہوتا ہے۔

بچے کی ولادت کے سلسلہ کے چند احکام و آداب یہ ہیں۔

بچے کی ولادت کے سلسلہ کے چند احکام و آداب یہ ہیں۔

بچے کی ولادت سے پہلے ہی اس کا نام تجویز کر دینا چاہیے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

سموا اولاد کم قبل ان یولدوا۔(وسائل الشیعہ) اپنی اولاد کا نام ان کی پیدائش سے پہلے رکھ دو

سر مونڈتے وقت سر کے وسط یا کنارے میں چوٹی کی صورت میں بال نہ چھوڑے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاتحلقوا الصبیان القزع۔(وسائل الشیعہ) بچوں کے سر وسط سر میں کچھ بال چھوڑ کر نہ مونڈو

ساتویں دن عقیقہ کرے خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

عقوا عن اولاد کم یوم السابع۔(وسائل الشیعہ) ساتویں دن اپنے بچوں کا عقیقہ کرو۔

بچوں کا ختنہ کروائے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اختنوا اولادکم یوم السابع لایمنعکم حرو لا بردفانہ طھور للجسد۔(وسائل الشیعہ) سردی کا موسم ہو یا گرمی کا' ساتویں دن اپنے بچوں کا ختنہ کرو اس لئے کہ یہ جسم کی پاکیزگی کا باعث ہے۔

بچے کو اس کی ماں کا دودھ پلوائے۔ یہ دودھ بچے کی نشو و نما کے لئے زیادہ موثر اور مفید ہے کیونکہ یہ اسی خون کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے جو شکم مادر میں اس کی غذا فراہم کرتا رہا ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

مامن لبن رضع بہ الصبی اعظم برکتہ علیہ من لبن امہ۔(وسائل الشیعہ) بچے کے لئے اس کی ماں کا دودھ ہر دودھ سے زیادہ بابرکت ہے۔

اگر ماں کے علاوہ کسی اور عورت کا دودھ پلوانا پڑ جائے تو ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو خوش اطوار اور عقلمند ہو۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

تو قوا علی اولاد کم لبن البغی من النساء والمجنونہ فان البن یعدی۔(بحارالانوار) اپنی اولاد کو فاحشہ اور دیوانی عورت کا دودھ نہ پلاؤ اس لئے کہ دودھ طبیعت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

باب الطلاق

رشتہ زوجیت کو قطع کرنے کا نام طلاق ہے۔ اگرچہ یہ مستحسن عمل نہیں ہے تاہم ازدواجی زندگی میں ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ زن و مرد میں یکجہتی باقی نہیں رہتی اور مرد کو عورت سے یا عورت کو مرد سے علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا اور ان کی فلاح و بہبود اسی میں ہوتی ہے کہ وہ احسن طریق سے نکاح کے بندھن کو توڑ دیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ صحت طلاق کے لئے ضروری ہے کہ طلاق دہندہ طلاق کا قصد و ارادہ رکھتا ہو اور جس عورت کو طلاق دی جا رہی ہو وہ حیض و نفاس سے پاک و صاف ہو چکی ہو اور پاک ہونے کے بعد اس سے مباشرت واقع نہ ہوئی ہو۔ اور اجرائے طلاق کے وقت دو عادل گواہ موجود ہوں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لایکون الطلاق طلاقا حتی یجتمع الحد و د الاربعہ فاولھا ان تکون المراۂ طاہرہ من غیر جماع یقع بھا من بعد خروجھا من طمثھا االذی طھرت فیہ والثانی ان یکون الرجل نریدا بالطلاق غیر مکرہ ولا مجبر علیہ والثالث ان یحضر شاھد ین عد لین فی وقت تطلیقہ ایاھا والرابع ان ینطق لسانہ عند الشاھدین بالطلاق۔(مستدرک الوسائل)

اس وقت تک طلاق واقع نہ ہو گی جب تک چار شرطیں جمع نہ ہو جائیں پہلی شرط یہ ہے کہ عورت خون سے پاک ہو اور خون حیض سے پاک ہونے کے بعد اس سے مباشرت واقع نہ ہوئی ہو دوسری یہ کہ بغیر کسی جبرو اکراہ کے طلاق کا ارادہ کرے تیسری یہ کہ طلاق دیتے وقت دو عادل گواہ موجود ہوں چوتھی یہ کہ ان دو گواہوں کے روبرو صیغہ طلاق اپنی زبان پر جاری کرے۔

ایک شخص کوفہ میں حضرتؑ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو جبکہ وہ حیض سے پاک ہو چکی تھی اور اس کے بعد میں نے مقاربت بھی نہیں کی تھی طلاق دے دی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ کیا دو عادل گواہوں کے روبرو طلاق دی تھی۔ کہا نہیں۔ فرمایا۔

اذھب فان طلاقک لیس بشئی۔(وسائل الشیعہ)

جاؤ یہ تمہاری طلاق کچھ نہیں ہے۔

طلاق میں عورتوں کی گواہی صحیح نہیں ہے خواہ چار عورتیں ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایجوز شهادہ النساء فی الطلاق۔(مستدرک الوسائل) طلاق میں عورتوں کی گواہی صحیح نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص طلاق پر مجبور کر دیا جائے یا ہذیانی حالت میں طلاق کے الفاظ زبان پر لائے یا ابھی نابالغ ہو تو اس کی طلاق صحیح نہ ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایجوز طلاق صاحب ہذیان ولا مکرہ ولا صبی حتی یحتلم۔(مستدرک الوسائل) ہذیان بکنے والے اور مجبور کئے جانے والے اور بچے کی طلاق صحیح نہیں ہے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔

اگر کوئی شخص خواب میں طلاق دے تو وہ بھی باطل ہو گی۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ سے بیان کیا کہ اس نے خواب میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں۔ آپؑ نے فرمایا۔

انما الطلاق فی الیقظہ ولیس الطلاق فی النوم۔ (مستدرک الوسائل) طلاق بیداری ہی میں ہو سکتی ہے نیند کی حالت میں نہیں ہوتی۔

اگر طلاق میں مدت عدہ کے اندر رجوع کیا جا سکتا ہو تو وہ طلاق رجعی کہلاتی ہے۔ چنانچہ وہ طلاق جو شرائط طلاق کی پابندی کے ساتھ دی جائے اس میں طلاق دہندہ کو حق رجوع ہوتا ہے اور اگر اس میں رجوع کی گنجائش نہ ہو تو وہ طلاق بائن ہے۔ چنانچہ عورت کی عمر نو سال تمام نہ ہوئی ہو یا یائسہ ہو یا اس سے مباشرت نہ ہوئی ہو یا خلع کی صورت ہو یا تین مرتبہ طلاق دی گئی ہو تو ان تمام صورتوں میں حق رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ ان تین طلاقوں کی شرعی صورت یہ ہے کہ شرائط طلاق کے ساتھ عورت کو پہلی مرتبہ طلاق دے پھر مدت عدہ کے اندر رجوع کر لے یا عدہ کے بعد نکاح جدید کرے پھر دوبارہ انہی شرائط کے ساتھ طلاق دے اور مدت عدہ کے اندر رجوع کر لے یا عدہ کے بعد نکاح کر لے پھر سہ بارہ طلاق دے دے تو یہ تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ پہلی اور دوسری طلاق' رجعی ہو گی اور تیسری طلاق' بائن ہو گی کیونکہ اس تیسری طلاق کے بعد نہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ اس وقت تک از سر نو عقد کر سکتا ہے جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح کر کے اس سے طلاق نہ لے لے یا بیوہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان طلقھا واحدہ ثم ترکھا حتی یخلوا جلھا ان شاء ان یخطب مع الخطاب فعل وانی راجعھا قبل ان یخلو اجلھا او بعدہ کانت عندہ علی تطلیقہ فان لطقھا الثانیہ ایضا فشاء ان یحطبھا مع الخطاب ان کان ترکھا حتی یخلوا جلھا فان شاء راجعھا قبل ان ینقضی اجلھا فان فعل فھی عندہ علی تطلیقتین فان

اگر وہ عورت کو ایک طلاق دے اور پھر اسے نظر انداز کر دے یہاں تک کہ اس کی مدت عدہ گزر جائے تو چاہے تو اس سے نکاح کر لے اور چاہے تو مدت عدہ کے گزرنے سے پہلے رجوع کر لے اس صورت میں وہ ایک دفعہ کی طلاق یافتہ ہو گی اور اگر دوسری دفعہ طلاق دے تو مدت عدہ کے گزرنے کے

طلقها الثالثه فلا تحل له حتی تنکح زوجا غیره۔ (وافی)

بعد اس سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح کر لے اور مدت عدہ کے گزرنے سے پہلے رجوع کرنا چاہے تو رجوع کر لے' اس صورت میں وہ دو دفعہ کی طلاق یافتہ ہو گی اور اگر تیسری دفعہ طلاق دے دے تو وہ اس وقت تک حلال نہ ہو گی جب تک کسی اور شخص سے نکاح نہ کر لے۔

اسلام کے تمام احکام مبنی بر حکمت ہیں۔ اس نے طلاق میں دو مرتبہ رجوع کا حق دے کر طلاق دہندہ کے لئے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ اگر وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اپنے کئے پر پچھتائے تو عدہ کے اندر رجوع کر لے یا عدہ کے بعد دوبارہ نکاح کر لے اور ان دو موقعوں کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ سابقہ تجربہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اب نباہ ناممکن ہے ورنہ یہ جانتے ہوئے کہ اب نہ رجوع ہو سکے گا اور نہ تحلیل کی بے غیرتی برداشت کئے بغیر نکاح ہو سکے گا وہ یہ اقدام کیوں کرتا۔

سواد اعظم کے نزدیک اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں تین مرتبہ لفظ طلاق دہرا دے ا طلاق کے ساتھ تین کا ہندسہ لگا دے تو پہلے مرحلہ ہی پر عورت حرام ہو جاتی ہے نہ رجوع کا حق رہتا ہے اور نہ اس وقت تک اس سے نکاح کر سکتا ہے جب تک اس کے حلال کرنے کا سروسامان نہ کرے۔ اسلام ایسا حکمت پسند و فطرت شناس دین موقع دئے بغیر اس قسم کی سزا تجویز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ شارع اسلام نے اس قسم کی تین طلاقوں کو جو بیک وقت دی جاتی ہیں صریحاً غلط کہا ہے اور صحاح اہلسنّت میں متعدد احادیث اس غیر اسلامی طریق کار کی مد میں درج ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں کسی نے ایک ہی نشست میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے پر غضب لہجے میں فرمایا۔

ایلعب بکتاب الله وانا بین اظهر کم۔ (سنن نسائی ج ۲ ص ۹۹)

کیا اللہ کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے حالانکہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔

اس یکبارگی تین طلاق کو طلاق ثلاث قرار دینے کی ابتداء حضرت عمرؓ کے دور سے ہوئی اور انہی کے حکم سے اس کا نفاذ ہوا۔ چنانچہ ابن عباس کہتے ہیں کہ۔

کان الطلاق علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم و ابی بکر و سنتین من خلافته عمر طلاق الثلاث واحده فقال عمر ابن الخطاب ان الناس قد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کے عہد میں اور عمر کے دور خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی مانا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ

استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناہ فلوا مضینا علیھم فامضا علیھم۔(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۷۷)۔

لوگوں نے ایسے امر میں جلد بازی شروع کر دی ہے جس میں ان کے لئے مہلت فراہم کی گئی تھی اب اگر اسی کو نافذ کر دیا جائے تو کیا ہرج ہے چنانچہ انہوں نے ایک ساتھ دی ہوئی تین طلاقوں کو تین طلاقیں قرار دینے کا حکم جاری کر دیا۔

اس حکم کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ بلکہ قرآن و سنت دونوں نے اس کی نفی کی ہے۔ مگر اس کے باوجود سواد اعظم کا اسی پر عملدرآمد ہے۔ بہرحال قرآن و سنت اور آئمہ اہل بیت علیہ السلام کے اقوال کی روشنی میں ایک ساتھ تین طلاقیں کہہ دینے سے تین طلاقیں واقع نہیں ہوتیں بلکہ پہلی اور دوسری اور دوسری اور تیسری طلاق کے درمیان رجوع کی صورت پیدا ہو تو تین طلاقیں ہوں گی۔

اگر کسی آزاد عورت کا شوہر غلام ہو تو وہ بھی تین طلاقوں کے بعد اسی طرح حرام ہو جائے گی جس طرح آزاد سے بیاہی ہوئی آزاد عورت حرام ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے غلام سے بیاہی ہوئی آزاد عورت کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ وہ کتنی طلاقوں کے بعد حرام ہو گی۔ فرمایا۔

الطلاق والعدہ بالنساء۔(وافی)

طلاق اور عدہ میں دوسری عورتوں کے برابر ہو گی۔

یعنی تیسری طلاق کے بعد حرام ہو جائے گی اور اس کی مدت عدہ بھی تین طہر ہے۔ اگر عورت کنیز ہو تو دوسری طلاق کے بعد حرام ہو جائے گی۔ چنانچہ دو آدمیوں نے حضرت عمرؓ سے کنیز کی طلاق کے بارے میں پوچھا۔ وہ ان دونوں کو لے کر امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے اور کنیز کی طلاق کے بارے میں پوچھا آپ نے انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ دو یعنی دو طلاقوں کے بعد وہ اپنے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔

اگر کوئی شخص مباشرت کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دے تو وہ پورے مہر کی ادائیگی کا ذمہ دار ہو گا اور اگر مباشرت سے پہلے طلاق دے تو عورت نصف مہر کی حقدار ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے کنیز کو مہر قرار دے کر ایک عورت سے عقد کیا اور مباشرت سے پہلے اسے طلاق دے دی اب ادائے مہر کی کیا صورت ہو گی فرمایا کہ وہ کنیز کی آدھی قیمت اس عورت کو بطور مہر ادا کرے۔ اسی طرح ایک شخص نے اپنی کنیز کی آزادی کو مہر قرار دے کر اس سے عقد کیا اور مباشرت سے قبل اسے طلاق دے دی فرمایا کہ وہ کنیز محنت مزدوری کر کے اپنی نصف قیمت اس شخص کو واپس کرے۔

باب العدہ

عورت کو طلاق کے ملنے یا بیوہ ہونے پر کچھ عرصہ کے لئے نکاح ثانی سے توقف کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک رشتہ کے ختم ہوتے ہی دوسرا رشتہ قائم کر لیا جائے تو اس سے ازدواجی رشتہ بے وقعت و بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ علاوہ بریں اس میں یہ مصلحت بھی کارفرما ہے کہ یہ امر واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے اور یہ معلوم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اگر رشتہ کے قطع ہونے یا شوہر کے مرنے کے فوراً بعد دوسرا نکاح کر لے گی تو حمل کے ظاہر ہونے کی صورت میں یہ پتا نہ چل سکے گا کہ یہ حمل پہلے شوہر سے ہے یا دوسرے شوہر سے۔ کیونکہ ابتدائے حمل میں حمل کا احساس نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو غیر یقینی طور پر۔ اس بنا پر جن عورتوں میں حمل کا امکان نہیں ہوتا جیسے صغیرہ یائسہ اور غیر مدخولہ' ان پر سے عدہ ساقط کر دیا گیا ہے اور وہ طلاق کے بعد جب چاہیں عقد ثانی کر سکتی ہیں۔ البتہ عدہ وفات ان پر بھی ہے۔ کیونکہ ازدواجی روابط میں تفریق کے باوجود شوہر کی موت کا صدمہ سب کو یکساں ہوتا ہے اور غم کے اثرات جب تک تازہ رہتے ہیں انسان فطرۃً خوشی کی کسی تقریب کو گوارا نہیں کرتا اور اسلام کا ہر قانون چونکہ فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے اس نے بیوہ کو سوگوارانہ طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے اور بے ضرورت گھر سے باہر نکلنے' زیور اور رنگین لباس پہننے اور زینت کرنے سے منع کیا ہے اور اس کی ایک حد بھی مقرر کر دی ہے تاکہ زندگی کے معمولات میں ناقابل برداشت عرصہ تک خلل رونما نہ ہو۔ اس مقررہ حد کا نام عدہ ہے جس میں مطلقہ ہو یا بیوہ عقد ثانی نہیں کر سکتی۔

اگر عورت طلاق یافتہ ہو تو اس کا عدہ تین طہر ہیں اس میں وہ طہر بھی شامل ہے جس میں طلاق واقع ہوئی ہو۔ قرآن مجید میں ہے۔

والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء۔ جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین طہروں تک اپنے کو نکاح سے روکیں۔

قروء قرء کی جمع ہے اس کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی طہر سے مراد دو حیضوں کا درمیانی عرصہ ہے اور آیت میں قرء سے مراد یہی پاکیزگی کے ایام ہیں چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انما القرء مابین الحفتین۔ (وسائل الشیعہ) قرء سے مراد دو حیضوں کا درمیانی عرصہ ہے۔

لہٰذا جب تیسرے طہر کے بعد خون حیض دیکھے گی تو اس کے ساتھ ہی مدت عدہ ختم ہو جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا رأت الدم من الحیضتہ الثالثتہ فقدا نقضت عدتھا۔ (وسائل الشیعہ)

جب عورت تیسرا خون حیض دیکھے گی تو اس کی مدت عدہ ختم ہو جائے گی۔

اگر مطلقہ حاملہ ہو تو مدت عدہ وضع حمل ہے۔ خواہ طلاق کے تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہو جائے وقت پر پیدا ہو یا قبل ازوقت گر جائے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اماالمطلقہ الحامل فاجلھا کما قال اللہ عزو جل ان تضع حملھا وکل شئی وضعتہ یستبین انہ حمل تم اولم یتم فقد انقضت بہ عدتھا۔(متدرک الوسائل)

مطلقہ حاملہ کی مدت عدہ فرمان الٰہی کے مطابق وضع حمل ہے اور وہ جو کچھ جنے اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ حمل تھا خواہ جو جنا ہے وہ تمام ہو یا ناتمام۔ اس کا عدہ ختم ہو جائے گا۔

اگر جڑواں بچوں کے ساتھ حاملہ ہو تو ایک بچے کی پیدائش سے عدہ ختم نہیں ہو گا بلکہ دوسرے بچے کے جننے پر تمام ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا تنقضی عدتھا الابالولد الاخیر منھما۔(متدرک الوسائل)

اس کا عدہ آخری بچے کی پیدائش پر تمام ہو گا۔

طلاق رجعی میں عورت عدہ کے ختم ہونے تک نان و نفقہ کی حقدار ہو گی اور اسی گھر میں ٹھہرے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المطلقہ لھاالسکنی والنفقتہ مادامت فی عدتھا کانت حاملا اوغیر حامل مادامت الزوج علیھا رجعتہ۔ (متدرک الوسائل)

عورت جب تک عدہ میں ہے اور شوہر رجوع کر سکتا ہے وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ اسے سکونت اور نفقہ کا حق ہے۔

اور عورت کے لئے بھی شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المطلقتہ لاتعتد الافی بیت زوجھا ولا تخرج منہ حتی یخلوا جلھا۔(متدرک الوسائل)

مطلقہ اپنے عدہ کے ایام شوہر کے گھر میں پورے کرے اور عدہ ختم ہونے سے پہلے گھر سے نہ نکلے۔

اگر عورت بیوہ ہو جائے تو مدت عدہ چار ماہ دس دن ہو گی۔ صغیرہ ہو یا یائسہ' مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اگر ایک عورت کا شوہر ہم بستر ہونے سے پہلے مرجائے تو عورت عقد ثانی کے لئے کتنا عرصہ توقف کرے۔ فرمایا۔

لا تنكح حتی تعتد باربعتہ اشهر و عشرہ ایام۔ (الفقیہ)

وہ جب تک چار ماہ دس دن تک عدہ نہ رکھے دوسرا نکاح نہ کرے۔

اگر بیوہ حاملہ ہو تو چار ماہ دس دن اور وضع حمل میں جو مدت طویل تر ہوگی وہ مدت عدہ قرار پائے گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

تعتد ابعد الا جلین ان وضعت قبل اربعتہ اشهر وعشر وان مضت لها اربعتہ اشهر وعشر قبل ان تضع تربصت حتی تضع۔(مستدرک الوسائل)

وہ بیوہ جو حاملہ ہو اسے چار ماہ دس دن اور وضع حمل میں جو مدت طویل تر ہو گی عدہ رکھنا ہوگا اگر چار ماہ دس دن سے پہلے وضع حمل ہو جائے تو وہ چار ماہ دس دن پورے کرے اور اگر چار ماہ دس دن گزر جائیں اور وضع حمل نہ ہو تو وضع حمل تک توقف کرے۔

قرآن مجید میں عدہ کی ان دونوں مدتوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ پہلی مدت عدہ کے بارے میں فرمان الٰہی ہے۔

والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسهن اربعتہ اشهر و عشرا۔

وہ لوگ جو بیویاں چھوڑ کر مر جائیں تو بیویاں چار مہینے دس دن تک اپنے کو روک کر رکھیں۔

اور دوسری مدت کے بارے میں ارشاد ہے۔

و اولات الاحمال اجلهن ان یضعن حملهن۔

حاملہ عورتوں کی مدت عدہ ان کے بچہ جننے تک ہے۔

ابن مسعود کا قول ہے کہ پہلی آیت منسوخ اور دوسری آیت ناسخ ہے اور بیوہ کی مدت عدہ صرف وضع حمل ہے۔ مگر امیرالمومنین علیہ السلام نے ان دو آیتوں کو جمع کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت طویل تر ہو گی وہی مدت عدہ ہو گی اور یہی قول مسلم و معتمد ہے۔

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں دوسری آیت کو مطلقہ عورتوں کے بارے میں قرار دیا ہے اس لئے کہ مطلقہ اگر حاملہ ہو تو اس کی مدت عدہ صرف وضع حمل ہے۔

عدہ طلاق کی ابتداء طلاق کے واقع ہونے سے ہوتی ہے۔ خواہ عورت کو اس کا علم ہو یا نہ ہو اور عدہ وفات کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب اسے شوہر کے مرنے کا علم ہو جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المطلقه تعتد من يوم طلقها زوجها والمتوفی عنها زوجها تعتد من يوم يبلغها الخبر۔(الفقیہ)

مطلقہ اس دن سے عدہ شروع کرے جس دن سے اسے طلاق ہوئی ہے اور بیوہ اس دن سے عدہ کی ابتداء کرے جس دن اسے شوہر کے مرنے کی اطلاع ملے۔

اگر کوئی عورت طلاق رجعی کے عدہ میں ہو اور اسی عدہ کے دوران اس کا شوہر فوت ہو جائے تو وہ عدہ طلاق کے بجائے عدہ وفات رکھے گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو پہلی یا دوسری طلاق دے دیتا ہے اور عورت کے عدہ کے دوران خود مرجاتا ہے اس عورت کو کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا۔

تعتد عدة المتوفی عنها زوجها اربعة اشهر و عشرا۔(مستدرک الوسائل)

وہ چار مہینے دس دن عدہ رکھے جو اس عورت کا عدہ ہے جس کا شوہر مرجائے۔

باب القضاء

شرعی احکام کے مطابق باہمی تنازعات و خصومات کے تصفیہ کا نام قضا ہے۔ اس کام کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ عدل و انصاف کا حصول حقوق عامہ کا تحفظ اور تمدنی نظم کا قیام اسی سے وابستہ ہے۔ لیکن جتنا یہ فریضہ اہم ہے اتنا ہی اپنی گوناگوں پیچیدگیوں کی وجہ سے کٹھن اور دشوار ہے اور اچھے اچھے ذی فہم صحیح نتیجہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں اور اگر پہنچ بھی جائیں تو مالی مفاد اور تعلقات و روابط کی فولادی دیواریں ان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اور انصاف و حق رسی کے بجائے تضیع حقوق پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ صرف وہی افراد اس سے عہدہ برآمد ہو سکتے ہیں جن کا قلب و ضمیر مادی آلائشوں سے پاک و صاف ہو اور احساس فرض کے پیش نظر اس منصب کی ذمہ داریوں کی تکمیل میں فرق نہ آنے دیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے قاضی شریح کو اس منصب اور اس منصب کی ذمہ داریوں کی طرف ملتفت کرتے ہوئے فرمایا۔

یا شریح قد جلست مجلسا لا یجلسه الا نبی او وصی نبی او شقی۔(واسائل الشیعہ)

اے شریح جس مسند پر تم بیٹھے ہو اس پر نبی یا وصی نبی بیٹھتا ہے یا وہ جو شقی و بدبخت ہوتا ہے۔

اس منصب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جو فیصلہ کرے پوری دیانت داری سے کرے اور بے جا رو رعایت، جنبہ داری اور خیانت و بے راہروی سے کنارہ کش رہے۔ حضرتؑ نے رفاعہ ابن شداد کو اہواز میں قاضی مقرر کیا تو انہیں ہدایات دیتے ہوئے تحریر فرمایا۔

ان هذه الاطسقه امانته فمن جعلها خیانته فعلیه لعنته الله الی یوم الاقیامه۔(مستدرک الوسائل)

یہ منصب ایک امانت ہے جو اس میں خیانت کا مرتکب ہوگا وہ قیامت تک اللہ کی لعنت کا مستحق قرار پائے گا۔

قضا کے سلسلہ میں رشوت لینے کا کوئی جواز نہیں ہے خواہ صحیح فیصلہ ہی کرنا ہو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ومن السحت الرشوه فی الحکم۔(مستدرک الوسائل)

فیصلہ کے سلسلہ میں رشوت حرام ہے۔

رشوت کبھی تحفہ و ہدیہ کے نام سے بھی پیش کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں سے جنہوں نے اس کے ہاں کوئی مرافعہ دائر کر رکھا ہو تحفہ و تحائف کے قبول کرنے کا بھی جواز نہیں ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ایاک و قبول التحف من الخصوم۔(مستدرک الوسائل)

داد خواہوں سے کوئی تحفہ قبول نہ کرو۔

جب تک دعوی و جواب دعوی سن کر معاملہ کی تہ تک نہ پہنچے فیصلہ نہ کرے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایدخل فی اعجاب یکتفی بادنی فهم دون اقصا۔ (مستدرک الوسائل)

اپنی معاملہ فہمی پر مغرور نہ ہو کہ تھوڑا بہت سمجھنے پر اکتفاء کر لے بلکہ اصل معاملہ کی پوری چھان بین کرے۔

غصہ اور اونگھ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے۔ حضرت[ع] فرماتے ہیں۔

لاتقض وانت غضبان ولا من النوم سکران۔ (مستدرک الوسائل)

غصہ کی حالت میں اور نیند کی مدہوشی میں فیصلہ نہ کرو۔

قضا کے سلسلے میں مشورہ و رائے نہ لے۔ اس لئے کہ دین کے احکام و ضوابط مشورہ کے محتاج نہیں ہیں اور نہ قیاس و رائے سے طے پاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت[ع] کا ارشاد ہے۔

لا تشاور فی القضاء فان المشورہ فی الحرب و مصالح العاجل والدین لیس بالرای انما ھوالاتباع۔ (مستدرک الوسائل)

قضا کے سلسلہ میں مشورہ نہ کرو اس لئے کہ مشورہ جنگ اور دنیوی مصالح کے سلسلہ میں ہوتا ہے اور دین رائے کے تابع نہیں ہے بلکہ (احکام شرع کے) اتباع کا نام ہے۔

فریقین میں سے ایک فریق کو اپنی توجہ کا مرکز قرار نہ دے بلکہ دونوں سے یکساں رویہ رکھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

من ابتلی بالقضاء فلیواس بینھم فی الاشارہ وفی النظر وفی المجلس۔(وسائل الشیعہ)

جس شخص پر قضا کا بار آپڑے اسے چاہئے کہ اشارہ نظر اور جائے نشست میں سب سے یکساں برتاؤ کرے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی ذات والاصفات میں صحیح علمی ذوق اور قوت فیصلہ کے امتزاج نے واقعات سے اخذ نتائج کا ملکہ بدرجۂ اتم پیدا کر دیا تھا اور آپ ان پیچیدہ گتھیوں کو جنہیں سلجھانے میں دوسرے عاجز و درماندہ ہو جاتے تھے اس طرح حل کر دیتے کہ اصل واقعہ کا ایک ایک گوشہ بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا۔ یہ حضرت[ع] کا وہ امتیازی وصف تھا جس میں کوئی آپ[ع] کا مثل و نظیر نہ تھا۔ چنانچہ اکابر صحابہ حل قضایا و فصل خصومات میں آپ[ع] سے رابطہ قائم کرتے اور آپ[ع] کے فیصلہ پر مطمئن ہو جاتے۔

حضرت علی علیہ السلام کی قوت فیصلہ اور مہارت قضا کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اعلم امتی بالسنتہ والقضاء بعدی علی ابن ابی طالب۔کفایتہ الطالب ص ۱۹۰)

میری امت میں میرے بعد سب سے بڑھ کر سنت و قضا کے جاننے والے علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

علی اقضانا۔(صواعق محرقہ ص ۱۳۶)

علی علیہ السلام ہم سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

ابن مسعود کہتے ہیں۔

کنانتحدث ان اقضی اهل المدینتہ علی۔(استیعاب ج ۳ ص ۴۱)

ہم یہ تذکرہ کیا کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں علی علیہ السلام سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

ابو سعید خدری اور قتادہ انصاری کہتے ہیں۔

اقضا هم علی۔(فتح الباری ج ۸ ص ۱۳۶)

سب لوگوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والے علی علیہ السلام ہیں۔

حضرتؑ کے سامنے جو قضایا پیش ہوتے آپ ان کا فیصلہ قرآن و سنت کی روشنی میں کرتے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ماوایت علیا قضی قضاء الا وجلت لہ اصلافی السنتہ۔(امالی مفید ح)

اصل و بنیاد سنت میں موجود پائی۔

حضرتؑ کا ہر فیصلہ چونکہ قرآن و سنت کی بنیاد پر ہوتا تھا اس لئے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا جس میں نہ رد و بدل کی گنجائش ہوتی تھی اور نہ ترمیم و تنسیخ کی۔ چنانچہ حضرتؑ خود فرماتے ہیں۔

لو اختصم الی رجلان فقضیت بینهما ثم مکثااحوالا کثیره ثم امتیانی فی ذلک الامر اقضیت بینهما قضاء واحد الان القضاء لا یحول ولا یزول ابدا۔(مستدرک الوسائل)

اگر میرے پاس دو شخص کوئی جھگڑا نمٹانے کے لئے آئیں اور میں کوئی فیصلہ کروں اور پھر ایک طویل مدت کے بعد دوبارہ اسی قضیہ کو لے کر آئیں تو میرا فیصلہ وہی ہو گا جو پہلے تھا کیونکہ فیصلہ میں نہ رد و بدل ہوتا ہے اور نہ حکم کبھی برطرف ہوتا ہے۔

فصل خصومات کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا طریق کار یہ تھا کہ اگر ایک چیز کی ملکیت کے دو دعویدار ہوتے اور دونوں کا قبضہ ہوتا یا ان میں سے کسی ایک کا قبضہ نہ ہوتا تو دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیتے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعویٰ کیا اور دونوں نے اپنی ملکیت کے گواہ پیش کئے۔ حضرتؑ نے دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیا۔

اگر دو دعویداروں میں سے ایک کا قبضہ ہوتا تو قبضہ کو دلیل ملکیت قرار دے کر اس کے حق میں فیصلہ فرماتے۔ چنانچہ دو شخصوں نے ایک چوپایہ کے بارے میں دعوی کیا اور دونوں نے اپنی اپنی ملکیت کے گواہ پیش کئے۔ حضرت نے اس شخص کے حق میں فیصلہ کیا جس کا قبضہ تھا اور فرمایا کہ اگر اس کا قبضہ نہ ہوتا تو میں ان دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیتا۔

اگر دونوں کے پاس برابر کے گواہ ہوتے تو ان دونوں سے دوسرے حق کی نفی کے سلسلہ میں قسم بھی لیتے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے ایک چوپایہ کی ملکیت کا دعویٰ کیا اور دونوں نے گواہ پیش کئے حضرت نے ان دونوں سے قسم کا مطالبہ کیا ان میں سے ایک نے قسم کھانے سے انکار کیا اور دوسرے نے قسم کھائی۔ آپ نے وہ چوپایہ قسم کھانے والے کے حوالے کر دیا۔

اگر دونوں گواہ پیش کرتے مگر ان کی تعداد میں فرق ہوتا تو ان کی کمی بیشی کے اعتبار سے فیصلہ کرتے۔ چنانچہ دو شخصوں نے ایک خچر کی ملکیت کا دعویٰ کیا ایک نے پانچ گواہ اور دوسرے نے دو گواہ ملکیت کے ثبوت میں پیش کئے۔ حضرتؑ نے پانچ گواہ پیش کرنے والے کو پانچ حصوں کا اور دو گواہ پیش کرنے والے کو دو حصوں کا مالک قرار دیا۔

اگر کوئی پیچیدہ صورت پیش آتی تو قرعہ سے کام لیتے۔ چنانچہ یمن میں ایک چھت کے بیٹھنے سے گھر کے افراد دب کر ہلاک ہو گئے مگر دو کمسن بچے زندہ بچ رہے۔ ان میں سے ایک آزاد تھا اور ایک غلام مگر آزاد اور غلام میں تمیز نہ ہو سکی۔ حضرتؑ کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا آپؑ نے قرعہ ڈالا اور ایک کو آزاد قرار دے کر وارث ٹھہرایا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔

باب الشہادہ

عدلیہ کے روبرو کسی واقعہ کو ثابت یا رد کرنے کے لئے جو بیان دیا جائے شہادت کہلاتا ہے تاکہ حاکم اس شہادت کی روشنی میں مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے یا کسی کا حق متاثر ہوتا ہو تو اس کی حق رسی کرے۔ لہٰذا اگر کسی واقعہ یا حق کا اثبات کسی کی شہادت پر منحصر ہو اور اسے گواہی کے لئے طلب کیا جائے تو اسے اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق گواہی دینا چاہیے اور اس سے پہلو تہی نہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

ولا یاب الشھداء اذاما دعوا۔ جب گواہ (گواہی کے لئے) طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔

اسلام میں گواہ کے لئے عادل اور صحیح العقیدہ ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی گواہی پر اعتماد کیا جا سکے اور کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے اگر وہ فاسد العقیدہ اور غیر عادل ہو گا تو اس کی گواہی قابل قبول نہ ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لایجوز شھادہ حروری ولا قدری ولا مرجئ ولا اموی ولا ناصب ولا فاسق۔(مستدرک الوسائل) خارجی، قدری، مرجی، اموی، ناصبی اور فاسق کی گواہی صحیح نہیں ہے۔

البتہ اگر فاسق صدق دل سے تائب ہو چکا ہو تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے ایک ایسے شخص نے گواہی دی جس کا ایک ہاتھ اور پیر چوری کے جرم میں کاٹا جا چکا تھا۔ حضرتؑ نے اس کی گواہی کو قابل قبول سمجھا کیونکہ وہ صدق دل سے توبہ کر چکا تھا اور لوگوں نے اس کی نیک چلنی کی تصدیق کی تھی۔

اگر گواہ غلام ہو مگر عادل ہو تو یہ غلامی گواہی کے قبول کرنے سے مانع نہ ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا باس فی شھادہ المملوک اذا کان عدلا۔(وسائل الشیعہ) غلام کی گواہی میں کوئی ہرج نہیں جبکہ وہ عادل ہو۔

ایک مرتبہ عبداللہ ابن قفل تمیمی کا گزر حضرتؑ کی طرف ہوا آپؑ نے اس کے پاس ایک زرہ دیکھی جو بصرہ میں مال غنیمت کے یکجا ہونے سے پہلے اس نے اٹھالی تھی۔ آپؑ نے بلا کر فرمایا کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے جس پر تم نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ عبداللہ نے کہا کہ یہ میری زرہ ہے اور آپ چاہیں تو قاضی شریح سے اس کا فیصلہ کرا لیں۔ حضرت نے قاضی شریح کو فیصلہ پر مامور کیا اور اس سے فرمایا کہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے جو مال غنیمت

میں خیانت کر کے حاصل کی گئی ہے۔ قاضی شریح نے ثبوت طلب کیا حضرت نے امام حسن علیہ السلام کو بطور گواہ پیش کیا۔ جنہوں نے شہادت دی کہ واقعا" یہ طلحہ کی زرہ ہے۔ شریح نے کہا کہ یہ ایک گواہی ہے اور ایک گواہی کافی نہیں ہے۔ حضرتؑ نے قنبر کو طلب کیا انہوں نے بھی گواہی دی کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے۔ شریح نے کہا کہ یہ غلام ہے اور غلام کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔ اب حضرتؑ کے تیور بدلے۔ چہرے پر غیض و غضب کے آثار ظاہر ہوئے اور شریح سے فرمایا کہ تم نے اس مقام پر تین غلطیاں کی ہیں۔ پہلی غلطی یہ کہ تم نے گواہ طلب کئے حالانکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر مال غنیمت میں کسی نے کچھ چوری چھپے اٹھا لیا ہو تو وہ بغیر گواہوں کی گواہی کے واپس لے لیا جائے گا۔ دوسری غلطی یہ کہ میں نے حسن علیہ السلام کو بطور گواہ پیش کیا اور تم نے یہ کہہ کر ان کی گواہی رد کر دی کہ وہ اکیلے گواہ ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے اور تیسری یہ کہ میں نے قنبر کو پیش کیا اور تم نے غلام ہونے کی بنا پر ان کی گواہی قبول نہ کی حالانکہ گواہ عادل ہو تو اس کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے۔ اور پھر یہ کہ زرہ تو ایک معمولی چیز ہے اور امام المسلمین پر بڑی سے بڑی چیز میں اعتماد و اطمینان کیا جا سکتا ہے۔اگر دو گواہوں کی گواہی میں اختلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا۔ اور اگر دونوں شہادتوں کا عنوان تو مختلف ہو مگر ان میں باہمی تلازم ہو تو وہ قابل قبول ہوں گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے سامنے قدامہ ابن مظعون کو پیش کیا گیا اور عمرو تمیمی اور معلی ابن جارود نے گواہی دی کہ اس نے شراب پی ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ حضرت عمر نے امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپؑ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جبکہ دونوں گواہوں کی گواہی مختلف ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ گواہی میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس نے شراب پی ہے جب ہی تو شراب کی قے کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا خصی کی شہادت قابل قبول ہے (عمرو تمیمی خصی تھا) فرمایا۔

ماذهاب انثيه الا كذهاب بعض اعضائه۔ (الفقیہ) خصیوں کا نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عضو بدن جاتا رہے۔

اگر دو گواہ کسی شخص کے بارے میں گواہی دیں کہ اس نے چوری کی ہے اور اس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور پھر ان گواہوں میں سے ایک گواہ منحرف ہو جائے اور یہ کہے کہ مجھے اشتباہ ہو گیا تھا تو اسے قطع ید کی آدھی دیت دینا ہو گی۔ چنانچہ دو آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں چوری کی گواہی دی جس پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ مجھے اشتباہ ہو گیا تھا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ ہاتھ کی آدھی دیت ادا کرے۔

اگر دونوں گواہ چوری کی گواہی دینے کے بعد یہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو وہ پوری دیت دیں گے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں چوری کی شہادت دی۔ حضرتؑ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا کچھ دنوں کے

بعد وہ ایک اور شخص کو لائے اور کہا کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا وہ چور نہ تھا جس کا ہاتھ کاٹا گیا تھا بلکہ یہ چور ہے۔ حضرت نے حکم دیا کہ وہ دونوں پہلے شخص کے قطع ید کی دیت دیں اور دوسرے شخص کے بارے میں ان کی گواہی رد کر دی۔

اگر کسی شخص کے بارے میں قتل یا زنا کی گواہی دی جائے اور اس کے نتیجہ میں اسے قتل یا سنگسار کر دیا جائے اور بعد میں گواہ یہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو ان پر قتل کی دیت عائد ہو گی اور اگر یہ کہیں کہ ہم نے عمداً غلط شہادت دی تھی تو وہ قتل کے سزا وار ہوں گے۔ چنانچہ چار آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں زنا کی گواہی دی اور اس شہادت کی بنا پر اسے سنگسار کر دیا گیا۔ بعد میں ایک گواہ منحرف ہو گیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے اشتباہ ہو گیا تھا تو وہ ایک چوتھائی دیت دے اور اگر دو گواہ یہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تو وہ نصف دیت دیں اور اگر تین گواہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو تین چوتھائی دیت دیں اور اگر چاروں گواہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو پوری دیت ادا کریں اور اگر یہ کہیں کہ ہم نے جھوٹی گواہی دی تھی تو وہ قتل کے سزاوار ہوں گے۔

اگر یہ اندیشہ ہو کہ گواہوں سے ایک دوسرے کے روبرو گواہی طلب کی گئی تو ایک کی گواہی دوسرے کی گواہی پر اثر انداز ہو گی تو اس صورت میں گواہوں سے الگ الگ گواہی لینا چاہیے۔ امیرالمومنین علیہ السلام ایسے موارد پر گواہوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے گواہی لیتے تاکہ ان کے اتفاق یا اختلاف سے اصل واقعہ کی صحت یا عدم صحت واضح ہو سکے۔ چنانچہ ایک شخص سفر میں تھا اور اس کے گھر میں بیوی اور ایک یتیم لڑکی تھی۔ اس کی بیوی کو یہ خیال ہوا کہ کہیں اس کا شوہر اس لڑکی سے عقد نہ کر لے اس نے نشہ آور چیز اس لڑکی کو پلائی اور اپنی چند ہمسائیوں کی مدد سے اس کی بکارت زائل کر دی جب اس کا شوہر سفر سے پلٹ کر آیا تو اسے بتایا کہ یہ لڑکی فعل بد کی مرتکب ہوئی ہے اور اپنی شریک کار ہمسائیوں سے بھی کہلوایا۔ اس شخص نے یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور یہ کہا کہ اس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی طرف رجوع کیا گیا آپ نے اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ تیرے پاس اس الزام کا کیا ثبوت ہے۔ اس نے اپنی ہمسائیوں کو گواہی کے لئے پیش کیا آپ نے انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ان میں سے ایک کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ اگر تو نے صحیح واقعہ نہ بتایا تو میری تلوار سے بچ نہ سکے گی۔ اس نے جان کی امان مانگی اور صحیح صحیح واقعہ بیان کر دیا۔ جب اس عورت کی فریب کاری ظاہر ہو گئی تو آپؑ نے اس عورت اور اس کی ہمسائیوں سے چار سو درہم اس لڑکی کو دلوائے اور اس شخص سے کہا کہ وہ اس عورت کو طلاق دے کر علیحدہ کر دے اور اس لڑکی کو اپنے عقد میں لے لے اور پھر فرمایا۔

اللہ اکبر انا اول من فرق بین الشھود الا دانیال النبی۔(وسائل الشیعہ)

اللہ بزرگ و برتر ہے میں حضرت دانیال علیہ السلام کے بعد وہ پہلا فرد ہوں جس نے گواہوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے گواہی کے لئے طلب کیا۔

باب الحدود

اصلاح معاشرہ اور انسداد جرائم کے لئے مجرموں کی سرکوبی از بس ضروری ہوتی ہے چنانچہ ہر حکومت جرائم کے سدباب اور امن و امان کی بحالی کے پیش نظر جرائم پیشہ لوگوں کو مختلف سزائیں دیتی ہے۔ اگر سزا کا اندیشہ نہ ہو تو نہ جرائم کی روک تھام ہو سکتی ہے اور نہ نظم و انضباط برقرار رہ سکتا ہے۔ اسلام جو افرادی اصلاح کے ساتھ پر امن معاشرہ کے قیام کا داعی ہے وہ قانون معاشرت کے تحفظ کے لئے مجرم کو سزا دینا ضروری سمجھتا ہے اور کسی جرم کو نظرانداز نہیں کرتا تاکہ کسی کو کھلے بندوں ارتکاب جرم کی جرأت نہ ہو سکے۔ ایک طبقہ کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام کی سزائیں انتہائی سخت ہیں۔ بیشک اسلام کی تجویز کردہ سزائیں اپنے اندر سختی لئے ہوئے ہیں لیکن جرائم کے انسداد کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا جبکہ یہ مشاہدہ ہے کہ معمولی سزائیں جرائم کی روک تھام میں ناکام ثابت ہو چکی ہیں اور سزاؤں کے باوجود جرائم بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ لہٰذا جرائم کے انسداد کے لئے یہی تدبیر کارگر ہو سکتی تھی کہ سخت سے سخت سزا تجویز کی جائے تاکہ سزا کی ہولناکی ارتکاب جرم سے مانع ہو۔

اسلام میں دو قسم کی سزائیں ہیں۔ ایک وہ جو شارع کی طرف سے متعین ہیں جیسے سو تازیانوں یا ہاتھ کاٹنے کی سزا۔ انہیں حدود سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری سزائیں وہ جو قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ وہ جرم کی سبکی و سنگینی اور مجرم کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے تجویز کرے چاہے اسے قید کرے چاہے جسمانی سزا دے یا ڈانٹ ڈپٹ کرکے چھوڑ دے انہیں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ حدود کے اجراء کے لئے ضروری ہے کہ مجرم کے خلاف شرعی شہادت قائم ہو یا وہ خود اقرار جرم کرے۔ اگر بینہ شہادت سے جرم ثابت ہو جائے تو پھر حد کے اجراء میں تاخیر روا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرتؐ کے پاس تین آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص زنا کا مرتکب ہوا ہے فرمایا کہ چوتھا گواہ کہاں ہے کہا کہ وہ ابھی آیا چاہتا ہے فرمایا۔

لیس فی الحدود نظرہ بساعۃ۔(وسائل الشیعہ) حدود کے سلسلہ میں ایک ساعت کا بھی انتظار نہیں کیا جا سکتا۔

یونہی سفارش کی بنا پر عفو و درگزر کا بھی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یشفعن احد فی حد اذا بلغ الامام فانہ لا یملکہ۔ (وسائل الشیعہ) جب معاملہ امام تک پہنچ جائے تو حد کے بارے میں کوئی شخص سفارش نہ کرے کیونکہ امام اس (کے رد و بدل) پر اختیار نہیں رکھتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ بنی اسد کا ایک آدمی کسی جرم میں ماخوذ ہوا اس کے قبیلہ کے کچھ لوگ حضرت حسین ابن

علی علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور کہا کہ آپؑ ہمارے آدمی کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام سے سفارش کریں مگر آپؑ نے انکار کر دیا اب وہ لوگ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ ہم اپنے آدمی کی سفارش کرنے کے لئے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ کہ جو چیز میرے بس میں ہو گی میں اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ وہ لوگ یہ سمجھ کر کہ ان کی سفارش مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ خوشی خوشی واپس پلٹے۔ واپسی پر امام حسین علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو ان سے کہا کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے ہماری سفارش قبول فرمالی ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ شاید اس عرصہ میں اس پر حد جاری ہو چکی ہو۔ یہ سن کر وہ لوگ دوبارہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے دیکھا کہ اس پر حد جاری کی جارہی ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ یاامیرالمومنینؑ کیا آپؑ نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جو چیز میرے اختیار میں ہو گی اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ فرمایا۔

قد وعد تکم ما املک وھذا شئی للہ لست املکہ۔ (مستدرک الوسائل)

میں نے تو اس چیز کے لئے وعدہ کیا تھا جس پر مجھے اختیار ہو گا اور ہر چیز صرف اللہ کے لئے ہے جس پر مجھے اختیار نہیں ہے۔

شرع نے جن جرائم کے ارتکاب پر مختلف حدود کے اجراء کا حکم دیا ہے۔ ان میں سے چند حدوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حد زنا:۔ زنا ایک ایسا عمل شنیع ہے جو ہر قوم و ملت میں انتہائی برا سمجھا جاتا ہے اور کوئی مذہب جو اخلاقی قدروں کا پاس رکھتا ہو اس کی اجازت نہیں دیتا اور اسلام میں اسے گناہائے کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

لا تقربو الزنا انہ کان فاحشتہ وساء سبیلا۔

زنا کے قریب نہ جاؤ یہ سراسر بے حیائی اور بد چلنی ہے۔

زنا کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ تعداد پوری ہو جائے تو اسے سو کوڑوں یا رجم کی سزا دی جائے گی۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یرجم رجل ولا مراۃ حتی یشھد علیہ اربعتہ شھد و علی الا یلاج والاخراج۔(وسائل الشیعہ)

کسی مرد یا عورت کو اس وقت تک سنگسار نہیں کیا جائے گا جب تک چار گواہ وقوع فعل کی عینی شہادت نہ دیں۔

اگر گواہ نہ ہوں اور وہ خود چار مرتبہ اس فعل کے ارتکاب کا اقرار کرے تو اس صورت میں بھی اسے

کوڑوں یا رجم کی سزا دی جائے گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

اذا اقر الرجل علی نفسہ بالزنا اربع مرات و کان محصنا رجم۔(مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص چار مرتبہ زنا کا اقرار کرے اور بیوی رکھتا ہو تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔

ایک شخص امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یا امیرالمومنینؑ میں فعل زنا کا مرتکب ہوا ہوں مجھے شرعی سزا دے کر پاک کر دیجئے۔ حضرتؑ نے فرمایا کیا تمہارا ذہنی توازن درست ہے۔ کہا ہاں فرمایا کیا قرآن کی تلاوت کر سکتے ہو کہا ہاں فرمایا کس قبیلہ سے ہو کہا قبیلہ جہنہ سے فرمایا تم اس وقت جاؤ میں لوگوں سے تمہارے بارے میں دریافت کروں گا۔ حضرتؑ نے اس کے بارے میں لوگوں سے دریافت کیا تو بتایا گیا کہ وہ صحیح العقل اور مسلمان ہے۔ جب وہ دوبارہ آیا اور اقرار زنا کے بعد اجرائے حد کی خواہش کی تو آپ نے پوچھا کیا تم بیوی رکھتے ہو کہا ہاں فرمایا کیا تم اس تک پہنچ سکتے تھے یا وہ کسی دور و دراز جگہ پر تھی۔ کہا کہ وہ گھر میں موجود تھی فرمایا جاؤ ہم تمہارے بارے میں مناسب فیصلہ کریں گے۔ جب وہ تیسری مرتبہ آیا اور مثل سابق اقرار کیا تو حضرتؑ نے پھر اسے واپس جانے کے لئے کہا آخر چوتھی مرتبہ حاضر ہوا اور زنا کا اعتراف کیا۔ جب حضرتؑ نے دیکھا کہ یہ چار مرتبہ اقرار کر چکا ہے۔ جس کے بعد حد کا اجراء ضروری ہو گیا ہے تو آپؑ نے اسے زیر حراست رکھنے کا حکم دیا اور اعلان فرمایا کہ کل اس پر حد شرعی جاری ہو گی جو آنا چاہے وہ آئے اور گھر سے اس طرح نکلے کہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ دوسرے دن امیرالمومنین علیہ السلام منہ اندھیرے گھر سے نکلے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور ایک گڑھا کھود کر اس میں اسے کھڑا کیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے لوگو یہ اللہ کا حق ہے اس کام کے لئے وہ آگے بڑھے جس کے ذمہ خود اس حق کا مطالبہ نہ ہو۔ کیونکہ جس پر خود حد عائد ہوتی ہو اسے حد جاری کرنے میں حصہ نہ لینا چاہیئے۔ یہ سن کر کچھ لوگ پلٹ گئے اور کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ حضرتؑ نے چار مرتبہ تکبیر کی آواز بلند کرنے کے بعد پتھر پھینکا پھر حسن اور حسین علیہما السلام نے پتھر پھینکے۔ جب اس نے دم توڑ دیا تو حضرت نے اسے گڑھے سے باہر نکالا' نماز جنازہ پڑھی اور اسے دفن کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اسے غسل نہیں دیا فرمایا کہ اس کا غسل یہی تھا جس نے اسے ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد حضرتؑ نے فرمایا۔

من اتی من القاذورہ فلیتب الی اللہ تعالی فیما بینہ و بین اللہ فواللہ توبتہ الی اللہ فی السر افضل من ان یفضح نفسہ و یھتک سترہ۔(تفسیر برہان)

جو شخص کسی فعل قبیح کا مرتکب ہو تو وہ اس معاملہ میں جو اس کے اور اللہ کے مابین ہے اللہ تعالی کی بارگاہ میں توبہ کرے خدا کی قسم درپردہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ رسوائی مول لے اور اپنا پردہ چاک کرے۔

اسی طرح ایک عورت نے حضرت کے سامنے زنا کا اقرار کیا جب اقرار کی تکمیل ہو گئی تو آپ نے اعلان

فرمایا کہ کل اس عورت پر حد جاری کی جائے گی اور جو آنا چاہیں وہ آئیں۔دوسرے دن امیرالمومنین علیہ السلام اس عورت کو لے کر نکلے اور دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے جب اجراء حد کا وقت آیا تو آپ خچر پر سوار ہوئے اور باواز بلند فرمایا کہ اے لوگو اللہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد لیا اور انہوں نے مجھ سے عہد و پیمان لیا کہ وہی شخص حد جاری کرے جو خود حد کا سزاوار نہ ہو۔ لہٰذا تم میں سے جو فعل زنا کا مرتکب ہوا ہو وہ حد کے اجراء میں حصہ نہ لے یہ سنتے ہی اکثر لوگ پلٹ گئے اور امیرالمومنین علیہ السلام' امام حسن اور امام حسین علیہم السلام نے حد جاری کی۔ فعل زنا کے محرکات کہیں قوی ہوتے ہیں کہیں کمزور کہیں شہوانی قوت کی تسکین کا سامان ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا۔ کہیں فریق ثانی کی رضامندی ہوتی ہے اور کہیں جبر کار فرما ہوتا ہے کہیں یہ جرم مجرم کی ذات تک محدود رہتا ہے اور کہیں اس سے معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ ان مختلف صور و حالات کے پیش نظر اسلام نے جرم کی نوعیت یکساں ہونے کے باوجود مرتکبین جرم کو ایک سطح پر نہیں رکھا بلکہ کہیں نرم، کہیں سنگین اور کہیں سنگین تر سزائیں تجویز کی ہیں۔ان سزاؤں کی صورت یہ ہے کہ۔

اگر ایسا مرد جو بیوی رکھتا ہو یا ایسی عورت جو بیاہی ہوئی ہو زنا کا ارتکاب کریں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

یرجم المحصن والمحصنۃ۔(مستدرک الوسائل)

شادی شدہ مرد اور بیاہی ہوئی عورت کو سنگسار کیا جائے گا۔

اور اگر وہ بڑھاپے کے حدود میں قدم رکھ چکے ہوں تو انہیں سنگسار کرنے سے پہلے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا زنی الشیخ والشیخۃ جلد کل واحد منھما و علیھما الرجم۔(مستدرک الوسائل)

جب سن رسیدہ مرد اور سن رسیدہ عورت زنا کا ارتکاب کریں تو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور پھر سنگسار کیا جائے گا۔

اگر بن بیاہا ہو تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ چنانچہ حضرتؑ سے بن بیاہے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

جلد مائۃ لقول اللہ عز وجل الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ۔(مستدرک الوسائل)

اسے فرمان باری "بدکار مرد اور بدکار عورت ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ" کے مطابق سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

اگر شادی شدہ ہو مگر ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لئے شہربدر کردیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

علی البکر جلد مائۃ ونفی سنتہ فی غیر مصرہ۔ (مستدرک الوسائل)

وہ بیاہا ہوا جس نے ابھی مقاربت نہ کی ہو اسے سو کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔

چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جو زنا کا اقرار کرتا تھا۔ حضرتؑ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم شادی شدہ ہو اس نے کہا کہ ہاں فرمایا کہ پھر تمہیں سنگسار کیا جائے گا ابھی اسے سنگسار نہ کیا گیا تھا کہ ایک شخص نے کہا کہ یا امیرالمومنین اس کا عقد تو ہو چکا ہے مگر ابھی مقاربت نہیں کی۔ فرمایا کہ اس صورت میں اسے رجم کے بجائے سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص قید خانہ میں ہو یا گھر سے دور ایسی جگہ پر ہو جہاں سے بیوی تک نہ پہنچ سکتا ہو تو اسے سنگسار کرنے کے بجائے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ چنانچہ ایک شخص قید و بند میں تھا اور بیوی تک نہ پہنچ سکتا تھا اس نے قید خانہ میں زنا کا ارتکاب کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا بلکہ سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

ایک مرد یمنی مدینہ میں زنا کا مرتکب ہوا۔ حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنا چاہا حضرتؑ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ یہاں مدینہ میں ہے اور اس کی بیوی دوسرے شہر میں ہے اسے سو کوڑے لگائے جائیں۔

ایک شخص کی بیوی بصرہ میں تھی اور وہ کوفہ میں زنا کا مرتکب ہوا۔ حضرتؑ نے اسے سنگسار کرنے کے بجائے سو کوڑے لگوائے۔

اگر کوئی شخص بیٹی، بہن وغیرہ سے زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من اتی ذات محرم قتل۔ (مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص محرم کے ساتھ زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص سوتیلی ماں کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو۔ اسے سنگسار کیا جائے گا خواہ بیوی رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جو اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوا تھا۔ حضرتؑ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے زبردستی زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

من کابر امراۃ علی نفسھا فوطئھا غصبا قتل۔
(مستدرک الوسائل)

جو شخص کسی عورت کو بے دست و پا کر کے اس سے بدکاری کرے اسے قتل کیا جائے گا۔

جو عورت زنا پر مجبور کر دی گئی ہو اس پر سے حد ساقط ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

جو شخص کسی عورت کو بے دست و پا کر کے اس سے بدکاری کرے اسے قتل کیا جائے گا۔

لیس علی المستکرحت حد ذا قالت انی اسلکرحت
(مستدرک الوسائل)

جو عورت مجبور و بے بس کر دی گئی ہو اور مجبوری کا اظہار کرے اس پر حد نہیں ہے۔

چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک مرد اور عورت کو لایا گیا جو زنا کرتے دیکھے گئے تھے۔ حضرتؑ کے دریافت کرنے پر اس عورت نے کہا کہ یا امیرالمومنین میں رضا مندی سے اس فعل پر آمادہ نہیں ہوئی بلکہ مجھے مجبور کر دیا گیا۔ حضرتؑ نے اس پر حد جاری نہ کی اور اسے چھوڑ دیا۔

اگر کوئی کافر ذمی کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر کے سامنے پانچ آدمی پیش کئے گئے جو زنا میں ماخوذ تھے۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ ان پانچوں پر حد زنا جاری کی جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام وہاں موجود تھے۔ آپؑ نے فرمایا کہ ان سب کا حکم یکساں نہیں ہے حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر آپؑ ہی ان کی سزا تجویز کریں۔ آپؑ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو قتل اور ایک کو سنگسار کیا جائے ایک کو سو کوڑے اور ایک کو پچاس کوڑے مارے جائیں اور پانچویں کو تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے۔ اس پر حضرت عمر متعجب ہوئے اور دوسرے لوگوں کو بھی حیرت ہوئی کہ ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں کیوں؟ حضرت عمر نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ پہلا مجرم کافر ذمی ہے اس نے ایک مسلمان عورت سے زنا کیا جس کی وجہ سے وہ ذمی ہونے سے خارج ہو گیا۔ لہٰذا اسے قتل کی سزا دی جائے گی، دوسرا شخص بیوی رکھتا ہے اس لئے اسے سنگسار کیا جائے گا، تیسرا بیوی نہیں رکھتا اس لئے اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے، چوتھا غلام ہے اس لئے اسے نصف سزا دی جائے گی اور پانچواں مخبوط الحواس ہے اس لئے اسے تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔

اگر کوئی حالت دیوانگی میں زنا کا مرتکب ہو تو اس پر نہ حد جاری ہو گی اور نہ اسے سنگسار کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک دیوانی عورت جو زنا میں ماخوذ تھی حضرت عمر کے پاس لائی گئی۔ جب شہادت سے زنا ثابت ہو گیا تو حضرت عمر نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ امیرالمومنین نے اسے کچھ لوگوں کے حصار میں جاتے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے اور واقعہ کیا ہے۔ بتایا کہ یہ فلاں قبیلہ کی دیوانی عورت ہے جسے حضرت عمر نے کوڑے لگانے کا حکم دیا ہے۔ حضرت نے

فرمایا کہ اسے واپس لے جاؤ اور عمر سے کہو کہ۔

اما علمت ان هذه مجنونة آل فلان وقال النبی رفع القلم عن المجنون حتی یفیق۔(وسائل الشیعہ)

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ فلاں قبیلہ کی دیوانی عورت ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دیوانہ مرفوع القلم ہے یہاں تک کہ دیوانگی زائل ہو۔

اگر عورت حاملہ ہو تو جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شوہر دار عورت نے اپنے کو بے شوہر کا ظاہر کر کے ایک دوسرے قبیلہ میں نکاح کر لیا جب اس کا انکشاف ہوا تو حضرتؑ نے فرمایا کہ جب وہ بچہ جن لے تو اسے سنگسار کیا جائے۔

حضرت عمر کے پاس ایک حاملہ عورت کو لایا گیا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی انہوں نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔امیرالمومنین علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپؑ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ عورت تو اپنے جرم کی وجہ سے سزا کی مستحق ہے مگر اس بچے کا کیا قصور ہے جو اس کے شکم میں ہے جب اس کے بچہ پیدا ہو جائے اس وقت اسے سنگسار کیا جائے۔

اگر کوئی عورت زنا سے حاملہ ہو کر بچہ جنے اور پھر اسے مار ڈالے تو اسے دوہرے جرم کی وجہ سے دوہری سزا دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے ایسی عورت کو پیش کیا گیا جس نے زنا کے ارتکاب کے بعد بچے کو مار ڈالا تھا آپؑ نے فرمایا کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں اور پھر سنگسار کر دیا جائے۔

اگر کوئی شوہر دار عورت نابالغ بچے سے زنا کرائے اس بچے کو تعزیر کی جائے گی اور عورت کو رجم کی بجائے سو کوڑے لگائے جائیں گے چنانچہ ایک شوہر دار عورت کو جو ایک نابالغ بچے سے بدکاری کی مرتکب ہوئی تھی حضرت عمر کے پاس لایا گیا انہوں نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر حد جاری ہو گی اس لئے کہ جس بچے سے یہ مرتکب زنا ہوئی ہے وہ ابھی بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا۔

اگر غلام زنا کا مرتکب ہو تو اسے ہر صورت میں پچاس کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام راوی ہیں کہ۔

قضی امیرالمومنین فی العبید اذا زنی احدھم ان یجلد خمسین جلدہ و ان کان مسلما او کافر اونصرانیا ولا یرجم ولا ینفی۔(وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے غلاموں کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی زنا کا مرتکب ہو تو اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں خواہ مسلمان ہو یا کافر یا نصرانی اسے نہ سنگسار کیا جائے گا اور نہ شہر بدر کیا جائے گا۔

اگر ایسا شخص زنا کرے جس کا کچھ حصہ آزاد ہو چکا ہو اور کچھ حصہ غلام ہو تو آزاد حصہ کے بقدر اس پر پوری حد اور غلام حصہ کے بقدر نصف حد جاری کی جائی گی مثلاً" نصف آزاد ہو اور نصف غلام تو آزاد حصہ کے حساب سے پچاس کوڑے اور غلام حصہ کے حساب سے پچیس کوڑے لگائے جائیں گے۔

حضرت عثمان کے دور میں ایک کنیز جو تین چوتھائی آزاد ہو چکی تھی زنا کی مرتکب ہوئی۔ حضرت عثمان نے اس کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا آپ نے فرمایا کہ اسے تین چوتھائی آزادی کے حساب سے اور ایک چوتھائی غلامی کے حساب سے سزا دی جائے گی۔ زید بن ثابت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اسے صرف غلامی کے حساب سے سزا ملنا چاہئے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ چار حصوں میں سے تین حصے آزاد ہو چکے ہیں اور صرف ایک حصہ غلامی میں ہے۔ کہا کہ پھر اسے میراث بھی آزادی کے بقدر ملنا چاہئے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے اور اسے میراث بھی آزادی کے بقدر ملے گی۔ شیخ مفید رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

خلاف عثمان امیرالمومنین وصار الی قول زید ولم یصغ الی عاقال بعد ظھور الحجتہ علیہ۔(ارشاد ص ۱۰۰)

عثمان نے امیرالمومنین علیہ السلام کے قول کی مخالفت کرتے ہوئے زید کے قول پر عمل کیا اور حضرت کی بات پر کان نہ دھرا حالانکہ ان پر دلیل و حجت واضح ہو چکی تھی۔

اگر وقوع زنا میں شبہ کی گنجائش ہو تو شک کا فائدہ مجرم کو دیتے ہوئے حد جاری نہیں کی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ادرؤا الحدود بالشبھات۔(وسائل الشیعہ)

شک و شبہ کی صورت میں حدود ساقط کر دو۔

چنانچہ ایک مرد اور عورت کو زنا کا ارتکاب کرتے دیکھا گیا اور انہیں حضرتؑ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؑ نے اس مرد سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ میری بیوی ہے اور اس عورت سے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ کچھ لوگوں نے اس عورت سے کہا کہ ہاں کہہ دو اور کچھ لوگوں نے کہا کہ انکار کر دو۔ اس عورت نے کہا کہ ہاں یہ میرا

شوہر ہے۔ حضرتؑ نے اس احتمال کی بنا پر کہ شاید یہ اس کی بیوی ہو حد ساقط کر دی اور اس مرد سے کہا کہ جب تک تم نکاح کا ثبوت پیش نہ کرو گے یہ عورت تم سے علیحدہ رکھی جائے گی۔

حد قذف :۔ کسی بالغ و عاقل مسلمان پر زنا یا لواطت کی تہمت لگانا یا اسے ولدالزنا کہنا قذف کہلاتا ہے۔اسلام نے جس طرح مسلمان کے مال و جان کا تحفظ کیا ہے اسی طرح اس کی عزت و آبرو کا بھی نگہبان ہے وہ شہادت کے علاوہ جبکہ نصاب شہادت مکمل ہو قطعاً" اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کی عصیاں کاری کا پردہ چاک کرکے یا کسی پر بہتان تراشی کرکے اسے معاشرہ میں رسوا و بدنام کیا جائے۔اس رسوائی پر یہ اثر بھی مرتب ہوتا ہے کہ انسان گناہ کے ارتکاب میں جسور و بیباک ہو جاتا ہے اور اگر گناہ ڈھکا چھپا رہتا ہے تو اپنے معاشرتی وقار کو بحال رکھنے کے لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلام نے اس جرم کی سنگینی کے پیش نظر جب دو گواہوں کی گواہی یا اقرار سے قذف ثابت ہو جائے تو اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان الفریۃ ثلث اذا رمی الرجل بالزنا و اذا قال ان امہ زانیۃ واذا دعی لغیرابیہ فذلک فیہ حد ثمانون۔(وسائل الشیعہ)

بہتان تراشی تین طرح کی ہوتی ہے ایک یہ کہ کسی کو زناکار کہے یا یہ کہے کہ اس کی ماں زانیہ ہے یا باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کرے اس کی سزا اسی کوڑے ہے۔

قذف کی یہ سزا آزاد ہو یا غلام مرد ہو یا عورت سب کے لئے یکساں ہے۔ چنانچہ ایک عورت نے اپنی سوت کو غلط کار ثابت کرنے کے لئے اس کے بستر پر انڈے کی سفیدی ڈال دی اور اپنے شوہر سے کہا کہ ایک اجنبی مرد اس کے ہاں شب باش ہوا ہے۔ اس کے بستر کا جائزہ لو جب اس نے بستر پر نظر کی تو اسے سفیدی نظر آئی جس سے اسے اپنی بیوی کے بے راہ ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس نے حضرت عمر سے اس کا ذکر کیا انہوں نے اسے سزا دینے کا حکم دیا امیرالمومنین کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس بستر کو دیکھنا چاہا جب بستر پر نظرڈالی تو فرمایا کہ اس پر کھولتا ہوا گرم پانی ڈالو جب پانی ڈالا گیا تو سفیدی پھول کر ابھر آئی فرمایا کہ اس نے اپنی سوت کو متہم کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ لہٰذا اسے الزام تراشی کی سزا دی جائے۔ چنانچہ اس پر حد قذف جاری کی گئی۔

اگر کوئی نابالغ لڑکے یا لڑکی یا دیوانے پر تہمت لگائے تو اس پر حد جاری کرنے کے بجائے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لاحد لمن لاحد له ولکن القاذف اثم۔(مستدرک الوسائل)

جس پر خود حد جاری نہ ہوتی ہو اس پر تہمت لگانے سے بھی حد جاری نہ ہو گی البتہ تہمت لگانے والا گنہگار ہے۔

اگر باپ' بیٹے پر تہمت لگائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی اور اگر بیٹا' باپ پر تہمت باندھے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یحد الولد ولا یحد الوالد اذا قذف الولد۔(مستدرک الوسائل)

بیٹے پر حد جاری ہو گی اور باپ پر حد نہ ہو گی جب وہ بیٹے پر تہمت لگائے۔

اگر کوئی شخص متعدد آدمیوں پر اجتماعی طور پر تہمت لگائے تو اس پر ایک ہی حد جاری ہو گی۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

قضی امیرالمومنین فی رجل افتری علی نفر جمیعا فجلده حدا واحدا۔(وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس شخص پر جس نے ایک جماعت پر تہمت لگائی تھی ایک ہی حد کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کوئی عورت یہ کہے کہ فلاں آدمی مجھ سے زنا کا مرتکب ہوا ہے تو وہ دوہری سزا کی مستحق ہو گی ایک سزا اقرار زنا کی بنا پر اور دوسری قذف کی بنا پر۔ چنانچہ حضرتؑ سے ایک ایسی ہی عورت کے بارے میں پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا۔

حد د نا ها حد ین حد بفریتها علی المسلم وحد باقرارها علی نفسها۔(مستدرک الوسائل)

ہم اس پر دو حدیں جاری کریں گے ایک مرد مسلم پر افتراء باندھنے کی اور دوسرے اقرار زنا کی۔

ایک شخص نے اپنی بیوی کو زانیہ کہا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ تو مجھ سے زیادہ زنا کار ہے۔ یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش ہوا انہوں نے حکم دیا کہ دونوں کو قذف کی پاداش میں کوڑے لگائے جائیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ حکم سنا تو فرمایا کہ جلدی نہ کی جائے اس عورت پر ایک کے بجائے دو حدیں جاری ہوں گی۔ ایک حد اس بات کی کہ اس نے مرد کو یہ کہہ کر کہ تو مجھ سے زیادہ زناکار ہے اس پر زنا کی تہمت لگائی ہے اور دوسری حد اس امر کی کہ اس نے اپنے زنا کا اقرار کیا ہے۔ اس اقرار کی بنا پر مرد پر سے حد ساقط ہو جائے گی اور عورت کو بھی زنا کی پوری سزا نہیں دی جائے بلکہ تعزیر پر اکتفاء کی جائے گی(یہ اس لئے کہ زنا کی حد کے لئے چار

مرتبہ اقرار ضروری ہے اور اس نے ایک ہی مرتبہ اقرار کیا تھا)

اگر کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر اس کی تردید کر دے تو اس پر سے حد ساقط نہیں ہو گی۔ چنانچہ ایک عورت نے اپنے شوہر کو حضرتؑ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس نے میری کنیز سے زنا کیا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ میں نے اس کنیز سے مقاربت کی ہے مگر اس نے وہ کنیز مجھے ہبہ کر دی تھی۔ حضرتؑ نے اس سے ہبہ کا ثبوت طلب کیا۔ وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا تو حضرتؑ نے اسے سزا دینے کا حکم دیا۔ جب اس عورت نے یہ دیکھا کہ اس کا شوہر سزا سے بچ نہیں سکتا تو اس نے ہبہ کا اعتراف کیا۔ حضرتؑ نے حکم دیا کہ اس عورت پر حد قذف جاری کی جائے۔

اگر دو آدمی ایک دوسرے پر تہمت لگائیں تو ان پر سے حد ساقط ہو گی البتہ انہیں تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے پاس دو آدمیوں کو لایا گیا جنہوں نے ایک دوسرے پر زنا کی تہمت لگائی تھی۔ آپؑ نے ان پر حد جاری کرنے کے بجائے انہیں تعزیر کر کے چھوڑ دیا۔

اگر کوئی شخص حد قذف جاری ہونے کے بعد یہ کہے کہ میں نے وہی بات کہی تھی جو صحیح تھی تو اس پر دوبارہ حد جاری نہیں کی جائیگی۔ چنانچہ حضرت عمر کے دور کا واقعہ ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ جو ان کی طرف سے حاکم بصرہ تھا قبیلہ بنی ہلال کی ایک عورت ام جمیل بنت محجن کے ہاں اکثر آتا جاتا تھا۔ ایک دن ابو بکرہ نے اسے جاتے دیکھا تو پوچھا کہ تم اکیلے کہاں جا رہے ہو کہا کہ میں اپنے بعض دوستوں کی ملاقات کے لئے جا رہا ہوں۔ کہا کہ دوستوں کو تمہارے پاس آنا چاہئے نہ یہ کہ تم ان کے ہاں جاؤ۔ ابو بکر کے دل میں شک گزرا اور اس نے مغیرہ کا تعاقب کیا۔ مغیرہ گرد و پیش سے بے خبر ام جمیل کے گھر میں داخل ہوا۔ ابو بکرہ نے یہ دیکھا تو وہ ساتھ والے مکان کی چھت پر چڑھا اور ام جمیل کے مکان کی طرف نظر دوڑائی دیکھا کہ وہ مغیرہ کے پہلو میں بیٹھی ہے وہ وہاں سے اٹھا اور شبل ابن معبد نافع ابن حارث اور زیاد ابن سمیہ کو اپنے ہمراہ لے کر اسی جگہ پر آیا ان چاروں نے جھانک کر دیکھا تو دونوں کو ناگفتہ حالت میں پایا۔ اس واقعہ کے بعد ابو بکرہ مدینہ آیا اور حضرت عمر سے کہا کہ مغیرہ زنا کار ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ کیا تم نے اسے زنا کرتے دیکھا ہے کہا کہ ہاں اور میرے ساتھ شبل نافع اور زیاد نے بھی دیکھا ہے۔ حضرت عمر نے مغیرہ اور ان تینوں آدمیوں کو مدینہ طلب کیا۔ سب سے پہلے ابو بکرہ نے گواہی دی اور پھر نافع اور شبل نے شہادت دی۔ آخر میں زیاد ابن سمیہ گواہی کے لئے کھڑا ہوا۔ حضرت عمر نے دیکھا کہ اگر اس نے بھی پہلے گواہوں کی طرح عینی شہادت دی تو مغیرہ رجم سے بچ نہ سکے گا۔ انہوں نے زیاد سے مخاطب ہو کر کہا۔

والله انی لاری وجھا خلیقا ان لایخزی علیہ الیوم رجل من اصحاب محمد۔(انساب الاشراف ج ۱ ص ۴۹۱)

خدا کی قسم میں ایک ایسا چہرہ دیکھ رہا ہوں جو اس لائق ہے کہ ایک صحابی رسول کی رسوائی کا باعث نہیں ہو گا۔

حضرت عمر کے ان الفاظ سے زیاد سمجھ گیا کہ گواہی کیسی ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے ان دونوں کو یکجا دیکھا سانسوں کی آوازیں بھی سنیں مگر جو خصوصی کیفیت سابقہ گواہوں نے بیان کی ہے میں نے نہیں دیکھی۔ اس بیان سے مقدمہ کا رخ پلٹ گیا۔ مغیرہ کی بن آئی وہ تلوار لے کر ابو بکرہ اور پہلے دونوں گواہوں پر جھپٹا۔ حضرت عمر نے اسے روک دیا اور تینوں گواہوں کو اسی اسی درے لگوائے۔ جب درے لگوا چکے تو ان سے توبہ کے لئے کہا دو نے تو توبہ کر لی مگر ابوبکرہ نے کہا کہ میں کبھی سچی بات کو جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ حضرت عمر نے چاہا کہ اسے پھر کوڑے لگوائیں۔ حضرت علی علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر ابوبکرہ کو دوبارہ کوڑے لگائے گئے تو ہم مغیرہ کو رجم کریں گے۔ مقصد یہ تھا کہ گواہی تو ہو چکی جس پر اسے سزا دی گئی ہے۔ اگر ان الفاظ کو بھی گواہی کا درجہ دے دیا گیا تو چار شہادتیں مکمل ہو جائیں گی اور مغیرہ رجم کا سزاوار ہو گا اور اگر یہ صرف پہلی شہادت کی صحت کا اظہار ہے تو اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی شخص کسی سے بدزبانی کرے اور اسے گدھا' خنزیر' فاسق' فاجر خبیث ایسے الفاظ کہے تو اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ففی ھذا کلہ ادب لایبلغ بہ الحد۔(مستدرک الوسائل)

ایسے الفاظ پر تعزیر کی جائے گی جو حد کی سزا سے کم ہو گی۔

حد شراب نوشی:۔ شراب نوشی وہ مذموم عادت ہے جو دوسری قبیح عادتوں اور مہلک بیماریوں کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور کیا جسمانی اور کیا اخلاقی ہر اعتبار سے تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ ایکطرف شراب خوار اپنی صحت و توانائی کو مینا و جام کی نذر کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے مسمی ذرات پہلے خون میں سرایت کرتے ہیں اور پھر تمام جسم میں پھیل کر رعشہ' فالج' دماغی' اختلال' تشنج اور دوسرے اعصابی امراض کی تولید کا باعث ہوتے ہیں اور دوسری طرف اخلاقی اعتبار سے اتنا گر جاتا ہے کہ شرم و حیا' عزت و آبرو اور غیرت و ناموس کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور ایسے ناشائستہ افعال کر گزرتا ہے جو عادی زندگی میں اس سے سرزد نہ ہوتے کیونکہ افعال قبیحہ سے مانع عقل اور اخلاقی وجدان ہوتا ہے اور نشہ و بدمستی میں نہ عقل کام کرتی ہے اور نہ اخلاقی وجدان ساتھ دیتا ہے اس لئے بے جھجک نفسانی و شہوانی خواہشات کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے اور آخر اپنے ہاتھوں خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

اسلام نے جس کے اوامر و نواہی کی بنیاد مصالح و مفاسد واقعیہ پر ہے۔ انہی مفاسد کے پیش نظر ہر قسم کی شراب کو وہ پھلوں سے بنائی گئی ہو یا غلوں سے، قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے اور اس کے لئے اسی کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر کے برادر نسبتی قدامہ ابن مظعون پر شراب نوشی ثابت ہو گئی تو انہوں نے امیرالمومنین علیہ السلام سے سزا کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اسے اسی کوڑے لگائے جائیں۔ قدامہ نے کہا کہ مجھ پر حد جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

لیس علی الذین آمنوا و عملوا الصالحات جناح فیما طعموا۔

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جو کچھ کھا پی چکے ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرتؑ نے فرمایا۔

لسنت من اھلھا ان طعام اھلھا لھم حلال لیس یاکلون ولایشربون الاما احل اللہ لھم۔(وسائل الشیعہ)

تم اس آیت کے مصداق نہیں ہو اس آیت کے مصداق وہ ہیں جن کا کھانا پینا حلال ہوتا ہے اور وہ وہی چیزیں کھاتے پیتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے حلال کی ہیں۔

اگر کوئی شخص شراب نوشی کے ساتھ شعائر اسلامی کی توہین کا بھی مرتکب ہو تو اس سے جرم سنگین تر ہو جائے گا۔ چنانچہ حارثی نجاشی اور ابو سماک اسدی نے ماہ رمضان میں شراب پی اور نشہ میں دھت ہو کر غل غپاڑہ مچایا۔ حضرتؑ کو اطلاع دی گئی تو آپؑ نے چند آدمیوں کو بھیجا۔ جنہوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ ابو سماک تو بھاگ نکلا اور نجاشی کو پکڑ لیا گیا۔ جب اسے حضرتؑ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؑ نے اسے اسی کوڑے لگائے اور رات بھر بند رکھا دوسرے دن پھر بیس درے لگائے اس نے کہا کہ اسی درے تو لگ چکے یہ بیس درے کیوں؟ فرمایا۔

ھذالجرائتک علی شرب الخمر فی شھر رمضان۔ (الفقیہ)

یہ اس لئے کہ تم نے ماہ رمضان میں شراب پینے کی جسارت کی ہے۔

حد شرعی کے اجراء کے لئے ضروری ہے کہ شراب خوار کے اقرار یا دو گواہوں کی متفقہ شہادت سے شراب نوشی ثابت ہو جائے۔ اگر گواہوں کے بیان میں اختلاف ہو گا تو حد جاری نہیں ہو گی البتہ اگر یہ اختلاف اس نوعیت کا ہو جس سے وقوع فعل مشتبہ نہ ہوتا ہو تو حد جاری کی جائے گی چنانچہ حضرت عمر کے سامنے عمرو تمیمی اور معلی ابن جارود نے گواہی دی کہ قدامہ ابن مظعون نے شراب پی ہے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ حضرت عمر نے امیرالمومنین علیہ السلام

سے دریافت کیا کہ آپؑ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جبکہ ان دونوں گواہوں کی گواہی مختلف ہے فرمایا کہ گواہی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس نے شراب پی ہے جب ہی تو شراب کی قے کی ہے۔ حضرت عمر نے کہا کیا خصی کی شہادت قابل قبول ہے۔ (عمرو تمیمی خصی تھا) فرمایا۔

ماذھاب انثیہ الاکذھاب بعض اعضائہ۔(الفقیہ)

خصیوں کا نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عضو بدنی جاتا رہے۔

یہ حد سب کے لئے یکساں ہے خواہ مرد ہو یا عورت' آزاد ہو یا غلام' کافر ہو یا مسلم۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کان علی یجلد الحرو العبدو الیھودی والنصرانی فی الخمر ثمانین(وسائل الشیعہ)

حضرت علی علیہ السلام شراب نوشی کے جرم میں آزاد' غلام' یہودی' نصرانی سب کو اسی کوڑے لگاتے تھے۔

اگر کسی کو شراب نوشی کی پاداش میں دو دفعہ حد لگ چکی ہو تو تیسری دفعہ کوڑوں کے بجائے اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کان امیرالمومنین یجلد فی قلیل النبیذ کما یجلد فی قلیل الخمر و یقتل فی الثالث من النبیذ کما یقتل فی الثالثہ من الخمر۔(وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام جس طرح تھوڑی سی خمر (شراب انگوری) کے پینے پر کوڑے لگاتے تھے اسی طرح نبیذ (شراب خرط) کے پینے پر کوڑے لگاتے تھے اور جس طرح تیسری مرتبہ خمر کے پینے پر قتل کرتے تھے اسی طرح نبیذ کے پینے پر قتل کرتے تھے۔

اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہوا ہو یا اسلامی شہروں سے دور رہتا ہو اور اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ شراب حرام ہے تو اس پر شراب نوشی کی حد جاری نہیں ہو گی۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ حضرت ابوبکر نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے شراب پی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ کہا کیوں پی ہے۔ جبکہ اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے؟ کہا کہ میں ان لوگوں میں رہتا ہوں جو شراب پیتے ہیں اور اسے حلال سمجھتے ہیں مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ شراب حرام ہے کہ اس سے اجتناب کرتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر سے اس کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ اس مسئلہ کو علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی حل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں اس شخص کو لے کر حضرتؑ کے پاس لائے اور واقعہ بیان کیا آپؑ نے فرمایا کہ اسے مہاجرین و انصار کے پاس لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ کسی نے تحریم خمر کی آیت اس کے سامنے پڑھی ہے۔ اگر کسی نے پڑھی ہو تو یہ عقوبت کا سزاوار ہے اور اگر

کسی نے نہ پڑھی ہو تو یہ قابل مواخذہ نہیں ہے۔ جب اسے مہاجرین و انصار کے سامنے پیش کیا گیا تو ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ میں نے اس کے روبرو یہ آیت پڑھی تھی۔ چنانچہ اسے چھوڑ دیا گیا۔

حد سرقہ :۔ کسی کا مال چوری چھپے اٹھالینا سرقہ کہلاتا ہے۔یہ وہ مذموم عادت ہے جس سے نفس کی دنائت اور اخلاقی معیار کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بلند نفس انسان یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ دوسرے کی کمائی ہوئی دولت لے اڑے' اسے بے دردی سے ضائع کرے اور معاشرے میں ذلیل نگاہوں سے دیکھا جائے۔ بیشک کچھ لوگ اپنی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے جب کوئی چارہ نہیں پاتے تو چوری ایسے جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں لیکن ہر موقع پر چوری کا ارتکاب ضرورت و احتیاج کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ شروع میں کسی جائز یا ناجائز ضرورت کی بنا پر چوری کی جاتی ہے پھر رفتہ رفتہ اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور ضرورت ہو یا نہ ہو عادت کی تسکین کے لئے چوری کا ارتکاب کیا جاتا ہے بہرحال یہ ایک اخلاقی و معاشرتی جرم ہے جس کی روک تھام کے لئے اسلام نے کہیں پر حد اور کہیں پر تعزیری عقوبت تجویز کی ہے تاکہ معاشرہ میں امن و سکون کی فضا پیدا کی جاسکے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

والسارق والسارقہ فاقطعوا ایدیھما۔ چور مرد ہو یا عورت تم ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

لفظ ایدی ید کی جمع ہے اور ید کا اطلاق انگلیوں سے گٹے' کہنی اور کاندھے کے جوڑ تک سب پر ہوتا ہے اور صرف انگلیاں بھی مراد لی جاتی ہیں۔ چنانچہ فخرالدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان الید اسم یتناول الاصابع فقط الا تری انہ لو حلف لا یمس فلانا بیدہ فمسہ باصابعہ فانہ یحنث فی یمینہ۔ (تفسیر کبیر ج ۱۱ ص ۲۲۴)

لفظ ید کا اطلاق فقط انگلیوں پر بھی ہوتا ہے چنانچہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ فلاں کو ہاتھ سے مس نہیں کرے گا اور وہ انگلیوں سے مس کرے تو وہ قسم شکنی کا مرتکب قرار پائے گا۔

اسی بنا پر فقہی مکاتب میں ید کے معنی مراد میں اختلاف ہے بعض گٹے تک بعض کہنی تک اور خوارج کاندھے تک قطع ید کی سزا تجویز کرتے ہیں۔ مگر آئمہ اہل بیتؑ کے نزدیک صرف داہنے ہاتھ کی چار انگلیاں قطع کی جائیں گی اور یہی قرین صواب ہے کیونکہ چوری میں زیادہ تر دخل انگلیوں ہی کا ہوتا ہے چنانچہ

ان امیرالمومنین علیہ السلام قطع السارق من مفصل الاصابع و ترک ابھامہ مع الکف۔ (مستدرک الوسائل)

امیرالمومنین علیہ السلام چور کی انگلیاں جڑ سے کاٹتے اور انگوٹھے کو ہتھیلی سمیت باقی رہنے دیتے۔

اگر کسی کا ہاتھ چوری کے جرم میں قطع ہو چکا ہو اور وہ پھر چوری کرے تو اس کا بایاں پیر وسط سے کاٹ دیا۔

جائے گا اور اس سزا کے بعد تیسری مرتبہ چوری کرے تو اسے حبس دوام کی سزا دی جائے گی چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا پھر دوبارہ چوری کے جرم میں ماخوذ ہوا حضرتؑ نے اس کا بایاں پیر وسط سے قطع کیا پھر تیسری مرتبہ چوری کا مرتکب ہوا حضرت نے اسے حبس دوام کی سزا دی اور فرمایا۔

کلیتہ اصنع رسول اللہ لا اخالفہ۔(وسائل الشیعہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی طریق کار تھا میں اس کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا جو سرقہ کا مرتکب ہوا تھا۔ حضرت عمر نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا پھر دوبارہ چوری کے جرم میں پکڑا گیا انہوں نے اس کا بایاں پیر کاٹنے کا حکم دیا پھر تیسری مرتبہ چوری کی حضرت عمر نے اس کا دوسرا ہاتھ کاٹنا چاہا امیرالمومنین علیہ السلام کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اب اس کا ہاتھ یا پیر کاٹا نہیں جائے گا بلکہ اسے قید کی سزا دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص چوری کے جرم میں قید کی سزا بھگت رہا ہو اور قید خانہ میں چوری کا مرتکب ہو تو اسے سزائے قتل دی جائے گی۔چنانچہ ۔

کان امیرالمومنین اذا اتی بہ فی الثالثہ بعد ان قطع یدہ و رجلہ فی المرتین خلدہ فی السجن وانفق علیہ من فی المسلمین فان سرقہ فی السجن قتلہ۔ (مستدرک الوسائل)

امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس چور کو تیسری مرتبہ لایا جاتا جبکہ پہلی دو چوریوں میں اس کا ہاتھ اور پیر قطع کر چکے ہوتے تو آپ اسے حبس دوام کی سزا دیتے اور اس کا خرچہ بیت المال پر ڈالتے اور اگر قید خانہ میں چوری کرتا اسے قتل کر دیتے۔

اگر غلطی سے کسی کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے تو پھر اس کا دایاں ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ نے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا مگر داہنے ہاتھ کے بجائے اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ جب ہاتھ کاٹنے والوں کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو انہوں نے حضرتؑ سے کہا کہ ہم نے غلطی سے اس کا بایاں ہاتھ کاٹ ڈالا ہے کیا اب اس کا دایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے۔ آپؑ نے فرمایا۔

لاتقطع یمینہ قد قطعت شمالہ۔ (وسائل الشیعہ)

اس کا دایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جبکہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جا چکا ہے۔

شرع اسلام نے ہر سرقہ پر قطع ید کی سزا تجویز نہیں کی بلکہ اس پر چند شروط و قیود عائد کر کے اسے محدود کر

دیا ہے لہٰذا انہی موارد پر یہ سزا دی جائے گی۔ جہاں یہ شرائط پائی جائیں اور جہاں یہ شرائط نہ ہوں وہاں صرف تادیب و تعزیر پر اکتفا کی جائے گی۔ حد شرعی کے اجراء میں جن امور کا اعتبار کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

پہلے یہ کہ چوری کی گواہی دو عادل مرد دیں یا چور خود اقرار کرے اگر بینہ موجود نہ ہو اور نہ وہ اقرار کرے تو اس صورت میں حد جاری نہیں ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من عرف فی یده سرقه فقال اشتریتها ولم یقر بالسرقه ولم یقیم علیه البینته لم تقطع یده۔ (مستدرک الوسائل)

جس کے ہاتھ میں چوری کی کوئی چیز دیکھی جائے اور وہ یہ کہے کہ میں نے اسے خریدا ہے اور چوری کا اقرار نہ کرے اور اس کے خلاف شہادت بھی نہ ہو تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔

اگر دو گواہوں کی گواہی سے چوری ثابت ہو جائے تو امام کو حق عفو نہیں ہے اور اگر کوئی چوری سے تائب ہو کر چوری کا اقرار کرے اور اس کے خلاف گواہی نہ ہو تو اس صورت میں امام کو حق عفو حاصل ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر چوری کا اقرار کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ کیا تمہیں قرآن مجید میں سے کچھ یاد ہے کہا کہ ہاں سورہ بقرہ یاد ہے۔ فرمایا کہ۔

قد وهبت یدک لسوره البقره۔ (وسائل الشیعہ)

میں سورہ بقرہ کی وجہ سے تمہیں قطع ید سے معاف کرتا ہوں۔

اس پر اشعث ابن قیس نے کہا کہ آپ کو اللہ کے مقررہ حدود کے معطل کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ فرمایا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جب شہادت سے چوری ثابت ہو تو امام کو حق عفو نہیں ہے اور اگر کوئی خود اقرار کرے تو امام کو اختیار ہے کہ وہ قطع ید کرے یا معاف کر دے۔

دوسرے یہ کہ ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی چوری ہو اور اس سے کم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

ان امیرالمومنین کان یقطع السارق فی ربع دینار۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام چوتھائی دینار کی چوری میں چور کا ہاتھ قطع کر دیتے تھے۔

تیسرے یہ کہ چوری کرنے والا بالغ ہو نابالغ پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

انعلام لا یجب علیہ الحد حتی یحتلم۔ (مستدرک الوسائل)

بچہ اگر نابالغ ہو تو اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔

ایک مرتبہ حضرتؑ کے پاس ایک نابالغ لڑکی کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپ نے اسے تعزیری سزا دی مگر اس کا ہاتھ نہ کاٹا۔

چوتھے یہ کہ عاقل ہو دیوانے اور مخبوط الحواس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک دیوانے کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپؑ نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا کہ۔

لاقطع علی مجنون۔ (مستدرک الوسائل)

دیوانے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

پانچویں یہ کہ کسی محفوظ اور بند جگہ سے چوری کرے۔ اگر ایسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائے جہاں آنے جانے کی عام اجازت ہوتی ہے جیسے حمام مسجد' سرائے وغیرہ تو حد جاری نہیں کی جائے گی۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

کل مد خل ید خل فیہ بغیر اذن نسرقہ منہ السارق فلا قطع فیہ۔ (وسائل الشیعہ)

اگر چور ایسی جگہ سے چوری کرے جس میں داخل ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت نہ ہو تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص کسی کو اپنے گھر میں مہمان ٹھہرائے اور وہ اس کے ہاں سے چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔ بشرطیکہ مال کسی محفوظ جگہ میں بند نہ ہو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لاقطع علی ضیفہ۔ (مستدرک الوسائل)

مہمان کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا۔

بیرونی لباس کی جیب بھی غیر محفوظ جگہ متصور ہوتی ہے۔ لہذا اس میں سے کوئی چیز نکال لی جائے تو اس پر قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے ایک جیب تراش کو پیش کیا گیا جس نے ایک شخص کی جیب سے کچھ درہم نکال لئے تھے۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان کان طر من قمیصہ الاعلی لم اقطعہ وان کان طرمن قمیصہ السافل قطعتہ۔ (وسائل الشیعہ)

اگر اس نے اوپر والے لباس سے درہم نکالے ہیں تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا اور اگر اندرونی جامہ سے درہم نکالے ہیں تو اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔

اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرے تو اس پر بھی حد سرقہ جاری نہیں ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا اقطع علی من ائتمن علی شئی فخان فیہ۔ (مستدرک الوسائل)

جسے کسی شے کا امین بنایا گیا ہو اور وہ اس میں خیانت کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا۔

چھٹے یہ کہ چور چوری کا مال گھر سے باہر نکالے اگر تالہ توڑے یا نقب لگائے اور مال باہر نکالنے سے پہلے پکڑا جائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس علی السارق قطع حتی یخرج بالسرقہ من البیت۔ (وسائل الشیعہ)

چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا اس وقت تک نہیں دی جائے گی جب تک وہ چوری کا مال گھر سے باہر نہ نکالے۔

ساتویں یہ کہ چوری چھپے مال اٹھائے اگر علانیہ اور سینہ زوری سے مال چھینے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نے بھرے بازار میں ایک دکان پر سے ایک پارچہ اٹھالیا۔ حضرتؑ سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہٰذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔ آپؑ نے فرمایا۔

لیس علی الطرار والمختلس قطع۔ (وسائل الشیعہ)

جیب کترے اور جھپٹا مار کر چھین لینے والے کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا۔

ایک شخص ایک لڑکی کے کانوں سے گوشوارے اتار کر بھاگ نکلا لوگوں نے اسے پکڑ کر حضرتؑ کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا کہ اس نے چھپ چھپا کر تو چوری کی نہیں کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ زد و کوب کے بعد اسے قید کر دیا۔

آٹھویں یہ کہ مسروقہ مال میں خود اس کا حصہ نہ ہو اگر حصہ ہو اور اپنے حصہ کے بقدر یا اس سے کم کی چوری کرے تو اس پر حد جاری نہ ہو گی۔ چنانچہ ایک شخص نے بیت المال میں سے کچھ اٹھا لیا جب اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لایقطع فان لہ فیہ نصیبا۔ (وسائل الشیعہ)

اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ بیت المال میں اس کا بھی حصہ ہے۔

ایک شخص نے مال غنیمت میں سے ایک خود چوری کر لیا۔ حضرتؑ سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہٰذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔ آپؑ نے فرمایا۔

انی لا اقطع احدالہ فیمااخذ شرکہ۔ (وسائل الشیعہ)

میں کسی ایسے شخص کا ہاتھ نہیں کاٹوں گا جس نے اس مال میں سے چوری کی ہو جس میں وہ حصہ دار ہو۔

نویں یہ کہ مجبور و مضطر نہ ہو مگر قحط سالی میں بھوک کے ہاتھوں تنگ آکر چوری کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

کان امیرالمومنین لا یقطع السارق فی ایام المجاعتہ۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام قحط کے دنوں میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹتے تھے۔

دسویں یہ کہ پرندوں کے علاوہ دوسری اشیاء کی چوری کرے۔ اگر پرندوں کی چوری کرے تو قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ کوفہ میں حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے کسی کے ہاں سے کبوتر چرائے تھے۔ آپؑ نے اس کا ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور فرمایا۔

لا اقطع فی الطیر۔ (وسائل الشیعہ)

میں پرندوں کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹوں گا۔

گیارہویں یہ کہ غلام اپنے مالک کے علاوہ کسی اور کی چوری کرے۔ اگر مالک کے مال کی چوری کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

عبدی اذا سرقنی لم اقطعہ و عبدی اذاسرق غیری قطعتہ۔(وسائل الشیعہ)

اگر میرا غلام میری چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کروں گا اور کسی اور کے ہاں چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع کروں گا۔

اسی طرح اگر بیت المال کا غلام بیت المال میں سے چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے دو آدمیوں کو پیش کیا گیا جنہوں نے بیت المال میں چوری کی تھی۔ ایک ان میں بیت المال کی ملکیت تھا اور دوسرا کسی دوسرے کی ملکیت میں تھا آپ نے بیت المال کے غلام کے بارے میں فرمایا۔

اما هذا فمن مال اللہ ولیس علیم شئی مال اللہ اکل بعضہ بعضا۔ (وسائل الشیعہ)

یہ اللہ کا مال ہے اس پر حد نہیں ہے کیونکہ اللہ کا مال اللہ کے مال ہی نے کھایا ہے۔

ان موارد میں سے جہاں قطع ید کی سزا دی جاتی ہے دو موارد یہ بھی ہیں۔

ایک یہ کہ کفن کی چوری کی جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کے دور میں ایک شخص نے کفن چوری کیا۔ آپؑ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپؑ مردے کا مال چوری کرنے پر بھی یہ سزا تجویز کرتے ہیں۔ فرمایا۔

انا نقطع لامو اتنا کما نقطع لا حیاء نا۔ جس طرح ہم زندوں کی چوری پر ہاتھ کاٹتے ہیں اسی طرح مردوں کی چوری پر بھی یہ سزا دیتے ہیں۔ (وسائل الشیعہ)

دوسرے یہ کہ کسی آزاد مرد یا عورت کو غلام یا کنیز کہہ کر بیچ دیا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے ایک آزاد مرد کو غلام کہہ کر فروخت کر دیا تھا۔ آپؑ نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

امیرالمومنین علیہ السلام جن لوگوں کے ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹتے تھے ان کی دیکھ بھال کا بھی حکم دیتے اور علاج کی سہولتیں بھی بہم پہنچاتے۔ چنانچہ حرث ابن حضیرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں ایک دست بریدہ حبشی کو پانی بھرتے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا ہاتھ کس نے کاٹا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم آٹھ آدمیوں نے مل کر چوری کی اور اس جرم میں ہمیں امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں علم تھا کہ چوری حرام ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھرت سزا کے مستحق ہو۔ چنانچہ سب کی چار چار انگلیاں کاٹ دیں اور انگوٹھے چھوڑ دیئے۔ پھر چند دنوں تک ہماری دیکھ بھال کی گئی زخموں کی مرہم پٹی کی گئی اور اچھے سے اچھا کھانا دیا گیا۔ جب ہمارے زخم بھر گئے تو ہمیں عمدہ قسم کے کپڑے دئے اور فرمایا کہ اگر تم نے توبہ کی اور نیکی کی راہ اختیار کی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہو گا اور اگر ایسا نہ کیا تو آگ میں جھونک دئے جاو گے۔

باب القصاص

اسلام کا ہر قانون عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس سے عدل کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں۔ اسی بنیادی تقاضے کے پیش نظر قانون قصاص کا اجراء کیا گیا ہے جو قیام عدل میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ قصاص کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرے یا جسمانی گزند پہنچائے تو اسے بھی ویسی ہی سزا و عقوبت دی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ان النفس بالنفس والعین بالعین والا نف بالا نف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص۔

جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسا ہی بدلہ ہے۔

بعض ترقی پسند عناصر اسلام کے قانون قصاص پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قصاص جرم کے مقابلہ میں جرم کا اعادہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص وقتی ہیجان کے نتیجہ میں قتل یا کسی اور جنایت کا ارتکاب کر گزرتا ہے تو اسے تادیبی سزا تو دی جا سکتی ہے مگر قتل کی سزا دے کر جرم قتل کا اعادہ نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ بعض ممالک میں قتل کی سزا قتل کی صورت میں نہیں دی جاتی بلکہ صرف قید و بند پر اکتفاء کی جاتی ہے۔ لیکن ایک مختصر مدت کے لئے سلب آزادی کی سزا قطع حیات ایسے سنگین جرم کی قرار واقعی سزا نہیں ہو سکتی۔ اس سے نہ عدل کا تقاضا پورا ہوتا ہے اور نہ اسے انسداد جرائم کے لئے موثر قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ اعتراض کہ قصاص اعادہ جرم ہے کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ایک ہی چیز بعض حالتوں میں مذموم ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں مستحسن قرار پاتی ہے مثلاً" تکبر بری چیز ہے مگر متکبر کے مقابلہ میں ہو تو اچھی چیز ہے۔ ہمدردی ایک عمدہ صفت ہے مگر کسی ظالم و سفاک سے ہمدردی کی جائے تو بری سمجھی جائے۔ گی اسی طرح قتل و جنایت کا ارتکاب ابتداءً ہو یا قصاصاً" اگرچہ دونوں صورتاً" برابر ہیں مگر دونوں کو ایک سطح پر سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل سلیم کا قطعی فیصلہ ہے کہ بلاوجہ قتل قبیح ہے اور قتل کے عوض قتل مذموم نہیں ہے بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس لئے کہ معاشرتی امن اور قتل و خونریزی کا انسداد اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب مجرم کو یہ یقین ہو کہ جس ظلم و جور کا وہ مرتکب ہو رہا ہے اسے بھی ویسی ہی عقوبت سے دو چار ہونا پڑے گا اور قصاص کا مقصد بھی یہی ہے کہ پاداش عمل کا ڈر ارتکاب جرم سے مانع ہو اور شرپسند عناصر کی تخریبی کاروائیوں کا سدباب کرے۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے۔

من خاف القصاص كف عن ظلم الناس۔ (تحف العقول) جسے قصاص کا ڈر ہوتا ہے وہ لوگوں پر ظلم کرنے سے باز رہتا ہے۔

قصاص کا تعلق صرف اس قتل سے ہوتا ہے جو جان بوجھ کر کیا جائے اور اگر ورثہ مقتول چاہیں تو دیت لے کر یا بغیر دیت کے درگزر بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ولی الدم بالخیار ان شاء قتل وان شاء قبل الدیہ وان شاء عفا۔ (مستدرک الوسائل) مقتول کے ورثہ کو اختیار ہے چاہے قتل کریں چاہے دیت لے لیں چاہے معاف کر دیں۔

اگر ارادہ قتل کے بغیر قتل واقع ہو جائے اس طرح کہ کسی کو لاٹھی وغیرہ سے اس طرح پیٹے کہ موت واقع ہو جائے مگر جان سے مارنے کا قصد نہ ہو یا غلطی و اشتباہ سے قتل ہو جائے اس طرح کہ تیر وغیرہ سے کسی جانور کو نشانہ بنائے اور وہ کسی انسان کے لگ جائے تو ان دونوں صورتوں میں ورثہ مقتول کو قصاص کے بجائے صرف دیت کا حق ہو گا۔ قصاص اس لئے نہیں کہ پہلی صورت میں اگرچہ فعل کا وقوع عمداً ہے مگر قتل کا قصد نہیں ہے اور دوسری صورت میں نہ فعل کا وقوع قصداً ہے اور نہ قتل کا ارادہ ہے اور دیت اس لئے ہے کہ اسلام یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی کا خون رائیگاں جائے خواہ قتل کا ارادہ ہو یا نہ ہو جیسا کہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یبطل دم امرء مسلم۔ (وسائل الشیعہ) کسی مسلمان کا خون رائیگاں نہیں ہو گا۔

قصاص کا جواز اسی صورت میں ہے جب مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ مقتول آزاد ہو۔ اگر مقتول غلام ہو تو اس کے قصاص میں آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس سے غلام کی قیمت وصول کی جائے گی اور اسے سزا بھی دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے اس آزاد کے بارے میں جس نے ایک غلام کو قتل کر دیا تھا دریافت کیا گیا۔ تو آپؑ نے فرمایا۔

انما هو سلعه تقوم علیه قیمته عدل ولا وکس ولا شطط و یعاقب۔ (مستدرک الوسائل) غلام ایک متاع ہے جس کی صحیح صحیح قیمت لگائی جائے گی اس طرح کہ نہ کم ہو اور نہ زیادہ اور قاتل کو سزا بھی دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مار ڈالے تو اس سے غلام کی قیمت لے کر تصدق کر دی جائے گی اور اسے سزا بھی دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا جس نے اپنے غلام کو اتنا مارا کہ اس نے دم توڑ دیا۔ آپؑ نے اس سے غلام کی قیمت وصول کر کے تصدق کر دی اور اسے سو تازیانے لگوائے اور قید کی سزا دی۔

اگر غلام اپنے آقا کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ صدوق رحمتہ اللہ نے تحریر کیا

ہے۔

اذا قتل عبد مولاہ قتل بہ فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و علی علیہ السلام قضیا بذلک۔ (مستدرک الوسائل)

جب غلام اپنے آقا کو قتل کر ڈالے تو اس کے عوض اسے بھی قتل کر دیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ اور علی علیہ السلام نے یہی فیصلہ فرمایا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے غلام سے کسی کو قتل کروائے تو اس شخص کو قتل کی اور غلام کو حبس دوام کی سزا دی جائے۔ گی چنانچہ ایک غلام نے اپنے مالک کے کہنے سے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ حضرتؑ نے فرمایا۔

ھل عبدالرجل الاکسو طہ و کسیفہ یقتل السید و یستودع العبد السجن۔ (وسائل الشیعہ)

غلام کی حیثیت تو تازیانے اور تلوار کی ہے آقا کو قتل کیا جائے اور غلام کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔

دوسری شرط اسلام ہے لہذا اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے تو اسے کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر کافر، کافر کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقتص الیھودی والنصرانی والمجوسی بعضھم من بعض و یقتل بعضھم ببعض اذا قتلوا عمدا۔ (مستدرک الوسائل)

اگر یہودیوں نصرانیوں اور مجوسیوں میں سے بعض، بعض کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالیں تو انہیں بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ قاتل مقتول کا باپ نہ ہو۔ اگر باپ، بیٹے کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یقتل والد بولدہ اذا قتلہ و یقتل الولد بالوالد اذا قتلہ۔ (وسائل الشیعہ)

اگر باپ بیٹے کو قتل کر دے تو باپ کو اس کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

چوتھی شرط عقل و بلوغ ہے اگر دیوانہ یا بچہ کسی کو قتل کر دے تو ان سے قصاص کے بجائے ان کے اقرباء سے دیت لی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ساقتل المجنون و المغلوب علی عقلہ والصبی فعمد ھما خطاء علی عاقلتھا۔ (متدرک الوسائل)

دیوانے اور بچے کو قتل نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ ان کا عمداً ارتکاب قتل بھی غلطی و اشتباہ کے حکم میں ہے لہٰذا مقتول کی دیت ان کے اقرباء پر عائد ہو گی۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ مقتول ارتداد حد یا قصاص کے سلسلہ میں قتل نہ کیا گیا ہو اور درصورتیکہ اس کا خون بہانا شرعاً جائز ہو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من مات فی حد اوقصاص فھو قتیل القرآن فلاشئی علیہ۔ (متدرک الوسائل)

جو شخص حد یا قصاص کے سلسلہ میں مارا جائے اس پر (دیت یا قصاص) کوئی چیز نہ ہو گی۔

اگر کسی شخص پر کوئی حملہ کرے اور وہ بچاؤ کے لئے حملہ آور کو قتل کر دے تو اس قتل کا نہ قصاص ہو گا اور نہ دیت۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من شھر سیفہ فدمہ ھدر۔ (متدرک الوسائل)

جو شخص تلوار کھینچ کر حملہ آور ہو اس کا خون رائیگاں قرار پائے گا۔

اگر ایک آدمی کسی کو جکڑے اور دوسرا اسے قتل کر دے اور تیسرا دیکھ رہا ہو اور اسے بچانے کی فکر نہ کرے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جکڑنے والے کو حبس دوام کی سزا دی جائے گی اور دیکھنے والے کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے تین آدمی پیش کئے گئے جو قتل کے جرم میں ماخوذ تھے۔ ان میں سے ایک نے مقتول کو جکڑے رکھا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا اور تیسرا دیکھ رہا تھا مگر قتل سے مانع نہ ہوا۔ آپؑ نے حکم دیا کہ جکڑنے والے کو عمر قید کی سزا دی جائے اور قاتل کو قتل کیا جائے اور دیکھنے والے کی دونوں آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔

اگر دو یا دو سے زیادہ مرد کسی مرد کو قتل کر دیں تو ان سب کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قتل کی صورت میں ولی مقتول کو ایک سے زائد افراد کی دیت بھی دینا ہو گی۔ چنانچہ دو آدمی کسی کو قتل کر دیں اور ان دونوں کو قصاصاً قتل کر دیا جائے تو ایک آدمی کی دیت دینا ہو گی جو دونوں قاتلوں کے ورثہ میں نصف تقسیم کر دی جائے گی اگر ان دو میں سے ایک کو قتل کیا جائے تو دوسرا شریک قتل اس مقتول کے ورثہ کو نصف دیت دے گا اور اگر تین قاتل ہوں اور ان میں سے ایک کو قتل کیا جائے تو باقی دو قاتلوں سے دو تہائی دیت لی جائے گی جو قصاصاً قتل ہونے والے کے ورثہ کو دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان کانوا ثلاثہ فقتل احدھم بالقودرد الا ثنان الباقیان علی اولیائہ ثلثی الدیت و یوجعان عقوبہ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر قاتل تین ہوں اور ان میں سے ایک قصاصاً" قتل کیا جائے تو باقی دو افراد قصاصاً" قتل ہونے والے کے وارثوں کو دو تہائی دیت دیں گے اور انہیں عقوبت بھی کی جائے گی۔

اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو چونکہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوتی ہے اس لئے عورت کے ورثاء چاہیں تو قاتل کے ورثاء کو آدھی دیت دے دیں اور اسے قتل کر دیں اور چاہیں تو آدھی دیت لے کر اس کی جان بخشی کر دیں۔

چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یخیراولیاء المراۃان یقتلوا الرجل و یعطوا اولیاء نصف الدیت او ان یاخذوا نصف الدیت من الرجل۔ (مستدرک الوسائل)

عورت کے ورثاء کو اختیار ہے کہ وہ مرد کو قتل کر دیں اور اس کے وارثوں کو آدھی دیت دیں یا یہ کہ مرد قاتل سے نصف دیت لے لیں۔

اگر مقتول کے ورثاء نابالغ ہوں تو ان کے بالغ ہونے کے بعد قصاص، دیت یا عفو کا فیصلہ ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

انتظروالذین قتل ابوھم ان یکبروا فاذا بلغوا خیر وفان احبوا قتلوا او عفوا اوصالحوا۔ (وسائل الشیعہ)

جن بچوں کا باپ قتل کر دیا گیا ہو ان کے بالغ ہونے کا انتظار کیا جائے جب وہ حد بلوغ کو پہنچ جائیں تو انہیں اختیار ہو گا کہ چاہے وہ قاتل کو قتل کریں یا معاف کر دیں یا مصالحت کر لیں۔

اگر مقتول کے وارث دو ہوں اور ان میں سے ایک قصاص چاہے اور دوسرا عفو کرنا چاہے، تو قصاص کی صورت میں طالب قصاص آدھی دیت قاتل کے ورثاء کو دے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے دو آدمی پیش ہوئے، ان میں سے ایک قصاص کا طالب تھا اور دوسرا عفو کرنا چاہتا تھا۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان اراد الذی لم یعف ان یقتل ورد نصف الدیت علی اولیاء المقتول المقاد منہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو عفو کے بجائے قتل کرنا چاہے اگر قتل کرے تو مقتول کے ورثاء کو آدھی دیت دے۔

اگر کسی کو قصاصاً" قتل کرنے کے لئے ضرب لگائی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ مر گیا ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہو کہ وہ مرا نہ تھا تو پھر اس صورت میں اسے قتل کیا جا سکتا ہے جب ضرب لگانے والے کی ضرب کا قصاص

لے لیا جائے۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ مقتول کے بھائی نے حضرت عمر سے مرافعہ کیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے بھائی کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اسے قتل کرے۔ مقتول کے بھائی نے قتل کے ارادہ سے اس پر تلوار کا وار کیا اور اپنے خیال میں اسے ختم کر دیا۔ اس کے عزیز و اقارب اسے اٹھا کر گھر لائے تو دیکھا کہ اس میں رمق جان باقی ہے۔ چند دن اس کا علاج معالجہ ہوا اور وہ تندرست ہو گیا۔ ایک دن مقتول کے بھائی نے اسے دیکھا تو اسے پکڑ کر حضرت عمر کے پاس لایا۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اس شخص نے شور مچایا کہ ایک دفعہ تو مجھے قتل کیا جا چکا ہے۔ اب دوبارہ کیوں؟ مگر اس کی بات نہ سنی گئی۔ جب اسے قتل کے ارادہ سے لے کر چلے تو امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف سے گذر ہوا۔ آپ نے واقعہ سنا تو ان لوگوں کو لے کر حضرت عمر کے پاس آئے اور فرمایا کہ اب اس کا قتل ناروا ہے کیونکہ ایک شخص کو دو مرتبہ قتل نہیں کیا جا سکتا۔ مقتول کے بھائی نے کہا کہ اگر میں اسے قتل نہ کروں تو میرے بھائی کا خون رائیگاں جائے گا۔ فرمایا کہ تم اس صورت میں اسے قتل کر سکتے ہو کہ جب وہ پہلے وار کے بدلے تم پر تلوار کا وار کرے اگر تم زندہ بچ نکلے تو اسے قتل کر دینا۔ کہا کہ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا اور اس کے قتل سے دست بردار ہو گیا۔

قاتل کو قصاصاً تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ خواہ اس نے قتل کا ارتکاب چھت سے گرا کر یا زہر دے کر یا کسی اور طریقہ سے کیا ہو۔

حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یقاد من احدا اذا قتل الا بالسیف و ان قتل بغیر ذلک۔ (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو تو اس سے قصاص تلوار کے ذریعے لیا جائے گا خواہ اس نے کسی اور طریقہ سے قتل کیا ہو۔

قصاص کا تعلق جس طرح انسانی قتل سے ہوتا ہے اسی طرح اعضاء بدن میں کسی عضو کو کاٹ دینے یا مجروح کرنے پر بھی قصاص ہو گا اور جس طرح قتل میں دیت کا جواز ہے اسی طرح اس میں بھی مقررہ دیت لی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ماکان من جراحات فی الجسدفان فیھا القصاص او یقبل المجروح دیت الجراحہ فیعطاھا۔ (وسائل الشیعہ)

جسم کے کسی حصہ کو مجروح کرنے کی صورت میں قصاص ہے یا یہ کہ مجروح دیت قبول کر لے اس صورت میں اسے دیت دے دی جائے گی۔

قصاص میں اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ قصاص جرم کی حد سے بڑھنے نہ پائے بلکہ نوعیت و مقدار کے اعتبار سے اس کے مثل ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کی آنکھ پھوڑ دے تو اس کی بھی ایک آنکھ پھوڑ دی جائے

گی خواہ مجرم کی دونوں آنکھیں موجود ہوں یا ایک آنکھ جاتی رہی ہو۔ چنانچہ حضرتؑ نے ایک یک چشم کے بارے میں فرمایا

اذا فقاء عین صحیح یفقا عینہ الصحیحہ۔ (مستدرک الوسائل) جب وہ کسی صحیح و سالم کی آنکھ پھوڑ دے تو اس کی بھی صحیح آنکھ پھوڑ دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص کسی کی آنکھ پر اس طرح ضرب لگائے کہ ڈھیلا اپنی جگہ پر رہے اور بینائی جاتی رہے تو قصاص میں صرف آنکھ کی بینائی کو زائل کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے دوسرے شخص کی آنکھ پر ضرب لگائی جس سے آنکھ کا ڈھیلا تو ویسے کا ویسا رہا مگر بینائی جاتی رہی۔ اس شخص نے مضروب کو دیت دینا چاہی مگر اس نے دیت کی بجائے قصاص کا مطالبہ کیا جب آپس میں فیصلہ نہ ہو سکا تو یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کیا۔ آپؑ نے مضروب کو دیت پر آمادہ کرنا چاہا یہاں تک کہ دگنی دیت دینا چاہی مگر وہ نہ مانا اور قصاص پر اصرار کرتا رہا۔ جب دیت پر مصالحت نہ ہو سکی تو حضرت نے روئی تر کرکے ضرب لگانے والے کی پلکوں اور آنکھوں کے گرد رکھی اور ایک آئینہ گرم کرکے اس کی آنکھ کے سامنے کیا اور اسے سورج کی طرف دیکھنے کے لئے کہا۔ جب اس نے ٹکٹکی جما کر سورج کی طرف دیکھا تو سورج کی حرارت سے آنکھ کی چربی پگھل گئی بینائی جاتی رہی اور آنکھ اپنی ہیئت پر باقی رہی۔

اگر سزا مقررہ مقدار سے تجاوز کر جائے تو سزا دینے والا اس زیادتی کا ضامن ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے قنبر کو ایک شخص پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ قنبر نے تین تازیانے غلطی سے زیادہ لگا دئے۔

فاقادہ علی قنبر ثلثہ اسواط۔ (وسائل شیعہ) حضرت نے قنبر سے ان تین تازیانوں کا قصاص لیا۔

اگر کسی کو متنبہ کر دیا جائے اور وہ اپنا بچاؤ کرنے کے بجائے کسی چیز کی زد میں آ جائے تو اسے قصاص لینے کا حق نہ ہو گا۔ چنانچہ ایک مرتبہ چند بچے کھیل رہے تھے کہ کھیل کے دوران ایک بچے نے لکڑی پھینکی جو ایک دوسرے لڑکے کو لگی اور اس کے اگلے دانت ٹوٹ گئے۔ حضرتؑ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو لکڑی پھینکنے والے نے گواہ پیش کئے کہ اس نے لکڑی پھینکنے سے پہلے خبردار کر دیا تھا۔ حضرتؑ نے اسے قصاص سے بری قرار دے دیا اور فرمایا۔

قد اعذر من حذر۔ (وسائل الشیعہ) جس نے خبردار کر دیا' وہ معذور ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کو ناگوار بات کہے اور وہ بھی جواب میں ویسی ہی بات کہے تو اسے قصاص سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس فی کلام قصاص۔ (وسائل الشیعہ)   باتوں میں قصاص نہیں ہے۔

البتہ ناگوار بات کہنے اور جواب دینے والے کو تادیب کی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نے کسی کو پاگل کا بیٹا کہا۔ اس نے بھی جواباً" یہی الفاظ کہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام سے اس کی شکایت کی گئی تو آپؑ نے پہلے کو دوسرے سے اور دوسرے کو پہلے سے بیس تازیانے لگوائے حالانکہ سخت الفاظ کا بدلہ سخت الفاظ میں چکایا جا چکا تھا۔

باب الدیہ

قتل یا اعضاء بدن کو نقصان پہنچانے کے نتیجہ میں جو مال بطور معاوضہ دیا جاتا ہے' دیت کہلاتا ہے۔ اگر قتل کا وقوع عمداً" ہو تو قصاص سے دست بردار ہو کر دیت لینے کا جواز ہے اور اگر قتل غلطی سے ہو اس طرح کہ کسی کو ایسی چیز سے مارا جائے جس سے عام طور پر موت واقع نہیں ہوتی مگر اتفاقیہ موت ہو جائے یا تیر وغیرہ سے کسی جانور کو نشانہ بنایا جائے اور وہ کسی آدمی کے لگ جائے تو ان دونوں صورتوں میں صرف دیت لینے کا حق ہے۔ چنانچہ ارشاد الہی ہے۔

من قتل مومنا خطاء فتحریر رقبہ مومنہ و دیتہ مسلمہ الی اھلہ الا ان یصدقوا۔

جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور مقتول کے قرابت داروں کو دیت ادا کرے گا مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں۔

دیت چھ چیزوں میں سے کوئی ایک چیز مقررہ مقدار میں دی جاتی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الدیہ الف دینار والدینار عشرہ درھم وعلی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل الورق عشرہ الاف درھم وعشرہ الاف لاھل الا مصار ولا ھل البواری الدیہ مائہ من الا بل و لا ھل اسواد مائتا بقرہ او الف شاہ۔(الفقیہ)

دیت کی مقدار ایک ہزار دینار[1] ہے اور ایک دینار دس درھم کے مساوی ہے جو سونا رکھتے ہوں وہ ہزار دینار دیں اور جو چاندی رکھتے ہوں وہ دس ہزار درہم دیں۔ شہری باشندوں کے لئے دس ہزار درہم ہیں' بادیہ نشینوں کے لئے سو اونٹ اور دیہاتوں یا قصبوں کے رہنے والوں کے لئے دو سو گائیں یا ہزار بکریاں۔

محدث کبیر شیخ حرعاملی نے تحریر کیا ہے کہ۔

رواہ فی المقنع مرسلا الی قولہ مائتی حلہ۔ (وسائل الشیعہ)

صدوق رحمتہ اللہ علیہ نے مقنع میں اس حدیث کو دو سو حلوں تک روایت کیا ہے۔

---

[1] دینار سونے کا سکہ ہے جو ایک مثقال کے برابر ہوتا ہے اور مثقال کا وزن ۱۸ چنوں کے مساوی ہے اور درہم چاندی کا سکہ ہے جو ۱۲٫۶ چنوں کے ہم وزن ہے۔

اگر جان بوجھ کر قتل کیا گیاہو تو ایک سال کے اندر دیت ادا کی جائے گی اور اگر غلطی یا اشتباہ سے قتل واقع ہوا ہو تو تین سال کے اندر دیت دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

تستادی دیتہ الخطاء فی ثلث سنین و تستادی دیتہ الحمد فی سنہ۔ (الفقیہ)

جو قتل غلطی سے ہو اس کی دیت تین سال کی مدت میں ادا کی جائے گی اور جو قتل قصداً ہو اس کی دیت ایک سال میں ادا کی جائے گی۔

اگر قصداً قتل کیا ہو یا قصد قتل کے بغیر زد و کوب سے موت واقع ہو گئی ہو تو قاتل خود دیت ادا کرے گا اور اگر محض غلطی سے ایسا ہوا ہو تو قاتل کے اقرباء پر یہ دیت عائد ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لیس علی العاقلہ دیتہ العمد انما علیھم دیتہ الخطاء۔ (مستدرک الوسائل)

قاتل کے اقرباء پر قتل عمد کی دیت نہیں ہے اگر غلطی سے قتل واقع ہوا ہو تو البتہ ان پر دیت کی ذمہ داری ہو گی۔

حضرت عمر نے ایک حاملہ عورت کے بارے میں ایک ناگوار بات سنی تو اسے طلب کرنے کے لئے آدمی بھیجا اور اسے اس قدر ڈرایا دھمکایا گیا کہ وہ ہراساں ہو گئی اور اس خوف و ہراس کی وجہ سے اسے درد شروع ہو گیا۔ اس نے قریب ہی ایک گھر میں بچہ جنا جو زندہ پیدا ہونے کے بعد مر گیا۔ حضرت عمر نے صحابہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ سب نے باتفاق رائے کہا کہ آپ پر کوئی مظلمہ عائد نہیں ہوتا۔ حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ اگر ان لوگوں نے تمہاری رو رعایت کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے تو تمہیں فریب دیا ہے اور اگر واقعاً ان کی یہ رائے ہے تو انہوں نے غلط رائے قائم کی ہے۔

الدیتہ علی عاقلتک۔ (وسائل الشیعہ)

اس کی دیت تمہارے اقرباء پر عائد ہوتی ہے۔

حضرت عمر کو خود ہی یہ فیصلہ کر لینا چاہئے تھا کہ جب یہ حادثہ خوف و ہراس کی وجہ سے رونما ہوا ہے تو ہراساں کرنے والا اس کی ذمہ داری سے بری قرار نہیں پا سکتا اور وہ تو معمولی قسم کے واقعات میں بھی' دیت دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام شعرانی نے کشف الغمہ میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر حجام سے لبیں کٹوا رہے تھے کہ کسی بات پر بگڑ کر اسے اتنا ڈانٹا کہ اس کی ریح صادر ہو گئی۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس حد تک ڈرانے کا تو ہمارا ارادہ نہ تھا لہٰذا ہم اس کی دیت دیں گے۔ چنانچہ اسے ایک بکری اور چالیس درہم دئے۔

اگر کوئی شخص قاضی کے غلط فیصلہ کے نتیجہ میں مارا جائے یا اسے جسمانی ضرر و نقصان پہنچے تو اس کی دیت بیت المال سے دی جائے گی۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

قضی امیرالمؤمنین ما خطأت به القضاۃ فی دم او قطع فعلی بیت مال المسلمین۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ قاضیوں کی غلطی کے نتیجہ میں جو خون بہے یا عضو بدن کٹے اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

اگر کوئی شخص بھیڑ بھاڑ میں مارا جائے اور کچلنے والوں کا پتہ نہ چل سکے تو اس کی دیت بیت المال سے دی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نماز جمعہ کے ہجوم میں کچلا گیا۔ حضرتؑ نے اس کے بارے میں فرمایا۔

ان دیتہ من بیت مال المسلمین۔ (وسائل الشیعہ) اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے جنگ جمل سے پلٹتے ہوئے ایک عورت اور ایک نومولود بچے کی میتیں دیکھیں۔ آپؑ نے ان کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ یہ عورت حاملہ تھی اس نے جب جنگ کی ہولناکی اور لوگوں کی بھگدڑ دیکھی تو اس پر اتنا ہول طاری ہوا کہ وضع حمل ہو گیا اور دونوں نے دم توڑ دیا۔ پوچھا کہ ان دونوں میں سے پہلے کون مرا تھا۔ بتایا گیا کہ پہلے تو بچہ مرا تھا۔ حضرتؑ نے ان دونوں کی دیت بیت المال پر عائد کی اور اس عورت کے شوہر کو بچے کی دیت میں سے دو حصے دیئے اور ایک حصہ مرنے والی ماں کا قرار دے کر اس کی تقسیم اس طرح کی کہ نصف شوہر کو دیا اور باقی نصف اس عورت کے قرابت داروں کے حوالے کیا اور اس عورت کی دیت میں سے نصف کا وارث شوہر کو قرار دیا کیوں کہ اس عورت کا کوئی اور بچہ نہ تھا اور نصف اس عورت کے دوسرے اقربا کو دیا۔

اس سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے چند فیصلے درج کئے جاتے ہیں جن سے دیت و ضمان کے بارے میں خواہ اس کی ذمہ داری ایک فرد پر عائد ہوتی ہو یا چند افراد پر، رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

یمن میں چند آدمیوں نے شیر کا شکار کرنے کے لئے بلندی پر ایک گڑھا کھودا۔ رات کو شیر ادھر سے گزرتا ہوا اس میں گر پڑا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا تو صبح ہوتے ہی گڑھے کے گرد بھیڑ لگ گئی۔ ان تماشائیوں میں سے ایک کا پاؤں پھسلا تو اس نے سنبھلنے کے لئے پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی کو پکڑا اس نے جھٹ سے تیسرے کو اور تیسرے نے چوتھے کو پکڑ لیا اور وہ چاروں گڑھے کے اندر جا گرے اور شیر نے ان سب کو چیر پھاڑ دیا۔ ان کے ورثاء میں دیت کے بارے میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ پہلا آدمی دیت کا حق دار نہیں ہو گا اور دوسرا پہلے آدمی سے ایک تہائی دیت کے لینے کا اور تیسرا دوسرے آدمی سے دو تہائی دیت کے لینے کا اور چوتھا تیسرے آدمی سے پوری دیت کے لینے کا حق دار ہو گا۔

یہ فیصلہ اس بناء پر فرمایا کہ پہلا خود سے گرا تھا اور وہ خود ہی اپنی ہلاکت کا باعث بنا۔ لہٰذا اسے دیت کا حق دار قرار نہیں دیا جا سکتا اور دوسرے کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ پہلے آدمی نے اسے پکڑا اور تیسرا اور چوتھا آدمی اس کے اوپر گرا لہٰذا اس کی دیت ان تینوں سے متعلق ہو گی مگر چونکہ تیسرے اور چوتھے آدمی کے گرنے کا باعث وہ خود تھا

اس لئے دو تہائی دیت ساقط ہو جائے گی اور ایک تہائی پہلے آدمی کے ذمہ باقی رہے گی اور تیسرے آدمی کی دیت دو تہائی اس لئے ہو گی کہ وہی اس کی ہلاکت کا تمام تر ذمہ دار ہے۔

چھ آدمی دریائے فرات میں نہانے کے لئے اترے ان میں سے ایک لہروں کی لپیٹ میں آکر غرق ہو گیا۔ حضرتؑ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو پانچ میں سے تین نے دو کے خلاف گواہی دی کہ انہوں نے اسے غرق کیا ہے اور ان دو نے ان تینوں کے خلاف گواہی دی کہ انہوں نے مل کر اسے غرق کیا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ دیت کو ان پانچوں آدمیوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح کہ دو حصے وہ تین آدمی دیں جن کے خلاف دو کی شہادت ہے اور تین حصے وہ دو آدمی دیں جن کے خلاف تین کی شہادت ہے۔

چار آدمیوں نے شراب پی اور نشہ کی حالت میں ایک دوسرے پر چھریوں سے حملہ کر دیا اور سب کے سب شدید زخمی ہو گئے۔ حضرتؑ نے حکم دیا کہ انہیں زیر حراست رکھا جائے جب ہوش میں آئیں تو انہیں پیش کیا جائے۔ اس عرصہ میں دو زخمی زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئے۔ جب ان دونوں مقتولوں کے وارثوں کو علم ہوا تو انہوں نے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر زندہ رہنے والوں کے خلاف مرافعہ کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے آدمی ان زندہ بچ رہنے والوں کے ہاتھوں مرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مرے ہوں۔ کہا کہ پھر آپؑ اپنے علم کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔ فرمایا کہ چاروں آدمیوں کے قبیلہ والے مل کر ان دونوں مقتولوں کی دیت دیں گے اور دونوں مقتولوں کو جو زخم پہنچے ہیں ان کی دیت مقتولوں کی دیت سے وضع کر لی جائے۔

حضرتؑ نے یہ فیصلہ اس بناء پر فرمایا کہ قتل تو بہرصورت واقع ہوا تھا مگر نہ قتل عمد کا کوئی ثبوت تھا اور نہ قاتل شخص متعین تھا۔

ایک لڑکی نے ایک دوسری لڑکی کو ہنسی کھیل میں اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ اتنے میں ایک اور لڑکی آئی اور اس نے ازراہ شوخی اٹھانے والی لڑکی کے چٹکی لی اور وہ اس زور سے اچھلی کہ سوار ہونے والی لڑکی گری اور گردن ٹوٹنے سے ہلاک ہو گئی۔ حضرتؑ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو آپؑ نے ایک تہائی دیت چٹکی بھرنے والی لڑکی پر عائد کی اور ایک تہائی دیت ساقط کر دی کیوں کہ مرنے والی لڑکی خود بھی اس کھیل میں شریک تھی۔

ایک پیاسے آدمی نے کچھ لوگوں سے پانی مانگا مگر انہوں نے پانی ہوتے ہوئے پانی دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ پیاس سے بے حال ہو کر مر گیا۔ حضرتؑ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؑ نے ان لوگوں کو اس کی موت کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر دیت عائد کی۔

ایک عورت نے اپنا بچہ ایک دایہ کے سپرد کیا۔ اس دایہ نے اسے ایک اور کھلائی کے حوالے کر دیا جو اسے

لے کر کہیں غائب ہو گئی اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے بچے کا کیا کیا ہے۔ حضرت نے حکم دیا کہ پہلی دایہ ضامن ہے کیوں کہ اسی نے بچے کو ماں کی گود سے لیا تھا۔ لہٰذا وہ اس کی دیت ادا کرے۔

ایک غلام نے ایک آزاد کو غلطی سے قتل کر دیا۔ جب وہ قتل کا مرتکب ہوا تو اس کے آقا نے اسے آزاد کر دیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس کی آزادی کو صحیح قرار دیا اور قتل کی دیت غلام پر عائد کی کیوں کہ اب وہ آزاد ہو چکا تھا۔

ایک شخص کسی کے گھر میں داخل ہوا اور اسے صاحب خانہ کے کتے نے کاٹ لیا۔ حضرتؑ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر وہ صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوا تو صاحب خانہ ذمہ دار نہیں ہے اور اگر اس کی اجازت سے داخل ہوا تو صاحب خانہ ضامن ہے۔

ایک شخص نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ فلاں شخص کے بیل نے اس کے اونٹ کا پیٹ چاک کر دیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس پر نہ دیت ہے اور نہ قصاص۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ فیصلہ سنا تو فرمایا کہ اگر اس شخص نے بیل کو اونٹ کی گزر گاہ میں باندھ رکھا تھا تو وہ اس کا ضامن ہو گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ محل وقوع کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیل کہیں باہر سے لایا تھا اور اسے اونٹ کے راستے میں باندھ دیا تھا۔ حضرت عمر نے آپؑ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے بیل کے مالک سے اسے اونٹ کی قیمت دلوا دی۔

ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص کو لے کر آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص کے بیل نے میرے گدھے کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں پہلے حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر کے پاس بھیجا۔ ان دونوں کا جواب یہ تھا کہ جانور پر دیت ہے نہ قصاص۔ پھر انہیں حضرت علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر بیل نے گدھے کے استھان پر پہنچ کر اسے ہلاک کیا ہے تو بیل کا مالک ضامن ہو گا اور اگر گدھا بیل کی جگہ پر چلا آیا تو بیل کا مالک ضامن نہیں ہو گا۔ وہ دونوں یہ فیصلہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپؐ نے یہ فیصلہ سن کر فرمایا

الحمد للہ الذی جعل من اھل بیتی من یحکم بحکم الانبیاء (وسائل الشیعہ)

تمام حمد و ثنا اس اللہ کے لئے ہے جس نے میرے اہل بیت میں وہ افراد رکھے جو انبیاء کی مانند فیصلے کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خچر جو ادھر چرتا رہتا تھا اور اسے کوئی روکتا ٹوکتا نہ تھا۔ سرکنڈوں کے ایک انبار میں گھس گیا۔ بنی مدلج کے ایک آدمی نے تیر چلا کر اسے ہلاک کر دیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اسے طلب کر کے فرمایا۔

واللہ لا تفارقنی حتی تلدیھا۔ (وسائل الشیعہ) — خدا کی قسم تم اس جگہ سے جا نہیں سکتے جب تک اس کی قیمت ادا نہ کر دو۔

چنانچہ اس نے چھ سو درہم ادا کئے۔

ایک شخص کا گھوڑا تھان سے بھاگ نکلا اور دوڑتے ہوئے ایک آدمی کو لات ماری اور اسے ختم کر دیا۔ اس آدمی کے وارث گھوڑے کے مالک کو پکڑ کر حضرتؑ کے پاس لائے اور دیت کا مطالبہ کیا۔ گھوڑے کے مالک نے کہا کہ یہ خود ہی تھان سے بھاگ نکلا تھا اور چند گواہ بھی پیش کئے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اس صورت میں، گھوڑے کے مالک پر دیت عائد نہیں ہوتی۔

ایک شخص کے دو اونٹ آوارہ ہو کر صحرا کی طرف نکل گئے ایک شخص نے انہیں پکڑ لیا اور دونوں کو ایک رسی سے باندھ دیا ان میں سے ایک گلا گھٹنے کی وجہ سے مر گیا۔ حضرتؑ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ شخص ضامن نہیں ہے کیونکہ۔

انما اراد الا صلاح۔ (وسائل الشیعہ) — اس نے تو بھلائی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

اعضاء بدن میں سے کسی عضو کو قطع یا مجروح یا بیکار کر دینے سے بعض صورتوں میں دیت قتل کی دیت کے مساوی ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں کم۔ جو جرم کی سنگینی و سبکی کے اعتبار سے مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اس نقصان و ضرر رسانی پر عائد ہونے والی چند دیتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر نابینا کر دے تو اسے پوری دیت دینا ہو گی اور اگر ایک آنکھ پھوڑے تو آدھی دیت۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی العینین الدیتہ وفی کل واحد منھما نصف الدیتہ۔ (وسائل الشیعہ) — دونوں آنکھوں میں پوری دیت ہے اور ایک آنکھ میں آدھی دیت۔

اگر کسی کی ایک آنکھ پہلے ہی سے پھوٹی ہوئی ہے تو اس کی صحیح آنکھ کے پھوڑنے پر پوری دیت دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا انتفت اشفاد العین کلھا فلم تنبت ففیھا الدیتہ کاملہ وفی کل واحد منھا ربع الدیتہ۔ (مستدرک الوسائل) — اگر آنکھوں کی تمام پلکیں کاٹ دی جائیں اور وہ دوبارہ نہ اگیں تو پوری دیت دی جائے گی اور ہر پلک کی دیت ایک چوتھائی ہو گی۔

اگر کسی کی آنکھ کے دونوں پپوٹے کاٹ دیئے جائیں تو آدھی دیت اور ایک پپوٹا کاٹا جائے تو چوتھائی دیت دینا

ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی جفون العینین فی کل واحد منها ربع الدیته۔ (مستدرک الوسائل)

آنکھ کے دونوں پپوٹوں میں سے ہر پپوٹے کی دیت ایک چوتھائی ہے۔

اگر ابروؤں کو اس طرح گزند پہنچایا جائے کہ تمام بال جھڑ جائیں تو دونوں ابروؤں کی دیت نصف اور ایک ابرو کی دیت ایک چوتھائی ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان اصیب الحاجب فذهب شعره کله فدیته نصف دیته العین مائتا و خمسون دینارا۔ (وسائل الشیعہ)

اگر کسی گزند کی وجہ سے ابرو کے تمام بال جھڑ جائیں تو آنکھ کی دیت کا نصف یعنی دو سو پچاس دینار دیئے جائیں گے۔

اگر کسی کے دونوں کان کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک کان کاٹ دیا جائے تو نصف دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے:

فی الاذنین اذاقطعت احدا هما فدیتها خمس مائته دینارا۔ (وسائل الشیعہ)

جب ایک کان کاٹ دیا جائے تو اس کی دیت پانچ سو دینار ہو گی۔

اگر کان کی لو کاٹ دی جائے تو ایک تہائی دیت دینا ہو گی۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان علیا قضی فی شحمه الاذن ثلث دیه الاذن۔ (وسائل الشیعہ)

حضرت علی علیہ السلام نے کان کی لو کاٹنے پر کان کی دیت کا ایک تہائی دینے کا فیصلہ کیا۔

اگر کسی کو دونوں کانوں سے بہرا کر دے تو پوری دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا ضرب الرجل فذهب سمعه کله ففیه الدیه کاملہ۔ (مستدرک الوسائل)

جب کسی کو اسی طرح چوٹ لگائے کہ قوت سماعت بالکل جاتی رہے تو پوری دیت دینا ہو گی

اگر کسی کی ناک کاٹ دی جائے تو پوری دیت دی جائے گی چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

قضی امیرالمؤمنین فی دیه الا نف اذا استوصل مائته من الابل۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ جب ناک پوری کاٹ دی جائے تو دیت میں سو اونٹ دیئے جائیں۔

اگر ناک کا پردہ کاٹ دیا جائے تو نصف دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فان قطع روثہ الا نف فد یتھا خمسہ مائتہ دینار۔ (وسائل الشیعہ)

اگر ناک کا پردہ کاٹ دیا جائے تو پانچ سو دینار دیت ہو گی۔

اگر کسی کے دونوں ہونٹ کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک ہونٹ کاٹا جائے تو آدھی دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی الشفتین اللیتہ وفی کل واحد نصف اللیتہ۔ (متدرک الوسائل)

دونوں ہونٹوں کی دیت پوری ہو گی اور ایک ہونٹ کی دیت آدھی۔

اگر کسی کی زبان جڑ سے کاٹ دی جائے تو پوری دیت اور اگر اس کا کچھ حصہ کاٹ دیا جائے تو اسی کے تناسب سے دیت دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی اللسان اللیتہ و اذا بقی منہ فبحساب مانقص منہ۔ (متدرک الوسائل)

زبان کی دیت پوری ہو گی اور اگر اس میں سے کچھ باقی رہے تو پھر کمی کے تناسب سے دیت ہو گی۔

اگر کسی ضرب کے نتیجہ میں زبان بعض حروف کا تلفظ نہ کر سکے تو کل دیت کو مخارج حروف پر تقسیم کر کے دیت دی جائے گی۔چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

من ضرب اوقطع من لسانہ فلم یصب بعض الکلام فانہ ینظر الی مالا یصیبہ من الحروف فیعطی اللیتہ بحساب ذ لک من حروف المعجم۔(متدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص کسی کی زبان پر چوٹ لگائے یا کاٹ دے اور وہ کچھ الفاظ کا تلفظ نہ کر سکے تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ حروف تہجی میں سے کتنے حرف ادا نہیں کر سکتا اور انہی حرفوں کے حساب سے دیت دی جائے گی۔

ایک شخص نے ایک بچے کے سر پر ضرب لگائی جس سے اس کی زبان میں کھچاؤ پیدا ہو گیا اور بعض حروف کی ادائیگی نہ کر سکا۔ اسے حضرتؑ کے سامنے پیش کیا گیا آپؑ نے اسے حروف تہجی ادا کرنے کے لئے کہا وہ چند حروف ادا نہ کر سکا۔ آپؑ نے فرمایا کہ دیت کو حروف تہجی پر تقسیم کیا جائے اور جتنے حروف یہ ادا کر سکا ہے اتنی مقدار سالم دیت سے وضع کر کے اسے دی جائے۔ اگر کسی گونگے کی زبان کاٹ دی جائے تو ایک تہائی دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے کہ۔

فی لسان الا خرس ثلث اللیہ۔ (متدرک الوسائل)

گونگے کی زبان قطع کرنے کی دیت ایک تہائی ہے۔

اگر کسی کے تمام دانت توڑ دیئے جائیں تو سالم دیت دینا ہو گی۔ اس طرح کہ سامنے کے چھ اوپر والے اور

چھ نیچے والے دانتوں میں سے ہر ایک کی دیت پچاس دینار اور پیچھے والے سولہ دانتوں میں سے ہر ایک کی دیت پچیس دینار ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

کل سن من المقادیم اذا کرحتی یذھب خمسون دینار ایکون ذ لک ستمائہ دینار و دیتہ کل سن من المواخر اذا کرحتی یذھب علی النصف من دیتہ المقادیم خمسہ و عشرون دینارا۔ (وسائل الشیعہ)

جب سامنے کے دانتوں میں سے کوئی دانت اس طرح توڑا جائے کہ جڑ سے اکھڑ جائے تو دانت کی دیت پچاس دینار ہو گی اور ان کی مجموعی دیت چھ سو دینار بنے گی اور پچھلی طرف کے دانتوں کو توڑنے کی صورت میں ہر دانت کی دیت سامنے والے دانتوں کی دیت سے نصف یعنی پچیس دینار ہو گی۔

اگر کوئی شخص کسی کی داڑھی کے بال اس طرح مونڈے یا اکھیڑے کہ دوبارہ نہ اگیں تو پوری دیت دینا ہوگی۔ اور اگر اگ آئیں تو ایک تہائی دیت۔ چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی اللحیہ اذا حلقت فلما تنبت بالدیہ کاملہ فاذا نبتت فثلث الدیہ۔ (الفقیہ)

جب کسی کی داڑھی کے بال اس طرح مونڈ دیئے جائیں کہ دوبارہ نہ اگیں تو حضرت علی علیہ السلام نے پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کسی کا شانہ توڑ دیا جائے تو سو دینار دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

دیتہ المنکب اذا کر خمس دیتہ الید مائہ دینار۔ (مستدرک الوسائل)

شانہ کی دیت سو دینار ہے جو ہاتھ کی دیت کا پانچواں حصہ ہے۔

اگر کسی کے دونوں ہاتھ گٹ سے کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک ہاتھ کاٹا جائے تو آدھی دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی الیدین الدیہ وفی کل واحد منھما نصف الدیہ۔ (مستدرک الوسائل)

دونوں ہاتھوں کی پوری دیت ہے اور ایک ہاتھ کی آدھی دیت۔

اگر کسی کی دسوں انگلیاں کاٹ دی جائیں تو پوری دیت دینا ہو گی۔ اور ایک انگلی کاٹی جائے تو دیت کا دسواں حصہ دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی الاصبع عشر من الابل۔ (مستدرک الوسائل)

ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہے۔

اگر انگلی کی ایک پور کاٹی جائے تو انگلی کی دیت کا تیسرا حصہ دیا جائے گا اور انگوٹھے کی پور کاٹی جائے تو انگلی

کی دیت سے آدھی دیت دی جائے گی۔ چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ۔

ان امیرالمؤمنین یقضی فی کل مفصل من الاصابع بثلث عقلی تلک الا صابع الا الا بهام فانه کان یقضی فی مفصلها بنصف عقلی تلک الابهام لان لها مفصلین۔ (الفقیہ)

امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ فیصلہ تھا کہ انگلی کی ہر پور کی دیت انگلی کی دیت کی ایک تہائی ہو گی لیکن انگوٹھے کی پور کی دیت انگوٹھے کی دیت کا نصف ہو گی کیونکہ اس میں دو ہی پوریں ہوتی ہیں۔

اگر کسی کی کمر اس طرح توڑ دی جائے کہ وہ بیٹھ نہ سکے تو پوری دیت دینا ہو گی۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

قضی امیرالمؤمنین فی رجل کر صلبه فلا یستطیع ان یجلس ان فیه الدیته۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس شخص کے بارے میں جس کی کمر توڑ دی گئی تھی اور وہ بیٹھ نہ سکتا تھا پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر عورت کے دونوں پستان قطع کر دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک پستان قطع کیا جائے تو نصف دیت ہو گی۔ چنانچہ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

قضی امیرالمؤمنین فی رجل قطع ثدی امراته قال اذن اغرمه لها نصف الدیته۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس شخص کے بارے میں جس نے اپنی عورت کا ایک پستان کاٹ ڈالا تھا فرمایا کہ میں اس مرد سے عورت کو آدھی دیت دلواؤں گا۔

اگر کسی کو اس طرح ضرب لگائی جائے کہ پیشاب رکنے نہ پائے تو اسے پوری دیت دی جائے گی۔

ان علیا قضی فی رجل ضرب حتی سلس ببوله بالدیته کاملة۔ (وسائل الشیعہ)

حضرت علی علیہ السلام نے اس شخص کے بارے میں جس کا چوٹ لگنے کی وجہ سے پیشاب نہ رکتا تھا پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کسی کے دونوں خصیئے کاٹ دیئے جائیں تو اسے پوری دیت دی جائے گی اور اگر ایک خصیہ کاٹا گیا ہو تو آدھی دیت۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی البیضتین الدیتہ وفی کل واحد منھا نصف الدیتہ۔ (مستدرک الوسائل)

دونوں خصیوں کی سالم دیت ہے اور ایک کی آدھی دیت۔

اگر کسی کے دونوں پیر ٹخنوں سے کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

والرجلین جمیعا الف دینار۔ (مستدرک الوسائل)

دونوں پیروں کی دیت ہزار دینار ہے۔

اگر پاؤں کی دسوں انگلیاں کاٹ دی جائیں تو پوری دیت دینا ہو گی اور ہر انگلی کی دیت' دیت کا دسواں حصہ ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی کل اصبع اصابع الرجلین مائتہ وفی کل انمتہ بحسابھا۔(مستدرک الوسائل)

پیروں کی انگلیوں میں سے ہر انگلی کی دیت سو دینار ہے اور ہر پور کی دیت اسی تناسب سے ہو گی۔

اگر کوئی شخص کسی کے منہ پر تھپڑ مارے تو ڈیڑھ دینار سے چھ دینار تک تاوان دینا ہو گا۔ صدوق رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

انہ قضی فی اللطمتہ بالوجہ تسود ان ارشھا ستتہ دنانیر فان اخضرت فار شھا ثلثتہ دنانیر فان احمرت فارشھا دینار و نصف۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر طمانچے سے چہرہ سیاہ ہو جائے تو چھ دینار اور سرخ ہو جائے تو ڈیڑھ دینار نیلا ہو جائے تو تین دینار تاوان دیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص کسی کے سر یا چہرے پر ضرب لگائے اور خون نکل آئے تو دیت ایک فیصد حصہ دے گا۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی الدامیہ بعیرا۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے خون نکالنے والی چوٹ پر ایک اونٹ دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر کھال کے ساتھ تھوڑا سا گوشت بھی چیر دے تو دیت کا دو فیصد دیا جائے گا۔

قضی فی الباصعتہ بعشرین دینارا۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جو تھوڑا سا گوشت بھی چیر دے بیس دینار دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر زیادہ مقدار میں گوشت چیر دے تو دیت کا تین فیصد دیا جائے گا۔

قضی فی الملاحمہ بثلثین دینارا۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جو گوشت کے اندر تک اتر جائے تیس دینار دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر چوٹ کا اثر ہڈی کے نازک پردے تک پہنچ جائے تو چار فیصد دیت دی جائے گی۔

ان علیا قضی فی السحاق اربعتہ ابعر او قیمتھا من الذھب والورق (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جو ہڈی کے پردے تک پہنچ جائے چار اونٹ یا ان کی قیمت کے مساوی سونا اور چاندی کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ہڈی نظر آنے لگے تو پانچ فیصد دیت دی جائے گی۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی المموضحتہ بخمس من الابل اوقیمتھا من الذھب والورق۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جس سے ہڈی دکھائی دینے لگے پانچ اونٹ یا ان کی قیمت کے برابر سونا اور چاندی کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ہڈی ٹوٹ جائے تو دیت کا دس فیصد دیا جائے گا چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ

قضی امیرالمومنین فی الھاشمتہ بعشر من الابل۔ (الفقیہ)

امیرالمومنین نے اس ضرب میں جس سے ہڈی ٹوٹ جائے دس اونٹوں کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ہڈی کے ذرے الگ ہو جائیں تو پندرہ فیصد دیت دی جائے گی۔

قضی فی المنقلتہ خمستہ عشر من الابل۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے ہڈی کے ذروں کے الگ ہونے کی صورت میں پندرہ اونٹوں کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ضرب جوف دماغ یا بھیجے کے پردہ تک پہنچے تو ایک تہائی دیت دی جائے گی۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی الجائفتہ وفی الماموتہ ثلث الدیتہ۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے جوف دماغ اور ہڈی کے پردے تک پہنچنے والی ضرب میں ایک تہائی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر کوئی شخص ایسا کام کرے جس سے کسی زن مسلمہ کا حمل ساقط ہو جائے تو جسمانی ساخت کے منازل کے اعتبار سے اس کی دیت بیس دینار سے ایک ہزار دینار تک ہو گی۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک حاملہ عورت کو اس طرح

زد و کوب کیا کہ اس کا حمل جو بندھے ہوئے خون کی صورت میں تھا ساقط ہو گیا۔ امیرالمومنینؑ سے اس کی دیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی دیت چالیس دینار ہو گی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

ولقد خلقنا الانسان من سلالتہ من طین ثم جعلنا نطفتہ فی قرار مکین ثم جعلنا النطفتہ علقہ فجعلنا العلقہ مضغتہ فجعلنا المضغہ عظاما فکسونا العظام لحما ثم انشانا خلقا آخرت فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں اسے نطفہ کی صورت میں رکھا پھر اس نطفہ کو بندھا ہوا خون بنایا پھر بندھے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچا تیار کیا پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر (اس میں روح پھونک کر) اسے دوسری شکل و صورت دے دی تو بابرکت ہے وہ خدا جو ہر بنانے والے سے بہتر بنانے والا ہے۔

پھر فرمایا کہ نطفہ کی دیت بیس دینار۔ بندھے ہوئے خون کی چالیس دینار لوتھڑے کی ساٹھ دینار اور ہڈیوں کی تخلیق کے بعد اسی (80) دینار اور صورت کی تکمیل کے بعد سو دینار اور روح پڑنے کے بعد ہزار دینار ہو گی۔ اگر کسی یہودی نصرانی یا مجوسی عورت کا بچہ ساقط کر دیا جائے تو اس کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ ہو گی چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

ان امیرالمومنین قضی فی جنین الیھودیہ والنصرانیہ والمجوسیہ عشر دیتہ امہ۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے یہودیہ نصرانیہ اور مجوسیہ عورت کے بچے کے ساقط کرنے کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ قرار دی۔

مسائل مشکلہ

امیرالمومنین علیہ السلام مشکل سے مشکل مسائل اور پیچیدہ سے پیچیدہ منزاعات کے حل کرنے میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے اور جن مسائل کا حل تلاش کرنے میں اہل نظر کی فکری قوتیں اور ذہنی کاوشیں بیکار ہو جاتی تھیں۔ آپؑ کا ذہن رسا انہیں فوراً حل کر دیتا تھا۔ اگرچہ علماء و فقہاء نے مسائل مشکلہ کے عنوان سے بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ مگر اس منزل کے پہلے راہ پیا آپؑ ہیں اور آپؑ ہی کے افکار و نظریات کی روشنی نے اس منزل کی طرف رہنمائی کی ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کے چند قضایا و مسائل درج کئے جاتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ وہ شخص کون ہو سکتا ہے جس نے صبح کے وقت ایک عورت سے عقد کیا شام کو اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور اس کے بعد وہ شخص مرگیا اور بیوی اور یہ نومولود بچہ اس کے وارث قرار پائے۔ حضرت ابوبکر کوئی جواب نہ دے سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے سنا تو فرمایا کہ وہ عورت اپنے آقا کی حاملہ کنیز تھی آقا نے اسے آزاد کر دیا اور پھر اس سے نکاح کر لیا۔ صبح کو عقد ہوا اور شام کو ولادت ہوئی اور اس کے مرنے کے بعد یہی دونوں اس کے وارث ہوں گے۔

عقبہ ابن ابی عقبہ وفات پا گیا۔ حضرتؑ چند لوگوں کے ہمراہ اس کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ تشیع جنازہ کے دوران آپؑ نے ایک شخص سے فرمایا کہ عقبہ مرگیا ہے لہٰذا تمہاری بیوی تم پر حرام ہو گئی ہے۔ حضرت عمر وہاں موجود تھے انہوں نے کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص مرجاتا ہے اور دوسرے شخص کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ عقبہ کا غلام ہے اور اس کے نکاح میں ایک آزاد عورت ہے جو عقبہ کے ورثاء میں شامل ہے اور اس غلام میں بھی اس کا حصہ ہے اور عورت اپنے غلام پر حرام ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی اپنے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔

ایک عورت نے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ کیا آپؑ اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ ایک جوان شوہر دار عورت اپنے باپ سے اجازت لے کر دوسرا شوہر کر لے۔ لوگ اس سوال پر متعجب ہوئے مگر امیرالمومنین علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کی خواہش کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ اس کا شوہر عورت کے قابل نہیں ہے۔ آپؑ نے اس کے شوہر کو طلب کیا اور فرمایا کہ تم اسے طلاق دے دو اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے طلاق دے دی اور آپ نے عدہ کا انتظار کئے بغیر اس کا عقد ایک دوسرے شخص سے کر دیا کیونکہ ایسی صورت میں عدہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کو بھی پیش آیا اور وہ یہ کہ ایک عورت نے ان سے کہا کہ۔

ان زوجی یقوم اللیل و یصوم النہار وانا اکرہ ان اشکوہ الیک وھو یعمل بطاعۃ اللہ۔ (استیعاب)

میرا شوہر رات کو نمازیں پڑھتا ہے اور دن کو روزہ رکھتا ہے مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں آپ سے اس کا گلہ کروں جبکہ وہ اللہ کا اطاعت گزار ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر تو وہ بہت اچھا آدمی ہوا' خدا اسے جزائے خیر دے کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے منع کردوں کہ وہ دن کو روزہ نہ رکھے اور رات کو نماز نہ پڑھے۔ کعب ابن سور وہاں بیٹھا تھا اس نے کہا کہ اس عورت کا مقصد یہ ہے کہ اس کا شوہر ہمہ وقت عبادت میں لگا رہتا ہے اور بیوی کے حقوق ادا کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ حضرت عمر نے کہا کہ تم خوب سمجھے اب تم ہی اس کا فیصلہ کرو۔ اس نے کہا کہ مرد کو چار عورتیں کرنے کی اجازت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ چار راتوں میں سے ایک رات اس کے حصہ میں آتی ہے۔ لہٰذا وہ چار راتوں میں سے تین راتیں عبادت میں صرف کرے اور ایک رات اس کے لئے مخصوص کردے۔ حضرت عمر کو کعب کا یہ فیصلہ پسند آیا اور اسے بصرہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ جہاں وہ جنگ جمل میں اونٹ کی مہار تھامنے پر کسی کا تیر لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

ایک شخص نے اپنی کنیز جس سے اس کا ایک لڑکا بھی تھا اپنے ایک غلام سے بیاہ دی۔ اس شخص کا انتقال ہوا تو وہ لڑکا اس کا وارث قرار پایا اور وہ کنیز اپنے لڑکے کی طرف منتقل ہونے کی بنا پر آزاد قرار دے دی گئی۔ کیونکہ ماں اپنے بیٹے کی غلامی میں نہیں آسکتی پھر وہ لڑکا مر گیا اور وہ عورت اس کے ترکہ کی وارث قرار پائی۔ اس ترکہ میں وہ غلام بھی شامل تھا جس سے اس کا عقد ہوا تھا۔ اب وہ عورت یہ کہتی تھی کہ یہ میرا غلام ہے اور غلام یہ کہتا تھا کہ یہ میری بیوی ہے۔ جب کوئی تصفیہ نہ کر سکے تو حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوئے مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام اس پر مطلع ہوئے تو آپؑ نے اس عورت سے کہا کہ وہ تیرا غلام ہے چاہے تو اسے آزاد کر یا اپنی غلامی میں رکھ یا بیچ ڈال اگر وہ تیری طرف منتقل ہونے کے بعد زنا شوئی کے تعلقات قائم کرتا تو سزا کا مستحق ہوتا۔

ایک عورت حضرتؑ کے پاس آئی اور کہا کہ میں عقبہ ابن عامر جہنی کی بیوی ہوں جو مال کثیر چھوڑ کر مر گیا ہے مگر عقبہ کے چچا زاد بھائیوں نے اس کے ترکہ پر قبضہ کر لیا ہے حالانکہ میں حاملہ ہوں اور پیدا ہونے والا بچہ ہی اس کا صحیح وارث ہے اور اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں عقبہ کے دو غلاموں سالم اور میمون کو پیش کیا جنہیں عقبہ کے بعد اس کے چچا زاد بھائیوں نے آزاد کر دیا تھا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر اس کے ہاں بچہ پیدا ہو تو نہ اسے کچھ ملے گا اور نہ اس کے بچے کو اور اگر اس کے ہاں بچہ پیدا نہ ہو تو اسے ترکہ میں سے چوتھا حصہ دیا جائے گا۔ اس کی توجیہ یہ بیان فرمائی کہ بچہ پیدا ہونے کی صورت میں اس کی زوجیت اور بچے کی فرزندی کی گواہی دینے والے اس کے دعویٰ کی بنا پر غلامی پر باقی ہوں گے کیونکہ عقبہ کے چچا زاد بھائی نہ وارث ہیں اور نہ انہیں آزاد کرنے کا حق پہنچتا ہے اور غلام کی گواہی اس موقع پر کافی نہیں ہے اور بچہ نہ ہونے کی صورت میں چچازاد بھائی وارث ہوں گے اور وارثوں ہی

نے ان دونوں کو آزاد کیا ہے لہٰذا آزادی کی بنا پر ان کی گواہی زوجیت کے بارے میں قابل قبول ہو گی۔

ایک نوجوان حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یاامیرالمومنین علیہ السلام میرا باپ چند آدمیوں کے ہمراہ سفر پر گیا۔ وہ تو سب کے سب واپس آ گئے مگر میرا باپ پلٹ کر نہیں آیا میں نے ان سے پوچھا تو یہ جواب دیا کہ وہ سفر کے دوران مر گیا ہے اور اس کے مال کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا حالانکہ میرے علم میں ہے کہ وہ مال کثیر لے کر نکلا تھا مجھے شبہہ ہے کہ انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے اور اس کا مال آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ میں قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہو چکا ہوں مگر اس نے میرا دعویٰ مسترد کر دیا ہے اب میں آپؑ کے پاس فریاد لے کر آیا ہوں۔ حضرتؑ اسے اور ان آدمیوں کو لے کر شریح کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے شریح تم نے کس بنیاد پر اس نوجوان کے دعویٰ کو مسترد کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس نوجوان سے گواہ طلب کئے مگر یہ کوئی گواہ پیش نہ کر سکا لہٰذا میں نے ان لوگوں سے حلف لے کر اس کا دعویٰ مسترد کر دیا۔ فرمایا کہ اے شریح کیا اس طرح کے دعووں کا یوں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پھر حضرتؑ نے اس کا فیصلہ اس طرح کیا کہ ان لوگوں کو الگ الگ بٹھایا اور ہر ایک پر ایک ایک آدمی نگران مقرر کر دیا اور ان میں سے ایک کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم کس دن نکلے تھے، مہینہ اور سال کون سا تھا، مرنے والے کا مرض کیا تھا، کتنے دن بیمار رہا، غسل و کفن کس نے دیا، نماز کس نے پڑھائی اور قبر میں کون اترا۔ اس نے جو جوابات دیئے عبیداللہ ابن ابی رافع انہیں حضرتؑ کے حکم سے قلمبند کرتے رہے۔ جب تمام متعلقہ امور پوچھ چکے تو آپ نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور گرد و پیش بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی صدائے تکبیر بلند کی پھر دوسرے آدمی کو بلایا اس نے اس خیال سے کہ پہلے آدمی نے اعتراف جرم کر لیا ہے کہا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام میں ان لوگوں کے ساتھ شریک جرم ہونا نہ چاہتا تھا مگر مجھے کہہ سن کر شریک کر لیا گیا اور ہم سب نے مل کر اسے قتل کیا اور اس کا مال آپس میں بانٹ لیا۔ اس کے بعد دوسروں کو ایک ایک کر کے بلایا انہوں نے انکار کی گنجائش نہ پا کر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ جب وہ اقرار کر چکے تو آپ نے انہیں مقتول کے خون کا مجرم اور اس کے مال کا ذمہ دار قرار دیا۔

ایک شخص نے اپنے غلام کو حضرتؑ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ میرا غلام ہے اور اس نے مجھ سے اجازت حاصل کئے بغیر عقد کر لیا ہے فرمایا کہ تم اسے اس عورت سے الگ کر دو اس نے غلام سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اس عورت کو طلاق دے دو۔ حضرتؑ نے یہ سنا تو فرمایا کہ تم نے طلاق کا حکم دے کر اپنی رضا مندی کا اظہار اور نکاح کے جواز کا اقرار کیا ہے لہٰذا اب اسے اختیار ہے چاہے طلاق دے یا نہ دے۔

حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے یہ قسم کھائی تھی کہ اگر وہ رمضان کے مہینہ میں اپنی بیوی سے ہم بستری نہ کرے تو اس کی بیوی کو تین طلاقیں ہو جائیں گی حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ اسے لے کر سفر پر روانہ ہو جائے اور پھر دن کے وقت ہم بستری کر لے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ ان لوگوں کے لئے چھٹکارے کی ایک صورت تجویز کی ہے جو قسم کے ذریعہ طلاق کو صحیح سمجھتے ہیں۔

ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر کہا کہ میرے سامنے چند خرمے رکھے ہوئے تھے میری بیوی نے ایک خرما اٹھا کر منہ میں رکھ لیا میں نے قسم کھائی کہ وہ نہ اسے پھینکے اور نہ اسے نگلے فرمایا وہ آدھا کھا لے اور آدھا پھینک دے تم قسم سے بری الذمہ ہو جاؤ گے۔

متفرق سوالات اور ان کے جوابات

امیرالمومنین علیہ السلام سے یہود و نصاریٰ کے علماء و احبار مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے۔ کبھی علمی آزمائش مقصود ہوتی تھی اور کبھی علمی استفادہ۔ آپؑ ان کے ہر سوال پر کان دھرتے اور اس کی نوعیت کچھ بھی ہوتی بغیر کسی ذہنی دباؤ کے ایسا جواب دیتے کہ وہ مطمئن ہو کر خاموشی اختیار کر لیتے یا حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔ذیل میں آپؑ کے چند جوابات درج کئے جاتے ہیں۔ایک یہودی نے آپؑ سے سوال کیا کہ۔

اخبرنی عمالیس اللہ و عمالیس عنداللہ و عمالا یعلمہ اللہ۔ (توحید صدوق) مجھے بتائیے کہ وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے لئے نہیں ہے اور وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے ہاں نہیں ہے اور وہ کیا چیز ہے جس کا اسے علم نہیں ہے۔

فرمایا کہ وہ چیز جسے اللہ نہیں جانتا وہ تمہارا یہ قول ہے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور اللہ نہیں جانتا کہ اس کا کوئی بیٹا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے **قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم** (اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہیں جانتا) اور وہ چیز جو اللہ کے لئے نہیں ہے وہ شریک ہے اور جو چیز اس کے ہاں نہیں ہے وہ ظلم ہے۔ اس یہودی نے یہ جواب سنا تو کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

ایک نصرانی نے حضرتؑ سے کہا کہ **اخبرنی عن وجہ الرب** "مجھے اللہ کے چہرے کے بارے میں بتائیے" حضرت نے کچھ لکڑیاں منگوا کر آگ روشن کی جب شعلے بھڑک اٹھے تو فرمایا **این وجہ ھذہ النار** "اس آگ کا چہرہ کس طرف ہے" اس نے کہا کہ آگ کا رخ چاروں طرف یکساں ہوتا ہے فرمایا کہ یہ آگ جو ہماری روشن کی ہوئی ہے اس کا رخ متعین نہیں کیا جا سکتا تو اللہ جو کسی چیز سے مشابہت نہیں رکھتا اس کا رخ کیسے متعین کیا جا سکتا ہے۔پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ پورب اور پچھم اللہ ہی کے لئے ہیں لہٰذا جدھر رخ کر لو گے وہیں اللہ کا سامنا ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کون سی عبادت ہے کہ اگر بجا لائی جائے تو عقوبت اور ترک کی جائے تو عقوبت فرمایا کہ وہ نماز ہے جو نشہ کی حالت میں پڑھی جائے کیونکہ نشہ میں نہ نماز درست ہے اور نہ تکلیف ساقط۔

سلطان روم کے ایک قاصد نے پوچھا کہ اس آدمی کے بارے میں آپؑ کیا کہتے ہیں جو نہ جنت کا خواہشمند ہے نہ دوزخ سے ہراساں نہ اللہ سے ڈرتا ہے اور نہ سجدہ و رکوع کرتا ہے خون اور غیر ذبیحہ جانور کا گوشت کھاتا ہے بن دیکھے گواہی دیتا ہے فتنہ کو دوست رکھتا ہے اور حق سے کراہت کرتا ہے فرمایا کہ جو نہ جنت کا طالب ہے نہ دوزخ

سے ہراساں اور نہ اللہ سے خائف وہ اللہ کا دوست ہے اس لئے کہ وہ جنت کی خواہش اور دوزخ کے خوف سے بالاتر رہ کر اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے تو اس کے عدل کی بنا پر اور ظلم کی بنا پر نہیں ڈرتا۔ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ اللہ ظالم نہیں ہے اور رکوع و سجود نہیں کرتا تو نماز جنازہ میں اس لئے کہ اس میں نہ رکوع ہے اور نہ سجود' ٹڈی اور مچھلی کا گوشت کھاتا ہے اور ان دونوں کو ذبح نہیں کیا جاتا اور کلیجی کھائی جاتی ہے اور وہ خون ہی خون ہوتی ہے اور اولاد کو دوست رکھتا ہے اور قرآن مجید میں اولاد کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے **انما اموا لکم و اولاد کم فتنہ** "تمہارا مال اور اولاد فتنہ ہے" جنت و دوزخ کی گواہی دیتا ہے حالانکہ اس نے نہ جنت کو دیکھا ہے اور نہ دوزخ کو اور موت ناگوار معلوم ہوتی ہے اور وہ سراسر حق ہے۔

یہودیوں کی ایک جماعت نے چند سوالات کے ضمن میں پوچھا کہ وہ کون تھا جس نے اپنی قوم کو ڈرایا اور وہ نہ انسانوں میں سے تھا اور نہ جنوں میں سے فرمایا وہ چیونٹی تھی جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کو دیکھ کر کہا۔

یا ایھا النمل ادخلو اسساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ وھم لا یشعرون۔

اے چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں کچل ڈالے اور انہیں خبر بھی نہ ہونے پائے۔

پوچھا وہ کون سی جگہ تھی جس پر ایک ہی مرتبہ سورج چمکا اور پھر اس پر سورج کی شعاعیں نہیں پڑیں فرمایا وہ رود نیل کی نچلی سطح ہے جس پر سے بنی اسرائیل گزرے اور فرعون اور اس کا لشکر موجوں کی لپیٹ میں آیا۔ پوچھا کہ مخلوقات میں وہ کون کون جانور ہیں جو ماں کے شکم سے پیدا نہیں ہوئے فرمایا وہ حضرت آدمؑ جناب حواؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اژدھا' حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے ہاتھ سے ذبح ہونے والا مینڈھا اور وہ پرندہ جس کا ڈھانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنایا اور وہ اللہ کے حکم سے پرواز کرنے لگا۔

ایک شخص نے خطبہ کے دوران پوچھا کہ وہ کون سا جاندار ہے جو دوسرے جاندار کے شکم سے نکلا مگر ان دونوں میں کوئی قرابت نہ تھی فرمایا وہ یونس ابن متی علیہ السلام تھے جو مچھلی کے پیٹ سے نکلے۔

پوچھا گیا کہ وہ کون سا درخت تھا جسے پانی سے سیراب نہیں کیا گیا فرمایا کہ وہ درخت جو حضرت یونس علیہ السلام پر سایہ ڈالنے کے لئے اگا۔ قرآن مجید میں ہے۔

وانبتنا علیہ شجرہ من یقطین۔

ہم نے انکے سر پر (سایہ کے لئے) کدو کا درخت لگایا۔

پوچھا گیا کہ وہ کون ذی روح ہے جو جماد سے پیدا ہوا۔ فرمایا وہ ناقہ صالح علیہ السلام ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کون ہے جو زندگی میں پانی سے سیراب ہوتا رہا اور مرنے کے بعد کھاتا ہے فرمایا وہ عصائے موسیٰ علیہ السلام تھا جب تک وہ درخت کا جزو رہا پانی سے سیراب ہوتا رہا اور جب شاخ سے الگ ہو کر مردہ ہو گیا تو جادو گروں کی رسیوں اور چھڑیوں کو نگل گیا۔

ایک یہودی عالم راس الجالوت نے آپ سے پوچھا کہ تمام چیزوں کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ فرمایا پانی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وجعلنا من ماء کل شئی حی۔ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

پوچھا کہ وہ دو گھٹنے بڑھنے والی چیزیں کون سی ہیں جن کا گھٹاؤ بڑھاؤ نظر میں آتا ہے فرمایا کہ وہ شب و روز ہیں جو گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ پوچھا کہ وہ کون سا پانی تھا جو نہ زمین سے پھوٹا اور نہ آسمان سے برسا فرمایا وہ پسینہ تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو دوڑا کر حاصل کیا تھا اور ملکہ سبا بلقیس کے پاس بھیجا تھا پوچھا وہ کون سی چیز ہے جو بے جان ہونے کے باوجود سانس لیتی ہے فرمایا وہ صبح ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے **والصبح اذا تنفس** "صبح کی قسم جب وہ سانس لے (روشن ہو جائے)" پوچھا وہ کون سی قبر ہے جو صاحب قبر کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی فرمایا وہ مچھلی ہے جس کے شکم میں حضرت یونس علیہ السلام رہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ وہ کون ہے جس پر بہتان باندھا گیا لیکن وہ نہ انسان ہے اور نہ جن فرمایا کہ وہ بھیڑیا ہے جس پر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جھوٹ باندھتے ہوئے کہا کہ **فاکلہ الذئب** (اسے بھیڑیا کھا گیا)۔

پوچھا گیا کہ وہ کون ہے جس کا شمار نہ انسانوں میں ہوتا ہے اور نہ جنوں میں اور اس پر وحی نازل ہوئی فرمایا وہ شہد کی مکھی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے **واوحی ربک الی النحل۔** (تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی)

پوچھا گیا کہ وہ مبعوث ہونے والا کون ہے جو نہ جن و انس میں سے ہے اور نہ ملائکہ و شیاطین میں سے۔ فرمایا وہ کوا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے **فبعث اللہ غرابا** "خدا نے ایک کوے کو بھیجا"

پوچھا گیا کہ وہ رسول کون ہے جو نہ انسانوں اور جنوں میں سے ہے اور نہ فرشتوں اور شیطانوں میں سے فرمایا وہ ہد ہد ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا **اذھب بکتابی ھذا فالقہ الیھم** "ہمارا یہ خط لے کر جا اور ان لوگوں کے آگے ڈال دے"

کعب احبار نے پوچھا کہ وہ کون ہے جس کا کوئی باپ نہیں اور وہ کون ہے جس کا کوئی قوم و قبیلہ نہیں اور وہ کون ہے جس کا کوئی قبلہ نہیں فرمایا جس کا کوئی باپ نہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جس کا کوئی قبیلہ نہیں وہ

حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور جس کا کوئی قبلہ نہیں وہ خانہ کعبہ ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ بہترین چیز جو اللہ نے خلق کی ہے کیا ہے۔ فرمایا کلام پھر پوچھا کہ بدترین چیز کیا ہے فرمایا کلام مقصد یہ ہے کہ اچھی بات سے اچھی کوئی چیز نہیں اور بری بات سے بری کوئی چیز نہیں۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ دو بھائی کون تھے جو ایک دن پیدا ہوئے اور ایک دن مرے۔ ان میں سے ایک کی عمر پچاس برس تھی اور دوسرے کی عمر ڈیڑھ سو برس تھی فرمایا وہ دو بھائی عزیر اور عزرہ تھے اللہ نے عزیر کو سو سال مردہ رکھا اور پھر اسے جلایا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے **فاماتہ اللہ مائتہ عام ثم بعثہ** (خدا نے اسے موت دی اور سو برس تک مردہ رکھا پھر اسے زندہ اٹھایا)

پوچھا گیا کہ وہ باپ اور بیٹا کون سے ہیں کہ باپ کی عمر کم اور بیٹے کی عمر زیادہ ہے فرمایا وہ عزیر اور ان کے فرزند ہیں۔ چنانچہ جب اللہ نے عزیر کو سو سال مردہ رکھنے کے بعد زندہ کیا تو اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی اور ان کے بیٹے کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔

ایک شخص نے پوچھا کہ سنت، بدعت، جماعت اور فرقہ کے معانی کیا ہیں فرمایا

السنتہ ماسن رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ والبدعتہ ما احدث بعدہ والجماعتہ اهل الحق وان کانوا قلیلا والفرقہ اهل الباطل وان کانوا کثیرا۔ (معانی الاخبار)

سنت وہ ہے جس کا اجراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے (اپنے قول و عمل سے) کیا اور بدعت یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوئی چیز ایجاد کر لی جائے اور جماعت سے مراد اہل حق کی جماعت ہے اگرچہ وہ کم ہو اور فرقہ سے مراد اہل باطل کا گروہ ہے اگرچہ وہ کثرت میں ہو۔

ابو سعید خدری نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی۔

لایبقی علی وجہ الارض بعد مائتہ الامات۔ (مروج الذهب ج ا ص ۴۱۲)

ایک صدی کے بعد روئے زمین پر ایک بھی زندہ باقی نہیں رہے گا۔

لوگ اس حدیث کو سن کر پریشان ہو گئے۔ حضرتؑ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ ابو سعید نے صحیح بیان کیا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سو برس کے بعد زمین آدمیوں سے خالی ہو جائے گی بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیکھا ہے ایک صدی کے بعد ان میں سے ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔

ایک دہریہ نے حضرتؑ سے کہا کہ مسلمانوں کا یہ نظریہ ہے کہ کافر آگ میں جلتا ہے۔ یہ میرے پاس کافر کی ہڈی ہے مگر اس میں ذرا بھی تو تپش نہیں ہے آپؑ نے چقماق طلب کیا اور رگڑ کر اس میں سے آگ نکالی پھر وہ پتھر اسے دیا اور کہا کہ اسے چھو کر دیکھو یہ بظاہر ٹھنڈا ہے مگر اس کے اندر آگ بھری ہوئی ہے۔

خطابی و اقناعی جوابات

امیرالمومنین علیہ السلام کے بعض جوابات کی نوعیت خطابی و اقناعی ہوتی تھی۔ ایسے جوابات کا موقع و محل وہاں ہوتا ہے جہاں تحقیقی و تفصیلی جواب سائل کی ذہنی سطح سے بلند تر ہو اور اسے ایک لطیف و شگفتہ جواب دے کر اس کی ذہنی تسکین کا سامان کرنا مقصود ہو۔ چنانچہ اس قسم کے جوابات دلاویز و خوش آئند ہونے کی وجہ سے فوراً ذہن میں اتر جاتے ہیں اور سائل کو بڑی حد تک مطمئن کر دیتے ہیں۔ حضرتؑ کے اس قسم کے چند جوابات درج کئے جاتے ہیں جو اقناعی ہونے کے باوجود حقیقت و واقعیت سے الگ بھی نہیں ہیں۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ اگر کسی شخص کو گھر میں بند کر دیا جائے اور وسائل معاش روک دئے جائیں تو اس کی روزی کدھر سے آئے گی۔ فرمایا جدھر سے اس کی موت آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ روزی رسان ظاہری اسباب و ذرائع کا محتاج نہیں ہے جو ذات پتھر اور ریشم کی تاروں میں لپٹے ہوئے کیڑے کی روزی کا سامان کرتی ہے وہ انسان کی رزق رسانی کا بھی سامان کر سکتی ہے اگرچہ بظاہر رزق کے دروازے مسدود ہوں۔

پوچھا گیا کہ خداوند عالم اس ان گنت مخلوق کا حساب کیونکر لے گا۔ فرمایا جس طرح مخلوق کے ان گنت ہونے کے باوجود اسے روزی دیتا ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ حساب کیونکر لے گا جبکہ انسان اسے دیکھے گا نہیں۔ فرمایا جس طرح انہیں روزی دیتا ہے اور وہ اسے دیکھتے نہیں۔

پوچھا گیا کہ پانی کا ذائقہ کیا ہے فرمایا **طعم الحیاۃ** ”جو زندگی کا ذائقہ ہے“

پوچھا گیا کہ مشرق و مغرب کے درمیان کتنا فاصلہ ہے فرمایا جتنا سورج ایک دن میں طے کرتا ہے۔

پوچھا گیا کہ زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ کتنا ہے فرمایا اتنا کہ آنکھ اسے طے کر سکے اور مظلوم کی دعا وہاں تک پہنچ سکے۔ اس سوال کا جواب اس سے بہتر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ اس وسیع کائنات کے حدود تک پھیلا ہوا ہے جس کی حد بندی تو ہو نہیں سکتی البتہ ایک مظلوم کی دعائے مستجاب اس کی وسعتوں پر چھا سکتی ہے۔ کیونکہ دعا کو شرف قبولیت بخشنے والا اس کائنات پر محیط ہے۔ حضرتؑ کے اس ارشاد میں کہ ”آنکھ اسے طے کر لے“ آسمان کے حد نظر ہونے کا بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

پوچھا گیا کہ جھوٹ اور سچ میں کتنا فاصلہ ہے فرمایا چار انگلیوں کا (یعنی کان اور آنکھ کا درمیانی فاصلہ) مطلب یہ ہے کہ ہر سنی سنائی بات پر اس وقت تک اعتماد صحیح نہیں ہے جب تک قابل اعتماد ذرائع سے اس کا علم و یقین نہ ہو جائے۔

کعب ابن اشرف نے کہا کہ قرآن مجید میں ہے **وجنتہ عرضھا السموات والارض** ”جنت کی وسعت آسمان و

زمین کے برابر ہے" تو پھر دوزخ کہاں پر ہے فرمایا۔

اذا جاء اللیل این یکون النهار و اذا جاء النهار این یکون اللیل۔ جب رات آتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔

کہا اللہ کے علم میں فرمایا کہ پھر جنت بھی اللہ کے علم میں ہے۔

حاضر جوابی

حاضر جوابی انسان کی فطری ذہانت کی آئینہ دار ہے اور برجستہ و برعمل جواب سوچ بچار کے بعد دئے جانے والے جواب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب کی بات کی ایک طرح سے تردید ہوتی ہے مگر جواب کی شگفتگی و برجستگی ناگواری کا احساس نہیں ہونے دیتی اور مخاطب بھی خندہ زیر لب کے ساتھ داد تحسین دیئے بغیر نہیں رہتا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے **نعم الناصر الجواب الحاضر** "برجستہ جواب بہترین مددگار ہے"

امیرالمومنین علیہ السلام کے گوناگوں خصوصیات میں ایک حاضر جوابی بھی ہے۔ آپؑ خوش طبعی کے موقع پر خوش طبعی کے انداز میں اور طنز کے موقع پر طنزیہ انداز میں ایسا نپا تلا جواب دیتے جو اپنی دلآویزی سے بہار آفریں فضا پیدا کر دیتا یا سننے والوں کی زبانوں پر خاموشی کا پہرہ بٹھا دیتا۔ ذیل میں حضرتؑ کے چند جوابات درج کئے جاتے ہیں جن سے آپؑ کے ذہنی استحضاء اور طبعی شگفتگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک یہودی عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے طرز عمل پر اعتراض کرتے ہوئے حضرتؑ سے کہا کہ **مادفنتم نبیکم حتی اختلفتم فیه** (تم لوگ اپنے نبی کو دفن بھی نہ کر چکے تھے کہ ان کے بارے میں اختلاف شروع کر دیا) حضرت نے فرمایا **انما اختلفنا عنه لا فیه** (ہم نے ان کے بارے میں اختلاف نہیں کیا بلکہ ان کی نیابت کے سلسلہ میں اختلاف ہوا) پھر فرمایا کہ تمہاری حالت یہ تھی کہ جب تمہیں مصر سے نکالا گیا اور ابھی تمہارے پیر دریا کی تری سے سوکھنے نہ پائے تھے کہ تم بے راہ ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ۔

اجعل لنا الها کمالهم الهته فقال انکم قوم تجهلون۔ ہمارے لئے بھی ایک ایسا خدا بنا دیجئے جیسے ان لوگوں کے خدا ہیں اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بیشک تم ایک جاہل قوم ہو۔

اس یہودی کا مقصد تو یہ تھا کہ مسلمان یہودیوں پر تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے شریعت میں تغیرو

تبدل کر کے اختلافات کی بنیاد رکھی مگر مسلمان کب اختلاف سے بچ سکے ان میں تو نبی کے دفن ہونے سے پہلے ہی اختلاف و نزاع کی صورت پیدا ہو گئی۔ حضرتؑ نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ اولا" تو یہ اختلاف نبی کی نبوت و صداقت کے بارے میں نہ تھا بلکہ ان کی نیابت کے سلسلہ میں پیدا ہوا اور تم نے تو اپنے نبی کی زندگی ہی میں بے راہروی اختیار کر لی اور توحید سے منحرف ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمائش کرنے لگ گئے کہ جیسے اور لوگوں کے پاس پرستش کے لئے بت ہیں ہمارے لئے بھی ویسا بت بنا دیجئے۔ جس پر تمہارے ہی نبی نے تمہیں شریعت سے بے خبر اور دین کی روح سے نا آشنا کہا۔

ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے آپؑ سے کہا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں آپؑ سے بہتر تھے۔ فرمایا بہتر کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ **عبدت اللہ قبلھما و عبدتہ بعدھما** "میں نے ان دونوں سے پہلے اللہ کی عبادت کی اور ان کے بعد بھی مصروف عبادت ہوں" مقصد یہ ہے کہ معیار فضیلت ایمان و عمل ہے۔ میں ایمان میں سابق ہوں اور عمل کے لحاظ سے میرا زمانہ طویل ہے۔

ایک شخص نے آپ سے کہا کہ **ما اقصر سیفک** "آپ کی تلوار کتنی چھوٹی ہے" حضرت نے اسے یہ جواب دے کر خاموش کر دیا کہ **اطولہ بخطوہ** "میں قدم آگے بڑھا کر اسے طویل کر لیا کرتا ہوں"

ایک شخص نے جو بظاہر دوست اور بباطن آپؑ سے عناد رکھتا تھا آپؑ کی بڑھ چڑھ کر مدح اور توصیف کی تو فرمایا **انادون ماتقول وفوق مافی نفسک** "جو تمہاری زبان پر ہے میں اس سے کم ہوں اور جو کچھ تمہارے دل میں ہے اس سے زیادہ ہوں"

ایک مرتبہ آپؑ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان چل رہے تھے ان دونوں کا قد حضرتؑ کے قد سے نکلتا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپؑ کے قد پر طنز کرتے ہوئے کہا **یا علی انت فینا بمنزلہ النون فی لنا** "اے علی علیہ السلام آپ ہم دونوں کے درمیان اس طرح ہیں جیسے لنا میں نون" حضرت نے فورا" جواب دیا **لو لا انا بینکما لکنتمالا** "اگر میں تم دونوں کے درمیان نہ ہوتا تو تم لا ہوتے" مطلب یہ ہے کہ جس طرح لنا میں سے نون نکال لیا جائے تو لا باقی رہ جاتا ہے اسی طرح میں الگ ہو جاؤں تو تم لاشے ہو کر رہ جاؤ گے۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام اور چند صحابہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھجوریں کھاتے اور گٹھلیاں حضرت علی علیہ السلام کے سامنے رکھ دیتے۔ آپ کی دیکھا دیکھی صحابہ نے بھی گٹھلیاں آپ کے آگے ڈھیر کرنا شروع کر دیں۔ جب فارغ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ کھجوریں کس نے کھائی ہیں۔ صحابہ نے کہا **من اکثر نواتہ فھوا کول** "جس کے آگے گٹھلیاں زیادہ ہیں اسی نے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں" حضرت علی علیہ السلام نے کہا **یا لا من اکلہ مع النواہ فھوا**

کول "ایسا نہیں بلکہ جس نے گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھائیں وہ زیادہ کھانے والا ہے"

اخبار غیبیہ

انبیاء و آئمہ کا علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک عادی و اکتسابی اور دوسرا موہبی والہامی۔ علم عادی وہ ہے تعلم جو عام ذرائع و اسباب کے تابع ہوتا ہے جیسے مشاہدہ یا عادل افراد کی گواہی سے کسی واقعہ کا علم اور علم موہبی وہ ہے جو وحی و الہام اور القائے ربانی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس علم میں تعلیم و اکتساب کا قطعا" دخل نہیں ہے بلکہ یہ موہبہ الہٰی اور عطیہ خداوندی ہے۔ علم اکتسابی جذبۂ بشریت سے تعلق رکھتا ہے اور علم موہبی مقام نبوت و عصمت سے وابستہ ہے۔ اسی علم کے ذریعہ انبیاء و آئمہ امور غیبیہ پر مطلع ہوتے اور پیش آئند واقعات کی خبر دیتے ہیں۔ اگرچہ قرآن مجید میں علم غیب کو ذات الہٰی سے مختص کیا گیا۔ ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ۔

کہہ دو کہ اللہ کے علاوہ زمین و آسمان میں بسنے والوں میں سے کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔

مگر دوسرے مقام پر پسندیدہ و برگزیدہ رسولوں کا استثناء بھی موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد الہٰی ہے۔

عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول۔

وہی غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب کی باتوں کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو وہ پسند کرے۔

اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ علم غیب ذات باری سے بایں معنی مختص ہے کہ اس کا علم مستقلاً" اور بالذات ہے اور پسندیدہ رسولوں کو ذاتی طور پر امور غیبیہ کا علم نہیں ہوتا بلکہ خداوند عالم کے بتانے اور وحی و الہام کے ذریعہ آگاہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب اللہ اپنے رسولوں کو پردہ غیب میں چھپے ہوئے امور سے آگاہ کرتا ہے تو اس میں بھی کوئی استبعاد نہ ہونا چاہیئے کہ آئمہ و خاصان خدا بھی پیغمبر کی تعلیم اور القاو الہام کے ذریعہ غیب کی باتوں سے باخبر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے زمانہ آئندہ میں رونما ہونے والے حوادث و واقعات کے سلسلہ میں جو پیشین گوئیاں فرمائی ہیں وہ اس امر کا روشن ثبوت ہیں کہ آپ کے علم و ادراک کا ذریعہ صرف ظاہری حواس نہ تھے بلکہ وارث علم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے اعتبار سے ان امور پر بھی اطلاع رکھتے تھے جو دائرہ محسوسات سے باہر اور پردہ غیب میں نہاں تھے اور اسی علم سے مستقبل میں واقع ہونے والے امور کا انکشاف کرتے تھے۔ البتہ عام معاملات زندگی میں متعارف طریقوں سے حاصل ہونے والے علم پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اب امیرالمومنین علیہ السلام کی ان گنت پیشین گوئیوں میں سے چند پیشین گوئیاں درج کی جاتی ہیں۔ جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپؑ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات پر مشاہدات و محسوسات کی طرح نظر رکھتے تھے۔

عبداللہ ابن رزین غافقی نے بیان کیا کہ۔

سمعت عليا يقول يا اهل العراق مستقتل منكم سبعته نضر بعد زاء مثلهم كمثل اصحاب الاخدود فقتل حجر و اصحابه (البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۵۵)

میں نے حضرت علی علیہ السلام کو فرماتے سنا کہ اے اہل عراق تم میں سے سات آدمی عنقریب مرج عذراء میں قتل کئے جائیں گے ان کی مثال اصحاب اخدود کی ہو گی۔ چنانچہ حجر اور ان کے اصحاب قتل کئے گئے۔

حجر ابن عدی کندی جو حجر الخیر اور حجر الادبر کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں اپنے بھائی ہانی ابن عدی کے ہمراہ مدینہ آئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہو کر اسلام لائے۔ آپ کا شمار افاضل صحابہ میں ہوتا ہے۔ زہد و تقویٰ میں نمایاں امتیاز رکھتے اور امیرالمومنین علیہ السلام کے خواص اصحاب میں محسوب ہوتے تھے۔ جمل و صفین کی جنگوں میں حضرتؑ کے ہمرکاب رہے اور ہر معرکہ میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام اور ان کی اولاد کی محبت رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی اور اسی محبت و وابستگی کی بنا پر اموی کارندوں کے مظالم کا نشانہ بنے اور آخر بے جرم و خطا قتل کر دئے گئے۔

اموی عمال کا وتیرہ تھا کہ وہ علانیہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد پر سب و شتم کرتے تھے اور یہی ہدایات انہیں مرکز کی طرف سے دی جاتی تھیں۔ چنانچہ معاویہ نے جب مغیرہ ابن شعبہ کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجنا چاہا تو اسے بلا کر کہا کہ۔

ولست تارك ايصاءك بخصلة لا تترك شتم علي و ذمه والترحم على عثمان والاستغفار له والعيب لا صحاب علي والا قصاء لهم والا طراء بشيعة عثمان والا دناء لهم۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۳۴)

میں ایک بات تمہیں کہے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ تم علی علیہ السلام پر سب و شتم اور ان کی مذمت اور عثمان کے لئے دعائے رحمت و مغفرت کو اپنا معمول بنانا اور اس کے ساتھ علی علیہ السلام کے دوستوں کی خوردہ گیری اور انہیں دور رکھنے اور عثمان کے ہمنواؤں کی مدح سرائی اور انہیں قریب تر کرنے کو کسی صورت میں ترک نہ کرنا۔

مغیرہ نے کوفہ پہنچ کر ہر خطبہ میں علی علیہ السلام و آل علی علیہ السلام پر لعن طعن شروع کر دی۔ حجر اپنی عقیدت و ارادت کی بنا پر اسے گوارا نہ کر سکتے تھے۔ وہ اس دشنام طرازی کے خلاف احتجاج کرتے اور بھرے اجتماع میں مغیرہ کو ٹوک دیتے۔ مغیرہ، حجر ابن عدی سے "مصلحۃً" کوئی خاص تعرض تو نہ کرتا مگر اپنی روش سے دستبردار بھی نہ ہوتا۔ کچھ دربار رس لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ حکومت کی یہ نرم روی حکومت کے وقار کو مجروح کئے دے رہی

ہے لہٰذا ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے۔ مغیرہ نے کہا کہ میرے بعد جو شخص یہاں کا والی ہو کر آئے گا اگر اس سے بھی ان کا یہی طرز عمل رہا تو وہ انہیں قتل کئے بغیر نہیں رہے گا۔ مجھے ضرورت نہیں کہ میں ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کروں۔ معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اسے امارت کوفہ سے الگ کر دیا اور اس کی جگہ زیاد ابن سمیہ کا تقرر کر دیا۔

زیاد کا تقرر طوفان کا ایک پیش خیمہ تھا اس نے کوفہ میں وارد ہوتے ہی شیعیان علی علیہ السلام کو ڈرانا دھمکانا اور علی علیہ السلام و اولاد علی علیہ السلام کو سب و شتم کا ہدف بنانا شروع کر دیا۔ حجر اسے بھی ملامت کرنے سے نہ چوکتے اور غلط بات پر بے دھڑک ٹوک دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ زیاد نے خطبہ جمعہ کو اتنا طول دیا کہ نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔ حجر نے اسے نماز کی طرف متوجہ کیا مگر اس نے خطبہ جاری رکھا۔ حجر نے دیکھا کہ نماز کا وقت گزرا جا رہا ہے تو وہ نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ اور لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ زیاد نے اس صورت حال سے معاویہ کو آگاہ کیا اور حجر کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ معاویہ نے جواب دیا کہ انہیں پابند سلاسل کر کے دمشق روانہ کردو ۔ زیاد تو چاہتا ہی تھا کہ ان سے پیچھا چھوٹے۔ فوراً چند آدمی ان کی طلبی کے لئے بھیجے۔ جب یہ آدمی حجر کے ہاں پہنچے اور انہیں زیاد کے پاس چلنے کے لئے کہا تو حجر کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم زیاد کے حکم کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں سمجھتے۔ حجر کسی صورت میں اس کے ہاں نہیں جائیں گے۔ جب یہ لوگ ناکام پلٹے تو زیاد نے دوبارہ سپاہیوں کو بھیجا جنہوں نے حجر کے ساتھیوں پر لاٹھیاں برسا کر کئی ایک کو زخمی کر دیا۔ حجر نے جب گرفتار کرنے والوں کی کثرت و قوت دیکھی تو گھر کا رخ کیا جہاں ان کے اور ساتھی بھی جمع ہو گئے۔ زیاد کے آدمی یہاں بھی پہنچ گئے۔ حجر کے ساتھیوں نے کچھ دیر ان کا مقابلہ کیا مگر زیادہ دیر تک یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ آخر بچ بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف قیس ابن یزید حکومت کی گرفت میں آ گئے۔ حجر نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر کہ تم اس جمعیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے رخصت کر دیا اور خود محلہ بنی حرب کی طرف چلے گئے اور سلیم ابن یزید کے گھر میں پناہ لے لی۔ زیاد کے سپاہیوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے ادھر کا رخ کیا۔ سلیم نے انہیں بڑھتے دیکھا تو تلوار سونت کر مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ حجر نے انہیں روکا اور کہا کہ خدا تمہیں اس حمایت و پاسداری کی جزا دے تم یہ کرو کہ اگر یہاں سے نکل جانے کا کوئی مخفی راستہ ہو تو مجھے بتا دو تاکہ میں ادھر سے نکل جاؤں اور میری وجہ سے تم پر کوئی افتاد نہ پڑے۔ چنانچہ حجر ایک مخفی راستے سے نکلے اور قبیلہ بنی نخع کے ہاں پہنچ کر عبداللہ ابن حارث نخعی کے گھر میں داخل ہوئے اور وہیں ٹھہر گئے۔ مگر زیاد کے سپاہی سن گن پا کر یہاں بھی پہنچ گئے۔ حجر کو خطرہ منڈلاتا نظر آیا تو وہ رات کے اندھیرے میں قبیلہ بنی ازد کے ہاں پہنچ کر ربیعہ ابن ناجد ازدی کے گھر میں چلے آئے اور سپاہی انہیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

زیاد جب بے دست و پا ہو گیا تو اس نے محمد ابن اشعث کو بلا کر حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے حجر کو تلاش کرو

اگر تم نے تین دن کے اندر اسے میرے سامنے پیش نہ کیا تو تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ حجر کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے محمد ابن اشعث کو پیغام بھجوایا کہ میں خود تمہارے پاس آنے کو تیار ہوں تاکہ تم مجھے زیاد کے سامنے پیش کر سکو مگر اتنا کرو کہ زیاد سے یہ عہد و پیمان لے لو کہ وہ مجھے امان دے اور معاویہ کے ہاں بھجوا دے پھر وہ جانیں اور ان کا کام۔ محمد ابن اشعث کو کچھ ڈھارس ہوئی اور وہ چند آدمیوں کو لے کر زیاد کے پاس آیا اور اسے امان دینے اور معاویہ کے پاس بھجوانے پر رضا مند کر لیا۔ جب حجر کو اس امان دہی کی اطلاع دی گئی تو وہ زیاد کے پاس چلے آئے۔ زیاد نے انہیں کڑے تیوروں سے دیکھا اور کہا کہ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ تمہاری شاہرگ کاٹ دوں۔ مگر مجھے اپنے عہد کا پاس ہے۔ اس کے بعد انہیں چند دن کے لئے قید خانہ میں رکھا اور پھر ان کے خلاف گواہیوں کا ایک پلندہ جمع کر کے شہاب ابن کثیر اور وائل ابن حجر کی زیر نگرانی انہیں دمشق روانہ کر دیا۔ ان گواہوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جو حجر سے دشمنی و عناد رکھتے تھے اور کچھ لوگ وہ تھے جن کے نام خود سے درج کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ ان گواہوں میں شریح ابن ہانی حارثی کا بھی نام تھا۔ انہیں پتا چلا تو انہوں نے ایک خط معاویہ کے نام لکھا اور وائل ابن حجر کے ہاتھ معاویہ تک پہنچا دیا۔ خط یہ تھا۔

اما بعد فانه بلغنی ان زیاد اکتب الیک بشهادتی علی حجر ابن عدی وان شهادتی علی حجر انه ممن یقیم الصلواه ویوتی الزکواه و یدیم الحج والعمره یامر بالمعروف وینهی عن المنکر حرام الدم والمال فان شئت فاقتله وان شئت فدعه۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۴)

مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ زیاد نے حجر ابن عدی کے خلاف میری گواہی بھی تحریر کی ہے حجر کے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ وہ نماز گزار زکواۃ کے پابند اور برابر حج و عمرہ بجا لاتے رہتے ہیں وہ اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں ان کا خون بہانا اور مال چھیننا حرام ہے اب آگے آپ کی مرضی چاہے اسے قتل کریں چاہے چھوڑ دیں۔

جب حجر اور ان کے ساتھی دمشق سے چھ میل کے فاصلہ پر مرج عذراء میں پہنچے تو منزل کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔ معاویہ کو ان کے گرفتار کر کے لائے جانے کی اطلاع ہو چکی تھی انہوں نے ہدبہ ابن فیاض قضاعی، حصین ابن عبداللہ کلابی اور ابو شریف البدی کو وہاں بھیجا جنہوں نے حجر اور ان کے ساتھیوں سے کہا کہ امیر معاویہ کے پاس ایسی ناقابل تردید شہادتیں پہنچی ہیں جن سے حکومت کے خلاف تمہاری بغاوت و سرکشی ثابت ہوتی ہے اور تمہارے قتل کے جواز میں کوئی شبہ نہیں رہتا لیکن۔

انا قداء نا ان نعرض عليکم البرائۃ من علی واللعن لہ فان فعلتم ترکنا کم وان ابیتم قتلنا کم۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۵)

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم تم سے علی علیہ السلام سے بیزاری اور ان پر لعنت کا مطالبہ کریں اگر تم ایسا کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں اور انکار کرو تو تمہیں قتل کر دیں۔

حجر اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی جانوں کے بچاؤ کے لئے امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں کوئی ناسزا لفظ کہیں یا ان سے اظہار بیزاری کریں۔ اب انہوں نے موت کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر مصلے بچھا دیئے اور تمام رات نمازوں میں گزار دی۔ جب صبح ہوئی تو معاویہ کے آدمیوں نے تلواریں نیاموں سے کھینچ لیں۔ حجر نے کہا کہ مجھے وضو اور دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دی جائے جب مہلت ملی تو انہوں نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور کہا کہ خدا کی قسم میں نے اپنی زندگی میں اتنی مختصر نماز کبھی نہیں پڑھی۔ میں چاہتا تھا کہ حسب معمول نماز کو طول دوں مگر اس خیال سے ایسا نہیں کیا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں میری وصیت یہ ہے کہ مجھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سمیت خاک و خون میں غلطاں دفن کیا جائے تاکہ میں کل اللہ کے روبرو اسی حالت میں معاویہ سے اپنے خون کا محاسبہ کروں۔ ہدبہ ابن فیاض قضاعی نے آپ کی گردن پر تلوار ماری کچھ دیر لاشہ تڑپا اور روح طیب جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔ آپ کے ساتھیوں میں سے شریک ابن شداد حضرمی، صیفی ابن قیس شیبانی، قبیصہ ابن ضبیہ عبسی، محرز ابن شہاب منقری اور کرام ابن حیان غزی بھی شہید کئے گئے اور عبدالرحمن ابن حسان غزی کو قس ناطف میں زندہ گاڑ دیا گیا اور اس طرح امیرالمومنین علیہ السلام نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی ۵۱ ھ میں معاویہ کے دور حکومت میں پوری ہوئی۔ حجر اور ان کے اصحاب کے بے گناہ قتل نے بہت سی آنکھوں کو اشکبار کیا اور خود معاویہ کو بھی اس قتل کی سنگینی اور پاداش عمل کا احساس تھا۔ چنانچہ جب اس کا وقت آخر آیا تو اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔

حجر تمہارے قتل سے میرا یوم حساب طویل ہو گا۔

ابو سالم میسم ابن یحیی تمار کے بارے میں فرمایا۔

انک توخذ بعدی و تصلب و تطعن بحربتہ فاذا کان الیوم الثالث ابتلو منخراک و فمک دما فتخضب لحیتکہ فانتظر ذلک الخضاب و تصلب علی باب

تم میرے بعد گرفتار ہو گے سولی پر لٹکائے جاؤ گے اور ایک بھالے سے تمہیں چھیدا جائے گا جب تیسرا دن ہو گا تو تمہارے دونوں نتھنوں اور منہ سے خون جاری

دار عمر و ابن حریث (اعلام الوری)

ہو جائے گا جس سے تمہاری ڈاڑھی رنگین ہو جائے گی لہٰذا اس خضاب کے منتظر رہو۔ تمہیں عمرو ابن حریث کے گھر کے دروازے پر سولی دی جائے گی۔

میثم کوفہ کے ایک تجارت پیشہ خاندان کے فرد تھے اور کھجوروں کے کاروبار کی وجہ سے تمار (خرما فروش) کہلاتے تھے آپ امیرالمومنین علیہ السلام کے ان تلامذہ و اصحاب میں شمار ہوتے ہیں جو اسرار امامت کے امین، تنزیل و تاویل قرآن کے عالم اور معارف دینی کے خزینہ دار تھے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے۔

کان میثم قد اطلعہ علی علیہ السلام علی علم کثیر و اسرار خفیہ من اسراء الوصیتہ۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ا ص ۲۱)

علی علیہ السلام نے میثم کو علوم کثیرہ اور وصیت کے مخفی اسرار پر مطلع کیا تھا۔

جب میثم نے امیرالمومنین علیہ السلام سے اپنے بارے میں شہادت کی خبر سنی تو کہا یا امیرالمومنین علیہ السلام مجھے کس جرم کی پاداش میں سولی پر لٹکایا جائے گا۔ فرمایا کہ تم سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر جاں بخشی چاہتے ہو تو مجھ سے اظہار بیزاری کرو۔ کہا کہ میں ہر مصیبت سہہ لوں گا اور ہر ظلم و اذیت برداشت کر لوں گا مگر آپ سے اظہار بیزاری نہیں کروں گا۔

اگر سنگ جفا ریزد و گر تیر بلا بارد
دل از کویت نخواہم کند تاجاں در بدن دارم

جب ابن زیاد کے دور میں شیعیان علی علیہ السلام کا استیصال کیا جانے لگا تو جناب میثم کی تلاش شروع ہوئی اور ان کے میر محلّہ کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں گرفتار کر کے لائے۔ میر محلّہ کو معلوم ہوا کہ میثم حج کے لئے مکہ جا چکے ہیں اس نے ابن زیاد سے کہا کہ ان کی واپسی تک مجھے مہلت دی جائے جب وہ آئیں گے تو انہیں پیش کر دیا جائے گا۔ جب میثم حج سے فارغ ہو کر واپس آئے تو انہیں ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے پوچھا کیا تم میثم ہو کہا ہاں میثم ہوں کہا کہ تم ابوتراب علیہ السلام سے اظہار بیزاری کرو۔ کہا کون ابوتراب کہا علی علیہ السلام۔ کہا کہ اگر میں ان سے اپنی نفرت و بیزاری کا اعلان نہ کروں تو پھر کیا ہو گا۔ کہا کہ تمہیں قتل کیا جائے گا۔ کہا کہ میرے مولا و آقا مجھے خبر دے گئے تھے کہ تمہیں عمرو ابن حریث کے گھر کے سامنے سولی دی جائے گی۔ میں اس ساعت کا منتظر ہوں۔ چنانچہ انہیں کچھ دن قید میں رکھ کر عمرو ابن حریث کے مکان کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ انہوں نے سولی پر سے کہنا شروع کیا کہ اے لوگو تم میں سے جو پیش آئند حوادث کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام کی احادیث سننا چاہے وہ آئے۔ ابن زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ ان کے منہ پر لگام چڑھا دی جائے۔ چنانچہ لگام چڑھا دی گئی اور وہ

بولنے سے مجبور ہو گئے۔ جب سولی پر لٹکے تین دن گزر گئے تو ان کے منہ اور نتھنوں سے خون جاری ہو گیا۔ ڈاڑھی اور چہرہ خون سے رنگین ہو گیا اور اسی دن غروب آفتاب سے پہلے ان کی روح ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے وارد عراق ہونے سے دس دن پہلے کا ہے۔

رشید ہجری سے فرمایا۔

کیف صبرک اذا ارسل الیک دعی بن امیہ فقطع یدیک و رجلیک ولسانک۔ (امالی شیخ)

اس وقت تمہارے صبر کی کیا حالت ہو گی جب بنی امیہ سے ملحق کیا ہوا ایک شخص تمہیں بلوا بھیجے گا اور تمہارے ہاتھ' پیر اور زبان کاٹے گا۔

رشید نے سنا تو کہا کہ اس کا ثمرہ تو پھر جنت ہی ہے فرمایا۔ ہاں۔

انت معی فی الدنیا والاخرہ۔ (رجال کشی)

تم دنیا میں بھی میرے ساتھ رہے اور آخرت میں بھی میرے ساتھ ہو گے۔

آخر اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آیا اور ابن زیاد نے انہیں بلا کر کہا کہ تم علی علیہ السلام سے اپنی بیزاری کا اعلان کرو۔ انہوں نے کہا کہ میرے آقا مجھے یہ خبر دے گئے تھے کہ مجھ سے اظہار بیزاری کے لئے کہا جائے گا اور میرے انکار پر میرے ہاتھ پیر اور زبان کاٹ دی جائے گی۔ ابن زیاد نے کہا کہ میں ان کی بات کو سچا ثابت نہیں ہونے دوں گا۔ تمہارے ہاتھ پیر تو کاٹے جائیں گے مگر زبان نہیں کاٹی جائے گی۔ چنانچہ ان کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے گئے۔ جب انہیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا تو ان کی بیٹی قنواء بنت رشید نے پوچھا کہ بابا آپ درد تو شدت سے محسوس کرتے ہوں گے۔ کہا کہ بس اتنا کہ جیسے کوئی ہجوم میں گھر کر رہ گیا ہو۔ پھر کہا کہ کاغذ قلم لاؤ میں تمہیں پیش آئند حوادث لکھوا دوں۔ ابن زیاد کو اس کی خبر دی گئی تو اس نے حکم دیا کہ ان کی زبان بھی کاٹ دی جائے۔ چنانچہ زبان بھی کاٹ دی گئی اور وہ اسی رات شہادت کی منزل پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ مزرع ابن عبداللہ نے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

لیو خذن رجل فیقتلن ولیصلبن بین شرفتین من شرف هذا المسجد۔ (بحار الانوار)

ایک شخص گرفتار ہو گا اور اس مسجد کے کنگروں میں سے دو کنگروں کے درمیان اسے سولی پر آویزاں کیا جائے گا۔

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ اب تو آپ غیب کی خبریں دینے لگے۔ کہا کہ میں نے اسے

امیرالمومنین علیہ السلام ایسے عظیم راہنما سے سنا ہے۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ مزرع گرفتار کرلئے گئے اور قتل کے بعد مسجد کے دو کنگروں کے درمیان سولی پر آویزاں کئے گئے۔

جویریہ ابن مسہر عبدی کے بارے میں فرمایا۔

لیقتلنک العتل الزنیم ولیقطعن یدک ورجلک ثم انہ لیصلبنک۔ (تنقیح المقال)

تمہیں ایک تند خو اور بد ذات قتل کرے گا اس طرح کہ پہلے تمہارے ہاتھ پیر کاٹے گا پھر تمہیں سولی پر لٹکائے گا۔

جویریہ امیرالمومنین علیہ السلام کے ثقہ و معتمد صحابی تھے۔ حضرت انہیں دیکھتے تو محبت و شفقت کا اظہار فرماتے اور سفر میں ہمرکاب رکھتے تھے۔ جب معاویہ کے دور اقتدار میں دوستداران آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مظالم توڑے جانے لگے اور شیعان علی علیہ السلام میں سے کسی کو شہربدر اور کسی کو قتل کیا جانے لگا تو زیاد ابن سمیہ نے جویریہ کے ہاتھ پیر کاٹے اور پھر ایک درخت کے تنے پر انہیں لٹکا دیا۔

عمرو ابن الحمق الخزاعی سے فرمایا۔

واسک اناراس یشھر فی الاسلام من بلد الی بلد۔ (تنقیح المقال)

اسلام میں تمہارا سر پہلا سر ہو گا جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرایا جائے گا۔

عمرو ابن حمق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند مرتبت صحابی اور حافظ احادیث و آثار تھے ان کا شمار امیرالمومنین علیہ السلام کے مخلص اور جانباز دوستوں میں ہوتا ہے۔ جنگ جمل و صفین اور نہروان میں حضرتؑ کے ہمرکاب رہ کر داد شجاعت دی۔ حضرتؑ فرمایا کرتے تھے۔

لیت ان فی شیعتی مائتہ مثلک۔ (تنقیح المقال)

کاش میرے شیعوں میں تم ایسے ۱۰۰ ہوتے۔

عمرو کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔ جب زیاد ابن سمیہ نے حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم دیا تو آپ حجر کی طرف سے دفاع کرتے رہے اور اس پکڑ دھکڑ میں بکر ابن عبید کی لاٹھی سے زخمی ہو گئے۔ ابو سفیان ابن عویمر اور عجلان ابن ربیعہ انہیں عبداللہ ابن مالک کے گھر میں اٹھا لائے۔ آپ چند دن وہاں رہے پھر موصل چلے گئے۔ جہاں گرفتار کر کے حاکم موصل عبدالرحمن ثقفی کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا اور معاویہ سے ان کے بارے میں رائے طلب کی۔ معاویہ نے لکھا کہ عمرو عثمان کے قاتلوں میں سے ہے۔ لہٰذا اس پر اتنے وار کئے جائیں جتنے اس نے عثمان پر کئے تھے۔ چنانچہ ان پر نو وار کئے گئے حالانکہ وہ پہلے یا دوسرے وار میں دم توڑ چکے تھے۔ اس کے بعد حاکم موصل نے ان کا سر قطع کیا اور زیاد کے پاس بھجوا دیا۔ زیاد نے وہ سر معاویہ کے پاس بھیج دیا

اور اس طرح ان کا سر موصل سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک پھرایا گیا۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے۔

اول راس حمل من بلد الی بلد راس عمرو ابن الحمق الخزاعی۔ (المعارف ص ۲۴۱)

پہلا سر جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرایا گیا وہ عمرو ابن حمق خزاعی کا سر تھا۔

قنبر مصری کہتے ہیں کہ۔

لقد اخبرنی امیرالمومنین ان نیتی تکون ذبحا ظلما بغیر حق۔ (ارشاد شیخ مفید)

مجھے امیرالمومنین علیہ السلام نے خبر دی تھی کہ میری موت اس طرح ہو گی کہ میں تیغ جفا سے ناحق ذبح کیا جاؤں گا۔

قنبر قبیلہ مضر سے تعلق رکھتے تھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کے جان نثار و وفادار غلام تھے ہمہ وقت حاضر خدمت رہتے اور آپؑ سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور حضرتؑ بھی انہیں اولاد کی طرح سمجھتے اور اولاد کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اس وابستگی کے جرم میں گرفتار کر کے حجاج شقی کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے دیکھا تو کہا کہ تم علی علیہ السلام کے غلام قنبر ہو کہا کہ ہاں میں علی علیہ السلام کا غلام ہوں اور وہ میرے ولی نعمت تھے۔ کہا کہ تم ان کے دین سے علیحدگی اختیار کر لو۔ کہا کوئی ایسا دین بتاؤ جو ان کے دین سے بہتر ہو۔ کہا کہ میں بہرحال تمہیں قتل کروں گا۔ کہا کہ میں شہادت کے درجے پر فائز ہو کر سعادت ابدی حاصل کروں گا اور تم شقی و بدبخت قرار پاؤ گے کہا کہ یہ بتاؤ کہ تم کس طرح قتل ہونا پسند کرو گے۔ کہا کہ جس طرح تم چاہو مجھے قتل کرو اور یاد رکھو کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ چنانچہ ان کا گلا کاٹ کر ذبح کر دیا گیا۔

جب امیرالمومنین علیہ السلام صفین کی طرف جاتے ہوئے سرزمین کربلا سے گزرے تو حادثہ فاجعہ کربلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ھھنا مناخ رکابھم و ھٰھنا موضع رحالھم وھٰھنا مھراق دمائھم فتیہ من آل محمد یقتلون بھذہ العرصہ تبکی علیھم السماء والارض۔ (صواعق محرقہ ص ۱۹۳)

اس سرزمین پر آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوانوں کو قتل کیا جائے گا جن پر آسمان بھی روئے گا اور زمین بھی یہ جگہ ان کی سواریوں کی ہے اور یہ ان کے سازو سامان کی اور یہ مقام وہ ہے جہاں ان کا خون بہے گا۔

حادثہ کربلا اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخ عالم کا منفرد واقعہ ہے جو ۶۱ ھ کے ماہ محرم کے پہلے عشرہ میں رونما ہوا۔ اور ہر سال ان دنوں میں اس معرکہ حق و باطل کی یاد تازہ کی جاتی ہے جو فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسین علیہ السلام نے اپنی اور اپنے اعزہ و رفقاء کی قربانی سے سر کیا۔ ایک طرف بیعت پر اصرار تھا اور دوسری طرف

بیعت سے انکار۔ حسین علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں نے دشمن کی کثرت و قوت کو نظرانداز کر کے دل بادل فوجوں کے مقابلہ میں بیعت سے انکار کر دیا اور آخر دم تک اس انکار پر قائم رہے اور دنیا سے اپنی خود داری' استقامت اور اصول پرستی کا لوہا منوا لیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی پیشین گوئی میں جن جوانان آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا تذکرہ ہے تاریخ ان کی تعداد اٹھارہ بتاتی ہے۔ ان میں چھ امیرالمومنین علیہ السلام کے فرزند تھے سید الشہداء امام حسین علیہ السلام' ابو الفضل العباس' عبداللہ' جعفر' عثمان اور محمد الاصغر اور امام حسن علیہ السلام کے تین فرزند تھے قاسم' عبداللہ اور ابوبکر اور امام حسین علیہ السلام کے دو بیٹے تھے علی اکبر اور علی اصغر اور عقیل کے دو بیٹے تھے عبدالرحمن اور جعفر اور عبداللہ ابن جعفر کے دو فرزند تھے محمد اور عون اور مسلم ابن عقیل کے دو بیٹے تھے عبداللہ اور محمد اور ابو سعید ابن عقیل کے ایک فرزند تھے محمد ان کے علاوہ گنے چنے چند اصحاب تھے جنہوں نے خون آشام تلواروں کے سامنے گردنیں خم کر دیں مگر طاغوتی طاقت کے آگے سر تسلیم خم کرنا گوارا نہ کیا۔

اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں کہ سعد ابن ابی وقاص سے فرمایا۔

ان فی بیتک لسخلا یقتل الحسین ابنی۔

تمہارے گھر میں ایک بچہ ہے جو میرے فرزند حسین علیہ السلام کو قتل کرے گا۔

یہ بچہ عمر ابن سعد تھا جو ابن زیاد کے حکم سے چار ہزار کے لشکر کے ساتھ کربلا آیا اور امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء کے قتل سے اپنے جذبہ خون آشامی کی تسکین کی۔

سوید ابن غفلہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرتؑ کے پاس آیا اور کہا کہ خالد ابن عرفطہ مر گیا ہے آپؑ اس کے لئے دعا فرمائیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔

انہ لم یمت ولا یموت حتی یقود جیش ضلالتہ صاحب لوائہ حبیب ابن جماز۔(ارشاد)

وہ نہیں مرا اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ ایک ضلالت و گمراہی کے لشکر کی قیادت نہیں کرتا اس کے لشکر کا جھنڈا اٹھانے والا حبیب ابن جماز ہو گا۔

مجمع میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام میں آپؑ کا دوست اور فرمانبردار ہوں۔ پوچھا تم کون ہو۔ کہا میں حبیب ابن جماز ہوں۔ فرمایا میں تمہیں متنبہ کئے دیتا ہوں کہ تم وہ جھنڈا نہ اٹھانا مگر تم اٹھاؤ گے اور باب الفیل کی طرف سے مسجد میں داخل ہو گے۔ چنانچہ جب ابن زیاد نے عمر ابن سعد کی قیادت میں کربلا کی جانب لشکر روانہ کیا تو خالد ابن عرفطہ مقدمتہ الجیش کا سردار اور حبیب ابن جماز حامل لواء تھا۔

اسمٰعیل ابن زیاد کہتے ہیں کہ ایک دن امیرالمومنین علیہ السلام نے براء ابن عازب سے فرمایا۔

یا براء یقتل ابنی الحسین وانت حی لا تنصرہ۔ (ارشاد)

اے براء میرا فرزند حسین علیہ السلام قتل کیا جائے گا اور تم زندہ ہو گے اور ان کی مدد نہیں کرو گے۔

چنانچہ براء ابن عازب بڑی حسرت و ندامت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے سچ فرمایا تھا حسین علیہ السلام شہید کر دئے گئے اور میں ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔

امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کے بارے میں فرمایا۔

سیقتل رجل من ولدی بارض خراسان بالسم ظلما اسمہ اسمی واسم ابیہ موسی ابن عمران۔ (امالی صدوق)

میری اولاد میں سے ایک فرد سرزمین خراسان میں زہر سے ظلماً" مارا جائے گا اس کا نام میرے نام پر اور اس کے باپ کا نام موسیٰ ابن عمران کے نام پر ہو گا۔

علوی حکومت کے قیام کی آڑ میں اموی حکومت کا تخت الٹا گیا تو علویوں کے بجائے عباسیوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کا طبعی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ علویوں کو یہ اقتدار کھٹکتا اور وہ حکومت سے متصادم ہوتے۔ چنانچہ عباسیوں کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب مامون رشید بر سر اقتدار آیا تو علویوں کی سرگرمیوں میں کمی واقع نہ ہوئی۔ اس نے علویوں کے جوش و خروش کو دبانے کے لئے امام علی الرضا علیہ السلام کو اپنے دارالخلافہ مرو میں آنے کی دعوت دی اور انہیں لانے کے لئے اپنے ماموں رجاء ابن ضحاک کو مدینہ بھیجا۔ امام مدینہ چھوڑنا نہ چاہتے تھے مگر جب مجبور کر دیئے گئے تو نیشا پور سے ہوتے ہوئے مرو میں تشریف فرما ہوئے۔ مامون نے بڑی سرگرمی سے استقبال کیا اور آپ کو ولیعہد سلطنت قرار دینے کا اظہار کیا۔ آپؑ نے اس سے بچنے کی پوری کوشش کی اور انکار پر انکار کرتے رہے۔ آخر اس کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر چند شرائط کے ساتھ اسے منظور فرما لیا۔ آپ کے اعلان ولیعہدی سے علوی تو مطمئن ہو گئے مگر بنی عباس کو خلافت اپنے خاندان سے باہر جاتی نظر آئی تو انہوں نے بغداد میں ہنگامہ کھڑا کر دیا اور مامون کو معزول قرار دے کر ابراہیم ابن مہدی عباسی کی بیعت کر لی۔ اب مامون کے لئے دو طرفہ مصیبت تھی اگر اس اعلان ولیعہدی کو منسوخ کرتا ہے تو علویوں کی بغاوت کے ابھرنے کا اندیشہ ہے اور اگر برقرار رکھتا ہے تو عباسیوں کی شورش پر قابو پانا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ کسی طرح امام رضا علیہ السلام کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور اسے طبعی موت قرار دے کر علویوں کو خاموش رکھا جائے اور عباسیوں کو ہمنوا بنا لیا۔ جائے چنانچہ وہ بغداد جاتے ہوئے طوس کے قصبہ سنا آباد میں اترا اور امام علیہ السلام کو پیغام بھیجا کہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپؑ آئیں یا مجھے آنے کی اجازت دیں۔ امام علیہ السلام خود اس کے ہاں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب اس کے ہاں پہنچے تو اس نے انگور جن میں زہر کی آمیزش تھی آپؑ کے سامنے پیش کئے۔ آپ نے کھانے سے

انکار کیا مگر اس نے اصرار کیا تو آپؑ نے چند دانے کھائے جن کے کھاتے ہی زہر کا احساس ہوا۔ آپؑ نے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مامون نے پوچھا کہ آپؑ کہاں جارہے ہیں فرمایا جہاں تم بھیجنا چاہتے تھے۔ جب اپنی قیام گاہ پر آئے تو حالت دگرگوں ہو گئی اور تین دن موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۷ صفر ۲۰۲ھ کو پچپن برس کی عمر میں انتقال فرما گئے اور قریہ سنا آباد میں جواب مشہد الرضا علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے دفن کئے گئے۔ دعبل خزاعی نے آپ کے مرثیہ میں کہا ہے۔

یا ارض طوس سقاک اللہ رحمتہ　　　ماذا ضمنت من الخیرات یا طوس

اے سرزمین طوس خدا تجھے اپنی رحمت کے چھینٹوں سے سیراب کرے تو اپنے دامن میں نیکیوں کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہے۔

طابت بقاعک فی الدنیا و طاب بھا　　　شخص ثوی بسنا باد مرموس

دنیا جہاں میں تیری سرزمین کا کونا کونا پاک و صاف ہے اور وہ ہستی بھی طیب و طاہر ہے جو سنا آباد میں منزل گزیں اور مدفون ہے۔

معاویہ ابن ابی سفیان کے بارے میں فرمایا۔

الاوانہ سیامرکم بسبی والبراۃ منی۔ (نہج البلاغہ)

وہ تمہیں حکم دے گا کہ مجھے گالیاں دو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو۔

چنانچہ معاویہ نے اپنے عمال سلطنت کو مامور کیا کہ وہ جمعہ و عیدین اور دوسرے اجتماعات میں حضرتؑ پر علانیہ سب و شتم کریں حالانکہ امام حسن علیہ السلام نے شرائط صلح میں ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ کم از کم آپؑ کے روبرو حضرتؑ پر لعن طعن نہ کی جائے مگر اس کا پاس نہیں کیا گیا چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں کہ شرائط صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ۔

ان لا یشتم علیا فلم یجبہ الی الکف عن شتم علی فطلب ان لا یشتم وھو یسمع فاجابہ الی ذالک ثم لم یف لہ بہ ایضا۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۰۳)

وہ حضرتؑ کو گالی گلوچ نہ دے مگر وہ علی علیہ السلام پر سب و شتم سے دستبرداری پر آمادہ نہ ہوا پھر امام حسن علیہ السلام نے یہ خواہش کی کہ ان کے سامنے گالیاں نہ دی جائیں۔ معاویہ نے اس کا وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا۔

مروان ابن حکم کے بارے میں فرمایا۔

اما ان لہ امرہ کلعقتہ الکلب انفہ و ھوابو الا کبش الاربعتہ وستلقی الامتہ منہ ومن ولدہ یوماالخمر (نہج البلاغہ)

دیکھو یہ بھی اتنی مدت کہ کتا اپنی ناک چاٹنے سے فارغ ہو حکومت کرے گا اور اس کے چار بیٹے بھی حکمران ہوں گے اور امت اس کے اور اس کے بیٹوں کے ہاتھوں سختیوں کے دن دیکھے گی۔

چنانچہ معاویہ ابن یزید کے مرنے کے بعد اہل شام نے جابیہ دمشق میں اس کی بیعت کی اور نو مہینے برسر اقتدار رہنے کے بعد مرگیا اور اس کے بیٹوں میں سے عبدالملک خلیفہ ہوا اور عبدالعزیز مصر' کا بشر کوفہ و بصرہ کا اور محمد جزیرہ کا والی قرار پایا اور اسی نے ابراہیم ابن مالک اشتر اور مصعب ابن زبیر کو دیر جاثلیق میں قتل کیا۔

عبداللہ ابن زبیر کے بارے میں فرمایا۔

خب ضب یروم امراو لا یدرکہ ینصب حبالتہ الذ ین لا صطیا و الدنیا وھو بعدمصلوب قریش۔ (بحار الانوار)

فریب کار اور جاہ طلب حکومت کے لئے تگ و دو کرے گا مگر اسے حاصل نہ کر سکے گا دنیا کا شکار کرنے کے لئے دین کا جال بچھائے گا اور آخر قریش کے ہاتھوں سولی پر لٹکایا جائے گا۔

عبداللہ ابن زبیر یزید کی بیعت سے انکار کرنے کے بعد مکہ میں آکر مقیم ہو گیا اور اقتدار کے لئے راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔ جب یزید مرگیا تو اس نے کچھ لوگوں کے تعاون سے حجاز میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کر دیا اور حجاز کے علاوہ یمن عراق اور خراسان کے باشندوں نے بھی اس کی بیعت کر لی لیکن بنی امیہ اور بنی ہاشم اس کی بیعت کے لئے آمادہ نہ ہوئے جس پر اس نے بنی امیہ کے سرکردہ افراد کہ جن میں مروان اور عبدالملک بھی شامل تھے مدینہ سے باہر نکال دیا اور محمد ابن حنیفہ' عبداللہ ابن عباس اور بنی ہاشم کے چوبیس نمایاں افراد کو قید خانہ میں بند کر دیا اور انہیں یہ دھمکی دی کہ اگر بیعت نہیں کریں گے تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ عبداللہ ابن زبیر بنی ہاشم کو اپنا حریف تصور کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ان سے بیعت لئے بغیر اقتدار کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس نے بیعت لینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور سارے جتن کر ڈالے۔ مگر بیعت کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر سختی و تشدد پر اتر آیا اور ان پر مظالم توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے۔

تحامل عبداللہ ابن الزبیر علی بنی ہاشم تحاملا شدید او اظھر لھم العداوہ والبغضاء حتی بلغ فلک منہ ان ترک الصلواہ علی محمد فی خطبتہ۔ (تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۸)

عبداللہ ابن زبیر نے بنی ہاشم پر سخت مظالم توڑے اور علانیہ ان سے دشمنی کا مظاہرہ کیا اس کی دشمنی کی حد یہ تھی کہ اس نے خطبہ میں محمد صلی اللہ علیہ و آلہ پر درود ترک کر دیا۔

جب بنی ہاشم کو قید خانہ میں سختیاں جھیلتے کچھ عرصہ گزر گیا تو مختار ابن عبید نے ان کی مدد کے لئے چار ہزار سواروں کا ایک لشکر بھیجا جس نے قید خانہ کا دروازہ توڑ کر انہیں باہر نکالا۔ بنی ہاشم نے قید سے آزاد ہو کر ابن زبیر کے ارادوں کو ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا ادھر مروان نے مدینہ سے نکل کر شام کا رخ کیا اور شام کے حدود میں پہنچ کر اپنی بیعت لینا شروع کر دی اور ابن زبیر کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مروان مرگیا تو اس کے بیٹے عبدالملک نے چالیس ہزار شامیوں کو حجاج ابن یوسف کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ جنہوں نے مکہ کو محاصرہ میں لے لیا اور آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دئے۔ ابن زبیر نے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور مقابلہ کے لے میدان میں اتر آیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے دشمن کی کثرت و قوت دیکھی تو کچھ میدان سے منہ موڑ کر گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور کچھ لوگوں نے حجاج کے دامن میں پناہ لے لی۔ ابن زبیر نے اپنے باقی ماندہ لشکر کی ہمت بندھائی اور اسے جنگ میں جھونک دیا۔ دونوں فریق میں خونریز جنگ ہوئی۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا ابن زبیر قتل کر دیا گیا اور اس کی بچی کھچی فوج تتر بتر ہو گئی۔ عبدالملک کے آدمیوں نے اس کی لاش کو مقام تنعیم میں سولی پر لٹکا دیا جو کئی دنوں تک لٹکی رہی۔ ایک دن عبداللہ ابن عمر ادھر سے گزرے تو انہوں نے لاش سے مخاطب ہو کر کہا۔

يرحمك الله يا ابا خبيب لولا ثلث كن فيك لقلت انت انت الحادك في الحرم ومسادعتك الى الفتنة و بخل بكفك۔ (تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۱۴)

اے ابا خبیب اللہ تم پر رحم کرے اگر تم میں تین باتیں نہ ہوتیں تو میں یہ کہتا کہ تم تم ہی ہو ایک یہ کہ تم نے حرم میں الحاد و بے دینی کا ارتکاب کیا دوسرے فتنہ کی طرف تیزی سے بڑھے اور تیسرے کنجوسی کرتے رہے۔

ایک شخص نے آپؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپؑ نے مال کی تقسیم میں عدل و مساوات کا اصول پیش نظر نہیں رکھا۔ فرمایا کہ اگر تم جھوٹ کہتے ہو تو اللہ اس وقت تک تمہیں موت نہ دے جب تک بنی ثقیف کا ایک شخص تمہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون ہے فرمایا۔

رجل لا يدع لله حرمته الا انتهكها۔ (احتجاج طبرسی)

وہ ایسا آدمی ہے جو ہر اس چیز کی بے حرمتی کا مرتکب ہو گا جو اللہ کے نزدیک عزت و حرمت رکھتی ہے۔

یہ حجاج ابن یوسف ثقفی تھا جس نے کوہ ابو قیس پر منجنیق نصب کر کے خانہ کعبہ پر سنگباری کی اور شعائر اللہ کی توہین کا مرتکب ہوا اور مدینہ منورہ میں جابر ابن عبداللہ' انس ابن مالک' سہل ابن سعد اور دوسرے صحابہ کی تذلیل کے لئے ان کے ہاتھوں اور گردنوں کو گرم سیسہ سے داغا جس طرح ذمیوں کو داغا جاتا تھا اور اتنی خونریزیاں کیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

قد قتل من الصحابۃ و اکابر التابعین مالا یحصی فضلا عن غیر ھم۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۵۴)

اس نے اتنے صحابہ اور بزرگ تابعین قتل کئے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا ہے چہ جائیکہ دوسرے مقتولین کا شمار ہو سکے۔

نضر ابن شمیل کہتے ہیں کہ۔

بسمعت ھشاما یقول احصبوا امن قتل الحجاج صبرا فوجدوھم ماہ وعشرین الفا۔ (عقد الفرید ج ۳ ص ۲۶۰)

میں نے ابن ھشام کو کہتے سنا کہ حجاج کے ان مقتولین کی تعداد جنہیں اس نے جکڑ (باندھ) کر قتل کیا ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔

حضرتؑ نے اپنے ایک خطبہ میں جسے علامہ مجلسی قدس سرہ نے بحارالانوار ج ۹۱ ص ۵۸۷ میں درج کیا ہے۔ حکومت عباسیہ کے قیام کی پیشین گوئی کی ہے اور خلفاء عباسین کے بعض نمایاں صفات و عادات کا تذکرہ فرمایا ہے چنانچہ ابوالعباس سفاح اور منصور دوانیقی کے بارے میں فرمایا۔

اولھم ارائفھم و ثانیھم افتکھم۔

ان میں کا پہلا مہربان ہو گا اور دوسرا قاتل و سفاک۔

ابو العباس ۱۳۲ ھ میں برسر اقتدار آیا اور چار سال آٹھ مہینے حکومت کرنے کے بعد ۱۳۶ ھ میں مر گیا اس کا یہ مختصر دور بنی امیہ کے استیصال اور مختلف بغاوتوں کے فرو کرنے میں گزرا۔ اس عرصہ میں بنی ہاشم سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ مصلحۃً ان سے حسن سلوک بھی کرتا رہا اور منصور نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے بے دریغ خون بہایا اور جس کے متعلق بھی یہ شبہہ ہوا کہ وہ اس کے اقتدار کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خصوصاً حسنی سادات پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ کسی کو پابہ زنجیر قید و بند میں رکھا اور کسی کو قتل کر کے اس کے سر کی تشہیر کی۔ چنانچہ عبداللہ المحض کے بیٹوں محمد اور ابراہیم کو گرفتار کرنے کے لئے لشکر بھیجا اور انہیں قتل کروانے کے بعد محمد کا سر مختلف شہروں میں پھرایا اور ابراہیم کا سر ان کے والد بزرگوار کے پاس جو قید خانہ میں زندگی گزار رہے تھے بھجوایا۔ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

فقلتھا وجماعۃ کثیرہ من ل البیت فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۴۸)

منصور نے محمد و ابراہیم اور اہل بیتؑ کے کثیر افراد کو قتل کیا انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ہارون رشید کے متعلق فرمایا۔

وخامسھم کبشھم۔

ان میں کا پانچواں اونچے درجہ کا سردار ہو گا۔

ہارون رشید صاحب سطوت و جبروت تھا۔ اس نے جنگوں میں سرگرم عمل اور رومیوں سے برسر پیکار رہنے

کے باوجود علوم و فنون کی ترقی میں حصہ لیا اور یونانی و سنسکرت زبان کی کتابوں کے عربی میں تراجم کرائے۔ رفاہ عامہ کے سلسلہ میں شفا خانے قائم کئے مگر ان خوبیوں کے باوجود امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو زندان میں زہر سے شہید کر کے اپنے نامہ عمل کو سیاہ کیا۔

مامون رشید کے متعلق فرمایا۔

وسابعهم اعلمهم
ان میں کا ساتواں ان سب سے بڑھ کر عالم ہو گا۔

چنانچہ مامون فلسفہ تاریخ وقائع ایام فقہ اور فنون عربیہ میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ علمی مباحث میں دلچسپی لیتا اکابر علماء سے مختلف موضوعات پر مناظرے کرتا اور انہیں لاجواب کر دیتا۔ بلا شبہہ خلفاء میں اس سے بڑھ کر کوئی ذی علم نہ تھا۔ سیوطی نے لکھا ہے۔

ولم يل الخلافة من بني العباس اعلم منه۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۱۳)
خلفاء بنی عباس میں اس سے بڑھ کر کوئی صاحب علم نہ تھا۔

مگر اس علم و فضل کے باوجود اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے امام رضا علیہ السلام کے خون سے اپنے دامن کو داغدار کیا۔

متوکل عباسی کے بارے میں فرمایا۔

عاشرهم الفرهم يقتله اخصهم به۔
ان میں کا دسواں بڑا کافر ہو گا اور اس کے قریبی لوگ ہی اسے قتل کریں گے۔

متوکل آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے انتہائی بغض و عناد رکھتا تھا اور اسی دشمنی کی بنا پر اسے کافر کہا ہے۔ اسے نہ صرف اولاد علی علیہ السلام سے بغض تھا بلکہ جو انہیں دوست رکھتا تھا اسے زندہ نہ چھوڑتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے یعقوب ابن السکیت سے جو علوم عربیہ کے امام اور اس کے بیٹوں کے معلم تھے۔ پوچھا کہ میرے بیٹے معتز اور موید تمہیں زیادہ عزیز ہیں یا فرزندان علی علیہ السلام حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام۔ انہوں نے کہا کہ حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام تو ایک طرف رہے میں علی علیہ السلام کے غلام قنبر کو بھی ان دونوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ متوکل کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے ابن سکیت کی زبان گدی سے کھنچوا دی اور وہ تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو گئے۔ غرض اس نے دوستداران آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تذلیل اور سادات بنی فاطمہ علیہ السلام کی ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قبر سید الشہداء علیہ السلام کو منہدم اور اس پر ہل چلانے کا حکم دیا اور آپؑ کے مرقد کی زیارت سے مانع ہوا۔ علامہ سیوطی نے تحریر کیا ہے۔

امر بهدم قبر الحسین و هدم ماحوله من الدور وان یعمل مزارع وضع الناس من زیارته و خرب وبقی صحراء وکان المتوکل معروفا بالنصب۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۴۱)

اس نے حکم دیا کہ حسین (علیہ السلام) کی قبر اور جتنے گھر اس کے گرد و پیش ہیں سب گرا دیۓ جائیں اور ان پر کھیتی باڑی کی جائۓ اور لوگوں کو زیارت سے منع کیا یہاں تک کہ وہ جگہ منہدم ہو کر چٹیل میدان ہو گئی۔ متوکل آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دشمنی میں شہرت رکھتا تھا۔

متوکل کے اس اقدام سے عامہ مسلمین کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ہر طرف سے اس پر لعن طعن کی بوچھاڑ ہونے لگی اور مسجدوں اور دیواروں پر اس کے خلاف دشنام آمیز تحریریں لکھی جانے لگیں اور شعراء نے اس کی مذمت میں اشعار کہے چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

تالله ان کانت امیه قداتت قتل ابن بنت نبیها مظلوما

خدا کی قسم اگر بنی امیہ اپنے نبی کے دختر زادے پر ظلم ڈھاتے ہوۓ ان کے قتل کے مرتکب ہوۓ۔

فلقد اتاه بنو ابیه بمثله هذا العمری قبره مهدوما

تو بنی عباس نے جو ان کے ہم جد تھے ویسا ہی ان پر ظلم کیا مجھے اپنی زندگی کی قسم یہ حسین علیہ السلام ہی کی قبر ہے جو ان کے ہاتھوں منہدم ہوئی ہے۔

متوکل کی غلط اور تشددانہ روش سے اس کی اولاد بھی تنگ آچکی تھی۔ چنانچہ اس کے بیٹے منتصر نے اس کے قتل کا تہیہ کیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ اس نے پہلے منتصر کو اپنا ولیعہد نامزد کیا مگر کچھ دنوں کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور منتصر کے بجائے معتز کو اپنا ولیعہد مقرر کرنا چاہا اور منتصر سے کہا کہ وہ ولیعہدی سے دستبردار ہو جائے مگر وہ نہ مانا اور ان دونوں میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی آخر منتصر نے متوکل کے چند ترک غلاموں کو اس کے قتل پر آمادہ کیا۔ وہ تو چاہتے ہی تھے کہ اس کا کام تمام ہو۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار سنبھالے اور رات کے وقت جبکہ وہ مجلس طرب آراستہ کئے ہوئے تھا اچانک اس پر ٹوٹ پڑے اور تلواروں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیۓ۔ اس کے بعد منتصر مسند خلافت پر بیٹھا اور چھ ماہ کی حکومت کے بعد وفات پائی۔[1]

---

[1] واقعات شاہد ہیں کہ جنہوں نے تخت و تاج کے لئے اپنے باپ کو راستے سے ہٹایا انہیں بھی زیادہ عرصہ تک حکومت کرنا نصیب نہیں ہوا اور موت نے جلد ہی انہیں تخت و تاج سے محروم کر دیا۔

معتمد کے بارے میں فرمایا۔

وخامس عشرھم کثیر العناء قلیل الغناء۔

ان میں کے پندرہویں کو الجھنوں سے واسطہ زیادہ ہو گا اور مالی استطاعت کم ہو گی۔

معتمد ابن متوکل مہتدی کے قتل کے بعد مسند فرمانروائی پر بیٹھا۔ اس نے اپنے بھائی موفق کو وزارت دفاع اور مختلف صوبوں کی امارت کا عہدہ سپرد کیا۔ معتمد کو اسے اپنے دور خلافت میں گوناگوں مشکلات سے دو چار ہونا پڑا۔ چنانچہ حبشی غلاموں نے علی ابن محمد کی سرکردگی میں بصرہ اور اس کے اطراف میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ جن سے موفق نے متعدد جنگیں لڑیں۔ حجاز و عراق میں ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگ دانے دانے کو ترس گئے اور نہر عیسیٰ کے بند کے ٹوٹ جانے سے بغداد میں اتنا شدید سیلاب آیا کہ محلّہ کرخ کے سات ہزار مکان منہدم ہو گئے۔ معتمد اگرچہ تئیس برس تک بساط خلافت پر متمکن رہا مگر وہ ایک طرح سے موفق کے ہاتھ میں کھلونا بنا رہا اور وہی سلطنت کے تمام امور سرانجام دیتا تھا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے۔

وکان فی خلافتہ محکوما علیہ قد تحکم علیہ اخوہ ابو احمد الموفق وضیق علیہ حتی انہ احتاج الی ثلثمائتہ دینار فلم یجدھا۔ (تاریخ کامل ج ۶ ص ۴۷)

معتمد اپنے دور خلافت میں حاکم کے بجائے محکوم تھا اس کا بھائی ابو احمد موفق اس پر مسلط تھا اور اسے تنگدستی کی حالت میں رکھتا تھا یہاں تک کہ اگر اسے تین سو دینار کی ضرورت پڑتی تو وہ بھی اسے میسر نہ ہوتے۔

معتضد ابن موفق کے بارے میں فرمایا۔

سادس عشرھم اقضاھم للذمم واوصلھم للرحم۔

ان میں کا سولھواں سب سے بڑھ کر ادائے حقوق اور صلہ رحمی کرنے والا ہے۔

عباسی خلفاء نے ہر دور میں سادات علویہ کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے مظالم کا نشانہ بنایا اور انہیں قتل و غارت کیا جاتا رہا البتہ معتضد نے قرابت و صلہ رحمی کا کچھ پاس و لحاظ کرتے ہوئے ان پر تشدد گوارا نہیں کیا اور نہ ان کے ساتھ حسن سلوک کئے جانے سے مانع ہوا۔ چنانچہ ابن جریر طبری نے تحریر کیا ہے کہ والی طبرستان محمد ابن زید علوی نے مخفی طور پر بتیس ہزار دینار محمد ابن ورد عطار کے پاس بھیجے تاکہ وہ بغداد' کوفہ' مکہ اور مدینہ کے سادات پر انہیں تقسیم کریں۔ رئیس شرطہ بدر کو معلوم ہوا تو اس نے محمد ابن ورد کو طلب کیا اور اس رقم کے بارے میں باز پرس کی۔ اس نے کہا کہ مجھے والی طبرستان ہر سال اتنی رقم بھیجتا ہے اور جہاں جہاں وہ کہتا ہے میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ بدر نے معتضد سے اس کا ذکر کیا اور اس کی رائے دریافت کی۔ معتضد نے کہا کہ تمہیں وہ خواب یاد ہو گا جو میں نے تم سے

بیان کیا تھا۔ کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے کہا کہ میں نے خواب دیکھا کہ لاؤ لشکر کے ساتھ نہروان کے اطراف میں راہ پیا ہوں اس دوران میں میری نظر ایک ٹیلے پر پڑی جس پر ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے شاہی جلوس اور اس کے شکوہ و جلال کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ آگے بڑھ کر میرے سامنے آؤ میں آگے بڑھا تو کہا کہ مجھے پہچانتے ہو کہ میں کون ہوں میں نے کہا کہ آپ کو کبھی دیکھا نہیں کہا کہ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہوں پھر ایک بیلچے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اسے اٹھاؤ اور زمین پر مارو میں نے چند ضربیں لگانے کے بعد ہاتھ روک لیا فرمایا۔

انہ سیلی من ولدک ھذا الا سربعد د الضربات فاوصھم بولدی خیرا۔ (تاریخ طبری ج ۸ ص ۸۰)

تم نے جتنی ضربیں لگائی ہیں تمہاری اولاد میں اتنے ہی مسند حکومت کے وارث ہوں گے لہٰذا انہیں یہ وصیت کرنا کہ وہ میری اولاد سے حسن سلوک کریں۔

یہ خواب بیان کرنے کے بعد کہا کہ تم محمد ابن ورد سے کہہ دو کہ وہ محمد ابن زید کو لکھے کہ چوری چھپے مال بھیجنے کی ضرورت نہیں وہ علانیہ مال بھیجے اور جہاں چاہتا ہے بے جھجک تقسیم کرے۔

علامہ طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۲۸۴ ھ میں معتضد نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ ہر نماز جمعہ کے بعد منبروں پر کھڑے ہو کر معاویہ ابن ابی سفیان پر لعنت کی جائے اور ایک نوشتہ[1] جو امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے فضائل و مناقب اور معاویہ کے نقائص و معایب پر مشتمل تھا پڑھ کر لوگوں کو سنایا جائے۔ جب اس کے وزیر عبداللہ ابن سلیمان کو معلوم ہوا تو وہ حضرت علی علیہ السلام سے انحراف کی بنا پر قاضی یوسف ابن یعقوب کے پاس آیا اور اسے معتضد کے ارادہ سے مطلع کیا اور کہا کہ کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ چنانچہ قاضی یوسف معتضد کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ نماز جمعہ کے بعد معاویہ پر برملا لعنت کی جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات آپ کے خلاف بھڑک اٹھیں گے اور ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا کہ اس کا دبانا آپ کے بس سے باہر ہو جائے گا۔ کہا کہ مجھ میں اتنا دم خم ہے کہ میں اسے دبا سکوں اور کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہونے دوں کہا کہ پھر ان علویوں کے بارے میں کیا کیجئے گا جو خروج پر تلے بیٹھے ہیں جب عوام آل محمدؐ کے مآثر و فضائل سے آگاہ ہوں گے تو وہ ان کی طرف مائل ہو جائیں گے جس سے انہیں تقویت پہنچے گی اور وہ اپنے موقف کے حق بجانب ہونے میں اسے بطور حجت و برہان پیش کریں گے۔ اس پر معتضد خاموش ہو گیا اور اپنا

---

[1] یہ نوشتہ تاریخ طبری جلد ۸ صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۹ میں درج ہے اور اس کے نیچے معتضد کے وزیر ابوالقاسم عبداللہ ابن سلیمان کا نام کاتب کی حیثیت سے مرقوم ہے۔

ارادہ بدل دیا۔

مقتدر کے بارے میں فرمایا۔

کانی اری ثامن عشرھم تفحص رجلاہ فی دمہ بعد ان یاخذہ جندہ بکظمہ من ولدہ ثلث رجال سیرتھم سیرۃ الضلال۔

میں ان میں کے اٹھارویں کو گویا دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے خون میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے جبکہ اس کا لشکر اس کا گلا دبوچ چکا ہو گا اس کے بیٹوں میں سے تین وہ ہیں جن کا طور طریقہ گمراہوں کا ہو گا۔

مقتدر ابن معتضد تیرہ برس کی عمر میں مسند خلافت پر بیٹھا اور پچیس سال بر سر اقتدار رہنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ صورت یہ پیش آئی کہ مونس المظفر جو امیرالامراء کے منصب پر فائز تھا اسے عبداللہ ابن حمدان اور نازوک حاجب نے یہ بتایا کہ مقتدر اسے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی ہارون ابن غریب کا اس کی جگہ تقرر کرنا چاہتا ہے مونس نے یہ سنا تو امراء اور فوجی دستوں کے ساتھ قصر شاہی پر دھاوا بول دیا مقتدر کو گھر سے باہر نکال کر اپنے گھر میں زیر حراست رکھا اور محمد ابن معتضد کو القاہر باللہ کا لقب دے کر مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ جب بیعت کی تکمیل ہو گئی تو لشکریوں نے اپنے سالانہ وظائف اور حق بیعت کا مطالبہ کیا لیکن بروقت یہ مطالبہ پورا نہ کیا جا سکتا تھا۔ انہیں انتظار کرنے کے لئے کہا گیا اس پر وہ بگڑ گئے اور ہلڑ ہنگامہ کرتے ہوئے مونس کے مکان پر آئے اور اس کے ہاں سے مقتدر کو باہر لائے اور قصر میں لا کر اسے دوبارہ مسند اقتدار پر بٹھا دیا۔ مقتدر نے فوج کو سالانہ وظائف کے ساتھ عطایا و انعامات دئے۔ ابھی اس واقعہ کو دو ہی سال کا عرصہ گزرا ہو گا کہ مونس و مقتدر میں پھر کسی بات پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مونس موصل چلا آیا اور ترکوں اور بربریوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی اور بغداد کا رخ کیا۔ مقتدر کو معلوم ہوا تو اس نے بھی فوجیں میدان میں اتار دیں اور خود ایک بلندی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ مقتدر کی فوج کے جرنیلوں نے اسے میدان میں لا کھڑا کرنا چاہا تاکہ فوج کی ہمت بڑھے مگر مقتدر پر اتنا خوف و ہراس طاری تھا کہ وہ نیچے اترنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر زور دینے پر اترا مگر اس وقت جب مونس نے عباسی فوجوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا اس کی فوج کا ایک سردار اس کے پاس آیا اور کہا کہ آپ واپس جائیے۔ مقتدر واپس جانا چاہتا تھا کہ مونس کی فوج نے اس پر حملہ کر دیا ایک بربری نے اس پر بھالا مارا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کا سرتن سے علیحدہ کرنے کے بعد نیزہ پر بلند کیا گیا اور جسم پر سے لباس اتار کر عریاں کر دیا گیا جسے ایک شخص نے گھانس پھونس سے ڈھانپا۔ اس کے بارہ بیٹوں میں سے راضی، متقی اور مطیع مختلف ادوار میں خلیفہ ہوئے جن کے عادات و خصائل اپنے پیشرووں کی عادات سے مختلف نہ تھے۔

مستعصم کے بارے میں فرمایا۔

لکانی اراہ علی جسد ازوری قتیلا۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ بغداد کے پل پر مقتول پڑا ہے۔

مستعصم خلفاء بغداد میں کا آخری تاجدار تھا جس پر عباسی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ سلطنت عباسیہ پر یہ زوال دفعتہً طاری نہیں ہوا بلکہ ان حالات کا طبعی نتیجہ تھا جو صدیوں پہلے سے رونما ہو رہے تھے۔ چنانچہ حنبلیوں اور اشعریوں کے آئے دن کے بکھیڑے اور شیعہ سینوں کے جھگڑے حکومت کی بنیادوں کو گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہے تھے اور حکمرانوں کی تن آسانیاں اور ارکان دولت کی باہم آویزیاں تباہی و بربادی کی راہ ہموار کرتی جا رہی تھیں اور آخر دور میں تو سیاسی و عسکری قوت دم توڑ چکی تھی اور خلفاء بے بس اور دیلمی اور سلجوقی امراء کے دست نگر ہو کر رہ گئے تھے اور ہر قدم پر ان کے اشارہ چشم وابرو کے منتظر رہتے تھے۔ مگر ان حالات میں بھی اسلامی ممالک آزادی و خود مختاری کے باوجود برائے نام سہی مرکز خلفمت سے وابستہ تصور ہوتے تھے اور یہی وابستگی اسے باقی و برقرار رکھے ہوئے تھی۔ لیکن ایک شکستہ و بوسیدہ عمارت کو اڑانوں کے سہارے کب تک رکھا جا سکتا تھا ایک نہ ایک دن اسے دھڑام سے گرنا ہی تھا۔ چنانچہ تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد کا حادثہ پیش آیا۔ اس المیہ کی ذمہ داری خواہ کسی کے سر ڈالنے کی کوشش کی جائے مگر خود خلیفہ وقت کو اس سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے سلطنت کے نظم و نسق سے آنکھیں بند رکھیں اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے دشمن کو تاخت و تاراج کا موقع فراہم کیا۔ حملہ تاتار کا قوی ترین محرک یہ تھا کہ چنگیز خان کے پوتے منکو خان کے دور اقتدار میں باطنیوں نے جو بحیرہ خزر کے جنوب میں پہاڑی علاقوں میں سکونت پذیر تھے امن عامہ کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ منکو خان نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو ایران کی حکومت کا پروانہ دے کر ان کی سرکوبی پر مامور کیا۔ ہلاکو خان نے اطراف و جوانب کے سربراہوں اور مستعصم سے مدد کی درخواست کی مگر مستعصم نے اس کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کوئی مدد نہ دی۔ جب ہلاکو خان نے باطنیوں پر قابو پالیا اور ان کے قلعے فتح کر لئے تو مستعصم کو ایک خط میں لکھا کہ تم نے میرے ساتھ تعاون کرنے سے گریز کیا اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ تم ہماری بالا دستی تسلیم کر کے اطاعت قبول کرو مگر مستعصم کے سر میں ہوائے غرور بھری ہوئی تھی اس نے اس کا سخت الفاظ میں جواب دیا اور پیغامبر کو بھی ذلیل کیا گیا اس نے یہ نہ سوچا کہ اس کے پاس نہ باقاعدہ فوج ہے نہ آزمودہ کار سپاہ اور جو ہے وہ ناکارہ و آرام طلب جس میں نہ ہلاکو خان کی دل بادل فوجوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت ہے اور نہ میدان میں جم کر لڑنے کی ہمت۔ لہٰذا نرم رویہ اختیار کرنا قرین مصلحت ہو گا غرض اس تحکمانہ طرز عمل سے ہلاکو خان کے تیور بدلے' تاتاری خون نے جوش مارا اور وہ دو لاکھ تاتاریوں کے ساتھ بغداد پر حملہ کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ مستعصم کی پاشان و پریشان فوج کے بس کا روگ نہ تھا کہ وہ اس سیلاب بلا کے آگے بند باندھ سکے۔ کچھ دیر تک مدافعانہ جنگ لڑی اور آخر تاتاریوں کے پرزور حملے سے پسپا ہو کر شہر میں واپس ہو گئی۔ تاتاریوں نے پیش قدمی کر کے بغداد کا محاصرہ کر لیا جب مستعصم نے دیکھا کہ اس کی قوت دفاع دم توڑ چکی ہے تو وہ

اعزہ و امراء کو لے کر ہلاکو خان کے پاس چلا آیا۔ ہلاکو نے اسے اپنی گرفت میں لے کر اپنی فوجوں کو قتل عام کا حکم دے دیا تاتاریوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ایک ایک گھر اور شاہی خرمن کو لوٹ لیا اور چالیس دن تک ان کی تلواریں اہل بغداد کے سروں پر چلتی رہیں اور صرف وہی لوگ بچے جو کسی طرح ان کی نظروں سے اوجھل رہ سکے۔ مستعصم کو ایک چٹائی میں لپیٹ کر اس طرح روندا گیا کہ اس نے دم توڑ دیا اور اس کے عزیز و اقارب بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ یہ واقعہ محرم ۶۵۶ ھ میں پیش آیا اور سوا پانچ صدیوں تک قائم رہنے والی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد ابن عبداللہ المحض کے بارے میں فرمایا۔

انہ یقتل عند احجار الزیت۔ وہ احجار زیت کے نزدیک قتل کئے جائیں گے۔

سانحۂ کربلا کے بعد اموی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پوری شدت سے ابھر آیا تھا جس نے ایک عام بے چینی اور غیر اطمینانی کیفیت پیدا کر دی اور حکومت کی تبدیلی ناگزیر سمجھی جانے لگی۔ چنانچہ بنی امیہ کے دور آخر میں عباسیوں اور علویوں نے اموی اقتدار کا تختہ الٹ کر حکومت پر قابض ہونے کا تہیہ کر لیا اور آل رسولؐ کے حق کی فوقیت کا اعلان کر کے انقلابی تحریک کو آگے بڑھایا اور ماہ ذی الحجہ ۱۳۱ ھ میں ایک مجلس مشاورت قائم کر کے یہ طے کیا کہ اموی اقتدار کے خاتمہ پر محمد ابن عبداللہ المحض کو جو حسن مثنی کے پوتے اور زہد و ورع کی بنا پر نفس زکیہ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے مسند خلافت پر بٹھا دیا جائے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس معاہدہ کی تکمیل کر لی گئی۔ ان بیعت کرنے والوں میں منصور دوانیقی بھی شامل تھا۔ جب ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲ ھ کو مروان ثانی کے قتل کر دئے جانے پر اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو عباسیوں نے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر خلافت کے نام پر زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور محمد ابن عبداللہ کے بجائے ابوالعباس سفاح کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سفاح نے محمد ابن عبداللہ اور ان کے ہمنواؤں سے کوئی تعرض نہ کیا اور اپنی پوری توجہ بنی امیہ کے استیصال پر مرکوز کر دی۔ جب اسکے بعد منصور مسند خلافت پر متمکن ہوا تو اسے محمد ابن عبداللہ کی طرف سے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے پیش نظر حکومت کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں اور محمد ابن عبداللہ کو بھی یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ منصور انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی پوری کوشش کرے گا۔ چنانچہ وہ اور ان کے بھائی ابراہیم پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ اس روپوشی سے منصور کے اس شبہہ کو اور تقویت پہنچی کہ وہ اپنی خلافت کے لئے کوشاں ہیں۔ اس نے زیاد ابن عبیداللہ کو ان کی گرفتاری پر متعین کیا۔ زیاد نے انہیں امان کے وعدہ پر طلب کیا جب وہ آئے تو انہیں چھوڑ دیا اور خود قید خانہ میں چلا گیا پھر ان کی گرفتاری پر محمد ابن خالد کو مقرر کیا۔ اس نے گھروں تک کی تلاشی لی مگر انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر رباح ابن عثمان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا گیا اور اسے تاکید کی کہ جس طرح بن پڑے محمد اور ابراہیم کو تلاش کیا جائے۔ جب وہ بھی ناکام ہوا تو منصور نے حکم دیا کہ تمام حسنی سادات کو گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ

انہیں زنجیروں میں جکڑ کر مدینہ سے کوفہ لایا گیا اور تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور عبداللہ المحض کو بھی پابند سلاسل کر کے زندان کے تہ خانہ میں رکھا گیا اور ان پر اتنے مظالم کئے گئے جو کسی طرح اموی مظالم سے کم نہ تھے۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے۔

والله مافعلت امیته فیهم   معشار ما فعلت بنو العباس

خدا کی قسم بنی عباس نے ان پر جو مظالم کئے ان کے مقابلہ میں بنی امیہ کے مظالم دسواں حصہ ہوں گے۔

جب محمد کو ان حالات کا علم ہوا تو وہ ان مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ماہ رجب ۱۴۵ھ میں ایک مختصر سی جمیعت کے ساتھ مدینہ آئے اور اہل مدینہ کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ منصور کو اطلاع دی گئی تو اس نے اپنے بھتیجے عیسیٰ کی قیادت میں چار ہزار سوار اور دو سو پیادے بھیجے اور اس کے عقب میں محمد ابن قحطبہ کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے روانہ کیا دونوں فریق میں خونریز جنگ ہوئی محمد، حمید ابن قحطبہ کے ہاتھ سے مارے گئے اور ان کے ساتھی بھی سب ایک ایک کر کے قتل کئے گئے۔ ابن قحطبہ نے محمد کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھجوایا۔ جس نے مختلف شہروں میں اس کی تشہیر کی۔ یہ واقعہ امیرالمومنین علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق مدینہ کے نزدیک احجار زیت میں پیش آیا۔

ابراہیم ابن عبداللہ المحض کے بارے میں فرمایا۔

بباخمری یقتل بعد ان یشهر یاتیه سهم غرب یکون فیه منیت فیابوس المراهی شلت یده و وهن معسرد

وہ باخمری میں پہلے تو دشمن پر غالب آجائیں گے پھر قتل کر دئے جائیں گے اس طرح کہ کسی نامعلوم شخص کا تیر انہیں لگے گا۔جو جان لیوا ثابت ہو گا برا ہو اس تیر پھینکنے والے کا کاش اس کے ہاتھ شل اور بازو ناکارہ ہو جاتے۔

منصور، محمد ابن عبداللہ کے بھائی ابراہیم کی تلاش میں بھی تھا۔ مگر وہ ایک جگہ قیام نہ کرتے تھے اس لئے ان کا پتا نہ چلتا تھا آخر میں وہ بصرہ میں وارد ہوئے اور شہر کے عمائد و اکابران کے ہمنوا ہو گئے۔ انہوں نے حاکم بصرہ سفیان ابن معاویہ کو بے دست و پا کر کے بصرہ پر تسلط حاصل کر لیا اور بیت المال کی جمع جتھا فوج پر تقسیم کر دی۔ اس اثناء میں محمد ابن عبداللہ کے مارے جانے کی اطلاع آگئی۔ آپ نے فارس و اہواز کے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر ترتیب دیا اور یکم شوال ۱۴۵ھ کو بصرہ میں قیام کر دیا۔ منصور نے یہ خبر سنی تو بہت سٹپٹایا۔ اس نے فوراً شام، افریقہ اور خراسان میں پھیلی ہوئی فوجوں کو جمع کر کے ان کے مقابلہ میں صف بندی کا حکم دیا۔ ابراہیم ابھی محاذ جنگ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اہل کوفہ کی ایک جماعت ان کے پاس آئی اور کہا کہ کوفہ میں ایک لاکھ شمشیرزن آپ

کے پرچم کے نیچے لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ یہاں سے کوفہ تشریف لے چلیے۔ ابراہیم نے اہل کوفہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کوفہ کی طرف حرکت کی جب کوفہ اور واسط کے درمیان مقام باخمری میں پہنچے تو منصور کا لشکر بھی وہاں پہنچ گیا۔ ابراہیم کی سپاہ نے دشمن کے لشکر کو دیکھ کر تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور بڑی بے جگری سے حملہ کر دیا۔ فوج مخالف اس حملہ کی تاب نہ لا سکی اس کے قدم اکھڑ گئے اور پسپا ہو کر کوفہ کے حدود تک پہنچ گئی صرف سو آدمی میدان میں رہ گئے۔ ان کے قدم بھی اکھڑا چاہتے تھے کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا جو ابراہیم کے حلق میں لگا۔ آپ نے سنبھلنا چاہا مگر سنبھل نہ سکے زمین پر گرے اور دم توڑ دیا۔ ان کے ہمراہی منتشر ہو گئے فوج مخالف کے سردار عیسی ابن موسی نے ان کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھجوا دیا۔ یہ واقعہ ماہ ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں پیش آیا۔

علی ابن محمد اور اس کی حبشی فوج کے بارے میں فرمایا۔

کانی بہ قد سار بالجیش الذی لا یکون لہ غبار ولا نجب ولا قعقعتہ لجم ولا حمحمتہ خیل یثیرون الارض باقدامھم کانھا اقدام النعام۔ (نہج البلاغہ)

میں اس شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک ایسے لشکر کو لے کر بڑھ رہا ہے جس میں نہ گرد و غبار ہے نہ شور و غوغا نہ لگاموں کی کھڑکھڑاہٹ اور نہ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز وہ لوگ زمین کو اپنے پیروں سے جو شتر مرغ کے پیروں کے مانند ہیں روند رہے ہوں گے۔

علی ابن محمد قبیلہ عبد قیس کا ایک فرد اور خوارج کے فرقہ ازارقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ امراء سلطنت کی مجلسوں میں آتا جاتا اور ان کے عطیوں پر گزر بسر کرتا تھا۔ سر میں سیادت و پیشوائی کا سودا تو رکھتا ہی تھا اپنے متبعین کی ایک جماعت تشکیل دینے کے لئے ۲۴۹ھ کو بغداد سے بحرین میں آیا اور کچھ لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ بحرین میں پانچ سال گزارنے کے بعد اپنے چند عقید تمندوں کے ساتھ بصرہ آیا۔ حاکم بصرہ محمد ابن رجاء نے اس کے طور طریقے دیکھے تو اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ یہ بھاگ کر بصرہ سے بغداد آگیا اور جب محمد ابن رجاء کی حکومت ختم ہو گئی تو بصرہ واپس آگیا اور یہاں پہنچ کر اعلان کیا کہ جو غلام میرے پاس چلا آئے گا وہ آزاد قرار پائے گا۔ غلام اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے تو تھے ہی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جب اس نے حبشی غلاموں کی اچھی خاصی جمعیت بہم پہنچا لی تو ملک میں شورش برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور عراق کے مختلف شہروں میں لوٹ مار شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں واسط، رامہرمز ایسے متعدد شہروں پر قابض ہو گیا۔ مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی سرکوبی کے لئے لشکر بھیجے جاتے مگر اس کے جیالے سپاہی ان کے قدم ٹکنے نہ دیتے اور انہیں جنگ سے دستبردار ہو کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے۔ ۲۵۲ھ میں ایلہ پر چڑھائی کی اور وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے شہر میں آگ لگا دی اور اہواز تک کا علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۲۵۷ھ میں اس کے ایک

سردار لشکر علی ابن ابان مہلبی نے بصرہ پر متعدد حملے کئے۔ ہر حملہ میں ہزاروں آدمیوں کو قتل کیا اور محلوں کے محلے جلا دئے۔ جب بصرہ کے کشت و خون کی مرکز میں معتمد کو اطلاع ہوئی تو اس نے مولد کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا جو دس دن تک لڑتا رہا۔ آخر حبشیوں نے اس کی فوج پر شبخون مارا اور اسے میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد نو برس تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہا مگر حبشی سپاہ کو شکست نہ دی جا سکی۔ ۲۶۶ ھ میں معتمد نے ابوالعباس معتضد کو اس مہم پر متعین کیا۔ ابوالعباس دس ہزار کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا اور دشمن کا سامنا کرتے ہی اس پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ دیر مقابلہ کیا اور پھر پیچھے کو ہٹا۔ حبشی اس کی پسپائی کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جوش میں آکر آگے بڑھے اتنے میں ایک فوجی دستہ نے جو ابو حمزہ نصیر کی قیادت میں کشتیوں کے ذریعہ پہنچا تھا عقب سے حملہ کر دیا اس کے ساتھ ابوالعباس نے بھی پلٹ کر حملہ کیا جب حبشی دو طرفہ گھر گئے تو ان میں بھگدڑ مچ گئی اور جدھر جس کا منہ آیا ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے مجتمع ہو کر پھر حملوں کا آغاز کر دیا۔ ۲۶۷ ھ میں ابوالعباس کا باپ موفق بھی ایک کثیر لشکر کے ساتھ پہنچ گیا اور ابوالعباس کے ساتھ مل کر میدان کارزار گرم کیا۔ آخر ۲۷۰ ھ میں علی ابن محمد کے مارے جانے سے جنگوں کا سلسلہ رکا۔ ان جنگوں میں مقتولین کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکا۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ پندرہ لاکھ مسلمان تہ تیغ ہوئے اور بصرہ میں صرف ایک دن کے اندر تین لاکھ افراد مارے گئے۔ ہزاروں خاندانوں کی عزت و ناموس پامال ہوئی اور واسط' کوفہ اور اس کے اطراف کی بیس ہزار عورتوں اور بچوں کو حبشیوں کے پنجے سے چھڑایا گیا۔

ایران سے نکلنے والے تیل کے چشموں کے بارے میں فرمایا۔

ویحا للطا لقان فان للہ تعالی بھاکنوزا لیست من ذھب ولا فضتہ۔ (بحار الانوار)

طالقان میں اللہ کے ایسے خزانے ہیں جو نہ سونے کے ہیں اور نہ چاندی کے۔

داعیان طبرستان کے بارے میں فرمایا۔

دعاہ حتی تقوم باذن اللہ فتدعوا الی دین اللہ۔

چند داعی اللہ کے حکم سے کھڑے ہوں گے جو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیں گے۔

بنی عباس نے جب علوی سادات کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا تو ان میں کا ایک خاندان طبرستان کے پہاڑی علاقہ میں آکر آباد ہو گیا۔ ابتداء میں یہ لوگ مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور مختلف مقامات پر مبلغ و داعی بھیج کر تبلیغی فرائض انجام دیتے رہے۔ جب دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں ایک معتدبہ جمیعت ان کے ساتھ ہو گئی تو سیاست میں دخیل ہو گئے اور ۲۵۰ ھ میں داعی کبیر حسن ابن زید کو حکمران منتخب کر کے طبرستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ حسن فقیہ' ادیب' شاعر اور شاعر نواز تھا چنانچہ شعراء اس کے دربار میں قصائد پڑھتے اور انعام و اکرام حاصل

کرتے۔ ایک مرتبہ ایک شاعر کو قصیدہ مدحیہ پر دس ہزار درہم دئے جو اس دور میں بہت بڑا انعام تھا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شاعر نے قصیدہ پڑھا جس کا ایک مصرع یہ تھا **اللہ فرد و ابن زید فرد** (اللہ یکتا ہے اور ابن زید بھی یکتا ہے) اس پر اس نے بگڑ کر کہا کہ اے دروغ گو تیرے منہ میں خاک تو نے یہ کیوں نہ کہا **اللہ فرد و ابن زید عبد** (اللہ یکتا ہے اور ابن زید ایک بندہ ہے) حسن نے انیس سال آٹھ مہینے چھ دن حکومت کرنے کے بعد ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

حسن کی وفات کے بعد اس کا بھائی محمد ابن زید قائم بالحق کے لقب سے برسر اقتدار آیا۔۶ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح علوم دینیہ و عربیہ کا ماہر تھا۔ اس کا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کربلا میں صرف کثیر سے روضۂ سید الشہداء اور شہر پناہ تعمیر کرائی۔ ابن اثیر نے تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ دو آدمی آپس کا جھگڑا نمٹانے کے لئے اس کے سامنے پیش ہوئے۔ اس نے ان کے نام پوچھے تو ایک نے معاویہ بتایا اور دوسرے نے علی۔ اس نے یہ نام سنے تو کہا کہ بس فیصلہ ہو گیا علی کے مقابلہ میں معاویہ حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ معاویہ نے کہا کہ آپ ناموں پر فیصلہ نہ کیجئے ان ناموں میں ایک مصلحت پوشیدہ ہے کہا وہ کیا کہا کہ میرا باپ مخلص شیعہ تھا اس نے نواصب سے بچانے کے لئے میرا نام معاویہ رکھا اور میرے اس حریف کا باپ ناصبی تھا اس نے شیعوں اور علویوں کے ڈر سے اس کا نام علی رکھ دیا۔ محمد اس کی حاضر جوابی پر مسکرایا اور اسے اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔

محمد کی حکومت اگرچہ طبرستان' جرجان' سے 'اصفہان اور کاشان تک پھیلی ہوئی تھی مگر اس نے عمرو ابن لیث کی خراسان سے برطرفی کی خبر سنی تو اپنی مملکت کو وسعت دینے کے لئے خراسان پر حملہ کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ جب جرجان کے قریب پہنچا تو اسمٰعیل ابن احمد سامانی نے جو خراسان پر قبضہ کر چکا تھا اسے پیغام بھجوایا کہ وہ واپس چلا جائے۔ مگر اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہ رکے آخر دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں محمد شدید زخمی ہو گیا اور انہی زخموں کی وجہ سے ۲۸۷ھ میں انتقال کیا اور سامانیوں نے طبرستان پر قبضہ کر لیا۔

۳۰۴ھ میں علوی خاندان کا ایک فرد حسن ابن علی اطروش جو ناصرالحق کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے طبرستان پر حملہ آور ہوا اور سامانیوں کو وہاں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ناصرالحق نے علوی حکومت تو دوبارہ قائم کر دی مگر خود اس جنگ میں مارا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۹۷ برس تھی۔

ناصرالحق کی وفات کے بعد اس کے داماد حسن ابن قاسم کو طبرستان کی حکومت سپرد کی گئی مگر ناصرالحق کے بیٹوں ابوالحسین احمد حاکم جرجان اور ابوالقاسم والیٔ گیلان نے اسے حکومت سے بے دخل کر دیا۔ ابوالحسین احمد نے ۳۱۱ھ میں وفات پائی تو اس کا بیٹا ابو علی محمد طبرستان کے صدر مقام آمل میں مسند اقتدار پر پہنچا مگر ماکان ابن کالی دیلمی نے آمل پر حملہ کر کے ابو علی محمد کو گرفتار کر کے جرجان بھیج دیا جہاں اس نے اپنی حکومت قائم کر لی جب ابو علی محمد گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہو گیا تو اس کے بھائی ابو جعفر حسن نے حکومت سنبھال لی۔ مگر حسن ابن قاسم نے ماکان

ابن کالی کے تعاون سے آمل پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ابو جعفر حسن جرجان کی طرف چلا گیا۔ اس دوران میں اسفار ابن شیرویہ جو ابو جعفر حسن کی طرف سے ساریہ کا حاکم تھا حسن ابن قاسم پر حملہ آور ہوا۔ حسن ابن قاسم جو نوے برس کی عمر کا تھا لڑتا ہوا مارا گیا۔ ابو جعفر حسن کے بعد اس کا بھائی الثائر کا لقب اختیار کر کے حکمران ہوا۔ جب الثائر کا ۳۵۵ھ میں انتقال ہوا تو اس کا بھائی حسن الناصر حکمران قرار پایا اور اس پر علوی حکومت کا اختتام ہو گیا۔

سلطنت فاطمیہ کے بانی عبداللہ المہدی کے بارے میں فرمایا۔

ثم یظهر صاحب القیرو ان الغض البض ذوالنسب المحض المنتجب من سلالته ذی البداء المسجی بالرداء۔

پھر قیروان کا فرمانروا ظاہر ہو گا جس کا جسم ترو تازہ اور نرم و نازک ہو گا صحیح نسب کا حامل اور اس کی اولاد میں سے ہو گا جس کے لئے بدا واقع ہو گا اور جسے چادر میں لپیٹ کر رکھا جائے گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی زندگی میں جناب اسمٰعیل کی امامت کا اظہار کیا تھا مگر جب وہ آپؑ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تو ان کی امامت کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا اس لئے امام علیہ السلام نے رفع اشتباہ کے لئے ان کی میت کو ایک چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا اور اعیان و اکابر شیعہ کو ان کی میت دکھا دی تھی تاکہ انہیں موت کا یقین ہو جائے اور امامت کے سلسلہ میں بدا کے واقع ہونے کا کوئی شبہہ نہ رہے مگر ایک گروہ نے اسمٰعیل کی وفات کے باوجود انہیں امام تسلیم کر لیا اور پھر ان کی اولاد میں سلسلہ امامت کے اجراء کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ اسمٰعیل کے بعد جعفر المصدق پھر محمد المکتوم پھر محمد الحبیب اور پھر عبداللہ کو امام مانا جانے لگا۔ اس سلسلہ امامت کے قائل اسمعیلیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسمٰعیل امام ہفتم تھے پھر تین امام مخفی ہوئے اور ان مخفی آئمہ کے بعد آئمہ ظاہر کا سلسلہ شروع ہوا اور عبداللہ ابن محمد الحبیب پہلا امام قرار پایا۔ بعض مورخین نے عبداللہ کی سیادت سے انکار کیا ہے مگر اکثر مورخین نے جن میں ابن خلکان اور ابن خلدون بھی شامل ہیں اسے صحیح النسب فاطمی سید تسلیم کیا ہے۔

فرقہ اسمعیلیہ کے مبلغ و داعی مختلف علاقوں میں اپنے نظریات کی تبلیغ کے لئے متعین کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ابو عبداللہ حسن ابن محمد کو شمالی افریقہ کا داعی مقرر کیا گیا۔ وہ پہلے حج کے دنوں میں مکہ آیا تاکہ افریقی لوگوں سے جو حج کے لئے آیا کرتے تھے راہ و رسم پیدا کرے اور ان کے ساتھ افریقہ کی راہ لے۔ چنانچہ اس نے اہل کتاب سے جو شمالی افریقہ میں واقع ہے روابط بڑھائے اور حج سے فارغ ہو کر ان کے قافلہ کے ہمراہ کتامہ پہنچ گیا اور کچھ عرصہ اس علاقہ میں قیام کرنے سے اہل کتامہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور پھر ان کے تعاون سے لشکر کشی کی اور مختلف شہروں کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس نے شمالی افریقہ کے معتدبہ حصہ پر قبضہ کر لیا تو اپنے بھائی ابوالعباس کو حمص کے علاقہ میں سلمیہ بھیجا تاکہ عبداللہ کو عزت و احترام کے ساتھ یہاں لائے اور زمام حکومت اس کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ جب ابوالعباس سلمیہ پہنچا تو عبداللہ اس کے ہمراہ نکل کھڑا ہوا۔ مکفی باللہ کو اس کی نقل و حرکت کی خبر دی

گئی تو اس نے اس کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا۔ عبیداللہ نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنے بیٹے ابوالقاسم نزار کے ہمراہ غیر معروف راستوں پر ہو لیا اور مصر ہوتا ہوا طرابلس پہنچ گیا اور وہاں سے ابوالعباس کو ابو عبداللہ کو اطلاع دینے کے لئے کتامہ روانہ کر دیا۔ ابوالعباس کتامہ جاتے ہوئے جب قیرقان پہنچا تو وہاں کے حاکم زیادۃ اللہ نے اسے گرفتار کر کے قیدخانہ میں ڈال دیا اور طرابلس کے عامل کو لکھا کہ وہ عبیداللہ کو گرفتار کر لے۔ عبیداللہ گرفتاری کی خبر سن کر سلجماسہ کی طرف چل دیا مگر یہاں بھی مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کا حکم پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ادھر ابو عبداللہ نے لشکر کشی کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور ۲۹۶ھ میں قیروان کو فتح کر کے اپنے بھائی ابوالعباس کو زندان سے نکالا اور سلجماسہ کو محاصرہ میں لے کر عبیداللہ اور اس کے بیٹے نزار کو قید سے رہا کیا اور انہیں رہائی دلانے کے بعد ربیع الثانی ۲۹۷ھ کو قیروان واپس پلٹ آیا اور اقتدار عبیداللہ کے سپرد کر کے اس کی فرمانروائی کا اعلان کیا۔ عبیداللہ نے شمالی افریقہ میں سلطنت عبیدیہ کی بنیاد رکھی اور چوبیس سال ایک ماہ اور بیس دن حکومت کرنے کے بعد ۳۲۲ھ میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوالقاسم نزار مسند حکومت پر بیٹھا اور جب اس کے تیسرے جانشین المعزلدین اللہ نے ۳۵۹ھ میں مصر پر قبضہ کیا تو مصر کو دارالحکومت قرار دے لیا۔ سلطنت عبیدیہ ۲۷۰ برس تک قائم رہی۔

سلاطین دیالمہ کے بارے میں فرمایا۔

یخرج من دیلمان بنو الصیاد ثم یستقوی امرھم حتی یملکوا الزوراء ویخلموا الخلفاء۔	دیلم سے ایک شکاری کی اولاد میدان میں نکلے گی جس کا اقتدار اتنا مضبوط ہو گا کہ وہ بغداد پر چھا جائے گی اور خلفاء کو برطرف کرے گی۔

زمانہ سابق میں بحرخزر کا جنوبی علاقہ دیلم کہلاتا تھا اور وہاں کے باشندے بھی دیلم اور دیالمہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ یہاں ایک شخص بویہ نامی مقیم تھا جس کی کنیت ابو شجاع تھی۔ اگرچہ وہ شاہان فارس کی اولاد میں سے تھا مگر غربت و ناداری کی بنا پر بحیرہ کیسپین میں مچھلیاں پکڑ کر گزر بسر کرتا تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے علی، حسن اور احمد جو اپنے حسن تدبر اور سعی پیہم سے فارس کے تمام صوبوں پر قابض ہو گئے اور عمادالدولہ، رکن الدولہ اور معزالدولہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا دائرہ اختیار و اقتدار اتنا وسیع تھا کہ بغداد کا مرکز خلافت بھی ان کے زیر اثر ہو گیا۔ دربار خلافت میں خلیفہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے اور سکوں پر خلیفہ کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی لکھا جاتا بلکہ خلیفہ کی موقوفی و بحالی ان کے اختیار میں تھی اور جسے چاہتے مسند خلافت پر بٹھا دیتے اور جسے چاہتے اتار دیتے۔ چنانچہ جب معزالدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ مستکفی باللہ ترکوں کی مدد سے اسے قتل یا بغداد سے باہر نکال دینا چاہتا ہے تو اس کے فرستادہ چند دیلمی مستکفی کے دربار میں آئے اور اس کی طرف بڑھے۔ وہ یہ سمجھا کہ درباری دستور کے مطابق دست بوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ہاتھ آگے کر دیا انہوں نے اس کے ہاتھ مین ہاتھ ڈال کر اسے

نیچے اتار لیا اور گھسیٹتے ہوئے معزالدولہ کے پاس لے آئے۔ اس نے اسے قید کر دیا اور المطیع للہ کو مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ اسی طرح رکن الدولہ کے پوتے ابونصر بہاء الدولہ ابن عضد الدولہ کے حکم سے الطائع للہ کو بھرے دربار میں تخت خلافت سے نیچے اتار لیا گیا وہ چیختا چلاتا رہا مگر اس کی حمایت میں نہ کسی کو زبان کھولنے کی جرأت ہوئی اور نہ تلوار کو حرکت دینے کی ہمت۔ بہاء الدولہ نے اسے معزول کرنے کے بعد چند آدمیوں کو متقی کے بیٹے قادر باللہ کے پاس بھیجا جو طائع کے خوف سے بطیحہ میں مقیم تھا تاکہ طائع کی جگہ پر اسے مسند خلافت پر بٹھایا جائے۔

ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے کہ ہبتہ اللہ ابن عیسیٰ نے بیان کیا کہ جب قادر باللہ بطیحہ میں مقیم تھا تو میں ہفتہ میں دو مرتبہ اس کے ہاں آتا تھا۔ وہ میرا احترام کرتا اور خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ ایک مرتبہ میں اس کے ہاں گیا تو وہ اس خندہ روئی سے پیش نہ آیا جو اس کا معمول تھا۔ میں نے کہا کہ آج آپ کی پذیرائی کا انداز کچھ بدلا ہوا ہے اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہو یا کوئی ناگوار بات کہی ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔ کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے جس کا میرے دل و دماغ پر اثر ہے اور میں کچھ کھو سا گیا ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ خواب تو بیان کیجئے۔ کہا کہ میں نے دیکھا کہ ایک وسیع و عریض دریا ہے جس کا پاٹ دجلہ سے کئی گنا بڑا ہے۔ میں اس دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا آگے بڑھ کر ایک بلند و بالا پل نظر آیا مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے دریا پر اتنا اونچا اور مضبوط پل کس نے بنایا ہے ابھی میں حیران و ششدر کھڑا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا جو بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کیا تم اس دریا کو عبور کرنا چاہتے ہو میں نے کہا ہاں اس نے وہیں سے ہاتھ بڑھایا اور مجھے پکڑ کر دریا کے اس پار اتار دیا میں نے اس کی یہ غیر معمولی قوت و طاقت دیکھی تو مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں کہا۔

علی ابن ابی طالب و هذا الا مر صائر الیک و یطول عمر ک فیه فاحسن الی ولدی و شیعتی۔ (تاریخ کامل ج ۷ ص ۱۴۸)

میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہوں یہ حکومت تمہاری طرف پلٹے گی لہٰذا میری اولاد اور میرے شیعوں سے نیک برتاؤ کرنا۔

ہبتہ اللہ کہتا ہے کہ ادھر اس نے خواب ختم کیا ادھر باہر سے شور سنائی دیا جھانک کر دیکھا تو دروازہ پر لوگوں کا ہجوم تھا اور تہنیت و تبریک کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ بہاء الدولہ کے آدمی آئے ہیں جو قادر باللہ کو بغداد لے جانا چاہتے ہیں تاکہ تخت و تاج خلافت اس کے سپرد کیا جائے۔ قادر باللہ نے یہ سنا تو دم بخود ہو کر رہ گیا اور اسی وقت بہاء الدولہ کے آدمیوں کے ساتھ بغداد روانہ ہو گیا۔ جب بغداد پہنچا تو بہاء اللہ ارکان دولت اور روسائے شہر نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اپنے جلو میں لے کر قصر خلافت میں اتارا۔ قادر باللہ نے اکتالیس برس تین ماہ کا طویل عرصہ حکومت کی۔

تاتاریوں اور ان کی خونریزیوں کے بارے میں فرمایا۔

كانى اراهم قوما كان وجوههم المجان للطرقته يلبسون السرق والد يباج و يعتبقون العنان ويكون هناك استحرار قتل حتى يمشى المجروح على المقتول ويكون المفلت اقل من الماسور۔

میں ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جن کے چہرے ان ڈھالوں کی طرح ہیں کہ جن پر چمڑے کی تہیں منڈھی ہوئی ہوں وہ ابریشم و دیبا کے کپڑے پہنتے ہیں اور اصیل گھوڑوں کو عزیز رکھتے ہیں اور وہاں کشت و خون کی گرم بازاری ہو گی اور بچ کر بھاگ نکلنے والے اسیر ہونے والوں سے کم ہوں گے۔

قبیلہ تاتار منگولیا کے صحرائے گوبی میں متمدن دنیا سے الگ تھلگ وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ان لوگوں کے سینے چوڑے' چہرے چپٹے اور خدو خال ترکوں سے ملتے جلتے تھے۔ ایک نسل سے ہونے کے باوجود مختلف شاخوں اور ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر شاخ کا ایک سردار ہوتا تھا جو اپنے قبیلہ کی سود و بہبود کا نگران سمجھا جاتا تھا۔ ۲۰ ذی قعدہ ۵۴۹ ھ میں شمالی علاقہ کے سردار کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام تموچین (فولادی ٹکڑا) رکھا گیا۔ ابھی یہ بچہ تیرہ برس ہی کا تھا کہ اس کا باپ زہر سے ہلاک کر دیا گیا۔ یہ بچہ جس نے بعد میں قاآن اعظم چنگیز خان کے نام سے شہرت پائی اپنے باپ کی جگہ پر سردار قرار پایا۔ اگرچہ اس کی مخالفت میں آوازیں اٹھیں مگر اس نے خود اعتمادی کا سہارا لے کر مخالف آوازوں کو خاموش کر دیا اور اپنے حسن تدبر اور زور بازو سے آس پاس کے علاقوں کو فتح کر لیا اور اپنی طاقت اتنی بڑھا لی کہ ایک تاتاری سردار نے اپنی لڑکی اسے بیاہ دی اور آپس میں معاہدہ صلح کر لیا۔ جب وہ مر گیا تو چنگیز خان نے اس کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا اور پراگندہ و منتشر ریاستوں کو ختم کر کے ایک مستحکم و وسیع مملکت تشکیل دے لی۔ اسی چنگیز خان کی قیادت میں تاتاریوں نے اسلامی مملکتوں پر تاخت کی اور آبادیوں کو بے نشان' شہروں کو ویران اور لاکھوں آدمیوں کو تہ تیغ کر کے اپنی فرمانروائی کا پرچم بلند کیا۔ اس مار دھاڑ اور قتل و غارت کا آغاز اس طرح ہوا کہ اس کے ہمسایہ ملک خوارزم کے چند تاجر تاتاریوں کے علاقہ میں آئے جن کے پاس عمدہ ریشمین کپڑے تھے۔ چنگیز خان عمدہ کپڑوں کی تلاش میں رہتا تھا اس نے حسب پسند کپڑے خریدے اور مزید خریداری کے لئے اپنے ہاں کے آدمی ان تاجروں کے ہمراہ خوارزم بھیجے تاکہ وہ کپڑا اور دوسری چیزیں خرید کر لائیں۔ جب یہ لوگ واپسی پر خوارزم کے سرحدی گاؤں اترار میں پہنچے تو والی اترار نے خوارزم شاہ کے حکم سے ان کا مال ضبط کر لیا اور ان آدمیوں کو جو کئی سو تھے قتل کر دیا۔ حالانکہ دونوں مملکتوں میں تاجروں کے آزادانہ آنے جانے کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ چنگیز خان کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے خوارزم شاہ کو ایک ایلچی کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ وہ والئ اترار کو قصاص کے لئے اس کے حوالے کرے مگر اس نے ناعاقبت اندیشی سے نہ صرف والئ اترار کو اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایلچی کو قتل کر کے اعلان جنگ کر دیا اور ایک لشکر جرار تاتاریوں کی سرحد پر اتار دیا۔ چنگیز خاں کا بیٹا جوجی خاں لشکر لے کر نکلا اور خوارزم کے لشکر کو پسپا کر دیا۔ خوارزمیوں کی پسپائی سے تاتاریوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ ایران

کے مختلف شہروں پر حملہ آور ہونے کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور چنگیز کے بیٹوں چغتائی خاں اور اکتائی خاں نے اترار کے قلعہ کو محاصرہ میں لے کر والی اترار کو زندہ گرفتار کر لیا اور اس کی آنکھوں اور کانوں میں پگھلی ہوئی چاندی انڈیل کر اسے ہلاک کر دیا اور خود چنگیز خاں ایک عظیم لشکر کے ساتھ بخارا کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کی آبادی کو قتل کر کے شہر میں آگ لگا دی اور بچے کھچے لوگوں کو غلام بنا لیا۔ بخارا کو تباہ کرنے کے بعد سمرقند کا رخ کیا یہاں کے لوگوں نے مقابلہ کے لئے ہاتھ پیر مارے مگر چنگیزی فوجوں کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں بھی تاتاریوں نے قتل عام کیا اور باقی ماندہ زن و مرد کو کنیز و غلام بنا کر ساتھ لے لیا۔ پھر خوارزم پر حملہ آور ہوئے۔ شاہ خوارزم دارالحکومت چھوڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سر چھپاتا پھرتا تھا۔ اہل شہر نے دیکھا کہ تاتاریوں کا لشکر مختصر ہے انہیں آسانی سے پسپا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی تاتاریوں نے جو ادھر ادھر کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے۔ یکبارگی حملہ کر دیا۔ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا اور دریا کا بند توڑ کر اسے تہ آب کر دیا۔ خوارزم کو تباہ کرنے کے بعد خراسان کا رخ کیا اور بے دریغ انسانی خون بہایا۔ خراسان کے بعد بدخشاں کو برباد کیا یہاں سے بلخ کی طرف بڑھے اور پوری آبادی کو تہ تیغ کر دیا پھر بامیان اور طالقان پر فوج کشی کی اور پوری طرح خون آشامی کا مظاہرہ کیا۔ پھر نساء کا رخ کیا اور زن و مرد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اسی طرح سبزوار، نیشاپور، مرو برات اور دوسرے شہروں کو لوٹا۔ شاہ خوارزم کا بیٹا جلال الدین غزنین کی طرف جا چکا تھا۔ چنگیز خاں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ غزنین چھوڑ چکا تھا۔ اس نے تعاقب جاری رکھا اور دریائے سندھ کے کنارے پر اسے گھیر لیا۔ جلال الدین نے گھوڑا دریا میں ڈالدیا اور موجوں سے ٹکراتا ہوا دوسری سمت نکل گیا۔ چنگیز خاں نے اس کے بال بچوں کو قتل کر دیا اور غزنہ اور غور پر قبضہ کر لیا۔ غرض تاتاریوں نے وسط ایشیا سے روس تک تہلکہ مچا دیا۔ شہروں کو کھنڈر آبادیوں کو ویران اور میدانوں کے میدان لاشوں سے پاٹ دئے۔

تعمیر بغداد کے بارے میں فرمایا۔

تبنی لهم مدينة يقال لها الزوراء بين دجلت و دجيل۔	بنی عباس کے لئے دریائے دجلہ اور نہر دجیل کے درمیان ایک شہر کی بنیاد رکھی جائے گی جسے زوراء کہا جائے گا۔

زوراء بغداد کا دوسرا نام ہے۔ اس کی بنیاد عباسیین کے دوسرے حکمران منصور دوانیقی نے ۱۴۴ھ میں رکھی۔ اس نے ماہر انجینئروں سے اس کا نقشہ بنوایا۔ مختلف جگہوں سے معمار و کاریگر جمع کئے اور ہر روز ایک لاکھ معماروں اور مزدوروں نے کام کر کے اس کو تکمیل تک پہنچایا۔ وسط شہر میں قصر شاہی اور امراء سلطنت کے محلات تعمیر کئے گئے اور باب خراسان، باب البصرہ، باب الکوفہ اور باب الشام سے اس کی حد بندی کی گئی۔

اصبغ ابن نباتہ نے بیان کیا کہ صفین کی طرف جاتے ہوئے امیرالمومنین علیہ السلام ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے

ہوئے اور اس ٹیلے اور بابل کے درمیان سرکنڈوں کے ایک جنگل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "شہر ہے اور کیسا شہر ہے" میں نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام کیا یہاں کبھی کوئی شہر آباد تھا جس کے کھنڈر دیکھ کر آپؑ یہ فرما رہے ہیں فرمایا۔

لاولکن ستکون مدینہ یقال لھا الحلتہ السیفیتہ۔ نہیں بلکہ یہاں ایک شہر آباد ہو گا جسے حلہ السیفیہ کہا جائے گا۔

چنانچہ سیف الدولہ صدقہ ابن منصور نے سلطان ملک شاہ کی اولاد کی باہم آویزیوں سے کنارہ کش رہنے کے لئے ۴۹۵ ھ میں اس سرزمین پر قیام کیا اور اپنے اہل و عیال اور لشکر کے لئے متعدد مکانات تعمیر کرائے۔ جس کے بعد لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور سیف الدولہ کی زندگی ہی میں ایک شہر سا آباد ہو گیا جو حلہ سیفیہ کے نام سے موسوم ہوا۔

امیرالمومنین علیہ السلام اپنے چند اصحاب کے ہمراہ بیرون کوفہ تشریف فرما ہوئے اور ایک جانب اشارہ کر کے فرمایا۔

لا تذھب الایام حتی یحضر ھھنا نھر یجری فیہ الماء۔ کچھ عرصہ کے بعد یہاں نہر کھودی جائے گی جس میں پانی رواں ہو گا۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ کیا ایسا بھی ہو گا فرمایا کہ ہاں چنانچہ اب کوفہ کے پہلو میں نہر رواں ہے اور نہر آصفی کے نام سے موسوم ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے بصرہ جاتے ہوئے ذیقار میں منزل کی تو فرمایا کوفہ سے پورے ایک ہزار آدمی آئیں گے نہ ایک زیادہ ہو گا اور نہ ایک کم۔ وہ مرنے اور جان دینے کا معاہدہ کریں گے اور اس معاہدہ پر ثابت قدم رہیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں اس تعداد میں کمی یا بیشی نہ ہو جائے ورنہ ساتھ والے شک و شبہہ میں پڑ جائیں گے۔ چنانچہ میں نے آنے والوں کو شمار کرنا شروع کیا جب آنے والوں کی تعداد نو سو ننانوے تک پہنچی تو ان کا سلسلہ رک گیا میں نے دل میں کہا کہ حضرتؑ نے یہ کہا ہی کیوں تھا کہ نہ ایک کم ہو گا اور نہ ایک زیادہ۔ ابھی میں اسی پریشان خیالی میں تھا کہ ایک شخص کو آتے دیکھا جو اون کا کرتہ پہنے اور تلوار، زرہ اور ایک مشکیزہ لئے ہوئے تھا اس نے حضرت کے قریب پہنچ کر کہا کہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں فرمایا کس بات پر بیعت کرو گے کہا جہاد اور پیمان امامت پر۔ پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے کہا اویس قرنی۔ حضرتؑ نے یہ نام سنا تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور فرمایا کہ میرے حبیب اور اللہ کے رسولؐ مجھے یہ خبر دے گئے تھے کہ میں ایک ایسے شخص سے ملاقات کروں گا جو اللہ کے گروہ میں شامل اور شہادت و شفاعت کے درجہ پر فائز ہو گا۔

دور آخر کے علائم و آثار کے سلسلہ میں فرمایا۔

یاتی علی الناس زمان یرتفع فیہ الفاحشتہ وتصنع و ینتھک فیہ المحارم و یعلن فیہ الزنا و یستحل فیہ اموال الیتمی ویوکل الربوا ویطفف فی المکاییل والموازین و یستحل الخمر بالنبذ و ارشھوہ بالھد یتہ والخیانتہ بالامانتہ و یتشبہ الرجال بالنساء والنساء بالرجال ویستخف بحدود الصلواہ ویحج فیہ لغیر اللہ۔ (بحارالانوار)

لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں بدکاری وسعت معاش کے لئے بطور پیشہ اختیار کی جائے گی اللہ کے حدود توڑے جائیں گے زنا کھلے بندوں ہو گا یتیموں کا مال حلال سمجھا جائے گا سود کھایا جائے گا ناپ تول میں کمی کی جائے گی شراب کو آب انگور رشوت کو ہدیہ اور خیانت کو امانت کی صورت میں حلال قرارر دیا جائے گا مرد عورتوں کی اور عورتیں مردوں کی شباہت اختیار کریں گی نماز کے حدود و شرائط کو سبک سمجھا جائے گا اور حج اللہ کے علاوہ اور مقاصد کے لئے کیا جائے گا۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جس قوم نے تقویٰ و پرہیز گاری کی شاہراہ اختیار کی' راستبازی کو اپنا شعار بنایا اور حدود الہیہ کا احترام ملحوظ رکھا وہ پھلی پھولی اور برگ و بار لائی اور جس نے معصیت و سرکشی اختیار کی وہ اس کے نتائج سوء سے بچ نہ سکی۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اسلام کے دور انحطاط کے علائم میں انہی بداعمالیوں کو سرفہرست جگہ دی ہے۔ ان علائم کی جھلک عصر حاضر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ راگ رنگ' رقص و سرود اور اس قسم کے محرمات کو تہذیب و ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ زناء و غنا' کاروبار کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ حیلے حوالوں اور غلط تاویلوں کا سہارا لے کر سند جواز مہیا کی جاتی ہے۔ رشوت ہدیہ سمجھ کر وصول کی جاتی ہے اور شراب' آب انگور' آب جو اور دوسرے ناموں سے بے جھجک استعمال کی جاتی ہے اور اس تبدیلی اسم کو وجہ جواز قرار دے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سود کو ایک طرح کا لین دین کہہ کر جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ سود اور تجارت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کاروبار میں نفع و نقصان دونوں کی گنجائش ہوتی ہے اور سود میں نقصان کا پہلو نہیں ہوتا بلکہ نفع ہی نفع ہوتا ہے جو دوسروں کی مجبوری و بے بسی سے فائدہ اٹھا کر سمیٹا جاتا ہے۔ موجودہ معاشرہ میں ناپ تول میں کمی اور امانت میں خیانت ایسی برائیاں بھی کم نہیں ہیں اور یہ بھی ہر رہ گزر پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ مرد حرکات و سکنات رفتار و گفتار اور وضع و لباس میں عورتوں کی نقالی کرتے اور عورتیں مردوں کی چال ڈھال کا چربہ اتارتی نظر آتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں وہ مرد بصورت زن ہے یا زن بصورت مرد ہے۔ رہے اسلامی فرائض تو انہیں چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ اگر ان کی اہمیت کا احساس ہوتا تو ان حدود پر بھی توجہ مرکوز ہوتی جو ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ نماز پڑھی جاتی ہے تو نہ وضو کی صحت و عدم صحت پر نظر کی

جاتی ہے، نہ جگہ کی اباحت اور جسم و لباس کی طہارت کا خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے تو نماز کا پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور حج میں سیر، سیاحت، شہرت اور تجارت ایسے مقاصد بھی شامل کر لئے جاتے ہیں۔ حالانکہ حج وہ ہے جو خالصۃً اللہ کے لئے ہو اور اس میں کوئی دنیوی مقصد کارفرما نہ ہو۔

بددعا کے فوری اثرات

انبیاء آئمہ اور خاصان خدا کی دعائیں وہ کسی کے حق میں ہوں یا خلاف، بارگاہ الٰہی میں مستجاب ہوتی ہیں اور خداوند عالم ان کے مرتبہ و مقام اور تقرب کے پیش نظر ان کی کسی دعا کو مسترد نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جس کے حق میں دعا کرتے ہیں وہ اس دعا کا سزاوار ہوتا ہے اور بددعا کرتے ہیں تو اس کے لئے جس کا رویہ معاندانہ و جارحانہ ہوتا ہے اور وہ سچ کو سچ سمجھتے ہوئے اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس ضد اور کفر کا پھر یہی علاج رہ جاتا ہے کہ اسے بددعا کا ہدف بنایا جائے۔ اوروں کی تنبیہہ و سرزنش کے لئے قدرت کی گرفت کو پکارا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام بھی انہی اولیاء اللہ اور خاصان خدا میں سے تھے جن کی کوئی دعا شرف قبولیت حاصل کئے بغیر نہ رہتی تھی اور دعا کے الفاظ منہ سے نکلتے ہی قبولیت سے ہمکنار ہو جاتے تھے۔ ابن مسعود کہتے ہیں۔

لاتتعضو الدعوہ علی فانما لا ترد۔ (مناقب) علی علیہ السلام کی بد دعا نہ لینا اس لئے کہ ان کی دعا رد نہیں ہوتی۔

استجابت دعا کے سلسلہ میں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

علی ابن زاذان کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث بیان فرمائی تو ایک دریدہ دہن نے اس کی تکذیب کی۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں تمہارے لئے بددعا کروں گا اگر میں جھوٹا ہوں گا تو بددعا کا کوئی اثر نہ ہو گا اور اگر میں سچا ہوں گا تو بددعا اثر کئے بغیر نہیں رہے گی۔ اس نے کہا کہ اگر آپؑ سچ کہتے ہیں تو بددعا کیجئے آپؑ نے بددعا کی اور اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔

جمیع ابن عمیر بیان کرتے ہیں کہ عیزار نامی ایک شخص، معاویہ کو عراق کے حالات سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ حضرتؑ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؑ نے اسے بلا کر کہا کہ میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے کہ تم شامیوں کے جاسوس ہو۔ کیا تم قسم کھا کر مجھے مطمئن کر سکتے ہو کہ تم نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ آپؑ کو میرے بارے میں غلط اطلاع دی گئی ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان کنت کاذبا فاعمی اللہ بصر ک۔ اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تمہیں نابینا کرے۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ بصارت سے محروم ہو گیا۔

ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام نے بھرے مجمع میں فرمایا کہ تم میں کون ہے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و دعا من عاداہ۔ جس کا میں مولا ہوں اس کے علی علیہ السلام بھی مولا ہیں اے اللہ جو علی علیہ السلام کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو انہیں دشمن رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ۔

کچھ لوگوں نے اس حدیث کی صحت کی گواہی دی مگر انس ابن مالک چپ رہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اے انس تم بھی تو غدیر کے موقع پر موجود تھے۔ کیا تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سنے کہا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں میرا حافظہ کام نہیں کرتا۔ حضرتؑ نے یہ سنا تو فرمایا۔

ان کنت کاذ با فضربک اللہ ببیضاء لا معتہ لا تواریھا انعمامتہ۔ (المعارف) اگر تم جھوٹ کہتے ہو تو خدا تمہیں ایسے برص میں مبتلا کرے جسے عمامہ بھی نہ چھپا سکے۔

چنانچہ وہ برص میں مبتلا ہو گئے جس کے بعد وہ اپنا چہرہ ہمیشہ ڈھانپے رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ حسن بصری ایک جدون کے کنارے وضو کر رہا تھا کہ ادھر سے امیرالمومنین علیہ السلام کا گزر ہوا آپؑ نے اسے وضو کرتے دیکھا تو فرمایا اعضاء وضو کو اس طرح دھوؤ کہ کوئی جزو خشک نہ رہ جائے اس نے کہا کہ کبھی تو آپؑ نے ان لوگوں کو تہ تیغ کر دیا جو پوری طرح وضو کرتے تھے فرمایا کیا تم ان کے قتل پر رنجیدہ و غمگین ہو کہا ہاں فرمایا۔

فاطال اللہ حزنک۔ (بحارالانوار) تو اللہ تمہیں ہمیشہ غمگین رکھے۔

ایوب بجستانی کہتے ہیں کہ میں نے جب بھی اسے دیکھا اسے افسردہ و غمگین پایا۔ گویا اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے پلٹا ہے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا۔

عمل فی دعوہ الرجل الصالح۔ (بحارالانوار) یہ ایک مرد صالح کی بددعا کا نتیجہ ہے۔

جب بسر ابن ابی ارطاۃ نے عبید اللہ ابن عباس کے دو کمسن بچوں کو ان کی ماں ام الحکم جویریہ کے سامنے ذبح

کر دیا تو حضرتؑ نے بددعا کرتے ہوئے فرمایا۔

اللھم اسلبہ دینہ و عقلہ　　　　خدایا بسر سے دین اور عقل سلب کر لے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کا دین بھی جاتا رہا اور عقل بھی جاتی رہی اور آخر عمر میں اس کی دیوانگی کی یہ کیفیت تھی کہ لوگوں نے لکڑی کی ایک تلوار اسے دے دی جسے وہ مشک پر جس میں ہوا بھری ہوئی تھی دن بھر چلاتا اور یوں اپنے جذبہ خون آشامی کو تسکین دیتا یہاں تک کہ موت نے اسے جکڑ لیا۔

حضرتؑ کوفہ میں بنی مراد کے ایک زیر تعمیر مکان کی طرف سے گزر رہے تھے کہ اس مکان پر سے اینٹ کا ایک ٹکڑا گرا جس نے آپؑ کے سر کو زخمی کر دیا آپؑ نے فرمایا۔

مابومی من مراد تو احد اللھم لاترفعھا۔　　　　مجھے بنی مراد سے ایک نہیں بہت سے دنوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اے خدا اسے بلند نہ ہونے دینا۔

لوگوں کا بیان ہے کہ خدا کی قسم ہم جب بھی اس مکان کی طرف سے گزرے تو دوسروں کے مکانوں کے پہلو میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے سینگ والے بکروں کے درمیان ایک بے سینگ کی بکری ہو۔

علم کلام

علم کلام وہ علم ہے جس میں اسلامی عقائد کی صحت کا عقلی دلائل سے اثبات اور زنادقہ' ملاحدہ اور فرق باطلہ کے نظریات کا ابطال کیا جاتا ہے۔ اسلامی عقائد کی بنیاد عقل پر استوار ہے اور کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہے جس کی تائید عقل سے نہ ہوتی ہو۔ اس لئے اسلام نے کورانہ تقلید کے بجائے دلیل و برہان کی روشنی میں جانچ پرکھ کر رائے قائم کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ عقل کی رہنمائی سے صحیح نظریات تک پہنچا جا سکے۔ انہی نظریات و عقائد کا فکری و عقلی جائزہ لینے اور دلیل و برہان سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے علم کلام کی تدوین کی گئی اور علماء و متکلمین نے عقائد کے سلسلہ میں تفصیلی مباحث ترتیب دئے اور مخالفین کے شبہات کا دلائل سے رد کیا۔ مگر متقدمین میں ایک گروہ کو اپنے خود ساختہ نظریات' معیار عقلی پر پورے اترتے نظر نہ آئے تو اس نے فکر و نظر اور عقلی استدلال کو خطرناک سمجھتے ہوئے اس علم کی بھرپور مخالفت کی۔ چنانچہ امام شافعی' امام مالک احمد ابن حنبل' سفیان ثوری اور محدثین نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور حکماء و متکلمین کو ملحد و زندیق کے ناموں سے یاد کیا اور علمی سوال و جواب کو بدعت قرار دیتے ہوئے قابل تعزیر جرم ٹھہرایا۔ حضرت عمر بھی عقائد کو عقل کے معیار پر پرکھنے کے خلاف تھے اور علمی و عقلی مسئلہ پوچھنے پر سزا سے بھی درگزر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ امام غزالی نے تحریر کیا ہے۔

وھوالذی سد باب الکلام و لجدل و ضرب ضبیعا بلدرہ لما اورد علیہ سوالا فی تعارض آیتین من کتاب اللہ وحجزہ وامر الناس بھجرہ۔ (احیاء العلوم ج ا ص ۲۱)

حضرت عمرؓ نے علم کلام وجدل کا دروازہ بند کیا اور ضبیح تمیمی نے جب دو آیتوں کے باہمی اختلاف کے بارے میں ان سے سوال کیا تو انہوں نے اسے درہ سے مارااور اس سے قطع تعلق کر لیا اور دوسروں کو بھی اس سے قطع مراسم کا حکم دیا۔

اس مخالفت اور انتہائی مخالفت کے باوجود یہ علم برگ و بار لایا اور اس کی استدلالی قوت کے سامنے ارباب ظاہر کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور آج اسلامی مکاتب فکر میں سے کوئی بھی اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کرتا عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے معتزلہ نے عقلی استدلال کا دروازہ کھولا اور مذہب و عقل میں تطبیق پیدا کر کے علم کلام کی بنیاد رکھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس علم کا سرچشمہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے مختلف ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی صداقت و برتری کا اثبات دلائل و براہین سے فرمایا اور وہ دلائل عقلی معیار اور منطقی طرز استدلال پر پورے اترتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آئمہ اہل بیت نے اسی سرچشمہ نبوت سے سیراب ہو کر اس علم کی آبیاری کی خصوصاً" امیرالمومنین علیہ السلام نے اس کے نشر و ارتقاء میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسلامی نظریات و عقائد کو عقل کی روشنی میں پیش کیا۔ چنانچہ توحید، عینیت، صفات، رسالت، معاد، قضا و قدر اور جبر و اختیار کے سلسلہ میں آپ کے خطبات اور یہود و نصاریٰ اور زنادقہ کے مقابلہ میں آپ کے احتجاجات اس کا روشن ثبوت ہیں۔ علماء متکلمین نے آپؑ ہی کے کلمات سے طریق استدلال کے رموز سیکھے اور آپؑ ہی کے افادات کی بنیادوں پر علم کلام کی عمارت کھڑی کی۔ امام رازی تحریر کرتے ہیں۔

قد جاء فی خطب امیرالموسنین علی ابن ابی طالب من اسرار التوحید والعدل والنبوہ والقضاء والقدر دحوال المعاد مالم یات فی کلام سائرالصحابہ و ایضاً فجمیع فرق المتکلمین ینتھی اخر نسبتھم فی ھذا العلم الیہ۔ (اربعین ص ۴۶۷)

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے خطبات میں توحید، عدل، نبوت اور قضاء و قدر کے اسرار اور معاد کے حالات اتنے بیان ہوئے ہیں کہ تمام صحابہ کے مجموعی کلام میں بھی نظر نہیں آتے۔ اس علم میں متکلمین کے تمام گروہوں کا آخری نقطہ انتساب آپ ہی پر منتہی ہوتا ہے۔

مصری مؤرخ عقاد اس علم میں حضرت کی اقدمیت کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

عنه اخذ الحکماء الذین شرعوا علم الکلام قبل ان یتطرق الیهم علم فارس او علم یونان۔ (العبقریات الاسلامیہ ص ۸۵۶)

وہ حکماء جنہوں نے علم کلام کا آغاز کیا انہوں نے یہ علم حضرتؑ ہی سے حاصل کیا قبل اس کے کہ فارس یا یونان کا علم ان تک پہنچے۔

لہٰذا اس میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس علم کے بانی امیرالمومنین علیہ السلام تھے آپؑ ہی نے اس کی داغ بیل رکھی اور آپؑ ہی نے اسے نقطہ عروج پر پہنچایا۔ علامہ محسن الامین نے تحریر کیا ہے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام مقتدی الشیعہ و امامھم و اول من سن مایسمی علم الکلام والاحتجاج فی الاسلام۔ (اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۲۴)

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام جو شیعوں کے مقتداؤ امام ہیں اور وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے اس علم کی داغ بیل ڈالی جو علم کلام و احتجاج کے نام سے موسوم ہے۔

علم مناظرہ و احتجاج

علم مناظرہ وہ علم ہے جس میں اثبات مدعا اور طریق استدلال یا ابطال دعوی اور رد استدلال کے اصول و آداب سے بحث کی جاتی ہے۔ مناظرہ اگر حدود مناظرہ میں رہ کر کیا جائے تو اس پر نتیجہ خیز اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اور باہمی سوال و جواب اور جواب الجواب سے صحیح اور غلط نظریہ کا امتیاز ہو جاتا ہے اور مناظرہ کا مقصد بھی یہی امتیاز حق و باطل ہے۔ لہٰذا ہر فریق کے لئے ضروری ہے کہ آداب مناظرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقیقت طلبی کے جذبہ کے ساتھ گفتگو کرے' فریق مخالف کی بات ضبط و سکون اور فراخ حوصلگی سے سنے' سخت اور درشت لہجے میں جواب دینے کے بجائے متانت و سنجیدگی کے انداز میں جواب دے' خارج از موضوع کوئی بات نہ چھیڑے' اوچھے ہتھیاروں پر اترنے اور ذاتیات پر حملہ آور ہونے سے اجتناب برتے اور دوسرے فریق کو معقول دلائل سے قائل کرنے اور اسی کے مسلمات سے مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ اگر دلائل اور فریق ثانی کے مسلمات کو نظرانداز کر کے سخن پروری و کج بحثی سے کام لے گا اور وقتی ہار جیت ہی کو پیش نظر رکھے گا تو وہ مناظرہ نہ ہو گا مکابرہ ہو گا جس کا مقصد صرف مد مقابل کو الجھاوؤں میں ڈال کر نیچا دکھانا اور اپنی ہمہ دانی و چرب زبانی کا سکہ بٹھانا ہوتا ہے جو کسی طرح ممدوح و قابل ستائش نہیں ہے اور نہ ہی کوئی غیر جانبدار و معاملہ فہم انسان اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں آداب مناظرہ کی رہنمائی کے سلسلہ میں ارشاد ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمتہ و الموعظتہ الحسنتہ وجادلھم بالتی ھی احسن۔

تم لوگوں کو حکمت و پسندیدہ موعظت کے ذریعہ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلاؤ اور بحث و مباحثہ کرو تو عمدہ اور شائستہ طریقہ سے۔

دنیائے اسلام میں سب سے پہلے امیرالمومنین علیہ السلام نے مخالفین و مبتدعین سے بحث و مباحث کی طرح ڈالی۔ ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا اور اسلام کی صداقت کے نقوش ان کے ذہن نشین کئے۔ چنانچہ امام غزالی تحریر کرتے ہیں۔

واول من سن دعوہ المبتدعہ بالمجادلہ الی الحق علی ابن ابی طالب۔ (احیاء العلوم ج ۱ ص ۸۵)

جس نے سب سے پہلے فرق ضالہ کو بحث و مباحثہ کے ذریعہ حق کی دعوت دی وہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے۔

علامہ مجلسی نے تحریر کیا ہے۔

وان اول من سن دعوہ المبتدعہ بالمجادلہ الی الحق علی وقد ناظرہ الملاحدۃ فی مناقضات القرآن و اجاب مشکلات مسائل الجاثلیق حتی اسلم۔ (بحارالانوار ج ۶ ص ۴۶۳)

جس نے سب سے پہلے بحث و جدل کے ذریعہ مذاہب باطلہ کو حق کی دعوت دی وہ حضرت علی علیہ السلام تھے چنانچہ ملحدوں نے قرآنی اختلافات کے بارے میں ان سے مناظرے کئے اور جاثلیق کے مشکل سوالات کے جوابات دئے جس کے نتیجہ میں وہ اسلام لے آیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام جب بھی کسی سے مناظرانہ رنگ میں گفتگو کرتے تو اسے دلائل کے زور سے خاموش کر دیتے اور جواب الجواب کی نوبت نہ آنے دیتے۔ چنانچہ خوارج کے مختلف نمائندوں اور یہود و نصاریٰ کے عالموں سے جو مختلف مواقع پر مباحثے کئے یا معترضین کو جواب دئے وہ ان کے لئے قفل دہن ثابت ہوئے۔ علامہ مجلسی نے کتاب ابو بکر ابن مردویہ کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ۔

ماحاج علی احدالا حجہ۔ (بحارالانوار ج ۹ ص ۴۶۳)

حضرت علی علیہ السلام نے کسی سے استدلالی گفتگو نہیں کی مگر یہ کہ اسے لاجواب کر دیا۔

ذیل میں حضرت کی چند احتجاجی گفتگوئیں تحریر کی جاتی ہیں۔

ایک مسیحی سے الوہیت مسیح کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

لولا تمرد عیسیٰ عن عبادہ اللہ لصرت علی دینہ۔ (عیون الاخبار)

اگر عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی عبادت سے گریز نہ کرتے تو میں ان کا دین اختیار کر لیتا۔

اس مسیحی نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف عبادت سے گریز کی نسبت صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ وہ ہمہ وقت عبادت میں منہمک رہتے تھے۔ فرمایا اگر تمہارے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا تھے تو وہ عبادت کس کی کرتے تھے جبکہ عبادت کرنا بندے کے شایان شان ہے نہ خدا کے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نہروان سے واپس پلٹ کر کوفہ تشریف لائے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ آپؑ نے جس طرح طلحہ، زبیر اور معاویہ سے جنگ کی اسی طرح ابوبکر و عمر سے جنگ کیوں نہ کی۔ فرمایا۔

لصراز لی مظلوما مستاثر اعلی حقی۔ (احتجاج طبری ص ۱۰۱)

میں ہمیشہ مظلوم رہا اور میرے حق پر دوسروں کو ترجیح دی جاتی رہی۔

اس پر اشعث ابن قیس نے کہا تو پھر اس کا واحد حل یہ تھا کہ آپؑ تلوار اٹھاتے اور اپنے حق کا مطالبہ کرتے۔ فرمایا اے اشعث اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو اس کا جواب بھی سن لو۔ میں اس خاموشی کے سلسلہ میں چھ نبیوں کے طریق کار پر عمل پیرا رہا ان میں ایک حضرت نوح علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں ارشاد قرآنی ہے۔

ثدعا ربہ انی مغلوب فانتصر۔

نوح نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی کہ میں ان لوگوں کے مقابلہ میں کمزور ہوں لہٰذا تو ہی ان سے بدلہ لے۔

دوسرے حضرت لوط علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

لوان لی بکم قوۃ او اوی الی رکن شدید۔

کاش تمہارے مقابلہ کی مجھ میں طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعہ میں سر چھپا سکتا۔

تیسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ۔

میں تم سے اور ان بتوں سے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو الگ ہو جاؤں گا۔

چوتھے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

ففررت منکم لما خفتکم۔ میں جب تم لوگوں سے ڈرا تو بھاگ کھڑا ہوا۔

پانچویں حضرت ہارون علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

یابن ام ان القوم استضعفونی و کادوا یقتلوننی۔ اسے میرے ماں جائے قوم نے مجھے کمزور و ناتواں پایا اور بعید نہ تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔

چھٹے خیرالبشر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ ہیں جنہوں نے قریش سے خطرہ محسوس کیا تو آمادہ ہجرت ہوئے اور مکہ سے نکل کر غار ثور میں پناہ لی اور مجھے اپنے بستر پر سونے کا حکم دے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان انبیاء کرام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کوئی ڈر خوف نہ تھا تو یہ صریحاً غلط اور قرآنی آیات کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب ظاہری اسباب اور تاب مقاومت نہ ہونے کی صورت میں انبیاء تک مقابلہ سے اجتناب کرتے رہے تو یارو مددگار نہ ہونے کی صورت میں وصی پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی معذور سمجھنا چاہیئے۔

حضرت ابوبکر مہاجرین و انصار کے حلقہ میں بیٹھے ہوہئے تھے کہ امیرالمومنین علیہ السلام تشریف لائے اور ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے دختر رسول فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک دینے سے کیوں انکار کیا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی زندگی میں انہیں ہبہ فرما چکے تھے ابوبکر نے کہا کہ فدک عامۂ مسلمین کا مال ہے اگر فاطمہ سلام اللہ علیہا گواہ پیش کریں تو ان کا حق تسلیم کر لیا جائے گا۔ ورنہ یہ مسلمانوں ہی کا مال قرار پائے گا اور حکومت وقت کی تحویل میں رہے گا فرمایا کہ اگر کوئی چیز مسلمانوں کے قبضہ میں ہو اور میں یہ دعویٰ کروں کہ یہ میری ملکیت خاصہ ہے تو تم گواہوں کا مطالبہ کس سے کرو گے کہا آپؑ سے فرمایا کہ پھر تم فاطمہ علیہا السلام سے کس بنا پر گواہوں کا مطالبہ کر سکتے ہو جبکہ فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ حیات سے ان کے قبضہ میں چلا آرہا ہے۔ پھر یہ بتاؤ کہ اگر چند افراد فاطمہ علیہا السلام کے بارے میں کسی ایسے امر کے ارتکاب کی گواہی دیں جس پر حد شرعی عائد ہوتی ہو تو تم کیا قدم اٹھاؤ گے کہا کہ میں حد شرعی جاری کروں گا فرمایا کہ اگر تم نے ایسا ارادہ کیا تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے کہا کس طرح فرمایا کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیت پڑھی ہے۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا۔ اے اہل بیت علیہ السلام اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ تم سے ہر پلیدی کو دور رکھے اور تمہیں ایسا پاک و پاکیزہ کر دے جیسا پاک و پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔

کہا ہاں پڑھی ہے فرمایا کیا فاطمہ علیہا السلام بھی اہل بیت علیہ السلام میں شامل ہیں کہا ہاں شامل ہیں فرمایا کہ

پھر ان پر حد جاری کرنے کے معنی یہ ہوں گی کہ اللہ نے ان کی طہارت و پاکیزگی کی جو گواہی دی ہے تم نے اسے رد کر دیا اور اللہ کے مقابلہ میں چند جہلا کی گواہی قبول کرلی۔ یاد رکھو کہ تم نے فدک کے بارے میں اللہ کی گواہی کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی نظرانداز کر دیا کہ۔

البینتہ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ۔ بینہ و گواہی مدعی کے ذمہ ہے اور مدعا علیہ پر قسم عائد ہوتی ہے۔

علم الادب

زبان و بیان کی تمام خوبیوں کے ساتھ خیالات و افکار کی ترجمانی کا نام ادب ہے۔ ادب صرف معنی آفرینی و فکر پیمائی ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے اسلوب بیان کی شگفتگی، طرز ادا کی دلاویزی اور لفظوں کے دروبست کی حسن آفرینی بھی ضروری ہے۔ اگرچہ الفاظ سے مقصود معنی ہی ہوتے ہیں مگر معانی براہ راست دوسروں کے ذہن میں منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ ان کے لئے الفاظ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے کیونکہ معانی و مطالب کے ابلاغ کا یہی ایک ذریعہ ہیں ان کے بغیر نہ معانی کی منتقلی عمل میں آسکتی ہے اور نہ افہام و تفہیم کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر الفاظ بھونڈے، ترتیب کنجلک اور اسلوب الجھا ہوا ہو گا تو معنی دھندلے اور اثر کمزور پڑ جائے گا۔ اس کے برعکس اگر الفاظ شستہ، لسانی قواعد کے مطابق اور موقع و محل کے اعتبار سے مناسب ہوں گے تو معنی واضح اور کلام پر اثر ہو گا اور ادب کا مقصد ہی یہ ہے کہ اپنی بات کو دلنشین لفظوں کے قالب میں ڈھال کر دوسروں کے ذہن میں اتارا جائے اور الفاظ کے حسن و اثر آخر ہی سے ایک سحر آگہی فضا پیدا کر کے احساس و شعور کو متاثر کیا جائے۔

یہ علم اپنی افادیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے فکر و نظر اور علم و فن کی زندگی و بقا وابستہ ہے چنانچہ گزشتہ اقوام و ملل کے تہذیبی اور اخلاقی اور سیاسی معاشرتی حالات کا اندازہ ان کے علمی و ادبی ذخائر ہی سے ہوتا ہے اور ہر قوم کا ادب اس کی اخلاقی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی تصویر اور اس کے عادات اور تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے۔ ادب سے جہاں مختلف قوموں کی تمدنی و معاشرتی تہذیبوں کا پتا چلتا ہے وہاں لفظ کو معنی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے احساسات کو عملی جامہ پہنانے اور انہیں پر اثر بنانے کا ملکہ بھی حاصل ہوتا ہے اور اس طرح زبان، نکھر، سنور کر ارتقائی منازل طے کرتی اور فروغ پاتی ہے۔ یوں تو ہر زبان میں ادب کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں مگر عربی زبان اپنی لطافت شیرینی اور متوازن الفاظ کے اعتبار سے ادبی تخلیق کے لئے نہایت موزوں واقع ہوئی ہے اسی لئے ہر دور میں اس کا دامن نظم و نثر کے ادب پاروں سے مالا مال رہا ہے اور کوئی زبان ادبی لطافتوں اور بلاغت آفرینیوں میں اس کے مقابلہ پر نہ آسکی۔

عربی ادب کے ارتقاء اور اسے اوج و عروج کے بام بلند تک پہنچانے میں امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات و نگارشات کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے۔ آپؑ نے زبان کو نئے اسلوب و آہنگ دیئے۔ اظہار بیان کا نیا سلیقہ بخشا، فصاحت و بلاغت کی راہیں کھولیں، زبان کے اصول و قواعد تعلیم کئے اور ادب کے ہر شعبہ میں ایسے درخشاں نقوش چھوڑ گئے جنہیں راہروان وادی ادب نے علمی دستاویز و ادبی سند قرار دے کر مشعل راہ بنایا۔

ادب کے ذیل میں صرف و نحو، لغت، عروض و قوافی، قرأت و کتابت نظم و نثر اور معانی بیان اور بدیع سے بحث کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر شعبہ مستقل علم کا درجہ رکھتا ہے لہٰذا ہر شعبہ کو الگ الگ عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔

علم صرف و نحو

عربی زبان میں لفظ کی ہیئت و حرکت کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جس علم کے ذریعہ لفظ کی ہیئت کا علم حاصل ہوتا ہے اسے علم صرف اور جس علم کے ذریعہ حرکات (زیر، زبر، پیش) کا علم حاصل ہوتا ہے اسے علم نحو کہا جاتا ہے۔ انہی حرکات کے ذریعہ مختلف معانی میں امتیاز اور معنی مقصود کی تعیین ہوتی ہے۔ اگر حرکت اعراب میں غلطی واقع ہو گی تو معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے مثلاً **ما احسن زیداً** کو اگر **ما احسن زیدٌ** پڑھا جائے تو معنی بدل جائیں گے اس لئے کہ پہلے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ زید کتنا اچھا ہے اور دوسرے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ زید نے کوئی اچھائی نہیں کی۔ عرب اہل زبان تھے انہیں اعرابی صحت کے لئے قواعد و ضوابط کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ خود ان کی بول چال سے ضوابط کا استخراج کیا جاتا تھا مگر موالی و معربین اعرابی غلطیوں کا شکار ہو جاتے تھے، جو اہل زبان کی قوت سماعت پر گراں گزرتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے اعرابی غلطی کی تو آپؐ نے فرمایا۔

ارشدوا اخاکم فقد ضل۔ (المزہر ج ۲ ص ۳۹۶) اپنے بھائی کی غلطی کی اصلاح کرو یہ بھٹک گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد جب فتوحات کا دور آیا تو عربوں اور عجمیوں کے آپس کے میل جول بڑھے۔ اس میل ملت اور باہمی بات چیت کے نتیجہ میں زبان کا متاثر ہونا بھی طبعی امر تھا۔ چنانچہ بول چال میں اعرابی غلطیاں ہونے لگیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام کو اس کا احساس ہوا کہ اگر زبان کی حفاظت کا ساماں نہ کیا گیا تو عجمی اثرات سے اس صورت بگڑ جائے گی۔ لہٰذا اس کے گرداگرد قواعد کی ایک محکم باڑ باندھ دینا چاہیئے تاکہ اس کی صحت برقرار رہے۔ چنانچہ آپؑ نے لسانی قواعد کے اصول وضع کئے اور ابوالاسود دئلی کو ان کی ترتیب و تدوین پر مامور کیا۔

ابوالاسود بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپؑ سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں گویا کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام آپ کس فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں فرمایا کہ عجمیوں کے آنے جانے اور ان کے اختلاط سے ایسے کلمات سننے میں آتے ہیں جو اعرابی اعتبار سے غلط اور استعمالات عرب کے خلاف ہوتے ہیں۔ اگر تصحیح زبان کی طرف توجہ نہ کی گئی تو لفظ و معنی کی سمتیں بدل جائیں گی اور کوئی بات صحیح طور پر سمجھی نہ جا سکے گی۔ اس لئے میں نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ عربی زبان کے قواعد منضبط کر دوں تاکہ صحیح و غلط میں امتیاز ہو سکے اور کلام میں غلطی واقع ہونے نہ پائے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ ایسا کر جائیں گے تو عربی زبان ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جائے گی ورنہ غلط استعمالات کے نشر و شیوع سے زبان کے خط و خال مسخ ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ قرآن و حدیث کی زبان سے دوری ہو جائے گی۔ ابوالاسود کہتے ہیں کہ تین دن کے بعد میں پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھایا جس پر تحریر تھا۔

الکلام کلہ اسم و فعل و حرف الاسم ما انباء عن المسمی و الفعل ما انباء عن حرکتہ المسمی والحرف ما انباء عن معنی لیس باسم ولا فعل۔

کلام کی تین قسمیں ہیں اسم، فعل اور حرف، اسم وہ ہے جو کسی مسمیٰ کا پتا دے اور فعل وہ ہے جو مسمیٰ کے عمل و حرکت کا پتا دے اور حرف وہ ہے جس میں نہ اسم کے معنی ہوں اور نہ فعل کے۔

پھر آپؑ نے فرمایا۔

واعلم یا ابا الاسود ان الاشیاء ثلثہ ظاہر و مضمر و شئی لیس بظاہر ولا مضمر۔ (معجم الادباء ج ۱۳ ص ۴۹)

اے ابوالاسود تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اشیاء کی تین قسمیں ہیں ظاہر، مضمر اور وہ جو نہ ظاہر نہ مضمر (جیسے اسم اشارہ)۔

اس کے بعد آپؑ نے معرفہ و نکرہ، وجوہ اعراب، رفع نصب جر اور چند دوسرے اصول بیان فرمائے اور فرمایا **انح ھذا النحوہ** "تم یہ طریقہ اختیار کرو" حضرت کے اس قول سے ان قواعد کا نام نحو قرار پا گیا۔ ابوالاسود کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کی ہدایت جانب کے مطابق کچھ قواعد مرتب کر کے اصلاح کے لئے آپؑ کی خدمت میں پیش کئے اور جب حروف ناصبہ **ان، انہ لیت لعل اور کان** گنوائے تو آپؑ نے فرمایا کہ **لکن** کو تو چھوڑ گئے میں نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ لکن حروف ناصبہ میں سے نہیں ہے فرمایا ایسا نہیں ہے یہ بھی ان میں داخل ہے چنانچہ میں نے اسے بھی بڑھا دیا۔

ابوالاسود نے اس سلسلہ میں جو کچھ سیکھا امیرالمومنین علیہ السلام ہی سے سیکھا۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

کان ابوالاسود اخذ ذلک عن امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ۔ (الزہرج ۲ ص ۳۹۷)

ابولاسود نے علم نحو امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا۔

ابوالاسود سے ان کے فرزند عطاء ابن ابی الاسود۔ یحیٰ ابن یعمر میمون الاقرن اور عنبسہ ابن عبدان نے یہ فن سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اس کے بعد خلیل ابن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ اور ان کے شاگرد اخفش مجاشعی متوفی ۲۱۵ھ نے اس کے قواعد منضبط کے اور اس کئے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ بیشک ان لوگوں کی محنت و عرق ریزی سے یہ علم پایۂ تکمیل تک پہنچا مگر ایک علم کو تشریحات و توضیحات سے تکمیل تک پہنچانا اور ہے اور اس کی ایجاد اور بنیاد رکھنا اور ہے۔ علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

حصتہ الامام من علم النحو عظیمہ لان الابتدء بھا اصعب من تحصیل المجلد ات الفخام التی دونھا النحاہ بعد تقدم العلم و تکثرالناظرین فیہ۔ (عبقریتہ الامام ص ۱۸۶)

علم نحو میں حضرت علی علیہ السلام کا بہت بڑا حصہ ہے اس لئے کہ اس کی ایجاد و تاسیس اس سے کہیں زیادہ مشکل تھی کہ نحو کی ضخیم کتابیں تصنیف کر دی جائیں جبکہ نحویوں کی تدوین سے پہلے یہ علم ایجاد ہو چکا تھا اور اس پر بحث و نظر کرنے والوں کی بھی کثرت تھی۔

یہ واضح رہے کہ علم صرف، علم نحو ہی کا ایک شعبہ ہے اور دونوں کا موضوع کلمہ و کلام ہے فرق یہ ہے کہ اگر صحت و اعتدال کے لحاظ سے بحث کی جائے تو علم صرف ہے اور ترکیب و اعراب کے اعتبار سے بحث کی جائے تو علم نحو ہے۔ اس لئے یہ دونوں علم علوم عربیہ کے ذیل میں یکجا بیان کئے جاتے رہے ہیں۔ ابوعثمان مازنی متوفی ۲۴۹ھ نے اسے نحو سے الگ کیا اور پھر مستقلا" علم صرف پر کتابیں تحریر کی جانے لگیں۔ بہرحال علم صرف کی تاسیس علم نحو کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ لہٰذا جو علم نحو کا موجد ہو گا وہی علم صرف کا موجد قرار پائے گا اور علم نحو کے ایجاد کا سہرا بلا شبہہ حضرتؑ کے سر ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے عبدالرحمن ابن ہرمزاعرج اور کچھ لوگوں نے نصرابن عاصم کو نحو کا موجد قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں نے نحو کے ابتدائی اصول ابوالاسود سے سیکھے اور ابوالاسود اس فن میں امیرالمومنین علیہ السلام کے شاگرد تھے۔

علم اللغت

علم اللغت کے معنی زبان دانی کے ہیں۔ زبان دانی کے لئے اصلی اور دخیل مترادف اور متباین، مشترک اور متشابہہ الفاظ اور ان کی ہیئت و ساخت کا جاننا ضروری ہے تاکہ تلفظ، محل استعمال اور حقیقی و مجازی معنی کی تشخیص میں غلطی نہ ہونے پائے۔ ہر زبان میں حسب ضرورت الفاظ کا سرمایہ پایا جاتا ہے۔ ابتداء میں ضروریات محدود ہوتی ہیں

اس لئے الفاظ کا ذخیرہ میں محدود ہوتا ہے اور جوں جوں ضروریات بڑھتی جاتی ہیں الفاظ کا دائرہ بھی پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح کہ یا تو نئی اشیاء اور جدید معانی کے لئے نئے الفاظ وضع کئے جاتے ہیں یا دوسری زبان کی لفظوں کو اپنے لب و لہجہ کے سانچے میں ڈھال کر اپنی زبان کے حدود میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ عربی زبان بھی تعمیر و ساخت اور شکست و ریخت کے انہی مرحلوں سے گزر کر اور ریگزار عرب کے وسیع دامنوں میں پل کر پروان چڑھی اور متمدن زبانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عربی زبان ارتقاء کی راہ پر اس وقت گامزن ہوئی۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے مکہ میں طرح اقامت ڈالی اور قحطان کی ایک شاخ بنی جرہم میں رشتہ ازدواج قائم کیا۔ اس طرح دو خاندانوں کے اختلاط اور عربی و عبرانی کی آمیزش سے زبان میں توسیع ہوئی اور الفاظ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ اس وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں چھیالیس ہزار چار سو متروک الفاظ کے علاوہ چھ کروڑ پانچ لاکھ بیس ہزار الفاظ مستعمل ہیں۔ حالانکہ کسی معیاری زبان کا سرمایہ الفاظ ساڑھے چار لاکھ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ عربی زبان میں ایک ایک شے کے لئے اس کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کے پیش نظر متعدد الفاظ وضع کئے جاتے رہے ہیں مثلاً" شیر کے لئے پانچ سو' سانپ کے لئے دو سو اور کتے کے لئے ستر الفاظ مستعمل ہیں۔ ایک مرتبہ عرب کا مشہور شاعر ابوالعلاء معری' علم الہدیٰ سید مرتضیٰ کے ہاں حاضر ہوا۔ جب دروازہ پر تو پہنچا تو کسی چیز سے ٹھوکر کھائی ایک شخص کی زبان سے نکلا **من ھذا الکلب** یہ کتا کون ہے ابوالعلاء نے کہا کہ کتا وہ ہے جو کتے کے ستر اسماء سے ناواقف ہو۔ سید مرتضیٰ نے یہ سنا تو اسے بلایا اور جب اس سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ زبان عرب پر عبور تام رکھتا ہے۔ غرض دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان عربی زبان کی وسعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ کوئی ایسی لغت تدوین کی جا سکی ہے جو تمام الفاظ' امثال اور محاورات عرب پر حاوی ہو اگرچہ خلیل ابن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ نے کتاب العین' ابوبکر ابن درید متوفی ۳۲۱ھ نے جمہرہ' ابوالحسن احمد ابن فارس متوفی ۳۹۰ھ نے مجمل' ابونصر اسمٰعیل جوہری متوفی ۳۹۸ھ نے صحاح' ابو غالب تمام ابن غالب قرطبی متوفی ۴۳۶ھ نے تلقیح العین' ابن سیدہ اندلسی متوفی ۴۵۸ھ نے المحکم' ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ نے لسان العرب' مجدالدین فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ نے قاموس اور دوسرے لغویین نے بے شمار کتابیں لغت میں ترتیب دیں اور جب تک تدوین و تالیف کا سلسلہ جاری ہے مگر کسی کتاب کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تمام الفاظ عرب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام زبان عرب پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ آپؑ کے خطب' خضو و فرامین اور کلمات حکمیہ میں لفظوں کا اتنا وافر سرمایہ ہے کہ اس دور کے ادباء و فصحاء کا مجموعی کلام بھی اتنے الفاظ پر محیط نہیں ہے۔ آپؑ تحریر و تقریر میں الفاظ پر الفاظ لاتے۔ الفاظ کی مرصع تصویر کھینچتے' حرف و صوت میں حقائق و معارف سموتے' کلام میں تفنن و بوقلمونی پیدا کرتے اور کسی موقع پر ثقیل اور نامانوس الفاظ کا سہارا نہ لیتے بلکہ ہر لفظ نکھری سنوری اور فصاحت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی۔ استاد محی الدین محشی' نہج البلاغہ تحریر کرتے ہیں۔ **املکھم لغتہ یدیر ھا کیف یشاء** "وہ لغت عرب پر سب سے زیادہ اقتدار رکھتے تھے اور جس صورت سے چاہتے اسے گردش دیتے

تھے" آپؐ جس لفظ کا جس طرح تلفظ کرتے وہ اس کی صحت کی سند قرار پا جاتا۔ چنانچہ نضر ابن شمیل بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ مامون رشید عباسی کے ہاں گیا۔ مامون نے بر سبیل تذکرہ یہ حدیث بیان کی۔

حدثنا هشیم عن الشعبی عن ابن عباس قال رسول الله اذا تزوج الرجل اعراۃ لدینها و جمالها کان فیها سداد من عوز۔ (المزہر)

ہم سے ہشیم نے اس نے شعبی سے اور شعبی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے اس کے دین اور جمال کی وجہ سے عقد کرے وہ اسے تنگدستی و احتیاج سے بچا لے جائے گی۔

مامون نے لفظ سداد بفتح سین پڑھی۔ نضر نے کہا کہ ہمیں یہ حدیث امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سلسلہ روایت سے پہنچی ہے اور آپ نے سداد بکسر سین فرمایا تھا اور اس مقام پر سداد ہی صحیح ہے مامون نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے غلط پڑھا ہے کہا کہ یہ آپ کی غلطی نہیں ہے بلکہ ہشیم کی غلطی ہے اور آپ نے تو جیسا سنا ویسا بیان کیا مامون نے کہا کہ سَداد اور سِداد میں کیا فرق ہے کہا کہ سَداد کے معنی صحت و درستی کے ہیں اور سِداد کے معنی کسی نقصان کی تلافی یا کسی شے کے تدارک کے ہیں۔ کہا کہ کلام عرب میں اس کا کوئی شاہد ہے کہا ہاں اور عبداللہ ابن عمرو عرجی کا یہ شعر پڑھا۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا۔
لیوم کریھتہ وسداد شغر۔

انہوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا جنگ کے دن اور سرحدوں کی حفاظت کے موقع پر انہیں احساس ہو گا کہ انہوں نے کیسے جوان کو کھویا ہے"

عربی زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح جذب و قبول کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ چنانچہ اس میں فارسی، رومی، نبطی، حبشی، قبطی، عبرانی اور سریانی زبانوں کے الفاظ بھی سموئے ہوئے ہیں جیسے سندس، قسطاس زنجبیل وغیرہ یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ مزاج و ساخت کے اعتبار سے عربی لفظوں میں گھل مل گئے ہیں۔ حضرتؑ نے بھی توسیع زبان کے لئے غیر عربی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپؑ نے قاضی شریح سے پوچھا کہ اگر ایک عورت کو طلاق دی گئی ہو اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ اسے ایک مہینہ میں تین مرتبہ خون آتا ہے تو تم اس کے عدہ کے بارے میں کیا فیصلہ کرو گے۔ شریح نے کہا کہ اگر اس کے گھر والے اس کی تصدیق کریں تو اس کے قول کو صحیح سمجھا جائے گا حضرت نے فرمایا قالون یہ رومی زبان کی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے صحیح کہا (لسان العرب)

ایک مرتبہ کچھ لوگوں کو دامن لٹکائے چلتے دیکھا تو فرمایا۔

كانهم اليهود خرجوامن فهو رهم۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۴ ص ۳۶۱) — گویا یہ یہودی ہیں جو اپنی درسگاہوں سے باہر نکل رہے ہیں۔

فهور فهر کی جمع ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ یہ نبطی یا عبرانی زبان کی لفظ ہے۔ اس کی اصل **بهر** ہے جس کے معنی یہودیوں کی درسگاہ یا اس مقام کے ہیں جہاں وہ عید کے لئے جمع ہوتے تھے۔ محیط میں ہے کہ **فهر** فوریم کا معرب ہے اور فوریم یہودیوں کی ایک عید کا نام ہے جو ماہ آذر کی ۱۳ یا ۱۵ تاریخ کو ہوتی ہے۔

عرب جب عجمی الفاظ کو معرب کرتے تھے تو ان لفظوں کو جہاں اپنے لب و لہجہ کے سانچے میں ڈھالتے وہاں ان سے اور صیغے بھی بنایا کرتے تھے چنانچہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے۔

وقد اقلتنا المصايا الضمر — مثل القسى عاجها المقمجر

تمہیں ان لاغر اندام اونٹوں نے اٹھالیا جو ان کمانوں کے مانند تھے جنہیں کمانی گر نے ٹیڑھا کیا ہو۔

شاعر نے پہلے کمانگر کو قمنجر کی صورت میں بدلہ اور پھر اسے شعری قاعدہ کے مطابق اسے فاعل کی صورت دے دی۔ حضرت نے بھی اسی نہج پر الفاظ سے الفاظ ڈھالے۔ چنانچہ ایک مرتبہ نو روز کے موقع پر آپ کے سامنے حلوا پیش کیا گیا آپؑ نے پوچھا کہ آج کیا بات ہے کہا گیا کہ آج نوروز ہے۔ آپؑ نے خوش طبعی کے طور پر فرمایا۔

نوروز والنا كل يوم۔ (المزہر) — تو پھر ہمارے لئے ایسا نوروز ہر روز منایا کرو۔

نوروز فارسی زبان کی لفظ ہے اس کا عربی میں تلفظ نوروز اور نیرُوز ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے اسی لفظ نوروز سے نوروزو امر کا صیغہ مشتق کیا ہے۔

بعض الفاظ قریب المعنی ہوتے ہیں مگر مترادف و ہم معنی نہیں ہوتے اس معنوی تفریق کی وجہ سے ان کا محل استعمال بھی مختلف ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے اس تفریق معنوی کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ اکراہ و اجبار میں کیا فرق ہے فرمایا۔

الاكراه من السلطان والاجبار من الزوجه والابن۔ (قصا یا قی) — اکراہ وہ ہے جو بادشاہ کی طرف سے ہو اور اجبار وہ ہے جو زوجہ اور فرزند کی طرف سے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ جو بات حکماً منوائی جائے وہ اکراہ ہے اور جس میں حکم کار فرما نہ ہو وہ اجبار ہے۔

آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ خوف اور غم میں کیا فرق ہے فرمایا۔

الخوف قبل و قوعہ والغم ما یلحق الانسان من وقوعہ۔ (الف کلمہ)

کسی امر ناگوار کے واقع ہونے سے پہلے جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ خوف ہے اور جو کیفیت واقع ہونے کے بعد طاری ہوتی ہے وہ غم ہے۔

اجر اور عوض میں فرق یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو ابتلاء و آزمائش ہو جیسے دکھ' درد بیماری وغیرہ اس کے بدلہ میں جو کچھ اللہ کی طرف سے ملے وہ عوض ہے اور انسان کے اعمال کے نتیجہ میں جو حاصل ہو وہ اجر ہے۔ چنانچہ حضرت نے اس فرق کو ایک مریض کی عیادت کرتے ہوئے واضح کیا۔

ان مرض لا اجرفیہ ولکنہ یحط السیئات ویحتھاحت الاوراق و انما الاجر فی القول باللسان والعمل بالایدی والاقدام۔ (نہج البلاغہ)

مرض میں اجر نہیں ہے البتہ وہ گناہوں کو مٹاتا ہے اور انہیں اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح درخت سے پتے جھڑتے ہیں ہاں اجر اس میں ہوتا ہے کہ کچھ زبان سے کہا جائے اور کچھ ہاتھ پیروں سے کیا جائے

معانی الفاظ کے سلسلہ میں حضرتؑ کا قول حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آیہ قرآنی **واذا الموؤدۃ سئلت۔** (جس وقت زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا) میں لفظ موؤدۃ کے متعلق صحابہ میں اختلاف رائے ہوا تو آپؑ نے فرمایا۔

انھا لاتکون موؤدۃ حتی یاتی علیھا التارات السبع۔ (درۃ الغواص)

زندہ درگور لڑکی پر لفظ موؤدۃ اس وقت صادق آتی ہے جب وہ سات مرحلوں سے گزر چکی ہو۔

حضرت نے آیہ قرآنی **لقد خلقنا الانسان من سلالتہ** میں خلقت انسانی کے جو مراتب بیان کئے ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب لڑکی ولادت کے بعد روئے' جئے اور پھر اسے زندہ دفن کر دیا جائے وہ موؤدہ ہے۔

حضرت ابوبکرؓ سے لفظ کلالہ کے معنی دریافت کئے گئے انہوں نے کہا۔

ھو من مات ولم یدع ولد اولاد الدا ھذا قولی فیھا برائی فان کان ھوا با فمن اللہ۔ (کشف الغمہ ج ۲ ص ۵۹)

وہ جس کے نہ بیٹا ہو اور نہ باپ یہ میری اپنی رائے ہے اگر صحیح ہو تو اللہ کی جانب سے ہے۔

امیرالمومنین کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ یہ رائے سے کام لینے کا محل نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کلالہ کا اطلاق سگے بھائی بہن اور پدری بھائی' بہن یعنی باپ' ایک اور مائیں مختلف ہوں اور مادری بھائی بہن یعنی ماں

ایک اور باپ مختلف ہوں سب پر ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالہ ان امرو ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلھا نصف ماترک و ھویرثھا ان لم یکن لھا ولد۔

لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور صرف ایک بہن ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہو گا اور اگر بہن مر جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو تو بھائی سارے مال کا وارث ہو گا۔

اس آیت میں کلالہ سے حقیقی اور پدری بھائی بہن مراد ہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

وان کان رجل یورث کلالہ او امراۃ ولہ اخ اواخت فلکل واحد منھا السدس فان کانوا اکثر من ذلک فھم شرکاء فی الثلث۔

اگر کوئی مرد یا عورت مادری بھائی یا بہن کو اپنا وارث چھوڑ جائے تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہو گا اور اگر ایک سے زیادہ ہوں وہ ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔

اس آیت میں کلالہ سے مراد مادری بھائی بہن ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ سے آیہ قرآنی **فاکھتہ و ابا** کے معنی دریافت کئے گئے کہا کہ **فاکھتہ** کے معنی تو میں جانتا ہوں مگر **ابا** کے معنی مجھے معلوم نہیں حضرتؑ نے سنا تو فرمایا **الاب ھوا لکلاء والمرعی** (اس کے معنی گھاس اور چراگاہ کے ہیں)

ابن قتیبہ دینوری نے ادب الکاتب میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ آیہ قرآنی **وفار التنور** (تنور جوش مارنے لگا) میں تنور کے معنی سطح زمین کے ہیں۔ فیروز آبادی نے بھی قاموس میں یہ معنی تحریر کئے ہیں۔ حضرتؑ سے مروی ہے کہ جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ۔

مر اصحابک بالعج والثج (معانی الاخبار)

اپنے اصحاب کو عج اور ثج کا حکم دیجئے۔

پھر حضرتؑ نے فرمایا کہ عج کے معنی صدائے تلبیہ بلند کرنے کے ہیں اور ثج کے معنی جانور کے ذبح کرنے کے ہیں۔ حضرتؑ سے حنان اور منان کے معنی پوچھے گئے فرمایا کہ حنان وہ ہے جو روگردانی کرنے والے پر بھی نظر کرم رکھے اور منان وہ ہے جو بن مانگے دے۔

ایک عورت نے اپنے شوہر کو سفلہ کہا۔ شوہر نے کہا کہ اگر میں سفلہ ہوں تو میری طرف سے تجھے طلاق ہے۔ یہ معاملہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان کنت لاتبالی ماقلت وما قیل لک فانت سفلہ والا فلاشئی علیک۔ (تہذیب الاحکام)

اگر تجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ تو نے کیا کہا اور تیرے بارے میں کیا کہا جاتا ہے تو سفلہ ہے اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بات بے نتیجہ ہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ نوُمتہ کے معنی کیا ہیں فرمایا۔

الذی لایدری الناس مافی نفسہ۔ (معانی الاخبار)

وہ جس کے دل کی بات لوگ نہ جان سکیں۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ "قسی" کس کپڑے کو کہتے ہیں فرمایا اس مصری یا شامی کپڑے کو جس کی لکیروں سے چار خانے بنتے ہوں۔

ضرب الامثال

ضرب المثل اس مختصر سے مختصر فقرہ کو کہتے ہیں جو اپنی لفظی لطافت اور معنوی افادیت کی بنا پر بے تکلف زبانوں پر آگیا ہو اگر مثل کا استعمال برمحل ہو تو اس سے کلام کا حسن اور اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ مثل میں کسی تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ لٰہذا جس واقعہ کے سلسلہ میں اسے بیان کیا گیا ہو گا اس سے ملتے جلتے ہوئے واقعہ کی تصویر نظروں کے سامنے آجائے گی اور اس کی روشنی میں موجودہ واقعہ کے اچھے یا برے نتائج پر حکم لگایا جا سکے گا۔ ابراہیم نظام کا قول ہے کہ مثل میں چار خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کلام میں یکجا نہیں ہوتیں۔ لفظی اختصار، معنیٔ مقصود سے ہم آہنگی، حسین تشبیہ اور لطیف استعارہ۔ انہی خوبیوں کی بنا پر مثلیں زبانوں پر چڑھتی اور فروغ عام پاتی ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات و تحریرات میں کثرت سے مثلیں استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ھیھات بعد اللتیا والتی۔

افسوس اب یہ بات جبکہ میں چھوٹی بڑی مصیبت جھیل چکا ہوں۔

اللیتا التی کی تصغیر ہے اس مثل کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک شخص نے ایک پستہ قد عورت سے عقد کیا جو

آئے دن اس کے لئے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیتی اس نے تنگ آکر اسے طلاق دے دی اور ایک ایسی عورت سے نکاح کر لیا جو دراز قامت تھی مگر یہ اس کے لئے پہلی سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی اس نے اسے بھی طلاق دے دی اور کہا **بعد اللتیا والتی لا اتزوج ابدا** (میں اس چھوٹی اور بڑی کے بعد کبھی شادی نہیں کروں گا) اس کے بعد اس سے چھوٹی اور بڑی مصیبت مراد لی جانے لگی۔

لو کان یطاع لقصیر امر۔ کاش کہ قصیر کی بات مان لی جاتی۔

یہ مثل اس موقع پر استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی مشورہ دینے والے کا مشورہ رد کر دیا جائے اور بعد میں پچھتایا جائے۔ یہ جملہ سب سے پہلے جذیمہ ابن ابرش کے غلام قصیر نے کہا اور پھر مثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

عند الصباح یحمد القوم السری۔ صبح کے وقت ہی لوگ رات کی راہ پیمائی کی تعریف کرتے ہیں۔

یہ مثل اس موقع پر کہی جاتی ہے جب زحمت و مشقت کے نتیجہ میں راحت و آرام میسر آئے۔ یہ جملہ سب سے پہلے خالد ابن ولید نے کہا اور پھر بطور مثل استعمال ہونے لگا۔

کم من اکلہ منعت اکلات۔ بسا اوقات ایک دفعہ کا کھانا بہت دفعہ کے کھانوں سے مانع ہو جاتا ہے۔

یہ جملہ ضرورت سے زیادہ شکم پری کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کو ضرورت سے زیادہ نہ کھانا چاہیئے کیونکہ کھانے کی حرص مختلف بیماریوں کا پیش خیمہ ہے جس کے نتیجہ میں انسان کو بہت سے کھانوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ یہ جملہ سب سے پہلے عامر ابن ظرب عدوانی نے کہا اور پھر مثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

ابوالفضل میدانی نے مجمع الامثال میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے تمثیلا" بیان فرمایا کہ ایک جنگل میں ایک شیر اور تین بیل سفید، سیاہ اور سرخ مل کر رہتے تھے۔ شیر انہیں کھا جانا چاہتا تھا مگر ان کے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے حملہ کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک دن اس نے کالے اور سرخ بیل سے کہا کہ مجھے اس سفید بیل کی طرف سے اندیشہ ہے کیونکہ سفید ہونے کی وجہ سے وہ دور سے دکھائی دے جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شکاری اسے دیکھ کر یہاں پہنچ جائے اور ہم سب اس کی وجہ سے مارے جائیں اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اسے کھا جاؤں تاکہ ہمارے لئے کوئی خطرہ نہ رہے۔ دونوں بیلوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور شیر اسے چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ پھر ایک دن اس نے سرخ بیل سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا رنگ تو میرے رنگ سے ملتا جلتا ہے مگر یہ کالا بیل ہمیں ایک نہ ایک دن لے ڈوبے گا۔ اگر تم کہو تو میں اسے بھی کھا جاؤں تاکہ ہم یہاں بے خوف و خطر رہ

سکیں۔ اس نے کہا کہ بہتر ہے اسے بھی کھا جاؤ۔ جب اسے کھا چکا تو سرخ بیل سے کہا کہ اب میں تمہیں بھی کھاؤں گا اس نے کہا کہ اب میں اکیلا اور بے بس ہوں تم جب چاہو مجھے کھا سکتے ہو مگر مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکوں۔ شیر نے اسے مہلت دی اور اس نے بلند آواز سے کہا۔

الا انی اکملت یوم اکل التور الابیض۔ میں تو اسی دن لقمہ بن گیا تھا جس دن سفید بیل کھایا گیا تھا۔

اس مثل سے مراد یہ ہے کہ جو شخص دوسرے کی ہلاکت پر رضا مند ہو جاتا ہے اسے بھی ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

میدان جنگ میں حضرتؑ سے کہا گیا کہ آپ زرہ خود پہنے بغیر دشمن سے بھڑ جاتے ہیں فرمایا۔

احرز ام اجلہ۔ موت کا لمحہ انسان کو حفاظت میں لئے ہوئے ہے۔

اس جملہ کے بارے میں میدانی نے لکھا ہے کہ۔

ھذا اصدق مثل ضربتہ العرب۔ (مجمع الامثال) یہ عربی مثلوں میں سب سے سچی ضرب المثل ہے۔

ایک مرتبہ عید کے موقع پر متعدد کھانے آپ کے سامنے جمع ہو گئے آپ نے ان کھانوں کو ملا کر ایک کر لیا اور فرمایا۔

اجعلھا باجا۔ میں انہیں یک رنگ کئے لیتا ہوں۔

علامہ مجلسی نے لکھا ہے کہ **صارت کلمتہ مثلا** (حضرت کا یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا ہے)

ساعدا سمابلا۔ آخر اس تبدیلی کا کیا سبب ہے۔

علامہ سید رضی نے تحریر کیا ہے کہ یہ جملہ جو بطور مثل استعمال ہوتا ہے اور سب سے پہلے آپ ہی سے سنا گیا ہے۔

جعلت فداکہ۔ میں تم پر قربان جاؤں۔

شیخ علاء الدین نے تحریر کیا ہے کہ۔

اد لی من قال جعلت فد اک علی رضی اللہ عنہ۔ جس نے سب سے پہلے **جعلت فد اک** کہا وہ حضرت علی علیہ السلام تھے۔ (محاضرہ الاوائل)

حضرتؑ کے چند کلمات اور درج کئے جاتے ہیں جو اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

لارای لمن لا یطاع	اس کی رائے ہی کیا جس کی بات نہ مانی جائے۔
القلب مصحف البصر	دل آنکھ کا صحیفہ ہے۔
الھم نصف الھرم	غم آدھا بڑھاپا ہے۔
خیر البلاد ما حملک	بہترین شہروہ ہے جو تمہارا بوجھ اٹھائے۔
الحرمان خیر من الامتنان	احسان مند ہونے سے محروم ہونا بہتر ہے۔
من صارع الحق صرعہ	جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا۔
الامانی تعمی اعین البصائر	امیدیں چشم بصیرت کو کور کر دیتی ہیں۔
کل متقصر علیہ کاف	جس پر قناعت کر لی جائے وہ کافی ہے۔
رسولک ترجمان عقلک	تمہارا قاصد تمہاری عقل کا ترجمان ہے۔
بطن المرء عدوہ	انسان کا شکم اس کا دشمن ہے۔
ثبات الملک بالعدل	ملک کا ثبات و قیام عدل سے وابستہ ہے۔
جلیس المرء مثلہ	آدمی کا ہم نشیں ویسا ہوتا ہے جیسا وہ خود ہوتا ہے۔
رسول الموت الولادۃ	پیدائش موت کی پیغامبر ہے۔
عاقبۃ الظلم و خیمہ	ظلم کا انجام سخت ہے۔
صمت الجاھل سترہ	جاہل کی خاموشی اس کی پردہ پوش ہے۔
اشرف الغنی ترک المنیٰ	امیدوں سے دستبرداری بہترین ثروت ہے۔

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے دل بے آرزو دیا تو نے

من لم یثق لم یوثق بہ — جو دوسروں پر اعتماد نہیں کرتا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔

ضعف العقل امان من الغم۔ — عقل کی کمزوری غم سے امان دلاتی ہے۔

چنداں کہ عقل بیش غم روزگار بیش

اول رای العاقل آخر رای الجاھل۔ — عاقل کی رائے جو شروع میں ہوتی ہے وہی جاہل کی رائے آخر میں ہوتی ہے۔

آنچہ دانا کند کند ناداں — لیک بعد از خرابیٔ بسیار

علم عروض

علم عروض وہ علم ہے جس میں اوزان شعر سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کے ذریعہ شعر کے وزن کو پرکھا اور کلام موزوں و غیر موزوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ افراد جو طبع موزوں رکھتے ہیں انہیں علم عروض کی احتیاج نہیں ہے اور ان کا ذوق طبعی خود ہی موزوں و غیر موزوں کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو طبع موزوں نہیں رکھتے اور صف شعراء میں شامل ہونے کے لئے الفاظ کو نظم کے قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں وہ عروض کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہوتے ہیں اور لفظوں کو جوڑ کر مقررہ اوزان میں سے کسی ایک وزن پر شعر ڈھال لیتے ہیں۔ شعری وزن اس طرح جانچا جاتا ہے کہ بحر کے ہر رکن کے مقابلہ میں الفاظ کی ترتیب اس طرح قائم کی جاتی ہے کہ متحرک حروف کے مقابلہ میں متحرک حروف اور ساکن حروف کے مقابلہ میں ساکن حروف آئیں۔ اس طرح الفاظ کی نشست سے آواز میں توازن و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور شعر وزن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ وزن تناسب ہی کی ایک قسم ہے یہ تناسب متحرک و ساکن حرفوں کے امتزاج و تالیف سے اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور بھاری اور ہلکے سروں کے تال میل سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ متحرک حرفوں کے تسلسل کو چڑھاؤ اور ساکن حرفوں کے ٹھہراؤ کو اتار سمجھئے۔ اسی ہم رنگی کی بنا پر شاعری اور موسیقی کا انتہائی نزدیکی تعلق ہے۔ دونوں وزن اور تناسب پر اپنی بنیاد قائم کرتے ہیں اور دونوں پر جوش و طرب اور حزن و افسردگی کے یکساں اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یہ توازن و تناسب، نغمہ و شعر کے علاوہ مختلف آوازوں، ہواؤں کے ہلکوروں، آبشاروں کے گرنے، طوفانی موجوں کے اٹھنے، بادلوں کے گرجنے، بلندیوں پر سے پتھروں کے لڑھکنے اور پرندوں کے چہچہانے میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ قمری کی آواز گکو کو گکو کو گکو کو گکو کو کو بحر طویل فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن کے وزن پر ہے۔ انہی موزوں و

متناسب آوازوں سے موسیقی اور عروض کا فن وجود میں آیا۔ چنانچہ فیثا غورث کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ دریا کے کنارے لوہے پر ہتھوڑے کے چلنے کی پیہم آوازیں سنیں تو ان آوازوں کے اتار چڑھاؤ میں اسے تناسب و نغمگی کا احساس ہوا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر آوازوں میں ایک ہی آہنگ ہو تو وہ کیف و اثر سے خالی ہوتی ہیں اور اگر صوتی اعتبار سے بھاری اور ہلکی ہوں تو ان میں تناسب کے ذریعہ کیف اور اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ذہانت سے کام لے کر ریشم کے ڈوروں کو باندھ کر سارنگی کی طرح کا ایک آلہ بنایا اور آوازوں کے زیرو بم اور تاروں کے اتار چڑھاؤ سے صوتی آہنگ پیدا کر کے اسے ایک فنی حیثیت دے دی۔ اسی طرح خلیل ابن احمد فراہیدی جو فن موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا ایک مرتبہ ٹھٹھیروں کے بازار سے گزرا تو کھٹ کھٹ کی منظم و مرتب آوازوں میں اس نے موزونیت کا احساس کیا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس طرح الفاظ میں وزن ہوتا ہے جسے ف ع ل کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے اسی طرح آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے بھی وزن پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان موزوں و متناسب آوازوں سے اس کا ذہن اوزان شعر کی تشکیل کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے دقت نظر اور ذہنی کاوش سے کام لے کر علم عروض ایجاد کیا اور پانچ دائرے بنا کر پندرہ بحروں کے اوزان مرتب کئے۔ پھر اخفش نے سولہویں بحر کا اضافہ کیا جو بحر متدارک کے نام سے موسوم ہے۔ اس علم کے بنیادی ماخذ کے بارے میں احمد ابن حمدان رازی کا قول یہ ہے کہ۔

العروض اخذ اصله الخليل ابن احمد من رجل من اصحاب علی ابن الحسين ابن علی ابن ابی طالب۔
(تاسیس الشیعہ ص ۵۹)

خلیل ابن احمد نے عروض کے بنیادی قواعد علی ابن الحسین ابن علی ابن ابی طالب علیہم السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص سے سیکھے۔

اس قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیل ابن احمد ان آوازوں سے راہنمائی حاصل کرنے سے پہلے اس کے بنیادی قواعد کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور امام علی ابن الحسین علیہما السلام کے اصحاب میں سے کسی ایک شخص سے اس فن کے ابتدائی اصول سیکھے تھے۔ بعید نہیں ہے کہ اس شخص نے امام علی ابن الحسین علیہما السلام سے سیکھے ہوں یا بالواسطہ امیرالمومنین علیہ السلام سے استفادہ کیا ہو۔ اس لئے کہ حضرت علی علیہ السلام نے سب سے پہلے ناقوس کی آواز کے اتار چڑھاؤ کو بحر متدارک مثمن مقطوع کے سانچے میں ڈھالا اگر کھٹ کھٹ کی آوازوں سے علم عروض نے جنم لیا ہے تو پھر اس کے موجد امیرالمومنین علیہ السلام قرار پائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے ناقوس کی آواز میں نہ صرف وزن و ہم آہنگی محسوس کی بلکہ اسے لفظی جامہ بھی پہنایا۔ چنانچہ حارث ابن اعور بیان کرتے ہیں کہ میں حیرہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے ہمرکاب چل رہا تھا کہ ایک دیر سے ناقوس کے بجنے کی آواز آئی۔ آپ نے برجستہ اس کے وزن و آہنگ پر یہ منظوم کلمات فرمائے اور نوائے دیر صدائے حرم بن کر گونجنے لگی۔

جو چاہیں ہم تو ہو ناقوس میں بھی بانگ اذاں   خدا خدا کی بتوں سے ابھی صدا آئے

لا الہ الا اللہؑ	ذات الہ ہے واحد و یکتا	اس کا کوئی شریک نہ ہمتا
سبحان اللہ حقا حقا	عیبوں سے وہ پاک ہے حقا	بات ہے حق کی بول ہے سچا
ان المولی ضمیر یبقی	بے پروا اور سب کا آقا	قائم و دائم رہنے والا
حقا حقا صدقا صدقا	ہر دم گونجے حق کا نعرہ	حق کا بول رہے گا بالا
یحلم عنا رفقا رفقا	اس کی ذات ہے حلم سراپا	اس کا شیوہ رفق و دارا
لو لا حلمہ کنا نشقی	حلم سے گر وہ کام نہ لیتا	بخت نہ اپنا یاور ہوتا
ان المولی یسائلنا	بے شک ہم سے پوچھے گا مولا	تم نے کیا دنیا میں کیا کیا
ویرا فقنا ویحا سبنا	جانچ ہماری گو وہ کرے گا	سختی نہ ہو گی اس میں اصلا
یا مولانا لا تھلکنا	اے مولا اے سب کے آقا	ہر آفت سے ہم کو بچانا
وتدار کنا واستخد منا	دکھ کا ہمارے کرنا چارہ	تابع فرماں ہم کو بنانا
حلمک عنا قد جراء نا	حلم سے تیرے کھا کر دھوکا	کتنے نڈر ہم ہو گئے مولا
یا مولانا عفوک عنا	تو تو بڑا غفار ہے مولا	عفو خطا کر بار الہا
ان الدنیا قد غرتنا	دنیا ہے بس دھوکا ہی دھوکا	اپنے جال میں ہم کو پھانسا
واشتغلتناو استھوتنا	غافل اس نے ہم کو بنایا	راہ ہوس پر اس نے لگایا
واستلھتنا واستغوتنا	اپنی راہ پہ ہم کو ڈالا	حق کی راہ سے دور ہٹایا
قد ضیعنا دارا تبقی	گھر عقبی کا ہم نے اجاڑا	جس میں سدا ہے جا کے رہنا
واستوصنا دا را تفنی	گھر دنیا کا ہم نے بسایا	جو ہے فانی اور لا تبقیٰ
تفنی الد نیا قرنا قرنا	ہر دم رو بفنا ہے دنیا	ختم ہے اک دن کھیل یہ سارا
کلا موتی کلا موتی	موت سے کس کو ہے چھٹکارا	ایک نہ اک دن سب کو مرنا

كلا فيها موتى موتى — کس کو سدا ہے یاں پر رہنا — رفتہ رفتہ سب کو مرنا

كلا موتى كلا د فنا — سب کو ہے ہر حال میں مرنا — اجڑے گھر میں جا کے بسنا

نقلا نقلا د فنا د فنا — یاں سے اک دن کوچ ہے کرنا — زیر لحد ہے تنہا رہنا

يا بن الد نيا مهلا مهلا — دنیا والے رک جا تھم جا — سونچ سمجھ کر آگے بڑھنا

زن ماياتى وزنا وزنا — رتی رتی تولہ تولہ — کام ہو سارا تولا ناپا

لسنا ند رى ما فرطنا — عیش میں سارا وقت گنوایا — غفلت میں انجام نہ سونچا

الا فيها يوما متنا — جس دن موت نے آن دبوچا — اس دن آنکھ سے اٹھا پردہ

لو لا جهلى ما ان كانت — بے خبری کا کہرا چھایا — کچھ نہ سوجھے کیا ہے دنیا

عندى الد نيا الا سبحنا — چشم بصیرت کھول کے دیکھا — صورت زنداں اس کو پایا

يابن الد نيا جمعا جمعا — دنیا والے کر لے اکٹھا — بھر لے اپنا خالی پیالہ

يابن الد نيا مهلا مهلا — دنیا والے یابن الدنیا — کچھ تو کر احساس زیاں کا

يابن الد نيا دقا دقا — دنیا والے بندہ دنیا — اس کا در کھٹکاتے رہنا

يابن الد نيا وزنا وزنا — دنیا والے کام ہو تیرا — وزن میں پورا ٹھیک اترتا

خيرا خيرا سئيا سئيا — نیکی کا بدلہ نیک کمایا — شر کا بدلہ شر ہے پایا

سئيا سئيا حسنا حسنا — بد انجام ہے بد کاموں کا — نیک عمل کا نیک نتیجہ

ياذ ا من ذ اكم ذ ا هذ ا — کیا ہے دنیا کتنی دنیا — آنکھیں کھول کے دیکھ ذرا سا

لسنا نرجو ننجو نخشى — بخشش کا اب کیا ہے سہارا — خوف و رجا سے کام نہ رکھا

عجل قبل الفوت الوزنا — موت سے پہلے جلدی کرنا — ہاتھ سے اپنے وزن عمل کا

مامن يوم يمضى عنا — جو دن گزرا ایسا گزرا — جیسے ڈھلتا گھٹتا سایہ

الا اوهن عنا رکنا	ہر دن کوئی نہ کوئی ہے مرتا موت کے آگے بس ہے کس کا
ان المالک انذ رنا	خوف نہ اس کا ہم نے کھایا مالک نے ہر چند ڈرایا
انما نحشی عزلی • بهما	بدلیں گے یہ جسم نہ اعضاء مر کر اک دن جینا ہو گا

اسی طرح ایک مرتبہ ایک طنبورہ نواز کو طنبورہ بجاتے اور اس پر جھومتے دیکھاتو آپ نے آگے بڑھ کر طنبورہ توڑ دیا اور اس سے یہ عہد لیا کہ آئندہ وہ یہ کام نہیں کرے گا۔ پھر فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اس طنبورہ سے کیا آواز نکلتی ہے کہا یہ تو میں نہیں جانتا۔ فرمایا کہ اس میں سے یہ صدا آتی ہے۔

ستند خل جھنم ایا ضاربی ستند م ستند م ایا صاحبی

اے میرے ساتھی تم جلد شرمندگی و ندامت اٹھاؤ گے اور اے میرے بجانے والے تم عنقریب جنہم واصل ہو گے۔

فن شعر

شعراس کلام کا نام ہے جس میں جذبات کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی موثر ودلکش پیرایہ میں کی گئی ہو۔ اگرچہ ابتداء میں شعر کے لئے وزن ضروری نہ سمجھا جاتا تھا مگر شعرائے عرب نے کلام کی خوبی و دلآویزی کے لئے وزن کا التزام کیا اور اب ہر زبان میں وزن و آہنگ کی پابندی لازمی قرار دے لی گئی ہے۔ اگر وزن کے ساتھ تشبیہ و استعارہ اور تخیل و محرکات کی لطافتیں بھی ہوں تو اس سے شعر کی دلفریبی و اثر انگیزی اور بڑھ جاتی ہے اور سننے والے کلام کے حسن سے متاثر و مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یوں تو دنیا کے ہر خطہ میں ذوق شعری پایا جاتا ہے اور شعرو سخن کی محفلیں جمتی ہیں مگر سرزمین عرب ہمیشہ شاعری کا گہوارہ رہی ہے اور ہر دور میں ایک سے ایک بہتر شاعر پیدا کیا ہے جن کا احاطہ و شمار نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ عربوں کا فطری جوش اور زبان کی موزونیت ہے۔ چنانچہ جتنے متوازن اور معنی سے ہم آہنگ الفاظ اس زبان میں ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ عربی شاعری صرف قلبی واردات کی ترجمانی تک محدود نہ تھی بلکہ دشمن کو للکارنے، غیرت قومی کو جھنجھوڑنے، انتقامی جذبات کو ابھارنے اور نسلی افتخار و برتری کے اظہار کے لئے شعر ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ دور جاہلیت کی شاعری اخلاقیات سے یکسر تہی دامن تھی جبکہ اس میں سخاوت، شجاعت اور خود داری کے درس بھی ملتے ہیں۔ لیکن ایسے مضامین کی بھی کمی نہ تھی جو برائی کو پرکشش بنا کر بے راہروی کی تحریک کرتے تھے۔ اسلام، جس کا مقصد اخلاقیات کی تربیت و تکمیل تھی وہ یہ گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس قسم کی مخرب اخلاق شاعری کو فروغ حاصل ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ایسے تخریب کار

شعراء کی مذمت میں کہتا ہے۔

الشعراء یتبعهم الغاوون الم ترانهم فی کل وادیهیمون وانهم یقولون مالا یفعلون۔

شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔

یہ انہی شعراء کے بارے میں ہے جو نفسانی جذبات کو ابھارتے' شر و فساد کو ہوا دیتے اور لوگوں کی عزت و ناموس کو ہدف بناتے تھے اور جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے تو اسلام نے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی نہ شعر کہنے سے منع کیا اور نہ شعر سننے سے روکا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے روبرو اشعار پڑھے جاتے تھے اور آپ نہ صرف سنتے بلکہ بعض مواقع پر صد و تحسین سے حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ بہرحال ظہور اسلام کے بعد بھی شعر و شاعری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ البتہ اسلام نے جہاں عربوں کے اخلاق و عادات پر اثر ڈالا وہاں ان کے ذہنی رجحانات میں بھی تبدیلی پیدا کی اور عصبیت و نسلی تفاخر کو جو ان کی شاعری کا محور تھا سرے سے ختم کر دیا جس کے نتیجہ میں تشبیب و تفاخر کی جگہ اخلاقیات و مدح پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لے لی۔ چنانچہ حضرت ابو طالب علیہ السلام جو اس دور کے عظیم شاعر تھے ان کا کلام اخلاقی تعلیمات اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدح و توصیف ہی پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صحابہ میں حسان ابن ثابت' کعب ابن مالک انصاری' عبداللہ ابن رواحہ' نابغہ جعدی' کعب ابن زہیر وغیرہ کفار کی زبان بندی کے لئے ان کے ہجویہ اشعار کے جواب میں ہجویہ اشعار کہتے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدح و توصیف میں بھی قصائد نظم کرتے تھے۔ عرب میں حدی اور رجز کا پہلے بھی رواج تھا اور اسلام کے بعد بھی باقی رہا اور اب بھی عرب کے صحراؤں میں حدی کی صدائیں بلند ہوتی سنائی دیتی ہیں۔ البتہ رجز کی آوازیں شمشیر و سناں کی جنگوں کے ساتھ ختم ہو گئی ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے علم و ادب کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور طبع موزوں و ذوق علم کے ساتھ اپنے پدر بزرگوار حضرت ابو طالب علیہ السلام سے شاعری و زبان آوری ورثہ میں پائی اور اشعار کا ایک وافر ذخیرہ چھوڑا۔ یہ اشعار زہد و بے ثباتی دنیا پند و موعظت' عبرت و حکمت' بلند نفسی و علوہمتی ایسے مطالب عالیہ پر مشتمل ہیں اور اخلاقی ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ ان اشعار کا جوہر شکوہ الفاظ' حسن بندش' آمد و برجستگی اور سلاست و روانی ہے اور ندرت تشبیہ و حسن تعلیل ایسے محاسن شعری بھی نمایاں ہیں۔ چند متفرق اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

سلام علی اهل القبور الدوارس
کانهم لم یجلسوا فی المجالس

کہنہ قبروں میں بسنے والوں پر سلام ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی مجلس آرائی کی ہی نہ تھی۔

ولم یشربوا من بارد الماء شربه
ولم یا کلو مابین رطب و یابس

اور نہ ٹھنڈا پانی پیا تھا اور نہ دنیا کی مختلف چیزوں سے لذت اندوز ہوئے تھے۔

الا خبرونی این قبر ذلیلکم　　　و قبر العزیز الباذخ المتنافس

مجھے یہ بتاؤ کہ تم میں سے ادنیٰ کی قبر کون سی ہے اور معزز و باوقار اور اعلیٰ کی قبر کون سی ہے۔

وفی قبض کف الطفل عند ولودہ　　　دلیل علی الحرص المرکب فی الحی

پیدائش کے وقت بچے کی مٹھیوں کا بند ہونا یہ بتاتا ہے کہ حرص زندہ انسان کے اندر سمو دی گئی ہے۔

وفی بسطها عند الممات مواعظ　　　الا فانظرونی قد خرجت بلا شئے

اور موت کے وقت ان کا کھلا ہونا ایک درس عبرت ہے کہ دیکھ لو کہ میں دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔

اصبر علی حسد العدو　　　فان صبرک قاتلہ

دشمن کے حاسدانہ رویہ پر صبر کرو تمہارا صبر خود ہی اسے ہلاک کر دے گا۔

فالنار تاکل بعضها　　　ان لم تجد ما تاکلہ

اگر آگ کو بھسم کرنے کے لئے کچھ نہ ملے تو پھر آگ آگ ہی کو نگل جایا کرتی ہے۔

ومن یصحب الدنیا یکن مثل قابض　　　علی الماء خانتہ فروج الاصابع

جو شخص دنیا میں رہے سے وہ اس شخص کے مانند ہے جو اوک میں پانی بھرے اور انگلیوں کی درزوں سے سارے کا سارا بہہ جائے۔

حلاوۃ دنیاک مسمومتہ　　　فماتا کل الشهد الا بسم

تمہاری دنیا کی شیرینی زہر آلودہ ہے تم شہد بھی کھاتے ہو تو اس میں زہر کی آمیزش ہوتی ہے۔

فکن موسرا شئعت ام معسرا　　　فما تقطع الدهر الا بهم

چاہے تم فارغ البال ہو چاہے تنگدست زندگی غم و حزن کے سایہ ہی میں کٹے گی۔

اذا تم امر بدا انقصہ　　　توقع زوالا اذا قیل تم

ہر عروج کا نتیجہ تنزل ہے لہٰذا کمال کے بعد زوال کی توقع رکھو۔

اذا النائبات بلغن المدی **و کادت لھن تذوب المھج**

جب مصیبتیں حد آخر تک پہنچ جائیں اور دل سوز غم سے پگھلنے لگیں۔

وحل البلاء وقل الغرا **فعند التناھی یکون الفرج**

اور بلائیں گھیرلیں اور صبر ساتھ چھوڑ دے تو انتہائے مصیبت کے بعد خوشی و خوش حالی آتی ہے۔

ایک گروہ نے آپ کی شعری مہارت کی نفی کی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ جب کفار قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ہجویہ اشعار کہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ حضرت علی علیہ السلام سے فرمائیں کہ وہ ان کے ہجویہ اشعار کا جواب دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ **لیس ہناک۔** "وہ اس کام کے نہیں ہیں" اس ارشاد کا مقصد تو یہ تھا کہ ہجویہ اشعار کہنا ان کے مرتبہ کے شایاں نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ جواب دینے سے عاجز اور شعر کہنے سے قاصر تھے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو صحابہ جواب کے لئے آپؑ کا نام ہی کیوں تجویز کرتے۔ اس نام کے تجویز کرنے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ شعر کہنے اور شعر کے حسن و قبح کو پرکھنے میں عمومی شہرت رکھتے تھے اور کچھ لوگوں نے آپؑ کی شعرگوئی کے سلسلہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ آپؑ نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے چنانچہ مجدالدین فیروز آبادی حضرتؑ کے دو شعر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قال المازنی لم یصح انہ تکلم بشئی من الشعر غیر ھذین البیتین و صوبہ الز مخشری۔ (قاموس "ودق")

ابو عثمان مازنی نے کہا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ان دو شعروں کے علاوہ بھی اشعار کہے ہوں اور زمخشری نے بھی اسی قول کو صحیح مانا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم الادباء میں اسی رائے کی تائید کی ہے مگر اس دعوی کی تصدیق اسی صورت میں کی جا سکتی ہے جب تاریخ و ادب کی قدیم کتابوں میں سے ان تمام اشعار کو حذف کر دیا جائے جن کی صحت نسبت کے بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں کیا گیا اور اس کثرت سے نقل ہوئے ہیں کہ ان سے مستقل مجموعے مرتب کئے جا چکے ہیں اور مختلف ہاتھوں سے ان کی ترتیب و جمع آوری ہوئی ہے چنانچہ۔

ابو احمد عبدالعزیز ابن یحیٰی جلودی متوفی حدود ۳۳۰ ھ نے آپؑ کے اشعار کو جمع کیا۔ چنانچہ نجاشی نے ان کے مؤلفات میں کتاب شعر علی کا ذکر کیا ہے۔

محمد ابن عمران مرزبانی متوفی ۳۸۴ ھ نے آپؑ کے مختلف مواقع کے اشعار یکجا کئے۔

علی ابن احمد فنجکروی متوفی ۵۱۳ ھ نے آپؑ کے منظوم کلام کا ایک مجموعہ مدون کیا۔

ابو البرکات ہبتہ اللہ ابن علی متوفی ۵۴۲ ھ نے ایک مجموعہ آپؑ کے اشعار پر مشتمل مرتب کیا۔

محمد ابن الحسین ا لکیدری متوفی حدود ۵۷۶ ھ نے دو مجموعے آپؑ کے کلام پر مشتمل ترتیب دیئے' ایک کا نام انوارا لعقول اور دوسرے کا نام الحدیقتہ الانیقہ ہے۔

سید محسن امین عاملی صاحب اعیان الشیعہ متوفی ۱۳۷۱ ھ نے حروف تہجی کی ترتیب پر آپؑ کے اشعار کی تدوین کی۔

ان مجموعوں کے علاوہ متعدد اعلام نے اپنی کتابوں میں آپؑ کے مختلف اشعار درج کئے ہیں۔ چنانچہ محمد ابن سلامہ مغربی نے کتاب دستور معالم الحکم میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ میں نصرابن مزاحم نے کتاب الصفین میں ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں برد نے کامل میں اور دوسرے مؤلفین نے اپنے مؤلفات میں آپؑ کے مختلف موقع کے اشعار نقل کئے ہیں۔ ان مجموعوں اور ان میں اشعار کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ رائے قطا" صحت سے عاری اور واقعیت سے دور ہے کہ آپؑ نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے۔ سعید ابن مسیب کہتے ہیں۔

کان ابوبکرؓ شاعر او عمر شاعر او علی الشعر الثلثہ۔
(عقدالفرید ج ۳ ص ۳۹۶)

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں شاعر تھے اور حضرت علی علیہ السلام ان سے بڑھ کر شاعر تھے۔

شعبی کا یہ قول متعدد کتابوں میں درج ہے۔

کان ابوبکر یقول الشعر وکان عمر یقول الشعر وکان عثمان یقول الشعر وکان علی الشعر الثلثہ۔
(تاریخ الخلفاء ص ۱۲۸)

حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان شعر کہا کرتے تھے مگر حضرت علی علیہ السلام کی شاعری کا پایہ ان تینوں سے بلند تر تھا۔

اس دور میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے اپنی زندگی میں ایک آدھ شعر نہ کہا ہو مگر ایسے لوگوں کو کبھی شعراء میں شمار نہیں کیا گیا۔ اگر امیرالمومنین علیہ السلام نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے ہوتے تو انہیں شاعر بھی نہیں کہنا چاہیئے تھا چہ جائیکہ الشعر (بہت بڑا شاعر) کہا جائے۔ حضرت علی علیہ السلام کا خلفاء ثلثہ سے تقابل اور ان کے مقابلہ میں انہیں اشعر کہنا غیر موزوں سی بات ہے اس لئے کہ اولا" تو ان خلفاء کا کلام کہیں دیکھنے سننے میں نہیں آتا اور کچھ تھوڑا بہت ہو تو ہو مگر اتنا بہرحال نہیں ہے کہ انہیں صف شعراء میں شمار کیا جا سکے بلکہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ ان میں سے بعض کو شعر کا مفہوم سمجھنے کے لئے دوسروں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ زبرقان ابن بدر نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ حطیہ نے اس کی ہجو میں یہ شعر کہا ہے۔

دع المکارم لا تنهض لبغیتها
واقعد فانک انت الطاعھم الکاسی۔

بزرگیوں کو چھوڑ اور ان کے پیچھے نہ بھاگ اپنی جگہ پر بیٹھا رہ تجھے تو کھانے اور پہننے سے مطلب ہے۔

حضرت عمر نے کہا کہ اس میں تو ہجو کی کوئی بات نہیں ہے کیا تم کھاتے اور پہنتے نہیں ہو۔ زبرقان نے کہا کہ اس سے بڑھ کر ہجو کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے میری زندگی کا مقصد ہی کھانا پینا اور پہننا قرار دے لیا ہے۔ حضرت عمر اس پر مطمئن نہ ہوئے اور حسان ابن ثابت کو بلایا اور پوچھا کہ کیا اس میں ہجو کا کوئی پہلو ہے انہوں نے کہا۔

ماجاہ ولکن سلح علیہ (عقد الصزید ج ۳ ص ۲۱۶) ہجو ہی نہیں کی بلکہ اس پر غلاظت پھینک دی ہے

احمد حسن الزیات اس واقعہ کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں۔

لم یفطن الی موضع الھجاء فیہ لد قتہ حتی ولہ علیہ حسان (تاریخ الادب العربی) حضرت عمر شعر کی باریکی کی بنا پر ہجو کے پہلو کو نہ سمجھ سکے یہاں تک کہ حسان نے انہیں بتایا۔

قبیلہ بنی عجلان نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ نجاشی نے ان کی ہجو کی ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں بھی سنوں کہ وہ ہجو کیا ہے انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

اذا اللہ عادی اھل یوم و دقہ
فعادی بنی عجلان رھط ابن مقبل

اگر اللہ کمینے اور ذلیل لوگوں کو دشمن رکھتا ہے تو قبیلۂ ابن مقبل کی شاخ بنی عجلان کو بھی دشمن رکھے۔

حضرت عمر نے کہا کہ یہ تو ہجو نہیں ہے بلکہ بددعا ہے اگر وہ مظلوم ہے تو اس کی دعا قبول ہو گی ورنہ رد کر دی جائے گی انہوں نے کہا کہ اس کے بعد یہ شعر بھی کہا ہے۔

قبیلتہ لا یخضرون بذمتہ
ولا یظلمون الناس حبتہ خردل

یہ قبیلہ کسی سے عہد شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا اور نہ کسی پر رائی برابر ظلم کرتا ہے (یعنی وہ کمزور و بزدل ہیں)۔

حضرت عمر نے یہ شعر سن کر کہا۔

لیت آل الخطاب مثل ھولاء۔ (عقد الفرید) کاش خطاب کی آل اولاد بھی ایسی ہوتی

انہوں نے کہا کہ اس کے بعد یہ شعر کہا ہے۔

ولا یردون الماء الا عشیہ
اذا صدر الورادعن کل منھل

یہ لوگ رات کے وقت چشمہ پر آتے ہیں جب دوسرے لوگ اپنے اونٹوں کو سیراب کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

حضرت عمر نے کہا کہ بھیڑ بھاڑ سے بچنا اچھی بات ہے یہ تو کوئی ہجو نہیں ہے حالانکہ شاعر کا مقصد یہ تھا کہ وہ ذلیل و کمزور ہیں اور انہیں اونٹوں کو پانی پلانے کی اجازت اس وقت ملتی ہے جب تمام لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ شعر بھی تو کہا ہے۔

وما سمی العجلان الالقولھم **خذ القعب ایھا العبد و اعجل**

بنی عجلان کا نام عجلان اس لئے پڑا کہ لوگ اسے یہ کہتے تھے کہ اے غلام پیالہ اٹھا اور جلدی سے دودھ دوہ لے۔

حضرت عمر نے کہا کہ اس میں کیا برائی ہے قوم کا سردار قوم کا خدمت گزار ہوتا ہے۔ غرض ان ہجویہ اشعار سے ہجو کے پہلو کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔

امیرالمومنین علیہ السلام الفاظ کی گہرائیوں میں جھانک کر شعر کے حسن و قبح کو پرکھنے کا ملکۂ تام رکھتے تھے اور کلام عرب پر احاطہ کرنے کے بعد شعر کی قدر و قیمت اور شعراء کے مرتبہ و مقام کو بخوبی پہچانتے تھے۔ چنانچہ اسی شعری شعور اور وسیع النظری کی بنا پر آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ عرب میں سب سے بڑا شاعر کون ہے فرمایا۔

ان القوم لم یجروا فی حلبتہ تعرف الغایہ عند قصبتھا فان کان ولا بد فا لملک الضلیل۔ (نہج البلاغہ)

شعراء کی دوڑ ایک روش پر نہ تھی کہ گوے سبقت لے جانے سے ان کی آخری حد کو پہچانا جائے اگر ترجیح دینا ہی ہے تو پھر گمراہ فرمانروا (امراء القیس) ہے۔

حضرت نے پہلے تو کسی ایک کی تعیین کرنے سے پہلو تہی کی اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ شعراء کے کلام میں موازنہ کر کے اشعر کی تعیین اس صورت میں ہو سکتی ہے جب ان کے اشعار کی نوعیت ایک ہو اور جب اصناف شعر میں سے ہر صنف کا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے اور ایک مخصوص مزاج ہے تو ان میں تقابل کیسا مثلاً" جو الفاظ اظہار شجاعت کے لئے موزوں ہوتے ہیں وہ تغزل کے لئے موزوں و مناسب نہیں ہوتے اور جو تغزل کے لئے مناسب ہوتے ہیں وہ شجاعت و بسالت کے لئے مناسب نہیں سمجھے جاتے۔ اس لئے کہ لفظ و معنی کا رشتہ اس کا مقتضی ہے کہ حماست کے الفاظ میں سختی و خشونت اور تغزل کے الفاظ میں نرمی و نزاکت ہو۔ لہٰذا جب کلام کی سمتیں بدلی ہوئی ہوں گی تو ان میں موازنہ بے محل قرار پائے گا۔ اس ایک گونہ معذرت کے بعد امراء القیس ابن حجر کندی کو ترجیح دی ہے اور اس ترجیح کی وجہ ایک موقع پر یہ بیان فرمائی ہے۔

رأيته احسنهم نادرة واسبقهم بادرة وانه لم يقل لرغبة ولا الرهبة۔ (المزہر ج ۲ ص ۴۷۸)

میں نے اسے مضمون آفرینی میں سب سے بہتر اور بیساختگی و برجستہ گوئی میں سب سے آگے پایا ہے اس نے نہ رغبت کی بنا پر شعر کہے اور نہ خوف و ہراس کے پیش نظر۔

حضرت نے رغبۃ و رہبۃ کی لفظوں سے عرب کے شاعر اعشیٰ اور نابغہؒ کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اعشیٰ کو کسی شے کی طلب و خواہش ہوتی تو اس کی طبیعت میں روانی آتی اور نابغہؒ کو خوف دامنگیر ہوتا تو اس کے جذبۂ شاعری میں ارتعاش پیدا ہوتا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے اس اجمالی تبصرہ سے نقد و نظر کے بنیادی ضوابط کی طرف رہنمائی ہوتی ہے پہلا ضابطہ یہ ہے کہ کلام کی نوعیت یکساں ہو جب موازنہ بر محل ہو گا اور اگر کلام کا موضوع و آہنگ بدلا ہوا ہو تو تقابل صحیح نہ ہو گا چنانچہ مثنوی کا موازنہ رباعی سے اور مرثیہ کا موازنہ غزل سے برمحل نہ سمجھا جائے گا دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ شعر میں جدت' جودت اور ندرت ہونا چاہیئے اگر صرف لفظوں کا تانا بانا بنا گیا ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔ چنانچہ اسی ندرت پسندی و جدت بازی کی وجہ سے امراء القیس کو دوسرے شعراء پر ترجیح دی ہے۔ تیسرا ضابطہ جو امراء القیس کی شاعرانہ خصوصیات سے مستخرج ہے یہ ہے کہ معنی کے ساتھ لفظوں کی ترکیب و ترتیب اور دروبست میں حسن سلیقہ کارفرما ہو۔ چنانچہ شعر کی خوبی کا انحصار صرف مضمون آفرینی پر نہیں ہے بلکہ اس میں اسلوب و طرز بیان کو بھی دخل ہے۔ اس لئے کہ معنی کتنے ہی بلند اور لطیف کیوں نہ ہوں۔ اگر انہیں موزوں و مناسب لفظوں میں پیش نہ کیا جائے تو معنی کا حسن کجلا کر رہ جائے گا اور اگر معنی میں کوئی خاص ندرت نہ ہو مگر انہیں عمدہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو پامال مضمون میں بھی رعنائی و تازگی پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ امراء القیس جس میں رندی و سرمستی کا عنصر نمایاں تھا ایک عام اور مبتذل بلکہ اخلاقی سطح سے گرے ہوئے مضمون کو کہیں استعارہ و تشبیہ اور کہیں حسن ترکیب کا سہارا لے کر خوش آہنگ بنا دیتا ہے اور اس کی اسی خصوصیت خاصہ کی بنا پر حضرتؑ نے اسے بزم شعرا کا صدر نشیں قرار دیا ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام یگانہ روزگار' ادیب و نقاد تو تھے ہی اس کے ساتھ شاعر نواز اور ادیب پرور بھی تھے اور ادبی شہ پاروں کو پرکھتے اور ان کی قدر افزائی فرماتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک اعرابی آپؑ کے پاس آیا اور کہا کہ میں ایک حاجت لے کر آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اگر آپؑ میری حاجت روائی فرمائیں گے تو میں اللہ کی حمد و ستائش کروں گا اور آپ کا شکرگزار ہوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنی حاجت زمین پر تحریر کرو اس نے لکھا انی فقیرہ "میں غریب و نادار ہوں" آپ نے قنبر سے فرمایا کہ فلاں حلہ اسے دے دو اس نے حلہ لے لیا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے۔

کسو تنی حلہ تبلی محاسنھا — فسوف اکسوک من حسن الثنا حللا

آپ نے مجھے وہ حلہ پہنایا ہے جس کا رنگ روپ مٹ جائے گا اور میں اس کے عوض آپ کی بہترین مدح و ثنا کے حلے پہناؤں گا۔

ان الثناء ولیحیی ذکر صاحبہ — کالغیث یحیی نداہ السھل ولجبلا

مدح و ثناء ممدوح کے ذکر کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے جس طرح برسنے والے ابر کی پھوار پہاڑوں اور میدانوں کی رگ رگ میں زندگی کی رو دوڑا دیتی ہے۔

لاتزھد الدھر فی عرف بدأت بہ — فکل عبد سیجزی بالذی فعلا

جو حسن سلوک اور نیکی آپ نے کی ہے اس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھئے کیونکہ ہر بندے کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا۔

حضرت اس کی برجستہ گوئی سے خوش ہوئے اور قنبر سے فرمایا کہ اسے پچاس دینار بھی دے دو پھر اس اعرابی سے مخاطب ہو کر کہا۔

اما الحلتہ ملمسئلتک واما الدنا نیر فلا دبک۔ تمہارے سوال پر تمہیں حلہ دیا گیا ہے اور تمہارے ادب کے پیش نظر یہ دینار دیئے جا رہے ہیں۔

(عمدہ ابن رشیق ج ۱ ص ۲۹)

فن نثر

امیرالمومنین علیہ السلام کی نثری تخلیقات علم و ادب کا عظیم سرمایہ ہیں جن میں سائنسی انکشافات، علمی اکتشافات اور فلسفہ و حکمت کے نکات سمٹے ہوئے ہیں۔ حضرت کو زبان، بیان پر اتنا اقتدار حاصل تھا کہ طویل سے طویل تحریروں میں روانی، تسلسل، صفائی اور سبک روی میں فرق نہیں آتا اور مختصر سے مختصر جملوں میں معانی و مطالب کی وسعت کے باوجود ادائے مطلب میں خلل واقع نہیں ہوتا اور لفظوں کے دروبست جملوں کی ساخت اور بندش کی تازگی نے نثر کو اس انتہا تک پہنچا دیا جس کے بعد اعجاز کی حد شروع ہو جاتی ہے اور انسانی زور فصاحت دم توڑتا نظر آتا ہے۔ جچی تلی لفظیں موقع و محل کے اعتبار سے کہیں ہلکی پھلکی اور کہیں گونجتی گرجتی معنی سے ہم آہنگ اور شگفتگی سے ہمکنار، کیف و رنگ میں ڈوبے ہوئے جملے، زنجیر کی کڑیوں کی طرح مرتبط فقرے اور قرآن و حدیث کے اسلوب میں ڈھلی ہوئی تحریریں آپ کی انشاء پردازی کا خاص جوہر ہیں۔ الہیات کے دقیق مسائل کو ادبی اسلوب بیان کے امتزاج سے اتنا دلکش اور جاذب نظر بنا دیا ہے کہ نظریں کلام کی لفظی و معنوی خوبیوں پر جم کر رہ جاتی ہیں اور فلسفہ،

ادب پارہ کے روپ میں نظر آنے لگتا ہے اور اخلاقی مواعظ کو اس شیریں انداز میں پیش کیا ہے کہ موعظت کی تلخی کا احساس نہیں ہونے پاتا اور بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور جہاں موت کی ہولناکی، نزع کی بے چینی، قبر کی تنہائی، تیمارداروں کی مایوسی اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے وہاں موت پوری ہولناکیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اور جہاں اپنے کلک گہربار سے طاؤس کی خوش رنگی و خوش خرامی، اجالوں میں چیونٹی کی نقل و حرکت اور گھپ اندھیروں میں چمگادڑ کی اڑان اور ٹڈی دل کی تگاپو کی تصویر کشی کی ہے وہاں صانع عالم کے حسن آفرینش کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ حسن زیات نے آپؑ کی ان نگارشات کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

تعد من معجزات اللسان العربی۔ (تاریخ الادب العربی)

ان کا شمار عربی ادب کے معجزوں میں ہوتا ہے۔

اسی طرح ہر دور کے ادباء و فصحاء نے آپؑ کی غیر معمولی قدرت اظہار اور زبان و بیان اور طرز ادا کی ندرت کا اعتراف کرتے ہوئے کلام خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپؑ کے کلام کو ہر کلام سے فصیح تر قرار دیا اور عظیم قلمکاروں نے آپؑ کے طرز نگارش کے تتبع سے تحریر و انشاء کا سلیقہ سیکھا۔ چنانچہ عبدالحمید ابن یحییٰ متوفی ۱۳۲ھ، ابن نفع متوفی ۱۴۲ھ، ابن نباتہ متوفی ۳۷۴ھ ایسے بلند پایہ انشاء پردازوں نے اپنی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا سرچشمہ آپ کے خطبات و تحریرات کو قرار دیا اور آپ کے اسلوب نگارش کی رہنمائی سے ادبی شاہکار تخلیق کئے۔ ابن ابی الحدید تحریر کرتے ہیں۔

ومنہ تعلم الناس الخطابۃ والکتابۃ۔

آپ ہی سے لوگوں نے خطابت و انشاء پردازی کا فن سیکھا۔

علماء ادب نے نثر کی چار قسمیں کی ہیں! مرصع، مسجع، مرجز اور عاری ذیل میں ان قسموں کے اصطلاحی معنی اور حضرتؑ کے کلام سے ان کی ایک ایک مثال درج کی جاتی ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آپؑ ان چاروں قسموں پر یکساں اقتدار رکھتے تھے۔

نثر مرصع یہ ہے کہ دو فقروں کے تمام الفاظ متحد الوزن اور آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں۔

بعید الجولۃ عظیم الصولۃ۔

وہ دور تک بڑھ جانے والا اور بڑے زور سے حملہ کرنے والا ہے۔

اس جملہ میں بعید اور عظیم ہموزن اور جولہ اور صولہ ہم قافیہ ہیں۔

نثر مسجع یہ ہے کہ دو فقروں کے اکثر الفاظ ہم قافیہ ہوں جیسے

اخلاقکم دقاق و عھد کم شقاق۔ تم پست اخلاق اور عہد شکن ہو۔

اس میں دقاق اور شقاق ہم قافیہ ہیں۔

نثر مرجز یہ ہے کہ دو فقروں کے اکثر الفاظ ہم وزن ہوں جیسے۔

سرج لمع ضوئہ و شھاب سطع نورہ۔ وہ ایسا چراغ ہے جس کی روشنی لو دیتی ہے اور ایسا روشن ستارہ ہے جس کا نور ضیا پاش ہے۔

اس میں سراج اور شہاب لمع اور سطع ہم وزن ہیں۔

نثر عاری وہ ہے جس میں وزن و قافیہ کی پابندی نہ کی گئی ہو جیسے۔

ولیکن احب الامور الیک اوسطھا فی الحق و اعمھا واجمعھا فرضی الرعیتہ۔ تمہیں سب طریقوں میں سے وہ طریقہ پسند ہونا چاہئے جو حق کے اعتبار سے بہترین انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو۔

حضرت کے نثری کلمے جو آپؑ کی زبان سے سنے گئے یا قلم سے صفحہ قرطاس پر آئے متعدد کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں ان میں سے اہم مجموعے یہ ہیں۔

نہج البلاغہ ۔ علامہ شریف رضی متوفی ۴۰۶ ھ کی مشہور ترین تالیف ہے جس میں حضرتؑ کے خطبات، مراسلات اور کلمات حکمیہ، منتخب کر کے ترتیب دئے ہیں۔

مستدرک نہج البلاغہ ۔ اس کے جامع شیخ ہادی ابن شیخ عباس نجفی ہیں۔

دستور موالم الحکم۔ اس کے جامع ابو عبداللہ محمد ابن سلامہ قضاعی ہیں۔

نثرا للالی۔ اس کے جامع ابو علی الطبرسی صاحب تفسیر مجمع البیان ہیں۔

عزرا الحکم و درر الحکم۔ اس کے جامع عبدالواحد آمدی تمیمی ہیں۔

قلائد الحکم و فرائد الحکم۔ اس کے جامع قاضی ابو یوسف اسفرائنی ہیں۔

تحف العقول۔ یہ ابو سعد حسن ابن علی ابن شعبہ کی تالیف ہے اس میں امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات و کلمات کے علاوہ دوسرے آئمہ اطہار کے ارشادات بھی درج ہیں۔

کتاب مطلوب کل طالب من کلام علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔ اس کے جامع ابو اسحاق و عودہ انصاری ہیں۔

صحیفہ علویہ۔ اس کے مرتب عبداللہ ابن صالح امین جمعہ متوفی ۱۱۳۵ ھ ہیں۔

الف کلمہ۔ اس کے جامع ابن ابی الحدید معتزلی شارح نہج البلاغہ ہیں۔

مائتہ کلمہ۔ اس کے جامع ابو عثمان جاحظ ہیں۔

نظم الغرر و نضد الدرر۔ اس کے جامع میرزا عبدالکریم ابن محمد یحییٰ قزوینی ہیں۔

عیون الحکم والمواعظ۔ اس کے جامع شیخ علی ابن محمد واسطی ہیں۔

اکسیر السعادتین۔ اس کے جامع اسعد ابن عبدالقاہر اصفہانی ہیں۔

علم القراۃ والکتابہ

حرفوں کی ترکیبی و غیر ترکیبی شکلوں اور مختلف الاشکال حروف کی امتیازی علامتوں کو پہچاننے کا نام علم القراۃ اور انہیں قلم بند کرنے کے طریق کار کا نام علم الکتابہ ہے۔ اس نوشت و خواند کی ایجاد ضرورت کے زیر اثر ہوئی اور اپنی افادیت کی بنا پر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ تحریر ہی سے علوم و فنون کو بقاء و دوام حاصل ہوتا ہے اور دانشمندوں کے تجربات و مشاہدات دستبرد زمانہ سے محفوظ کئے جاتے ہیں۔ابتداء میں تصاویر و نقوش کے ذریعہ مختلف واقعات ظاہر کئے جاتے تھے اور یہ تصویریں حروف تہجی کا کام دیتی تھیں۔ یہ تصویری تحریریں آشور بابل اور مصر میں ہیکلوں' معبدوں اور مقبروں پر ثبت کی جاتی تھیں اور اس طرح اہم واقعات تاریخی اعتبار سے محفوظ کر لئے جاتے تھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے بھی اس تصویری رسم الخط کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ اہرام[1] مصر کی بنا کب رکھی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا اس پر کوئی تصویر بنی ہوئی ہے بتایا گیا کہ اس پر گدھ کی تصویر ہے جس کے پنجہ میں کیکڑا جکڑا ہوا ہے فرمایا۔

بنی الهرمان والنسرفی السرطان۔ (غیاث اللغات ص ۴۹۴) اہرام کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب ستارہ نسر برج سرطان میں تھا۔

---

[1] اہرام مصر فراعنہ مصر کے مقبرے ہیں ان میں بڑا اہرام خوفو نے اپنے دفن کے لئے تعمیر کیا تھا۔ یہ ایک وسیع رقبہ میں ۴۸۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کے قریب خافراع اور منکاؤ راع کے دو اہرام ہیں جو بلندی اور پھیلاؤ میں اس سے چھوٹے ہیں۔ اہرام کبیر کی تعمیر ایک لاکھ انسانوں کی محنت شاقہ کے نتیجہ میں بیس سال کے عرصہ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

ستارہ نسر کی صورت نسر (گدھ) کی سی ہوتی ہے اس لئے اسے گدھ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور برج سرطان کی صورت سرطان (کیکڑا) سے ملتی جلتی ہے۔ نسر دو ہزار سال میں ایک برج سے دوسرے برج میں منتقل ہوتا ہے لہٰذا یہ دیکھ کر کہ ستارہ نسر کس برج میں ہے اس کے زمانۂ تعمیر کی مدت متعین کی جا سکتی ہے۔ اس تصویری خط کے بعد مختلف آوازوں کے لئے مختلف علامتیں وضع کی گئیں جنہیں حروف کہا جاتا ہے۔ ان حروف کے ذریعہ تحریر کا کام آسان اور مختصر ہو گیا اور تصویری خط کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اس حروفی تحریر میں مصریوں اور چینیوں کو تقدم حاصل ہے مصریوں نے یہ فن فینیقیوں سے سیکھا۔ جو شام کے مغربی سواحل پر حکمران تھے انہی سے فرمایا مغربی دنیا نے سیکھا۔ اور یونانیوں نے ان کے حروف تہجی پر اپنے ہاں کے حروف کی بنیاد رکھی۔ ظہور اسلام سے کچھ عرصہ قبل حجاز میں تحریر و کتابت کا رواج تھا۔ جب وہ تجار تجارت کے سلسلہ میں شام و عراق جاتے تھے اور وہاں نوشت و خواند کا رواج پایا تو ان میں سے چند لوگوں کو تحریر کی ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے وہاں کے لوگوں سے نبطی و سریانی خط سیکھا اور بعد میں محدود پیمانے پر تحریری کام ہونے لگا اس خط نبطی سے خط نسخ نے جنم لیا اور خط سریانی سے ایک دوسرے خط کی بنیاد پڑی جو کوفہ میں نشوونما پانے کی وجہ سے خط کوفی کے نام سے موسوم ہوا۔

امیرالمومنین علیہ السلام فن تحریر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آیات قرآنیہ کی کتابت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بیشتر تحریری خدمات آپ ہی سے متعلق تھے۔ آپ نے جہاں اعرابی علامتوں اور نقطوں کی طرف رہنمائی فرمائی وہاں کتابت کے اصول بھی وضع کئے۔ حرفوں کے جوڑ ملانے تحریر کے نوک پلک سنوارنے اور واضح و خوشخط لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ اپنے کاتب عبداللہ ابن ابی رافع سے فرمایا۔

الق دواتک واطل جلفتہ قلمک و فرج بین اسطور و قرسط بین الحروف لان ذلک اجدی بصباحہ الخط۔

دوات میں صوف ڈالا کرو اور قلم کی زبان لانبی رکھو سطروں کے درمیان فاصلہ زیادہ چھوڑو اور حرفوں کے جوڑ ساتھ ملا کر لکھو کہ یہ خط کی دیدہ زیبی کے لئے مناسب ہے۔

خط کی عمدگی و پاکیزگی کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا۔

علیکم بحسن الخط فان من مفاتیح الرزق۔

خوشخط لکھو اس لئے کہ خط کی زیبائی رزق کی کنجی ہے۔

خوشخطی ہر طبقہ کے لئے نتیجہ خیز و ثمر آور ہے حضرت فرماتے ہیں۔

حسن الخط للفقیر مال و للغنی جمال و للعالم کال۔

خط کی پاکیزگی فقیر کے لئے مال، دولتمند کے لئے جمال، اور عالم کے لئے کمال ہے۔

بچوں کو لکھنے کی تعلیم دینے کے بارے میں فرمایا۔

علموا اولاد کم الکتابۃ۔ اپنے بچوں کو لکھنے کی تعلیم دو۔

علم معانی

علم معانی وہ علم ہے جو الفاظ کو معنی سے ہم آہنگ بنانے کے اصولوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے تاکہ دوسروں کے ذہنوں تک صحیح طریق سے معانی منتقل کئے جا سکیں۔ انہی اصولوں پر فصاحت و بلاغت کو پرکھا اور فصیح و غیر فصیح میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ فصاحت کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے اور بلاغت کا تعلق معنی سے۔ وہ کلام جو لسانی قواعد کے مطابق ثقیل و ناموس الفاظ سے مبرا اور ترتیب کے الجھاؤ سے پاک ہو فصیح کہلاتا ہے اور اگر ان اوصاف کے ساتھ مخاطب کی ذہنی کیفیت اور موقع و محل کی مطابقت بھی ملحوظ رکھی گئی ہو تو اسے بلیغ کہا جاتا ہے۔ مخاطب کی ذہنی کیفیت مختلف موارد پر مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ خالی الذہن ہوتا ہے' کبھی متردد اور کبھی منکر۔ لہٰذا ان موقعوں کے لحاظ سے کلام کا انداز بھی مختلف ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مخاطب خالی الذہن ہو تو کلام میں تاکیدی الفاظ سے زور پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ جیسے امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد۔

مراوہ الدنیا حلاوۃ الآخرۃ وحلاوۃ الدنیا مراۃ الاخرۃ۔ دنیا کی تلخی آخرت کی خوشگواری ہے اور دنیا کی خوشگواری آخرت کی تلخی ہے۔

اگر مخاطب تردد و شک کی حالت میں ہو تو تاکید کا لانا مستحسن ہے تاکہ اس کا شک برطرف ہو جائے۔ جیسے حضرتؑ کا یہ ارشاد۔

اما واللہ ما اتیتکم اختیارا ولکن جئت الیکم سوقا۔ بخدا میں تمہاری طرف بخوشی نہیں آیا بلکہ حالات سے مجبور ہو کر آگیا۔

اگر مخاطب کو سرے سے انکار ہو تو تاکید کا لانا ضروری ہے تاکہ اس کے انکار کو اقرار میں بدلا جا سکے جیسے حضرتؑ کا یہ قول۔

انھم واللہ لم ینفروا من ولم یلحقوا بعدل۔ خدا کی قسم وہ ظلم سے نہیں بھاگے اور عدل سے جا کر نہیں چمٹے۔

اگر مخاطب کا انداز منکر کا سا ہو۔ اگرچہ اسے انکار نہ ہو تو اسے بھی منکر قرار دے کر کلام میں تاکید لائی

جاتی ہے جیسے حضرت کا یہ ارشاد۔

واعلموا عباد اللہ انکم وما انتم فیہ من ھذہ الدنیا علی سبیل من قد مضی۔

اے خدا کے بندو اس بات کو جان لو کہ تمہیں اور اس دنیا کی چیزوں کو جن میں تم ہو انہی لوگوں کی راہ پر گزرنا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

یہ کلام موکد ہے حالانکہ کوئی بھی اس سے انکاری نہیں ہے کہ پہلے لوگوں کی طرح بعد میں آنے والوں کو بھی مرنا ہے مگر ان لوگوں کی غفلت اور دنیا طلبی میں انہماک یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا انہیں ہمیشہ دنیا میں رہنا ہے اور موت سے دو چار ہونا نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے طور طریقہ کو ایک طرح کا انکار قرار دے کر تاکید لائی گئی ہے۔

کبھی منکر کو غیر منکر قرار دے لیا جاتا ہے جبکہ وہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ کا انکار کرے جو ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہو تو ایسے موقع پر اگرچہ کلام کو موکد ہونا چاہیئے مگر ایسے انکار کو بے وزن اور ناقابل اعتناء ٹھہراتے ہوئے تاکید ترک کر دی جاتی ہے جیسے اہل بیت علیہ السلام کے بارے میں حضرت کا یہ ارشاد۔

وفیھم الوصیۃ والوراثۃ

انہی کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اور انہی کے لئے وراثت ہے۔

غرض الفاظ کی موزوں ترتیب کے ساتھ مقتضائے حال کی مطابقت وہم آہنگی کا نام بلاغت ہے اگر مقتضائے حال کی رعایت ملحوظ نہ رکھی گئی ہو تو خواہ اجزائے کلام کی ترتیب شگفتہ' بندش عمدہ اور الفاظ سلیس و سادہ کیوں نہ ہوں کلام میں بلاغت پیدا نہ ہو گی۔

علم معانی کی رعایت سے کلام کو مقتضائے حال کے مطابق ڈھالا اور لفظوں کی تقدیم و تاخیر اور حسن ترتیب سے بلاغت کا جوہر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ان بلاغت کے اصولوں کا سرچشمہ فصحاو بلغاء کا کلام ہے۔ چنانچہ قدیم فصحائے عرب کے کلام میں بلاغت کے اصناف و اسالیب کارفرما تھے حالانکہ اس وقت نہ معانی و بیان کا فن وجود میں آیا تھا اور نہ بلاغت کے اصول ترتیب دیئے گئے تھے۔ ان کا ذوق سلیم خود ہی فصیح و غیر فصیح میں امتیاز اور بلاغت اور اس کے مراتب کی تشخیص کر لیتا تھا دور اسلام کے ادیبوں اور انشاء پردازوں نے انہی اسالیب کی روشنی میں فن بلاغت کی تدوین کی اور کلام کے لفظی و معنوی محاسن کے پرکھنے کے پیمانے مقرر کئے۔

عرب کے مختلف علاقوں میں اگرچہ عربی ہی بولی جاتی تھی مگر ہر علاقہ کا تلفظ' طرز ادا اور لب ولہجہ مختلف ہوتا تھا اور ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر معاشرت کی تبدیلی کے ساتھ زبان بھی قدرے بدل جاتی ہے اور تلفظ' اسلوب بیان اور لب و لہجہ میں فرق آ جاتا ہے۔ مگر ہر علاقہ اور خطہ کی زبان مستند معیاری اور فصیح نہیں سمجھی جاتی بلکہ جو لہجہ کی لطافت و شیرینی لفظوں کی سلاست و روانی اور جملوں کی ترکیب و ساخت کے اعتبار سے

سبک و دلآویز ہوتی ہے وہی زبان مستند قرار پاتی ہے۔ چنانچہ عرب میں سات زبانیں رائج تھیں جو قریش ہذیل، ثقیف، ہوازن، کنانہ، تمیم اور یمن کی طرف منسوب تھیں مگر ان تمام لہجوں اور زبانوں میں قریش کی زبان کو معیاری سمجھا جاتا تھا اور انہی کی زبان تمام عرب میں فصیح و بلیغ سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ نزول قرآن کے بعد اپنی صحت و بلند معیاری کی بنا پر جزیرہ نمائے عرب میں عام ہو گئی اور دوسرے لہجے رفتہ رفتہ متروک قرار پا گئے۔ قریش اور عرب کے دوسرے قبائل کے لہجوں میں ذیل کی چند مثالوں سے فرق واضح ہو جاتا ہے۔ قریش مرد سے خطاب کے موقع پر کاف مفتوح اور عورت سے خطاب کے موقع پر کاف مکسور کلمہ کے آخر میں لاتے تھے اور قبیلہ ربیعہ و مضر کاف مفتوح کے آخر میں سین کا اور کاف مکسور کے آخر میں شین کا اضافہ کر دیتے تھے۔ قبیلہ قضاعہ یائے نسبتی کے آخر میں جیم بڑھا دیتا تھا اور مصری کی جگہ مصریج بولتا تھا قبیلہ ازد اور ہذیل عین ساکن کو نون سے بدل دیتے تھے اور اعرابی کی جگہ انرابی کہتے تھے۔ قبیلہ مازن و ربیعہ با کو میم سے اور میم کو با سے تبدیل کر دیتے تھے اور بکر کی جگہ مکر اور مااسمک کی جگہ بااسمک بولتے تھے۔ قبیلہ حمیر الف لام کو الف میم سے بدل دیتا تھا اور السلام کی جگہ امسلام بولتا تھا اور بنی طے بعض الفاظ کا ادھورا تلفظ کرتے تھے مثلاً" السلطان کہنا ہو تو السلطا کہتے۔ ان مثالوں سے قریش کی زبان کے اعلیٰ معیار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ قریش کو اگرچہ تجارت کے سلسلہ میں شام، یمن، حبشہ اور فارس تک جانا پڑتا تھا اور مختلف زبانوں سے مختلف الفاظ سنتے تھے اور حج و طواف کے لئے آنے والے قبائل کی زبانوں سے بھی اجنبی اور نامانوس الفاظ ان کے گوش گزار ہوتے تھے مگر وہ اپنے لہجہ اور زبان کے معیار کو برقرار رکھتے اور الفاظ کی صحت و سلاست اور لہجے کی نفاست کو اجنبی آوازوں سے متاثر نہ ہونے دیتے اور اگر دوسری زبان کی لفظیں استعمال کرنے کی انہیں ضرورت محسوس ہوتی تو وہ اپنے ذوق سلیم اور لب و لہجہ کے مطابق ان کے نوک پلک کی درستی اور اصلاح کر کے استعمال کرتے اور جو الفاظ ثقیل و ناتراشیدہ ہوتے اور ان کے معیار پر پورے نہ اترتے انہیں اپنی زبان پر نہ آنے دیتے اس طرح زبان کی نفاست و رعنائی بھی برقرار رہتی اور الفاظ کا سرمایہ بھی بڑھتا رہتا۔ قریش کو زبان کے نکھارنے میں ان میلوں، ٹھیلوں سے بھی بڑی مدد ملی جو مکہ کے اطراف میں عکاظ، ذوالمجاز اور ذوالمجنہ میں ہوتے تھے۔ ان میلوں میں خرید و فروخت کے علاوہ ادبی و ثقافتی اجتماعات بھی ہوتے تھے اور مختلف قبیلوں کے خطباء و شعراء زبان آوری کے جوہر دکھاتے اور اظہار و ابلاغ کے نئے اسلوب سننے میں آتے۔ ان اجتماعات میں قریش بھی شریک ہوتے اور ادبی محفلوں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے اور اس طرح مکہ میں زبان پرورش پاتی اور پھلتی پھولتی رہی اور جہاں زبان نشو و نما پاتی اور نکھرتی، سنورتی ہے وہیں کی زبان مستند اور معیاری سمجھی جاتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے بھی مکہ کی لسانی برتری کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے آپؑ سے کہا کہ ہم نے آپؑ سے بڑھ کر فصیح اور زبان آور نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔

وما يمنعني وانا مولدي بمكہ۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ میرا مولد مکہ ہے۔

جورج جرداق مسیحی نے تحریر کیا ہے۔

قد نشاء في المحيط الذی تسلم لہ الفطرہ و تصفو۔ (الامام علیؑ) حضرت نے ایک ایسے خطہ میں نشو و نما پائی جس میں طبیعت نکھرتی اور سنورتی ہے۔

اس علم و ادب کی بہار آفریں سرزمین پر نشو و نما پانے کا یہ اثر تو ہونا ہی تھا کہ آپؑ میں زبان و بیان کی وہ تمام خوبیاں موجود ہوں جو اہل زبان کی زبان کا جوہر ہیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے علاوہ آپؑ نے اپنے ذوق اور وجدان سلیم سے ادب کے مزید خدو خال نکھارے اور ایسے اسلوب وضع کئے جن سے بلاغت کی نئی راہیں کھلیں اور زبان و بیان میں ادبی لہریں رواں دواں ہوئیں۔ آپؑ ہی کے زور بیان نے قریش کا ادبی معیار بلند کیا اور بلاغت کے نئے اسلوب ان کے ذہن نشین کئے۔ معاویہ ابن ابی سفیان کا قول ہے کہ۔

واللہ ما سن الفصاحتہ لقریش غیرہ۔ خدا کی قسم قریش کے لئے فصاحت کی راہیں آپؑ ہی نے ہموار کیں۔

آپؑ کی طبیعت میں فصاحت و بلاغت اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ آپؑ کی ہر تقریر مختصر ہو یا طویل' بلاغت کا نادر نمونہ ہوتی تھی اور ہر تحریر ادب کا لافانی پارہ' نہ کبھی تراش خراش کی نوبت آئی اور نہ کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بلکہ جو کہا اجمالا" کہا اور جو لکھا قلم برداشتہ لکھا۔ اس کے باوجود فصاحت کا وہ معیار قائم کیا جو فصحائے عالم کی پرواز سے بلند تر رہا محمد حسن الزیات لکھتے ہیں۔

لا نعلم بعد رسول اللہ فیمن سلف و خلف اقصح من علی۔ (تاریخ الادب العربی) رسول اللہؐ کے بعد اگلے پچھلے لوگوں میں علی علیہ السلام سے فصیح تر کوئی تھا نہ ہے۔

ہر وہ شخص جو اسلوب کلام عرب سے واقف ہو آپؑ کے خطبات و تحریرات پر نظر کرنے کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپؑ کا کلام لفظوں کی شگفتگی' جملوں کی برجستگی' اسلوب کی لطافت اور مقتضائے حال کی رعایت میں مثل و نظیر نہیں رکھتا اور عرب کے بلند پایہ ادیبوں اور انشاپردازوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے حضرتؑ کے خطب و مکاتیب سے استفادہ کرکے تحریر کے اسلوب سیکھے اور آپؑ کے طرز نگارش سے بلاغت کے اصول اخذ کئے۔ علامہ شریف رضی نے تحریر کیا ہے۔

كان امیرالمومنین مشرع الفصاحتہ و موردها و منشاء البلاغہ و مولد ما ومنہ علیہ السلام ظهر مکنونها واخذت قوانینها۔

امیرالمومنین علیہ السلام فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کا مخرج و منبع تھے فصاحت و بلاغت کی چھپی ہوئی باریکیاں آپ ہی سے ظاہر ہوئیں اور آپ ہی سے اس کے اصول و قواعد سیکھے گئے۔

علم بیان

علم بیان وہ علم ہے جس میں معنی مجازی کے استعمال کے مختلف پیرائے اور اسلوب زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ اگرچہ وضع الفاظ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لفظوں کو ان کے حقیقی و وضعی معنی میں استعمال کیا جائے مگر بعض معانی و افکار اتنے دقیق و لطیف ہوتے ہیں کہ الفاظ اپنے وضعی معنی کے ذریعہ انہیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے اس لئے معنی مجازی کا سہارا لینا پڑتا ہے اس سے جہاں دقیق معانی کی نقاب کشائی ہوتی ہے وہاں اظہار بیان میں تفنن و بوقلمونی بھی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے کلام کا حسن اور اس کی تاثیر یہ نکھر جاتی ہے۔ اس علم میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ سے بحث کی جاتی ہے۔

تشبیہ یہ ہے کہ ایک چیز کی کسی صفت کو دوسری چیز کی صفت کے مثل و مانند ظاہر کیا جائے جس کو تشبیہ دی جائے اسے مشبہ جس سے تشبیہ دی جائے اسے مشبہ بہ اور جو وصف مشبہ و مشبہ بہ میں مشترک ہوتا ہے اسے وجہ شبہ اور جس کے ذریعہ مشابہت کا اظہار کیا جاتا ہے اسے حرف تشبیہ کہا جاتا ہے۔

مشبہ اور مشبہ بہ میں سے جو کسی ظاہری حاسہ سے معلوم کیا جا سکے اسے حسی اور جو حاسوں کے بجائے عقل سے جانا جائے اسے عقلی کہا جاتا ہے کبھی دونوں حسی ہوں گے کبھی دونوں عقلی اور کبھی مشبہ عقلی اور مشبہ بہ حسی ہو گا اور کبھی مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی۔ ان کی مثالیں حضرت کے کلام سے درج کی جاتی ہیں۔

(ا) ومخرج عنقہ کلا بریق۔

مور کی گردن کا پھیلاؤ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صراحی۔

مور کی گردن مشبہ اور صراحی مشبہ بہ ہے اور یہ دونوں حسی ہیں۔

(۲) انتقم من الحرص بالقناعہ کما تنتقم من العد و بالقصاص۔

قناعت کے ذریعہ حرص سے اس طرح انتقام لو جس طرح قصاص کے ذریعہ دشمن سے انتقام لیتے ہو۔

قناعت کے ذریعہ حرص کے دبانے کو قصاص کے ذریعہ دشمن کو کچلنے سے تشبیہ دی ہے اور یہ چیزیں عقلی

ہیں۔

(۳) سياتي عليكم زمان يكفاء فيه الاسلام كما يكفاء الاناء بما فيه۔

وہ زمانہ تمہارے سامنے آنے والا ہے جس میں اسلام کو اس طرح اوندھا کر دیا جائے گا جس طرح برتن کو ان چیزوں سمیت جو اس میں ہوں۔

اس میں مشبہ اسلام کی واژگوں کیفیت ہے جو عقلی ہے اور مشبہ بہ وہ برتن ہے جسے اوندھا کر دیا گیا اور وہ حسی ہے۔

(۴) اشهود كغياب۔

کیا تم موجود ہوتے ہوئے غائب ہونے والوں کے مانند ہو۔

یہاں حاضر مشبہ اور غائب مشبہ بہ ہے مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی ہے۔

مشبہ اور مشبہ بہ کے اعتبار سے تشبیہ کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مفرد ہوں اس کی چند صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ دونوں ہر قسم کی تقیید سے آزاد ہوں جیسے حضرتؑ کا ارشاد۔

الكاهن كالساحر۔

کاہن مثل جادوگر کے ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معنی کی تکمیل کے لئے دونوں میں کوئی قید ہو۔ جیسے امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد۔

الولد العاق كالا صبع الزائد ان تركت شانت وان قطعت اطت۔

نافرمان بیٹا زائد انگلی کے مانند ہے اگر اسے رہنے دیا جائے تو بدزیب معلوم ہوتی ہے اور کاٹا جائے تو تکلیف دیتی ہے۔

اس جملہ میں فرزند کے ساتھ عاق کی اور انگلی کے ساتھ زائد کی قید لگی ہوئی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مشبہ آزاد ہو اور مشبہ بہ مقید ہو جیسے حضرتؑ کا ارشاد۔

مادوا كما يميد الشجر يوم الريح العاصف۔

وہ اس طرح کانپتے رہتے تھے جس طرح تیز جھکڑ والے دن درخت تھرتھراتے ہیں۔

خوف سے کانپنا مشبہ اور درخت کا ہلنا مشبہ بہ ہے جس کے ساتھ طوفانی ہوا کی قید ہے۔

(۲) مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب ہوں جیسے حضرت[ع] کا یہ قول۔

کثرۃ الآراء مفسدہ کالقدر لا تطیب اذا کثر طباخولھا۔

رایوں کی کثرت اس ہنڈیا کے مانند ہے جس کے پکانے میں بہتوں کا ہاتھ ہو نہ وہ رائیں خرابی سے بچتی ہیں اور نہ ہنڈیا خوش ذائقہ ہوتی ہے۔

اس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کی ہیئت مرکب ہے۔

(۳)۔ مشبہ اور مشبہ بہ میں سے ایک مفرد ہو اور ایک مرکب جیسے مور کی تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا۔

فھو کفصوص ذات الوان نطقت بالعجین المکل۔

وہ رنگ برنگ کے ان نگینوں کی طرح ہے جو مرصع بجواہر چاندی میں دائروں کی صورت میں پھیلا دئے گئے ہوں۔

اس میں مشبہ مفرد اور مشبہ بہ مرکب ہے۔

تشبیہ کی ایک تقسیم یہ ہے کہ مشبہ متعدد اور مشبہ بہ ایک ہو یا مشبہ ایک اور مشبہ بہ متعدد ہوں جیسے حضرت[ع] کا یہ ارشاد۔

المصطنع انی اللیکم کمن طوق الخنزیر تبرا و قرط العکب در او البس الحمار و شیا والقم الافعی شھدا

کسی دنی و ذلیل سے نیکی کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے خنزیر کی گردن میں سونے کا ہار ڈالنے والا یا کتے کے کانوں میں موتی لٹکانے والا یا گدھے کو بیل بوٹے دار لباس پہنانے والا یا سانپ کو شہد چٹانے والا۔

اس میں مشبہ ایک اور مشبہ بہ چار ہیں۔

وجہ شبہہ یعنی وصف مشترک کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) وہ وصف مشبہ و مشبہ بہ میں واقعاً" ثابت ہو جیسے۔

وایم اللہ لتجد ن بنی امیہ لکم ارباب سوء بعدی کالناب الضرد س۔ خدا کی قسم میرے بعد تم بنی امیہ کو اپنے لئے بدترین حکمران پاؤ گے وہ ایک بوڑھی اور سرکش اونٹنی کے مانند ہیں۔

اس میں بنی امیہ کو کاٹنے والی بوڑھی ناقہ سے تشبیہ دی ہے اور وجہ شبہ منہ زوری و تند خوئی ہے اور یہ صفت دونوں میں واقعاً" پائی جاتی تھی۔

(۲) وہ وصف مشترک مشبہ و مشبہ بہ دونوں میں یا ایک میں فرض کر لیا گیا ہو جیسے۔

فتن کقطع اللیل المظلم۔ وہ ایسے فتنے ہوں گے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے۔

اس میں فتنے مشبہ اور تاریک رات مشبہ بہ ہے اور وجہ شبہ تاریکی ہے جو مشبہ میں فرض کر لی گئی ہے

حرف تشبیہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں موکد اور مرسل۔

تشبیہ موکد کی ایک صورت یہ ہے کہ حرف تشبیہ محذوف ہو جیسے۔

لاضطربتم اضطراب الا رشیتہ فی الطوی البعیدہ۔ تم اس طرح پیچ و تاب کھانے لگے جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور تھرتھراتی ہیں۔

اس میں لوگوں کی بے چینی کو کنوئیں میں رسیوں کے لڑکھڑانے سے تشبیہ دی ہے اور حرف تشبیہ محذوف ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ حرف تشبیہ کو حذف کر کے مشبہ بہ کو مشبہ کی طرف مضاف کر دیا جائے جیسے۔

ومصابیح کو اکبھا۔ چراغوں کی طرح چمکتے ہوئے ستارے آویزاں کئے۔

ستارے مشبہ اور چراغ مشبہ بہ جو مشبہ کی طرف مضاف ہیں۔

تشبیہ مرسل یہ ہے کہ حرف تشبیہ مذکور ہو جیسے۔

انداعی بلاعمل کالرامی بلا وتر۔ جو عمل نہیں کرتا اور دعا مانگتا ہے وہ ایسا ہے جیسے بغیر چلہ کمان کے تیر چلانے والا۔

استعارہ یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس کے اصل معنی کے بجائے کسی اور معنی میں استعمال کیا جائے جبکہ ان

دونوں معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔ تشبیہ اور استعارہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ و مشبہ بہ دونوں کا ذکر ہوتا ہے مگر استعارہ میں مشبہ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ مشبہ بہ کا ذکر کر کے اس سے مشبہ مراد لیا جاتا ہے اس میں مشبہ کو مستعارلہ مشبہ بہ کو مستعار منہ اور وجہ شبہ کو وجہ جامع کہا جاتا ہے۔ مستعارلہ، مستعار منہ اور وجہ جامع کے اعتبار سے استعارہ کی چھ قسمیں ہیں۔ یہ اقسام اور ان کے امثلہ حضرتؑ کے کلام سے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) مستعارلہ، مستعار منہ اور وجہ جامع سب حسی ہوں جیسے۔

فاجری فیها سراجا مستطیرا۔ ان میں ضوپاش چراغ رواں کیا۔

اس میں سورج مستعارلہ، چراغ مستعار منہ اور روشنی و ضیاء وجہ جامع ہے اور یہ سب حسی ہیں۔

(۲) طرفین استعارہ حسی ہوں اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے۔

احتجوا بالشجرة واضاعوا الثمرة۔ انہوں نے شجرہ ایک ہونے سے تو استدلال کیا لیکن اس کے پھلوں کو ضائع و برباد کردیا۔

اس میں مستعارلہ آپؑ کی ذات اور مستعار منہ ثمر ہے اور وجہ جامع تعلق اور لگاؤ ہے یعنی جس طرح ثمر کو شجر سے لگاؤ ہوتا ہے اسی طرح آپ کو پیغمبر اکرمؐ سے تعلق اور لگاؤ تھا اس میں طرفین استعارہ حسی اور وجہ جامع عقلی ہے۔

(۳) طرفین استعارہ عقلی ہوں اور وجہ جامع بھی عقلی ہو جیسے۔

وفی ضیق المضجع وحیدا۔ اسے خوابگاہ کے ایک تنگ گوشہ میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔

اس میں قبر کو خوابگاہ سے تعبیر کر کے خواب سے موت کا استعارہ کیا ہے۔ موت مستعارلہ اور خواب مستعار منہ اور وجہ جامع بے حسی و بے حرکتی ہے اور یہ سب چیزیں عقلی ہیں۔

(۴) مستعارلہ عقلی اور مستعار منہ حسی اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے۔

ظفقت ارتای بین ان اصول بید جذاء۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں۔

اس میں دست شکستہ ہونا مستعار منہ ہے جو حسی ہے اور بے یارو مددگار ہونا مستعارلہ اور کمزوری و ناتوانی وجہ جامع ہے اور یہ دونوں عقلی ہیں۔

(۵) مستعارلہ حسی اور مستعار منہ اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے۔

وردت من نخوة باوه واعتلائه و شموخ انفه و سمو غلوائه۔ اس کے اٹھلانے اور سر اٹھانے کے غرور اور تکبر سے ناک اوپر چڑھانے اور بہاؤ میں تفوق و سربلندی دکھانے کا خاتمہ کر دیا۔

اس میں مستعارلہ موجوں کی طغیانی ہے جو حسی ہے اور مستعارمنہ فخرو سربلندی ہے اور وجہ جامع تکبرو ترفع ہے اور یہ دونوں عقلی ہیں۔

(۶) مستعارلہ اور مستعارمنہ دونوں حسی ہوں اور وجہ جامع مرکب ہو یعنی ایک پہلو سے حسی اور ایک پہلو سے عقلی ہو جیسا کہ آل محمد علیہم السلام کے بارے میں حضرتؑ کا یہ ارشاد۔

اذا خوی نجم طلع نجم۔ جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو دوسرا ستارہ ابھر آتا ہے۔

اس میں آل محمد علیہم السلام مستعارلہ اور ستارہ مستعارمنہ ہے اور یہ دونوں حسی ہیں اور وجہ جامع منظر کی دلکشی اور مرتبہ کی بلندی ہے۔ حسن منظر حسی اور بلندیٔ مرتبت عقلی ہے۔

مستعارلہ اور مستعارمنہ کے اعتبار سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں وفاقیہ اور عنادیہ

استعارہ وفاقیہ وہ ہے جس میں مستعارلہ اور مستعارمنہ کا ایک شے میں اجتماع ممکن ہو جیسے۔

البصیر منها ستزود و الاعمی لها ستزود۔ بابصیرت اس دنیا سے آخرت کے لئے زاد حاصل کرتا ہے اور بے بصیرت اسی کے سروسامان میں لگا رہتا ہے۔

اس میں لفظ بصیر سے عاقل کا اور لفظ اعمی سے جاہل کا استعارہ کیا ہے اور بصارت و عقل کا اجتماع ممکن ہے اس طرح کہ ایک شخص دیکھ بھی سکتا ہو اور عقل بھی رکھتا ہو اسی طرح اندھے پن اور جہل کا اجتماع ممکن ہے اس طرح کہ ایک شخص اندھا بھی ہو اور جاہل بھی ہو۔

استعارہ عنادیہ وہ ہے جس میں مستعارلہ اور مستعارمنہ کا اجتماع ناممکن ہو جیسے۔

فذلک میت الاحیاء۔ وہ تو زندوں میں (چلتی پھرتی ہوئی) لاش ہے۔

اس میں زندہ کو مردہ سے استعارہ کیا ہے اور موت و حیات کا اجتماع ناممکن ہے۔

وجہ جامع کے اعتبار سے استعارہ کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ وجہ جامع، مستعارلہ اور مستعارمنہ کے معنی کا جزو ہو جیسے۔

ان شرار الناس طائرون الیک باقاویل السوء۔

شریر لوگ بری باتیں تم تک پہنچانے کے لئے اڑ کر پہنچا کریں گے۔

یہاں دوڑنا مستعارلہ اور اڑنا مستعارمنہ ہے اور وجہ جامع قطع مسافت ہے جو دونوں کے مفہوم میں داخل ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ وجہ جامع' مستعارلہ اور مستعارمنہ کے مفہوم سے خارج ہو جیسے اشعث ابن قیس کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد۔

حائک ابن حائک۔

جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

اس میں مستعارلہ مرد احمق اور مستعارمنہ حائک ہے اور وجہ جامع حماقت ہے جو دونوں کے مفہوم سے خارج ہے اس لئے کہ حائک موضوع ہے اس کے لئے جس کا پیشہ کپڑا بننا ہو اور مرد موضوع ہے مذکر کے لئے اور حماقت دونوں کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ وجہ جامع ظاہر و واضح ہو اور اس کے سمجھنے میں غور و فکر کی احتیاج نہ ہو جیسے۔

وایم اللہ لا فرطن لھم حوضا انا ماتحہ۔

خدا کی قسم میں ان کے لئے ایک ایسا حوض چھلکاؤں گا جس کا پانی نکالنے والا میں ہوں۔

اس میں لشکر کی جمع آوری کا استعارہ حوض کے چھلکانے سے کیا ہے اور وجہ جامع سمیٹنا اور یکجا کرنا ہے اور ابتدائے نظر میں اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ وجہ جامع کو غور و فکر کے بغیر سمجھا نہ جا سکے جیسے۔

لو وھب ما تنفست عنہ معادن الجبال۔

وہ چیزیں جنہیں باہر نکالنے کے لئے پہاڑوں کے معدن سانسیں لیتے ہیں بخش دے۔

یہاں کانوں سے سونا چاندی کے نکلنے کا پہاڑوں کے سانس لینے سے استعارہ کیا ہے اس میں وجہ جامع وہ حرکت ہے جو کسی شے کو اندر سے باہر نکالنے میں ہوتی ہے یہ استعارہ سطحی نظر میں سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غور و فکر کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

استعارہ میں وجہ جامع کبھی مفرد ہوتی ہے جیسے۔

تد فی الارض قدمک۔ اپنے قدم زمین میں گاڑ دینا۔

اس میں مضبوطی سے قدم جمانے کا استعارہ قدموں کے گاڑنے سے کیا ہے اور وجہ جامع ثبات و استقرار ہے جو امر واحد ہے۔

اور کبھی وجہ جامع چند چیزوں کی مجموعی ہیئت سے متخرج ہوتی ہے جیسے۔

فان الشیطان کامن فی کسرہ للوثبتہ ید ا و اخر للنکوص رجلا۔ شیطان اسی کے ایک گوشہ میں چھپا بیٹھا ہے جس نے ایک طرف تو حملے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہوا ہے اور دوسری طرف بھاگنے کے لئے قدم پیچھے ہٹا رکھا ہے۔

اس میں امیر شام یا عمرو ابن عاص کی متردانہ کیفیت کو اس شخص کی متذبذبانہ حالت سے تشبیہ دی ہے جو کسی کام کے کرنے میں متردد ہو اور کبھی آگے بڑھتا ہو اور کبھی قدم پیچھے ہٹاتا ہو۔

ان اقسام کے علاوہ استعارہ کی تین قسمیں اور ہیں مطلقہ، مجردہ اور مرشحہ

استعارہ مطلقہ یہ ہے کہ اس میں نہ مستعارلہ کے مناسبات مذکور ہوں اور نہ مستعارمنہ کہ جیسے۔

حائک ابن حائک۔ جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

اس میں مرد احمق مستعارلہ اور حائک مستعارمنہ ہے اور ان دونوں کے مناسب کوئی لفظ نہیں ہے۔

استعارہ مجردہ یہ ہے کہ اس میں مستعارلہ کے مناسبات مذکور ہوں جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد۔

ارسلہ بالدین المشھور والعلم الماثور۔ انہیں شہرت یافتہ دین منقول شدہ نشان کے ساتھ بھیجا۔

اس میں شرع مستعارلہ اور علم (پہاڑ) مستعارمنہ ہے اور لفظ ماثور (منقول) شرع کے مناسبات سے ہے

استعارہ مرشحہ یہ ہے کہ اس میں مستعارمنہ کے لوازم و مناسبات مذکور ہوں جیسے۔

ان بنی تمیم لم یغب لھم نجم الا طلع لھم نجم آخر۔ بنی تمیم تو وہ ہیں کہ جب بھی ان کا کوئی ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا ابھر آتا ہے

اس میں قبیلہ بنی تمیم کے سرداروں کو ستاروں سے استعارہ کیا ہے۔ ستارہ مستعارمنہ ہے اور طلوع و غروب

اس کے مناسبات سے ہے۔

استعارہ کی ایک قسم استعارہ بالکنایہ ہے اس میں مستعارلہ (مشبہ) مذکور اور مستعارمنہ (مشبہ بہ) محذوف ہوتا ہے اور مشبہ بہ کے بعض لوازم مشبہ کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں جیسے۔

وعضت الفتنہ ابناء ھا بانیا بھا۔
فتنوں نے اپنے دانتوں سے دنیا والوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔

اس میں فتنہ کو درندہ جانور سے تشبیہ دی ہے جو محذوف ہے اور مشبہ کو مشبہ بہ کی جنس میں سے قرار دے کر مشبہ بہ کا لازمہ یعنی دانتوں سے کاٹنا مشبہ کے لئے ثابت کیا ہے۔

مجاز مرسل یہ ہے کہ لفظ کو غیر وضعی معنی میں استعمال کیا جائے اور معنی وضعی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور علاقہ پایا جائے اس لئے کہ اگر تشبیہ کا علاقہ ہو گا تو وہ استعارہ ہو گا اور کوئی علاقہ نہ ہو گا تو لفظ کا غیر وضعی معنی میں استعمال غلط ہو گا یہ علاقے کئی طرح کے ہوتے ہیں ان میں سے چند علاقے حضرتؑ کے کلمات سے درج کئے جاتے ہیں۔

لفظ کل کے لئے وضع ہو اور اس سے جز مراد لیا جائے جیسے۔

لاتخاصمھم بالقرآن۔
تم ان سے قرآن کی رو سے بحث نہ کرنا۔

لفظ قرآن تمام آیات کے مجموعہ کے لئے وضع ہے اور یہاں وہ آیات مراد ہیں جن سے اثبات مدعا کیا جا سکتا ہے۔

لفظ جز کے لئے وضع ہو اور اس سے کل مراد لیں جیسے۔

ووحدتہ الشفاہ۔
ہونٹ اس کی یکتائی کا اقرار کرتے ہیں۔

یہاں ہونٹ سے مراد منہ ہے اور ہونٹ منہ کا ایک جز ہے۔

سبب سے مسبب مراد لیں جیسے۔

اجھز علیہ عملہ و کبت بہ بطنتہ۔
اس کی بداعمالیوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور شکم پری نے اسے منہ کے بل گرایا۔

ہلاکت کی نسبت بدعملی و شکم پری کی طرف دی ہے اور یہ دونوں ہلاکت کا سبب ہیں۔

محل و ظرف بول کر وہ چیز مراد لیں جو اس میں واقع ہے جیسے۔

حتی اسهرت لیالیهم واظماء ت هواجرهم۔ یہاں تک کہ ان کی راتیں جاگتی رہیں اور تپتی ہوئی دوپہریں پیاسی رہیں۔

اس میں بیداری کی نسبت راتوں کی طرف اور پیاس کی نسبت دوپہروں کی طرف دی ہے اس لئے کہ یہ بیداری راتوں میں ہوئی اور پیاس گرم دنوں میں جھیلی گئی۔

کسی چیز کے واسطہ کا ذکر کریں اور اس سے وہ چیز مراد لیں جس کا وہ واسطہ ہے جیسے۔

لم یدفعوا عنه بلسان۔ زبان سے اس کی روک تھام نہ کی۔

زبان اصل وضع کے اعتبار سے آلہ گویائی کا نام ہے اور یہاں حرف و سخن مراد ہے جو زبان کے واسطہ سے گوش گزار ہوتی ہے۔

کنایہ یہ ہے کہ کسی لفظ سے اس کے لازم معنی مراد لئے جائیں۔ کنایہ اور مجاز میں فرق یہ ہے کہ کنایہ میں حقیقی معنی کے خلاف قرینہ نہیں ہوتا اس لئے حقیقی معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں اور مجاز میں حقیقی معنی مراد نہیں لئے جا سکتے کیونکہ اس میں حقیقی معنی کے خلاف قرینہ قائم ہوتا ہے۔ کنایہ کی مثال یہ ہے۔

وثقلت فی الارض وطاته۔ زمین میں اس کی پامالیاں سخت سے سخت ہو گئیں۔

زمین کی پامالی کنایہ ہے ظلم و جور سے لیکن حقیقی معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

کنایہ کی چار قسمیں ہیں تعریض، تلویح، رمز اور ایماؤ اشارہ۔

تعریض یہ ہے کہ کنایہ میں موصوف مذکور نہ ہو لیکن ایسا قرینہ موجود ہو جس سے وہ واضح طور پر سمجھ میں آجائے جیسے۔

دلیلها کمیث الکلام بطئی القیام سریع اذا قام۔ اس پرچم کی طرف رہنمائی کرنے والا وہ ہے جو بات کہنے میں جلد بازی نہیں کرتا اور نہ اقدام میں تاخیر کرتا ہے اور جب کسی امر کو لے کر کھڑا ہو جائے تو پھر تیز گام ہے۔

اگرچہ ان صفات کے موصوف کا صراحتہً ذکر نہیں ہے مگر محل و مقام سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرتؑ نے اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تلویح یہ ہے کہ لازم سے ملزوم تک کثرت سے وسائط ہوں جیسے۔

لود معاویہ انہ مابقی من بنی ھاشم نافخ ضرمتہ الاطعن فی نیط۔ معاویہ تو یہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم میں سے کوئی آگ میں پھونکنے والا نہ رہے مگر یہ کہ اس کے دل کی رگوں کو نیزہ کا نشانہ بنا دیا جائے۔

یہ کنایہ ہے بنی ہاشم کے مکمل خاتمہ سے اس طرح کہ جب کوئی آگ میں پھونکنے والا نہ رہے گا تو آگ کے جلنے کی نوبت نہ آئے گی اور آگ جلنے کی نوبت اس لئے نہیں آئے گی کہ کوئی باقی رہا ہی نہیں کہ آگ جلائے اور کھانا پکائے۔ اس میں ملزوم تک متعدد وسائط ہیں۔

رمزیہ ہے کہ اس میں وسائط زیادہ نہ ہوں مگر تھوڑی بہت پوشیدگی ہو جیسے۔

ھذا الشخص المعکوس والجسم المرکوس۔ یہ ٹیڑھا ڈھانچہ اور اوندھا جسم۔

یہ معاویہ کی بے راہروی سے کنایہ ہے اس طرح کہ راست قامت ہونا انسان کا اور سرا فگندہ ہونا حیوان کا وصف ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں راست رو کو راست قامت اور کج رو کو سرنگوں ہو کر چلنے والا کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

افمن یمشی کمبا علی وجھہ اھدی امن یمشی سویا علی صراط مستقیم۔ کیا وہ شخص زیادہ ہدایت یافتہ ہو گا جو اپنے منہ کے بھل چلے یا وہ شخص جو برابر سیدھے راستے پر چل رہا ہو۔

اس آیت کے پیش نظر راست قامتی کے لئے ہدایت اور سرا فگندگی کے لئے ضلالت کو لازم قرار دیتے ہوئے جسم کی کجی سے عقیدہ کی بے راہروی کی طرف اشارہ فرمایا ہے

ایماء و اشارہ یہ ہے کہ نہ متعدد واسطے ہوں اور نہ کوئی پوشیدگی ہو جیسے۔

نافجا حضنیہ بین نثیلہ و معتلفہ۔ وہ پیٹ پھلائے سرگین اور چارے کے درمیان کھڑا ہوا۔

یہ اشارہ ہے شکم پری اور بسیار خوری کی طرف اور اس میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے۔

علم بدیع

بدیع وہ علم ہے جس میں ان امور کو بیان کیا جاتا ہے جو کلام میں حسن و دلاویزی پیدا کرتے ہیں۔ یہ حسن اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب کلام بلاغت کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ اگر بلاغت کے جوہر سے عاری ہوگا تو ان چیزوں سے حسن پیدا نہ ہوگا بلکہ اس کی مثال اس بوسیدہ عمارت کی سی ہوگی جس پر مینا کاری کی گئی ہو یا اس کریہہ و بدصورت کی سی ہوگی جسے سامان زیبائش سے نظر فریب بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ حسن و خوبی الفاظ میں بھی ہوتی ہے اور معنی میں بھی۔ اس لئے اس کی دو قسمیں ہوں گی، معنوی اور لفظی، معنوی خوبیوں کو بدائع معنویہ کہا جاتا ہے۔ اور لفظی خوبیوں کو صنائع لفظیہ۔ بعض اوقات پوری توجہ صنائع پر مرکوز کر دی جاتی ہے اور اس کثرت سے ان کو برتا جاتا ہے کہ مقصد و مدعا صنعتوں کے انبوہ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اس سے کلام میں حسن تو کیا پیدا ہوگا معانی کا سرشتہ بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔

من اشتغل بتفقد اللفظته و طلب السجعة نسي الحجة۔ جو شخص لفظ کی فکر اور سجع کی تلاش میں کھو جاتا ہے وہ دلیل و برہان بھول جاتا ہے۔

حضرتؑ کے کلام میں جہاں معانی و مطالب کی گہرائیاں اور حسن بیان کی نادرہ کاریاں اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہیں وہاں موقع و محل پر لفظی و معنوی صنائع بھی کار فرما ہیں اور یہ صنائع اس برجستگی سے استعمال ہوئے ہیں کہ نہ آورد کا شائبہ ہے اور نہ تکلف کی جھلک۔ ذیل میں صنائع کی یہ دونوں قسمیں اور ان کے امثلہ حضرت کے کلام سے تحریر کئے جاتے ہیں۔ صنائع معنویہ ہیں۔

طباق

صنعت طباق یہ ہے کہ کلام میں دو ایسے لفظ یکجا کئے جائیں جو متضاد و مخالف ہوں خواہ دونوں اسم ہوں۔ جیسے:

الصادق علی شرف منجاة و کرامة راست گفتار نجات اور بزرگی کی بلندیوں پر ہے۔

و الکاذب علی شفا مهواة و مهانة اور دروغ گو پستی و ذلت کے کنارے پر ہے۔

اس میں صادق اور کاذب متضاد ہیں اور کرامت اور مہانت میں تضاد ہے اور یہ سب اسم ہیں خواہ دونوں فعل ہوں، جیسے

یعیشون جھا لا ویموتون ضلالا وہ زندہ رہے تو جاہل اور مر گئے تو گمراہ

اس میں یعیشون اور یموتون میں تضاد ہے اور یہ دونوں فعل ہیں۔

خواہ ایک اسم اور ایک فعل ہو جیسے:

قد امرفیھا ما کان حلوا دنیا کے شیریں (مزے) تلخ اور صاف و شفاف (لمحے)
و کدر ما کان صفوا مکدر ہو گئے۔

اس میں امر اور حلوا میں کدر اور صفوا میں تضاد ہے۔ امر اور کدر فعل اور حلوا اور صفوا دونوں اسم ہیں۔ خواہ دونوں حرف ہوں جیسے:

ما یدریک ما علی مما لی تجھے کیا معلوم کہ کونسی چیز میرے حق میں ہے اور کونسی چیز میرے خلاف۔

علی ضرر کے لئے اور لام انتفاع کے لئے ہوتا ہے اور ضرر و انتفاع میں تضاد ہے۔

کبھی دو لفظوں میں حقیقی معنی کے اعتبار سے تضاد ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے اور کبھی حقیقی معنی کے اعتبار سے بھی تضاد ہوتا ہے۔ اور مجازی معنی کے اعتبار سے بھی جیسے۔

فالبصرے منھا شاخص والاعمی الیھا شاخص دیکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے۔

اس میں بصیر اور اعمی میں اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے بھی تضاد ہے اور مجازی معنی کے اعتبار سے بھی۔ اس طرح کہ بصیر کے مجازی معنی عالم و دانا کے ہیں اور عمیٰ کے معنی جاہل و بے خبر کے ہیں اور علم و جہل میں تضاد ہے۔

اثبات و نفی کے اعتبار سے طباق کی دو قسمیں ہیں ایجابی اور سلبی' طباق ایجابی وہ ہے جس میں حرف نفی نہ ہو۔ مذکورہ بالا مثالیں اسی طباق ایجابی کی ہیں اور طباق سلبی وہ ہے جس میں ایک مصدر کے دو فعل اس طرح ذکر کئے جائیں کہ ایک مثبت ہو اور ایک منفی جیسے:

و تغزون ولا تغزون۔ وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو۔

یا ایک امر ہو اور ایک نہی جیسے:۔

فکونو امن ابناء الاخرۃ ولا تکونوا من ابناء الدنیا۔ تم فرزندان آخرت بنو ابناء دنیا نہ بنو۔

کبھی تضاد کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو متقابل لفظوں میں سے ایک دوسرے لفظ کے متضاد باہیں معنی ہوتا ہے۔

کہ وہ معنی متضاد کا سبب ہے جیسے:

فالھدی خامل والعمی شامل۔ ہدایت گمنام اور کور چشمی ہمہ گیر تھی

اس میں ہدایت اور اندھے پن میں اگرچہ تضاد نہیں ہے مگر یہ اندھا پن گمراہی کا سبب ہے اور ہدایت و گمراہی میں تضاد ہے۔

یا تضاد کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ایک لفظ دوسرے لفظ کے متضاد معنی سے لزوم کا تعلق رکھتا ہے جیسے۔

فانہ واللّٰہ الجد لا اللعب والحق لا الکذب۔ خدا کی قسم وہ چیز سراسر حقیقت ہے ہنسی کھیل نہیں اور سر تا پا حق ہے جھوٹ نہیں۔

حق و کذب متقابل الفاظ نہیں ہیں بلکہ صدق و کذب متقابل ہیں مگر چوں کہ حق صدق کے لئے لازم ہے اس لئے لازم معنی کے اعتبار سے حق و کذب میں تضاد ہوگا۔ یہ تضاد و طباق خفی کے نام سے موسوم ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ لفظی اعتبار سے تضاد نہ ہو بلکہ معنوی اعتبار سے تضاد ہو جیسے۔

من سقف فوقھم مرفوع و مھاد تحتھم موضوع۔ ان کے سروں پر بام بلند اور ان کے نیچے بچھا ہوا گہوارہ۔

اس میں بام اور گہوارہ میں اگرچہ لفظی اعتبار سے تضاد نہیں ہے مگر چوں کہ چھت اوپر ہوتی ہے اور گہوارہ نیچے اور فوق و تحت متضاد ہیں لہٰذا معنوی اعتبار سے ان میں تضاد ہوگا۔

مقابلہ وہ صنعت ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ متوافق الفاظ لائے جائیں اور پھر علی الترتیب ان کے متضاد الفاظ ذکر کئے جائیں جیسے:

لعن اللّٰہ الامرین بالمعروف التارکین لہ و الناھین عن المنکر العاملین بہ۔ خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو اوروں کو بھلائی کا حکم دیں اور خود اسے چھوڑ بیٹھیں اور دوسروں کو بری باتوں سے روکیں اور خود ان پر عمل کرتے رہیں۔

اس میں امر، معروف اور ترک کے مقابلہ میں نہی، منکر اور عمل کے الفاظ ہیں۔

مراعاۃ النظیر یہ ہے کہ کلام میں چند متناسب چیزیں جمع کر دی جائیں جیسے:

الحمد للّٰہ غیر مقنوط من رحمتہ ولا مخلومن نعمتہ ولا مایوس من مغفرتہ۔ تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس کی رحمت سے نا امیدی نہیں اور جس کی نعمتوں سے کسی کا دامن خالی نہیں اور نہ اس کی مغفرت سے کوئی مایوس ہے۔

اس میں رحمت اور نعمت اور مغفرت متناسب الفاظ ہیں۔

صنعت تسبیغ یہ ہے کہ پہلے جملہ کی آخری لفظ سے دوسرے جملہ کی ابتداء کی جائے جیسے۔

الحمد للہ الواصل الحمد بالنعم والنعم بالشکر۔ تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو حمد کا پیوند نعمتوں سے اور نعمتوں کا سلسلہ شکر سے ملانے والا ہے۔

صنعت عکس یہ ہے کہ پہلے ایک چیز کو کسی پر مقدم کریں اور پھر اسے بدل کر مؤخر کر دیں جیسے:

فبالایمان یستدل علی الصالحات و بالصالحات یستدل علی الایمان. ایمان سے نیکیوں پر استدلال کیا جاتا ہے اور نیکیوں سے ایمان پر دلیل لائی جاتی ہے۔

صنعت رجوع یہ ہے کہ پہلے ایک بات کہی جائے اور پھر کسی خاص نکتہ کے پیش نظر سے اس کی تردید کر کے دوسری بات کہی جائے جیسے:

کانھم لم یسمعوا اللہ یقول تلک الدار الاخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض و لا فسادا و العاقبۃ للمتقین بلی و اللہ لقد سمعوھا و وعوھا یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو دنیا میں نہ بلندی چاہتے ہیں اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اور اچھا انجام پرہیز گاروں کے لئے ہے ہاں ہاں خدا کی قسم ان لوگوں نے اس آیت کو سنا تھا اور یاد کیا تھا۔

پہلے تو یہ فرمایا کہ فتنہ انگیز لوگوں نے اس آیت کو سنا نہ تھا اور پھر یہ کہہ کر کہ انہوں نے سنا تھا پہلی بات سے رجوع کیا۔ اس بنا پر کہ سننے کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ حشر انگیز و فتنہ پردازی سے باز رہتے اور جب وہ باز نہ رہے تو گویا انہوں نے سنا ہی نہ تھا اور اس طرح انہیں تنبیہ و سرزنش کی کہ انہوں نے سننے کے باوجود اس سے قطعا" کوئی فائدہ حاصل نہ کیا۔

صنعت ارصادیہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو پہلے جملہ کے آخر میں فلاں لفظ ہے تو دوسرے فقرہ کے آخری لفظ کی طرف فورا" ذہن منتقل ہو جائے جیسے:

ھبو طھا و صعودھا و نحوسھا و سعودھا۔ کبھی اتار ہو کبھی ابھار اور کسی میں نحوست ہو اور کسی میں سعادت

صنعت جمع یہ ہے کہ چند مختلف اشیاء کو ایک حکم کے تحت جمع کر دیا جائے جیسے:

ان امال و البنین حرث الدنیا مال اور اولاد دنیا کی کھیتی ہے۔

اس میں مال اور اولاد کو جو دو الگ الگ چیزیں ہیں دنیا کی کھیتی قرار دیا ہے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں دنیا ہی میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں اور آخرت میں کام نہ آئیں گی۔

صنعت تفریق یہ ہے کہ ایک ہی طرح کی دو چیزوں میں فرق ظاہر کیا جائے جیسے۔

غیرۃ المراۃ کفر و غیرۃ الرجال ایمان عورت کی غیرت کفر اور مرد کی غیرت ایمان ہے۔

اس میں مرد و عورت کی غیرت میں تفریق کی گئی ہے ایک کی غیرت کو ایمان کہا گیا ہے۔

صنعت تقسیم یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو بیان کیا جائے پھر ہر چیز کا تعین کرکے اس کے مناسب حال چیز کا ذکر کیا جائے جیسے:

کل نفس منھا سائق و شھید سائق یسوقھا الی محشرھا و شاہد یشھد علیھا بعملھا۔

ہر نفس کے ساتھ ایک ہنکانے والا ہوتا ہے اور ایک شہادت دینے والا۔ ہنکانے والا اسے میدان حشر تک ہنکا لے کر جائے گا اور گواہ اس کے عملوں کی شہادت دے گا۔

پہلے سائق اور شہید کا ذکر ہے اور پھر ہر ایک کا تعین کرکے اس کے مناسب حال چیز کا ذکر فرمایا ہے۔ صنعت جمع و تفریق یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک حکم میں جمع کیا جائے اور پھر ان میں تفریق پیدا کی جائے جیسے۔

حتی یقوم الباکیان باک یبکی للدینہ و باک یبکی لدنیاہ

یہاں تک کہ دو قسم کے رونے والے کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک دین کے لئے رونے والا اور ایک دنیا کے لئے۔

پہلے دو شخصوں کو گریہ و بکا کے عمل میں شریک کیا ہے اور پھر ایک کو دین کے لئے اور ایک کو دنیا کے لئے رونے والا قرار دے کر ان میں تفریق کی ہے۔

صنعت جمع و تقسیم یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک حکم کے تحت جمع کیا جائے اور پھر ہر ایک کا الگ الگ حکم بیان کیا جائے جیسے۔

شغل من الجنة و النار امامه ساع سريع نجا و طالب بطيرجا و مقصر فی النار هوی۔

جس کے پیش نظر جنت و دوزخ ہو اس کی نظر کسی اور طرف نہیں اٹھ سکتی جو تیز قدم دوڑنے والا ہے وہ نجات یافتہ ہے اور جو طلب گار ہو مگر ست رفتار اسے بھی توقع ہو سکتی ہے مگر جو ارادة" کوتاہی کرنے والا ہو اسے دوزخ میں گرنا ہے۔

پہلے ان لوگوں کو جن کے پیش نظر انجام کار ہے ایک حکم کے تحت جمع کیا ہے اور پھر انہیں تین قسموں میں تقسیم کیا ہے تیز رو ست قدم اور بے عمل

صنعت جمع و تقسیم یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک حکم کے تحت جمع کیا جائے' پھر ان میں تفریق کی جائے پھر ہر ایک کے مناسب حال چیز کا ذکر کیا جائے جیسے۔

فجعلهم فريقين انعم على هولاء و انتقم من هو لاء فاما اهل الطاعة فاثابهم فی جواره و خلدهم فی داره و اما اهل المعصية فانزلهم شر دار۔

انہیں دو گروہوں میں بانٹ دے گا۔ ایک کو وہ انعام و اکرام دے گا اور ایک سے انتقام لے گا۔ جو فرمانبردار تھے انہیں جزا دے گا کہ وہ اس کے جوار رحمت میں رہیں اور اپنے گھر میں انہیں ہمیشہ کے لئے ٹھہرا دے گا اور جو نافرمان ہوں گے انہیں ایک برے گھر میں اتار دے گا۔

پہلے لوگوں کو حکم موت کے تحت جمع کیا پھر ان میں تفریق کی بعض کو انعام یافتہ اور بعض کو قابل تعزیر قرار دیا پھر ان میں سے ہر ایک کے مناسب حال چیز کا ذکر فرمایا۔

صنعت و افتنان یہ ہے کہ کلام میں مداح و ہجو تہنیت و تعزیت وغیرہ مختلف مضامین جمع کر دیے جائیں جیسے:

زرعوا الفجور و سقوه الغرور و حصدوا الثبور ولا يقاس لال محمد من ہذہ الامة احد

انہوں نے فاسق و فجور کی کاشت کی غفلت و فریب کے پانی سے اسے سینچا اور اس سے ہلاکت کی جنس حاصل کی۔ اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اس میں معاندین آل محمدؐ کی مذمت کے ساتھ آل محمدؐ کی مدح و ستائش بھی ہے۔

صنعت مذہب کلامی یہ ہے کہ کلام دلیل برہان پر مشتمل ہو جیسے:

ولم یلد فیکون مولود اولم یولد فیصیر محدودا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں کہ وہ بھی کسی کی اولاد قرار پائے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے ورنہ محدود ہو کر رہ جائے گا۔

اس میں دعویٰ یہ ہے کہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کی اولاد ہوگی تو وہ بھی حادث و مولود ہوگا اور اگر وہ کسی کی اولاد ہوگا تو محدود قرار پائے گا حالاں کہ وہ نہ حادث ہے اور نہ محدود۔

مبالغہ یہ ہے کہ کسی وصف کی شدت یا ضعف کا اس حد تک دعویٰ کیا جائے کہ اس تک پہنچنا بعید یا محال ہو تاکہ دوسروں کو یہ تاثر دیا جائے کہ اس وصف کا اب کوئی درجہ باقی نہیں ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ اس وصف کا وقوع عقلاً" اور عادۃً" ممکن ہو اسے تبلیغ کہتے ہیں جیسے:

حتی ارتاب الناصح بنصحہ و ضن الزند بقدحہ۔ یہاں تک کہ ناصح خود اپنی نصیحت کے متعلق شک میں پڑ گیا اور طبیعت اسی چقماق کی طرح بجھ گئی جس نے شعلے بڑھکانا بند کر دیئے ہوں۔

ناصح کا نصیحت کے بارے میں شک کرنا اور چقماق کا ٹھنڈا پڑ جانا دونوں عقلاً" اور عادۃً" ممکن ہیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ عقلاً" ممکن ہو اور عادۃً" ایسا نہ ہوتا ہو اسے اغراق کہتے ہیں۔ جیسے:

ینحدر عنی السیل ولا یرقی الا الطیر۔ میں وہ (کوہ بلند) ہوں جس پر سے سیلاب کا پانی گزر کر نیچے گر جاتا ہے اور مجھ تک پرندہ پر نہیں مار سکتا۔

عقلاً" تو یہ ممکن ہے کہ انسان ایسے بلند مقام پر پہنچ جائے جہاں تک پرندہ پرواز نہ کر سکے مگر عادۃً" ایسا نہیں ہوتا تیسری قسم یہ ہے کہ عقل اور عادت دونوں کے اعتبار سے محال ہو اسے غلو کہتے ہیں۔ غلو کو اگرچہ بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا لیکن اس کے ساتھ اگر ایسی لفظ لائی جائے جو استبعاد کو کم کر دے تو اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے جیسے:

فکان ما ھو کائن من الدنیا عن قلیل لم یکن و کان ما ھو کائن من الاخرۃ عما قلیل لم یزل دنیا کی ساری موجود چیزیں معدوم ہو جائیں گی گویا کہ وہ موجود تھیں ہی نہیں اور آخرت میں پیش آنے والی چیزیں جلد ہی موجود ہو جائیں گی گویا کہ وہ ابھی سے موجود ہیں۔

اس میں دنیا کے جلد ناپذیر ہونے اور یوم آخرت کے قریب تر آنے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جو ہے، وہ نہیں ہے اور جو نہیں ہے، وہ ہے ظاہر ہے کہ موجود کا غیر موجود ہونا غیر موجود کا موجود ہونا عقلاً" اور عادۃً" ناممکن ہے مگر

لفظ "گویا کہ" سے اسے تمثیلی صورت دے کر امر غیر واقع کو وقوع سے قریب کر دیا ہے۔

تجاہل العارف یہ ہے کہ امر معلوم کو ایسے پیرایہ میں بیان کیا جائے گویا وہ غیر معلوم ہے جیسے:

این اخوانی الذین رکبوا الطریق و مضوا علی الحق

کہاں ہیں وہ میرے بھائی کو جو سیدھی راہ پر چلتے رہے اور حق پر گزر گئے۔

اعتراض یہ ہے کہ کلام میں کسی خاص نکتہ کے پیش نظر ایسا جملہ لایا جائے جس کے بغیر بھی کلام تمام ہو سکتا ہو جیسے:

فیا عجبا و اللہ یمیت القلب و یجلب الھم من اجتماع ھولاء القوم علی باطلھم و تفرقکم عن حقکم۔

ان لوگوں کا باطل پر ایکا کر لینا اور تمہاری جمیعت کا حق سے منتشر ہو جانا تعجب خیز ہے۔ یہ امر خدا کی قسم دل کو مردہ کر دیتا ہے اور رنج و اندوہ بڑھا دیتا ہے۔

اس میں "خدا کی قسم دل کو مردہ کر دیتا ہے اور رنج و اندوہ بڑھا دیتا ہے" جملہ معترضہ ہے جو اظہار مصیبت و غم کے لئے ہے۔

تکرار یہ ہے کہ کلام میں کسی لفظ کو دہرایا جائے اس کا فائدہ عموماً تاکید و تنبیہ ہوتا ہے جیسے:

فالحذر الحذر ایھا المستمتع

اے سننے والو ڈرو ڈرو۔

شجاعۃ الفصاحہ یہ ہے کہ مخاطب کے علم و فہم پر اعتماد کرتے ہوئے کلام کے ضروری اجزاء میں سے کسی جز کو چھوڑ دیا جائے جیسے۔

اما و اللہ لقد تقمصھا ابن ابی قحافۃ

خدا کی قسم فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا۔

اس میں **تقمصھا** کی ضمیر کا مرجع خلافت محذوف ہے جسے محل و مقام سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ تفسیر یہ ہے کہ پہلے ایسی چیز بیان کی جائے جس میں پوشیدگی خفاہو اور پھر اس کی تشریح و توضیح کی جائے جیسے:

اوصیکم عباد اللہ بتقوی اللہ التی ھی الزاد و بھا المعاد زاد مبلغ و معاد منجح۔

اے اللہ کے بندو میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ یہی تقویٰ زادراہ ہے اور اسی کو لے کر پلٹنا ہے۔ یہ زادراہ منزل تک پہنچانے والا اور یہ پلٹنا کامیاب پلٹنا ہے۔

اس میں پہلے زاد و معاد کا ذکر کیا ہے اور پھر اس کی تشریح و تفصیل کی ہے۔

توریہ یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی قریب اور ایک معنی بعید اور مقصود معنی بعید ہوں۔ اس کی تین قسمیں ہیں پہلی قسم یہ ہے کہ دونوں کے مناسبات میں سے کوئی لفظ مذکور نہ ہو اسے توریہ مجردہ کہاجاتاہے۔ جیسے:

حائک ابن حائک۔ جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

حائک کے معنی قریب جولاہے کے ہیں اور معنی بعید جھوٹے کے ہیں اور ان دونوں معنوں میں کسی معنی کے مناسب کوئی لفظ مذکور نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ معنی قریب کے مناسب کوئی لفظ مذکور ہو اسے توریہ مرشحہ کہا جاتا ہے جیسے:

والباسط فیھم بالجود یدہ وہ مخلوقات میں اپنا دست کرم بڑھائے ہوئے ہے۔

ید کے معنی قریب ہاتھ کے ہیں اور معنی بعید نعمت کے اور پہلے معنی کے مناسب لفظ بسط (پھیلانا) مذکور ہے

تیسری قسم یہ ہے کہ معنی بعید کے مناسب کوئی لفظ مذکور ہو اسے توریہ مبینہ کہا جاتا ہے جیسے

فاجری فیھا سراجا مستطیرا ان میں ضو پاش چراغ رواں کیا۔

سراج کے معنی قریب چراغ کے معنی بعید سورج کے ہیں اور لفظ اجری جس کے معنی چلانے اور حرکت دینے کے ہیں سورج کے مناسب ہے۔

صنعتِ استخدام یہ ہے کہ لفظ کے ذریعہ ایک معنی مراد لئے جائیں اور جو ضمیر اس کی طرف پلٹتی ہے اس سے دوسرے معنی کا ارادہ کریں یا ایک ضمیر سے ایک معنی اور دوسری ضمیر سے دوسرے معنی مراد لئے جائیں جیسے:

وخلق الاجال فاطالھا و قصرھا و قدمھا و اخرھا۔ اس نے زندگی کی مختلف مدتیں مقرر کی ہیں کسی کو زیادہ اور کسی کو کم کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے کر دیا ہے۔

اجل کے ایک معنی مدت کے ہیں اور دوسرے معنی ہنگامی موت کے ہیں۔ پہلی دو ضمیروں سے مراد مدت عمر ہے اور آخری دو ضمیروں سے مراد ہنگام موت ہے۔

صنعت توجیہہ یہ ہے کہ ایسا کلام کیا جائے جس سے دو متضاد معنی نکلتے ہوں اور یہ نہ معلوم ہوسکے کہ کی مراد کیا ہے جیسے:

قتلہ اللّٰہ و انا معہ اسے اللہ نے مارا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں۔

یہ جملہ اس شخص کے جواب میں فرمایا جس نے یہ پوچھا کہ آپ نے عثمان کو قتل کیا ہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ انہیں اللہ نے مارا ہے اور میں اللہ سے الگ نہیں ہوں اور ایک معنی یہ ہیں کہ انہیں اللہ نے مارا ہے اور

جس طرح انہیں موت آئی ہے اسی طرح مجھے بھی ایک دن موت آئے گی۔ ایسا کلام اس موقع پر کیا جاتا ہے جہاں الجھنے کے بجائے ذو معنی جواب دے کر خاموش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

صنعت تعدید یہ ہے کہ اسماء مفرد ایک نہج و اسلوب پر لائے جائیں جیسے:

الحمد للہ الکائن قبل انیکون کرسی او عرش او سماء اوارض اوجان اوانس

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو عرش و کرسی زمین و آسمان اور جن و انس سے موجود تھا۔

حسن نسق کی دو صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ کسی چیز کی صفت پر صفت پر گنواتے چلے جائیں جسے:

فاحذروا الدنیا فانھا غدارۃ غرارۃ خدوع معطیۃ منوع طبسۃ نزوع۔

دنیا سے ڈرو کہ غدار' دھوکہ باز' فریب (کار ہے) دینے والی اور پھر اسے لے لینے والی ہے لباس پہنانے والی اور اتروا لینے والی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے جملے لائے جائیں جو مستقل معانی کے حامل ہونے کے ساتھ ایک دوسرے سے مرتبط ہوں جیسے:

وجعل لکل شی قدر او لکل قدر اجلا و لک اجل کتابا۔

اس نے ہر شے کا ایک اندازہ اور ہر اندازے کی ایک مدت ہر مدت کے لئے ایک نوشتہ قرار دیا ہے۔

صنعت مشاکلہ یہ ہے کہ دو چیزوں کا ذکر ایک جا کریں اور جس لفظ سے پہلے چیز کو تعبیر کیا ہے اسی لفظ سے دوسری چیز کو تعبیر کریں جیسے:

ان فررتم من سیوف العاجلۃ لا تسلمون من سیوف الاجلۃ

اگر تم دنیا کی تلواروں سے بھاگے تو آخرت کی تلواروں سے بچ نہیں سکتے۔

دنیا کی تلواروں کی مناسبت سے آخرت کی طرف بھی تلواروں کی نسبت دی ہے۔

صنعت تلمیح یہ ہے کہ کلام میں حدیث مثل یا کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کیا جائے جیسے:

فما اتی علی اخر القول حتی اراکم متفرقین ایادی سبا۔

ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوتی کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم اولاد سبا کی طرح تتر بتر ہوگئے۔

یہاں لفظ ایادی سبا سے اولاد سبا کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب عمرو ابن عامر نے ایک کاہنہ کی

زبان سے یہ سنا کہ یمن سیلاب کی زد میں آیا چاہتا ہے تو وہ اپنے باغات زمین اور مکان بیچ کر اپنے قبیلہ کے ہمراہ نکل کھڑا ہوا۔ ان میں سے کچھ حجاز میں کچھ شام میں اور کچھ عراق میں بس گئے اور پھر ان کے یکجا ہونے کی کوئی صورت نہ رہی۔

صنعت توشیع یہ ہے کہ جملہ کے آخر میں مثنیہ کی صورت میں ایک لفظ لایا جائے اور پھر ان دو کی تفصیل بیان کی جائے جیسے:

ان اخوف ما اخاف علیکم اثنتان الحرص و طول الامل مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے ایک حرص اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ

صنعت التفات یہ ہے کہ کلام میں تنوع پیدا کرنے کے لئے کلام کے طرق سہ گانہ تکلم خطاب اور غیبت میں سے کسی ایک طریق سے دوسرے طریق کی طرف رجوع کیا جائے جیسے:

والذی نفس ابن ابی طالب بیدہ لا لف ضربة بالسیف اھون علی من میتة علی فراش۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں ابن ابی طالبؑ کی جان ہے کہ بستر پر اپنی موت مرنے سے تلوار کے ہزار وار کھانا مجھے آسان ہیں۔

یہ غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے۔

لف و نشر یہ ہے کہ پہلے چند چیزیں ذکر کی جائیں اور پھر ان چیزوں کے مناسبات و متعلقات بلاتعین بیان کیے جائیں۔ ان اشیاء کو لف اور انکے تعلقات کو نشر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر نشر کی ترتیب لف کے مطابق ہو تو اسے لف و نشر مرتب کہتے ہیں جیسے:

ولیختبر بذلک الشکر و الصبر من غنیھا و فقیرھا۔ تاکہ وہ اس طرح مالدار اور فقیر کے شکر اور صبر کو جانچے۔

شکر کا تعلق غنی سے اور صبر کا تعلق فقیر سے ہے اور دونوں کی ترتیب یکساں ہے۔ اگر ترتیب میں فرق ہو تو اسے لف و نشر غیر مرتب کہتے ہیں جیسے:

خلق الخلق حين خلقهم غنيا عن طاعتهم آمنا من معصيتهم لانه لا تضره معصية من عصاه ولا تنفعه طاعة من اطاعه۔

اللہ نے مخلوقات کو جب پیدا کیا تو ان کی اطاعت سے بے نیاز اور ان کے گناہوں سے بے خطر ہو کر انہیں پیدا کیا کیوں کہ اسے نہ کسی معصیت کار کی معصیت سے نقصان اور نہ کسی فرماں بردار کی اطاعت سے فائدہ پہنچتا ہے۔

اطاعت کا تعلق اللہ کی بے نیازی سے اور معصیت کا تعلق بے خوفی سے ہے۔ یہاں لف و نشر میں ترتیب نہیں ہے۔

تاکید المدح بما یشبہ الذم یہ ہے کہ صفت مدح کے بعد جب حرف استثناء لا کر ایک اور صفت مدح کا ذکر کیا جائے اس سے مدح میں زور پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ کہ مدح کے بعد جب حرف استثناء آئے گا تو یہ خیال پیدا ہو گا کہ اب کوئی صفت دم آئے گی مگر جب صفت ذم کے بجائے صفت مدح آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تلاش و تفحص کے باوجود کوئی صفت ذم نہیں مل سکتی اور اس طرح مدح بالائے مدح سے مدح میں تاکید پیدا ہوجاتی ہے جیسے محمد ابن ابی بکر کی خبروفات سن کر فرمایا:

ان حزننا عليه على قدر سرورهم به الا انهم نقصوا بغيضا و نقصنا حبيبا۔

ہمیں ان کے مرنے کا اتنا ہی رنج و قلق ہے جتنی دشمنوں کو اس سے خوشی ہے مگر یہ کہ ان کا ایک دشمن کم ہوا اور ہم نے ایک دوست کو کھو دیا۔

صنعت تجرید یہ ہے کہ کسی موصوف سے اسی کے مانند دوسرے موصوف کا استخراج کیا جائے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اس صفت میں ایسا کامل ہے کہ اس سے اس کے مانند ایک دوسرا حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسے:

يا اہل الكوفة منيت منكم بثلاث و اثنين صم ذووا اسماع و بكم ذوو اكلام و عمی ذووا ابصار لا احرار صدق ولا اخوان ثقة۔

اے اہل کوفہ میں تمہاری تین اور ان کے علاوہ دو باتوں میں مبتلا ہوں وہ یہ کہ تم کان رکھتے ہوئے بہرے ہو اور بولنے چالنے کے باوجود گونگے ہو اور آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے ہو اور پھر یہ کہ نہ تم جنگ کے موقعہ پر جوانمرد ہو اور قابل اعتماد بھائی ہو۔

حضرت نے اہل کوفہ سے بہرے گونگے اور اندھے لوگوں کا انتزاع کیا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ان میں اوصاف سے پوری طرح متصف ہیں۔

تعریض یہ ہے کہ کلام اپنے ظاہری معنی کے علاوہ ایک دوسرے معنی کی طرف بھی مبہم سا اشارہ کرے۔ جیسے:

لم تکن بیعتکم ایای فلتة۔ تم نے میری بیعت اچانک بے سوچے سمجھے نہیں کی تھی۔

یہ حضرت ابوبکر کی بیعت پر تعریض ہے جن کے بارے میں حضرت عمر نے کہا تھا۔

ان بیعة ابی بکر کانت فلتة ابوبکر کی بیعت بے سوچے سمجھے ناگہانی طور پر ہوئی

اقتباس یہ ہے کہ عبارت میں آیت یا جزو آیت کو اس طرح لایا جائے کہ وہ عبارت کا جز شمار ہونے لگے جیسے:

وانتم الا علون و اللہ معکم ولن یترکم اعمالکم۔ تم ہی غالب ہو اور خدا تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال کو ضائع و برباد نہیں ہونے دے گا۔

ایجاز یہ ہے کہ اظہار مقصد کے لئے کم از کم الفاظ استعمال کئے جائیں بشرطیکہ ادائے مقصد میں خلل پیدا نہ ہوتا ہو۔ امیرالمومنینؑ کا قول ہے کہ:

اذا کان الایجاز کافیا کان الاکثار عیا و اذا کان الایجاز مقصرا کان الاکثار واجبا۔ جب اختصار کافی ہو تو طول زبان پر اقتدار کی کمزوری ہے اور اختصار ادائے مطلب سے قاصر ہو تو الفاظ میں اضافہ ضروری ہے۔

حضرت کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ تھوڑے لفظوں میں بہت سے معانی و مطالب سمٹ آتے تھے جیسے:

تخففوا تلحقوا۔ ہلکے پھلکے رہو تاکہ آگے بڑھنے والوں کو پاسکو

علامہ سید رضی نے اس جملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی جملہ سننے میں نہیں آیا جس کے الفاظ کم اور معنی بہت ہوں۔

براعت استہلال یہ ہے کہ ابتداء کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جن سے بیان کئے جانے والے مضمون کی طرف اشارہ ہوتا ہو۔ جیسے:

الحمد للہ و ان اتی الد ھر بالخطب الفادح و الحدث الجلیل۔ ہر حالت میں اللہ کے لئے حمد و ثنا ہے اگرچہ زمانہ ہمارے لئے مصیبتیں اور صبر آزما حادثے لے کر آیا ہے۔

اس ابتداء سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آگے بیان ہونے والا مضمون حوادث و آلام زمانہ کے سلسلہ میں ہے **ایغال** یہ ہے کہ کسی نکتہ کے پیش نظر کلام کو ایسے الفاظ پر ختم کیا جائے جس کے بغیر بھی کلام ناتمام نہیں رہتا۔

جیسے

نحن علی موعود من اللہ و اللہ منجز وعدہ ہم سے اللہ کا ایک وعدہ ہے اور وہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔

اس میں یہ جملہ کہ اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے۔ صرف مزید اطمینان کے لئے ہے کیوں کہ یہ امر واضح و ظاہر ہے کہ اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

ضائع لفظیہ یہ ہیں۔

تجنیس یہ ہے کہ کلام میں ایسے دو مختلف المعنی لفظ لائے جائیں جو تلفظ یا کتابت میں متشابہ و ہم شکل ہوں اس کی متعدد قسمیں ہیں ان میں سے چند قسمیں یہ ہیں :

تجنیس تام یہ ہے کہ دونوں لفظوں کے حروف عدد و ترتیب اور حرکت و سکون میں یکساں ہوں۔ جیسے:

فالبصیر منھا شاخص و الاعمی الیھا شاخص۔ نگاہ رکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے۔

پہلے شاخص کے معنی کوچ کرنے والے کے ہیں اور دوسرے شاخص کے معنی ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے کے ہیں۔

تجنیس محرف یہ ہے کہ دونوں لفظوں کی ہیئت میں فرق ہو۔ یہ فرق یا اختلاف حرکات کی بنا پر ہوگا جیسے:

فان التقوی فی الیوم الحرز و الجنۃ و فی غد الطریق الی الجنۃ۔ تقویٰ آج (دنیا میں) پناہ و سپر ہے اور کل (آخرت میں) جنت کی راہ ہے۔

پہلی لفظ جنۃ بضم جیم ہے اور دوسری بفتح جیم ہے۔

یا یہ فرق حرکت و سکون کی بنا پر ہوگا اس طرح کہ ایک لفظ میں حرف متحرک ہو اور دوسری میں ساکن جیسے:

لا تری الجاھل الا مفرطا او مفرطا۔ تم جاہل کو حد سے بڑھا ہوا پاؤ گے یا حد سے پیچھے ہٹا ہوا۔

پہلی لفظ میں ف ساکن ہے اور دوسری میں متحرک۔

تجنیس ناقص یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں سے ایک لفظ میں ایک آدھ حرف زیادہ ہو یہ زیادتی یا پہلی لفظ کے شروع میں ہوگی۔ جیسے:

اصبحت بیوتھم قبورا وما جمعوا بورا۔ ان کے گھر قبروں میں تبدیل ہوگئے اور ان کی جمع جتھا تباہ ہوگئی۔

یا دوسری لفظ کی شروع میں ہوگی جیسے:

من باح فلد مہ اباح جس نے زبان کھولی اس نے اپنی موت کا ساماں کیا۔

یا پہلی لفظ کے وسط میں ہوگی جیسے:

لا یضرہ المنع والجود ولا یکدیہ الاعطاء و الجود وہ فیض و عطا کے روکنے سے مال دار نہیں ہو جاتا۔ اور جود و عطا سے کبھی عاجز و قاصر نہیں ہوتا۔

یا دوسری لفظ کے وسط میں ہوگی جیسے:

اذا حبط عملہ الطویل و جھدہ الجھید اس کی طویل عبادتوں اور بھرپور کوششوں کو اکارت کردیا۔

تجنیس مطرف یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں سے ایک لفظ کے آخر میں ایک حرف زیادہ ہو جیسے:

و مدار رحاھا تبدوا فی مدارج خفیۃ فتنے ہمیشہ چھپے ہوئے راستوں سے ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

تجنیس مضارع یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں ایک حرف کا فرق ہو اور وہ حرف ہم مخرج یا قریب المخرج ہوں یہ حرف یا لفظ کے شروع میں ہوگا جیسے:

فی قرار خبرۃ و دار عبرۃ اس مقام آزمائش اور محل عبرت میں

خبرہ اور عبرہ میں تجنیس ہے اور خ اور ع کا مخرج ایک ہے یا یہ حرف لفظ کے وسط میں ہوگا جیسے:

عباد مخلوقون اقتدارا و مربون اقتسارا۔ یہ بندے اس کے اقتدار کا ثبوت دینے کے لئے وجود میں آئے اور غلبہ و تسلط کے ساتھ ان کی تربیت ہوئی ہے۔

اقتدار اور اقتسار میں تجنیس ہے اور "د" اور "س" دونوں کا مخرج زبان کا کنارہ ہے۔

یا یہ حرف لفظ کے آخر میں ہوگا جیسے:

الخیر منہ مامول مو انشر منہ مامون۔ اس سے بھلائی ہی کی توقع ہو سکتی ہے اور اس سے گزند کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

مامول اور مامون میں تجنیس ہے اور لام اور نون دونوں قریب المخرج ہیں۔

تجنیس لاحق یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں ایک حرف کا فرق ہے اور وہ دونوں حرف قریب المخرج یا ہم مخرج نہ ہوں۔ اس کی بھی تین صورتیں ہیں۔ یہ حرف یا لفظ کے شروع میں ہوگا جیسے:

داع دعا و راع رعی — دعوت دینے والے نے پکارا اور نگہداشت کرنے والے نے نگہداشت کی

یا یہ حرف لفظ کے وسط میں ہوگا جیسے:

ما کنت الا کقارب ورد و طالب وجد — میں ایسا تھا جیسے رات بھر چلنے والا چشمہ پر پہنچ جائے اور ڈھونڈنے والا پالے۔

یا یہ حرف لفظ کے آخر میں ہوگا جیسے:

مرمة لمعاش او خطوة فی معاد۔ — معاش کے بندوبست کے لئے یا آخرت کی طرف قدم اٹھانے کے لئے۔

تجنیس مقلوب یہ ہے کہ دونوں لفظوں کے حرف تو ایک ہوں مگر ان کی ترتیب مختلف ہو، جیسے:

مثل الدنیا مثل الحیة لین و قاتل سمها۔ — دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے جو چھونے میں نرم ہے مگر اس کا زہر قاتل ہے۔

تجنیس مصحف یہ ہے کہ دونوں لفظ تحریر میں یکساں ہوں لیکن ان کے تلفظ اور نقاط میں فرق ہو جیسے:

فاتعظوا بالعبر و اعتبروا بالغیر۔ — عبرتوں سے پند و نصیحت اور زمانہ کے الٹ پھیر سے عبرت حاصل کرو۔

صنعت اشتقاق یہ ہے کہ کلام میں چند ایسے الفاظ لائے جائیں جن کا مصدر یا مادہ ایک ہو جیسے:

و اللہ لا سلمنی ما سلمت امور المسلمین۔ — خدا کی قسم جب تک مسلمانوں کے امور کا نظم و نسق برقرار رہے گا میں خاموشی اختیار کئے رہوں گا۔

شبہ اشتقاق یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو بظاہر ایک ہی مصدر یا مادہ سے نکلے ہوئے معلوم ہوں مگر دراصل ایسا نہ ہو جیسے۔

و اهلها علی ساق و سیاق۔ — اس کے رہنے والے پادر رکاب چل چلاؤ کے منتظر

ساق کے معنی پنڈلی کے ہیں اور سیاق ساق کا مصدر ہے۔

ردالعجز علی الصدر یہ ہے کہ جو لفظ اول کلام میں ہو وہی آخر کلام میں ہو یا ان دونوں لفظوں میں تجنیس ہو یا صنعت اشتقاق یا شبہ اشتقاق جیسے:

و استهدیه قریبا هادیا اس سے ہدایت چاہتا ہوں چونکہ وہ قریب تر اور ہادی ہے۔

سجع مرصع یہ ہے کہ دونوں جملوں کے تمام یا اکثر الفاظ ہموزن اور آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں جیسے:

الحمد لله الذی علا بحوله و دنا بطوله۔ تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو اپنی طاقت کے اعتبار سے بلند اور اپنی بخشش کے لحاظ سے قریب ہے۔

سجع مطرف یہ ہے کہ دونوں جملوں کے آخری الفاظ متوافق اور وزن عروضی میں مختلف ہوں، جیسے:

اتخذوا الشیطان لا مرهم ملاکا واتخذهم له اشراکا انہوں نے اپنے کاموں کا کرتا دھرتا شیطان کو بنا رکھا ہے اور اس نے ان کو اپنا آلہ کار بنا لیا ہے۔

سجع متوازی یہ ہے کہ دونوں جملوں کے صرف آخری الفاظ وزن و قافیہ میں متفق ہوں جیسے:

من جری فی عنان امله عشر باجله

لزوم مالایلزم یہ ہے کہ آخری لفظ کے حرف آخر سے پہلے کسی حرف معین کا التزام کیا جائے جیسے:

فانه ارجح ما وزن و افضل ماخزن۔ اس کا پلہ ہر وزن کی جانے والی چیز سے بھاری اور ہر گنج گرانمایہ سے بہتر و برتر ہے۔

اس میں ز کا التزام کیا ہے حالاں کہ اس کی پابندی کے بغیر بھی کلام میں سجع پیدا کیا جاسکتا ہے۔

حذف یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں کسی ایک حرف کو ترک کرنے کا التزام کرے۔ چناں چہ اس سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ایک طویل خطبہ ہے جو آپ نے ارتجالا" فرمایا۔ اس خطبہ میں الف نہیں ہے، اس کی ابتداء اس طرح ہے:

حمدت من عظمت منة و وسعت نعمته و سبقت رحمته غضبه و تمت کلمته و بلغت مشیته۔ اس کی حمد کرتا ہوں جس کا احسان عظیم نعمت وسیع اور جس کی رحمت اس کے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔ اس کی بات پوری اور مشیت نافذ ہے۔

صنعت غیر منقوطہ یہ ہے کہ کلام ایسے الفاظ پر مشتمل ہو جو نقطوں سے خالی ہو، اس سلسلہ میں بھی حضرت کا

ایک طویل خطبہ ہے اس کے ابتدائی کلمات یہ ہیں۔

الحمد للہ الملک المحمود و المالک الودود مصور کل مولود و مال کل مطرود

تمام حمد اس اللہ کے لئے جو ذی اقتدار اور قابل ستائش ہے مالک اور دوست رکھنے والا ہے مولود کا صورت گر اور ہر دھتکارے ہوئے کا سرمایہ ہے۔

صنعت تعمیہ یہ ہے کہ الفاظ یا حروف میں کوئی نام اس طرح پوشیدہ کیا جائے کہ اس کی طرف لفظی اشارہ تو ہو مگر بظاہر معلوم نہ ہو مثلاً" یہ شعر

چشم بکشا زلف بشکن جان من
بہر تسکین دل بریان من !

اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ آنکھ کھول زلف لہرا تاکہ میرے دل تپیدہ کو سکون و قرار حاصل ہو۔

اس میں تعمیہ کیصورت یہ ہے کہ چشم بکشا کا عربی ترجمہ افتح العین ہے جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ آنکھ کھول کر اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ حرف عین کو فتح (زبر) دو اور زلف بشکن کے ایک معنی یہ ہیں کہ زلف لہرا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ زلف سے لام مراد لیا جائے اس لیے کہ جب زلف بل کھاتی ہے تو اس کی ہیت لام کی سی ہو جاتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف !
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

اور بشکن کا عربی میں ترجمہ اکسر ہے اور اکسر کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسرہ (زیر) دو اور دوسرے مصرع میں دل بریاں سے مرادی' ہے کیوں کہ وہ لفظ بریاں کے وسط میں واقع ہے اور تسکین کے ایک معنی تسلی دینے کے ہیں اور دوسرے معنی ساکن کرنے یعنی جزم دینے کے ہیں۔ لہذا اس معنی مضمر کی رو سے جب عین کو زبر ل کو زیر اور ی کو جزم دی جائے گی تو یہ علی کے نام کا معما ہو جائے گا۔

امیرالمومنینؑ اس صنعت تعمیہ سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ آپ سے کسی نے پوچھا کہ کیا قرآن مجید میں تعمیہ پایا جاتا ہے۔ فرمایا کہ ہاں سورہ ہود میں ارشاد ہے:

ما من دابۃ الا ھو آخذ بنا صیتھا۔

روئے زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے ہیں ان سب کی پیشانی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

اس میں معما کی صورت یہ ہے کہ لفظ دابہ کا ناصیہ (پیشانی) دال ہے اور جب ھوا سے اپنی گرفت میں لے گا تو ھو دال کے ملنے سے "ھود" ہو جائے گا اور سورہ ہود کی یہ آیت حضرت ہود کے نام کا معما بن جائے گا۔

فن خطابت

خطابت اس طرز بیان کا نام ہے جس کے ذریعہ خطیب اپنے افکار و خیالات کو دوسروں کے سامنے موثر پیرایہ میں پیش کرتا ہے اور لفظوں کے حسن و شکوہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے متاثر کرکے عوام کا رخ ادھر موڑ دیتا ہے جدھر وہ موڑنا چاہتا ہے۔ خطابت کی داغ بیل انسان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ پڑی جس نے تدریجاً ترقی کی راہیں طے کرکے ایک فن کی حیثیت حاصل کرلی۔ اسے فنی حیثیت دینے میں یونانیوں نے بھی حصہ لیا اور ارسطو نے کتاب الخطابہ تصنیف کرکے اس کے اثر انگیز پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ قبل اسلام عربوں میں بھی بلند پایہ خطیب پیدا ہوئے۔ چنانچہ قیس ابن ساعدہ ایادی، اکثم بن صیفی، ذوالاصبع عدوانی، قیس ابن خارجہ، خویلد ابن عمرو، حاجب ابن زرارہ، حارث ابن عباد، قیس ابن مسعود، خالد ابن جعفر، علقمہ ابن علاثہ، عامر ابن طفیل، عمرو ابن شرید، عمرو ابن معدیکرب اور حارث ابن ظالم مری عرب کے شہرہ آفاق خطیب ہو گزرے ہیں جن کی خطابت و خوش بیانی کا آوازہ مدتوں تک گونجتا رہا اور ان کی ادبی عظمت کا اعتراف کیا جاتا رہا۔ اسلام میں خطابت کی ابتداء اسلام کے ابتدائی دور ہی میں ہو چکی تھی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خود بھی بہت بڑے خطیب تھے۔ قرآن مجید کی اعجازی نثر سے دعوت اسلام کا آغاز کیا اور خطبوں اور تقریروں کے ذریعہ اسلامی احکام بیان فرمائے اور اصلاحی و اخلاقی درس دیئے اور جن لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کے لئے مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا وہ بھی نطق و خطابت کے ذریعہ اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے اور اسلامی تعلیمات نشر کرتے تھے اور اس طرح اسلام کے ذریعہ خطابت کو فروغ حاصل ہوا۔ شعر و شاعری کے جمگھٹے خطبوں میں اجتماعات میں بدل گئے اور شاعروں کی جگہ خطیبوں نے لے لی۔ ان خطباء میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امیرالمومنینؑ سب سے فصیح تر اور با اثر خطیب تھے۔ آپ کے آباء و اجداد میں بھی متعدد خطباء ہو گزرے تھے چنانچہ آپ کے جد اعلیٰ کعب ابن لوی خطبائے عرب میں بڑے نامور خطیب تھے اور حج کے ایام میں ان کے خطبات عمومی اجتماعات میں گونجا کرتے تھے۔ اسی طرح قصی، ہاشم، عبدالمطلب اور آپ کے پدر بزرگوار حضرت ابو طالب بلند پایہ خطبائے عرب میں شمار ہوتے تھے۔ اس خاندانی ورثہ کے ساتھ آپ میں وہ تمام صفات بھی موجود تھیں جو ایک مؤثر خطابت کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک خطیب کے لئے ذہنی استحضار، فکر کی گہرائی، علم و نظر کی وسعت اور جذبات شناسی کے ساتھ قوت بیان پر اعتماد اور زبان پر اقتدار از بس ضروری ہوتا ہے اور امیرالمومنینؑ میں یہ تمام جوہر بدرجہ اتم موجود تھے۔ آپ مفکر، حاضر دماغ، نکتہ رس، ادا شناس، بلاغت علم نبوت کے ورثہ دار اور انسانی نفسیات کے ماہر تھے اور ذہن میں الفاظ کا لامتناہی ذخیرہ رکھتے تھے، جنہوں نے جس صورت سے چاہتے گردش دیتے اور جس موضوع کو چاہتے زبان کے سانچوں میں ڈھالتے اور جس موقع پر جو لفظ رکھتے یہ معلوم ہوتا کہ ایک ترشا ہوا نگینہ

ہے۔ جسے کسی مرصع کار نے کمال صنعت سے جڑ دیا ہے جس سے جلال و جمال اور زبان و بیان کے جوہر پوری تابانیوں کے ساتھ ابھر آتے، کبھی لفظوں کے ٹھہراؤ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ افق کے ماتھے پر شفق کی رنگینیاں مچل رہی ہیں اور کبھی جملوں کے اتار چڑھاؤ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کے قطروں سے شعلے برس رہے ہیں اور راکھ کی تہوں سے چنگاریاں لو دے رہی ہیں۔ آپ کی خطابت کا خاص جوہر آمد و بے ساختگی ہے۔ رزم ہو یا بزم، نہ تسلسل وروانی میں فرق آتا ہے نہ اسلوب کی بلند آہنگی میں بلکہ ہر موقع پر حسن خطابت سے ایک سحر آگیں فضا پیدا کرکے دل و دماغ کو مسحور کر دیتے اور زبان آوری کا جوہر دکھانے والوں کو حیرت کی وادی میں سرگرداں چھوڑ دیتے۔ آپ کا زور خطابت ان خطبات سے ظاہر ہے جو مختلف مواقع پر بیان فرمائے اور نہج البلاغہ، مستدرک نہج البلاغہ، تحف العقول وغیرہ کتب میں درج ہیں۔ ان خطبوں کی انفرادیت و بلند معیاری کا ہر دور کے فصحاؤ) دباء نے اعتراف کیا ہے اور آپ کے زور بیان اور **خطیبانہ** قوت کا لوہا مانا ہے۔ اس سلسلہ میں دور حاضر کے چند ادباء کے آراء نقل کئے جاتے ہیں۔

احمد حسن الزیات تحریر کرتے ہیں:

لا نعم بعد رسول اللہ فیمن سلف و خلف افصح من علی فی المنطق ولا ابل منہ ریقا فی الخطابۃ کان حکیما تتفجر الحکمۃ من بیانہ و خطیبا تتدفق البلاغۃ علی لسانہ و واعظاما السمع والقلب و مترسلا بعید غور الحکمۃ و متکلما یضع لسانہ حیث شاء وھو بالاجماع اخطب المسلمین و امام المنشئین۔

ہمارے علم میں نہیں ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد پہلے لوگوں اور بعد میں آنے والوں میں علیؑ سے بڑھ کر کوئی فصیح البیان اور ان سے زیادہ کوئی زبان آور ہو۔ وہ ایسے حکیم تھے جن کے بیان سے حکمت کے سوتے پھوٹتے تھے اور ایسے خطیب تھے جن کی زبان سے بلاغت کے سیلاب امڈتے تھے اور ایسے واعظ تھے جن کے کلمات کانوں میں گونجتے اور دلوں میں اتر جاتے تھے اور ایسے خطیب تھے جن کے صاف وروداں بیان میں حکمت کی باریکیاں مضمر ہوتی تھیں اور ایسے متکلم تھے کہ جس موضوع پر چاہتے لب کشائی کرتے وہ تمام مسلمانوں میں سب سے بڑھ کر خطیب اور انشاء پردازوں کے امام و سرکردہ تھے۔

(تاریخ الادب العربی ص ۱۷۴)

احمد زکی صفوت تحریر کرتے ہیں:

لایماری احد فی انه رضی اللّٰه عنه کان امام الخطباء و مقدم البلغا بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم

اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ خطیبوں کے امام اور اہل بلاغت کے پیشرو تھے۔

(ترجمہ علی ابن ابی طالبؑ ص ۱۰۷)

محمد سید کیلانی تحریر کرتے ہیں:

ومن اشهر خطباء ذلک العصر الامام علی الذی امتاز بمضاء لسانه و علوبیانه و قوة منطقه وسطوع حجته و مواتاة البلاغة له فی خطبه و کتبه و رسائله و سوابغ حکمه و جوامع کلمه۔

اس دور کے خطیبوں میں سب سے زیادہ شہرہ آفاق شخصیت حضرت علیؑ کی تھی جو زبان کی روانی' بیان کی بلند معیاری گویائی کی طاقت' استدلال کی تابندگی اور خطبوں' تحریروں اور خطوط میں بلاغت کی کار فرمائی اور حکمت آفرین کلموں اور پر معانی جملوں امتیاز رکھتے تھے۔

(اثر التشیع فی الادب العربی ص ۲۵)

شیخ احمد اسکندری تحریر کرتے ہیں:

هو امام الخطباء من العرب علی الاطلاق بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد عرب کے تمام خطیبوں کے امام مطلق تھے۔

(الوسیط ص ۱۱۴)

السید احمد الہاشمی تحریر کرتے ہیں:

کان رحمه اللّٰه افصح الناس بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم و اکثرهم علما و زهدا و اشدة فی الحق و هو امام الخطباء من العرب علی الاطلاق بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم

حضرت علیؑ رسول اللہؐ کے بعد تمام لوگوں سے زیادہ فصیح البیان اور علم زہد اور امر حق کی پابندی میں بڑھے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام خطبائے عرب کے امام و پیشرو تھے۔

(جواہر الادب ص ۳۶۸)

جورج جرداق مسیحی تحریر کرتے ہیں:

انه لمن الصعب ان تجد فی شخصیات التاریخ من اجتمعت لدیه کل هذه الشروط التی تجعل من صاحبها خطیبا فذا غیر علی ابن ابی طالب۔

تم علی ابن ابی طالبؑ کے علاوہ مشکل ہی سے تاریخی شخصیتوں میں وہ تمام اوصاف یک جا پاؤ گے جو ایک منفرد خطیب کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

(الامام علی ج ۳ ص ۷۰۹)

ابن میثم نے حضرت کے خطبات کو غرض غیات کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کیا ہے' مشاورہ' منافرہ اور مشاجرہ۔

مشاورہ یہ ہے کہ انسان کو نیکی اور بدی کی قدروں سے آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اور کیا نہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنی سود و بہبود کے پیش نظر اچھائی کی راہ اختیار کرے اور برائی سے بچ کر رہے اور اس طرح اپنی زندگی کو بامقصد بنانے میں کامیاب ہوسکے۔ حضرت کے وہ خطبات جو حکم و نصائح' اور امرو نواہی' تذکیر و تنبیہ نصرت دین و تقویت اسلام اور دنیا سے گریز اور اللہ سے وابستگی کے سلسلہ میں ہیں اسی قبیل سے ہیں۔

منافرہ یہ ہے کہ اچھوں کی مدح و توصیف اور بروں کی مذمت و تنقیص کی جائے یہ نہ صرف اس لئے کہ اچھوں کا حق ہے کہ ان کی مدح کی جائے اور برے اس لائق ہیں کہ ان کی مذمت کی جائے بلکہ اس لئے بھی کہ اچھوں کی مدح سے دوسروں میں اچھے صفات کے حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بروں کی تنقیص سے لوگوں کے دلوں میں برائیوں کی طرف سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت نے جہاں جہاں اوصاف حسنہ سے متصف افراد کی توصیف کی ہے اور صفات مذمومہ کے حامل افراد کی مذمت کی ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ شجاعت عفت' مروت' علم' صبر ایسے اخلاق فاضلہ کے اکتساب کی دعوت دیں اور بزدلی بخل و نایت و پست ہمتی ایسے صفات رذیلہ سے اجتناب کی تلقین کریں۔

مشاجرہ یہ ہے کہ اہل دنیا کے مظالم پر شکوہ اور ناگواری کا اظہار کیا جائے یا جو الزامات تراشے جائیں ان کی تردید یا توجیہ کی جائے چنانچہ دنیا والوں کی بے رخی' ناقدر شناسی' غصب حقوق وغیرہ کے سلسلہ میں آپ کے ملفوظات اسی مشاجرہ کے ذیل میں آتے ہیں اور اس میں وہ خطبات بھی داخل ہیں جن میں ان الزامات کے جوابات دئے ہیں جو مزاح و شوخی' حرص اقتدار' قتل عثمان اور تحکیم کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں آپ پر عائد کیے گئے تھے۔ اس قسم کے خطبات کا مقصد ان لوگوں کو پہچان کروانا ہے جو ظلم غصب اور الزام تراشی ایسے افعال کے مرتکب ہوتے رہے ہیں تاکہ ان سے نفرت کے ساتھ ان کے اعمال و افعال سے بھی نفرت کا احساس پیدا ہو اور حضرت کے خطبات کا بنیادی مقصد ہی برائیوں سے نفرت دلا کر سیرت و کردار کی درستی اور پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل ہے چنانچہ آپ نے اللہ کے صفات و جلال و جمال پیغمبر اکرمؐ کی عظمت و رفعت بزرگان دین سے خلوص و محبت خیر و شر کی تمیز' دنیا کی بے ثباتی'

اخلاق و عمل کی اہمیت اور اسلام کے پاکیزہ تعلیمات ایسے موضوعات کو اپنے خطبات کی اساس بنایا ہے۔

حضرت کے خطبات کی اثر آفرینی بھی مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ جب الفاظ فصاحت و بلاغت کے سانچوں میں ڈھل کر زبان سے نکلتے تو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے اور جذب و تاثیر سے وارفتگی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی علامہ رضی نے لکھا ہے کہ بعض خطبات کے دوران لوگوں کے بدن لرزنے لگتے' رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے اور دل کانپ اٹھتے۔ ایک مرتبہ متقین کے اوصاف پر مشتمل خطبہ دے رہے تھے کہ ہمام ابن عبادہ نے اتنا اثر لیا کہ دم توڑ دیا۔

حضرت کے خطبات میں سے چند مشہور خطبوں کے نام یہ ہیں:

الشقشقیه القاصعه الغراء الزہرا الاشباح الناطقه الدامغه الفاضحه الدیباج الوسیله اللولوء و الطالوتیه المونقه الطاوسیه غیر معجه

ایک خطبہ جسے البیان کا نام دیا گیا ہے حضرت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مگر علامہ مجلسی نے بحار میں' شیخ عباس قمی نے سفینتہ البحار اور دوسرے اعلام شیعہ نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ یہ خطبہ نہ نہج البلاغہ میں ہے اور نہ مستدرک نہج البلاغہ میں شیخ جواد نعینہ نے اس کی وضیعت پر دلائل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے۔

لا اعرف اسم الشخص الذی وضع خطبة البیان و لکنها بالا سرائیلیات اشبه۔

مجھے اس شخص کا نام معلوم نہیں جس نے خطبہ البیان وضع کیا۔ البتہ یہ اسرائیلی روایات سے بہت مشابہ ہے۔

(مجلہ الهادی سال ۲ نمبر ۴ صفحہ ۶۴)

تصنیف و تالیف

قبل اسلام عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور نہ اسے اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے نہ معلومات کو تحریری صورت میں لانے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ جمع و تالیف کا۔ ان کا سرمایہ معلومات جو انساب عرب و وقائع و حوادث اور نظم و نثر کے ادب پاروں تک محدود تھا ان کے ذہنوں میں محفوظ رہتا تھا۔

ظہور اسلام کے بعد خطوط و مراسلات اور قرآنی آیات کو ضبط تحریر لانے کے لئے اس کی ضرورت کا احساس ہوا

اور کچھ لوگوں نے ادھر توجہ کی۔ اس کے علاوہ دینی علوم اور اسلامی احکام کے تحفظ کے لئے بھی ضروری تھا کہ انہیں ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لیا جائے اور عوام کے حافظہ پر نہ چھوڑا جائے۔ پیغمبر اکرمؐ نے جہاں قرآن مجید کے قلمبند کرنے کا سامان کیا وہاں دوسرے علوم کی تدوین و تحریر کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

العلم صید و الکتابة قید قیدو احمکم اللّٰہ علومکم بالکتابة

علم شکار ہے اور تحریر زنجیر ہے۔ خدا تم پر رحم کرے اپنے علوم کو کتابت کی زنجیروں میں جکڑ لو۔

(کشف الظنون ج ۱ ص ۳۲)

امیرالمومنینؑ بھی اسلامی تعلیمات کے حفظ و بقا کے لئے تدوین و تالیف کو بڑی اہمیت دیتے تھے اسی اہمیت کے پیش نظر جمع قرآن و تدوین حدیث کو دوسرے امور پر ترجیح دی اور دوسروں کو بھی اس کی ضرورت و افادیت کی طرف توجہ دلاتے رہتے۔

ابن سعد نے طبقات میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ نے خطبہ کے دوران فرمایا کہ تم میں کون ہے جو ایک درہم صرف کرکے علم کا ذخیرہ حاصل کرے۔ حارث ابن عبد اللہ اعور نے یہ سنا تو ایک درہم کے کاغذ خرید کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان پر مختلف علمی مطالب تحریر فرمائے اور اس طرح تحریر علوم کی افادیت کو واضح کیا۔ حضرت دنیائے اسلام کے پہلے مصنف ہیں اور آپ ہی کے ہاتھوں تصنیف و تالیف کی بنیاد پڑی۔ ابن شہر آشوب نے تحریر کیا ہے:

ان اول من صنف فی الاسلام امیرالمومنین علی علیہ السلام

جس نے سب سے پہلے اسلام میں تصنیف کا آغاز کیا' وہ امیرالمومنین علیہ السلام تھے۔

(مناقب)

حضرت کے چند تصنیفات یہ ہیں۔

کتاب علی :۔ یہ کتاب مسائل و احکام پر مشتمل تھی اگرچہ کتابی صورت میں موجود نہیں ہے مگر اس کے مندرجات کتب احادیث میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں۔ محمد ابن اسماعیل بخاری نے بھی اپنی صحیح باب کتابتہ العلم میں اس کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الجفر و کتاب الجامعہ :۔ یہ دونوں کتابیں بھی حضرت کی تصنیف کردہ ہیں۔ بستانی نے تحریر کیا ہے:

الجفر و الجامعة کتابان لعلی کرم اللہ وجھہ۔ جفر اور جامعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تصنیف کردہ دو کتابیں ہیں۔

(دائرۃ المعارف ج ٦ ص ٤٧٨)

تفسیر نعمانی :۔ یہ ایک تفسیری تبصرہ ہے جو اپنے راوی محمد ابن ابراہیم ابن جعفر النعمانی کی نسبت سے تفسیر نعمانی کہلاتا ہے۔ یہ تفسیر بحار الانوار کی انیسویں جلد میں مرقوم ہے۔

امیرالمومنینؑ نے خود بھی تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا اور اپنے اصحاب و تلامذہ میں سے بھی مصنفین کی ایک جماعت پیدا کردی جنہوں نے آپ کے خطب و قضایا قلمبند کرنے کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھیں ان کتب کا تذکرہ رجال نجاشی، رجال کشی اور فہرست ابن ندیم میں موجود ہے۔ ان مصنفین میں سے چند قلمکار یہ ہیں:

ابورافع : پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام، امیرالمومنینؑ کے کاتب اور بیت المال کے خازن تھے انہوں نے کتاب السنن والاحکام و القضایا مرتب کی۔

عبید اللہ ابن ابی رافع :۔ انہوں نے ایک کتاب ترتیب دی جو ان لوگوں کے اسماء اور اجمالی تعارف پر مشتمل تھی جنہوں نے امیرالمومنین کے ہمراہ مختلف غزوات میں شرکت کی تھی۔ یہ علم رجال کی پہلی کتاب تھی جو عالم اسلام میں ظاہر ہوئی۔

علی ابن ابی رافع :۔ انہوں نے فقہ کے مختلف ابواب تحریر کئے۔

ربیعہ ابن سمیع :۔ انہوں نے حضرت علیؑ سے جو مسائل زکوۃ سنے انہیں تحریری صورت لائے۔

سلیم ابن قیس ہلالی :۔ حضرت کے رواۃ حدیث میں سے تھے انہوں نے رسول اللہ کے بعد پیش آنے والے واقعات کے سلسلہ میں ایک کتاب لکھی جو کتاب سلیم کے نام سے مشہور اور مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

اصبغ ابن نباتہ :۔ انہوں نے حضرت کے مرتب کردہ دستور حکومت اور وصیت نامہ کو جو اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے قلمبند کیا۔ یہ دونوں تحریریں نہج البلاغہ میں درج ہیں۔

سلمان فارسی :۔ انہوں نے امیرالمومنینؑ کے احتجاجات قلمبند کئے۔

ابو ذر غفاری :۔ ان کی ایک کتاب وصایا النبی ہے جس کی شرح علامہ محمد باقر مجلسی نے عین الحیاۃ کے نام سے تحریر کی ہے۔

ابوالاسود دئلی :۔ انہوں نے حضرت سے نحو کے ابتدائی قواعد سن کر انہیں تحریر صورت میں منضبط کیا۔

علم الطب

اسلام سے قبل کچھ لوگ امراض کو ارواح خبیثہ کی اثر اندازی کا نتیجہ سمجھتے تھے اور ان کے دفعیہ کے لئے کاہنوں، جادوگروں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کی طرف رجوع کرتے تھے اور کچھ لوگ علاج معالجہ بھی کرتے تھے۔ یہ علاج معالجہ داغنے، پچھنے لگانے، ٹونے ٹوٹکوں اور چند جڑی بوٹیوں تک محدود ہوتا تھا جن کے خواص تجربہ سے معلوم کئے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان تجربات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور صدیوں کے مسلسل تجربوں اور مشاہدوں کی اساس پر جو علم مدون ہوا اسے علم طب کہا گیا۔ طب کے لغوی معنی زیرکی و دانائی اور سحرو جادو کے ہیں اور اصطلاحاً" اس علم کو کہتے ہیں جو انسانی مزاج کے تعدیل۔ ازالہ امراض اور حفظ صحت کی تدابیر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ علم اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ مختلف امراض کا ازالہ اسی پر منحصر ہے اور اسی کے ذریعہ صحت و تندرستی بحال کی جاسکتی ہے۔ امیرالمومنین، بھی اسی علم کی افادیت کی بناء پر اسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

العلم علمان علم الادیان و علم الابدان علم دو ہیں ایک علم دین اور دوسرا علم طب

علم طب کے چند شعبے ہیں۔ تشریح و منافع اعضاء تشخیص امراض، دستور معالجات، تدابیر حفظان صحت، اور خواص مفرادات۔

تشریح اعضاء

جسم کے مختلف اعضاء اور ان کے افعال کے علم کا نام تشریح اعضاء یا علم بدن ہے خداوند عالم نے انسانی جسم میں ۲۴۸ ہڈیاں، ۵۱۸ عضلات، ۵۷ اعصاب، ۱۸۰ متحرک اور ۱۸۰ ساکن رگیں اور مختلف اعضاء اور ان میں گوناگوں حواس و قوئ ودیعت کئے ہیں جو ہمہ وقت اپنے وظائف کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر جسم کی ساخت اور اس کے نظام پر نظر کی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم کائنات اس کے اندر سمٹ آئی ہے۔ امیرالمومنینؑ نے جسم کی ساخت اور اعضا کے نظم و ارتباط پر نظر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی العالم الاکبر

کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر ایک بڑا عالم سمودیا گیا ہے

انسانی جسم کی بنیاد غیر مرئی خلیوں پر قائم ہے۔ ان خلیوں کے اجتماع سے بافت بنتے ہیں اور بافتوں سے اعضاء کی تشکیل ہوتی ہے اور اعضا کا مجموعہ جسم کہلاتا ہے۔ گویا انسانی جسم ایک کتاب ہے جس میں خلئے حرف کی اور بافت

الفاظ کی اور اعضا جملوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

و انت الکتب المبین الذی با حرفہ یظہر المضمر

تو وہ روشن کتاب ہے جس کے حرفوں سے چھپی ہوئی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔

انسان کے جسم میں قدرت نے مختلف قسم کے حاسے اور قویٰ و دیعت کئے ہیں جب یہ حاسے اپنے مخصوص محرکات کے ذریعہ متحرک و متاثر ہوتے ہیں تو ان سے مختلف اثرات ظہور میں آتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ نے ان قوتوں اور حاسوں کو کمیل ابن زیاد کے ایک سوال کے جواب میں بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے حضرت سے نفس کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا کہ کس نفس کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو۔ کہا کہ کیا ایک نفس کے علاوہ اور بھی نفس ہیں فرمایا کہ ہاں نفس کی متعدد قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک نفس نامیہ ہے جس سے جسم کی نشو ونما وابستہ ہے اور ایک نفس حیوانیہ ہے جو اس حواس ظاہرہ کا مرکز ہے۔ نفس نامیہ پانچ قوتوں کا سرچشمہ ہے ماسکہ' جاذبہ' ہاضمہ' دافعہ اور مربیہ' قوت ماسکہ وہ ہے جو فضلات کو روکے رکھتی ہے۔ قوت جاذبہ وہ ہے جو غذا کو اندر کی طرف جذب کرتی ہے۔ قوت ہاضمہ وہ ہے جو غذا کو ہضم کرکے جزو بدن بننے کے قابل بناتی ہے۔ قوت دافعہ وہ ہے جو فضلات کو باہر نکالتی ہے اور قوت مربیہ وہ ہے جو جوہر غذا کو تمام اعضاء میں حسب ضرورت تقسیم کرتی ہے۔

یونہی نفس حیوانیہ میں پانچ قوتیں کار فرما ہیں۔ سامعہ' باصرہ' شامہ' ذائقہ اور لامسہ' قوت سامعہ وہ ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف آوازیں سنتا ہے۔ قوت باصرہ وہ ہے جس کے ذریعہ دیکھتا اور مختلف اشیاء کے اشکال و الوان میں امتیاز کرتا ہے۔ قوت شامہ وہ ہے جس کے ذریعہ سونگھتا اور خوشبودار بدبو میں تمیز کرتا ہے۔ قوت ذائقہ وہ ہے جس کے ذریعہ مختلف اشیاء کی شیرینی' تلخی وغیرہ ذائقوں کا احساس ہوتا ہے اور قوت لامسہ وہ ہے جس کے ذریعہ گرمی و سردی اور سختی و نرمی محسوس کرتا ہے۔

مختلف اعضاء کے افعال و خواص کے سلسلہ میں فرمایا:

العقل فی الدماغ و الضحک فی الکبد و الرافۃ فی الطحال و الصوت فی الرئۃ۔

عقل کا تعلق دماغ سے' ہنسی کا جگر سے' نرمی و رافعت کا تلی سے اور آواز کا پھیپھڑے سے ہے۔

(عقد الفرید)

تشخیص امراض

علم طب میں تشخیص مرض کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اسی پر علاج کے مؤثر و کارگر ہونے کا انحصار ہے۔ اگر تشخیص صحیح نہ ہوگی تو علاج بھی مفید ثابت نہ ہوگا۔ اگرچہ بعض امراض کے علائم واضح ہوتے ہیں مگر بعض امراض کی علامتیں مشترک نوعیت کی ہوتی ہیں جن میں خفیف سا فرق ہوتا ہے اور ایک حاذق و ماہر طبیب کی دور رس نظریں ہی اس فرق کو محسوس کر سکتی ہیں اس لئے طبیب کے لئے فراست و دانائی اور نظر کی گہرائی از بس ضروری ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام اگرچہ رسمی طبیب نہ تھے مگر فصل خصومات کے سلسلہ میں مختلف عوارض کے جو علامات بیان کئے ہیں اس سے فن تشخیص میں آپ کی حذاقت و فنی مہارت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

عرب کی ایک بادیہ نشین لڑکی جوہڑ میں نہا رہی تھی کہ اثنائے غسل میں ایک جونک اس کے شکم میں داخل ہوگئی اور اس کے بڑھاؤ سے پیٹ بھی بڑھنے لگا جب اس لڑکی کے بھائیوں نے یہ دیکھا تو اسے بدچلن سمجھ کر قتل کرنا چاہا مگر انہی میں سے دو ایک نے کہا اسے امیرالمومنینؑ کے سامنے پیش کرنا چاہئے تاکہ وہ اسے مناسب سزا دیں۔ چنانچہ اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے جب شکم کے بڑھاؤ کے علاوہ کوئی اور علامت حمل کی نہ پائی تو ایک طشت میں گیلی مٹی منگوائی اور فرمایا کہ اسے علیحدگی میں اس پر بیٹھا دیا جائے چنانچہ اسے بٹھا دیا گیا ابھی اسے بیٹھے ہوئے کچھ دیر گزری ہوگی کہ جونک مٹی کی بو پا کر باہر آگئی اور پیٹ کا بڑھاؤ ختم ہوگیا۔ جب اس کی پاکدامنی ظاہر ہوگئی تو وہ خوش خوش اپنے بھائیوں کے ساتھ چلی گئی جن جن لوگوں نے یہ واقعہ سنا وہ حضرت کی حذاقت و فراست پر دنگ رہ گئے۔

اس قسم کا ایک واقعہ مشہور طبیب ابوبکر رازی متوفی ۳۱۱ھ کو بھی پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک شخص بغداد سے رے آرہا تھا کہ اس کے منہ سے خون آنا شروع ہوگیا۔ جب وہ رے پہنچا تو رازی کے پاس علاج کے لئے آیا اس نے نبض اور قارورہ دیکھنے اور مرض کا جائزہ لینے کے بعد کوئی ایسی علامت نہ پائی جس سے سل یا اندرونی زخم کا فیصلہ کرتا اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد پوچھا کہ تمہیں راستہ میں کن کن جگہوں سے پانی پینا پڑا۔ اس نے کہا صاف و شفاف پانی کے علاوہ تالابوں اور جوہڑوں کا گدلا پانی بھی پیتا رہا ہوں۔ وہ سمجھ گیا کہ کسی جوہڑ سے پانی پیتے ہوئے جونک اس کے پیٹ میں داخل ہوگئی جس کی وجہ سے منہ سے خون آرہا ہے۔ کہا کہ میں اس شرط پر تمہارا علاج کروں گا کہ تم اپنے غلاموں سے کہو کہ وہ علاج کے سلسلہ میں میرا ہر حکم مانیں۔ اس نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا اور دوسرے دن اپنے غلاموں کو لیکر وہاں پہنچ گیا۔ رازی نے کائی کے بھرے ہوئے دو لگن منگوائے اور اسے کھانے کیلئے کہا۔ اس نے جبر

کر کے تھوڑی سی کائی چکھی اور پھر ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ اب اس سے زیادہ نگل نہیں سکتا۔ رازی نے اس کے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ اسے زمین پر لٹا کر زبردستی اس کے منہ میں ٹھونستے جائیں۔ جب کائی کا ایک بھرا ہوا لگن اس کے پیٹ میں ٹھونس دیا گیا تو اسے قے آئی اور کائی میں لپٹی ہوئی جونک باہر آگئی اور وہ شفایاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا بعید ہے کہ رازی کے پیش نظر امیرالمومنین کا مذکورہ بالا واقعہ رہا ہو اور اسی سے اس کا ذہن ادھر متوجہ ہوا ہو کہ جوہڑوں سے پانی پیتے ہوئے جونک بھی پیٹ میں داخل ہو سکتی ہے۔

آنکھوں کی بینائی کا جدید طریقہ تشخیص یہ ہے کہ مریض کے سامنے ساڑھے چار فٹ کے فاصلہ پر ایک چارٹ لٹکا دیا جاتا ہے جس میں اوپر کی سطر جلی اور اسی طرح بعد کی سطریں بالترتیب خفی ہوتی جاتی ہیں اور آنکھوں پر مختلف نمبر کے شیشے لگا کر بینائی کی جانچ کی جاتی ہے۔ اگر ایک آنکھ کا امتحان لینا ہو تو دوسری آنکھ کے آگے سیاہ شیشہ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ چارٹ سنیلن کی ایجاد ہے اس لئے اسے سنیلن چارٹ کہا جاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ کے دور میں نہ سینلن چارٹ ایجاد ہوا تھا اور نہ جدید آلات ہی تھے اس وقت آپ نے بینائی کے امتحان کے سلسلہ میں جو طریق کار اختیار کیا اسے موجودہ ترقی پذیر صورت کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو واقعے درج کئے جاتے ہیں۔

دو شخص آپس میں لڑ پڑے اور ایک نے دوسرے کی آنکھ پر ضرب لگائی جس سے اس کی آنکھ کی بینائی میں فرق آگیا۔ یہ معاملہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا تو آپؑ نے فرمایا کہ اس کی صحیح آنکھ پر پٹی باندھو اور ایک انڈا لے کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ اس سے دریافت کرو کہ انڈا اسے نظر آتا ہے اگر وہ ہاں کہے تو اور پیچھے ہٹ کر دریافت کرو یہاں تک کہ اتنے فاصلے پر پہنچ جاؤ کہ وہ یہ کہے کہ اب نظر نہیں آتا پھر صحیح آنکھ کھول کر مضروب آنکھ پر پٹی باندھو اور اسی طرح انڈا اس کے بالمقابل کر کے دریافت کرو یہاں تک کہ اتنے فاصلے پر پہنچ جاؤ کہ یہ کہے کہ اب نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد دونوں فاصلوں کو ناپ لو اور جتنا فرق نکلے اس کے مطابق بینائی کم ہوئی ہوگی اور اسی حساب سے دیت کا حقدار ہوگا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص کی آنکھوں پر ضرب لگائی جس سے اس کی دونوں آنکھوں کی بنائی میں فرق آگیا۔ حضرت نے اس کے سامنے انڈا رکھ کر دریافت کیا کہ تمہیں یہ نظر آتا ہے اس نے کہا کہ ہاں پھر اتنی دور پیچھے ہٹ گئے کہ اس نے کہا کہ اب نظر نہیں آتا۔ یونہی چاروں سمت کی طرف گھوم کر اس سے پوچھا اور پھر چاروں سمتوں کے فاصلہ کو ناپا جب ہر سمت کا فاصلہ یکساں نکلا تو فرمایا کہ تم نے صحیح کہا ہے اور غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ پھر اسی سن وسال کے ایک شخص کو بلایا اور اسی طرح اس کی بنائی کو جانچا اور دونوں شخصوں کے فاصلہ میں جو تفاوت نکلا اس کے مطابق اس کی بصارت کی کمی کا فیصلہ کیا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص کے سر پر چوٹ لگائی جس سے اس کی بینائی اور قوت گویائی جاتی رہی اور قوت

۔ ۔ ی جواب دے گئی۔ حضرت کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ سچ کہتا ہے تو ان تینوں چیزوں کی الگ الگ دیت پانے کا حقدار ہوگا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ سچ کہتا ہے۔ فرمایا کہ قوت شامہ کا امتحان اس طرح لو کہ شدید قسم کی کوئی بدبو دار چیز اس کی ناک کے قریب لے جاؤ اگر یہ سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دے اور اس کی آنکوں میں پانی بھر آئے تو یہ جھوٹا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ سچا ہے اور بینائی کو اس طرح جانچو کہ اسے سورج کے سامنے کھڑا کرو۔ اگر اس کی آنکھیں بند ہو جائیں تو یہ جھوٹا ہے اور کھلی رہیں تو سچا ہے اور گویائی کا امتحان اس طرح لو کہ اس کی زبان میں سوئی چبھو کر دیکھو۔ اگر سرخ خون نکلے تو جھوٹا ہے اور سیاہ خون نکلے تو سچا ہے۔

ایک شخص نے یہ ادعا کیا کہ وہ ازالہ بکارت پر قادر نہیں۔ حضرت نے اس سے کہا کہ تم نرم زمین پر پیشاب کرو اور قنبر سے فرمایا کہ دیکھو اگر پیشاب سے زمین میں گڑھا سا پڑ گیا ہو تو یہ جھوٹا ہے اور اگر گڑھا نہ پڑا ہو تو سچا ہے۔

ایک شخص کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ نامرد ہے۔ حضرت نے قنبر سے فرمایا کہ اسے نہر میں اتارو اگر سرد پانی سے اس کا عضو سکڑ جائے تو یہ نامرد نہیں ہے اور اگر نہ سکڑے تو یہ نامرد ہے۔ اطباء قدیم و جدید کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اگر سرد پانی سے عضو سکڑے تو قابل علاج ہے ورنہ ناقابل علاج کیونکہ سرد پانی کی ٹھنڈک سے متاثر نہ ہونا اس کی علامت ہے کہ حس اعصابی ختم ہو چکی ہے۔

دستور معالجات

اصل معالج انسانی طبیعت ہے جو اپنی قوت مقاومت سے مرض کو دباتی اور قوائے بدنی کو ان کی اصلی حالت کی طرف پلٹاتی ہے۔ چنانچہ بقراط کا قول ہے **ان الطبیعة فی التی تشفی المریض** "طبیعت ہی بیمار کو صحت بخشتی ہے" ابن ازہر اندلسی نے تجربہ کے ذریعہ ثابت کیا کہ طبیعت ہی تمام جسمانی افعال پر حکمران ہے اور وہی بدن کی اصلاح اور مرض کا ازالہ کرتی ہے۔ یہ طبیعت ہی کی اثر اندازی کا کرشمہ ہے کہ اگر ایک تندرست انسان اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ وہ مریض ہے تو اس کا واقعی مریض ہو جانا کچھ بعید نہ ہوگا۔ چنانچہ بعض بیماریاں بیماری کے خیال میں ڈوبے رہنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اکثر کمزور طبیعت افراد اس کی زد میں آجاتے ہیں اس کے برعکس اگر کوئی بیمار اپنے آپ کو تندرست خیال کرے تو یہ ذہنی تاثر طبیعت کا رخ صحت کی طرف موڑ دے گا اور بعید نہیں کہ وہ اسی تصور کے زیر اثر تندرست ہو جائے یا کم از کم مرض بڑھنے نہ پائے۔

امیرالمومنینؑ بھی مریضوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو تندرست تصور کریں تاکہ یہ تصور مرض کے

مقابلہ میں طبیعت کی قوت مدافعت بحال رکھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:

امش بدائک ما مشی بک۔ مرض میں جب تک ہمت ساتھ دے چلتے پھرتے رہو۔

مقصد یہ ہے کہ چلتے پھرتے رہنا طبیعت کا رخ موڑنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے اور بستر پر پڑے رہنے سے بیماری کا خیال گھیرے رہتا ہے اور یہ پریشان خیالی مرض کی تقویت کا باعث ہوتی ہے لہٰذا دواؤں کے بجائے بیماری کے خدشہ سے دل و دماغ کو خالی رکھنے اور ارادہ کی مضبوطی سے بیماری پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

اطباء کی متفقہ رائے ہے کہ اگر غذا سے علاج ہو سکتا ہو تو دوا کا استعمال نہ کیا جائے اور اگر دوا کی ضرورت پڑ جائے تو مفرد دوا استعمال کی جائے اور جہاں تک ہو سکے مرکب ادویہ سے پرہیز کیا جائے۔ ابوبکر محمد ابن زکریا رازی کا قول ہے:

مهما قدرت ان تعالج بالاغذية فلا تعالج بالا دوية و مهما قدرت ان تعالج بدواء مفرد فلا تعالج بالدواء المركب۔ اگر غذا سے علاج کرنا تمہارے لئے ممکن ہو تو دوا سے علاج نہ کرو اور جہاں مفرد دوا سے علاج ہو سکے وہاں مرکب دوا استعمال نہ کرو۔

حکماء قدیم حتی الامکان مفرد ادویہ ہی سے علاج کرتے تھے اور دوسری ادویہ سے ترکیب دیتے تھے تو اس کی غرض یہ ہوتی تھی کہ دوا کی اصلاح کی جائے یا اس کی قوت کو بڑھایا جائے یا اس کے ضرر کو کم کیا جائے یا مرض کی نوعیت اور مریض کے مزاج کا تقاضا یہ ہو کہ مرکب دوا استعمال کی جائے۔ دوا کا کام تو بس اتنا ہے کہ جس مرض کے لئے وہ استعمال کی جا رہی ہے طبیعت کو اس کے ازالہ پر آمادہ کر دے مگر اس افادی پہلو کے ساتھ دوسرے اعتبار سے مضر و نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ دوا کا استعمال بہر حال غیر طبعی ہے جو مرض کے لحاظ سے مفید اور عمومی صحت کے اعتبار سے مضر ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مشہور موجد ایڈیسن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوا تو اس کے دوستوں نے اصرار کیا کہ کسی معالج کی طرف رجوع کرنا چاہئے چنانچہ وہ ایک معالج کو لے آئے اس نے دیکھا بھالا اور دوا تجویز کی جب وہ چلا گیا تو ایڈیسن نے دوا زمین پر پھینک دی۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ معالج کو زندگی کی ضرورت تھی اس لئے میں آمادہ ہوگیا کہ اسے بلا لیا جائے اور اس سے دوا خرید لی جائے اور میں بھی جینا چاہتا ہوں اس لئے دوا کو استعمال کرنے کے بجائے پھینک دیا ہے۔

آرتھر شوپنہار بھی اس کا قائل تھا کہ صحت و تندرستی عطاروں اور ویدوں سے خریدی نہیں جا سکتی چنانچہ اس نے زندگی بھر کبھی دوا استعمال نہیں کی۔

امیرالمومنینؑ کے طبی کلمات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علاج بالغذاء کو علاج بالدواء پر ترجیح دیتے اور ضرورت کے مواقع پر مفرد دوا تجویز کرتے اور ناگزیر صورت کے علاوہ دوا کے استعمال کی اجازت نہ دیتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

لا یتداوی المسلم حتی یغلب مرضه صحته۔ جب تک مرض صحت پر غالب نہ آجائے کوئی مسلمان دوا استعمال نہ کرے۔

طب کا یہ کلیہ ہے کہ امراض حارہ کا علاج اشیاء باردہ سے کیا جائے اور امراض باردہ کا علاج اشیاء حارہ سے کیا جائے حضرتؑ کا دستور علاج بھی یہی تھا۔ چنانچہ اس دستور کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا:

اکسر و احر الحمی بالعناب والماء البارد بخار کی گرمی کو بنفشہ عناب اور ٹھنڈے پانی سے توڑو عناب اور بنفشہ کا مزاج سرد ہے جو بخار کی حرارت کو فرو کرتے ہیں اور ٹھنڈا پانی بھی مفید ہے۔ خصوصاً اس بخار میں جو دھوپ میں چلنے پھرنے کی وجہ سے ہو۔

تدابیر حفظان صحت

حکماء یونان کے نزدیک حفظان صحت کے اصولوں کو علاج پر فوقیت حاصل ہے اگر ان اصولوں کی پابندی کی جائے تو ان بیماریوں سے تحفظ ہو سکتا ہے۔ جو بے اعتدالی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں کیونکہ کہ طبیعت کی قوت مقاومت مضمحل نہیں ہوتی اور مولد امراض جراثیم کے مقابلہ کی طاقت بحال رہتی ہے بلکہ جہاں علاج کارگر ثابت نہیں ہوتا وہاں احتیاطی تدابیر کے ذریعہ مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے:

لا تنال الصحة الا بالحمية تم پرہیز ہی سے صحت یاب ہو سکتے ہو

حفظان صحت کا اولین اصول یہ ہے کہ مضر صحت اشیا سے پرہیز کیا جائے اور کھانے پینے میں احتیاط برتی جائے کیونکہ اکثر بیماریاں کھانے پینے میں بے احتیاطی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

المعدة بیت الداء والحمیة راس الدواء معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز سو دواؤں کی ایک دوا ہے

معدہ کے عمل کو متوازن رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ بے ضرورت نہ کھایا جائے اور جب کھانے بیٹھے تو نہ زیادہ پیٹ بھرے اور نہ بھوکا رہے اس لئے کہ زیادہ خوری پھیپھڑوں کے لئے مضر ہے اور بھوک قوت حیات کو کم کر دیتی ہے۔

حضرتؑ کا ارشاد ہے:

لا تجلس علی الطعام الا وانت جائع ولا تقم عن الطعام الا وانت تشتهیه وجود المضغ و اذا نمت فاعرض نفسک علی الخلاء فاذا استعملت ہذا استغنیت عن الطب۔

جب بھوک ہو اس وقت کھانے کے لئے بیٹھو اور ابھی کچھ بھوک باقی ہو کہ اٹھ کھڑے ہو۔ کھانا خوب چبا کر کھاؤ اور سونے سے پہلے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو جاؤ۔ جب اس پر عمل کروگے تو علاج معالجہ سے مستغنی ہو جاؤ گے۔

کھانے کی ابتداء نمک سے کرنا چاہئے۔ حضرت فرماتے ہیں:

ابدو ا بالملح فی اول طعامکم فلو یعلم الناس ما فی الملح لا ختار علی الدریاق المجرب۔

کھانے کی ابتدا نمک سے کرو۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں کیا فائدے ہیں تو اسے تریاق آزمودہ پر ترجیح دیں۔

نمک انسانی جسم کی نشوونما کے لئے ضروری ہے جب یہ معدہ میں پہنچتا ہے تو اس سے نمک کا تیزاب بنتا ہے جو دوسرے اجزا کے ساتھ مل کر کھانے کو ہضم کرتا ہے۔

رات کو خالی شکم نہ سونا چاہئے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ترک العشاء خراب البدن۔

رات کو نہ کھانا خرابی بدن کا باعث ہوتا ہے۔

کھانا ٹھنڈا ہونے پر کھانا چاہئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

اقروا الحار حتی یبرد۔

کھانے کو رکھا رہنے دو یہاں تک کہ ٹھنڈا ہو جائے۔

ایک وقت میں مختلف کھانوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

حضرتؑ کا ارشاد ہے:

الالوان یعظمن البطن۔

رنگا رنگ کے کھانوں سے پیٹ بڑھ جاتا ہے۔

گوشت کثرت سے استعمال نہ کرنا چاہئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لا تجعلوا بطونکم قبور الحیوان

اپنے شکموں کو جانوروں کا گورستان نہ بناؤ

دن کو کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا چاہئے۔ اس سے اعصابی کھچاؤ کم ہوتا ہے اور قوت عمل عود کرتی آتی ہے اور رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنا چاہئے اس لئے کہ چلنا پھرنا ہضم طعام میں معین ہوتا ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

یتمدد بعد الغداء و یتمشی بعد العشاء۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹ جانا چاہئے اور رات کے کھانے کے بعد چلنا پھرنا چاہئے۔

شکم سیر ہونے کے بعد غسل کرنا مضر صحت ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

دخول الحمام علی البطنة من شر الداء شکم سیر ہو کر حمام میں جانا مرض کا باعث ہے۔

تمام مشروبات میں پانی سب سے بہتر مشروب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے:

الماء سید الشراب فی الدنیا و الاخرة۔ پانی دنیا و آخرت میں تمام مشروبات کا سردار ہے۔

پانی کم مقدار میں پینا چاہئے کیونکہ زیادہ پانی پینے سے معدہ کے رطوبات بڑھ جاتے ہیں جس سے نظام ہضم میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اشرب علی ظماء و لیقل من شرب الماء۔ پیاس ہو تو پانی پیو اور پانی کم پینا چاہئے۔

پانی انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے پانی اس حرارت کو جو خون کی آمد و شد سے پیدا ہوتی ہے حد اعتدال پر رکھتا ہے۔ اگر دوران خون سے پیدا ہونے والی گرمی بڑھ جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ اگرچہ تنفس حرارت کو فرو کرنے میں معین ہوتا ہے مگر اس حد تک تسکین نہیں ہوتی جو زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ یہ مقصد پانی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پانی ایک طرف حرارت کو فرو کرتا ہے اور دوسری طرف پسینہ اور پیشاب کے ذریعہ غلیظ مادوں کے اخراج کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ان سمی مواد کا اخراج نہ ہو تو انسان ہلاکت سے دو چار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ فوائد صحیح طور پر اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب پانی پاک و صاف اور اپنی اصلی حالت پر ہو۔ کنوئیں، جوہڑوں اور تالابوں کا پانی عموماً کثافت سے آلودہ ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ نہروں اور دریاؤں میں بھی ایسی چیزوں کی آمیزش ہو جاتی ہے جو صحت کے لئے مضر ہوتی ہیں۔ البتہ بارش کا پانی تمام کثافتوں اور موالد امراض جراثیم سے پاک ہوتا ہے اس لئے بارش کا پانی دوسرے پانیوں سے بہتر ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

اشربوا ماء السماء فانه یطهر البدن و یدفع الاسقام۔ بارش کا پانی پیو، یہ بدن کا تطہیر اور امراض کو دور کرتا ہے۔

دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کرنا چاہئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

السواک یجلو البصر

مسواک سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

دانتوں کی بیماریوں سے تحفظ کے لئے دانتوں کی صفائی از بس ضروری ہے اور صفائی کے لئے مسواک سے بہتر اور

کوئی ذریعہ نہیں۔ اس سے دانتوں کی صفائی بھی ہوتی ہے۔ اور منہ کے غلیظ رطوبات بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ مسواک دائیں جانب بائیں جانب اور بائیں جانب سے داہنی جانب کے بجائے اوپر کے دانتوں میں اوپر سے نیچے اور نیچے کے دانتوں میں نیچے سے اوپر کی جانب کرنا چاہئے تاکہ دانتوں کی دڑاڑوں سے غذا کے ذرات نکل آئیں اور ذرات کے تعفن سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں ان سے محفوظ رہیں۔ امیرالمومنینؑ کے مسواک کرنے کا یہی طریقہ تھا اور آپ طولا" مسواک کرنے کے بجائے عرضا" مسواک کرتے تھے۔

دھوپ میں زیادہ دیر بیٹھنے سے جسم کمزور پڑ جاتا ہے۔ اگر بیٹھنا ہی ہو تو سورج کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھو موسم سرما کے آغاز میں سردی سے بچنا چاہئے اور آخر سرما میں سردی سے بچاؤ کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

تو توا البرد فی اولہ و تلقوہ فی اخرہ فانہ یفعل فی الابدان کفعلہ فی الا شجار اولہ یحرق و آخرہ یورق۔

شروع سردی میں سردی سے احتیاط کرو اور آخر میں اس کا خیر مقدم کرو کیونکہ سردی جسموں میں وہی اثر کرتی ہے جو درختوں میں کرتی ہے ابتداء میں درختوں کو جھلس دیتی ہے اور آخر میں سرسبز و شاداب کرتی ہے۔

زرا بن جیش کہتے ہیں:

قال امیرالمومنین اربع کلمات فی الطب لوقالھا بقراط او جالینوس لقدم امامھا مائة ورقة ثم زینھا بھذہ الکلمات۔

امیرالمومنین نے طب کے بارے میں یہ چار کلمے ایسے فرمائے ہیں کہ اگر بقراط یا جالینوس کہتے تو ان جملوں کے شروع میں سو ورق پیش لفظ کے طور پر تحریر کرتے اور پھر ان جملوں سے صفحہ کتاب کو آراستہ کرتے۔

(بحار الانوار ج ۱۴ ص ۵۴۷)

خواص مفردات

مفردات کے خواص و افعال کا علم بھی طب کا ایک اہم باب ہے اسی سے مختلف چیزوں کے امزجہ و اثرات کا علم ہوتا ہے اور مختلف طبائع کے اعتبار سے ان کے فائدہ بخش یا ضرر رساں ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ ذیل میں چند چیزوں کے خواص کے بارے میں حضرت کے ارشادات درج کئے جاتے ہیں۔

العسل شفاء من كل داء لا دواء فيه يقل البلغم و يجلو القلب۔

شہد ہر مرض کی بے ضرر دوا ہے جو بلغم کو چھانٹتی اور دل کو جلا بخشتی ہے۔

الخل يكسر المره و يطفی الصفراء

سرکہ سودا کا زور توڑتا اور صفرا کا جوش کم کرتا ہے۔

اكل السفرجل قوة للقلب الضعيف و تطيب المعده

بہی کمزور دل کو تقویت دیتی اور معدہ کی اصلاح کرتی ہے۔

كلوا التفاح فانه نصوح المعده

سیب کھاؤ یہ معدہ کو قوی کرتا ہے۔

الكمثری يجلو القلب و يسكن اوجاع الجوف

ناشپاتی دل میں جلا پیدا کرتی اور درد شکم کو دور کرتی ہے۔

كلوا الرمان بشحمه فانه دباغ للمعده۔

انار کو اس کی باریک جھلی کے ساتھ کھاؤ کیوں کہ یہ معدہ کو تقویت دیتی ہے۔

عليكم باكل التين فانه نافع للقولنج۔

انجیر کھاؤ یہ قولنج کے لئے مفید ہے۔

العدس يرق القلب و يسرع الدمع كلوا الدبا فانه يزيد فی الدماغ

مسور دل کو نرم کرتا ہے اور آنسو لاتا ہے۔ کدو کھاؤ یہ دماغی قوت کو بڑھاتا ہے۔

لحم البقر داء و بسنها شفاء و سمنها دواء۔

گائے کا گوشت مرض، دودھ شفا اور گھی دوا ہے۔

لاتدمنوا اكل السمك فانه ينهك الجسد

بلاناغہ مچھلی نہ کھاؤ۔ اس سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔

مضغ اللبان يشد الاضراس

کندر کا چبانا دانتوں کو مضبوط کرتا ہے۔

الزبيب يشيد القلب و يذهب بالمرض و يطفی الحرارة ويطيب النفس۔

منقی دل کو قوی مرض کو زائل حرارت کو کم اور دل میں خوشی پیدا کرتا ہے۔

اکل الجوز فی شدۃ الحر یھیج الحر فی الجوف و یھیج القروح علی الجسد و اکلہ فی الشتاء یستخن الکیتین و یدفع البرد

سخت گرمی میں اخروٹ کھانے سے اندرونی حرارت جوش مارتی ہے اور بدن پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں اور سردی میں کھانے سے گردوں کی حرارت بڑھتی اور سردی دور ہوتی ہے۔

کلوا التمر فان فیہ شفاء من الادواء

خرما کھاؤ یہ بہت سی بیماریوں سے شفا دیتا ہے۔

خرما بہت سی بیماریوں کی روک تھام کرتا ہے کیوں کہ اس میں وٹامن اے کافی مقدار میں پایا جاتا ہے اور وٹامن اے کا خاصہ ہے کہ قوت مدافعت کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔ اگر جسم میں اس کی کمی ہو جائے تو خرما اس کمی کو پورا کرکے قوت دفاع کو بحال کر دیتا ہے اس کے علاوہ اس میں وٹامن بی اور سی بھی تھوڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ وٹامن بی ہضم کی خرابی کو دور کرتا ہے اور وٹامن سی کمزور رگوں کو تقویت دیتا ہے اور ہڈیوں اور دانتوں کی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

ان دیکھی مخلوق

ایک دور وہ تھا جب اس کرہ ارضی اور اس پر بسنے والی مخلوق ہی کو کل کائنات سمجھا جاتا تھا مگر جدید انکشافات نے بتایا ہے کہ یہ کرہ خاکی کل کائنات کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے بحر زخار کی سطح پر ایک لہر اور صحرائے وبسیط میں ایک ذرہ، اس وسیع کائنات کی حدود کا پھیلاؤ اس میں بسنے والی دیکھی اور ان دیکھی مخلوق کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ حساب اسے اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اگرچہ انسان نے زمین کی تہوں کو چیر کر اور فلک بوس پہاڑوں کو کھود کر مختلف دھاتوں اور پتھروں کا تجزیہ کیا ان کے گوناگوں اقسام گنوائے۔ نباتات کی قسموں کو بھی شمار کیا اور پرندوں اور چوپاؤں اور مختلف جانوروں کی قسمیں بھی گنوائیں۔ چنانچہ نباتات کی چار لاکھ قسمیں شمار کی جا چکی ہیں جن میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور حیوانات کی کم از کم دس لاکھ قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں مگر وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے جماد، نبات اور حیوانی کی تمام قسموں کا احاطہ کر لیا ہے کیونکہ کچھ مخلوق دیکھی جا سکتی ہے اور کچھ احاطہ بصری سے باہر ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

فلا اقسم بما تبصرون و مالا تبصرون۔

مجھے ان چیزوں کی قسم ہے جو تمہیں دکھائی دیتی ہیں اور جو تمہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

امیرالمومنینؑ نے بھی ایک خطبہ میں غیر مرئی مخلوق کا تذکرہ فرمایا ہے:

و رب ہذہ الارض التی جعلها قرارا للانام و مدر جاللهوام و الانعام و مالا یحصی مما یری ولا یری۔

اے اس زمین کے پروردگار جسے تو نے انسانوں کی قیام گاہ اور حشرات الارض اور چوپاؤں اور دیکھی اور ان دیکھی مخلوق کے چلنے پھرنے کا مقام قرار دیا ہے۔

اس ان دیکھی مخلوق میں وہ جراثیم بھی داخل ہیں جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہنے کے بعد اب جدید آلات کے ذریعہ مشاہدے میں آچکے ہیں ان جراثیم کی دریافت سے پہلے کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ایک جیتی جاگتی مخلوق ایسی بھی موجود ہے جو الگ سے اپنی دنیا بسائے ہوئے ہے مگر جب الیکٹرک خورد بین ایجاد ہوئی تو اس نے انسان کو اس ان دیکھی مخلوق سے روشناس کیا یہ جراثیم لمبائی میں ۵۰۰/۱ انچ سے لے کر ۴/۵۰۰۰ انچ تک ہوتے ہیں انہیں سب سے پہلے وان لیون ہوک نے جو ہالینڈ کے ایک قصبہ ڈیلف میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا دریافت کیا اور لوئی پاسچر اور ڈاکٹر رابرٹ نے مسلسل تجربات سے ثابت کیا کہ متعدی امراض کی تولید کا باعث یہی جراثیم ہوتے ہیں مگر مولد امراض جراثیم کی تعداد ان جراثیم سے کم ہوتی ہے جو زندگی کے لئے کار آمد اور زمین میں اجزائے حیاتیہ شامل کرکے اسے زرخیز بناتے ہیں۔ یہ جرثوے عموما" ہرشے میں ہوتے ہیں اور پانی کے ایک قطرے اور ہوا کے ایک جھونکے میں بڑی تعداد میں دوڑتے پھرتے رہتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ نے اس دور میں کہ جب جراثیم کا کوئی تصور نہ تھا پانی اور ہوا اور ان کی موجودگی کا پتہ دیا ہے۔ چنانچہ پانی میں اور کھلی چھت پر جہاں ہوا بے روک ٹوک چلتی ہے پیشاب کرنے سے منع کرنے کے بعد فرمایا:

فان للماء اهلا و للهواء اهلا۔ (تحف العقول ص ۲۲)

اس لئے کہ پانی میں بھی مخلوق بستی ہے اور ہوا میں بھی۔

تحقیق جدید نے پیشاب کے تجزیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں مختلف مواد اور نمکیات ہوتے ہیں جو ترکیبی صورت میں زہریلے اثرات کے حامل ہوتے ہیں خصوصا" یورک ایسڈ (تیزابی مادہ) اپنے اندر اتنی شدید سمیت رکھتا ہے کہ اگر اسے چھوا جائے تو زخم پڑ جائے اور کسی سنگین چیز پر ڈالا جائے تو اس میں سوراخ ہو جائے۔ جب تک پیشاب مثانہ کے اندر رہتا ہے اس کے سمی اثرات کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور جب جسم سے نکل کر ہوا سے مس ہوتا ہے تو سمی اثرات شدید ہو جاتے ہیں۔ یہ سمی اثرات پانی اور ہوا پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں کیوں کہ جب پانی اور ہوا میں تیزابی مادے کی آمیزش ہوگی تو ہوا کے جراثیم بھی متاثر ہوں گے اور پانی کے جراثیم بھی کیوں کہ ایسڈ (تیزاب) ہو یا الکی (سوڈا) اس میں جاندار زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ اگر پانی میں کمر تک ڈوب کر پیشاب کیا جائے تو پانی کے وہ جراثیم جو ایک قطرہ میں ہزاروں کی تعداد تک ہوتے ہیں پیشاب کی نالی میں داخل ہو کر تولید

مرض کا باعث ہوں گے کیوں کہ پانی کے جراثیم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت تیرتے ہیں۔

علم نفسیات

انسان کے خارجی اعمال اس کی باطنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے شعور یا لاشعور میں پوشیدہ میلانات اس کی زبان کے قلموں چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ پیر کی حرکتوں سے ظاہر ہو جاتے ہیں انہی افعال و اعمال کے حرکات و سکنات سے ذہنی کیفیت کے پرکھنے کا نام علم نفسیات ہے۔ یہ نفسیاتی حقائق تجربات سے حاصل کئے جاتے ہیں اور انسان اپنے ذہن اور اس کی کیفیات کو سامنے رکھ کر دوسروں کی ذہنی کیفیت پر حکم لگاتا اور ان کے افعال و حرکات سے ان کی اندرونی حالت کا جائزہ لیتا ہے چنانچہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ خوش و خرم ہے اور ایک پژ مردہ چہرے کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ کسی ذہنی تشویش میں مبتلا ہے۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے:

ما اضمرا حدیثاً الا ظهر فی فلتات لسانه و صفحات وجهه

جب کسی نے کوئی بات دل میں چھپا کر رکھنا چاہی تو وہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور چہرے کے آثار سے نمایاں ہو جاتی ہے۔

امیرالمومنینؑ کے زمانہ میں اگرچہ علم نفسیات رسمی طور پر مدون نہ ہوا تھا مگر آپ اس میں بصیرت نامہ رکھتے تھے۔ اور انسان کے حرکات و سکنات سے اس کے مخفی جذبات و عواطف کی تہ تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

کان یفهم اخلاق الناس فهم العالم المراقب لخفایا الصدور و یشرحها فی عظاته و خطباته شرح الادیب اللبیب۔
العبقریات ص ۸۵۶

حضرت علیؑ ایک عالم و بالغ نظر کی طرح لوگوں کے اخلاق و عادات کو سمجھتے تھے اور ان کے سینوں میں چھپے ہوئے جذبات ان کے سامنے آئینہ تھے۔ جن پر اپنے خطبات و مواعظ میں روشنی ڈالتے تھے۔

اس سلسلہ میں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کس سرعت ذہنی کے ساتھ اصل حقیقت کو بھانپ لیا کرتے تھے۔

ایک شخص اپنے غلام کو ساتھ لے کر سفرِ حج پر روانہ ہوا راستے میں غلام نے کوئی نا زیبا حرکت کی جس پر مالک نے اسے سزا دی وہ غلام طیش میں آگیا اور مالک سے کہنے لگا کہ میں تیرا غلام نہیں ہوں بلکہ تو میرا غلام ہے۔ اس پر

دونوں میں تکرار شروع ہو گئی اور وہ لڑتے جھگڑتے کوفہ میں امیرالمومنینؑ کے پاس آئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا کہ تم واپس جاؤ اور آپس میں تصفیہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تصفیہ نہ کر سکو تو کل میرے پاس آنا۔ ان کے جانے کے بعد حضرت نے قنبر سے فرمایا کہ دیوار میں دو سوراخ اتنے بڑے کر دو کہ ہر سوراخ میں ایک سر باسانی آسکے۔ دوسرے دن وہ لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم آپس میں کوئی تصفیہ نہیں کر سکے۔ حضرتؑ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے سر ان سوراخوں کے اندر داخل کریں۔ جب انہوں نے اپنے سر اندر داخل کئے تو قنبر سے کہا کہ میری تلوار لاؤ تاکہ میں اس غلام کی گردن اڑا دوں کیوں کہ اس نے آقا ہونے کا غلط دعویٰ کیا ہے۔ حضرت یہ سمجھتے تھے کہ ان میں سے جو غلام ہو گا وہ نفسیاتی طور پر مطمئن نہ ہو گا اس لئے وہ حکم قتل سنتے ہی سر باہر نکال لے گا چنانچہ یہی ہوا اور غلام نے فوراً سر باہر نکال لیا اور مالک بدستور اپنا سر سوراخ میں رکھے رہا۔ حضرتؑ نے اس غلام سے کہا کہ تو تو یہ کہتا تھا کہ میں مالک ہوں پھر تو نے جلدی سے سر باہر کیوں نکالا۔ جب اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو اس نے غلامی کا اعتراف کر لیا اور حضرت نے اسے مالک کے حوالے کر دیا۔

ایک بچہ جو ابھی گھٹنوں چلنے پایا تھا چھت پر کھیلتے ہوئے پرنالے میں سے نیچے جھانکنے لگا۔ ماں نے اس خیال سے کہ اگر بچے کو پیچھے ہٹانے کے لئے آگے بڑھی تو بچہ بھی آگے بڑھے گا اور زمین پر گر کر ہلاک ہو جائے گا اس نے چند آدمیوں کو مدد کے لئے بلایا انہوں نے باہر کی جانب زینہ لگایا مگر پرنالے کی بلندی تک نہ پہنچ سکے۔ وہ کوئی تدبیر سوچ ہی رہے تھے کہ امیرالمومنینؑ ادھر تشریف لے آئے۔ آپ نے یہ صورت دیکھی تو اسی سن و سال کا ایک بچہ طلب کیا اور اسے چھت پر لے جا کر اس بچے کے سامنے بٹھا دیا۔ جب اس نے اپنے ہم سن بچے کو دیکھا تو فوراً پرنالے سے باہر نکل آیا اور اس کی طرف لپکا اور اس طرح موت کے منہ سے بچ نکلا۔ حضرت نے بچے کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں سے مانوس ہوتا ہے اور ان کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی کی عمر کے بچے کو اس کے سامنے رکھ کر اسے ہلاکت سے بچا لیا۔

حضرت عمر کے دور حکومت میں دو عورتیں ایک بچے کو لے کر دربار خلافت میں آئیں اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ بچہ اس کا ہے مگر کسی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ حضرت عمر کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور امیرالمومنینؑ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جب وہ دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے انہیں سمجھایا بجھایا اور آخر میں انہیں ڈرایا دھمکایا مگر ان میں سے کوئی بھی اپنے دعویٰ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئی۔ جب سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آپ نے حکم دیا کہ ایک آری لائی جائے۔ ان عورتوں نے پوچھا کہ آری کا کیا ہو گا۔ فرمایا کہ میں اس بچے کے دو ٹکڑے کروں گا اور تم دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کر دوں گا۔ ان میں سے ایک تو چپ رہی اور دوسری نے چیخ کر کہا کہ یا امیرالمومنینؑ میں اپنے دعویٰ سے دست بردار ہوتی ہوں یہ بچہ اس کے حوالہ کر دیجئے۔

حضرتؑ نے یہ سنا تو فرمایا کہ یہ بچہ تمہارا ہی ہے اگر اس کا بچہ ہوتا تو یہ چپ نہ رہتی بلکہ اس کا دل بھی تڑپتا اور ماتا کا تقاضا ایسا کرنے سے مانع ہوتا۔ حضرتؑ نے ایک ماں کی نفسیات کو سمجھ لیا تھا وہ یہ گوارا کرے گی کہ بچہ دوسرے کو مل جائے مگر یہ گوارا نہ کرے گی کہ اس کے دو ٹکڑے کئے جائیں۔ چنانچہ آپ نے یہی نفسیاتی طریقہ اختیار کیا جس سے صحیح اور غلط دعویٰ کا فوراً پتہ چل گیا۔

حضرت عمر کے سامنے ایک عورت کو پیش کیا گیا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی۔ حضرت عمر نے اس سے پوچھا تو اس نے بے جھجک اس کا اقرار کیا۔ حضرت علیؑ اس موقع پر موجود تھے۔ آپؑ نے فرمایا کہ یہ اس طرح بانگ دہل اقرار کر رہی ہے جیسے اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ زنا حرام ہے اور اس کی سخت سزا ہے لہٰذا اس لاعلمی کی بنا پر اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔ حضرت نے جب اس کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اقرار کرتے ہوئے دیکھا تو نفسیاتی حیثیت سے فوراً سمجھ گئے کہ یہ زنا کی حرمت سے بے خبر ہے ورنہ اس طرح کھل کر اقرار نہ کرتی ابن قیم نے اس واقعہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ :

ھذا من دقیق الفراسۃ۔ یہ انتہائی دور رس فراست کا فیصلہ ہے۔

(الطرق الحکمیہ ص ۵۵)

اس قسم کا ایک واقعہ سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں بھی پیش آیا۔ چنانچہ صاحب تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ ایک عورت کو زنا کے جرم میں گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا۔ جب اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا میں یہ سمجھی تھی کہ جس طرح ایک مرد چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ہے کہ وہ چار مردوں سے تعلق رکھے مگر مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ یہ بات شرعاً ناجائز ہے لہٰذا میں آئندہ اس کی مرتکب نہیں ہوں گی۔ اس عذر لاعلمی کی بنا پر قانون اسے اپنی گرفت میں نہ لا سکا اور اسے چھوڑ دیا گیا۔

ایک شخص نے حضرت عمر سے اپنی ماں کی شکایت کی کہ وہ ماں ہونے سے انکاری ہے۔ حضرت عمر نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ وہ تمہاری ماں ہے اس نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور جب اس عورت سے دریافت کیا تو اس نے کئی گواہ پیش کئے کہ اس کی شادی ہی نہیں ہوئی کہ اس کے ماں بننے کا سوال پیدا ہو۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زیر حراست رکھا جائے تاکہ اسے افتراء پردازی کی سزا دی جا سکے۔ جب اسے زنداں کی طرف لے چلے تو امیرالمومنینؑ نے دیکھ کر دریافت کیا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ جب اس نے واقعہ بیان کیا تو آپ نے اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ کیا یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے' کہا کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ حضرت نے اس نوجوان سے کہا کہ تم بھی اس کے ماں ہونے سے انکار کر دو۔ اس نے کہا کہ یا ابوالحسنؑ یہ میری ماں ہے میں کیسے انکار کر دوں فرمایا کہ تم زبان سے کہہ دو کہ یہ میری ماں نہیں ہے۔ اس نے کہہ

دیا کہ یہ میری ماں نہیں اور میں اس کا بیٹا نہیں اس کے بعد حضرت نے اس عورت کے بھائیوں سے کہا کہ تم اس عورت کی ترویج کا مجھے اختیار دیتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ آپ مختار ہیں جو چاہیں کریں اور اس عورت نے بھی اپنی رضا مندی کا اظہار کیا۔ حضرتؑ نے قنبر سے فرمایا کہ فلاں جگہ پر کچھ درہم رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ جب قنبر درہم لائے تو آپؑ نے وہ درہم اس عورت کو دیے اور اس مجمع کو گواہ کرکے فرمایا کہ میں اس مہر پر اس کا عقد اس نوجوان سے کرتا ہوں۔ اس عورت نے یہ سنا تو چیخ کر کہا کہ :

یا ابا الحسن انه و الله ابنی۔ اے ابوالحسنؑ خدا کی قسم یہ میرا بیٹا ہے۔

اس کا باپ عجمی تھا۔ میرے بھائیوں نے اس سے میرا نکاح کر دیا تھا۔ اس بچے کی ولادت کے موقع پر اس کا باپ ایک جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ میں نے اسے ایک دوسرے قبیلہ میں بھیج دیا جہاں اس نے پرورش پائی۔ اب میرے بھائی مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اس کے بیٹا ہونے سے انکار کر دوں چنانچہ میں انکار کرتی رہی مگر اب صورت ایسی ہے کہ مجھے اعتراف حقیقت کی سوا چارہ نہیں ہے۔

امیرالمومنینؑ عورت کی اس فطرت کو سمجھتے تھے کہ وہ اپنی اولاد کے اولاد ہونے سے کسی دباؤ یا مصلحت کی بنا پر انکار تو کر سکتی ہے مگر اس ترویج پر کسی صورت میں آمادہ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آپ نے وہی طریق کار اختیار کیا جو اس کی فطرت کو جھنجھوڑ کر اسی امر واقع کے اعتراف پر مجبور کر دیا۔

علم الحساب

ابتدائی دور میں جب چیزوں کے شمار کی ضرورت محسوس کی گئی تو ہاتھ کی انگلیوں سے مدد لی جاتی تھی اور چوں کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دس ہیں اس لئے گنتی کی بنیاد دس پر رکھی گئی اور جب اس سے حساب و شمار کی ضرورت پوری نہ ہو سکی تو انگلیوں کی پوروں سے گنتی کا کام لیا جانے لگا۔ ان پوروں کی تعداد اٹھائیس ہے جن سے ایک ہزار تک کی گنتی پوری کی جاتی تھی۔ جیسے حروف تہجی ابجد ہوز وغیرہ سے جو تعداد میں اٹھائیس ہیں ایک ہزار تک کی گنتی کی جاتی ہے۔ ان پوروں پر شمار کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ داہنے ہاتھ کی چھنگلیاں کی پہلی پور پر ایک دوسری پور پر دو، تیسری پور پر تین اسی طرح شمار کرتے ہوئے انگشت شہادت کی پہلی پور پر دس تک کی گنتی پوری ہو جاتی ہے پھر انگشت شہادت کی دوسری پور پر بیس، تیسری پور پر تیس، انگھوٹے کی پہلی پر چالیس اور آخری پور پر پچاس شمار کئے جاتے پھر بائیں ہاتھ کی پہلی پور پر ساٹھ، دوسری پور پر ستر، تیسری پور پر اسی، چوتھی پور پر نوے اور پانچویں پور پر سو تک کی گنتی ختم ہوتی ہے، پھر چھٹی پور پر دو سو، ساتویں پور پر تین سو اور اسی طرح آخری پور پر ہزار تک کی گنتی تمام ہو

جاتی ہے۔ اس طریقہ شمار سے ایک ہزار تک کی گنتی کا کام تو نکل آتا تھا مگر طویل گنتی کے لئے یہ طریقہ نا کافی تھا۔ اس کے علاوہ عکائیوں' دھائیوں اور سینکڑوں کو الگ الگ بتانا پڑتا تھا۔ اس دشواری کو دیکھتے ہوئے مصریوں نے تصویروں کے ذریعہ تحریر اعداد کی بنیاد ڈالی اور ایطالیہ والوں نے عددوں کو حرفوں کی صورت میں ظاہر کیا۔

عرب میں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہندسوں کو حروف تہجی لکھنے کا رواج ہوا جو یونان میں پہلے سے رائج تھا اس طرح کہ جہاں ایک لکھنا ہوتا وہاں ا (الف) جہاں دو لکھنا ہوتا وہاں ب اور جہاں تین لکھنا ہوتا وہاں ج لکھ دیتے اور اسی طرح غ تک گنتی کو اختتام تک پہنچاتے۔ یہ طریقہ عرصہ تک مرسوم رہا اور اب بھی کہیں کہیں عددوں کے بجائے حروف لکھ دیئے جاتے ہیں مگر عموماً" عددوں کو ہندسوں کی صورت میں ہی لکھا جاتا ہے۔ جو آریہ قوم کی ایجاد ہے۔

عربوں کا علم حساب گنتی تک محدود تھا اور ان میں سے بھی بعض سو سے اوپر کی گنتی سے نا آشنا تھے۔ چنانچہ ابن طقطقی نے تاریخ فخری میں لکھا ہے کہ جب لشکر اسلام عجمیوں سے بر سرپیکار تھا تو ایک عرب کے ہاتھ ایک گلوبند لگا جس کی قدر و قیمت سے وہ ناواقف تھا ایک عجمی نے وہ ہار دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اسے فروخت کرو گے اس نے کہا کہ ہاں جب قیمت دریافت کی تو اس عرب نے ایک سو رائج الوقت سکہ مانگا اس نے فوراً" وہ رقم نکال کر دے دی اور ہار لے لیا۔ جب وہ سو روپیہ لے کر خوش خوش اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور واقعہ بیان کیا تو اس کے ساتھیوں نے کہا کہ تم نے سو سے زیادہ کیوں نہ مانگے۔ اگر تم زیادہ مانگتے تو وہ زیادہ دے دیتا۔ کہا کہ کیا سو سے اوپر بھی گنتی ہوتی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو سو سے زائد مانگتا۔

ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے کہ ابوہریرہ دوسی' ابو موسیٰ اشعری کے ہاں سے آٹھ لاکھ درہم لائے۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ کتنی رقم لائے کہا آٹھ لاکھ۔ حضرت عمر نے بار بار اس رقم کو دہرایا اور پوچھا کہ کتنے آٹھ سو ہوں تو یہ رقم بنتی ہے ابوہریرہ نے سو ہزار کو آٹھ مرتبہ دہرایا کہ آٹھ لاکھ کا مفہوم سمجھایا۔ حضرت عمرؓ اس تفصیل سے سمجھے کہ بڑی کثیر رقم ہے۔ اسی حساب و کتاب کے لئے حضرت عمر کو ایک حساب داں کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے والی شام کو لکھ کر روم کے ایک عیسائی کو مدینہ میں طلب کیا جو میراث کے مقررہ حصص کی تقسیم کر سکے۔ اسی طرح معاویہ نے بھی حساب کے نظم و انضباط کے لئے دفتر خراج کا افسر اعلیٰ ایک رومی عیسائی سرجون کو مقرر کر رکھا تھا۔

ان چند شواہد سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں علم حساب جس کے جاننے والے معدودے چند افراد تھے ابتدائی مراحل میں تھا اور تدریجی ترقی کرکے موجودہ مقام تک پہنچا ہے۔ اس وقت حساب کی باریکیوں کو سمجھنا اور انہیں حل کرنا آسان کام نہ تھا مگر امیرالمومنینؑ سے جو حسابی حل وارد ہوئے ہیں وہ اس امر کا روشن ثبوت ہیں کہ آپؑ اس علم میں حیرت انگیز حد تک دستگاہ رکھتے تھے بلکہ اس زمانہ پر نظر کرتے ہوئے آپؑ کی یہ فنی مہارت ایک معجزہ سے کم

نہ تھی۔ ملا عصمۃ اللہ سہارنپوری تحریر کرتے ہیں:

كان على فارها فى علم الحساب غاية الفراهة ولذا قيل انه كان معجزة من معجزات نبوة نبينا۔

حضرت علیؑ علم حساب میں انتہائی درجہ تک مہارت رکھتے تھے اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ ہمارے نبی کی نبوت کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھے۔

(شرح خلاصۃ الحساب)

ذیل میں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کا ذہن رسا حسابی گتھیوں کو کس آسانی سے سلجھا لیتا تھا۔

ایک یہودی نے حضرت سے دریافت کیا کہ وہ کونسا عدد ہے جس سے کسور تسعہ بغیر کسر کے نکل آئیں۔ فرمایا کہ ہفتہ کے دنوں کو سال کے دنوں میں ضرب دو تمہارا عدد مطلوب حاصل ہو جائے گا چنانچہ ۷ کو ۳۶۰ میں ضرب دی جائے تو حاصل ضرب ۲۵۲۰ ہوگا۔ یہ عدد دو پر تقسیم ہوگا کیونکہ یہ عدد زوج ہے اور تین پر بھی تقسیم ہوگا کیونکہ ۲۵۲۰ کا مجموعہ نو ہوتا ہے۔ اور نو تین پر قابل تقسیم ہو جاتا ہے لہٰذا عدد مذکور بھی چار پر تقسیم ہو جائے گا۔ اور پانچ پر بھی تقسیم ہوگا کیونکہ یہ عدد صفر پر ختم ہوتا ہے اور صفر پر ختم ہونے والا عدد سات کو تین سو ساٹھ میں ضرب دینے سے حاصل ہوا ہے لہٰذا یہ سات پر بھی تقسیم ہوگا اور جب اس عدد کے سمت راست کے تین ہندسے (۵۲۰) آٹھ پر تقسیم ہو جاتے ہیں، تو یہ عدد بھی آٹھ پر قابل تقسیم ہوگا اور چونکہ اس عدد کے ہندسوں کا مجموعہ ۹ ہے اور جس کا مجموعہ ۹ ہو وہ ۹ پر تقسیم ہو جاتا ہے لہٰذا یہ عدد بھی نو پر تقسیم ہوگا اور چونکہ یہ عدد صفر پر ختم ہوتا ہے لہٰذا دس پر بھی تقسیم ہوگا۔

ایک یہودی نے آپ سے دریافت کیا کہ وہ کون سا عدد ہے جو دو سے لے کر دس تک ہر عدد پر تقسیم ہو جاتا ہے اور اس عدد کا خارج قسمت بھی دو سے لے کر دس تک ہر عدد پر قابل تقسیم ہے مگر اس کا ۱/۸ چار پر ۱/۴ آٹھ پر اور ۱/۷ سات پر اور ۱/۹ نو پر اور ۱/۸ آٹھ پر تقسیم نہیں ہوتا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر میں یہ عدد بتادوں تو تم اسلام قبول کر لوگے کہا کہ ہاں میں مسلمان ہو جاؤں گا فرمایا کہ تم ہفتہ کے دنوں کو مہینہ کے دنوں میں ضرب دو اور حاصل ضرب کو سال کے دنوں میں ضرب دو تمہیں عدد مطلوبہ مل جائے گا۔ چنانچہ ہفتہ کے سات دنوں کو مہینہ کے تیس دنوں میں ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب ۲۱۰ ہوگا اور ۲۱۰ کو سال کے دنوں ۳۶۰ میں ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب ۷۵۶۰۰ ہوگا اور اس سے کسور تسعہ نکل آئیں گے لیکن اس کا ۱/۸ یعنی ۹۴۵۰ چار پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۴ یعنی ۱۸۹۰۰ آٹھ پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۷ یعنی ۱۰۸۰۰ سات پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۹ یعنی ۸۴۰۰ نو پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۸ یعنی ۹۴۵۰ آٹھ پر تقسیم نہیں ہوگا۔

دو اعرابی جن میں سے ایک کے پاس تین اور دوسرے کے پاس پانچ روٹیاں تھیں۔ ایک ساتھ کھانے کے لئے بیٹھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا جسے انہوں نے کھانے میں شریک کر لیا۔ جب کھا چکے تو اس شخص نے ان دونوں کو آٹھ درہم دیے جو ان روٹیوں کا معاوضہ تھا جو اس نے کھائی تھیں۔ جب وہ چلا گیا تو پانچ روٹیوں والے نے کہا کہ میں پانچ درہم لوں گا اور تین روٹیوں والے نے کہا کہ اس نے ہم دونوں کو یہ درہم دیے ہیں لہٰذا چار تم لو اور چار مجھے دو جب آپس میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو تصفیہ کے لئے حضرت کے پاس آئے۔ آپ نے تین روٹیوں والے سے کہا کہ تمہارا ساتھی تمہیں جو دیتا ہے وہ لے لو یہ تمہارے حق سے زیادہ ہے کیونکہ تمہارا حق صرف ایک درہم بنتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کیسے۔ فرمایا کہ روٹیاں آٹھ تھیں اور کھانے والے تین تھے لہٰذا ہر روٹی کے تین ٹکڑے قرار دے کر انہیں آٹھ میں ضرب دو۔ یہ کل چوبیس ٹکڑے ہوئے۔ ان چوبیس ٹکڑوں میں سے ہر ایک کے حصہ میں آٹھ آٹھ ٹکڑے آئے۔ تمہاری تین روٹیوں کے نو ٹکڑے ہوئے جن میں سے آٹھ تم نے خود کھائے اور ایک اس تیسرے آدمی نے اور تمہارے ساتھی کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے ہوئے جن میں سے آٹھ اس نے کھائے اور سات تیسرے شخص نے لہٰذا ایک ٹکڑے کے عوض ایک درہم تمہارا ہوا اور سات ٹکڑوں کے عوض سات درہم تمہارے ساتھی کے ہوئے۔ اس نے کہا یا امیرالمومنین آپ کا فیصلہ صحیح ہے' میں ایک درہم پر راضی ہوں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ سلطان آلپ ارسلان کو پیش آیا اس نے حلب سے پانچ سو من سنگ رخام اصفہان بھیجنا چاہا۔ دو شتربان اونٹوں پر بوجھ لاد کر اصفہان جا رہے تھے۔ سلطان نے یہ پتھر بھی انہیں لاد لینے کے لئے کہا۔ ان میں سے ایک کے چھ اونٹ تھے اور دوسرے کے چار اور ان دونوں نے پانچ پانچ سو من بوجھ پہلے سے اپنے اونٹوں پر لاد رکھا تھا۔ انہوں نے یہ پتھر بھی اس طرح لاد لیا کہ ہر اونٹ کا بوجھ برابر ہوگیا۔ جب اصفہان پہنچے تو سلطان نے ان دونوں کو ایک ہزار دینار دینے کا حکم دیا۔ اس کے وزیر نظام الملک طوسی نے چھ اونٹوں والے کو چھ سو اور چار اونٹوں والے کو چار سو دینار دیے۔ حسن ابن صباح ان ایام میں وہیں موجود تھا اس نے کہا کہ یہ تقسیم صحیح نہیں ہے۔ چھ اونٹوں والے کو آٹھ سو دینار اور چار اونٹوں والے کو دو سو دینار دینا چاہئیں۔ یہ بات سلطان کے کانوں تک پہنچی تو اس نے حسن ابن صباح کو بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ فیصلہ کس بنا پر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ان دونوں کے اونٹوں پر ایک ہزار من بار پہلے سے لدا ہوا تھا اور پانچ سو من پتھر لادا گیا۔ یہ کل وزن پندرہ سو من ہوا اور اونٹ دس تھے لہٰذا ہر اونٹ پر ڈیڑھ سو من بوجھ ہوگا۔ چار اونٹوں والے کو اونٹوں پر چھ سو من بوجھ ہوا' پانچ سو من پہلا بوجھ اور ایک سو من پتھر اور چھ اونٹوں والے کے اونٹوں پر نو سو من ہوا پانچ سو من پہلا بوجھ اور چار سو من پتھر جب پانچ سو من پر ایک ہزار دینار دیئے گئے ہیں تو جس نے ایک سو من لادا اسے دو سو اور جس نے چار سو من لادا اسے آٹھ سو دینار دینا چاہئیں۔ سلطان نے اس فیصلہ کو سراہا اور اسے صحیح قرار دیا۔ اس فیصلے کو حسن ابن صباح کی ذہانت و فراست کا

نتیجہ قرار دینا چاہئے کیونکہ امیرالمومنینؑ اسی نوعیت کا فیصلہ روٹیوں کے بارے میں فرما چکے تھے جو اپنی شہرت کی بنا پر یقیناً" حسن ابن صباح کے کانوں تک پہنچا ہوگا اور حضرت کے فیصلہ ہی سے اس کا ذہن اس فیصلہ کی طرف منتقل ہوگا فرق یہ ہے کہ امیرالمومنینؑ کا فیصلہ ایک اور سات کے تناسب سے تھا اور یہ فیصلہ ایک اور چار کے تناسب سے ہے۔

حضرتؑ کے پاس تین شخص آئے اور کہا کہ ہمارے پاس سترہ اونٹ ہیں ہم میں سے ایک کا نصف دوسرے کا ایک تہائی اور تیسرے کا نواں حصہ ہے ہم ان کی تقسیم سے قاصر ہیں لہٰذا حصہ رسدی ہم میں تقسیم کر دیجئے مگر قطع و برید کی نوبت نہ آئے۔ آپ نے ان اونٹوں میں ایک اونٹ اور شامل کرکے اٹھارہ اونٹ کر لئے اور نصف کے حصہ دار کو نو ایک تہائی کے حصہ دار کو چھ اور نویں حصہ کے حصہ دار کو دو اونٹ دیے اور اس طرح سترہ اونٹ ان میں تقسیم کر دیئے اور اٹھارواں اونٹ الگ کر لیا۔

یہ تقسیم بظاہر شرکاء کے اصل حصص کے مطابق نہیں ہے اس لئے کہ جسے نو اونٹ ملے ہیں اس کا حصہ ساڑھے آٹھ ہے اور جسے چھ اونٹ ملے ہیں اس کا حصہ پونے چھ ہے اور جسے دو اونٹ ملے ہیں اس کا حصہ ۸/۹ ہے ان حصص کی مجموعی تعداد ۱۶/۱۸ ہوتی ہے اور سترہ اونٹوں میں سے ۱۷/۱۸ حصص بچ رہتے ہیں۔ اگر انہیں بھی شرکاء کے بقدر حصص تقسیم کیا جائے تو ایک اونٹ کو نحر کرنا پڑتا ہے اور شرکاء یہ نہیں چاہتے تھے۔ اگر اونٹوں کو مذکورہ بالا طریق پر تقسیم نہ کیا جائے بلکہ تناسب حصص کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو یہ ایرا دوارد نہیں ہوتا۔ تقسیم تناسب کا طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے کل حصہ داروں کے حصص کو جمع کیا جائے۔ یہ حصص تین ہیں ۱/۲، ۱/۳ اور ۱/۹ ان تینوں کا حاصل جمع ۱۷/۱۸ ہوگا پھر پہلے کل حصہ داروں کے حصص کو جمع کیا جائے۔ یہ حصص تین ہیں ۱/۲، ۱/۳ اور ۱/۹ ان تینوں کا حاصل جمع ۱۷/۲ ہوگا ۱/۳ کا حاصل ضرب ۱۷/۳ ہوگا اور ۱/۹ کا حاصل ضرب ۱۷/۹ ہوگا پھر ہر ایک کے حاصل ضرب کو کل حصہ داروں کے حاصل جمع پر تقسیم کر دیا جائے تو ۱/۲ کے حصہ دار کو نو اور ۱/۳ کے حصہ دار کو چھ اور ۱/۹ کے حصہ دار دو اونٹ ملیں گے اور اس طرح سترہ اونٹ پورے تقسیم ہو جائیں گے اور باقی کچھ نہ بچے گا۔ حضرت نے اسی قاعدہ تناسب سے ان کے حصص نکالے ہیں مگر چونکہ اس وقت لوگ اس اصول تقسیم سے نا آشنا تھے۔ اس لئے آپ نے اٹھارواں اونٹ شامل کر کے تقسیم کی تاکہ ان کے حصص باآسانی ان کے ذہن نشین ہو جائیں۔

یہ روایت اس طرح بھی ہے کہ تین شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارے پاس انیس اونٹ ہیں ہم میں سے ایک کا نصف دوسرے کا ایک چوتھائی اور تیسرے کا پانچواں حصہ ہے انہیں بغیر قطع و برید کے ہم میں تقسیم کر دیجئے۔ حضرت نے حکم دیا کہ بیت المال میں سے ایک اونٹ لا کر ان اونٹوں میں شامل کر دیا جائے جب اونٹ بیس ہو گئے تو آپ نے نصف کے حصہ دار کو دس چوتھے حصہ کے حقدار کو پانچ اور پانچویں حصہ کے حقدار چار اونٹ دلائے۔ اس طرح انیس اونٹ ان میں تقسیم کر کے بیسواں اونٹ بیت المال میں واپس بھیج دیا۔

یہ تقسیم بھی سابقہ تقسیم کے مانند قاعدہ تناسب پر مبنی ہے اور اس کا طریقہ تقسیم بھی وہ ہی ہے جو سابقہ تقسیم میں تحریر ہوا ہے۔ حضرت نے جس طرح سترہ یا انیس اونٹوں کو ان کے شرکاء میں تقسیم کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نسبتوں کے اختصار اور تقسیم بہ اجزائے تناسبہ پر کامل دسترس رکھتے تھے اور یہ دیکھتے ہوئے آپ نے یہ فیصلہ اس دور میں کیا جب عرب حساب کے مبادیات سے بھی نا آشنا تھے تو آپ کے اس فیصلہ کو سرچشمہ الہام سے سیرابی ہی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

علم ہیئت

انسان نے جب سے اس کرہ خاک پر قدم رکھے وہ سورج کے طلوع و غروب، چاند کے گھٹاؤ بڑھاؤ اور ستاروں کی سیرو حرکت کے مناظر دیکھتا چلا آیا ہے۔ ان مناظر کی زیبائی و دلکشی نے اس کی متجسس نگاہوں کو اپنی طرف جذب کیا اور اس نے ان اجرام ارضیہ و فلکیہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس تحقیقی مشاہدہ کے نتیجہ میں علم ہیئت وجود میں آیا جس میں اجرام سماویہ کے مقادیر و حرکات اور ان کے طبعی خواص و آثار سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ علم تاریخی لحاظ سے قدیم ترین علوم میں شمار ہوتا ہے چنانچہ چینیوں کا دعویٰ ہے کہ طوفان نوح سے ایک سو برس پہلے ان کے ہاں رصد گاہیں تعمیر ہو چکی تھیں اور کلدانیوں میں بھی جو چار ہزار برس پیشتر ہو گزرے ہیں۔ ستارہ بینی کا شغف پایا جاتا تھا۔ انہوں نے سیاروں کو نظر غائر سے دیکھا ان کی گردش کا مشاہدہ کیا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں۔ قدیم مصریوں سے یونانیوں نے یہ علم سیکھا اور اس کی ترقی و ترویج کے لئے درس گاہیں تشکیل دیں۔ چنانچہ فیثا غورث نے جو ۵۰۰ قبل مسیح یونان میں علم ہیئت کا مشہور معلم ہو گزرا ہے کرتونا میں ہیئت کی تعلیم و تدریس کے لئے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد بطلیموس قلوذی نے جو تقریباً ۱۴۰ قبل مسیح متولد ہوا۔ سکندریہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور شاہ یونان کے لئے اپنی مشہور کتاب مجسطی تصنیف کی جس کی نظریات صدیوں تک ذہنوں پر چھائے رہے۔ یہ نظریات ہیئت بطلیموسی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ عباسین کے دور میں جو علوم یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوئے ان میں ایک ہیئت بطلیوسی ہے۔

جب یحییٰ ابن خالد برمکی متوفی ۱۹۱ھ کے حکم سے ابو حسان اور مسلم نے مجسطی کے ترجمے کئے تو ان تراجم کی بدولت عربوں کی ہیئت قدیم سے واقفیت حاصل کی اور بغداد قاہرہ اور اندلس میں اس کی تعلیم و تدریس کے لئے مدارس کھول دیئے گئے یہ قدیم نظریات تک حرف آخر سمجھے جاتے رہے اور آنکھ بند کر کے ان پر اعتماد کیا جاتا رہا۔ آخر سولہویں صدی مسیحی میں ہیئت قدیم کے نقوش دھندلے پڑ گئے اور ہیئت بطلیموسی کی جگہ ہیئت نیر کا پر نیکی سے پر پرزے نکالے۔

امیرالمومنینؑ نے قدرت کی عجائب آفرینی کے سلسلہ میں جو زمین و آسمان کی خلقت آفتاب و مہتاب کی جگمگاہٹ اور ستاروں کی نقل و حرکت کو تذکرہ کیا ہے اس سے جہاں قانون قدرت و مظاہر فطرت کی نقاب کشائی ہوتی ہے وہاں علم ہیئت کا بھی استفادہ ہوتا ہے اور آپ کے پیش کردہ نظریات ان انکشافات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں جو صدیوں کے مشاہدات اور فلک پیما آلات کے مرہون منت ہیں حالانکہ اس وقت نہ دور بینیں تھیں اور نہ رصد گاہیں' نہ لیبارٹریاں تھیں نہ تجربہ گاہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نہ قدیم ہیئت دانوں کے نظریات سے متاثر تھے اور نہ ان کے خوشہ چین بلکہ یہ علم موہبی کا کرشمہ تھا جس کی روشنی میں کائنات کی حقیقتوں پر نظر رکھتے تھے ذیل میں ارضی و سماوی اجرام کے بارے میں آپ کے چند نظریات درج کئے جاتے ہیں۔

حرکت زمین

قدیم ہیئت دانوں کا زمین کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ وہ کائنات کے مرکز پر واقع ہے اور تمام فلکی اجسام سورج' چاند' ستارے اور سیارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں لہٰذا اس مرکزیت کی بنا پر اس کیلئے ٹھہراؤ ضروری ہے کیونکہ جب دائرہ گھومتا ہے تو مرکز اپنے مقام پر ساکن و برقرار رہتا ہے اگرچہ اس دور میں اس کے خلاف بھی آوازیں اٹھیں۔ چنانچہ ۵۰۰ قبل مسیح فیثا غورث نے حرکت زمین کا نظریہ پیش کیا اور اس کے دو سو برس بعد استر خوس نے سورج کے گرد زمین کی سالانہ حرکت کا انکشاف کیا اور اس کے تیس برس بعد کیانتوس نے زمین کے لئے دو حرکتیں تجویز کیں مگر یہ نظریہ فروغ نہ پا سکا کیوں کہ ایک تو مشاہدہ اس کے خلاف تھا اور دوسرے حکیم ارسطو (۳۸۴۔ ۳۲۲' ق۔ م) حرکت زمین کا شدت سے مخالف تھا اور اس کے خلاف کوئی نظریہ پنپ نہ سکتا تھا اور جب بطلیموس نے بھی ارسطو کے نظریہ کی تائید کی تو یہ نظریہ ذہنوں میں راسخ ہوگیا اور جو نظریہ جڑ پکڑ لیتا ہے اس کے خلاف سننا تو درکنار کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ صدیوں تک اس نظریہ کی عملداری رہی اور زمین کو ساکن اور مرکز کائنات سمجھا جاتا رہا۔ ۱۴۴۰ء میں کوسا کے ایک پادری نکولس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین بھی ایک سیارہ ہے جو دوسرے سیاروں کی طرح اپنے مدارس میں حرکت کرتا ہے مگر اس نظریہ کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ پھر پولینڈ کے ماہر فلکیات کاپرنیکس (۱۴۷۳ء ۱۵۴۳ء) نے فلکیات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے لیکن اس سے کلیسا کے نظریات پر زد پڑتی تھی اور کلیسائی نظریات کے خلاف زبان کھولنا موت کو دعوت دینا تھا۔ اس لئے اس نے مصلحۃً خاموشی اختیار کرلی اور اپنے نظریہ کا اعلانیہ اظہار نہ کر سکا۔ کلیسا کے زیر عتاب آنے والوں میں ایک گیورڈانو برونو (۱۵۴۸ء ۱۶۰۰ء) بھی تھا جو کاپرنیکس کے نظریہ گردش

زمین سے متفق تھا۔ اس نے اپنے خیالات کا اعلانیہ اظہار کیا تو اس جرم کی پاداش میں اسے سات برس قید کی سزا دی گئی اور پھر زندہ جلا دیا گیا۔ آخر ۱۶۰۹ء میں گلیلیو نے دور بین ایجاد کی اور اپنے مشاہدہ سے کاپر نیکس کے نظریہ کی کھلم کھلا تصدیق کی اور دلائیل سے یہ ثابت کر دیا کہ زمین اپنے چاند سمیت سورج کے گرد گھومتا ہے مگر کلیسا نے اس کی صحت سے قطعی انکار کر دیا اور اسے مجرم قرار دے کر روم کی مذہبی عدالت میں مقدمہ چلایا اس نے کلیسا کے عتاب سے بچنے کے لئے عدلیہ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ میرا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ زمین گردش میں ہے۔ اس اعتراف پر اسے چھوڑ تو دیا گیا مگر اس نظریہ کو بطور مفروضہ بیان کرنے سے بھی اسے روک دیا گیا اور خلاف ورزی کی صورت میں اسے سخت سزا کی دھمکی دی گئی۔ کلیسا نے اس آواز کو اگرچہ قوت و طاقت سے دبانا چاہا مگر یہ آواز دب نہ سکی۔ رفتہ رفتہ مخالفت کا زور ٹوٹ گیا اور حرکت زمین کا نظریہ ہمہ گیر قرار پا گیا۔ اس نظام حرکت ارضی کو نظام شمسی سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں زمین کی بجائے سورج کو مرکز قرار دیا گیا ہے۔

علماء ہیئت کے نزدیک زمین کی متعدد حرکتیں ہیں مگر دو حرکتیں اپنے حسی اثرات کی بناء پر زیادہ نمایاں ہیں۔ پہلی حرکت وضعیہ ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف زمین کے محور میں ہوتی ہے اور ۲۳ گھنٹے ۵۸ منٹ اور ۴۹ سیکنڈ میں ایک چکر پورا ہو جاتا ہے اور زمین کی سالانہ حرکت کی وجہ سے ایک منٹ اور گیارہ سیکنڈ کا اس میں اضافہ ہو جاتا ہے جس سے یہ گردش پورے چوبیس گھنٹوں میں تمام ہوتی ہے۔ اس گردش سے رات اور دن کا ظہور ہوتا ہے اس طرح کہ جتنا حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے وہاں دن رہتا ہے اور باقی حصے پر رات ہوتی ہے۔ اس شب و روز کی مدت ۲۴ گھنٹے ہے جو اس گردش کی مدت کے برابر ہے۔ دوسری حرکت انتقالیہ ہے جو سورج کے گرد مدار ارضی پر ہوتی ہے چنانچہ یہ زمین ۱۰۸۰ میل فی منٹ کی رفتار سے مسلسل سورج کے گرد رواں دواں ہے۔ اور ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے اور ۴۶ سیکنڈ میں ۵۸۰،۰۰۰،۰۰۰ میل کی طویل مسافت طے کرکے اپنا دورہ تمام کرتی ہے اس حرکت سے فصول اربعہ یعنی گرما سرما بہار اور خزاں ظہور میں آتے ہیں۔

امیرالمومنینؑ کے ان کلمات پر جو تخلیق کائنات کے سلسلے میں ہیں نظر کی جائے تو یہ واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ زمین کو ساکن تصور نہ کرتے تھے بلکہ اسے متحرک قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:

فسکنت علی حرکتها من ان تمید باھلھا او تسیخ بحملھا او تزول عن مواضعھا۔	وہ ہچکولے کھانے کے بعد تھم گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے رہنے والوں کو لے کر جھک پڑے یا اپنے بوجھ کی وجہ سے دھنس جائے یا اپنی جگہ چھوڑ دے۔

(نہج البلاغہ)

اس ارشاد میں سکنت (وہ ٹھہری ہوئی ہے) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں ٹھہراؤ پایا جاتا ہے اور وہ ایک جگہ پر ساکن و برقرار ہے اس لئے کہ اگر یہ معنی ہوں تو **علی حرکتها** (حرکت کے ساتھ) بے معنی ہو جاتا ہے لہٰذا سکون سے مراد یہ ہے کہ اس کی حرکت میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور وہ ادھر ادھر لڑھکتی اور لڑکھڑاتی نہیں ہے اس عبارت میں لفظ مواضع موضع کی جمع ہے جس کے معنی جگہ کے ہیں۔ اگر حضرت کے نزدیک زمین ساکن ہوتی تو وہ جمع کے بجائے واحد کا لفظ لاتے اس لئے کہ جو چیز ساکن ہوتی ہے وہ ایک ہی جگہ گھیرتی ہے اور متعدد حرکتیں حرکت انتقالی ہی کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔ حضرت نے نہ صرف زمین کی حرکت کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کی متعدد حرکات کی طرف بھی واضح اشارات کیے ہیں۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

وعدل حرکا تها بالراسیات من جلا صید ها و ذوات الشناخیب الشحم من صیاخیدھا (نہج البلاغہ)	پتھروں کی مضبوط چٹانوں اور بلند چوٹیوں والے پتھریلے پہاڑوں سے اس کی حرکتوں میں اعتدال پیدا کیا۔

اس جملہ میں لفظ حرکات جو حرکت کی جمع ہے زمین کی متعدد حرکتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ قدرت نے ان حرکات کو پہاڑوں کے ذریعہ نقطہ اعتدال پر رکھا ہے اس طرح کہ اگر پہاڑوں کی جڑیں زمین میں پیوست نہ ہوتیں تو اس کے اجزاء متفرق و پراگندہ ہو جاتے اور حرکات میں یکسانیت نہ رہتی کیونکہ جسم مدور میں یکسانیت اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب مرکز ثقل کے مقابلہ میں وہ اپنے محور پر واقع ہو۔

زمین کی شکل و ہیئت

قدیم مصریوں اور یونانیوں کا یہ خیال تھا کہ زمین مسطح اور چپٹی ہے جس کے گرد اگر پانی اور اوپر سقف آسمان ہے مگر اب مشاہدہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین ایک گول جسم ہے صرف قطبین پر کچھ اندر کو دھنسی ہوئی ہے۔ اگرچہ زمین پر فلک بوس پہاڑ اور گہرے کھڈ ہیں مگر زمین کے وسیع و عریض پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے اتنے نشیب و فراز سے زمین کی گولائی میں چنداں فرق نہیں پڑتا۔ اس وسعت اور پھیلاؤ کی بنا پر جو حصہ بھی نظر آتا ہے مسطح اور ہموار دکھائی دیتا ہے۔ زمین کے گول ہونے پر مختلف دلائل دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مشاہداتی دلیل یہ ہے کہ چوں کہ زمین مغرب سے مشرق کی سمت گھومتی ہے اس لئے مشرقی مقامات پر سورج پہلے دکھائی دیتا ہے اور مغربی مقامات پر بعد میں نظر آتا ہے۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو مشرقی و مغربی تمام مقامات پر ایک وقت میں نظر آتا اور ایک ہی مشرق اور ایک ہی مغرب ہوتا حالانکہ نہ ایک وقت میں ہر جگہ نظر آتا ہے اور نہ ایک وقت میں ہر جگہ غروب ہوتا ہے۔

امیرالمومنینؑ نے بھی سورج کے متعدد مشرقوں اور مغربوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ زمین کو مدور اور کروی الشکل سمجھتے تھے چنانچہ عبد اللہ ابن ابی حامد سے روایت کی ہے حضرتؑ سے ارشاد **رب المشرق و المغارب** کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

لها ثلثمائة و ستون مشرقا و ثلثماته و ستون مغربا فيو مها الذى تشرق فيه لا تعودفيه الامن قابل و يومها الذى تغرب فيه لا تعودفيه الامن قابل۔

سورج کے تین سو ساٹھ مشرق اور تین سو ساٹھ مغرب ہیں جس دن میں وہ طلوع کرتا ہے اس کی طرف ایک سال کے بعد پلٹ کر آتا ہے اور جس دن میں وہ غروب ہوتا ہے اس کی طرف سال کے بعد پلٹتا ہے۔

(معانی الاخبار ص ٦٦)

حضرتؑ نے سورج کے تین سو ساٹھ مشرق اور تین سو ساٹھ مغرب بیان فرمائے ہیں۔ حالانکہ ہر آن اس کا نقطہ طلوع و غروب بدلتا رہتا ہے چنانچہ ان لوگوں کے لئے جو مغرب میں ہیں اس کا ہر لفظ مشرق اور ان لوگوں کے لئے جو مشرق میں ہیں ہر نقطہ مغرب ہے اس لحاظ سے اس کے مشارق و مغارب کا شمار نہیں ہو سکتا۔ پھر اس حد بندی کے کیا معنی اس کی وجہ یہ ہے کہ سیمری دائروں کو تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کرتے ہیں اور آج بھی دائرے کو تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کرہ زمین کو بھی تین سو ساٹھ خطوط پر تقسیم کر لیا گیا ہے لہٰذا ان درجوں کے اعتبار سے تین سو ساٹھ مشرق اور تین سو ساٹھ مغرب ہوں گے۔ اصل مقصد تو مشرق و مغرب کا تعداد بتانا ہے

جو حضرتؑ کے کلام سے ظاہر ہے اور اس تعداد کا لازمی نتیجہ زمین کا مدور ہونا ہے کیوں کہ مدور و کروی الشکل ہونے کی صورت ہی میں متعدد مشرق و مغرب ہو سکتے ہیں۔

سیار کرے

زمانہ سابق میں عموماً" یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہی ایک زمین ہے جس پر ہم رہتے سہتے اور انسان کے قافلے چلتے پھرتے دیکھتے ہیں اگرچہ انیکسی کورس (۵۰۰۔ ۴۲۸) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اس دنیا کے علاوہ اور دنیائیں بھی ہیں جن کے الگ الگ چاند سورج ہیں مگر کسی طرف سے اس کی تائید میں آواز بلند نہ ہوئی بلکہ اس کے خلاف دلائل دیئے گئے اور اس نظریہ کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر سولھویں صدی عیسوی میں گیورڈانوبرو نونے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہماری زمین ایسے اور کرے بھی ہیں اور ہر کرہ کا ایک سورج ہے جس کے گرد وہ گردش کرتا ہے لیکن اس وقت بھی یہ نظریہ، نظریہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکا اور نہ اسے مسلمہ حیثیت حاصل ہو سکی اور اب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ سیارے بھی زمین کے مانند کرے ہیں جن پر ہماری زمین کی طرح کوہسار ریگزار گہرے کھڈ اور سربلند ہیں۔

امیرالمومنینؑ نے بھی جدید نظریات کے مطابق زمینوں کی تعداد کا نظریہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

الحمد للّٰہ الذی لا یواری عنہ سماء سماء ولا ارض ارضا۔ (نہج البلاغہ)

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس سے ایک آسمان دوسرے آسمان کو اور ایک زمین دوسری زمین کو نہیں چھپاتی۔

اس آیت میں سات طرح زمینوں سے ہفت کرہ سیار مراد ہیں اگرچہ ان کے علاوہ بھی سیارے ہیں چنانچہ ترقی یافتہ دور بینوں کے ذریعہ ۱۸۴۶ء میں نیپچون سیارہ کا انکشاف ہوا اور ۱۹۳۰ء میں پلاٹو دریافت ہوا اور اٹھارویں صدی کے اواخر سے کچھ پہلے تک یورینس کو ساکن سمجھا جاتا رہا کیوں کہ اس کی روشنی کے مدھم ہونے کی وجہ سے اس کی حرکت کا احساس نہ ہوتا تھا مگر ۱۷۸۱ء میں معلوم ہوا کہ وہ بھی دوسرے متحرک سیاروں کی طرح کا ایک متحرک سیارہ ہے مگر یہ سارے چوں کہ کھلی آنکھ سے عادی طور پر نظر نہ آتے تھے اس لئے ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا صرف ان سیاروں کی گنتی بیان کی ہے جو ہر دور میں دکھائی دیتے رہے ہیں۔

آسمان یا کرہ بخاری

آسمان فارسی زبان کا لفظ ہے جو آس اور مان سے مرکب ہے آس آسیا کا مخفف ہے جس کی معنی چکی ہیں اور مان کے معنی مانند کے ہیں یعنی وہ چیز جو چکی کے مانند گھومتی ہے۔ یہ نام اس بناء پر تجویز ہوا کہ اس سقف نیلگوں کے بارے میں یہ عموی خیال تھا کہ وہ ایک جرم شفاف ہے جو زمین کے گرد چکی کی طرح گھوم رہا ہے اسی لئے اسے گنبد گرداں و چرخ گرداں کے ناموں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس کے لئے لفظ سماء ہے۔ سماء سمو سے ماخوذ ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے :

و انزلنا من السماء ماء طهورا۔ ہم نے سماء (بلندی) سے پاک و پاکیزہ پانی اتارا۔

اس آیت میں سماء سے مراد بلندی ہے اور آسمان کو سماء اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ بلندی کی سمت پر نظر آتا ہے امیرالمومنینؑ نے خلقت سماء کے بارے میں فرمایا ہے۔

فرمها بتصفیق الماء الزخارو اثارۃ موج البحار فمخضته مخض السقاء و عصفت عصفها بالفضاء ترد اوله الی اخره و ساجیه الی مائره حتی عب عبابه و رمی بالزبد رکامه فرفعه فی هواء منفتق و جومنفهق فسوی منه سبع سموات

پھر اس ہوا کو مامور کیا کہ وہ پانی کے ذخیرے کو تھپیڑے دے اور بحر بے کراں کی موجوں کو اچھالے۔ اس ہوا نے پانی کو یوں متھ دیا جس طرح دہی کے مشکیزے کو متھا جاتا ہے اور اسے دھکیلتی ہوئی تیزی سے چلی جس طرح خالی فضا میں چلتی ہے اور پانی کے ابتدائی حصے کو آخری حصے پر اور ٹھہرے ہوئے پانی کو چلتے ہوئے پانی پر پلٹانے لگی یہاں تک کہ اس متلاطم پانی کی سطح بلند ہوگئی اور وہ تہ بہ تہ پانی جھاگ دینے لگا۔ اللہ نے وہ جھاگ کھلی ہوا اور کشادہ فضا کی طرف اٹھائی اور اس سے ساتوں آسمان پیدا کئے۔

(نہج البلاغہ)

ایک شامی نے حضرتؑ سے آسمان کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا :

اسم السماء الد نیا رقیع وہی من دخان و ماء۔ نیچے والے آسمان کا نام رقیع ہے اور وہ دھوئیں اور پانی سے بنا ہے۔

(علل الشرائع ص ۱۹۷)

پھر اس شامی کے دوبارہ دریافت کرنے پر فرمایا **من بخار الماء** (پانی کے بخارات سے) قرآن مجید میں بھی آسمان کو دھوئیں سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی :

ثم استوی الی السماء وھی دخان۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور دھواں تھا۔

اس آیت میں دھوئیں سے مراد بخارات ہیں جو تہ بہ تہ ہونے کی صورت میں دھوئیں کے مانند نظر آتے ہیں چنانچہ امام راغب نے مفرادت میں لفظ دخان کی تشریح مثل الدخان سے کی ہے یعنی وہ چیز جو دھوئیں کے مانند تھی اور وہ بخارات ہی ہو سکتے ہیں جو دھوئیں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اسی ظاہری مشابہت کی بناء پر بخارات کا دھوئیں کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس کی تائید امیرالمومنینؑ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

ان اللہ بدالہ ان یخلق الخلق قصرب با مواج البحور فثار منھا مثل الدخان کا عظم مایکون من خلق اللہ فبنا بھا سماء رتقا۔ خداوند عالم نے چاہا کہ وہ مخلوقات کو پیدا کرے تو سمندروں کی موجوں میں تلاطم پیدا کیا جس سے دھوئیں کے مانند ایک عظیم تر غبار اٹھا اسی سے اس نے مضبوط آسمان کو بنایا۔

(بحار الانوار)

ظاہر ہے کہ مثل الدخان سے مراد بخارات ہیں کیوں کہ پانی سے بخارات ہی اٹھتے ہیں۔ حضرت نے انہی بخارات کو آسمانوں کا مادہ تخلیقی قرار دیا ہے اور جدید سائنسی تحقیق بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اجرام سماوی کہر اور بادل ایسے گیسی مواد سے جسے نیبولا کہا جاتا ہے وجود میں آئے ہیں اور انہی گیسی مادوں کو دھوئیں اور بخار کی لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے علامہ ہبتہ الدین شہرستانی نے کتاب الھیتہ والسلام میں تحریر کیا ہے کہ جب سماء کا اطلاق بلندی پر واقع ہونے والی چیز پر ہوتا ہے تو بعید نہیں ہے جسے آسمان سمجھتے ہیں وہ کرہ بخاری ہو جو زمینی ہوا کے گرد محیط ہے اور جس طرح سات زمینوں سے مراد کرات سیارہ ہیں اسی طرح سات آسمانوں سے مراد کرات بخاریہ ہیں جو اپنے اپنے کرہ سیارہ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

حرکت اجرام فلکیہ

قدیم حکما کا نظریہ تھا کہ کرہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور اس کے گرد گھومنے والے آسمانوں میں چاند سورج اور ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح کہ پہلے آسمان میں چاند دوسرے میں عطارد، تیسرے میں زہرہ، چوتھے میں آفتاب، پانچویں میں مریخ، چھٹے میں مشتری اور ساتویں میں زحل پیوست ہے اور چوں کہ آسمان حرکت میں ہیں اس لئے یہ بھی حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر اب یہ نظریہ پادر ہوا ہو چکا ہے اور ہیئت جدید نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تمام سیارے جن میں زمین بھی شامل ہے۔ سورج کی قوت جاذبہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔

سورج اگرچہ زمین اور دیگر سیارات کا مرکز ہے مگر وہ خود بھی اپنے محور میں گھوم رہا ہے اور تقریباً" پچیس دن ۷ گھنٹے اور ۴۸ منٹ میں ایک گردش تمام کرتا ہے اس کے علاوہ ایک اور حرکت بھی اس میں پائی جاتی ہے جو دوسرے سیاروں کی گردش کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ پہلی حرکت کو وضعیہ اور دوسری حرکت کو انتقالیہ کہا جاتا ہے۔ یہ اجرام جن راہوں پر رواں دواں ہیں انہیں فلک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہی گزر گاہوں پر وہ اپنی تلی ہوئی رفتار سے حرکت کر رہی ہیں۔ نہ ان کی مقررہ رفتار میں فرق آتا ہے اور نہ ان کی گزر گاہ میں۔ قرآن مجید میں بھی سیارات سبعہ کے افلاک کو طرائق (راستوں) سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے۔

امیرالمومنینؑ کے کلمات سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ فلک مدار نجوم و مجری کواکب کا نام ہے جن پر شمس و قمر اور سیارے ہمہ وقت راہ پیما ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے:

اللھم رب السقف المرفوع والجو المکفوف الذی جعلتہ مغیضا للیل والنہارو مجری الشمس والقمر ومختلفا للنجوم السیارہ۔

اے اللہ اے اس بلند آسمان اور تھمی ہوئی فضا کے پروردگار جسے تو نے شب و روز کے سر چھپانے اور چاند اور سورج کے گردش کرنے اور چلنے پھرنے والے ستاروں کی آمد و رفت کی جگہ بنایا ہے۔

(نہج البلاغہ)

اس ارشاد میں لفظ مجری اور سیارہ سے صاف ظاہر ہے کہ آفتاب و مہتاب اور سیارے گردش میں ہیں اور ان کی حرکت کسی دوسرے جسم کی حرکت کی تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے مدار میں سیر و حرکت کر رہے ہیں اور اسی مدار کا نام فلک ہے جو فضا میں خط موہوم کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔

اس ارشاد میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت نے فضا کو مغیض کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ **مغیض** کے معنی **الموضع الذی یغیض فیہ الماء** کے ہیں یعنی وہ جگہ جس میں پانی جذب ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح پانی زمین کی تہ میں جذب ہوتا ہے۔ اسی طرح روشنی اور تاریکی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔ ان کلمات میں نہار سے مراد روشنی اور لیل سے مراد ظلمت ہے جدید تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام کرہ زمین کو جو سورج سے روشنی حاصل ہوتی ہے اس کی مقدار سورج کی روشنی سے وہی نسبت رکھی ہے جو ایک سیکنڈ کو ۴۷ سال سے ہوتی ہے اور زمین کی روشنی سے دس گنا زائد روشنی اجسام فلکی میں بٹتی ہے اور باقی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔ امیرالمومنینؑ نے ان تمام تحقیقات کا خلاصہ ایک لفظ مغیض میں سمو دیا ہے جو صدیوں بعد ہیئت دانوں کی مسلسل محنت و عرق ریزی کے نتیجہ میں ظہور میں آئیں حالاں کی اس دور میں نہ روشنی کا تجزیہ کیا جا سکا تھا اور نہ فضا میں روشنی کے جذب ہونے کا تصور پیدا ہوا تھا۔

سورج سرچشمہ حرارت ہے

حکمائے قدیم کا خیال تھا کہ سورج صرف روشنی کا منبع ہے اور جب اس کی شعاعیں زمین سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہیں تو اس سے حرارت کی تولید ہوتی ہے خود سورج میں روشنی ہی روشنی ہے حرارت نہیں ہے مگر اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سورج روشنی اور حرارت دونوں کا منبع ہے اور وہ اپنی شعاعوں کے ذریعہ دوسرے کروں میں روشنی کے ساتھ گرمی بھی پہنچاتا ہے چنانچہ جدید تحقیق کی رو سے سورج کی بیرونی سطح کر درجہ حرارت ۶۰۰۰ اور اندرونی حصہ کا درجہ حرارت ۲۲۰۰۰،۰۰۰ ڈگری ہے اور فی منٹ ۲۵ کروڑ ٹن گیسی مواد اس سے خارج ہوتے رہتے ہیں جو روشنی اور حرارت دونوں کے حال ہوتے ہیں۔ اگر حرارت کے یہ شعلہ بار مواد زمین میں رہ جائیں تو تمام زمین جل کر راکھ ہو جائے مگر یہ نظام قدرت کی کارفرمائی ہے کہ زمین حسب ضرورت روشنی و حرارت لے لیتی ہے اور باقی فضا اور دوسرے کروں میں جذب ہو جاتی ہے۔ امیرالمومنینؑ کے کلمات سے بھی اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ سورج خود سرچشمہ حرارت ہے شعاعوں کے انعکاس سے حرارت کی تولید نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپؑ کا ارشاد ہے:

لو کان وجھھا لاھل الارض لا حرقت الارض و من علیھا من شدۃ حرھا

(بحار الانوار ج ۱۴ ص ۱۴۴)

اگر سورج کا پورا رخ اہل زمین کی طرف ہوتا تو زمین اور زمین پر بسنے والوں کو اپنی تپش و حرارت کی شدت سے جلا دیتا۔

سورج اور چاند کا محیط

سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر اور چاند دو لاکھ چالیس ہزار میل کی دوری پر واقع ہے اسی قرب و بعد مسافت کی بناء پر چاند اور سورج کے حجم میں تھوڑا ہی سا فرق نظر آتا ہے۔ اسی لئے زمانہ سابق میں سورج کو چاند سے زیادہ بڑا نہ سمجھا جاتا تھا اور اب جب کہ فلک پیما آلات کے ذریعہ سورج اور چاند کا قطر و محیط ناپا جا چکا ہے دونوں کے حجم کا تفاوت نمایاں ہوگیا ہے اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ سورج چاند سے بدرجہا بڑا ہے۔ یہ پیمائش سائنسی آلات کی مرہون منت ہے مگر اس دور میں کہ جب نہ دوربینیں تھیں نہ فلک پیما آلات تھے اور نہ اجرام فلکیہ کی پیمائش کا کوئی ذریعہ تھا۔ امیرالمومنینؑ نے سورج اور چاند کا جو محیط بیان فرمایا وہ جدید تحقیق سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے چنانچہ آپ سے سورج کا محیط دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

تسعمائة فرسخ فی تسعمائة فرسخ۔ نو سو ضرب نو سو فرسخ

(علل الشرائع ص ۱۹۷)

۹۰۰ کو ۹۰۰ میں ضرب دینے سے ۸۱۰۰۰۰ فرسخ ہوں گے اور ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے لہٰذا کل ۲۴۳۰۰۰۰ میل ہوں گے اور موجودہ تحقیق یہ ہے کہ سورج کا محیط ۲۷۸۴۵۰۰ میل ہے اور چوں کہ شرعی میل موجودہ میل سے ۲۴۰ گز بڑا ہوتا ہے لہٰذا اس محیط میں جب یہ مقدار بڑھا دی جائے گی تو موجود تحقیق اور حضرت کے بیان کردہ محیط میں تھوڑا سا ہی فرق رہے گا جو قابل اعتنا نہیں ہے اور اس قسم کا فرق تو خود ہیئت دانوں کے بیان کردہ محیط میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ان کے تخمینوں اور اندازوں میں کمی بیشی کی گنجائش نہ ہو۔ ممکن ہے کہ آئندہ تحقیقات کے نتیجہ میں یہ تھوڑا سا تفاوت بھی ختم ہو جائے۔

اسی طرح چاند کے محیط کے بارے میں آپ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا:

اربعون فرسخا فی اربعین فرسخا چالیس ضرب چالیس فرسخ

(تفسیر قمی ص ۳۷۹)

۴۰ x ۴۰ فرسخ ۱۶۰۰ فرسخ ہوں گے جن کے میل ۴۸۰۰ ہوں گے اور موجودہ نظریہ یہ ہے کہ چاند کا محیط ۶۰۰۰ میل ہے مگر شرعی اور جدید میلوں کے تفاوت کو دیکھنے کے بعد قریب قریب وہی محیط ہوگا جو جدید تحقیق نے ثابت کیا ہے۔

ستاروں میں آبادی

یہ دمکتے جھلکتے ستارے جو فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے ہیں ایک زمانہ وہ تھا کہ انہیں دیوتاؤں کی آرامگاہ تصور کیا جاتا تھا یا آسمان کی نیلگوں چھت میں ڈوری سے بندھے ہوئے رنگین قمقمے یا گڑی ہوئی سنہری کیلیں سمجھا جاتا تھا مگر انسان کی فلک پیمائی نے اس فریب نظر کا پردہ چاک کر دیا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ستارے اور سیارے اس کرہ ارضی کے مانند مادی کرے ہیں جن کی اپنی فضا ہے اور اپنا سماء اور اپنی مخصوص سمتوں میں دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

شنید ستم کہ ہر کوکب جہاں است   جداگانہ زمین و آسماں است

ان ستاروں میں کوئی مخلوق بستی ہے یا آبادی سے خالی ہیں ابھی کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکا۔ بعض ہیئت دانوں نے بتایا ہے کہ ہماری کہکشاں میں ایک کروڑ سیاروں کے نظام قائم ہیں جن میں کم از کم ایک لاکھ سیارے ایسے ہیں۔ جن میں زندگی کا امکان پایا جاتا ہے اور جہاں زندگی ممکن ہو وہاں زندہ مخلوق کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ اور مریخ کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ اس میں پانی اور روئیدگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ستاروں میں آبادی کا امکان دور جدید کی تحقیقی کاوش کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر امیرالمومنینؑ نے صدیوں پیشتر کہ جب انسان یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ کہ زمین کے علاوہ کہیں اور بھی زندگی کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا ہے۔ ان ستاروں میں شہروں اور بستیوں کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

لحنه النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوط کل مدینة الی عمود من نور۔

ان آسمانی ستاروں میں تمہارے شہروں کے مانند شہر ہیں۔ اور ہر شہر دوسرے شہر سے ایک عمود نور کے ذریعہ وابستہ و منسلک ہے۔

(تفسیر قمی ص ۵۵۴)

اس عمود نور سے مراد قوت جاذبہ ہے جس کے زیر اثر یہ سیارے ایک دوسرے سے وابستہ و مربوط ہیں اور اپنے اپنے مدار پر یکساں رواں دواں ہیں۔

ملنے کا پتہ :-

العصر اسلامک بک سنٹر

۳۵- حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور

مہاجرین میں سے صرف چھ افراد سے خوش تھے اور انصار میں سے کسی فرد پر راضی نہ تھے۔ اگر آنحضرت ان سے خصوصی طور پر راضی تھے تو اس خصوصی رضا مندی کو واضح کیا جاتا۔ مگر اس کے بجائے ان کے عیوب و نقائص کی ایک فہرست پیش کر دی جاتی ہے جس سے رسول خدا کی خوشنودی تو درکنار اس کی نفی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی تضاد کو دیکھتے ہوئے ابو عثمان جاحظ نے کہا ہے:۔

لو قال لعمر قائل انت قلت ان رسول اللہ مات وھو راض عن الستۃ فکیف یقول الاٰن لطلحۃ انہ مات ساخطا علیک للکلمۃ التی قلتھا لکان لقد رماہ بمشاقصہ۔	اگر کوئی کہنے والا حضرت عمر سے یہ کہتا کہ تم نے یہ کہا تھا کہ جب رسول اللہ نے وفات پائی تو وہ ان چھ آدمیوں سے راضی تھے۔ اور اب کس بنا پر طلحہ سے یہ کہتے ہو کہ پیغمبر ایک بات پر مرتے دم تک تم سے ناراض رہے تو انہی کی بات سے انہیں لاجواب کر دیتا۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱ صفحہ ۳۷)

طلحہ کی وہ بات جو پیغمبر کی ناراضگی کا باعث ہوئی تھی یہ تھی کہ انہوں نے آیہ حجاب کے اترنے پر کہا تھا کہ آج تو رسول اللہ اپنی بیویوں کو پردہ میں رکھ رہے ہیں اور کل ہم انہی سے نکاح کریں گے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وما کان لکم ان تؤذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ ابدا۔	تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم رسول خدا کو اذیت دو اور نہ کبھی یہ جائز ہو سکتا ہے کہ تم ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔"

ایک وقت تھا کہ طلحہ کی زبان سے یہ نازیبا کلمات نکلے تھے جو یقیناً قابلِ گرفت تھے مگر خود حضرت عمر نے صلح حدیبیہ کے موقع پر جو مظاہرہ کیا یا پیغمبر کے آخر زمانۂ حیات میں جو تند و تیز الفاظ کہے وہ طلحہ کے ان الفاظ سے کہیں زیادہ قابلِ گرفت تھے۔ اگر نبوت میں شک اور پیغمبر کی طرف ہذیان کی نسبت تجویز کرنے کے باوجود عرشۂ خلافت تک پہنچا جا سکتا ہے تو ان الفاظ کی بناء پر طلحہ کی اہلیت خلافت پر طعن کا کیا جواز ہے۔

حضرت علی کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا اسے بھی ایک خود ساختہ بات سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ پیغمبر کے بعد دورِ اوّل میں تو یہ کہا گیا کہ علی نو عمر ہیں اور خلافت کے لئے سن رسیدہ و پختہ کار آدمی ہونا چاہئے مگر اب نوعمری کا عذر تو ہو نہیں سکتا تھا اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ ان میں مزاح و خوش طبعی پائی جاتی ہے۔ حضرت عمر کا یہ چھوڑا ہوا شوشہ دوسرے معاندین کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے اسے خوب

خوب ہوا دی۔ چنانچہ عمرو ابن عاص نے شامیوں کے ذہن میں یہ چیز بٹھا دی کہ حضرت کا شیوہ ہی شوخی و بذلہ سنجی ہے۔ جس پر امیر المومنین کو کہنا پڑا " مجھے نابغہ کے بیٹے پر حیرت ہے کہ وہ میرے بارے میں اہل شام سے کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مسخرہ پن پایا جاتا ہے اور میں کھیل تفریح میں پڑا رہتا ہوں۔ اس نے غلط کہا اور کہہ کر گنہگار ہوا۔ خدا کی قسم مجھے موت کی یاد نے کھیل کود سے باز رکھا ہے اور اسے عاقبت فراموشی نے سچ بولنے سے روک دیا ہے " بے شک امیر المومنین خندہ جبیں، ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج تھے اور ترش روئی و تند خوئی سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر وہ مزاح جو لطیف اور سنجیدہ طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ آپ کے مزاح میں پیغمبر کے مزاح کی جھلک ہوتی تھی۔ پیغمبر کے مزاح کی یہ صورت تھی کہ نہ اس میں طنز کا پہلو ہوتا تھا اور نہ خلاف واقعہ کوئی بات ہوتی تھی اسی طرح امیر المومنین مزاحاً کوئی بات کہتے تو وہ نہ واقع کے خلاف ہوتی اور نہ وقار و سنجیدگی کے منافی۔ اگر اس حد تک مزاح شانِ رسالت کے منافی نہیں ہے تو اسے منصب خلافت کے منافی کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر یہاں پر مزاح سے وہ مزاح مراد ہے۔ جس سے انسان کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے یا رعب و داب ختم ہو جاتا ہے تو ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ آپ کی زبان سے کبھی کوئی ایسا جملہ نکلا ہو جس سے وقار مجروح ہوتا ہو یا متانت و سنجیدگی میں فرق آتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو دلوں سے آپ کا رعب و دبدبہ اٹھ جاتا اور نظروں میں ان کا وقار گر جاتا حالانکہ آپ کے جلال و ہیبت اور وقار و عظمت کا یہ عالم تھا کہ کوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کر سکتا تھا۔ اور جب تک آپ گفتگو کا آغاز نہ کرتے کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ابن عباس کہتے ہیں :۔

کان امیر المومنین علی علیہ السلام اذا اتی ھبنا ان نبتدئہ بالکلام (شرح ابن ابی الحدید ج ۴۔ ص۱۱)	" جب علی علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تو ہمیں جرأت نہ ہوتی تھی کہ ہم سلسلہ کلام شروع کریں "

حضرت اپنے وصیت نامہ فرماتے ہیں :۔

ایاک ان تذکر فی الکلام مایکون مضحکا و ان حکیت ذلک عن غیرک۔ (نہج البلاغہ)	" خبردار اپنی گفتگو میں ہنسانے والی باتوں کا ذکر نہ آنے دینا اگرچہ وہ نقل قول کی حیثیت سے کیوں نہ ہوں "

بہرحال حضرت علی کی طرف مزاح کی نسبت واقعات کی روشنی میں کسی طرح بھی صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔ آخر اس موقع پر حضرت عمر کو کچھ کہنا تھا اگر یہ نہ کہتے تو کچھ اور کہتے اور جہاں تک انہیں خلافت سے

الگ رکھنے کا تعلق ہے وہ شوریٰ کی ہیئت اور اس کے طریق کار سے ظاہر ہے۔
شوریٰ کی تجویز اگرچہ حضرت عمر کے ذہن کی پیداوار تھی مگر اسے عملی جامہ پہنانے میں عبدالرحمٰن ابن عوف کی ہوشیاری و کارگزاری کا بہت دخل ہے انہیں خود تو خلافت کے ملنے کی توقع تھی نہیں۔ انہوں نے امیدواران خلافت کی صف سے اپنے کو الگ کر کے خلیفہ گری کا حق حاصل کر لیا حالانکہ حضرت عمر نے انہیں ثالثی کا حق نہیں دیا تھا یہ ثالثی کا حق عبداللہ ابن عمر کا تھا مگر انہوں نے عبداللہ کو اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اور خود ثالثی کا اختیار حاصل کر لیا اور پھر خلافت کا دھارا حضرت عثمان کی طرف موڑنے کے لئے کتاب و سنت کے ساتھ سیرت شیخین کا ضمیمہ لگا دیا جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ حضرت علی اسے کبھی قبول نہیں کریں گے اور حضرت عثمان کے لئے اس سیرت کی پذیرائی سے کوئی امر مانع نہ تھا یہ شرط نہ حضرت عمر نے خود عائد کی تھی اور نہ عبدالرحمٰن سے اس قسم کی شرط کے عائد کرنے کا مطالبہ کیا تھا اگر حضرت عمر بعد میں آنے والے خلیفہ پر پہلے خلیفہ کی سیرت پر عمل پیرا ہونا ضروری سمجھتے تو حضرت ابو بکر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کسی کو نامزد کر جاتے مگر انہوں نے خلیفہ سابق کی سیرت کے خلاف قدم اٹھا کر یہ واضح کر دیا کہ بعد میں آنے والا خلیفہ پہلے خلیفہ کی سیرت کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ اپنی رائے اور صوابدید پر عمل پیرا ہو گا۔ اگر عبدالرحمٰن کتاب و سنت کے ساتھ سابقہ خلفاءؑ کی سیرت کی پابندی کو اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے بغیر خلافت کا انعقاد ہو ہی نہیں سکتا تو انہیں تشکیل شوریٰ کے موقع پر حضرت عمر کو یہ مشورہ دینا چاہیئے تھا کہ وہ حضرت ابو بکر کی سیرت پر چلیں اور جس طرح انہوں نے آپ کو نامزد کیا تھا اسی طرح آپ بھی کسی کو نامزد کر جائیں یا یہ اپچ اسی موقع کے لئے اٹھا رکھی تھی۔ عبدالرحمٰن نے یہ شرط تو پیش کر دی مگر اس پر غور نہ کیا کہ ان دونوں کی سیرت پر کیونکر چلا جا سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں تو ممکن تھا جب دونوں کی سیرت یکساں ہوتی اور دونوں کا نظریہ ایک ہوتا اور جب کہ متعدد مواد پہ دونوں کی رائیں جدا جدا اور نظریات مختلف تھے پھر دونوں کی سیرت پہ ایک ہی وقت میں یکساں عملدرآمد کیونکر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے جواز و عدم جواز میں اختلاف تھا خالد ابن ولید کی بحالی و برطرفی میں اختلاف تھا اسی طرح متعدد مواقع پر دونوں کی رائیں مختلف تھیں تو اب کسے مورد عمل قرار دیا جائے اور کسے نظر انداز کیا جائے۔

امیر المومنین نے اسلام کے ایک بنیادی ضابطہ کے پیش نظر سیرت شیخین کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا اس انکار کا اصل محور سیرت بحیثیت سیرت نہ تھی بلکہ وہ نظریہ تھا جس کی داغ بیل اس سیرت کے ذریعہ ڈالی جا رہی تھی اور وہ یہ کہ کتاب و سنت کے ساتھ سیرت خلفاءؑ کو بھی مذہبی و آئینی درجہ حاصل ہے حالانکہ سیرت

شیخین ہو یا کسی اور کی سیرت قرآن و سنت کی آئینہ دار ہو یا قیاس و رائے کی پروردہ اسے نہ مذہبی و آئینی درجہ دیا جا سکتا ہے اور نہ اسے دینی ماخذ قرار دینا صحیح ہے اگر ایک دفعہ اس نظریہ کی بنیاد پڑ جاتی تو حکام کی سیرت کو مستقل ماخذ و مدرک دینی کی حیثیت حاصل ہو جاتی اور قرآن و سنت کی طرح ان کے طرز عمل کو بھی سند و حجت قرار دے لیا جاتا۔ امیرالمومنین نے سیرت شیخین سے انکار کر کے اسلام کی اساس و بنیاد کو متزلزل ہونے سے بچا لیا اور اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ کتاب و سنت اور ہے اور سیرت اور ہے اسے دینی ماخذ قرار دینا آئین اسلام کے منافی ہے۔ اگر آپ اس شرط کو تسلیم کر لیتے تو ایک طرف سیرت خلفاء اسلام کی عملی تصویر سمجھی جاتی اور دوسری طرف حکام کا طرز عمل دینی احکام کا ماخذ و مدرک قرار پا جاتا اور نتیجتہً ان کے افعال و اعمال ہی کا نام اسلام ہو کر رہ جاتا۔

اس پر بھی ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ سیرت شیخین سے مراد کیا ہے۔ اگر اس سے وہ مسائل و احکام مراد ہیں جو انہوں نے اپنے فہم و اجتہاد سے مستنبط کئے اور ان پر عمل پیرا رہے تو انہیں من وعن تسلیم کر لینے اور ان پر عمل کی بنیاد رکھنے کے معنی یہی ہوں گے کہ شیخین کی تقلید کی جائے۔ چنانچہ ملا علی قاری نے اس سیرت کی پابندی کو تقلید ہی سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

فابی علی ان یقلدھما و رضی عثمان۔ (شرح فقہ اکبر صہ ۸۲)

"حضرت علی نے شیخین کی تقلید سے انکار کر دیا اور حضرت عثمان اس پر راضی ہو گئے"

اگر امیرالمومنین کو امام مفترض الطاعۃ اور خلیفہ منصوص نہ بھی سمجھا جائے مگر کم از کم انہیں اس پایہ کا مجتہد تو تسلیم کیا ہی جائے گا جس پایہ کا مجتہد شیخین کو سمجھا جاتا ہے اور ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کے فتوی و رائے کا پابند کر دینا اصولی طور پر غلط ہے اور اس میں قطعاً کوئی معقولیت نہیں ہے کہ ایک مجتہد سے یہ کہا جائے کہ تمہیں عملاً وہ راہ اختیار کرنا ہو گی جو پہلے مجتہد کی تھی یہ پابندی ذہنی و فکری جمود کو دعوت دینے والی اور تفکر و اجتہاد کی روح کو مضمحل کر دینے والی ہے۔ جب آنکھیں ہیں تو دیکھنے کا حق ہے کان ہیں تو سننے کا حق ہے اور عقل ہے تو غور و خوض کے بعد خود راہ متعین کرنے کا حق ہے۔ کسی سے زبردستی یہ حق چھین کر یہ کہا جائے کہ تم اندھے بہرے بن کر ہماری متعین کردہ راہ پر چلتے رہو اسے نہ عقل و دانش سے کوئی تعلق ہے اور نہ اسلام ایسے حکیمانہ دین سے کوئی واسطہ ہے۔

اور اگر سیرت سے مراد شیخین کا وہ لائحہ عمل ہے جو احکام کے اجراء و نفاذ میں انہوں نے اختیار کیا تو اسے قابل تقلید و اتباع نہیں قرار دیا جا سکتا اس لئے کہ طریق کار وقتی حالات کے تابع ہوتا ہے۔ جیسے حالات ہوں گے ویسا طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ اور حالات کبھی یکساں نہیں رہتے لہذا حالات کی تبدیلی

کے ساتھ طریقِ کار کا مختلف ہونا ناگزیر ہو گا۔ مثال کے طور پر حضرت عمر کے عہد کو دیکھئے کہ ان کے دورِ حکومت میں روم و ایران فتح ہوئے اور ان فتوحات کے نتیجہ میں دولت کی ریل پیل شروع ہو گئی ذرائع آمدنی وسیع سے وسیع تر ہو گئے۔ اور اس مالی فراوانی کی بناء پر وظائف کی مقدار بڑھ گئی اب ان کی سیرت کی پیروی کا تقاضا یہ تھا کہ خواہ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو جائیں ان کے جاری کردہ وظائف بے کم و کاست باقی رکھے جائیں حالانکہ ذرائع آمدنی کے کم یا نہ ہونے کی صورت میں یہ مطالبہ ناروا ہو گا۔ تو جو چیز حضرت عمر کے عہد میں روا اور قابلِ عمل تھی۔ اب ناقابلِ عمل قرار پائے گی۔ اس لئے کہ حالات بدل چکے ہیں۔ اس عہد کا تقاضا اور تھا اور اس عہد کا تقاضا اور ہے۔ بعید نہیں ہے کہ حضرت عمر کے بعد آنے والے خلیفہ پر ان کی سیرت کی پابندی عائد کرنے کا مقصد یہ رہا ہو کہ جو وظائف ان کے دور میں ملا کرتے تھے وہ علیٰ حالہ باقی رکھے جائیں۔ اور ان میں کمی واقع نہ ہونے پائے خواہ سابقہ آمدنی کے ذرائع باقی رہیں یا نہ رہیں۔ اس اعتبار سے اس شرط کو دینی شرط کہنے کے بجائے اقتصادی شرط کہنا چاہیئے جو سرمایہ داروں کی طرف سے مالی مفاد کے تحفظ کے لئے عائد کی گئی تھی۔

شوریٰ کے واقعات پر نظر کرنے کے بعد امیر المومنین کی سیرت کے اس درخشاں پہلو سے آنکھ بند نہیں کی جا سکتی کہ آپ بیک جنبشِ لب سلطنت و اقتدار کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کتاب و سنت کے مقابلہ میں حکام کی راہ روش کو اپنا لائحہ عمل بنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اس شرط کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتے خواہ بعد میں اس پر عمل نہ کرتے آخر حضرت عثمان نے کب عمل کیا تھا۔ تو بڑی آسانی سے ایک وسیع و عریض مملکت کی حکومت حاصل کر سکتے تھے مگر حضرت نہ ضمیر کے خلاف اقرار کرنا گوارا کرتے ہیں اور نہ اصول کے مقابلہ میں عظیم سے عظیم سلطنت کو درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں حالانکہ دنیا والے اقتدار کے لئے نہ وعدہ کو کوئی وزن دیا کرتے تھے اور نہ قول و اقرار کو بلکہ ہر قسم کے حیلہ و مکر کو سیاست و مصلحت بینی کا نام دے کر جائز قرار دے لیا کرتے تھے۔ کیا دنیا میں اصول پرستی حق پسندی اور بلند نفسی کی اس سے بہتر مثال مل سکتی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب حضرت کی نظروں میں سابقہ خلفاء کی سیرت اُن کے بعد ناقابلِ سند اور ناقابلِ عمل تھی تو ان کی زندگی میں ان کی سیرت کو صحیح اور قابلِ اتباع سمجھتے ہوئے ان کی بیعت کیونکر کر سکتے تھے اور پھر اس خلافت کو بھی کیونکر تسلیم کر سکتے تھے جو اس سیرت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو جس سیرت کو آپ رد کر چکے ہوں۔ جب وہ سیرت ناقابلِ قبول تھی تو وہ خلافت بھی ناقابلِ قبول ہو گی جو اس سیرت پر عمل پیرا ہونے کے وعدہ پر ظہور میں آئی ہو۔

بیعتِ امیر المومنین

حضرت عثمان نے ۷۰ برس کی عمر میں یکم محرم ۲۴ھ کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ بد قسمتی سے ان کا دورِ حکومت امویوں کے علاوہ عام مسلمانوں کے لئے خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ عوام سختیوں میں جکڑ دیے گئے بزرگ ترین صحابہ پر مظالم توڑے گئے۔ عبد اللہ ابن مسعود کی پسلیاں توڑی گئیں۔ عمار ابن یاسر کو زد و کوب کیا گیا۔ ابوذر غفاری جلا وطن کئے گئے۔ جبر و استبداد کے سائے پھیلے ظلم و استحصال کی گھٹائیں چھائیں اور خود سر عمال نے طاقت کے نشہ میں مدہوش ہو کر رعایا کو پامال کر کے رکھ دیا۔ حضرت عثمان کے اس طرزِ عمل کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں عوام کے جذبات بھڑک اُٹھے اور دلوں میں غم و غصّہ کی ایک عام لہر دوڑ گئی۔ اصحاب شوریٰ میں سے حضرت علی تو ان سے شاکی تھے ہی طلحہ اور زبیر بھی علانیہ ان کے خلاف ہو گئے اور عبد الرحمٰن ابن عوف جو سیرتِ شیخین کے زینہ سے انہیں خلافت کے بام بلند تک لے گئے تھے وہ اس حد تک بگڑے کہ ہمیشہ اپنے کئے پر پچھتاتے رہے اور زندگی کے آخری لمحہ میں ان سے بات چیت کے روادار نہ ہوئے۔ ابن عبد ربہ تحریر کرتے ہیں:-

دخل لہ عثمان عائداً لہ فی مرضہ فتحول عنہ الی الحائط	عبد الرحمٰن کی بیماری کی حالت میں حضرت عثمان ان کی عیادت کے لئے آئے عبد الرحمٰن نے انہیں دیکھ کر اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔"
(عقد الفرید۔ ج ۳ ص ۸۰)	

آخر اس عام ناراضگی کے نتیجہ میں ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو گھر کے اندر قتل کر دیئے گئے۔

اس بارہ سالہ دورِ حکومت نے مسلمانوں کے سوئے ہوئے احساسات کو جھنجھوڑا اور غلط قیادت کو آزمانے اور اس کے نتائج بھگتنے کے بعد ان کی آنکھیں کھلیں اور یہ احساس شدت سے اُبھرا کہ قیادت اس شخص کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جو عوامی فلاح و بہبود اور اجتماعی مفاد پر نظر رکھے اور مملکت کی دولت سمٹ کر اس کی ذات اور اس کے خاندان کے افراد تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ مسند خلافت کے خالی ہوتے ہی اکابر صحابہ اور خواص و عوام کی نظریں حضرت علی کی طرف اٹھنے لگیں۔ اگر حضرت عثمان عام حالات میں طبعی موت مرتے تو خلافت نے سقیفائی و شورائی نظام کے ماتحت جو رخ اختیار کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے، یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ خلافت اپنے اصلی مرکز کی طرف پلٹ کر آئے گی اور حضرت علی کو مسند خلافت پر متمکن ہونے کا موقع دیا جائے گا اس لئے کہ حضرت عثمان کے اہالی موالی وہ لوگ تھے جو انہیں عمومی مفاد کے

بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور وہ کبھی گوارا نہ کرتے کہ کسی ایسے شخص کو برسر اقتدار آنے دیا جائے جو ان کے بگڑے ہوئے اطوار پر قدغن لگائے اور انہیں اپنی سابقہ عادتوں میں تبدیلی پر مجبور کرے یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ معاویہ، عمرو ابن عاص اور عثمانی حکام و عمال جو امیر المومنین کی متوازن و معتدل سیرت سے بخوبی واقف تھے ان کے اقتدار میں سد راہ ہوتے اور اس سلسلہ میں ام المومنین حضرت عائشہ کی بھی انہیں پوری تائید و حمایت حاصل ہوتی جو بڑی حد تک ملکی سیاست پر اثر انداز اور امیر المومنین کے مخالفین کی صف اوّل میں تھیں یہ لوگ اپنے امتیازات و مفادات کے تحفظ کے لئے حضرت عثمان کو نئی بزم شوریٰ کی تشکیل کا مشورہ دیتے اور ایسی تدبیر کرتے کہ خلافت انہی کے پسندیدہ افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی یا حضرت عثمان شوریٰ کے چکر میں پڑے بغیر کسی کو نامزد کر جاتے جس کا جواز سیرت شیخین کی پابندی کو قبول کرنے کے بعد پیدا ہو چکا تھا۔ مگر حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ ان کے لئے یہ موقع ہی نہ رہا کہ وہ خلافت کے سلسلہ میں کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتے یا کوئی خاص ہدایت کرتے۔ اور اگر کرتے بھی تو اس ہنگامہ و شورش میں ان کی سنتا کون جب کہ لوگ ان کی خویش نوازیوں اور ان کے عمال کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے انہی کی خلافت کو انتہائی ناپسند کر رہے تھے اور انہیں جیتے جی یا قتل کر کے خلافت سے الگ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور آخر ان بے اعتدالیوں کا نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہا۔

پیغمبر اکرم کے بعد امیر المومنین نے ایک طویل عرصہ جس بے غرضی و بے نفسی کے ساتھ گزارا اور جس اعتدال پسندی و اصول پرستی کا مظاہرہ کیا وہ دلوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس تاثر نے عوام کے ذہن بدل دیئے اور گرد و پیش پر نظر دوڑانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ علی ابن ابی طالب سے بہتر کوئی شخصیت نہیں ہے جو قیادت امت کا بار اٹھا سکے اور موجودہ انتشار بد امنی اور بگڑے ہوئے حالات پر قابو پا سکے۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کے نمایاں افراد مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ حضرت علی سے خلافت کی درخواست کی جائے۔ اس فیصلہ کے بعد ایک وفد جس میں طلحہ اور زبیر بھی شامل تھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے زمام کار اپنے ہاتھوں میں لینے کی التجا کی۔ حضرت نے ان کی پیشکش کو قبول کرنے میں توقف کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے معاملات میں دخیل ہونا نہیں چاہتا جسے چاہو اُسے اپنا امیر منتخب کر لو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ ان لوگوں نے کہا :۔

انا لا نعلم احد احق به منك ولا اقدم سابقة ولا اقرب قرابة من رسول الله۔	ہم آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے اور نہ سابقہ خدمات کے لحاظ سے آپ سے کوئی مقدم ہے اور نہ کوئی رسول اللہ سے قرابت

ہیں آپ سے قریب تر ہے۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صـ۹۹)

آپ نے پھر انکار کیا مگر وہ لوگ باصرار آمادہ کرتے رہے اور جب یہ دیکھا کہ حضرت کسی طرح خلافت کے قبول کرنے پر تیار نہیں تو گڑگڑا کر کہنے لگے :-

ننشدك الله الا تری ما نحن فيه الا تری الاسلام الا تری الفتنة الا تخاف الله۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صـ۹۹)

"ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس عالم میں ہیں کیا آپ اسلام کی حالت اور فتنوں کو ابھرتے دیکھ نہیں رہے کیا آپ اللہ سے بھی نہیں ڈرتے۔"

جب امیر المومنین نے دیکھا کہ اصرار حد سے بڑھ گیا ہے اور حالات لاکھ نامساعد سہی مگر اتمام حجت کے بعد اب ادائے فرض سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی تو آپ نے فرمایا :-

قد اجبتكم واعلموا انی ان اجبتكم ركبت بكم ما اعلم۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صـ۹۹)

"مجھے منظور ہے مگر اس بات کو جان لو کہ یہ منظوری اس صورت میں ہے کہ میں تمہیں اس راہ پر چلاؤں جسے میں بہتر سمجھوں۔"

یہ عوامی رجحانات اور تبدیلیٔ حالات کا کرشمہ ہے کہ حضرت عمر کے بعد سیرت شیخین کی شرط عائد کر کے خلافت کی پیش کش کی گئی تھی۔ جسے آپ نے رد کر دیا تھا اور اب حضرت عثمان کے بعد خلافت انہیں سونپی جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ حضرت کو کسی شرط کا پابند کریں۔ حضرت انہیں اپنی شرط کا پابند بناتے ہیں کہ وہ دوسروں کی صوابدید کے بجائے اپنی صوابدید پر عمل پیرا ہوں گے اور انہیں بھی وہ راہ اختیار کرنا ہو گی جسے آپ تجویز فرمائیں اور بہتر سمجھیں۔ یہ حضرت کی اصول پسندی کی نمایاں فتح ہے۔ جس کے سامنے مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بلا چون و چرا اسے تسلیم کر لیا اور صحیح اصول کی پاسداری دوسروں کو جھکنے پر مجبور کر ہی دیا کرتی ہے۔

حضرت کی منظوری کے بعد ۲۵ ذی الحجہ روز جمعہ ۳۵ھ کو عمومی بیعت کا اہتمام کیا گیا امیر المومنین بیت الشرف سے نکل کر مسجد کی طرف آئے جہاں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ حضرت سادگی اور حد کی سادگی کے ساتھ سر پر ایک معمولی عمامہ رکھے ایک ہاتھ میں جوتے اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں عصا کے بجائے کمان لئے مسجد میں داخل ہوئے۔ حضرت کی آمد پر مجمع میں حرکت پیدا ہوئی آپ مجمع کو چیرتے ہوئے منبر کی طرف بڑھے اور اس مقام پر جہاں رسول اللہ بیٹھتے تھے جا بیٹھے کمان پر ٹیک لگائی۔ اور بیعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طلحہ اور زبیر نے پہل کی اور بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ حسین دیار بکری

تحریر کرتے ہیں:۔

اول من بایعه طلحة والزبیر ثم سائرالناس۔	سب سے پہلے طلحہ و زبیر نے بیعت کی اور پھر دوسرے لوگوں نے۔"

(تاریخ خمیس۔ ج ۲۔ ص ۲۷۶)

طلحہ کا ایک ہاتھ جنگ اُحد میں ناکارہ ہو گیا تھا۔ جب حبیب ابن ذویب نے انہیں بیعت کرتے دیکھا تو کہا:۔

اول من بداء بالبیعة ید لہ شلا لا یتم ھذا الامر۔	ایک ناکارہ ہاتھ والے نے بیعت کی ابتدا کی ہے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۵۱)

اس کے بعد لوگ بیعت پر اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح پیاسے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں اصحاب بدر میں سے کوئی فرد باقی نہ رہی جس نے بیعت نہ کی ہو۔ ابن حجر مکی نے تحریر کیا ہے:۔

فلم یبق من اھل بدر الا اتی علیا فقالوا ما نری احدا احق منك مد یدك نبایعك فبایعوہ۔ (صواعق محرقہ۔ ص ۱۱۱)	اہل بدر میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا اور سب کے سب حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے ہاتھ بڑھایئے تا کہ ہم بیعت کریں چنانچہ انہوں نے بیعت کی۔"

ان بیعت کرنے والوں میں صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے بلکہ یمن مصر اور عراق کے باشندے بھی تھے سب نے خوشی سے بیعت کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس طرح متفقہ طور پر آپ کی خلافت تسلیم کر لی گئی۔

بیعت کی تکمیل کے بعد خطیب انصار ثابت ابن قیس نے انصار کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:۔

واللہ یا امیرالمومنین ولئن کانوا تقدموك في الولاية فما تقدموك في الدين ولئن سبقوك امس لقد لحقتهم اليوم ولقد كانوا وكنت لا	خدا کی قسم اے امیرالمومنین اگرچہ وہ لوگ حکومت میں آپ سے سابق تھے مگر دین میں آپ سے سبقت نہ لے جا سکے اگر وہ کل آپ سے آگے بڑھ گئے تھے تو آج آپ بھی اسی مقام پر آ گئے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے نہ آپ کا مرتبہ ڈھکا چھپا تھا اور نہ

يخفى موضعك ولا يجهل لا يعلمون ولا احتجت الى احد مع علمك۔

آپ کی منزلت انجانی تھی وہ آپ کے محتاج تھے ان چیزوں میں جنہیں نہیں جانتے تھے اور آپ اپنے علم کی بنا پر کسی کے محتاج نہیں رہے ۔"

(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صہ ۱۵۵)

انصار نے بیعت کے سلسلہ میں عمومی طور پر بڑی سرگرمی سے حصہ لیا مگر ان میں سے چند آدمیوں نے جو عثمانی گروہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ بیعت سے گریز کیا۔ چنانچہ حسان ابن ثابت، کعب ابن مالک، مسلمہ ابن مخلد، ابوسعید خدری، محمد ابن مسلمہ، نعمان ابن بشیر، زید ابن ثابت، رافع ابن خدیج، فضالہ ابن عبید اور کعب ابن عجرہ نے بیعت نہیں کی۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی بیعت سے پہلوتہی کی۔ چنانچہ قدامہ ابن مظعون عبداللہ ابن سلام، مغیرہ ابن شعبہ، سعد ابن وقاص، عبداللہ ابن عمر، صہیب ابن سنان، سلمہ ابن وقشی اسامہ ابن زید، اور دہبان ابن صیفی بیعت سے منہ موڑ کر گھروں میں بیٹھے رہے یہ لوگ بھی حضرت عثمان سے وابستہ رہے تھے اور یہی وابستگی ان کے لئے بیعت سے مانع رہی۔

امیرالمومنین نے کسی شخص کو آزادئ رائے کے حق سے محروم نہیں کیا بلکہ ہر شخص کو اس کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا۔ نہ کسی پر دباؤ ڈالا اور نہ کسی پر سختی گوارا کی۔ جس نے برضا و رغبت بیعت کرنا چاہی اس سے بیعت لے لی اور جس نے بیعت سے علیحدگی اختیار کرنا چاہی اس سے مطالبہ نہ کیا البتہ سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر سے بیعت کے لئے کہا کیونکہ ان دونوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ صرف خود ہی بیعت سے علیحدہ نہیں رہیں گے بلکہ دوسروں کو بھی بیعت سے روکیں گے۔ چنانچہ سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر کو طلب کیا اور اُن سے بیعت کے لئے فرمایا۔ سعد نے دفع الوقتی کرتے ہوئے کہا کہ جب دوسرے لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی بیعت کر لوں گا اور اگر بیعت نہ بھی کروں تو کھل کر مخالفت بھی نہیں کروں گا حضرت نے دوبارہ ان سے کچھ نہ کہا انہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ اور عبداللہ ابن عمر نے بیعت سے انکار کیا تو اطمینان خاطر کے لئے اتنا فرمایا کہ تم اس امر کی ضمانت دو کہ ملک کے نظم و نسق میں رخنہ اندازی کر کے فضا کو مکدر کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اس نے ضمانت دینے سے انکار کیا۔ اس پر مالک اشتر نے بگڑ کر کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کا سر اڑا دوں حضرت نے فرمایا کہ تم اس سے کوئی تعرض نہ کرو میں خود اس کا ضامن ہوتا ہوں۔ یہ بچپن میں بھی کج خلق تھا اور بڑا ہو کر بھی کج خلق رہا۔

امیرالمومنین کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے بیعت کے موقع پر بڑی سرگرمی دکھائی مگر بعد میں بیعت سے منحرف ہو کر تخریبی کاروائیوں پر اُتر آئے۔ ان تخریب پسندوں

میں طلحہ اور زبیر بھی شامل تھے جنہوں نے مجمع عام میں بیعت کی اور جب انہیں اپنے توقعات پورے ہوتے نظر نہ آئے تو بیعت توڑ کر الگ ہو گئے اور بیعت شکنی کے جواز کے لئے عذر یہ تراشا کہ ہم نے تلوار کے سایہ میں مارے باندھے بیعت کی تھی اور اگر بیعت نہ کرتے تو قتل کر دیے جاتے۔ امیرالمومنین کی بیعت جس صورت اور جس حالت میں ہوئی اسے پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی انصاف پسند یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا کہ جس ہستی نے مسلمانوں کے انتہائی اصرار کے بعد خلافت کی ذمہ داری قبول کی ہو اس نے بیعت کا آغاز سختی و تشدّد سے کیا ہوگا اور لوگوں کو ہراساں و خوفزدہ کر کے ان سے بیعت لی ہوگی اور پھر ان دو کے علاوہ اور بھی ایسے افراد تھے جنہوں نے بیعت سے انکار کیا تھا مگر کسی پہ جبر کرنا تو در کنار کچھ کہا سنا بھی نہیں تو صرف انہی دو آدمیوں پر جبر کس لئے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ان دو سے بجبر بیعت لینے میں یہ مصلحت تھی کہ ان کے اثر و نفوذ کی بناء پر انہیں پابند بیعت کر کے سیاسی استحکام حاصل کیا جائے تو یہ مصلحت عبداللہ ابن عمر اور سعد ابن ابی وقاص کے بارے میں بھی ملحوظ ہونا چاہیئے تھی اور انہیں بھی بجبر پابند بیعت کرنا چاہیئے تھا جب کہ یہ دونوں اثر و رسوخ کے اعتبار سے طلحہ و زبیر سے کم نہ تھے۔ عبداللہ ابن عمر خلیفہ زادہ اور سعد ابن وقاص مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ جب ان پر سیاسی استحکام کی بناء پہ جبر نہیں کیا گیا تو ان دونوں پر جبر کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اگر امیرالمومنین بیعت کے سلسلہ میں جبر کرتے تو دورِ اوّل میں جو جبر ان پر کیا گیا تھا اسے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ کہا جاتا کہ جب حضرت علی نے جبر و اکراہ سے بیعت لی تو اگر انہیں بیعت کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ ظلم و زیادتی کیوں حالانکہ حضرت علی پر کئے جانے والے جبر کے جواب میں کسی نے یہ اشارۃً بھی نہیں کہا کہ آپ نے بھی بیعت کے سلسلہ میں جبر و تشدد روا رکھا تھا۔ لہٰذا یہی کہا جائے گا کہ ان دونوں نے بیعت کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے بعد میں یہ بات بنائی جسے واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

امیرالمومنین کی بیعت سے دینی و دنیوی اقتدار ایک مرکز پر جمع ہو گیا۔ دنیوی اقتدار کو حکومت سے اور دینی قیادت کو خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حکومت کی تشکیل میں عوامی انتخاب کار فرما ہوسکتا ہے مگر خلافت میں نہ انتخاب کا دخل ہوتا ہے اور نہ کسی خود ساختہ اصول کے ماتحت اسے کسی کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ خلافت اللہ کی جانب سے اس کے احکام کے اجراء و نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے جو نبوت کی طرح عوام کے چناؤ پر منحصر نہیں ہوتی اس لئے کہ اسلام کا کوئی جزوی و فرعی حکم بھی ایسا نہیں ہے۔ جسے عوام کی رائے پر چھوڑا گیا ہو تو خلافت ایسے اہم معاملہ کو جس پر حیات ملی اور بقائے دین کا انحصار ہے عوام کی رائے پہ کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امیرالمومنین کی خلافت جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہے

عوام کی رائے اور ان کی بیعت پر موقوف نہ تھی۔ اس مرحلہ پر جس خلافت کی پیش کش آپ کے سامنے کی گئی وہ صرف ایک انتخابی اصول کے ماتحت اقتدار کی منتقلی تھی جسے جمہوری خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لئے امیرالمومنین نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور اصرار کے بعد اسے قبول کیا تو اس مقصد کے پیش نظر کہ قیام حجت کے بعد ان فرائض کو انجام دے سکیں جو بحیثیت امام و جانشین رسول ان پر عائد ہوتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کو حضرت نے ایک خطبہ میں بیان فرمایا ہے۔ "اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پُری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اوّل کو سیراب کیا تھا۔" اگرچہ پیغمبر کے بعد آپ ظاہری اقتدار سے الگ رہے مگر خلافت الٰہیہ کے منصب جلیل سے ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کو علیحدہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا بلکہ اقتدار و عدم اقتدار دونوں صورتوں میں آپ خلیفۂ رسول اور امام منصوص ہونے کی حیثیت سے واجب الاطاعۃ تھے اس ظاہری خلافت سے تو بس اتنا ہوا کہ جو انہیں امام مفترض الطاعۃ نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں میں ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اگرچہ ان دونوں گروہوں میں اطاعت قدر مشترک تھی۔ مگر دونوں کے زاویہ ہائے نظر مختلف تھے ایک گروہ نے خلافت الٰہیہ کے اعتبار سے اطاعت کی اور ایک گروہ نے عوامی انتخاب کی رُو سے سر اطاعت خم کیا۔ جنہوں نے خلیفۂ منصوص ہونے کی حیثیت سے اطاعت کی انہوں نے اس اطاعت کے پردہ میں الٰہی حاکمیت کا اعتراف کیا اور جنہوں نے بربنائے اقتدار اطاعت کی انہوں نے فقط ملوکیت پرستی کے جذبہ کے زیر اثر سر جھکائے اور وہ ہر اس شخص کی جو کسی بھی طریق سے خواہ قوت و طاقت سے خواہ سیاسی حیلہ گری سے برسر اقتدار آجاتا اطاعت کرتے۔ یہ اطاعت و سرافگندگی اقتدار پرستی ہے اور خلافت الٰہیہ کے ماتحت اطاعت، اطاعتِ خدا و رسول ہے۔

دنیوی اقتدار اوروں کے لئے اوج و سربلندی کا باعث ہو تو ہو مگر امیرالمومنین کی قدر و منزلت اس سے بالاتر ہے کہ حکومت و اقتدار ان کے لئے وجہ افتخار بن سکے۔ اس ظاہری خلافت سے پہلے نہ آپ میں کوئی کمی تھی اور نہ اب کوئی اضافہ ہوا جہاں ہر بلندی سرنگوں ہو وہاں تاج و تخت کی بلندی رفعت کا سامان مہیا نہیں کرتی اور جہاں امامت کا جوہر ضیا بار ہو وہاں شہنشاہیت کا گرد فرزینت افزا نہیں ہوتا ؎

زروئے خوب تو مشاطہ دست باز کشید ۔۔۔ کہ شرم داشت کہ خورشید را بیارائد

چنانچہ صعصعہ ابن صوحان عبدی نے بیعت کے موقع پر حضرت سے مخاطب ہو کر کہا:۔

واللہ یا امیرالمومنین لقد زینت الخلافۃ وما زانتک ورفعتہا وما رفعتک ولہی احوج الیک منک الیہا۔
(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۳۵)

خدا کی قسم اے امیرالمومنین آپ نے خلافت کو زینت بخشی ہے اس نے آپ کو زینت نہیں دی آپ اسے بلندی پر لے گئے ہیں اس نے آپ کا پایہ بلند نہیں کیا آپ کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ اسے آپ کی ضرورت تھی۔"

ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے سامنے خلافت کی بحث چھڑی تو انہوں نے کہا:۔

یا ھولاء قد اکثرتم فی علی والخلافۃ والخلافۃ وعلی ان الخلافۃ لم تزین علیا بل علی زینہا (تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۱۔ ص ۱۳۵)

اے لوگو تم علی اور خلافت، خلافت اور علی کو طول دے رہے ہو خلافت نے علی کے لئے زینت کا سامان نہیں کیا بلکہ علی نے خلافت کو زینت دی ہے۔"

امیرالمومنین کا طرزِ جہانبانی

زمانۂ قدیم سے انسانوں پر شہنشاہی نظام مسلط رہا ہے جس کے نتیجہ میں انسانی مزاج اقتدار پرستی کا خوگر ہو گیا اور جذبۂ نیازمندی پرستش کی حد تک پہنچ گیا۔ چنانچہ قدیم مصریوں اور جاپانیوں نے اپنے حکمرانوں کے بارے میں یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ وہ پیدا ہی حکومت و فرمانروائی کے لئے ہوتے ہیں اور دوسرے افراد پیدائشی طور پر ان کے غلام اور خدمت گزار ہیں۔ اس تصوّر نے عام انسانوں کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیا اور سختیوں میں پیسے جانے اور استبدادیت کے پنجوں میں جکڑے رہنے کے باوجود یہ سمجھتے رہے کہ انہیں فرمانرواؤں کے خلاف لب کشائی کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے ان کے عیش و عشرت کا سامان کرتے اور ان کے شبستانوں کی رونق بڑھاتے رہیں۔

جب سرزمین عرب پر اسلام کی آواز بلند ہوئی تو اس وقت کے حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ کمزور طاقت وروں کے سامنے بے بس تھے غریب سود خواروں کی گرفت میں اور غلام آقاؤں کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے اسلام نے ان جکڑے بندھے انسانوں کو حریت و مساوات کا مژدہ سنایا رنگ و نسل کا امتیاز مٹایا غلاموں کو انسانی حقوق سے بہرہ یاب کیا اور انسانی حکومت کو ختم کر کے حکومت الٰہیہ کا پیغام دیا۔ حکومت الٰہیہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کا اعتراف کیا جائے۔ اور دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ سمو لیا جائے کہ وہی ہمارا اور سب کا مالک ہے وہ ہمارے ہر قول و فعل کا سننے اور

دیکھنے والا ہے اور ہم اسی کے احکام کے پابند اور اسی کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس حاکمیت کا اعتراف استبدادیت کے بتوں کو پاش پاش کر کے دل و دماغ میں برادری و برابری کا احساس پیدا کرتا ہے اور تمام ناروا پابندیوں سے چھڑا کر فطری و طبعی آزادی کی راہ پر لے چلتا ہے۔

پیغمبر اسلام کا مطمح نظر حکومت یا سیاسی اقتدار نہ تھا بلکہ مقصد بعثت حکومت الہیہ کی تشکیل اور خداوندی اقتدار کا قیام تھا۔ چنانچہ انہوں نے درس توحید دے کر تمام انسانوں کو ایک مرکز وحدت پر جمع ہونے کی دعوت دی تا کہ اللہ کے احکام کا اجراء اور اس کے قوانین کا نفاذ کر کے ایک پاک و پاکیزہ اور معیاری معاشرہ قائم کریں جس میں ظلم کے بجائے عدل و انصاف کو جہالت کے بجائے علم و حکمت کو اور انسانوں کی حکومت کے بجائے اللہ کی حاکمیت کو فروغ حاصل ہو تا کہ فرزندان توحید اللہ کے علاوہ کسی اور کے آگے سرنگوں نہ ہوں۔ آنحضرت نے صرف اپنے دور ہی میں حکومت الہیہ کی تشکیل نہیں کی بلکہ اپنے بعد کے لئے بھی ایک ایسے ابدی نظام کی رہنمائی فرما گئے جو اللہ کی حاکمیت پر مبنی تھا۔ اس نظام کا نام خلافت الٰہیہ ہے جس کے قیام کا ذمہ دار وہ ہو گا جو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اپنے قول و عمل سے عوام کو الہی حاکمیت کے تصور سے ادھر ادھر نہ ہونے دے اور ہر حرکت و سکون اور ہر قول و فعل میں اللہ کے احکام کا پابند اس کے قوانین کا نگران اور اسی کا مقرر کردہ ہو تا کہ زمین میں اسے اللہ کا نمائندہ سمجھ کر اس کے احکام کے آگے سر اطاعت خم کیا جائے کیونکہ خدا کے احکام کی تعمیل اسی کے احکام کی بجا آوری میں مضمر ہوتی ہے چنانچہ ارشاد الہی ہے :۔

اطیعوا اللہ واطیعو الرسول	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے
واولی الامر منکم	صاحبان امر ہوں ۔“

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پیغمبر کے بعد جس کمزور جمہوریت پر حکومت کی اساس رکھی گئی تھی وہ قیصری و کسروی طرز حکومت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اللہ کی حاکمیت کی جگہ شخصی حکومت نے لے لی حالانکہ اسلام میں آمریت ملوکیت اور شخصی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق ہے خواہ وہ تیغ و سنان کا سہارا لے کر بر سر اقتدار آیا ہو جمہور کی رائے ہموار کر کے۔ اس لئے کہ حکومت الہیہ کا معیار نہ قوت و طاقت ہے اور نہ ان عوام کی ہمنوائی جن کی اکثریت خود غرضی و مفاد پرستی کا شکار ہوتی ہے بلکہ جسے حکمران حقیقی اپنے نمائندہ کی حیثیت سے نگران ریاست مقرر کرے گا وہی اسلامی مملکت کا رئیس و سربراہ متصور ہو گا جو الہی حاکمیت کی اساس پر حکومت کی تشکیل کرے گا اور اللہ کے احکام و قوانین کے نفاذ کا پابند ہو گا۔ بے شک مسند نشینان خلافت مسلمان کہلاتے

اور حلقہ بگوش اسلام سمجھے جاتے تھے مگر اسلامی حکومت صرف مسلم افراد کے برسرِ اقتدار آ جانے کا نام نہیں ہے بلکہ اس نظامِ حیات کے احیاء کا نام ہے جسے آنحضرتؐ نے نافذ کیا اور اپنے بعد ایک ناقابلِ ترمیم لائحہ عمل کے طور پر چھوڑ گئے۔ اگر کوئی اس لائحہ عمل کے خلاف حکومت تشکیل دیتا ہے تو وہ لاکھ مسلمان کہلاتا اور مسلمان سمجھا جاتا ہو اسے اسلامی حکمران نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ یزید، مروان، عبدالملک اور اس قبیل کے دوسرے فرمانرواؤں کی حکومت کو اسلامی حکومت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ حکومتیں اسلامی حکومت کا آئینہ دار ہونے کے بجائے ہرقلی و قیصری حکومتوں کا نمونہ تھیں جنہیں اسلامی حکومت کہنا اسلامی طرزِ حکومت سے بے خبری کی دلیل ہے۔

حضرت علی کی حکومت صحیح معنی میں اسلامی حکومت تھی اور آپ نے حکومت کی ذمہ داری اسی شرط پر قبول کی تھی کہ اسے اسلامی قالب میں ڈھالنے اور منہاجِ نبوت پر چلانے میں کوئی دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ آپ نے حالات کی تبدیلی اور انسانی مزاج کی تغیر پذیری کے باوجود حکومتِ ربانیہ کے تقاضوں کے مطابق حکومت کی تشکیل کی اور رسول اللہ کے طرزِ جہانبانی پر اپنی حکومت کی اساس رکھی اگرچہ آپ کا دورِ حکومت مختصر اور انتہائی مختصر مگر وہ بھی شورشوں اور ہنگاموں کا آماجگاہ بن گیا تھا مگر اس تھوڑے عرصہ میں بھی اسلامی حکومت کے خدوخال کو اس طرح نمایاں کر کے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا کہ دورِ نبوی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اگر آپ زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو مسلمانوں پر حکومتِ اسلامیہ کا مفہوم واقعی روشن نہ ہوتا اور اسے بھی مادی حکومتوں کی طرح ایک حکومت تصور کر لیا جاتا جس کا مقصد ملک گیری و کشور کشائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا مگر آپ نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر ان تمام پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھا دیا جو اسلامی حکومت پر ڈالے گئے تھے اور اپنے طرزِ عمل سے واضح کر دیا کہ اسلامی اصول و آئین کے ماتحت حکومت کا قیام اور ہے اور بتقاضائے سیاست اسلام کا نام لے کر حکومت کی تشکیل اور ہے۔

امیرالمومنین کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے کہ ان کے ہر عمل میں للہیت کارفرما ہوتی ہے اور انہوں نے اقتدار کو قبول کیا تو اسی جذبہ للہیت کے زیرِ اثر تاکہ افراد کی حکومت کے بجائے اللہ کی حکومت قائم کریں اور لم یکن لہ شریک فی الملک کو صحیح معنی میں عملی جامہ پہنائیں۔ اگر حضرت کو ذاتی اقتدار کی خواہش ہوتی تو آپ کو مشورے دیئے جا رہے تھے کہ سابقہ حکومت کے عمال کو ان کے عہدوں سے نہ ہٹائیں تاکہ حکومت کے استحکام کو نقصان نہ پہنچے مگر آپ نے اس نقصان کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اگر انہیں ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیا گیا تو وہ خداوندی اقتدار کے بجائے اپنا اقتدار قائم کریں گے اور آپ نے حکومت

قبول کی تھی تو اسی شخصی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے۔ اگر حضرت کو اپنا اقتدار عزیز ہوتا تو جائز و ناجائز سے آنکھیں بند کر کے تمام استحکامی تدبیروں پر عمل کرتے اور شر انگیز عناصر سے سازگاری کر کے اپنا دور کامیاب بناتے مگر حضرت کی نگاہوں میں شخصی حکومت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ ان کی نظروں میں کسی چیز کی اہمیت تھی تو امت کی عملی تربیت اور اسلامی شعائر کے احیاء کی۔ ایک مرتبہ اپنا جوتا گانٹھتے ہوئے ابن عباس سے پوچھا کہ اس جوتے کی قیمت کیا ہو گی کہا کہ اب تو اس کی قیمت کچھ نہیں ہے:۔

واللہ لاحب الی امرتکم الا ان اقیم حقا او ادفع باطلا۔ (نہج البلاغہ)

خدا کی قسم اگر میرے پیشِ نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہو تو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے۔"

امیر المومنین نے اسلامی حکومت کی غرض و غایت کو دو مختصر سے جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ ایک حق کا قیام اور دوسرے باطل کا استیصال۔ اور آپ نے اپنے عہد اقتدار میں انہی دو چیزوں کو پیش نظر رکھا۔ اور اپنا دور حکومت حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی کے لئے وقف کر دیا اور اسلامی احکام کے اجرا اور اخلاقی اقدار کے تحفظ ہی کو مقصد اولین قرار دیا اور جب کہ اقتدار کے مقابلہ میں اصول و آئین کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی جاتی تھی اور حکومت کی خاطر اسلامی اصولوں کو نظر انداز کیا جا رہا تھا اور کوئی قانون ذاتی مفاد سے متصادم ہوتا تو اسے تاویلات کا ہدف بنا لیا جاتا تھا آپ نے کسی قیمت پر صحیح اصولوں سے انحراف گوارا نہ کیا اور نہ مخالفت کی تیز و تند آندھیاں آپ کے موقف میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ آپ نہ صرف اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہے بلکہ اپنے طرزِ عمل سے منجمد طبیعتوں میں حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کیا اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کر کے ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی اگرچہ آپ ملک گیری کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور نہ ہی اندرونی شورشوں کی وجہ سے اس کا کوئی موقع تھا مگر دلوں کی تسخیر اور ذہنوں کی تعمیر کشور کشائی سے بڑا کارنامہ ہے۔ بے شک اور فرمانرواؤں نے لشکر کشی کر کے مملکت کے حدود وسیع کئے اور علاقوں پر علاقے فتح کر کے فاتح کہلائے۔ مگر حضرت نے گلشن اسلام کی تازگی کے لئے کانٹوں کو چھانٹا اور ماؤف اعضا کو کاٹ کر فاسد مواد کا اخراج کیا اور اسلامی نظام کو اس کی صحت مندانہ قدروں پر استوار کر کے دکھا دیا۔ پیہم ہنگاموں اور متواتر خانہ جنگیوں میں اسلامی خطوط پر معاشرہ کی تطہیر کی رفاہ عامہ کے کام انجام دیئے۔ استحصال کی روک تھام کی رعایا کی شکایات سنیں اور ان کا ازالہ کیا۔ ناروا بندشوں کو ختم کر کے آزادانہ فضا میں سانس لینے کا موقع دیا۔ تعمیری عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور تخریبی قوتوں کا سر توڑ مقابلہ کیا عمال کی کارگزاریوں کا ہر پہلو سے جائزہ لیا خراج و زکوٰۃ کے کارندوں کے دائرہ کار اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے حقوق و فرائض کا تعین کیا اور نسلی

و ملکی امتیازات کو ختم کر کے معاشرتی عدل کو فروغ دیا۔

امیرالمومنین کے پیشِ نظر ایک ایسا معیاری و مثالی معاشرہ تھا جس میں ظلم و جور، استحصال و زر اندوزی اور رشوت و خیانت کی قطعاً کوئی گنجائش نہ ہو اور نظامِ حکومت حق و انصاف و قانونی مساوات وسائل معیشت کی آزادی انفرادی و اجتماعی فلاح اور اسلامی اقدار پر مبنی ہو۔ حضرت خود بھی ان چیزوں پر کاربند رہے اور عمالِ حکومت کو بھی ان پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً انہیں دینی اقدار اور اسلامی ضابطہ اخلاق کی طرف تحریراً متوجہ فرماتے رہتے ان تحریرات میں سرعنوان تقوی و پرہیزگاری کی ہدایت اور یوم حساب کی یاددہانی ہوتی تاکہ تقوی ان کے دلوں میں عظمتِ الہی کا احساس اور آخرت کی یاد عمل کا جذبہ پیدا کرے اور اس طرح یقین و عمل کی روح ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ یوں تو آپ کا ہر تحریری فرمان ایک دفترِ ہدایت ہوتا تھا مگر مالک اشتر کو والیٔ مصر مقرر کرتے وقت جو دستاویز لکھ کر دی وہ الہامی تعلیمات کی آئینہ دار اور دستوری شقوں پر اس حد تک حاوی ہے کہ آج تک ذہن انسانی اس سے آگے سوچ نہیں سکا اور نہ مزید ارتقائی مراحل طے کر کے اس میں بنیادی طور پر کسی شق کا اضافہ کر سکے گا۔ جورج جرداق مسیحی نے اس کی جامعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

ھی من جلائل وصایاہ و اجمعھا لقوانین المدینہ و الحقوق العامۃ والتصرفات الخاصۃ (صوت العدالہ۔ ج۔ ص۳۳۵)	آپ کے عہد ناموں میں سے یہ ایک عظیم منشور ہدایت ہے جو شہریت و مدنیت کے قوانین کا جامع اور عامۃ الناس کے حقوق اور خواص کے حدودِ کار پر حاوی ہے۔"

اس دستاویز میں حضرت نے معاشرہ کے ادنی طبقہ سے لے کر اعلیٰ طبقہ تک ایک ایک کے حقوق و فرائض وضاحت سے بیان فرمائے ہیں اور مزدوروں صنعت کاروں تاجروں لشکریوں قاضیوں مشیروں وزیروں اور اکتسابِ معیشت سے درماندہ افراد کے حقوق کا تعین کیا ہے اور صیغہ مالیات حکومتی معاہدات داخلہ و خارجہ تعلقات اہل اسلام اور ذمیوں کے شہری و معاشرتی حقوق سیاسی و معاشی نظام عدلیہ و انتظامیہ کے قیام اور قضاۃ و عمال اور ان کے ماتحت عملہ کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ منشور ہدایت اپنی افادیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے کسی خاص دور کسی خاص طبقہ اور کسی خاص ملک سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حضرت نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے جو راعی اور رعایا کا مقام متعین کیا اور مملکت کا جو لائحہ عمل تجویز فرمایا وہ آج بھی اتنی ہی افادیت کا حامل جتنا اس دور میں تھا اور ہر جمہوری و غیر جمہوری مملکت اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اگر امن عالم اور تحفظ حقوق کی آواز بلند کرنے والی

حکومتیں اسے اپنا لائحہ عمل قرار دے لیں تو نہ زمیندار و کاشتکار میں کشمکش ہو سکتی ہے نہ مزدور کی حق تلفی اور سرمایہ کار کے ظلم کا سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ دولت کی غیر متوازی تقسیم سے ناہمواری جنم لے سکتی ہے۔ بلکہ ایسا پُر امن معاشرہ صورت پذیر ہو سکتا ہے جو باہمی سازگاری خوشحالی و معاشی برتری کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہو۔

ہم اس منشور کو یہاں نقل کرنے کے بجائے ترجمہ نہج البلاغہ باب مکاتیب کا حوالہ دے دینا کافی سمجھتے ہیں قارئین کرام چاہیں تو نہج البلاغہ کے صفحات پر دیکھ سکتے ہیں البتہ اس کتاب میں کہیں کہیں اس کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔

اب حضرت کی حکومت کے مختلف شعبوں کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپ کی سیاست عین اسلامی سیاست تھی اور چونکہ اسلامی سیاست ایک ایسا نظام ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں کو دین سے وابستہ کر دیا گیا ہے اس لئے حکومت علویہ کا کوئی شعبہ وہ معیشت سے متعلق ہو یا معاشرت سے رعایا سے متعلق ہو یا راعی سے دین کے حدود سے خارج تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عمال کا معیار تقرر

تمدنی ارتقاء اور معاشرتی بلندی، ریاست کی تنظیم اور حکومت کی تشکیل سے وابستہ ہے۔ خواہ شخصی حکومت ہو یا جمہوری، اسلامی ہو یا غیر اسلامی حکومت ہی کے ذریعہ انسانی معاشرہ میں نظم و نسق پیدا کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ شورش و بدنظمی کا انسداد انسانی حقوق کا احترام اور ملکی اصلاحات کا نفاذ ممکن ہے۔ ریاست کا نظم و انضباط اور اس کی شیرازہ بندی سربراہ مملکت کے تدبر اور عمال کی انتظامی صلاحیتوں اور عملی کارگزاریوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی ریاست میں عمال و نگران کار نہ ہوں یا ہوں مگر خود غرض مفاد پرست اور ادائے فرض سے غافل ہوں تو نہ نظم و ضبط قائم رہ سکتا ہے اور نہ فتنہ و شر اور لاقانونیت کا استیصال کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے انتظامی و اصلاحی امور کا نفاذ انہی حکام و عمال کے ذریعہ عمل میں آتا ہے اور انہی کے ذریعہ رعایا کو ملکی قوانین و ضوابط کا پابند بنایا جاتا ہے۔ ان عمال کا تقرر ریاست کے مختلف علاقوں میں سربراہِ مملکت کی صوابدید سے ہوتا ہے۔ اگر حکومت اسلامی ہوگی تو وہ ان امور کے علاوہ جو اسلامی و غیر اسلامی حکومت میں مشترک ہیں جزیہ و زکوٰۃ کی جمع آوری حدود و تعزیرات کے اجراء اسلامی احکام کے نفاذ اور دینی و اخلاقی تربیت ایسے تعمیری فرائض کی انجام دہی کے بھی ذمہ دار ہونگے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عوام اپنے حکام کے طرزِ عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور وہی طور طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ان حکام کا ہوتا ہے۔ اگر وہ بلند کردار نیک سیرت اور اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ ہوں گے تو عوام میں بھی حسنِ عمل کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور اگر خود غرض رشوت خور اور استحصال پسند ہوں گے تو رعایا بھی خود غرضی کی ڈگر پر چل پڑے گی اور تمام اخلاقی قدروں کو اپنے ذاتی مفاد پر بھینٹ چڑھا کر ملکی فضا کو مکدر کر کے رکھ دے گی۔ اور اس کا نتیجہ انتشار بے اطمینانی بدامنی اور آخر میں حکومت کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے مملکت کی بہبود اور عوام کی فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ حکام و عمال کے تقرر میں باریک بینی سے کام لیا جائے ان کے عادات و اطوار پرکھ لیے جائیں اور معیار پر پورے اتریں تو ان کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

امیرالمومنین تقویٰ دیانت اور صلاحیت کار ہی کو عہدوں کا معیار سمجھتے تھے اور اپنے دورِ حکومت میں کلیدی عہدے انہی لوگوں کے سپرد کئے جن کی امانت و دیانت نیکی اور راست روی پر پورا اعتماد تھا۔ ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں :۔

ولا یخص بالولایات الا اھل الدیانات والامانات۔	حضرت علی انہی لوگوں کو والی و حاکم مقرر کرتے جو امین اور دیانت دار ہوتے۔

(استیعاب۔ ج ۳۔ ص ۴۷)

اس سلسلہ میں خاندانی اثرات قبائلی طاقت قرابت اور سفارش سے قطعاً متاثر نہ ہوتے تھے۔ صرف دیانت اور نظم و ضبط کی اہلیت کو دیکھتے تھے اور ان عمال کو بھی ہدایت کرتے تھے کہ وہ سفارش پر عہدے نہ دیں۔ چنانچہ ایک موقع پر فرمایا :۔

لاتقبلن فی استعمال عمالك وامرائك شفاعة الا شفاعة الكفاية والامانة۔ (السائل)	کارندوں اور کارپردازوں کو عہدہ دینے میں کسی کی سفارش قبول نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ وہ امین اور اس کام کے لئے موزوں ہیں۔

امیرالمومنین کے عمال میں چند عمال ہاشمی بھی تھے جیسے فرزندانِ عباس، عبداللہ، عبیداللہ اور قثم بعض لوگوں نے اس سے یہ تاثر لیا ہے کہ حضرت نے عہدہ داروں کے انتخاب میں قرابت کا پاس کیا ہے۔ اور عزیزداری کو ملحوظ رکھا ہے لہٰذا حضرت عثمان نے اگر اپنے قبیلہ و خاندان سے عمال مقرر کئے تو ان پر حرف گیری کیوں کی جائے جب کہ حضرت علی پر نکتہ چینی نہیں کی جاتی اس سے حضرت علی کی شخصیت کا تحفظ پیش نظر نہیں ہے بلکہ حضرت عثمان کی اقربا نوازی کا جواز ثابت کرنا ہے مگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت علی کے انتخاب میں اقربا پروری کا جذبہ شامل تھا تو حضرت عثمان خویش نوازی کے الزام سے بری کیسے

ثابت ہو گئے جب کہ الزام کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو برسراقتدار لائے بلکہ الزام یہ ہے کہ ایسوں کو برسراقتدار لائے جو خودسر، نا عاقبت اندیش اور امور نظم ونسق سے بے خبر تھے جنہوں نے قبائلی عصبیت کو ابھارا سرمایہ داری کا رجحان پیدا کیا اور جبر واستحصال اور ظلم وتشدد سے انسانی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا۔ اگر ایسے لوگوں کو منتخب کرتے جو حق پسند انصاف پرور اور تقویٰ ودیانت کے پابند ہوتے تو اقربا نوازی ہوتی بھی تو لوگ اسے نظر انداز کر دیتے اور نوبت وہاں تک نہ پہنچتی جہاں تک پہنچی۔ حضرت علی نے جن عزیزوں کو عہدے دیئے ان کی انتظامی صلاحیت اور تقویٰ ودیانت شک وشبہ سے بالاتر ہے اس تفرقہ کے باوجود دونوں دوروں کے عاملوں کو صرف قرابت میں اشتراک کی بنا پر ایک سطح پر سمجھنا اور اس سے حضرت عثمان کی بے غرضی وبے لوثی پر ثبوت لانا واقع کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ پھر یہ بات اس وقت کہی جا سکتی تھی جب اموی عمال کی طرح ہاشمی عمال تمام صوبوں پر چھائے ہوتے اور تمام علاقوں کا در وبست ان کے ہاتھوں میں ہوتا۔ لے دے کر دو چار عمال ہاشمی تھے اور وہ بھی ایسے جن کی علمی وعملی جلالت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ پچیس برس کے طویل عرصہ میں ہاشمی کسی عہدہ پر نظر نہیں آتا۔ تو اسے اتفاق پر محمول کر کے قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا اور امیرالمومنین کے دور میں چند ہاشمی منصب پر فائز ہو جاتے ہیں۔ تو ذہنی کیفیت دگرگوں ہو جاتی ہے اور پیشانی پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ کیا بنی ہاشم میں کوئی بھی کلیدی منصب کی اہلیت نہ رکھتا تھا اور اگر ان میں اہلیت تھی تو پھر ہاشمیت کی بنا پر انہیں عہدوں سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہوتا اگر بقول حضرت عمر نبوت وخلافت ایک خاندان میں جمع نہ ہو سکتی تھی تو کیا خاندان نبوت میں کسی عہدہ ومنصب کی بھی گنجائش نہ تھی۔ کیا ان میں اہل افراد نہ تھے یا یہ بنی ہاشم سے بے التفاتی وسرد مہری کا مظاہرہ تھا۔ امیرالمومنین کی فرض شناسی وبے نفسی کو دیکھتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے قربت سے متاثر ہو کر عدم اہلیت کے باوجود کسی ہاشمی کو کوئی عہدہ دیا ہو گا یا ان سے امتیازی برتاؤ روا رکھا ہو گا۔ حضرت کے نزدیک عہدوں کا معیار صرف اہلیت اور کردار کی پاکیزگی تھا اور جو اس معیار پر پورا اترتا وہ ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی مہاجر ہو یا انصار اسے اس کے حق سے محروم نہ کرتے۔ اگر ان میں سے کوئی بے راہروی کا مرتکب ہوتا تو قرابت وعزیزداری کی بنا پر درگزر سے کام نہ لیتے بلکہ فوراً مواخذہ کرتے اور مناسب سزا دیتے۔

عمال کا محاسبہ

عمال حکومت مملکت میں تعمیر اور تخریب دونوں طرح کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہی کی تعمیری صلاحیتوں سے نظم مملکت سنورتا ہے اور انہی کی تخریبی کاروائیوں سے نظم و نسق بگڑتا ہے۔ حزم و احتیاط اور احساسِ فرض کا تقاضا یہ ہے کہ سربراہِ مملکت عمال کے حالات و معاملات سے باخبر رہے ان کی تخریبی و تعمیری تمام کاروائیوں پر نظر رکھے اور سلطنت کا کاروبار ان پر چھوڑ کر مطمئن نہ ہو جائے اس لئے کہ عمال حکومت کتنے ہی بلند کردار اور پاکیزہ نفس کیوں نہ ہوں ان کے گرد عصمت کا حصار نہیں ہوتا کہ ان سے کسی لغزش و بے راہروی کا احتمال نہ ہو جب کہ دولت و اقتدار کے نشہ میں اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور حرص و طمع کا شکار ہو کر رشوت، غبن اور خیانت ایسے جرائم کا ارتکاب کر گزرتے ہیں اور خدمت خلق کے بجائے ذاتی مفاد کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

امیرالمومنین انسانی مزاج کی بے ثباتی کو خوب سمجھتے تھے اس لئے وہ آنکھ کان بند کر کے اعتماد کر لینے کے قائل نہ تھے اور پھر سابقہ حکومت کے بھی دو ایک عمال حضرت کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلا کر اپنے عہدوں پر بحال تھے جیسے ابوموسیٰ اشعری، اشعث ابن قیس اور مصقلہ ابن ہبیرہ۔ لہذا ضرورت تھی کہ ان کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھی جائے۔ آمد و خرچ کا جائزہ لیا جائے اور ان کا پورا پورا احتساب کیا جائے چنانچہ امیرالمومنین ان کے رہن سہن طور طریقہ اور چھوٹے بڑے معاملہ پر نظر رکھتے ان کی کارکردگیوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی کوتاہیوں پر تنبیہ و سرزنش کرتے بیت المال کا حساب جانچتے اور جائز و ناجائز مصرف کو وقتِ نظر سے دیکھتے اگر کسی کے متعلق خیانت کی خبر آتی تو نظریں آسمان کی طرف اٹھا کر بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے تھے:۔

اللّٰھم انک تعلم انی لم امرھم بظلم خلقک ولا بترک حقک	بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے انہیں تیری مخلوق پر ظلم کرنے اور تیرے حق کو نظر انداز کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔"

(استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۸)

اور پھر عملاً محاسبہ و مواخذہ کرتے اور جرم کی سبکی و سنگینی کے لحاظ سے کسی کو فقط تنبیہہ و سرزنش کرتے کسی سے غبن کیا ہوا سرمایہ اگلواتے اور کسی کو قید و بند کی سزا دیتے۔ اس سلسلہ کے متعدد واقعات میں سے چند واقعات اختصار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں تاکہ حضرت کی سیرت کا یہ رُخ نظروں کے سامنے

آجائے۔

والی بصرہ عثمان ابن حنیف ایک دعوت میں شریک ہوئے حضرت کو معلوم ہوا تو انہیں تنبیہہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:۔ "مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کر لوگے جن کے یہاں فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں اور دولت مند مدعو ہوں۔ جو لقمے چباتے ہو انہیں دیکھ لیا کرو اور جس کے متعلق شبہ بھی ہو اسے چھوڑ دیا کرو اور جس کے پاک و پاکیزہ طریق سے حاصل ہونے کا یقین ہو اس میں سے کھاؤ۔ اے ابن حنیف! اللہ سے ڈرو اور اپنی روٹیوں پر قناعت کرو تاکہ جہنم کی آگ سے چھٹکارا پا سکو۔"

اشعث ابن قیس جو حضرت عثمان کے زمانہ سے آذربائیجان کا حاکم چلا آرہا تھا حضرت کو اسکی بے راہروی کی اطلاع ملی تو جنگ جمل سے فارغ ہو کر اسے تحریر کیا کہ:۔ "تمہارے ہاتھوں میں اللہ کا جتنا مال ہے تم اس وقت تک اس کے خزانچی ہو جب تک اسے میرے حوالے نہ کر دو۔" اشعث سمجھ گیا کہ اسے برطرف کیا جا رہا ہے اس نے یہ کیا کہ جتنا مال سمیٹ سکتا تھا سمیٹ لیا اور اپنے چند دوستوں سے حضرت کے خط کا ذکر کرنیکے بعد کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں معاویہ کے ہاں چلا جاؤں انہوں نے کہا کہ تمہارے لئے مناسب نہیں کہ اپنے قوم و قبیلہ کو چھوڑ کر شام جاؤ۔ اس نے دوستوں کے کہنے سننے سے شام جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ٹال پی جانا چاہا۔ حضرت نے حجر ابن عدی کندی کو اس کے پاس بھیجا جو اسے گھیر گھار کر کوفے آئے۔ جب اس کا سامان دیکھا گیا تو اس میں سے چار لاکھ درہم برآمد ہوئے۔ حضرت نے تیس ہزار درہم اس کے خدمات کے صلہ میں اسے دیئے اور باقی مال بیت المال میں جمع کر دیا۔

منذر ابن جارود عبدی نے جو آپ کی طرف سے اصطخر کا حاکم تھا کچھ ہیر پھیر کیا آپ نے اُسے تحریر فرمایا:۔ "مجھے تمہارے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ تم آخرت گنوا کر دنیا بنا رہے ہو اور دین سے رشتہ توڑ کر اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کر رہے ہو۔ تم اس قابل نہیں کہ تمہیں امانت میں شریک کیا جائے۔ یا خیانت کی روک تھام کے لئے تم پر بھروسہ کیا جائے۔ لہذا جب میرا خط ملے تو فوراً میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔"

جب منذر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو جانچ پڑتال کے بعد اس کے ذمہ ۳۰ ہزار درہم نکلے منذر نے انکار کیا اور کہا کہ میرے ذمہ کوئی رقم نہیں ہے۔ حضرت نے اسے قسم کھانے کو کہا اس نے قسم کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ آپ نے اسے جیل میں بھجوا دیا۔ آخر صعصعہ ابن صوحان کے کہنے سے اسے رہا کر دیا گیا۔

زیاد ابن سمیہ کے بارے میں جو بصرہ میں ابن عباس کا قائم مقام تھا کچھ بد دیانتی کی خبریں آئیں۔ حضرت نے اسے تحریر کیا کہ "اگر مجھے پتہ چل گیا کہ تم نے مسلمانوں کے مال میں خیانت کرتے ہوئے کسی چھوٹی یا بڑی چیز میں ہیر پھیر کیا ہے تو یاد رکھو کہ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو تمہیں تہی دست، بوجھل، بیٹھ والا

اور بے آبرو کر کے چھوڑے گی"۔

اردشیر خرہ کے عامل مصقلہ ابن ہبیرہ کو تحریر کیا:۔ "وہ مال جسے مسلمانوں کے نیزہ کی انیوں اور گھوڑوں کے ٹاپوں سے جمع کیا گیا تھا اور جس پر ان کے خون بہائے گئے تھے تم اپنی قوم کے ان بدؤوں میں بانٹ رہے ہو جو تمہارے ہوا خواہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ثابت ہُوا تو تم میری نظروں میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ اس مال میں وُہ مسلمان جو میرے ہاں ہیں یا تمہارے ہاں دونوں برابر کے شریک ہیں"۔

جب بنی تمیم کے کچھ افراد نے ابن عباس کے متشددانہ رویہ کا شکوہ کیا تو حضرت نے ابن عباس کو لکھا:۔ "خدا تم پر رحم کرے رعیت کے بارے میں تمہارے ہاتھ اور زبان سے جو اچھائی یا برائی ہونے والی ہو اس میں جلد بازی نہ کیا کرو کیونکہ ہم دونوں اس ذمہ داری میں برابر کے شریک ہیں"۔

والی حلوان اسود ابن قطبہ کو تحریر کیا:۔ "دیکھو جب حاکم کے رجحانات مختلف اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوں گے تو یہ امر اکثر انصاف پروری سے مانع ہو گا۔ لہذا حق کی رُو سے سب لوگوں کا معاملہ تمہاری نظروں میں برابر ہونا چاہیئے۔ اپنے نفس کی حفاظت کرو اور مقدور بھر رعایا کی نگرانی رکھو"۔

محکمۂ قضا

حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ رعایا کے نزاعی امور کا بے لاگ فیصلہ کرنے کے لئے ایسی عدالت گاہیں قائم کرے جہاں ہر ادنیٰ و اعلیٰ اور امیر و غریب کو حصولِ انصاف کا یکساں موقع ہو۔ تاکہ کمزور کی حق تلفی نہ ہونے پائے اور مظلوم دادرسی سے محروم نہ رہے۔ اگر کمزور و درماندہ افراد کو حکومت کی طرف سے یہ تحفظ نہ ہو تو نہ اجتماعی نظم باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن کی صورت پیدا ہو سکتی ہے بلکہ کمزور افراد یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وُہ ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں ظلم کے خلاف فریاد سننے والا اور ظالم کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہے۔ اس سے ایک طرف ظالم کی حوصلہ افزائی ہو گی اور دوسری طرف کمزور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ظلم دجور سہتے رہیں گے اور آخر اندرونی گھٹن انہیں آمادہ بغاوت کرے گی اور بغاوت کا آتش فشاں پھٹتا ہے تو حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم۔ کفر کے ساتھ ملک باقی رہ سکتا ہے اور ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔

دنیا کی آئینی حکومتیں عدل و انصاف کو بروئے کار لانے کے لئے دیوانی فوجداری خفیفہ اور عالیہ کے

نام سے عدالتیں قائم کرتی ہیں مگر حصول انصاف کے لئے عدالتوں کے چکر لگانے پیشیاں بھگتنے وکیل کرنے اور کورٹ فیسوں کا بار اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اسلام نے محکمۂ قضا کی تشکیل اس طرح کی ہے کہ اگر اس کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط ملحوظ رکھے جائیں تو نہ صرف انصاف کے حصول میں دشواری پیش آسکتی ہے اور نہ مالی اعتبار سے زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ نہ اس میں جنبہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ رشوت کی گنجائش ہے اس لئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس منصب پر وہی لوگ فائز ہو سکتے ہیں جو تقویٰ و عدل سے آراستہ اور اسلامی قوانین پر اجتہادی نظر رکھتے ہوں۔ خود داری و عزتِ نفس انہیں عزیز ہو اور معاشرہ میں معزز و باوقار ہوں تاکہ رشوت ستانی سے اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دیں اور کسی دولت مند سے مرعوب ہو کر عدل و انصاف سے انحراف نہ کریں۔

امیرالمومنین نے اپنے دورِ خلافت میں محکمہ قضا کو خاص اہمیت دی اور ہر مرکزی مقام پر اس کا شعبہ قائم کیا اور انہی لوگوں کو منصب قضا کے لئے نامزد فرمایا جو تقوی و دیانت اور علمی اہلیت کے لحاظ سے اسلام کے مقرر کردہ معیار پر پورے اترتے تھے۔ حضرت خود بھی پیغمبر اکرم کے دور میں منصب قضا پر فائز رہے تھے اور اپنی انصاف پروری معاملہ فہمی اور نکتہ رسی کا سکہ دلوں پر بٹھا چکے تھے۔ اس عملی تجربہ کے بعد ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ محکمہ قضا کن لوگوں پر قائم ہونا چاہیئے۔ حکام عدلیہ کے فرائض کیا ہیں اور کس نہج پر انہیں تربیت دینا چاہیئے۔ کہ وہ رشوت سفارش اور جنبہ داری سے بچ کر انصاف کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ انسان کی طبعی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اس کا پورا لحاظ رکھا کہ قضاۃ کو اتنا وظیفہ ملنا چاہیئے کہ وہ رشوت اور ناجائز آمدنی سے بے نیاز ہو کر آسودگی و خوش اسلوبی سے گزر بسر کر سکیں اور ضرورت و احتیاج انہیں غلط راہ پر نہ ڈال دے۔ مزید اطمینان کے لئے ان کی مالی حالت اور معیار زندگی پر نظر رکھتے تھے املاک و جائیداد کا جائزہ لیتے اور آمد و خرچ کا موازنہ کرتے اگر صورت حال مشتبہ نظر آتی تو تنبیہہ و سرزنش کرتے یا برطرف کر دیتے۔ چنانچہ قاضی کوفہ شریح ابن حارث کے بارے میں جو حضرت عمر کے دور سے عہدہ قضا پر فائز چلا آرہا تھا یہ معلوم ہوا کہ اس نے ۸۰ دینار میں ایک مکان خرید کیا ہے حضرت نے اسے طلب کیا اور فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک مکان ۸۰ دینار میں خریدا ہے۔ شریح نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ حضرت نے اسے غصہ کی نظر سے دیکھا اور کہا "اے شریح ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے اس گھر کو دوسرے کے مال سے خریدا ہو یا حرام کی کمائی سے قیمت ادا کی ہو اگر ایسا ہے تو تم نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔"

اسلام مذہب عدل ہی کو ہر شعبہ میں کار فرما دیکھنا چاہتا ہے اور محکمہ قضا کا تو بنیادی مقصد ہی

قیامِ عدل ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد باری ہے:۔

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔	جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔"

اس عدل کا تقاضا یہ ہے کہ سماعت کے دوران فریقین سے یکساں طرزِ عمل اختیار کیا جائے اور دعوٰے و جواب دعوئ پر یکساں توجہ کی جائے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے اگر قاضی سلام کرے تو الگ الگ سلام کرنے کے بجائے ایک ساتھ سلام کرے اور جواب سلام دے تو ایک ساتھ جواب دے۔ کھڑا ہونے کے لئے کہے تو دونوں کو اور بیٹھنے کے لئے کہے تو دونوں کو اور کسی ایک فریق کی طرف اپنا میلان ظاہر نہ کرے تاکہ یکطرفہ التفات دوسرے فریق کے دل میں انصاف سے محرومی کا احساس پیدا نہ کرے۔ فریقین میں مساوات و برابری کا برتاؤ امیرالمومنین کا ایک مستقل کردار تھا اور فریقین میں خواہ ایک ذمی ہو اور دوسرا مسلمان ادنیٰ امتیاز کے بھی روادار نہ ہوتے تھے اور اپنے قضاۃ عمال کو بھی اس کا سختی سے پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ صاحب وفیات الاعیان نے تحریر کیا ہے کہ حضرت ایک ذمی کے ساتھ فریق مقدمہ کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں آئے۔ قاضی شریح نے کھڑے ہو کر آپ کا خیر مقدم کیا اس پر آپ نے فرمایا:" یہ تمہاری پہلی ناانصافی ہے۔" ایک شخص آپ کے ہاں مہمان ہوا اور انہی مہمانی کے دنوں میں اس نے آپ کی عدالت میں ایک شخص کے خلاف دعوئ دائر کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم فریق مقدمہ ہو اور پیغمبر اکرم فرما گئے ہیں کہ یہ امر تقاضائے انصاف کے خلاف ہے کہ فریقین مقدمہ میں سے ایک کو مہمان ٹھہرایا جائے اور دوسرے کو مہمان نہ کیا جائے۔ لہٰذا تم میرے ہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ کتب سیر میں درج ہے کہ آپ حضرت عمر کے دورِ حکومت میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ان کے ہاں گئے۔ حضرت عمر نے آپ کو یا اباالحسن کی کنیت سے اور آپ کے حریف کو نام سے مخاطب کیا اس پر حضرت کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ عدل کا اقتضاء یہ تھا کہ فریقین مقدمہ کے طرزِ تخاطب میں یکسانیت ہوتی۔ ایک کو نام سے اور دوسرے کو کنیت سے مخاطب کرنا تقاضائے عدل کے خلاف ہے۔

ان دو ایک واقعات کو دیکھنے کے بعد جو صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت کی نگاہیں عدل کے جملہ پہلوؤں پر مرکوز رہتی تھیں اور کوئی نیم روشن یا ڈھکا چھپا گوشہ بھی اُن کی باریک بین نظروں سے اوجھل نہ رہتا تھا۔ مندرجہ واقعات میں یہ تفریق تو ایک حد تک عیاں ہے کہ ایک کا خیر مقدم کیا جائے اور دوسرے کا خیر مقدم نہ ہو یا ایک کو مہمان کیا جائے اور دوسرے کو مہمان نہ کیا جائے مگر ایک کو کنیت سے اور دوسرے کو نام سے مخاطب کرنے میں امتیاز کی جو جھلک پائی جاتی ہے۔

اس پر اگر کسی باریک بین اور نکتہ رس کی نظر پڑ سکتی ہے تو غور و فکر کے بعد ہی پڑ سکتی ہے۔ مگر حضرت فوراً ان دونوں کے باہمی فرق کی طرف ملتفت ہو جاتے ہیں اور اس خیال سے کہ اس طرز تخاطب سے یہ تاثر لیا جا سکتا ہے کہ فیصلہ میں جھکاؤ بھی ادھر ہو گا جدھر تخاطب کا انداز تعظیمی ہے۔ آپ فوراً ادھر توجہ دلاتے ہیں کہ یا تو دونوں کو کنیت سے مخاطب کیا جاتا یا دونوں کو نام سے تاکہ اس تفریق کے نتیجہ میں کوئی غلط تاثر پیدا نہ ہونے پائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ دنیا میں کون ایسا ہو گا جسے اپنے حق میں تعظیمی رویہ ناگوار گزرتا ہو گا جب کہ وہ واقع میں تعظیم کا سزاوار بھی ہو۔ مگر حضرت کی طبع عدل آشنا پر یہ تعظیمی لب و لہجہ بھی بار ثابت ہوتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر عدل پسندی کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

موجودہ دور میں اکثر حلقوں سے یہ آواز سننے میں آتی ہے کہ عدلیہ کو انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد رہنا چاہئے تاکہ عدلیہ حکومت کی مقصد براری کا ذریعہ نہ بن جائے اور عوامی مفاد کا تحفظ کرنے کے بجائے حکومت کے مقاصد کی پشت پناہی ہی اس کا کام نہ رہ جائے۔ بیشک اس حد تک عدلیہ کی آزادی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے اور اس کے دائرہ کار کو وسیع ہونا ہی چاہئے۔ اس لئے کہ عدلیہ قانون کی ترجمان ہے اور قانون کی بالادستی عوام تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک اصول و آئین کی پابند حکومت بھی اسی کے آگے جھکنے پر مجبور ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عدلیہ کو آنکھ بند کر کے کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جس طرح چاہے اور جو چاہے فیصلے کرے اور اس کے غلط فیصلوں پر ٹوکنے والا اور صحت و سقم سے آگاہ کرنے والا کوئی نہ ہو جب کہ ایک حکومت عادلہ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ عدالتی فیصلوں کو جانچے پرکھے اور غلط فیصلوں میں ردّ و بدل کرے یا انہیں سرے سے کالعدم قرار دے۔ چنانچہ امیر المومنین نے عدلیہ پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ اہم امور کے فیصلے ان کے علم میں آئے بغیر نہ کریں صاحب وسائل نے تحریر کیا ہے کہ آپ نے قاضی شریح سے فرمایا:

ایاك ان تنفذ قضیة فی قصاص او حد من حدود الله او حق من حقوق المسلمین حتی تعرض ذلك علی۔ (وسائل ج ۳ ص ۳۹۵)	خبردار! قصاص یا حدود الٰہیہ میں سے کسی حد کا اجرا اور مسلمانوں کے حقوق میں سے کسی حق کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرنا جب تک وہ فیصلہ میرے سامنے پیش نہ کر دو۔"

البتہ جہاں تک عمومی فیصلوں میں آزادی اور بین الملی مساوات کا تعلق ہے تو حضرت اس کے سب سے بڑے حامی تھے آپ عدل کے اقتضا اور قانون کی بالادستی کے مقابلہ میں نہ کسی کی برتری کے قائل تھے نہ ترجیحی سلوک کے روادار تھے اور نہ اپنی ذات کو اس سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ اس

کا شاہد ہے کہ آپ صفین سے پلٹتے ہوئے ایک زرہ کھو بیٹھے۔ چند دنوں کے بعد ایک نصرانی کو وہی زرہ پہنے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا کہ تم نے یہ زرہ کہاں سے لی ہے یہ زرہ تو میری ہے اس نے اپنی ملکیت ظاہر کیا۔ حضرت نے قاضی شریح کی عدالت میں دعوی دائر کر دیا۔ قاضی کے دریافت کرنے پر اس نصرانی نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے اور میرا قبضہ دلیل ملکیت ہے۔ شریح نے حضرت سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ زرہ آپ کی ہے؟ آپ نے فرمایا ھذہ درعی لم ابع ولم اھب۔ "یہ زرہ میری ہے نہ میں نے اسے بیچا ہے اور نہ ہبہ کیا ہے۔" شریح نے دیکھا کہ ایک طرف یہ احتمال بھی نہیں ہے کہ غلط دعویٰ کیا ہو گا اور دوسری طرف شرعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قبضہ کو دلیل ملکیت سمجھا جائے جب تک اس کے خلاف ثبوت مہیا نہیں ہوتا۔ فیصلہ حضرت کے خلاف جاتا تھا۔ قاضی کو آپ کے خلاف فیصلہ دینے میں تردد ہوا۔ حضرت نے اسے متردد دیکھا تو فرمایا کہ تم وہی فیصلہ کرو جو منصب قضا کا تقاضا ہے۔ چنانچہ فیصلہ حضرت کے خلاف ہوا اور وہ زرہ اس نصرانی کو مل گئی۔

اس واقعہ کا تجزیہ کیا جائے تو عدل کے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو حضرت کی عدل پسندی و نصفت شعاری کا روشن ثبوت ہیں۔ آپ خود بھی سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ اور وہ فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوتا مگر آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ مدعی اپنا فیصلہ خود کرے۔ اس لئے اس کا فیصلہ قاضی کے سپرد کیا اور قاضی سے یہ کہنے کے بجائے کہ اس نے چوری کی ہے یا چوری کرنے والے سے خریدی ہے یہ فرمایا کہ میں نے نہ اس کے ہاتھ بیچی ہے اور نہ ہبہ کی ہے اگرچہ مقصد یہی تھا کہ یہ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ جب بیچی بھی نہیں گئی اور ہبہ بھی نہیں کی گئی تو پھر چوری ہی کے ذریعہ اس تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر حضرت اس کی طرف چوری کی نسبت دیتے تو خلافِ واقعہ نہ ہوتا مگر آپ اسے چور کہہ کر نہ اس کے جذبات کو ٹھیس لگانا چاہتے ہیں اور نہ اس کے وقار کو مجروح کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ آپ کی نظروں میں ایک زرہ کے مقابلہ میں انسانی اقدار کا تحفظ زیادہ عزیز تھا۔ اگرچہ فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور مقدمہ ہار گئے مگر حقیقتہً یہ حضرت کی اخلاقی جیت تھی جس کا ردعمل یہ ہوا کہ اس نصرانی کو جیت کے باوجود اپنی شکست کا احساس ہوا اور اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑا اور جب عدالت گاہ سے باہر نکلا تو حضرت سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔ دبے لہجے میں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ زرہ آپ کی ہے میں نے صفین کے راستے سے اسے اٹھایا اب یہ زرہ حاضر ہے اور میں آپ کی بلند نفسی، عالی ظرفی اور عدل پسندی کو دیکھ کر اسلام قبول کرتا ہوں۔ حضرت زرہ کی واپسی پر تو کیا خوش ہوتے البتہ اس کے اسلام لانے پر خوش ہوئے اور وہ زرہ اسے ہبہ کر دی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی مرحمت فرمایا۔

بُنیادی حقوق کا تحفّظ

ہر انسان دنیائے شعور میں قدم رکھنے کے بعد ایک طرف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ محسوس کرتا ہے کہ جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس میں کچھ معاشرتی حقوق بھی رکھتا ہے۔ اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے فرائض کو پہچانے اور اپنے حقوق کا تحفظ کرے وُہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اور اپنے حقوق کے ساتھ دوسروں کے حقوق کو بھی پامالی سے بچائے اور اگر ان حقوق میں کوئی سدّراہ ہو تو بقدر امکان انہیں آزاد کرانے کی کوشش کرے تاکہ ناجائز پابندیوں اور ناروا بندشوں کو توڑ کر اپنی فطری آزادی بحال رکھ سکے۔ ان حقوق کے تحفظ کی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے اور حکومتیں بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رسمی طور پر سہی دستوری دفعات میں حقوق عامہ کو جگہ دیتی ہیں تاکہ عوام کے دلوں میں عدم تحفظ کا احساس اور ملک میں بے اطمینانی بدامنی اور شورش پیدا نہ ہونے پائے۔

یہ حقوق بنیادی طور پر چار ہیں:۔

پہلا حق، حقِ حیات ہے یعنی ہر شخص کو اس دنیا میں جینے کا حق ہے اور کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو زندگی سے محروم کر دے۔ اسلام جو پُرامن زندگی کا داعی اور حیاتِ انسانی کا پاسبان ہے قتل کو انتہائی سنگین جرم قرار دیتا ہے اور ایک خونِ ناحق کو اتنی اہمیت دی ہے جتنی سب لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:۔

من قتل نفس بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا۔	جو شخص کسی کو نہ جان کے بدلے میں اور نہ فساد انگیزی کے نتیجہ میں بلکہ یونہی قتل کر ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔"

اس آیت کے استثنار سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی کو قتل یا فساد فی الارض کی پاداش میں قتل کر دیا جائے تو یہ قتل ناروا نہ ہو گا اس لئے کہ ایسے شخص نے خود ہی قتل اور فتنہ فساد کے ارتکاب سے اپنے حق حیات کو کھو دیا ہے۔ عدل و حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے تاکہ انتقام در انتقام کی صورت میں قتل و خونریزی کا دروازہ نہ کھل جائے۔ اسلام نے جان کے بدلے میں جان لینے کا حق دے کر قتل کے انسداد میں موثر قدم اٹھایا ہے۔ اس لئے کہ قتل کو قتل کا خوف ہی روک سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ارتکابِ قتل

سے پہلے یہ سوچ لے کہ اسے بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے تو وہ اپنی جان کے بچاؤ کے لئے کبھی قتل کا مرتکب نہیں ہوگا اور نتیجۃً دونوں قتل سے محفوظ رہیں گے اسی لئے قرآن مجید میں قانونِ قصاص کو زندگی و حیات سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

ولکم فی القصاص حیاۃ۔ "قصاص میں تمہارے لئے زندگی مضمر ہے۔"

اسی طرح کسی حملہ آور کا قتل بھی ناجائز نہ ہوگا جب کہ جان کا بچاؤ اس قتل پر منحصر ہو کیونکہ حملہ آور نے خود دوسرے کے حق پر حملہ کر کے اپنے حق کو ضائع کیا ہے اور اپنے قتل کا جواز پیدا کر دیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے صرف دوسرے ہی کو قتل کرنا جرم نہیں ہے بلکہ اپنے ہاتھوں خود اپنی جان کو تلف کرنا اور خودکشی کا مرتکب ہونا بھی قتل ہی کی طرح کا سنگین جرم ہے بلکہ اپنے اعضا بدن میں سے کسی عضو کو قطع کرنا تک ناروا ہے اس لئے کہ انسان زندگی کا امین بنایا گیا ہے اور یہ عمل امانت میں خیانت اور تصرف ناجائز ہے۔ اگرچہ بعض ممالک میں خودکشی کو شجاعانہ اقدام تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بزدلی اور حوادث زمانہ کے سامنے سپراندازی کا نتیجہ ہے جسے شجاعت ایسی اخلاقی فضیلت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس اقدام سے واضح لفظوں میں روکا ہے:۔

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما۔ "اپنی جانوں کو تلف نہ کرو کیونکہ اللہ تم پر بہرحال مہربان ہے۔"

امیرالمومنین جہاں انسانی اقدار کے محافظ تھے وہاں انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ اور کسی صورت میں اتلاف جان اور خون ناحق کو گوارا نہ کرتے تھے۔ اگرچہ پیغمبر اکرمؐ کے دور میں جنگوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے عہد میں بھی خونریز جنگیں لڑیں مگر ان میں سے ہر جنگ دفاعی اور حفاظت خود اختیاری کے لئے تھی۔ پیغمبر اکرم نے اس وقت تلوار اٹھائی جب دشمن آپ پر حملہ آور ہوا اور حضرت نے اپنے دور میں اس وقت قدم اٹھایا جب دشمن نے لشکر کشی کر کے امن عامہ کو تباہ کر دینا چاہا۔ اس صورت میں بھی آپ امکان بھر یہ کوشش کرتے رہے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور کشت و خون کے بغیر حالات سدھر جائیں۔ جنگ چھڑنے سے پہلے صلح و آشتی کی دعوت دی پرامن رہنے کی تلقین کی اور جب ساری کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں اور فریق مخالف جنگ پر تل گیا تو اس وقت تک ہاتھ نہیں اٹھایا جب تک دشمن کی طرف سے پہل نہیں ہوئی۔ اور جس حد تک دشمن پر پسپائی کے لئے جنگ ضروری تھی اس سے آگے نہیں بڑھے اور جنگ کے خاتمہ پر خون کے پیاسوں تک کی جان بخشی کر دی۔ چنانچہ جنگ جمل کے اختتام پر اہل بصرہ کو یک قلم معاف کر دیا۔ مروان، عبداللہ ابن زبیر وغیرہ سے کوئی مواخذہ نہیں کیا اور ام المومنین کو حفاظت

کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا اور جنگ صفین میں جتنے شامی عراقیوں کی قید و بند میں تھے سب کو بلا شرط رہا کر دیا اور جنگ نہروان کے خاتمہ پر خوارج کے زخمیوں کو جن کی تعداد چار سو تھی ایک جگہ جمع کیا اور ان کے قبیلہ والوں کو طلب کر کے فرمایا کہ ان زخمیوں کو اٹھا لے جاؤ اور ان کے زخموں کا علاج و مداوا کرو اور جب یہ تندرست ہو جائیں تو انہیں کوفہ پہنچا دو۔ حضرت کے اس طرزِ عمل سے ہر انصاف پسند یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپ کا مقصد صرف فتنہ و فساد کا انسداد تھا۔ اور جب اس کا انسداد ہو گیا تو پھر انسانی جانوں سے کھیلنا گوارا نہیں کیا حالانکہ ایسے موقع پر دشمن کے تڑپتے سسکتے زخمیوں کو ختم کر دیا جاتا ہے مگر اس کے برعکس یہاں ان کے علاج معالجہ کی فکر کی جاتی ہے تاکہ بلاضرورت انسانی جانوں کا اتلاف نہ ہونے پائے اور اس طرح غیر ضروری کشت و خون سے اپنے دامن کو پاک رکھا۔ یہی وہ کردار تھا جس نے آپ کے جوہر ذاتی کو جلا بخشی اور دنیا نے امن پسندی عدالت کیشی اور انسانی ہمدردی میں آپ کی انفرادیت کا اعتراف کیا۔

امیرالمومنین جہاں ناحق خونریزی کے شدید مخالف تھے وہاں یہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کسی کا خون رائیگاں جائے اور قاتل قصاص سے بچ رہے۔ چنانچہ جب حضرت عمر قتل کر دیئے گئے تو ان کے فرزند عبیداللہ نے ہرمزان اور چند بے گناہوں کو قتل کر دیا۔ حضرت عثمان نے اس سے چشم پوشی کی اور اسے قتل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب امیرالمومنین نے زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تو اسے ہرمزان کے قصاص میں قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ اموی سامراج کے دامن میں پناہ لینے کے لئے شام بھاگ گیا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے :-

لما ولی الخلافۃ اراد قتلہ فھرب منہ الی معاویۃ بالشام	جب حضرت خلافت پر فائز ہوئے تو عبیداللہ کے قتل کا ارادہ کیا مگر وہ بھاگ کر معاویہ کے پاس شام چلا گیا۔"
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۴۰)	

اور آخر صفین میں امیرالمومنین کے مقابلہ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

دوسرا حق آزادی فکر ہے یعنی ہر شخص کی فکر کو خارجی دباؤ سے آزاد ہونا چاہیئے تاکہ وہ خود سے اچھے بُرے کی تمیز کر کے راہِ عمل متعین کرے۔ اگر اس آزادیٔ فکر کو سلب کر لیا جائے تو وہ اسے خیر کہے گا جسے طاقت در خیر کہے اور اسے شر سمجھے گا جسے بالا دست قوت شر سمجھے اور اپنے شعور و عقل سے روشنی لینے کے بجائے دوسرے کی رائے کے تابع ہو جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اس کی آزادیٔ عمل بھی چھن جائے گی اس لئے کہ حریت فکر حرکت و عمل کی آزادی کا سرچشمہ ہے اور تمام افعال و اعمال فکر کے اسی طرح تابع ہوتے ہیں جس طرح لوہے کا ٹکڑا مقناطیس کی حرکت کے تابع ہوتا ہے۔ اگر فکر آزاد ہے تو عمل بھی آزاد رہے گا اور فکر جکڑی بندھی

ہے تو عمل بھی جکڑا بند صا رہے گا۔

اسلام اسی فکری آزادی کا پیغام لے کر آیا اور تمام تقلیدی بندشوں کو توڑ کر آزادانہ فکر کی دعوت دی اس نے نہ فکری آزادی پر پہرا بٹھایا اور نہ اس کی اجازت دی کہ مذہبیات میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے۔ اور کسی پر ایسا عقیدہ زبردستی ٹھونس دیا جائے جسے اس کی عقل و آزادانہ رائے تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔ اسلام اپنی ہمہ گیر سچائی کو سچائی کے زور سے منوانا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی غلط مسلک و عقیدہ اختیار کرتا ہے تو اسے بجبر اپنے آئین کا پابند بنانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے واضح لفظوں میں اعلان کیا ہے:۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔ اسلام میں جبر نہیں ہے جب کہ گمراہی کے مقابلہ میں ہدایت واضح ہو چکی ہے۔"

امیرالمومنین کا دور حریت فکر کا شاہکار ہے آپ نے آزادی فکر کا پرچم بلند کیا اور انسان کو اس کی بھولی بسری آزادی یاد دلاتے ہوئے فرمایا:۔ لا تکن عبد غیرك وقد جعلك الله حرا۔ جب اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے تو دوسروں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں میں نہ ڈالو" یہ آزادئ فکر کے بحال رکھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ دورِ ثالث کے بعد جب لوگوں نے بیعت پر اصرار کیا تو آپ نے عجلت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے انہیں ایک آدھ دن نہیں بلکہ پورا ایک ہفتہ غور و فکر کرنے کے لئے دیا کہ وہ اس بیعت کے نشیب و فراز کو سوچ لیں اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ حضرت کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ عوام کے وقتی جذبات میں عقل و شعور کا دخل نہیں ہوتا اور نہ جذباتی فیصلہ پائیدار ہوتا ہے عوام آج ایک فیصلہ کرتے ہیں اور کل اس کے خلاف رائے دینے لگ جاتے ہیں لہذا جذباتی فیصلہ کے بجائے وہ فیصلہ ہونا چاہیئے جسے فکر و تدبر کا حقیقت پسندانہ نتیجہ کہا جا سکے اگرچہ ہوشیار اور شاطر سیاستدان عوام کے جذبات کی بوقلمونی کے پیش نظر ان کے وقتی جذبات سے فائدہ اٹھالے جاتے ہیں اور ان کی آراء کو متاثر کرنے کے لئے سیاسی حربوں سے بھی کام لیتے ہیں مگر امیرالمومنین عوام کے رجحان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے انہیں سوچنے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں نہ ان کے ذہنوں پر دباؤ ڈالتے ہیں نہ ان کی فکروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ آزادانہ فضا میں غور و فکر کا موقع دیتے ہیں کیا دنیائے سیاست میں اس سے بڑھ کر حریت فکر کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

اسی طرح مذہبیات کے سلسلہ میں نہ آزادی مسلک کی راہ بند کی نہ کسی پر تبدیلئ عقیدہ کے لئے جبر کیا اور نہ کسی فرد کے مذہبی معاملات میں وہ یہودی ہو یا نصرانی صابی ہو یا مجوسی دخل دیا اور اپنے عمل و کردار سے واضح کر دیا کہ دین کی بنیاد دلیل و برہان پر ہے اسے نظریاتی طور پر تو منوایا جا سکتا ہے مگر قوت و طاقت سے نہیں۔ اس لئے کہ قوت و طاقت اور جبر و اکراہ سے نہ عقائد میں انقلاب آتا ہے اور نہ ذہنوں میں

تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا حق آزادیٔ عمل ہے۔ یعنی انسان اپنے افعال و اعمال میں ایک حد تک آزاد ہے اور اسے اس کی مرضی کے خلاف نہ کسی کام پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے وہ جس میں اپنے لئے بہتری سمجھے اُسے کرے اور جس میں ضرر و نقصان دیکھے اُسے نہ کرے بشرطیکہ اس کے اعمال مفاد عامہ کے لئے مضر اور ملک و ملت کے لئے نقصان دہ نہ ہوں۔ اس لئے آزادی عمل کے ساتھ بعض پابندیاں بھی ناگزیر ہیں اور ہر متمدن معاشرہ میں ایسے اقدامات پر پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے جو اخلاق کو تباہ اور ملکی امن کو برباد کرنے کا باعث ہوں۔

امیرالمومنین فکری آزادی کی طرح عملی آزادی کے بھی حامی اور اس پر سختی سے عامل تھے انہوں نے کسی فرد کو ایسے عمل پر مجبور نہیں کیا جس پر اس کا دل آمادہ اور ضمیر مطمئن نہ ہو۔ چنانچہ جب کچھ لوگوں نے آپ کی بیعت سے انکار کیا تو کسی کو بیعت پر مجبور نہیں کیا۔ اور جب طلحہ و زبیر نے بیعت شکنی کے بعد یہ کہا کہ ہم نے بادل ناخواستہ بیعت کی تھی تو فرمایا کہ تمہیں بیعت پر مجبور کس نے کیا تھا کہ تم اپنے ضمیر کے خلاف بیعت پر آمادہ ہوئے۔ اور جب انہوں نے مکہ جانے کی اجازت مانگی تو آپ نے کہا کہ میں بہتر تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم دونوں مدینہ میں رہو اور جب انہوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ میں تمہیں زبردستی روکنا نہیں چاہتا۔ حضرت عمر کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے صحابہ کی نمایاں فردوں کو اس اندیشہ کے پیش نظر کہ وُہ مرکز سے الگ ہو کر سیاسی جوڑ توڑ نہ کرنے لگ جائیں ہمیشہ مدینہ میں زیر نگرانی رکھا۔ مگر امیرالمومنین اس امر کے سمجھنے کے باوجود کہ ان دونوں کے جانے کا مقصد فتنہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں ہے ان کی آزادیٔ عمل کو سلب نہیں کیا البتہ جب انہوں نے حرب و پیکار کے لئے بصرہ کا رُخ کیا تو ان کی روک تھام ضروری ہو گئی۔ اسی طرح معاویہ نے شام میں علم بغاوت بلند کیا تو ان کے خلاف قدم اٹھایا۔ یہ اقدام اس لئے نہ تھا کہ انہوں نے بیعت سے انکار کیا تھا بلکہ اس لئے کہ وُہ مملکت کے نظم و نسق میں خلل انداز اور شام میں آپ کے احکام کے نفاذ میں سدراہ تھے حالانکہ آپ خلیفۂ وقت تھے اور معاویہ کی حیثیت ایک صوبہ کے عامل سے زیادہ نہ تھی۔ یونہی خوارج کو بھی ان کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا اور جب تک وہ قتل و غارت پر اُترنہ نہیں آئے نہ ان سے کوئی تعرض کیا اور نہ ان کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی۔

حضرت کی نظروں میں اس شخصی آزادی کا اتنا احترام تھا کہ نازک سے نازک موقع پر بھی اس آزادی پر حرف نہیں آنے دیا اور جنگ کے موقع پر کہ جب ایک ایک آدمی پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے یہ حق آزادی برقرار رکھا کہ چاہے کوئی آپ کے لشکر میں شامل رہے یا دشمن کے لشکر سے جا کر مل جائے حالانکہ ہنگامی

حالات میں ملکی تحفظ کے لئے چند بندشیں شخصی آزادی کے منافی نہیں سمجھی جاتیں۔ مگر آپ نے ان حالات میں بھی نہ کسی کے روکنے کی فکر کی اور نہ کسی کے جانے کی پرواہ چنانچہ اس موقع پر آپ کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگ شام چل دیے ہیں تو آپ نے والی مدینہ سہل ابن حنیف کو تحریر کیا:۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے یہاں کے کچھ لوگ چپکے چپکے معاویہ کی طرف کھسک رہے ہیں۔ تم اس تعداد پر جو نکل گئی ہے اور اس کمک پر جو جاتی رہی ہے ذرا افسوس نہ کرو۔ یہ دنیادار ہیں جو دنیا کی طرف جھک رہے ہیں اور اسی کی طرف تیزی سے لپک رہے ہیں۔ انہوں نے عدل کو پہچانا دیکھا سنا اور محفوظ کیا اور اسے خوب سمجھ لیا کہ یہاں حق کے اعتبار سے سب برابر سمجھے جاتے ہیں لہٰذا وہ لوگ ادھر بھاگ کھڑے ہوئے جدھر جنبہ داری اور تخصیص برتی جاتی ہے"

ان چند واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے کس حد تک شخصی آزادی کو برقرار رکھا اور دوست ہو یا دشمن قوی ہو کمزور اپنا ہو یا غیر کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا۔ یہ آزادی فکر و عمل کی آزادی ہے کار و کسب کی آزادی ہے۔ معاشرتی و سماجی آزادی ہے نقل و حرکت کی آزادی ہے اور ایک حد تک مذہب و عقیدہ کی آزادی ہے۔ اور یہی وہ آزادی ہے جو ایک متمدن ملک کی رعایا حکومت سے طلب کرتی ہے اور ایک عدل پسند و انصاف پرور حکومت اپنے ہاں کے باشندوں کو دے سکتی ہے۔ اس آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کرتا پھرے اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے جب کہ کوئی بھی حکومت اخلاقی بے راہروی قانون شکنی فتنہ پردازی اور مردم آزاری کی اجازت نہیں دے سکتی۔

چوتھا حق طبقاتی مساوات ہے۔ طبقاتی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ لونی نسلی اور جغرافیائی امتیازات کو ختم کرکے انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں قابلِ احترام سمجھا جائے اور سب کے معاشرتی و معیشتی حقوق ایک سطح پر رکھے جائیں خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، امیر ہو یا غریب، کالا ہو یا گورا کیونکہ تمام انسان ایک ہی خالق کے بندے اور ایک ہی نوع کی فردیں ہیں اور رنگ و نسل کا تفاوت، قومیت و وطنیت کی تفریق خاندانی بلندی و پستی صرف دورِ جاہلیت کے امتیازات ہیں جنہیں ایک طبقہ نے اپنی بالا دستی کے جواز کے لئے عوام کے ذہنوں میں راسخ کیا البتہ ایک کو دوسرے پر برتری ہو سکتی ہے تو تقویٰ و فرض شناسی کی بنا پر جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔	اے لوگو ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں قرار دیا ہے تاکہ آپس میں شناسائی ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ

پرہیزگار ہے۔"

امیرالمومنین اسلامی نظریۂ مساوات کے علمبردار اور انسانی حقوق کے نگران تھے۔ انہوں نے قرشی غیرقرشی عربی، عجمی، آزاد، غلام سب کے حقوق یکساں قرار دیئے اور قبائلی بلندی و خاندانی پستی کے اعتبار سے انسانی برادری میں افتراق و امتیاز گوارا نہیں کیا۔

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

بیت المال میں جتنا ایک آزاد کا حق تھا اتنا ہی غلام کا جو برتاؤ ایک قرشی کے ساتھ روا رکھتے وہی برتاؤ غیر قرشی کے ساتھ جیسا عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتے ویسا غیروں کے ساتھ نہ غیروں کو نظرانداز کیا اور نہ عزیزوں کی پاسداری کی۔ ایک مرتبہ ایک عامل کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے کچھ مالی ہیرپھیر کیا ہے تو اُسے تحریر کیا: "خدا کی قسم اگر حسن و حسین بھی وہ کرتے جو تم نے کیا ہے تو میں ان سے بھی کوئی رعایت نہ کرتا اور نہ وہ مجھ سے اپنی کوئی خواہش منوا سکتے۔" یہ تھی وہ مساوات اور حقوق میں برابر کا طرزِ عمل جو چودہ سو برس قبل فرمانروائے عرب و وارثِ مسند رسول نے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ آج ہر مملکت میں انسانی حقوق کے منشور کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے جسے مرتب ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر امیرالمومنین نے اسوقت انسانی حقوق کا عملاً تحفظ کیا جب حقوق عامہ کا تصور ذہنوں سے ناپید تھا۔ نہ انسانی حقوق کی تعیین ہوئی تھی اور نہ اس کی تدوین کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔

معاشی نظام

موجودہ دور میں معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت کے گرد گھومتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ایک آزاد معاشی نظام ہے جس میں ہر شخص کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ تمام مذہبی اخلاقی اور رسمی قیود کو نظرانداز کر کے جس قدر دولت سمیٹ سکتا ہے سمیٹے۔ نہ اس کے جمع کرنے میں کوئی اخلاقی روک ہے نہ سماجی بندش۔ اس نظام میں اجتماعی مفاد پر شخصی مفاد کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور سرمایہ دار کی نظر ذاتی منفعت اور طلب زر پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ ہوس اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ سرمایہ دار مفادِ عامہ کو کچل کر اور دوسروں کے مفاد کو ٹھکرا کر خود غرضی و مفاد پرستی کی راہ اختیار کر لیتا اور دولت کی جمع آوری ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیتا ہے، نہ کسی پر ظلم ڈھانے سے اس کا ہاتھ رُکتا ہے اور نہ کسی کا خون چُوسنے سے اس کا دل پسیجتا ہے ان سرمایہ داروں کی بے راہروی و ناانصافی کے نتیجہ میں محنت کش طبقہ کے دلوں میں نفرت کے جذبات کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ مزدور یہ سمجھتا ہے کہ وہ سرمایہ جو نفع کی صورت میں بچ بچا کر سرمایہ دار کی جیب میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ

اس کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اور سرمایہ دار یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی سوجھ بوجھ اور سرمایہ کاری کا کرشمہ ہے اور
اور مزدور اس کی مشینری کا ایک پُرزہ ہے جسے ناکارہ یا زنگ آلودہ ہونے کی صورت میں الگ کیا جا سکتا ہے
اس معاشی استحصال اور طبقاتی اختلاف کے مفاسد کا ردِّ عمل اشتراکیت کی صورت میں ظاہر ہوا اشتراکیت کا
مقصد انفرادی ملکیت کو ختم کر کے افراد معاشرہ میں دولت کی مساوی تقسیم ہے ان اشتراکیت پسندوں کے
نزدیک ملکیت کو ختم کئے بغیر معاشی ناہمواریوں اور ان سے پیدا ہوتے والی خرابیوں کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔
اشتراکیت کا نظریہ دور حاضرہ یا گزشتہ صدی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ۴۰۰ ق م افلاطون نے یونان میں
معیشت کی اُونچ نیچ اور حکومت کے غلط رویہ سے متاثر ہو کر اس کی بنیاد رکھی اور تیسری صدی عیسوی میں
قباد کے دورِ حکومت میں مزدک نامی ایک شخص نے دولت و عورت کو مشترکہ سرمایہ قرار دے کر اشتراکیت کے
اصولوں کی پرچار کی اور اس کے متبعین نے اسے عملاً قبول بھی کر لیا مگر ایک محدود حلقہ کے اندر ہی اس پر
عملدر آمد ہو سکا اور کچھ عرصہ کے بعد خود ہی اپنی موت مر گئی۔ پھر انیسویں صدی کے اوائل میں اس کی صدائے
بازگشت سنی گئی اور کچھ لوگوں نے اسے رائج کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارے مگر ان کی کوششیں رائیگاں
گئیں اور اسے عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ایک جرمنی نژاد یہودی کارل مارکس
نے نظریہ اقتصاد کے عنوان سے اس کے اصول وضوابط منضبط کئے اور اسے معیشتی و معاشرتی خرابیوں کا واحد
حل بتایا یہ دور وُہ تھا کہ روس میں ایک طرف دولت کی ریل پیل تھی اور متمول طبقہ سرمایہ کے ذریعہ سرمایہ
کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف بے روزگاری و معاشی بدحالی کی وجہ سے عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ عوام
کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی اور صنعت کے بروئے کار آنے سے مزدوروں کا ایک طبقہ بھی پیدا ہو چکا
تھا۔ کسان جاگیرداروں کے رحم و کرم پر تھے اور مزدور صنعتکاروں کے محتاج و دستِ نگر تھے۔ صنعتکاروں
اور جاگیرداروں کی بالادستی اور معیشت کی ناہمواری نے مزدوں کو ہڑتالوں پر اور کسانوں کو ہنگاموں پر
ابھارا آخر سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کے جذبات ابھر آئے اور اشتراکیت کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔
چنانچہ مارکس کے مرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں لینن اسے عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور روسی نوجوانوں
کو مساوی تقسیم کے پرکشش نعرہ سے اپنے گرد جمع کر لیا اور مخالف آوازوں کو تشدد و سختی سے دبا دیا۔ آخر
اشتراکیت کی بنیادوں پر نظام نو کے قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے کچھ اور ملک بھی متاثر ہوئے
اور اسے جزوی فرق کے ساتھ قبول کر لیا۔ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکی دونوں کا دائرہ فکر صرف دنیوی
معاش اور اقتصادی نشوونما ہے ان میں نہ مذہبی و اخلاقی قدروں کا وجود ہے اور نہ مادہ کے ماورا اقدار سے لگاؤ
ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری میں معاشی آزادی اور ذاتی ملکیت کا حق ہوتا ہے مگر معاشی

تحفظ کی ضمانت نہیں ہوتی اور اشتراکی نظام میں معاشی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے مگر ذاتی حق ملکیت نہیں ہوتا۔

اسلام کا نظریۂ معیشت جو فطرت سے ہم آہنگ اور تمام معاشی مشکلات کا واحد حل ہے ان دونوں نظریوں سے مختلف ہے۔ یہ نظام نہ تجربات کا مرہون منت ہے اور نہ اقتصادی ماہروں کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے بلکہ رب العالمین کا تجویز کردہ اور پیغمبر اسلام کا پیش کردہ ہے۔ اس نظام کی اساس شخصی یا گروہی مفاد کے بجائے عمومی مفاد پر ہے۔ کیونکہ اللہ کسی خاص فرد یا خاص گروہ کا رب نہیں ہے بلکہ ھو ربنا و ربکم "وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے"۔ اور اس کی ربوبیت کا سایہ سب پر یکساں ہے اس لئے اس کے قائم کردہ نظام میں اجتماعی مفاد ہی ملحوظ ہوگا اور شخصی یا گروہی مفاد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے حقیقی مالک صرف اللہ ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اس کی ملکیت میں داخل ہے۔ چنانچہ اس نے مال کی نسبت اپنی ذات کی طرف دیتے ہوئے فرمایا:۔

واتوھم من مال اللہ الذی اٰتکم۔ | "خدا کے مال میں سے جو اس نے تمہیں دیا ہے ان کو بھی دو"

اللہ کے مال میں بنیادی طور پر تمام انسانوں کو یکساں حق تصرف حاصل ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں یکساں مجاز ہیں کیونکہ تمام چیزیں جو زمین سے نکلتی ہیں یا زمین سے پیدا ہوتی ہیں یا دنیا میں پائی جاتی ہیں سب کی سب بنی نوع انسان کی نفع رسانی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ | "وہی وہ ذات ہے جس نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے نفع کے لئے پیدا کیا ہے"

البتہ جو شخص جائز طریقوں سے ان اموال میں سے کم یا زیادہ مال حاصل کر لیتا ہے خواہ محنت و مشقت سے حاصل کیا ہو جیسے تجارت، زراعت، کاروکسب وغیرہ سے یا بغیر محنت کے اس کی طرف منتقل ہوا ہو جیسے ہبہ، وصیت اور میراث کے ذریعہ سے وہ اسی سے مختص ہو جاتا ہے لیکن فرد اور معاشرہ میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اس مال میں معاشرہ کا بھی ایک حصہ مقرر کر دیا گیا ہے تاکہ فرد جماعت سے اور جماعت فرد سے وابستہ رہے اور باہمی اخوت کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

اسلام نہ اس حد تک سرمایہ داری کا حامی ہے کہ کچھ لوگوں کو دولت پر اجارہ داری دیدے اور دوسروں کو اُن کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے اور نہ اس حد تک مخالف ہے کہ اپنی پیدا کردہ املاک پر حق ملکیت نہ دے۔ بلکہ افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال اور حقیقت پسندی پر نظام معیشت قائم کیا ہے۔ اس نظام میں نہ بے قید سرمایہ داری ہے جو مذہبی و اخلاقی قیود سے آزاد ہوتی ہے اور نہ اشتراکیت ہے جو

انسان کے جائز حق ملکیت کو سلب کر کے اس کی محنت کو روٹی اور کپڑے کے عوض خرید لیتی ہے اور ایک خاص طبقہ اس کی کمائی کو اپنی صوابدید سے خرچ کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ اسلام نے نہ سرمایہ داری کی پشت پناہی کی ہے کہ ایک غیر عادلانہ طبقاتی نظام ظہور میں آئے اور معاشرہ غیر متوازن ہو کر رہ جائے اور نہ غیر فطری مساوات کی تعلیم دی ہے کہ حکومت تمام پیداواری وسائل کو اپنی تحویل میں لے کر قومی ملکیت قرار دے لے اور تمام افراد کی ضروریات کی یکساں طور پر کفیل ہو جائے۔ اس جبری مساوات سے کارکردگی کا جذبہ مضمحل اور سعی و طلب کا ولولہ سرد پڑ جاتا ہے کیونکہ ذاتی کام اور اجتماعی کام میں تفریق کئے بغیر کاروکسب میں یکساں دلچسپی لینا انسانی تقاضائے طبیعت کے خلاف ہے اور اس کا اثر جلد یا بدیر معاشرہ کی مجموعی پیداوار پر پڑنا بھی ناگزیر ہے۔

اسلام نے اس جبری و غیر فطری مساوات کے بجائے ذرائع معیشت میں مساوات رکھی ہے اور ہر شخص کے لئے یکساں معاشی مواقع فراہم کئے ہیں تاکہ ہر فرد اپنی جدوجہد اور استعداد کار سے معیشت کا سروسامان کرے اور اپنی محنت و کاوش کے مطابق ثمرہ و نتیجہ حاصل کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ "انسان کو اپنی محنت ہی کا ثمرہ ملتا ہے۔"

اس نظام کے ماتحت یہ امر ناگزیر ہے کہ معیشت کے اعتبار سے افراد میں تفاوت بھی رہے کیونکہ تمام افراد میں استعداد و صلاحیت یکساں نہیں ہوتی۔ جب استعداد و قوت کار میں یکسانیت نہیں ہے تو اس کے نتائج میں یکسانیت کیونکر ہو سکتی ہے لہٰذا خارجی مساوات کو بروئے کار لانے کے بجائے اسلام نے امیر و غریب کے درمیانی فاصلے کم کرنے پر توجہ دی ہے اور انفرادی حقوق ملکیت کے ساتھ متمول طبقہ پر ایسے مالی فرائض بھی عائد کر دیئے ہیں جن کی پابندی کے بعد نہ معاشرہ غیر متوازن ہو سکتا ہے اور نہ کسی فرد کے ضروریات سے محروم رہنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اسلام نے معاشی آزادی کے ساتھ انفرادی ملکیت کا بھی حق دیا ہے۔ انفرادی ملکیت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی فطرت میں سمو دیا گیا ہے اور اسلام تمام شعبہ ہائے حیات میں فطرت کا ہمنوا ہے اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے انفرادی ملکیت کا جواز ایک مسلمہ حقیقت ہے اور قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اموال کی نسبت افراد کی طرف دے کر ان کے حق ملکیت کو واضح کیا ہے اور دوسروں کے اموال میں تصرف بے جا کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم	آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھا جاؤ اور نہ حاکموں کو بطور رشوت دو تاکہ لوگوں کے مال میں سے جو کچھ ہاتھ لگے خورد برد کرنے لگ جاؤ

وانتم تعلمون۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔"

اسلام نے صرف شخصی ملکیت کا حق ہی نہیں دیا بلکہ اس حق کے تحفظ و احترام پر بھی زور دیا ہے۔ چنانچہ غصب و خیانت اور چوری، ڈکیتی پر تہدید و سزا اسی حق ملکیت کے تحفظ و احترام کی بنا پر تجویز کی ہے کیونکہ اسلام کا عدل پسند مزاج یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی کے مال کو خورد برد کیا جائے یا مالک کی رضامندی کے بغیر اس میں تصرف کیا جائے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے :۔

لا یحل مال امرء الا عن طیب نفس۔ "کسی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے۔"

اسلام نے اگرچہ شخصی ملکیت کا حق دیا ہے مگر وسائل معیشت پر ایسے قیود عائد کر دیئے ہیں کہ بے قید سرمایہ داری کا انسداد اور اس سے پیدا ہوتے والے مفاسد کا تدارک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تفریق قائم کر کے دولت کو متوازن حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور اندھا دھند جلب زر اور دولت کی اجارہ داری کے آگے ایک بند خود بخود بندھ جاتا ہے۔ اس بے قید سرمایہ داری کا ایک بڑا سبب سودی کاروبار ہے۔ اسلام نے سرے سے سود کو حرام قرار دے دیا ہے۔ تاکہ سرمایہ داری کو تقویت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید کا واضح اعلان ہے :۔

واحل البیع وحرم الربٰو۔ "اللہ نے خرید و فروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

اسی طرح جوا، لاٹری، سٹہ اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو حرام کیا ہے کیونکہ جوئے اور لاٹری میں دوسرے کا مال بغیر معاوضہ کے ہتھیا لیا جاتا ہے جس سے ہارنے والے کے دل میں جیتنے والے کی طرف سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو بعض اوقات فتنہ و فساد کو دعوت دے کر امن عامہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور سٹہ میں خرید کیا ہوا مال موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر موجود چیز کے مقابلہ میں صرف بازار کے اتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان چیزوں کو عمل شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے :۔

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ "شراب جوا، بت اور پاسہ بڑے ناپاک شیطانی کام ہیں لہذا ان سے بچے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

یونہی ان چیزوں سے بھی اکتساب زر حرام قرار دیا ہے۔ جن کا مقصد لہو و لعب ہو جیسے آلات لہو و قمار وغیرہ یا جن کی غرض و غایت امر ناجائز ہو جیسے صنم تراشی و صلیب سازی وغیرہ ان چیزوں کا بنانا بیچنا

خریدنا اور ان کے ذریعہ نفع کمانا حرام ہے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

ان الله اذا حرم شیئا حرم ثمنه۔	جب اللہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کے معاوضہ میں حاصل ہونے والا مال بھی حرام کر دیتا ہے۔"

بلکہ ان ممنوعہ چیزوں کے لئے خام مال کی فروخت بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ صلیب، بُت اور آلاتِ لہو بنانے کے لئے لکڑی وغیرہ کی بیع اور شراب کشید کرنے کے لئے انگور کی فروخت بھی ممنوع ہے اور ان چیزوں کی فروخت کے لئے جگہ کرایہ پر دینا بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق سے پوچھا گیا کہ:۔

عن الرجل یواجر بیته فیباع فیه الخمر قال حرام اجرته۔	ایک شخص اپنا مکان کرایہ پر دیتا ہے اور وہاں شراب فروخت ہوتی ہے فرمایا وہ رقم جو کرایہ کی صورت میں حاصل ہوتی ہے حرام ہے۔"

اسی طرح نفع اندوزی کے غلط اور ناروا طریقوں سے منع کیا ہے جیسے ناپ تول میں کمی کرنا۔ قرآن مجید میں ہے:۔

ویل للمطففین۔	ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی تباہی ہے۔"

یا چیزوں کی مقدار بڑھانے کے لئے ان میں ملاوٹ کرنا۔ آنحضرت کا ارشاد ہے:۔

من غش مسلما فی بیع او شراء فلیس منا و یحشر مع الیهود یوم القیامه۔	جو شخص کسی مسلمان سے خرید و فروخت کے موقع پر کسی چیز میں آمیزش کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے بلکہ قیامت کے دن یہود کے ساتھ محشور ہو گا۔"

یا ضروریاتِ زندگی کی مخصوص چیزوں کو گرانی کی اُمید پر روک کے رکھنا۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

المحتکر ملعون۔	نفع کی غرض سے ضروری چیزوں کو روک لینے والا ملعون ہے۔"

معاشی نظام کی اصلاح میں میانہ روی کو بھی بڑا دخل ہے کیونکہ اکثر معاشی پریشانیاں مصارف کو نقطۂ اعتدال پر نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ خرچ آمدنی سے بڑھنے نہ پائے تو ذہنی و معاشی الجھنوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اسی متوازن طرزِ عمل پر زور دیا ہے کہ ضرورت کے موقع پر نہ کنجوسی سے کام لیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ اور بے محل خرچ کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا	وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے

ولم یقترواوکان بین ذلک قواماً۔ — ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کے بیچوں بیچ اعتدال کی راہ پر چلتے ہیں"

ضرورت کے موقع پر ضرورت سے زائد صرف کرنا اسراف اور بلا ضرورت صرف کرنا تبذیر کہلاتا ہے قرآن مجید میں اسراف و تبذیر دونوں سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسراف کے بارے میں ارشاد ہے :۔

ان اللہ لا یحب المسرفین۔ — خدا اسراف کرنے والوں کو درست نہیں رکھتا"

اور تبذیر کے بارے میں ارشاد ہے :۔

وآت ذاالقربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیراً۔ — قریبیوں کا حق دو۔ نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو بے موقع ضائع نہ کرو"

اس قرآنی حکم سے ظاہر ہے کہ اگر دولت مستحقین کی اعانت اور ادائے حقوق کے علاوہ نام و نمود ٹھاٹ بھاٹ یا غیر ضروری سامان تعیش پر صرف ہو گی۔ تو یہ ضیاع مال اور تبذیر ہے اور قرآن مجید میں ہے :۔

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ — بے موقع و بے ضرورت مال ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں"

اس بے موقع و بے ضرورت صرف سے روکنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ جو غریب و نادار آس پاس بستے ہیں ان میں احساس محرومی پیدا نہ ہو اور نہ ان کے جذبات مجروح ہوں اور دوسرے وہ دولت جو غیر ضروری مصارف پر خرچ ہوتی ہے وہ عزیز و اقارب اور معاشرہ کے پسماندہ افراد کے کام آئے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دولت کے ذخائر سمیٹ کر تجوریاں بھر لی جائیں اور سونا و چاندی کے انبار جمع کر لئے جائیں یہ دولت کا اکتناز ہے اور دولت کا اکتناز اسی صورت میں ہوتا ہے۔ جب ادائے حقوق سے گریز کیا جائے۔ اگر مالی واجبات ادا ہوتے رہیں تو دولت کے جمع رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس میں بڑھوتری کے بجائے کمی ہی ہوتی جائے گی اور آخر خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ سونا و چاندی سمیٹ کر رکھا جائے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :۔

والذین یکنزون الذہب والفضۃ ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ فبشرہم بعذاب الیم۔ — وہ لوگ جو سونا و چاندی جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سُنا دو"

اسی اکتناز دولت کے سدباب کے لئے اسلام نے سونے چاندی کے برتن اور مردوں کے لئے سونے کا استعمال ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ یہ بھی اکتناز میں شامل ہے جس سے سرمایہ منجمد اور معیشت غیر متوازن ہو

کر رہ جاتی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سونے چاندی کو منجمد صورت میں رکھنے کے بجائے گردش میں رکھا جائے تاکہ خود صاحب مال کے مال میں بھی وسعت ہو اور دوسرے بھی اس گردش زر سے فائدہ اٹھا کر بیروزگاری سے متاثر نہ ہوں۔

معاشرہ میں محنت کش طبقہ کے مفادات کا تحفظ بھی ضروری ہے اور اسے اس کی محنت کا اتنا معاوضہ ملنا چاہیئے جس سے وہ اپنی بنیادی ضروریات باحسن وجوہ پوری کر سکے۔ کیونکہ اس کی محنت و کارکردگی سے پیداواری وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ اسلام نے اگرچہ اُجرت کی حد بندی نہیں کی اور نہ حد بندی ہو سکتی ہے کیونکہ کام کی نوعیت اور کارکردگی کی رفتار یکساں نہیں ہوتی۔ مگر مالک و مزدور کو حقوق و فرائض کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا ہے کہ مزدور بغیر کام کے اُجرت کا حقدار نہیں ہے اور مالک کے لئے اُجرت میں تاخیر تک روا نہیں ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:۔

اعط الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ۔ — مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔

جہاں بھی مالک و مزدور اور اجیر و مستاجر میں تصادم کی صورت پیدا ہوتی ہے وہ اسلام کے اسی حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ اگر مالک مزدور کے کام کے مطابق اجرت دے اور مزدور اُجرت کے مطابق کام کرے اور دونوں ایک دوسرے کا مفاد پیشِ نظر رکھیں تو نہ باہمی کشمکش کی صورت پیدا ہو اور نہ ایک طرف سے ہڑتال اور دوسری طرف سے تالا بندی کی نوبت آئے۔

اسلام نے غریب و پسماندہ طبقہ کو جو ذرائع معیشت سے محروم یا کاروکسب کے قابل نہیں ہوتا کسمپرسی کی حالت میں نہیں چھوڑا بلکہ دولت مندوں کے اموال میں زکوٰۃ کی صورت میں ایک حصہ اس کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ تاکہ کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور جن افراد کو پیغمبرؐ سے نسبی اتصال کی بناء پر بلندی و برتری حاصل ہے ان کے لئے زکوٰۃ کے بجائے خمس میں حصہ قرار دیا ہے اس کے علاوہ تمام صدقات و خیرات سے بھی محتاجوں کی خبرگیری کی پُرزور ہدایت کی ہے تاکہ معاشرہ میں کوئی بھوکا نہ رہ جائے پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:۔

الخلق کلھم عیال اللہ و احبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ۔ — تمام مخلوق اللہ کے عیال میں داخل ہے اور اللہ کو وہی زیادہ محبوب ہے جو اس کے عیال کے لئے زیادہ نفع رساں ہے۔

ان مالی واجبات اور انفاق فی سبیل اللہ کے بعد بھی کچھ جمع جتھا رہ جائے تو اسلام نے وصیت کی ہدایت کی ہے کہ مرنے سے پیشتر اپنے والدین اقرباء اور امور خیر کے لئے ایک حصہ مخصوص کر جائے یہ حصہ ترکہ کی ایک تہائی تک ہو سکتا ہے اور وارثوں کی رضامندی ہو تو اس سے بھی زائد ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف۔

"تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت نظر آئے تو ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھی وصیت کرے۔ بشرطیکہ وہ کچھ مال چھوڑ جائے۔"

اس وصیت کے علاوہ شریعت نے قانون وراثت کا نفاذ کیا تاکہ دولت وارثانِ بازگشت میں تقسیم ہو جائے اور ایک ہاتھ سے نکل کر متعدد ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل او كثر نصيبا مفروضا۔

"مردوں کے لئے حصہ ہے ان چیزوں میں جو ان کے ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے حصہ ہے ان چیزوں میں جو ان کے ماں باپ اور اقرباء چھوڑ جائیں خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ ہر شخص کا حصہ مقرر ہے۔"

یہ ہے اسلام کا وہ نظام معیشت جس میں نہ سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نہ سرمایہ سمٹ کر ایک جگہ جمع رہ سکتا ہے۔ اس میں نہ مزدور کی حق تلفی کی گنجائش ہے اور نہ غریب کی غربت کو نظر انداز کرنے کا جواز بلکہ معاشی جدوجہد کے ساتھ سماجی ذمہ داریوں کو بھی پوری اہمیت دی گئی ہے یہی وہ حکیمانہ نظام ہے جو دنیوی بہبود کے ساتھ اخروی فلاح کا بھی ضامن ہے جس میں کسب و معاش کے ساتھ اخلاقی اقدار کی پابندی اور تعاون و ہمدردی اور مروت و ایثار کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے معیشتی و معاشرتی خرابیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ معاشی ناہمواریوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے نظام کے گرد طواف کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب کہ معاشرتی سود و بہبود اور دولت کی عادلانہ تقسیم کے تمام ضابطے اس کے اندر موجود ہیں۔

اسلامی نظام معیشت کا یہ خاکہ اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ دورِ امیر المومنین کے معاشی نظام پر نظر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ حضرت نے انہی اصولوں پر معیشت کا نظام قائم کیا جو اسلام کے نظریاتی تقاضوں کے عین مطابق تھا اگرچہ وہ دور اسلامی نظام معیشت کے نفاذ کے لئے سازگار نہ تھا کیونکہ سابقہ

ملکی فتوحات اور خزانۂ عامرہ کے عطیات کی بدولت مسلمانوں کے اندر سرمایہ داری کا رجحان پیدا ہو چکا تھا اور سرمایہ داروں کا ایک طبقہ بھی موجود تھا جو اسلام کی سادگی و سادہ معاشرت کو خیر باد کہہ کر محلاتی زندگی کا خوگر ہو چکا تھا۔ اور انسان جس زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اس میں تبدیلی آسانی سے گوارا نہیں کرتا۔ مگر حضرت نے اس طبقہ کو خاطر میں لائے بغیر معاشی انقلاب پیدا کرنے اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی بساط پیٹ دینے کا تہیہ کر لیا تاکہ معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے پاک وصاف کر دیں جو سرمایہ داری کے نتیجہ میں گھر گھر پھیل چکی تھیں۔ چنانچہ زمام حکومت ہاتھوں میں لیتے ہی سابقہ حکومت کی عطا کردہ جاگیروں کو واپس لے لینے کا حکم دیا اور فرمایا:۔ "خدا کی قسم اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہوتا تو اُسے بھی واپس پلٹا لیتا۔" چنانچہ حضرت عثمان کے ہاں سے تلواریں زرہیں اور صدقہ کے اُونٹ اپنی تحویل میں لے لئے اور اعلان عام کیا کہ جس جس کے پاس حضرت عثمان کا دیا ہوا مال ہو وہ بیت المال میں جمع کر دے۔ اس اعلان سے امویوں اور سرمایہ داروں میں کھلبلی مچ گئی۔ اور ولید ابن عقبہ نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم آپ کی بیعت کئے لیتے ہیں بشرطیکہ وہ مال جو حضرت عثمان کی داد و دہش کے نتیجہ میں ہمیں ملا ہے وہ ہم سے چھینا نہ جائے۔ حضرت نے فرمایا:۔

اما وضعی عنکم ما اصبتم فلیس لی ان اضع حق اللہ عنکم ولا عن غیرکم۔	میں اس مال کو چھوڑ دوں جو تم لوگوں نے ہتھیا لیا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں اللہ کے اس حق سے دستبردار ہو جاؤں جو تمہارے اور تمہارے علاوہ دوسروں کے ذمّہ ہے۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱، ص ۲۷۰)

امیرالمومنین نظام معیشت کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ حاکم و رعایا ایک سطح پر ہوں چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "خدا نے آئمہ حق پر یہ فرض عاید کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تاکہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائیں۔" آپ نے اپنا پورا دورِ اقتدار اسی نہج پر گزارا اور رہنے سہنے اور کھانے پہننے کا معیار وہی رکھا جو ایک غریب و نادار کا ہو سکتا ہے۔ نہ اس سے بہتر کھانا پسند کیا اور نہ اس سے اچھا لباس پہننا گوارا کیا۔ حضرت خود فرماتے ہیں:۔ "کیا میں شکم سیر ہو کر پڑا رہا کروں۔ درآنحالیکہ میرے گرد و پیش بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں یا میں ویسا ہو جاؤں جیسا کسی شاعر نے کہا ہے:۔

وحسبک داءً ان تبیت ببطنۃ   وحولک اکباد تحن الی القد

تمہاری یہ بیماری کیا کم ہے کہ تم پیٹ بھر کر لمبی تان لو اور تمہارے گرد کچھ ایسے جگر ہوں

جو سوکھے چمڑے کو ترس رہے ہوں۔"

امیرالمومنین نظامِ معیشت کو عدل کی بنیادوں پر استوار کر کے طبقاتی تفریق کی راہ روکنا چاہتے تھے تاکہ معاشی اعتبار سے توازن و اعتدال کارفرما ہو اور معاشرہ غربت و امارت کے لحاظ سے دو طبقوں میں اس طرح نہ بٹ جائے کہ ایک طرف فلک بوس عمارتیں ہوں اور دوسری طرف شکستہ جھونپڑے۔ ایک طرف فاخرہ ملبوسات ہوں اور دوسری طرف پھٹے پرانے چیتھڑے۔ ایک طرف امراء کے کتے بھی ضرورت سے زیادہ شکم سیر ہوں اور دوسری طرف فاقوں سے دم توڑتے ہوئے انسان۔ ایک طرف ملکی سرمایہ بے دریغ لٹ رہا ہو اور دوسری طرف پیغمبر کا ایک عظیم صحابی صحرائے ربذہ میں دوا و غذا کے بغیر بے کسی کی موت مر رہا ہو۔ یہ نتیجہ ہوا کرتا ہے دولت کی جمع آوری اور غریبوں کی حق تلفی کا جیسا کہ حضرت نے فرمایا ہے:۔

ان اللہ فرض فی اموال الاغنیاء اقوات الفقراء فما جاع فقیر الا بما منع به غنی واللہ تعالیٰ سائلھم عن ذٰلک۔ (نہج البلاغہ)

"خداوند عالم نے دولت مندوں کے مال میں فقیروں کی روزی کا حصہ رکھا ہے۔ اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا ہے تو اس لئے کہ دولت مند نے دولت کو سمیٹ لیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے اس کا مواخذہ کرنے والا ہے۔"

حضرت اس ناہموار معیشت کے بجائے نظامِ معیشت اس نہج پر قائم کرنا چاہتے تھے کہ ہر فرد کی ضروریات پوری ہوں اور کوئی شخص خواہ کسی گوشہ میں پڑا ہو لوازمِ حیات سے محروم نہ رہے۔ پیداواری وسائل اور معیشت کے جملہ شعبوں میں سب کے حقوق مساوی ہوں اور سب کو سعی و کاوش اور کاروکسب کے یکساں مواقع مہیا ہوں۔ یہی اسلامی نظریۂ مساوات ہے جو نفاذ پذیر ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور تقاضائے عدل کے مطابق بھی ہے اور مساوات بایں معنی کہ دولت سب کو برابر برابر ملے اور افراد میں معاشی اعتبار سے اونچ نیچ نہ ہو تو اس خارجی مساوات کا اسلامی نظریہ سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ اسلام کے مالی فرائض زکوٰۃ، خمس، حج وغیرہ سے ظاہر ہے اور نہ اس قسم کی مساوات سے اجتماعی زندگی کو کسی مضبوط بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔

لا یزال الناس بخیر ما تفاوتوا فان استووا ھلکوا۔ (امالی صدوق)

"انسانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ان میں تفاوت رہے اور اگر سب برابر ہو جائیں تو ہلاک ہو جائیں۔"

ظاہر ہے کہ جب تمام انسان معاشی اعتبار سے ایک سطح پر ہوں گے تو ایک کو دوسرے کی احتیاج و ضرورت نہ ہوگی جس کے نتیجہ میں روابط کمزور اور معاشرتی تعلقات مضمحل ہو جائیں گے اور آخر مدنیت

واجتماعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا جو سراسر ہلاکت و تباہی ہے۔

عہد امیرالمومنین کے معاشی نظام پر نظر کی جائے تو یہ چیز بالکل روشن اور واضح ہو جاتی ہے کہ کاروباری آزادی کے ساتھ پیداواری وسائل عوام کی ملکیت تھے اور ہر شخص معیشت کے مختلف ذرائع زراعت تجارت دستکاری وغیرہ کے اختیار کرنے میں آزاد تھا۔ اور ایک بہترین نظام معیشت کی بنیادی قدر یہی ہے کہ ایک طرف مکمل معاشی آزادی ہو اور دوسری طرف مکمل معاشی تحفظ ہو تاکہ ہر شخص اپنی محنت و کارکردگی کے نتیجہ سے مطمئن ہو کر جد وجہد میں لگا رہے۔ حضرت یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی شخص کاروکسب اور معاشی تگ و دو چھوڑ چھاڑ کر معاشرہ پر بار بن جائے اور اپنی کمائی کے بجائے دوسروں کی کمائی سے اپنا پیٹ پالے۔ البتہ جو شخص اپنی ضروریات کے فراہم کرنے سے عاجز ہوتا یا ضروریات سے اس کی آمدنی کم ہوتی تو بیت المال سے اس کی اعانت کی جاتی۔

حضرت زراعت اور تجارت کو معاشی فارغ البالی کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔

من وجد ماءً وترابا ثم افتقر ابعدہ اللہ۔

"جسے زمین اور آبیاری کے لئے پانی میسر ہو اور وہ پھر نادار رہے تو اللہ اُسے دور ہی رکھے۔"

تجارت کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

تعرضوا للتجارۃ فان فیھا غنی لکم عما فی ایدی الناس۔

"تجارت کرو اس لئے کہ تجارت ہی وہ سرمایہ ہے جو تمہیں لوگوں کے مال و دولت سے مستغنی کر دے گا۔"

حضرت زراعت تجارت کی حوصلہ افزائی کے لئے خود بھی کھیتی باڑی اور کاروبار میں عملاً حصّہ لیتے تھے۔ چنانچہ افتادہ و بے آباد زمینوں کو آباد کرتے اور چشمے کھود کر باغوں اور نخلستانوں کی آبیاری کرتے۔ اسی طرح تجارت کی طرف رغبت دلانے کے لئے ایک مرتبہ اپنا تہبند فروخت کے لئے پیش کرتے ہوئے فرمایا:۔

اشتریتہ بخمسۃ دراھم فمن اربحنی فیہ درھما بعتہ۔

"میں نے یہ تہبند پانچ درہم میں خریدا تھا اگر کوئی ایک درہم زیادہ دے تو اس کے ہاتھ بیچ دوں گا۔"

فرصت کے اوقات میں اپنے شاگرد میثم تمار کی دکان پر بیٹھ جاتے اگر میثم اِدھر اُدھر ہوتے تو گاہکوں کے ہاتھ کھجوریں بیچتے اور اس میں ذرا سبکی محسوس نہ کرتے۔

حضرت تجار اور کاروباری طبقہ پر نظر رکھتے تھے تاکہ بلا وجہ قیمتوں میں اضافہ نہ کریں۔ چنانچہ بازاروں میں گھوم پھر کر چیزوں کے نرخ دریافت کرتے ناپ تول کا جائزہ لیتے۔ ابوالصہبا کہتے ہیں:۔

رایت علیا بشط الکلا یسئل

"میں نے شط کلا (بصرہ) میں دیکھا کہ حضرت نرخ

پوچھتے پھرتے ہیں۔" عن الاسعار۔

ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قلت اور گرانی پیدا کرنا ایک معاشرتی جرم ہے۔ حضرت نے اس کی روک تھام کے لئے عام اعلان کر دیا تھا کہ کوئی شخص گراں فروشی کے ارادہ سے ضروریاتِ زندگی کا ذخیرہ نہ کرے۔ چنانچہ مالک اشتر کو تحریر فرمایا: "ذخیرہ اندوزی سے منع کرنا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے۔ لہذا جو بھی ذخیرہ اندوزی کا مرتکب ہو اسے مناسب حد تک سزا دینا۔"

معاشی نظام میں توازن اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اسراف یعنی ضرورت سے زائد خرچ اور تبذیر یعنی بلاضرورت خرید سے بچ کر رہا جائے حضرت ان دونوں چیزوں کو معاشی تباہی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے چنانچہ بلاضرورت خرچ کے بارے میں فرمایا:۔

فدع الاسراف مقتصدا و اذکر فی الیوم غدا۔ "میانہ روی اختیار کرتے ہوئے فضول خرچی سے باز آؤ آج کے دن کل کو بھول نہ جاؤ۔"

اور غیر ضروری چیزوں کو سمیٹنے کے بارے میں فرمایا:۔

اذا استغنیت عن شیئ فدعه وخذ ما انت محتاج الیه۔ "جس چیز کی ضرورت نہ ہو اُسے چھوڑ دو اور اسی چیز کو حاصل کرو جس کی ضرورت ہو۔"

جب انسان میانہ روی کو چھوڑ کر ضرورت سے زائد خرچ کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ محتاج و دستِ نگر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ شادی بیاہ اور مختلف تقریبات پر زمین و جائیداد بیچ کر یا سودی قرضے لے کر اندھا دھند خرچ کرتا ہے اور کنبہ و برادری اور محلہ و شہر میں دریا دلی کی شہرت بھی حاصل کر لیتا ہے مگر آخر کار یا ذریعہ معاش سے محروم ہو جاتا ہے یا سود در سود کے چکر میں پڑ کر اطمینان و سکون کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح بلاضرورت خرید بھی معیشت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایک چیز بلاضرورت خریدنے والے کے کام تو آتی نہیں اب کسی اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مقدور نہ ہو تو یا اس بے ضرورت چیز کو اونے پونے بیچے اور نقصان اٹھائے یا اپنی ضرورت کی چیز سے دستبردار ہو جائے اور اگر اس بلاضرورت خرید کا رجحان بڑھ جائے تو اس سے معاشرہ بھی یقیناً متاثر ہو گا اس طرح کہ جس کے پاس وہ چیز ہے وہ اس کے کام کی نہیں ہے اور جسے اس کی ضرورت ہے وہ طلب کے بڑھ جانے سے یا تو اسے مہنگے داموں خریدے یا اس سے محروم رہے اس لئے کہ بلاضرورت خرید سے طلب، رسد سے بڑھ جاتی ہے اور چیزوں کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں اور قیمتوں کے چڑھاؤ سے افراطِ زر کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

بیت المال کی تقسیم

پیغمبر اکرم زکوٰۃ و صدقات اور اموالِ غنائم کو جمع رکھنے کے بجائے اموال غنائم کو مجاہدین میں اور دوسرے اموال جس شہر اور علاقے سے وصول ہوتے وہیں کے مسلمانوں میں فوراً تقسیم کر دیتے اس لئے نہ بیت المال تشکیل دیا گیا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ آنحضرتؐ کے بعد جب فتوحات کے نتیجہ میں روم و ایران کے خزانے مدینہ میں سمٹ آئے تو بیت المال کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے نظم و انصرام کے لئے محکمۂ مالیات قائم کیا گیا اس محکمہ کے زیر نگرانی سرمایہ سمیٹ کر رکھا جاتا جس سے رفاہی امور انجام دیئے جاتے اور سالانہ وظائف کی تقسیم ہوتی۔ آنحضرتؐ کے دور میں تقسیم کی بنیاد عدل و مساوات پر تھی اور سب سے یکساں برتاؤ ہوتا تھا مگر آپ کے بعد تقسیم بالسویّہ کی پابندی ختم کر دی گئی چنانچہ حضرت عمر کے دور میں بیت المال میں سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ وظیفہ ملتا تھا۔ ازواجِ پیغمبر کو دوسری خواتین پر ترجیح دی جاتی تھی اور حضرت عائشہ کو دوسری ازواج سے دو ہزار زائد دیا جاتا تھا۔ بدریین کے وظائف ان لوگوں سے زیادہ تھے جو بدر میں شریک نہ ہوئے تھے اور مہاجرین کو انصار پر فوقیت حاصل تھی۔ حضرت عثمان کے دور میں یہ درجہ بندی بھی باقی نہ رہی اور انہوں نے کتاب و سنت اور سیرت شیخین کی پابندی کا عہد کرنے کے باوجود نہ تقسیم بالسویہ ضروری سمجھی اور نہ تقسیم بالمدارج بلکہ مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ اموی عزیزوں دوستوں اور ہوا خواہوں کی تن پروری کے لئے مخصوص کر دیا اور جسے چاہا اور جس قدر چاہا بطورِ عطیہ بخش دیا۔

امیرالمومنین نے جب بیت المال کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لیا تو عملِ پیغمبر کے مطابق جس شہر میں جو مال جمع ہوتا اسی شہر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتے اور اگر وہاں سے کچھ بچ کر آتا تو بیت المال میں سمیٹ کر رکھنے کے بجائے ہر جمعہ کو مستحقین میں تقسیم کر کے بیت المال خالی کر دیتے۔ جب بیت المال خالی ہو جاتا تو اپنے ہاتھ سے اس میں جھاڑو دیتے دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں جس طرح خالی ہاتھ اندر داخل ہوا تھا اسی طرح خالی ہاتھ باہر جا رہا ہوں۔ ابن عبد البر نے تحریر کیا ہے:۔

وکان لا یدع فی بیت المال	حضرت نے یہ نوبت نہیں آنے دی کہ رات گزاریں
مالا یبیت فیہ حتی یقسمہ	اور مال بیت المال میں پڑا رہے بلکہ رات سے پہلے
الا ان یغلبہ شغل فیصبح	اسے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی مانع ہوتا
الیہ۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۵)	تو صبح ہونے دیتے۔

ایک دفعہ اس وقت مال آیا جب رات کا اندھیرا شروع ہو چکا تھا۔ فرمایا کہ اس مال کو ابھی تقسیم کر دیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ اب تو رات ہو چکی ہے اسے کل پر اٹھا رکھیئے۔ فرمایا کیا تمہیں یقین ہے کہ میں کل تک زندہ رہوں گا۔ کہا کہ موت کا علم اللہ کے سوا کس کو ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ پھر دیر نہ کرو اور اسے ابھی تقسیم کر دو۔ چنانچہ چراغ روشن کئے گئے اور سارا مال راتوں رات تقسیم کر دیا گیا۔

سابقہ حکومتوں میں بیت المال کی غیر مساویہ تقسیم نے معاشی نظام کو غیر متوازن بنا دیا تھا حضرت نے اس میں تبدیلی ضروری سمجھی اور غیر مساویانہ تقسیم کے بجائے اسلامی نظریۂ مساوات کو پھر سے زندہ کیا اور چھوٹے بڑے کا امتیاز ختم کر کے سب کا حصہ یکساں قرار دیا اگرچہ یہ طرزِ عمل امتیاز پسند ذہنیتوں پر شاق گزرا اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی مگر حضرت کسی کو خاطر میں نہ لائے اور اپنے اصول سے جو عین اسلامی اصول تھا ہٹنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ عبداللہ ابن ابی رافع بیان کرتے ہیں کہ جب طلحہ اور زبیر نے یہ دیکھا کہ تقسیم مال میں ان کا امتیاز خطرہ میں ہے تو وہ حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ یا امیرالمومنین حضرت عمر ہمیں بیت المال سے اتنا اور اتنا دیا کرتے تھے آپ بھی اس کا لحاظ رکھیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے چھوڑو کہ فلاں تمہیں اتنا دیا کرتا تھا یہ بتاؤ کہ رسول اللہ تمہیں کیا دیا کرتے تھے یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو گئے۔ حضرت نے انہیں خاموش دیکھا تو فرمایا کیا رسول اللہ تقسیم بالسویہ کے اصول پر کاربند نہ تھے۔ کہا کہ ہاں وہ سب میں برابر برابر تقسیم کیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ پھر سنتِ رسول زیادہ قابل عمل ہے یا سنتِ عمر؟ کہا کہ قابلِ عمل تو سنتِ رسول ہے مگر ہمیں اسلام میں سبقت کا شرف حاصل ہے ہم نے اسلامی غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ہمیں رسولؐ اللہ سے قرابت بھی ہے۔ فرمایا کہ اسلام میں تمہیں سبقت حاصل ہے یا مجھے کہا کہ آپ کو۔ فرمایا تم نے جہاد میں زیادہ حصہ لیا ہے یا میں نے کہا آپ نے۔ فرمایا تمہیں رسول اللہ سے زیادہ قرابت ہے یا مجھے کہا آپ کو۔ پھر حضرت نے ایک مزدور کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس مال میں میرا اور اس مزدور کا حصہ برابر ہے۔ جب میں اپنے لئے امتیاز گوارا نہیں کرتا تو تمہارے لئے کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے۔

حضرت بیت المال میں اعلیٰ ادنیٰ قرشی و غیر قرشی آزاد اور غلام سب کا حق مساوی سمجھتے تھے اور رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کی بنا پر امتیاز گوارا نہ کرتے تھے اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں سب امتیازات ختم کر دوں گا۔ عقیل نے یہ سنا تو حضرت سے کہا کہ آپ مجھے اور مدینہ کے ایک حبشی غلام کو ایک سطح پر رکھیں گے۔ حضرت نے فرمایا:۔

اجلس رحمك الله وما فضلك   بیٹھئے خدا تم پہ رحم کرے اگر تم کو اس پر فضیلت

علیه الا بسابقة او تقوی۔ ہوسکتی ہے تو تقویٰ اور سبقت کی بنا پر۔"

ایک مرتبہ حضرت کے پاس دو عورتیں آئیں حضرت نے ان دونوں کو برابر برابر دیا اس پر ایک نے کہا کہ میں عربیہ ہوں اور آزاد اور یہ غیر عربیہ ہے اور کنیز۔ اور آپ نے ہم دونوں کو ایک درجہ پر سمجھ لیا ہے حالانکہ میں مرتبہ کے لحاظ سے بلند تر ہوں۔ حضرت نے زمین پر سے مٹی اٹھائی اور اس پر نظر کرنے کے بعد فرمایا:۔

ما اعلم ان اللہ فضل احدا من الناس علی احد الا بالطاعة والتقویٰ۔ "میرے علم میں نہیں ہے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہو مگر اُسے جو طاعت و تقوے میں بڑھا ہوا ہو۔"

ایک دفعہ سہل ابن حنیف اپنے حبشی غلام کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یہ بیت المال سے اپنا حصہ لینے کے لئے آیا ہے آپ اسے کیا دیں گے فرمایا کہ تمہیں کیا ملا ہے کہا کہ سب کو تین تین دینار ملے ہیں اور مجھے بھی تین دینار ملے ہیں۔ فرمایا کہ پھر اسے بھی تین دینار دیئے جائیں گے۔

ایک مرتبہ آپ کی ہمشیرہ ام ہانی بنت ابی طالب آپ کے ہاں آئیں آپ نے بیت المال میں سے بیس درہم انہیں دیئے انہوں نے واپس پلٹ کر اپنی ایک عجمیہ کنیز سے دریافت کیا کہ تمہیں امیرالمومنین نے کیا دیا ہے اس نے کہا کہ بیس درہم یہ سن کر جناب ام ہانی حضرت کے پاس آئیں اور کہا کہ آپ نے جو کنیز کو دیا ہے وہی مجھے دیا ہے حالانکہ میرا حق فائق ہے۔ حضرت نے فرمایا:۔

انی واللہ لا اجد لبنی اسمٰعیل فی ھذا الفئ فضلا علیٰ بنی اسحٰق۔ "خدا کی قسم اس مال میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسحٰق پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔"

امیرالمومنین کی بلند نفسی اس کی قطعاً روادار نہ ہوسکتی تھی کہ وہ قرابت و عزیزداری کی بنا پر اپنے نظریہ تقسیم اموال میں تبدیلی پیدا کریں اور جانبداری سے کام لے کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے امتیازی برتاؤ روا رکھیں خواہ بہن ہو یا بھائی بیٹا ہو یا بیٹی۔ چنانچہ آپ سے عقیل نے فقر و افلاس کا شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بیت المال میں سے کچھ دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ چند دن صبر کرو جب دوسروں کو ملے گا تو تمہیں بھی مل جائے گا۔ جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے ایک شخص سے کہا کہ تم انہیں بازار میں لے جاؤ اور کسی دوکان کے سامنے کھڑا کردو اور عقیل سے کہا کہ تم اس دکان کا تالا توڑ دو اور جو کچھ اس کے اندر ہو سمیٹ کر گھر لے جاؤ۔ عقیل نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں چوری کروں اور چور کہلواؤں۔ فرمایا تو پھر تم مجھے چور بنانا چاہتے ہو کہ میں مسلمانوں کے مال میں سے

چوری کر کے تمہیں دوں۔

ایک دفعہ عقیل کے بچوں نے حضرت کو کھانے پر بلایا۔ جب کھانا سامنے رکھا گیا تو پوچھا کہ یہ کھانے کا سامان کہاں سے مہیا کیا ہے کہا کہ ہم چند دن اپنے حصے کے جو بچاتے رہے ہیں اس سے یہ سامان خریدا گیا ہے۔ فرمایا بچنے کا سوال اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب تمہاری ضرورت سے زائد تھے لہذا تم جتنا روز بچاتے تھے آئندہ اتنا کم دیا جائے گا کیونکہ اس سے زیادہ دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس پر عقیل بگڑ گئے حضرت نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو تپایا اور ان کے جسم کے قریب لے گئے۔ عقیل ڈر کر پیچھے ہٹے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم لوہے کے ایک گرم ٹکڑے کو دیکھ کر چیخ اٹھے ہو اور مجھے اس آگ میں جھونکنا چاہتے ہو جسے خدا نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔

ایک مرتبہ عبداللہ ابن جعفر نے حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے بیت المال میں سے کچھ دیجئے میری حالت یہ ہے کہ میں اپنی سواری بیچے بغیر روزمرہ کا خرچ بھی نہیں چلا سکتا۔ حضرت نے فرمایا:

لا واللہ ما اجد لك شيئاً الا	خدا کی قسم میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ
ان تامر عمك ان يسرق	نہیں ہے مگر یہ کہ تم اپنے چچا سے یہ کہو کہ وہ چوری
فيعطيك۔	کرے اور تمہیں دے۔"

حضرت کوئی عزیز ہو یا غیر کسی کا ادنیٰ تصرف بھی بیت المال میں گوارا نہ کرتے تھے حالانکہ اگر آپ درگزر سے کام لیتے تو کوئی آپ پر حرف گیری نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو ابن سلمہ جو حضرت کی طرف سے اصفہان کے عامل تھے گھی اور شہد کی مشکیں لے کر آئے۔ جناب ام کلثوم نے ضرورت کی بنا پر عمرو ابن سلمہ سے تھوڑا سا گھی اور شہد طلب کیا انہوں نے ایک پیالے میں گھی اور ایک پیالے میں شہد بھجوایا۔ دوسرے دن جب یہ مشکیں حضرت کے سامنے لائی گئیں تو آپ نے دو مشکوں کو ان کی اصلی حالت پر نہ پا کر عمرو سے وجہ دریافت کی۔ عمرو نے کہا کہ جناب ام کلثوم نے تھوڑا سا شہد اور گھی طلب کیا تھا میں نے ان مشکوں کو کھلوا کر گھی اور شہد بھیج دیا تھا۔ امیرالمومنین نے دونوں مشکیں تخمینہ لگانے والوں کے پاس بھیج دیں اور ان سے پوچھا کہ ان مشکوں میں سے کتنا گھی اور شہد کم ہوا ہے اور ان دونوں چیزوں کی قیمت کیا ہو گی۔ انہوں نے اندازہ کرنے کے بعد بتایا کہ جتنا گھی اور شہد ان میں سے نکالا گیا ہے اس کی قیمت پانچ درہم سے زیادہ نہ ہو گی آپ نے جناب ام کلثوم کو پیغام بھجوایا کہ وہ پانچ درہم بھیج دیں۔ اور اس کے بعد تمام مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک دفعہ بصرہ کے خراج میں موتیوں کا ایک قیمتی ہار آیا آپ کی صاحبزادی جناب ام کلثوم نے

خازن بیت المال ابورافع سے کہا کہ وہ ہار تین دن کے لئے عاریۃً بھجوا دیں۔ ابورافع نے وہ ہار بھجوا دیا۔ امیر المومنین نے وہ ہار دیکھا تو پوچھا کہ یہ ہار یہاں کیسے آیا ہے؟ ام کلثوم نے کہا کہ میں نے اسے عاریۃً منگوایا تھا۔ فرمایا کہ اگر عاریۃً نہ لیا ہوتا تو میں اس پر سزا دیتا۔ ام کلثوم نے کہا کہ بابا یہ ہار مجھے دے دیجئے۔ فرمایا جب تک میں ہر مسلمان خاتون کے گلے میں ایسا ہار نہ دیکھ لوں اس وقت تک تمہیں نہیں دیا جا سکتا۔ اور اتنے ہار آئیں کہاں سے۔ پھر حکم دیا کہ اسے فوراً بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔

امیر المومنین احساس ذمہ داری کی بنا پر حقیر و بے قیمت چیز کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی مالی اعتبار سے قیمتی چیز کو دی جا سکتی ہے۔ اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اسے بانٹ نہ دیتے۔ چنانچہ بیت المال میں ایک رسّی دیکھ لی جو تقسیم کے بعد پڑی رہ گئی تھی فرمایا کہ اسے بھی لے جاؤ اور تقسیم کر دو۔ اصفہان سے مال آیا تو اس میں سے ایک روٹی بھی نکل آئی۔ آپ نے قبیلہ وارانہ تقسیم کے لئے جہاں مال کے سات حصے کئے اس روٹی کے بھی سات ٹکڑے کئے اور ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ کر اور ساتوں قبیلوں کے شیوخ کو بلا کر ایک ایک حصہ اُن کے حوالے کیا۔ ایک مرتبہ پارچوں کی تقسیم ہوئی۔ امام حسن نے ان پارچوں میں ایک ٹوپی دیکھ کر کہا کہ بابا یہ مجھے دے دیجئے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ جب پارچے تقسیم ہوئے تو وہ ٹوپی ایک ہمدانی کے حصہ میں آئی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ امام حسن نے اس ٹوپی کو پسند کیا تھا مگر امیر المومنین نے انہیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ہمدانی نے وہ ٹوپی امام حسن کی خدمت میں بھیج دی۔

ان چند واقعات پر عمل کرنے کے بعد بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت نے تقسیم اموال میں وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو پیغمبر اکرم کا طرزِ عمل تھا۔ نہ بیت المال میں مال جمع کر کے رکھا اور نہ تقسیم میں رنگ و نسل کا امتیاز کیا بلکہ عدل و مساوات کے جو پیمانے وضع کئے اور حق و انصاف کے جو معیاری نمونے پیش کئے دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کیا اس کی مثال کہیں نظر آتی ہے کہ حقیقی بھائی اپنے بچوں کی پرورش کے لئے بیت المال سے چند سیر جَو کا مطالبہ کرے، بہن اپنے وظیفہ میں چند درہموں کا اضافہ چاہے۔ ابن عم اور داماد روزمرہ کی ضروریات کے سلسلہ میں مدد چاہے بیٹی گھی اور شہد کا ایک پیالہ لے لے یا ایک ہار عاریۃً منگوالے اور بیٹا ایک معمولی سی ٹوپی کی خواہش کرے مگر اصول پرستی و حق پسندی کے مقابلہ میں محبت و قرابت کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور بیت المال سے عزیزوں کے ساتھ اتنی سی مراعات بھی گوارا نہ کی جائے حالانکہ حق ولایت سے قطع نظر حضرت مسلمانوں سے اجازت لے کر یہ چند چیزیں اپنے عزیزوں کو دے سکتے تھے مگر آپ کی خودداری یہ گوارا نہیں کرتی کہ مسلمانوں پر

یہ ادنیٰ سا بوجھ بھی ڈالیں یا ان کے زیرِ بار احسان ہوں جب کہ حضرت اپنے ذاتی مصارف کے لئے غلہ تک مدینہ سے منگواتے تھے اور اپنے حق کے باوجود بیت المال پر اپنا بوجھ ڈالنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہارون ابن عنترہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خورنق میں حضرت کو ایک پرانا کمبل اوڑھے دیکھا جو سردی سے بچاؤ کے لئے کافی نہ تھا۔ میں نے کہا کہ یا امیرالمومنین اس بیت المال میں آپ کا حصّہ بھی تو ہے اس میں سے کوئی نیا کمبل لے لیجئے فرمایا:۔

واللہ ما ارزأکم شیئا وما ھی الاقطیفتی التی اخرجتھا من المدینۃ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۲۰۱)

خدا کی قسم میں نے تمہارے مال میں سے کوئی چیز لینا گوارا نہیں کی اور یہ چادر جو اوڑھے ہوئے ہوں مدینہ سے لے کر آیا تھا۔"

نظامِ زکوٰۃ

زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے۔ جو گیہوں، جو، خرما، کشمش، سونا، چاندی، گائے، بھینسوں، بھیڑ، بکریوں اور اونٹوں میں ہر صاحبِ نصاب پر مقررہ مقدار میں واجب ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں اور شرعی معنی میں بھی پاکیزگی کا اعتبار کیا گیا ہے اور زکوٰۃ سے تطہیرِ مال ہی مراد ہے کیونکہ جب تک زکوٰۃ ادا نہ کی جائے مال طاہر نہیں ہوتا اور ادائے زکوٰۃ کے بعد مال بھی طاہر اور انسانی ذہن بھی بخل طمع، حبِّ مال اور ان سے پیدا ہونے والی کثافتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم

ان کے مال سے زکوٰۃ لو اور اس کے ذریعہ انہیں پاک وصاف کر دو۔"

زکوٰۃ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ضرورت مند افراد کی اعانت و دستگیری ہوتی رہے اور معاشرہ میں کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے سات مصارف کا تعلق افراد سے ہے اور ایک مصرف کا تعلق اجتماعی و رفاہی امور سے ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمولفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی

صدقہ زکوٰۃ بس فقیروں کا حق ہے۔ اور محتاجوں کا اور اس کے کارندوں اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلب مقصود ہے اور غلاموں کی رہائی کے لئے اور قرضداروں کے ادائے قرض کے لئے اور

سبیل اللہ وابن السبیل۔ خدا کی راہ میں امور خیر کے لئے اور مسافروں کے لئے "

زکوٰۃ سے بڑی حد تک معاشی ناہمواریوں کو متوازن سطح پر لایا جا سکتا ہے کیونکہ ہر سال دولت کا ایک حصہ دولتمندوں کے ہاتھوں سے نکل کر غریبوں اور محتاجوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے اگرچہ اس سے امیر و غریب کا تفاوت ختم نہیں ہوتا مگر ایک حد تک اس میں کمی ضرور ہو جاتی ہے اور اس فریضۂ مالی کا مقصد بھی یہی ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے بجائے افراد میں بٹتی رہے اور سرمایہ داری کی طرف جھکاؤ پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صدقات و خیرات کی غرض و غایت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

کے لا تکون دولۃ بین الاغنیا منکم۔ تاکہ دولت ہر پھر کے تمہارے دولت مندوں ہی کے ہاتھوں میں نہ رہے "

بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اتنی کم ہے کہ اس سے معاشی تفریق ختم کی جا سکتی ہے اور نہ امیر و غریب کے درمیانی فاصلے کم ہوتے ہیں بلکہ محتاجوں اور ناداروں کی تعداد جوں کی توں رہتی ہے نہ ان کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ ان کی احتیاج میں کمی ہوتی ہے۔ اس کا جواب تو وہی ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے دیا ہے کہ " اللہ نے دولتمندوں کے مال میں فقیروں کا اتنا ہی حق مقرر کیا ہے جو ان کی ضروریات کی کفایت کرتا ہے۔ اور اگر اللہ یہ جانتا کہ اس سے محتاجوں کی احتیاج برطرف نہیں ہو سکتی تو وہ اس کی مقدار زیادہ کر دیتا " بلکہ وہ چاہتا تو مالک کے مال میں فقیر کا حصہ مالک کے برابر یا اس سے بھی زائد قرار دے سکتا تھا مگر حکمت الٰہیہ کا تقاضا یہ تھا کہ صاحب مال کا حصہ وافر رکھا جائے کیونکہ یہ مال اس کی محنت و ریاضت اور کد و کاوش کا ثمرہ ہے اور غریب و نادار کا اس میں حق ہے تو مالک بھی ضرورت و احتیاج کے لحاظ سے فقیر کا شریک ہے تو جہاں اللہ نے فقیر کا اسکی غربت و احتیاج کی بناء پر حق رکھا ہے وہاں مالک کی ضرورت کے علاوہ اس کی محنت صرفہ اور حق ملکیت کی رعایت بھی ضروری تھی چنانچہ اس حکیم مطلق نے اسی حق کی بناء پر جہاں مالک کی محنت اور صرفہ کم ہوتا ہے، زکوٰۃ کی مقدار زیادہ رکھی ہے اور جہاں محنت اور صرفہ زیادہ ہوتا ہے وہاں فقیر کا حصہ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان جس چیز کے حصول میں زیادہ محنت و مشقت کرتا ہے اتنا ہی اس کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ چنانچہ گیہوں کی فصل اگر بارانی ہو تو مالک چونکہ آبپاشی کی محنت اور اس کے مصارف سے بچ جاتا ہے اس لئے فقیر کا حصہ ۱/۱۰ قرار دیا ہے اور اگر فصل آبپاشی کے ذریعہ ہو تو چونکہ مالک آبپاشی کے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے اس لئے فقیر کا حصہ ۱/۲۰ قرار دیا گیا ہے۔ یونہی ان چوپاؤں میں جن کی پرورش کا بار مالک پر ہوتا ہے فقیر

کا حق قرار نہیں دیا گیا اور جو صحراؤں اور چراگاہوں میں چر کر خود ہی اپنا پیٹ پال لیتے ہیں ان میں فقراء کا حق قرار دیا گیا ہے۔ غرض اللہ نے مالک کے صرفہ و محنت اور فقیر کی احتیاج میں ایک نسبت قائم کر کے زکوٰۃ کی مقدار مقرر کی ہے کہ ایک طرف فقیر کو بقدر کفایت ملتا رہے۔ اور دوسری طرف مالک پر اتنا ہی بار پڑے جسے وہ خوشی خوشی گوارا کر لے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مقدار کی کمی احتیاج کے باقی رہنے کا سبب نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ دولت مندوں کا ایک طبقہ سرے سے اس فریضہ کو اہمیت ہی نہیں دیتا اور جو طبقہ اس فریضہ کو فریضہ سمجھتا ہے وہ تھوڑی بہت زکوٰۃ دے کر ایک وافر حصہ حیلے بہانوں سے بچا لے جانے کا جواز پیدا کر لیتا ہے۔ اگر دیانت واحتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی ادائیگی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ طبقاتی تفریق کو کم کر کے معاشی حالات پر قابو نہ پایا جا سکے اور پھر فقراء کی اعانت زکوٰۃ ہی پر کب منحصر ہے کہ مقدار کی کمی بیشی کا سوال اٹھایا جائے۔ یہ مقدار تو زکوٰۃ واجبی کی ہے ورنہ زکوٰۃ مستحبی کے لئے نہ نصاب کی شرط ہے اور نہ مقدار کی حد بندی بلکہ جیسے حالات ہوں ان کے مطابق صدقات و خیرات سے عزیزوں ہمسایوں اور ناداروں کی خبر گیری کرنا انسانی فرائض میں داخل ہے۔

زکوٰۃ ایک فریضہ شرعی ہے لہذا اس میں نیت تقرب اور ادائے فرض کا تقاضا کارفرما ہونا چاہیئے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کوئی احسان ہے جو فقیر و نادار پر کیا جا رہا ہے بلکہ ایک اجتماعی حق ہے جس کا حقداروں تک پہنچانا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے :-

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ — ان کے اموال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے کا حق ہے "

پیغمبر اکرم کے زمانہ میں زکوٰۃ کا نظام اجتماعی تھا جو کارندوں کے ذریعہ جمع کی جاتی اور پھر مصارف معیّنہ پر صرف کیا جاتا ہے۔ امیر المومنین جو پیغمبر کے بعد ولی امر اور نگران حقوق تھے انہوں نے اپنے دور میں اپنی زیر نگرانی زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کا محکمہ قائم کیا اور ان تمام امور کی پابندی کی جنہیں پیغمبر اکرم ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ زکوٰۃ کی جمع آوری پر ان لوگوں کا تقرر کرتے جن کی امانت و دیانت اور راست روی پر وثوق ہوتا انہیں تقویٰ و پرہیزگاری کی تلقین کرتے اور تاکید فرماتے کہ وہ وصولی کے سلسلہ میں سختی و تشدد سے کام نہ لیں اگر کوئی خود سے کہے یا پوچھنے پر بتائے کہ اس کے ذمہ زکوٰۃ ہے تو اس سے زکوٰۃ لی جائے اور اگر کوئی یہ کہے کہ میرے ذمہ زکوٰۃ نہیں ہے تو اس سے دہرا کر نہ پوچھا جائے کیونکہ یہ بے اعتمادی کا مظاہرہ ہوگا جو اسے ناگوار گزرے گا۔ اور چراگاہوں میں چرنے والے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں

سے کسی خاص جانور کے لینے پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ مالک کو یہ اختیار دینا چاہیئے کہ وہ اپنا حصہ چھانٹ لے۔ البتہ جو جانور لنگ کرتا ہو یا کمر شکستہ ہو یا ناکارہ و بیمار ہو وُہ نہ لیا جائے۔

حضرت ان جانوروں کی دیکھ بھال کی بھی تاکید فرماتے تھے اور کارندوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ انہیں بے گیاہ راستوں کی طرف سے نہ لائیں بلکہ ایسے راستوں سے لائیں جہاں پانی اور سبزہ ہو۔ اور انہیں پانی پینے اور چرنے اور سستانے کا موقع دیں اونٹنی اور اس کے بچے کو الگ الگ نہ رکھیں۔ اور سارے کا سارا دودھ نہ دوہ لیا کریں کہ بچے کا حصہ کم رہ جائے۔

حضرت کی یہ ہدایات اور طرزِ عمل بتاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ میں جبر و تشدد کو روا نہ رکھتے تھے۔ اور نہ اس کے لئے خون ریزی و لشکر کشی کا کوئی جواز سمجھتے تھے بلکہ لوگوں کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وُہ عمال کی سخت گیری اور حکومت کے دباؤ سے متاثر ہونے کے بجائے محض رضائے الٰہی و خوشنودی پروردگار کے لئے زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر اس کی ادائیگی بھی جبر کے ماتحت ہو تو فریضۂ زکوٰۃ اور حکومت کے جبری ٹیکسوں میں فرق ہی کیا رہے گا۔

امیر المومنین مال زکوٰۃ کو انہی مصارف میں صرف کرتے تھے۔ جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اور اسے محاصل حکومت کی دوسری مدوں میں خلط ملط نہ ہونے دیتے تھے۔

نظامِ خراج

مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں میں سے کچھ علاقے وہ تھے جن کے مالک حرب و ضرب سے مغلوب کئے گئے اور کچھ وہ تھے جو لڑے بھڑے بغیر صلح سے مفتوح ہوئے وہ علاقے جو قہر و غلبہ سے مفتوح ہوئے ان علاقوں کی وہ زمینیں جو شور افتادہ اور پہاڑوں اور دلدلوں کے نیچے واقع ہوں یا ذرائع آبپاشی کے فقدان سے ناقابل زراعت ہوں وہ انفال میں داخل ہیں جو اللہ اور رسول سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

یسئلونك عن الانفال قل	تم سے انفال کے بارے میں پوچھتے ہیں تم کہہ دو کہ
الانفال للہ والرسول۔	انفال اللہ و رسول کے لئے ہیں۔"

پیغمبر کے بعد امام و ولی امر کو اختیار ہے کہ وہ ان زمینوں اور زمینوں سے نکلنے والے معدنیات کو مصالح اہل اسلام یا مصالح عامہ میں جس طرح چاہے تصرف میں لائے اور ولی امر یا اس کے نائبین کی

اجازت خصوصی یا عمومی کے بغیر کسی کو ان میں حق تصرف نہیں ہے اور جو زمینیں فتح کے موقع پر زراعت کے قابل اور آباد ہوں وہ ولی امر کی اجازت سے مسلمانوں میں بانٹ دی جائیں گی تاکہ وہ ان میں کاشت کریں اور ملکی پیداوار بڑھائیں اور وہ علاقے جو معاہدہ صلح کے نتیجہ میں مفتوح ہوئے ہوں اگر وہاں کے باشندے اپنی مرضی و اختیار سے اسلام لے آئیں جیسے مدینہ بحرین اور یمن کے بیشتر حصے تو ان کا اپنی زمینوں پر قبضہ بدستور رہیگا اور وہ زمینوں کی پیداوار سے زکوٰۃ ادا کریں گے اور اگر اپنے مذہب و مسلک پر باقی رہیں تو جن شرائط پر مصالحت ہو گی ان شرائط کی پابندی کی جائے گی اگر یہ معاہدہ ہو کہ وہ اپنی زمینوں اور جائیدادوں کے بدستور مالک رہیں گے تو انہیں ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا جائیگا البتہ انہیں ذمی قرار دیکر ان پر جزیہ عائد کیا جائیگا۔ اور اگر اس شرط پر صلح ہو کہ وہ اپنی زمینوں سے دستبردار ہو کر مسلمانوں کو دیدیں تو وہ مسلمانوں میں تقسیم کردی جائیں گی۔ جس علاقہ کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا جاتا ہے اس علاقہ کی زمینیں اراضیٔ جزیہ کہلاتی ہیں اور جو زمینیں لڑ کر یا شرطِ صلح کی رو سے مسلمانوں میں بٹ جاتی ہیں وہ اراضیٔ خراجیہ کہلاتی ہیں۔ انہیں اراضیٔ خراجیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُن میں کاشت کرنے والوں سے زکوٰۃ کے علاوہ کاشت کا معاوضہ بھی وصول کیا جاتا ہے۔ اگر معاوضہ غلہ کی صورت میں ہو تو مقاسمہ کہلاتا ہے اور قیمت کی صورت میں ہو تو اسے خراج کہا جاتا ہے۔ خراج کی مقدار ولی امر کی صوابدید سے وابستہ ہے وہ حالات کے مطابق خراج کی تعیین کرے گا۔

امیرالمومنین نے اپنے دور میں خراج کی تحدید اور جمع آوری کا بندوبست کیا مگر حضرت کی نظر خراج سے زیادہ زمین کی آبادی پر تھی تاکہ رعایا مالی اعتبار سے فارغ البال ہو اور خراج کے بار کے نیچے دب کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ مالک اشتر کو ہدایات دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا کیونکہ خراج بھی تو زمین کی آبادی سے حاصل ہوتا ہے اور جو آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے وہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے اور اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی"۔ حضرت خراج کی وصولی کے سلسلے میں سختی برتنے کے خلاف تھے اور اپنے کارندوں کو تاکید کرتے تھے کہ وہ خراج کی وصولی میں اپنا رویہ نرم رکھیں اور کسی پر جبر و تشدد نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے بنی ثقیف کے ایک شخص کو قادسیہ اور کوفہ کے بعض علاقوں میں وصولیٔ خراج کے لئے نامزد کیا تو اس سے فرمایا:۔

ایاك ان تضرب مسلما او	خبردار خراج کے درہموں کی خاطر کسی مسلمان
یهودیا او نصرانیا فی درهم	یہودی یا نصرانی کو اذیت نہ دینا نہ درہموں کے
خراج او تبیع دابة عمل فی	لئے کھیتی باڑی میں کام آنے والے چوپائے

دِرھمٍ فانما امرنا ان ناخذ منھم العفو۔ فروخت کرنا۔ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جوان کے پاس ضرورت سے زائد ہو وہ لیں۔"

(بحار۔ ج ۹۔ صہ ۵۳۳)

حضرت نے خراج کی رقم بہت معمولی تجویز کی تھی جو کسی پر بار نہ تھی۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں تحریر کیا ہے کہ مصعب ابن یزید نے بیان کیا کہ حضرت نے میرے والد کو فرات سے سیراب ہونے والے علاقہ میں خراج کی وصولی پر مامور فرمایا جس کی شرح یہ تھی :۔ گندم کی کاشت پر اگر فصل گھنی ہو تو فی جریب (بیگھہ) ۱½ درہم اور تین سیر غلّہ اگر درمیانی ہو تو ایک درہم اور اگر ادنیٰ ہو تو ½ درہم اور جَو پر اس کا آدھا خراج تھا۔ باغات جن میں خرما اور دوسرے پھل دار درخت ہوں فی جریب ۱۰ درہم اور انگور کی بیلیں جب چوتھے سال میں داخل ہوں تو فی جریب ۱۰ درہم۔ اور کھیرا، سبزی، ترکاری، تل، روئی اور اکے دکے پھلدار درختوں پر خراج نہ تھا۔

نظام جزیہ

اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے دوش بدوش یہود نصاریٰ اور مجوس کو بھی تمام شہری حقوق حاصل ہوں گے بشرطیکہ وہ رعایا بن کر رہنا پسند کریں اور مملکت کے وفادار رہیں نہ دشمنانِ اسلام کے معاون و مددگار ہوں اور نہ اسلام کے خلاف جنگی عزائم رکھتے ہوں۔ اس صورت میں اُن سے حسن معاملت سے پیش آیا جائے گا اور حکومت ان کی جان و مال اور ناموس کے تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔ وہ اپنے مذہب و عقیدہ پر باقی رہنے اور مذہبی مراسم کے بجالانے میں آزاد ہوں گے۔ البتہ جدید عبادت گاہیں تعمیر کرنے ناقوس بجانے محرمات سے نکاح کرنے شراب پینے اور خنزیر کا گوشت کھانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

اگر کسی نظریاتی ریاست میں کسی جماعت کے حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں تو اس پر کچھ فرائض بھی عائد ہوں گے۔ چنانچہ ان معاشی و معاشرتی حقوق کے عوض ملکی قوانین کی پابندی کے علاوہ ایک جزوی ٹیکس بھی عاید ہوتا ہے جس کا نام جزیہ ہے۔ یہ لفظ جزاء سے ماخوذ ہے جس کے معنی بدلہ و عوض کے ہیں۔ یا فارسی لفظ گزیدہ و گزیہ کی عربی شکل ہے۔ اس جزیہ سے رفاہی و دفاعی امور انجام دیئے جاتے ہیں جس سے مسلم و غیر مسلم یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں اس اعتبار سے یہ غیر مسلم پر ناروا بار نہ ہوگا جب کہ ان کا مفاد بھی اس سے وابستہ ہے اس کی مقدار بھی خراج کی طرح معین نہیں ہے بلکہ جیسے حالات ہوں گے ولی امر ان کے مطابق جزیہ کی رقم تجویز کرے گا۔ امیرالمومنین کے دورِ خلافت میں جزیہ کی شرح یہ تھی :۔ امرائے

۴۸ درہم متوسط طبقہ سے ۲۴ درہم اور عوام سے ۱۲ درہم سالانہ۔ اور بچوں، بوڑھوں، اندھوں، دیوانوں، مفلسوں اپاہجوں، عورتوں اور راہبوں کو جزیہ کی چھوٹ تھی۔

شہریت

انسانی زندگی اجتماعیت سے وابستہ ہے اور اجتماعی زندگی میں افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایکدوسرے سے مرتبط ہوتے ہیں۔ اس ربط ووابستگی کے نتیجہ میں کنبہ خاندان اور برادری کی وحدتیں وجود میں آتی ہیں اور یہی وحدتیں مل کر بستیاں بساتی اور شہر آباد کرتی ہیں۔ اس اجتماعی زندگی میں انسانی افتادِ طبع کی بنا پر حسد و رقابت، بغض و نفرت اور مسابقت و مزاحمت کے جذبات کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ تصادم ٹکراؤ اور باہمی آویزش ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان جذبات کو متوازن سطح پر رکھنے کے لئے کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تاکہ انسان جذبات کی طغیانیوں میں بہہ کر مردم آزاری دغا و فریب اور جنگ و جدل پر نہ اُتر آئے اور ان پابندیوں کو توڑ کر اجتماعی زندگی کے شیرازہ کو درہم برہم نہ کرے۔ انہی معاشرتی حدود و قیود کا نام شہریت ہے جو معاشرتی علوم کی ایک شاخ اور اپنی اہمیت وافادیت کی بنا پر تدریسی نصاب میں جگہ حاصل کر چکی ہے۔

اس شہریت اور اجتماعی زندگی کا اولین اصول یہ ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھا اور اُن کا احترام کیا جائے ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت اور تعاون سازی کی فضا پیدا کی جائے تاکہ اس یکجہتی و ہم آہنگی سے اجتماعی مفادات حاصل کئے جا سکیں اور ایک معیاری معاشرہ تشکیل دیا جا سکے۔ اس شہریت کا تصور اس وقت تک عملی صورت اختیار نہیں کر سکتا جب تک معاشرہ کے افراد اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس نہ کریں اور ہر فرد ملنے جلنے اور رہنے سہنے کا ڈھنگ نہ سیکھے اس طرح کہ ہمسایہ، ہمسایہ سے ہم پیشہ، ہم پیشہ سے، مالک مزدور سے تاجر خریدار سے حاکم ماتحت سے کس طرح پیش آئے اور کن اخلاقی قدروں کو ملحوظ رکھے کہ وہ معاشرہ میں ایک اہم اور مثالی فرد ثابت ہو سکے۔ ایک اچھے اور معیاری شہری کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی نفع رسانی کے لئے اپنی تمام توانیں وقف کر دے۔ قوم و ملت کی خدمت کو اپنا شعار اور حق وانصاف کو اپنا دستور بنائے۔ مظلوم وستم زدہ کی مدد کرے اور کوئی امداد کے لئے پکارے تو اس سے پہلو بچا کر نہ نکل جائے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:-

من سمع رجلا ینادی للمسلمین   کوئی شخص "اے مسلمانو" کہہ کر مدد کے لئے پکارے

فلم یجبه فلیس بسلم۔ اور سننے والا اس کی آواز پر لبیک نہ کہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔"

اسی احساس شہریت کا نتیجہ ہے کہ جماعتی تنظیموں اور رفاہی و اصلاحی اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے تاکہ عوام کو ان سے فائدہ پہنچے۔ اور شہریت کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان صرف اپنے ہی مفاد پر نظر نہ رکھے بلکہ جماعتی مصالح اور اجتماعی مفادات کو بھی اتنی ہی اہمیت دے جتنی اہمیت اپنے کاموں کو دیتا ہے پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:۔

من لم یھتم بامور المسلمین فلیس بسلم۔ جو مسلمانوں کے معاملات کو اہمیت نہ دے، وہ مسلمان نہیں ہے۔"

عبادت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

مختلف ممالک نے جو شہریت کے اصول وضع کئے ہیں اگرچہ عمومی مفاد سب میں قدر مشترک ہے مگر ملکی روایات اور مقامی رسم و رواج کی بناء پر محدود اور قومیت و وطنیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر اسلام جو رنگ و نسل اور ملک و قوم کی سطح سے بلند تر اور عالمی فلاح و بہبود کا پیغامبر ہے اور تمام بنی نوع انسان کو مرکز وحدت سے وابستہ کر کے ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کرنا چاہتا ہے اس نے عالمی و آفاقی اساس پر قومیت کی بنیاد رکھی ہے جس میں نہ رنگ کا امتیاز ہے اور نہ نسل کی تفریق۔ نہ محدود قومیت کا تصوّر ہے اور نہ جغرافیائی حد بندی بلکہ

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اسلامی نقطہ سے شہریت کے جو اصول و قوانین بیان کئے گئے ہیں وہ کسی خاص سرزمین یا کسی خاص مملکت تک محدود نہیں ہیں بلکہ زمان و مکان کے اعتبار سے عام و ہمہ گیر ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین نے جو اسلام کی زبان اور اسلامی معارف کا سرچشمہ تھے اپنے کلمات حکیمہ میں شہریت کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے یہ ہماری غفلت یا احساس کمتری کا نتیجہ ہے کہ جب اس "حکیم عرب" کی آواز گونجی تو گراں گوش بنے رہے اور جب اس کی صدائے بازگشت مغرب سے سنی تو ہمہ تن گوش ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ مفکرین عالم نے اس سلسلہ میں جو اصول و قواعد ترتیب دیئے ہیں ان میں سے کوئی ضابطہ ایسا نہ ہو گا جس سے معاشرہ کی اصلاح وابستہ ہو اور حضرت نے اسے بیان نہ کر دیا ہو۔ ان اصول و ضوابط کی چند دفعات مشتے نمونہ از خروارے درج کی جاتی ہیں۔

(۱) معاشرتی بہبود کا بنیادی عنصر عدل و انصاف ہے جس سے کمزور و طاقت ور میں ایک متوازن

حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ طاقتور احتساب کے ڈر سے کمزور پر ظلم ڈھانے میں جری و بیباک نہ ہوگا اور کمزور کو ڈھارس ہوگی کہ اگر قوی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا تو قانونِ عدل اس کی سپر بن جائے گا اس لئے جس معاشرہ میں عدل کارفرما ہوگا وہاں امن سایہ فگن رہے گا اور جہاں ظلم ہوگا وہاں غیظ و غضب کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں اور جب بھڑک اٹھتی ہیں تو زلزلہ فگن دھماکوں سے پورا قصرِ ظلم و استبداد ہل جاتا ہے امیر المومنین کا ارشاد ہے "عدل کی روش پر چلو اور ظلم و بے راہ روی سے کنارہ کش رہو کیونکہ بے راہ روی کے نتیجہ میں گھر بار چھوڑنا پڑے گا اور ظلم تلوار اٹھانے کی دعوت دے گا۔

(۲) شہریت کا تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کیا جائے اور جیسا برتاؤ اپنے لئے چاہتے ہو ویسا برتاؤ دوسروں کے ساتھ کرو۔ حضرت کا ارشاد ہے:" جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہو، وہی دوسروں کے لئے پسند کرو اور جس چیز کو اوروں کے لئے ناپسند کرتے ہو اس سے خود بھی پرہیز کرو۔

(۳) تفاخر اور تفوق پسندی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ فخر و غرور سے دوسروں کے دلوں میں بغض و تنفر کے جذبات ابھر آتے ہیں جو باہمی روابط و تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں: اکبر الفخران لا تفخر "سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ فخر نہ کرو۔" اس لئے کہ فخر احساس کمتری کا نتیجہ ہوتا ہے اور بلند نفس انسان زبانی دعووں کے بجائے اپنے عمل سے بلند نفسی و عالی ظرفی کا ثبوت دیتا ہے۔

(۴) کمزور و پس ماندہ افراد سے ہمدردانہ برتاؤ کیا جائے۔ حضرت کا ارشاد ہے:" اپنے کمزوروں سے ہمدردی کرو۔ یہ ہمدردی تمہارے لئے اللہ کی رحمت کا باعث ہوگی۔"

(۵) اگر کسی کے بارے میں کوئی بُری بات سنو یا دیکھو تو اس کا ڈھنڈورہ نہ پیٹو۔ حضرت فرماتے ہیں:۔ "جس نے کسی بری بات کو سنا اور اسے ظاہر کیا تو ایسا ہی ہے جیسے وُہ خود بُرائی کا مرتکب ہُوا ہو۔

(۶) کسی کی خوشحالی کے بعد معاشی بدحالی پر خوش نہ ہونا چاہیئے۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "کسی کی تباہ حالی پر خوش نہ ہو کیا معلوم کہ کل زمانہ تمہارے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرے۔"

(۷) جہاں تک ہو سکے لڑائی جھگڑا مول نہ لو۔ حضرت فرماتے ہیں:۔" جو شخص اپنی عزت و ناموس کو محفوظ رکھنا چاہے اسے لڑائی جھگڑے سے کنارہ کش رہنا چاہیئے۔"

(۸) ہر موقع پر بے اعتمادی کا اظہار نہ کرو کیونکہ باہمی اعتماد ہی پر معاشرتی زندگی کا انحصار ہے:۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔" من لم یثق لم یوثق بہ۔ جو دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔"

(۹) دوستی و تعلقات کی بناء پر کسی کے حق کو نظر انداز نہ کرو۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔" باہمی روابط کی

بنا پر کسی بھائی کی حق تلفی نہ کرو۔ کیونکہ وہ پھر بھائی کہاں ہے جس کا حق تم تلف کرو۔"

(۱۰) حاجتمند سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ۔ حضرت کا ارشاد ہے "اگر کسی موقع پر لوگوں کو تمہاری احتیاج ہو تو ان سے عجز و انکسار اور خندہ جبینی سے پیش آؤ ہو سکتا ہے کہ کل تمہیں کوئی حاجت لے کر ان کے پاس جانا پڑے تو تمہیں اپنے طرز عمل پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

(۱۱) اسلام کے اہم فرائض میں سے ایک فریضہ نہی عن المنکر کا ہے۔ یعنی جہاں کوئی برائی ہوتے ہوئے دیکھو اس سے چشم پوشی نہ کرو بلکہ امکانی حد تک اس سے روکنے کی کوشش کرو۔ اگر اس پر عملدرآمد کیا جائے تو بہت سی کھلم کھلا اور علانیہ برائیوں کا سدباب ہو سکتا ہے کیونکہ خود یہ خیال برائی سے مانع ہوگا کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا ہے۔ اگر کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ ہو تو برائیوں کو نشوونما پانے کا موقع ملے گا اور معاشرہ اخلاقی اعتبار سے پستی کی آخری حدوں تک پہنچ جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "جو شخص نہ زبان سے نہ ہاتھ سے اور نہ دل سے برائی کی روک تھام کرتا ہے وہ زندوں میں چلتی پھرتی لاش ہے"

امیرالمومنین صرف زبانی پندو موعظت ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ عملاً ہر معاشرتی برائی کو کچلنے کے لئے آمادہ رہتے تھے کوئی گری ہوئی بات سنتے یا کہیں لڑائی جھگڑا یا اللہ کی نافرمانی ہوتے دیکھتے تو فوراً اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ اگر سرزنش کی ضرورت ہوتی تو سرزنش کرتے اور سزا کی ضرورت ہوتی تو سزا دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے شکایت کی کہ فلاں شخص مجھے یہ کہہ کر تنگ کرتا ہے کہ میں تمہاری ماں سے محتلم ہوا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ تقاضائے عدل تو یہ ہے کہ اسے دھوپ میں کھڑا کر کے اس کے سایہ پر تازیانے لگائے جائیں کیونکہ خواب سایہ کے مانند ہے مگر ہم اسے سزا دیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل نہ کرے۔ چنانچہ اُسے سزا دی گئی۔ ایک دفعہ دو آدمیوں کو جھگڑتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ تم کیوں ایک دوسرے سے اُلجھ رہے ہو؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ یا امیرالمومنین میں نے اس کے ہاتھ ایک پارچہ نو درہم میں بیچا ہے۔ اور اس سے یہ شرط کی تھی کہ قیمت کھرے اور معیاری درہموں میں ادا کرے مگر اس نے خراب اور ٹوٹے پھوٹے درہم مجھے دینا چاہے۔ میں نے ان سکّوں کے لینے سے انکار کیا تو اس نے مجھے طمانچہ دے مارا اور سر بازار میری ہتک و تذلیل کی۔ حضرت نے اس واقعہ کی تصدیق کی جب تصدیق ہوگئی تو آپ نے دوسرے شخص سے کہا کہ تم بھی اسے طمانچہ کے عوض طمانچہ مارو اس نے کہا کہ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ حضرت عفو و درگزر کو دوست رکھتے تھے اس درگزر پر خوش ہوئے اور فرمایا کہ تمہیں اس کا اختیار ہے چاہے بدلہ لو چاہے چھوڑ دو۔

اس فیصلہ پر معاملہ کو ختم ہونا چاہیئے تھا کیونکہ صاحب حق نے خود اپنا حق چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس

حق کے علاوہ ایک حق اور بھی تھا اور وہ اجتماعی و معاشرتی حق تھا جس کا تقاضہ یہ تھا کہ حکومت ایسے بد اطوار لوگوں کو سزا دے تاکہ آئندہ انہیں مردم آزاری کی جرأت نہ ہو۔ حضرت کی نظروں سے یہ حق اوجھل نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ آپ نے اسے بدعہدی و ایذارسانی کی پاداش میں پندرہ کوڑوں کی سزا دی۔

معاشرتی خرابیوں میں سے یہ خرابی عام ہو چکی ہے کہ سر بازار چوسر شطرنج پانسہ وغیرہ کھیل کھیلے جاتے ہیں اور انہیں ایک طرح کا تفریحی مشغلہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ چیزیں میسر میں داخل ہیں جنہیں قرآن نے ناپاک اور عمل شیطان کہا ہے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے :۔ الشطرنج والنرد بهما الميسر "شطرنج، پانسہ میسر ہی تو ہیں"۔ جب نئی پود بڑوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھتی ہے تو وہ بھی ان کی روش پر چل نکلتی ہے اور ضیاع وقت کے ساتھ قمار بازی کی راہ پر چل کر مالی و اخلاقی تباہی کا سامان کرتی ہے۔ حضرت معاشرہ کی تطہیر کے لئے اس قسم کے کھیلوں کو بھی قابلِ سزا سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ لوگوں کو شطرنج کھیلتے دیکھ لیا فرمایا یہ کیسے مہرے ہیں جن کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہو پھر بساط الٹ دی اور انہیں دھوپ میں کھڑا کر کے سزا دی۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں تحریر کیا ہے کہ حضرت نے ایک مرتبہ کوفہ کے باہر چند مکانوں پر مشتمل ایک آبادی دیکھی پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے بتایا گیا کہ یہ کوفہ ہی کا ایک محلہ ہے جو زرارہ ابن یزید کے نام پر زرارہ کہلاتا ہے۔ یہاں شراب کشید کی جاتی ہے اور فروخت ہوتی ہے۔ حضرت فرات کو عبور کر کے اس بستی میں پہنچے اور حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے چنانچہ اسے جلا دیا گیا۔

معاشرتی زندگی کی اصلاح افراد کی اصلاح ہی پر منحصر ہوتی ہے۔ انہی کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے اور انہی کے بگڑنے سے بگڑتا ہے۔ افراد معاشرہ کے اجزاء ہوتے ہیں اور جس طرح اعضاء سے ترکیب پا کر جسم بنتا ہے یونہی افراد کے باہمی ارتباط سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اگر اجزائے بدن میں سے ایک جزو کا بگاڑ پورے جسم کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے تو چند افراد کے بگاڑ سے قومی و اجتماعی زندگی کے خط و خال بھی بگڑ سکتے ہیں۔ پیش کردہ واقعات سے ظاہر ہے کہ حضرت افراد کی ذہنی و عملی تبدیلی ہی کے ذریعہ معاشرہ میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی اخلاقی حالت کا جائزہ لیتے سختی سے محاسبہ کرتے اور معاشرتی اصولوں کا انہیں پابند بناتے۔ بیشک نرمی و درگزر ایک عمدہ صفت ہے۔ مگر جہاں نرمی معاشرتی تخریب کا باعث ہو وہاں نرمی برتنا تخریب کاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

کاروباری طبقہ کی نگرانی

اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شخص اپنے زیرِ تربیت افراد کی اخلاقی نگہداشت کا ذمہ دار ہوتا ہے وہ باپ ہو یا بزرگِ خاندان، مربی ہو یا معلم وہ اپنے متعلقہ افراد کے بارے میں جواب دہ ہے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔

"تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔"

جب ہر فرد اپنے کنبہ و خاندان اور زیر تربیت افراد کے بارے میں جواب دہ ہے تو جو امت کا نگران اور ملت کا سربراہ ہو وہ کیونکر مسئولیت سے بالاتر ہو سکتا ہے یقیناً وہ بھی ملت کی نگہبانی اور اس کی اخلاقی نگرانی کا ذمہ دار ہوگا۔ اس ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام کارندوں پر چھوڑ کر مطمئن اور آسودہ خاطر ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ براہِ راست رعایا کے عادات و اطوار کا جائزہ لے اور ان کے طریقِ کار کو دیکھے بھالے۔ یہ کام ایوانِ حکومت کے سراپردوں میں رہ کر انجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ عوام میں گھل مل کر رہا جائے اور ان پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔

امیر المومنین کا طرزِ عمل یہ تھا کہ خود بنفس نفیس سیدھے سادے لباس میں کبھی چھپ کر اور کبھی علانیہ گلی کوچوں اور بازاروں میں چکر لگاتے، تاجروں اور دستکاروں سے چیزوں کے بھاؤ پوچھتے اور ایک معلم اخلاقیات کی حیثیت سے مناسب ہدایات دیتے دیانتداری اور خوش معاملگی کی تاکید کرتے۔ بے اعتدالی بددیانتی اور ناپ تول میں کمی بیشی سے روکتے اور انہیں جھنجھوڑنے کے لئے یہ آیت تلاوت فرماتے:۔

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين۔

"یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو دنیا میں نہ بلندی چاہتے ہیں، نہ فساد پھیلاتے ہیں اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے۔"

ایک دفعہ ایک قصاب کی دکان کی طرف سے گزرے تو ایک کنیز کو دیکھا جو دکاندار سے کہہ رہی تھی کہ کچھ تو اور دو۔ حضرت نے سنا تو فرمایا: زدها فانه اعظم للبركة۔ ہاں کچھ زیادہ دو یہ

چیز بڑی باعثِ برکت ہے۔"

ایک مرتبہ بازار سے گزرتے ہوئے ایک درزی کی دکان پر کھڑے ہو گئے اور اس سے فرمایا تاگا مضبوط استعمال کرو۔ سلائی باریک رکھو اور ٹانکا دوسرے ٹانکے سے ملا کر بھرو۔ اور سلائی کے بعد جو ٹکڑے بچ رہیں وہ مالک کے حوالے کرو۔ میں نے پیغمبر اکرمؐ کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن کپڑے میں خیانت کرنے والے کو اس طرح لایا جائے گا کہ خیانت سے حاصل کئے ہوئے پارچے اس پر لدے ہوئے ہوں گے۔

ابن اثیر نے البدایہ والنہایہ میں تحریر کیا ہے کہ ابو مطر بصری بیان کرتا ہے کہ میں مسجد کوفہ سے باہر نکل رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی کہ چادر کا کنارا اوپر اٹھا کر چلو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک بادیہ نشین عرب ہاتھ میں دُرّہ لئے ایک چادر باندھے اور ایک چادر اوڑھے ہوئے آ رہا ہے۔ یہ سادگی اتنی پُر عظمت تھی کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ کون ہے اس نے کہا کہ تم نو وارد معلوم ہوتے ہو کہا کہ ہاں میں بصرہ کا رہنے والا ہوں اور وہیں سے آ رہا ہوں۔ کہا کہ اسی لئے تم نے پہچانا نہیں یہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب ہیں یہ سن کر میں لرز اٹھا اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف ہٹا اور آپ کے عقب میں چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ آگے بڑھ کر سودا سلف بیچنے والوں کے پاس کھڑے ہو گئے اور ان سے فرمایا:۔ بیعوا ولا تحلفوا فان الیمین تنفق السلعة و تمحق البرکة۔ "بیچو مگر قسمیں کھا کر نہ بیچو کیونکہ قسم کھانے سے برکت اٹھ جاتی ہے اگرچہ مال بک جاتا ہے۔" پھر خرما فروشوں کے بازار کا رُخ کیا وہاں پہ ایک کنیز کو روتے دیکھ کر ٹھہر گئے اور اس سے رونے کی وجہ پوچھی اس نے کہا کہ میں نے اس دکاندار سے ایک درہم کی کھجوریں خریدی تھیں میرے مالک نے ناپسند کیں اور کہا کہ انہیں واپس کر آؤ مگر یہ واپس نہیں لیتا۔ حضرت نے اس دکاندار سے کہا کہ یہ کنیز ہے اور مجبور، تم یہ کھجوریں واپس لے لو۔ اس نے انکار کیا تو میں نے کہا کہ اے شخص پہچانتے ہو کہ تمہیں کون کہہ رہا ہے یہ امیر المومنین ہیں یہ سننا تھا کہ اس نے فوراً کھجوریں لے لیں اور درہم کنیز کو واپس کر دیا۔ پھر حضرت نے دکانداروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔ اطعموا المساکین یربو کسبکم۔ "مسکینوں کو کھانے کے لئے دو تمہارے کاروبار میں اضافہ ہو گا۔" اس کے بعد مچھلی بیچنے والوں کے بازار میں آئے اور فرمایا خبردار حلال و حرام کا امتیاز کئے بغیر ایسی مچھلی فروخت نہ کرنا جو پانی کے اندر مر گئی ہو۔ پھر آگے بڑھے اور پارچہ فروشوں کے بازار میں آئے اور ایک دوکاندار سے کہا کہ تین درہم تک کا کوئی کرتہ دکھاؤ اس نے حضرت کو پہچان کر آپ کا خیر مقدم کیا مگر آپ نے اس سے کُرتہ نہ خریدا اور ایک دوسری دکان سے تین درہم میں کرتہ خرید فرمایا۔ جب حضرت واپس رحبہ میں تشریف لائے تو ایک شخص آیا اور اس نے ایک درہم پیش کیا پوچھا کہ یہ درہم

کیسا ہے؟ کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے دوکانداروں سے معلوم ہوا کہ آپ میری دکان پر تشریف لے گئے تھے اور میرے لڑکے سے کرتہ خرید کیا ہے۔ وہ آپ کو پہچان نہ سکا اور دو درہم کا کرتہ تین درہم میں آپ کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ وہی درہم ہے جو آپ نے زائد دیا تھا۔ حضرت نے وہ درہم واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ اس نے اپنی مرضی سے بیچا ہے اور میں نے اپنی مرضی سے خریدا ہے اب یہ درہم واپس نہیں لیا جا سکتا۔

امیرالمومنین کا بازار میں آنے کا مقصد ہو سکتا ہے کہ کرتے کی خریداری ہو مگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض نظر انداز نہیں ہونے پاتا۔ اور یہ آپ کا دینی و منصبی فریضہ تھا کہ جہاں نیکی کی کوئی صورت دیکھیں اس کی ترغیب دیں اور جہاں برائی دیکھیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اس سے روکیں چنانچہ ایک شخص کو دامن لٹکا کر چلتے دیکھا تو اسے دامن اٹھا کر چلنے کی ہدایت کی اس لئے کہ یہ انداز پوشش کبر و غرور کی علامت ہے ایک کنیز کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر یہ گوارا نہیں کرتے کہ نظر بچا کر آگے نکل جائیں بلکہ جب تک اس کے آنسو پونچھ نہیں جاتے آگے نہیں بڑھتے۔ اور دکاندار پر حکومت کا رعب بٹھانے کے بجائے اس پر اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں کہ یہ کنیز مجبور و بے بس ہے تم اس کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے بیچا ہوا مال واپس لے لو۔ پھر تاجروں کو اعانتِ فقرا پر ابھارتے ہیں کہ وہ راہِ خدا میں خرچ کریں تاکہ ان کی تجارت پھولے پھلے اور انہیں ہدایت کرتے ہیں کہ وہ حرام چیزیں فروخت کے لئے بازار میں نہ لائیں اس لئے کہ حرام چیزوں کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ جھوٹی سچی قسمیں کھا کر سودا نہ بیچیں اس لئے کہ قسم سچی بھی ہو تو یہ ایک طرح سے اپنی ذات پر بے اعتمادی کا اظہار ہے کیونکہ قسم کھانے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ قسم کے بغیر اس کی بات سچی نہیں سمجھی جا سکتی اور پھر بار بار قسم کھانے سے دوسروں کی نظروں میں بھی ناقابلِ اعتماد ہو جاتا ہے۔ ایک پہچان لینے والے سے کرتا خریدنا پسند نہیں کرتے اس خیال سے کہ اگر وہ قیمت نہ لے یا عام نرخ سے کم لے تو اسے نقصان پہنچے گا اور آپ کسی کے ادنیٰ نقصان کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ اور اس میں یہ درس بھی مضمر ہو سکتا ہے کہ عمال حکومت آپ کے طرز عمل کو دیکھ کر اپنے عہدہ و منصب سے غلط استفادہ نہ کریں اور پھر یہ تعلیم دی کہ بائع و مشتری میں معاملہ طے پا جائے تو کچھ زیادہ بھی دینا پڑ جائے تو اسے نظر انداز کیا جائے تاکہ عزتِ نفس برقرار رہے۔ بشرطیکہ غش و فریب سے کام نہ لیا گیا ہو۔

یتیموں بیواؤں اور ناداروں پر شفقت

اسلام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے اور اعمال صرف نماز، روزہ، حج وغیرہ کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یتیموں بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک بھی اعمال صالحہ کا ایک اہم جزو ہے۔ اگر کوئی شخص مسکینوں اور ناداروں کو فقر و فاقہ میں چھوڑ کر تن پروری میں لگا رہتا ہے تو وہ دین کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا چنانچہ پیغمبر اکرمؐ سے دین کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

الدین التعظیم لامر اللہ و الشفقة علیٰ خلق اللہ

دین نام ہے اوامر الٰہیہ کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت و مہربانی کا۔"

یوں تو ہر مسلمان کا اسلامی و انسانی فرض ہے کہ وہ حسب استطاعت خلقِ خدا اور معاشرہ کے بے بال و پر اور شکستہ حال افراد کی خبر گیری کرے مگر رئیس مملکت پر اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے افراد کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کرے ان کی ضروریات پر نظر رکھے بے سہارا لوگوں کی طرف دستِ تعاون بڑھائے۔ یتیموں کی کفالت کرے اور ان سے شفقت و محبت کا ویسا ہی برتاؤ کرے جیسا برتاؤ ایک شفیق باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے۔

امیر المومنین کا دل محبت و شفقت کے جذبات سے معمور تھا۔ جب کسی مفلوک الحال کو دیکھتے تو تڑپ اٹھتے کسی بے نوا کی صدا سنتے تو بے چین ہو جاتے اور یتیموں سے اس طرح پیش آتے کہ انہیں یتیمی کا احساس نہ ہونے دیتے۔ ایک مرتبہ حلوان اور ہمدان سے انجیریں اور شہد کے مشکیزے آئے۔ حضرت نے اپنے عملہ کے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ یتیم بچوں کو جمع کر کے لائیں۔ جب بچے جمع ہو گئے تو آپ نے مشکیزوں کے منہ کھول کر ان بچوں کے ہاتھوں میں دے دیئے اور پیالوں میں شہد بھر بھر کر تقسیم کرنا شروع کیا۔ بچے شہد بھی انڈیلتے جاتے تھے اور مشکیزوں کے دہانوں پر لگا ہوا شہد بھی چاٹتے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ان بچوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس طرح شہد چاٹ رہے ہیں اور امیر المومنین انہیں منع بھی نہیں کرتے۔ حضرت نے فرمایا:۔

ان الامام ابو الیتمیٰ و انما العقتهم هذا برعاية الأباء۔

امام یتیموں کا باپ ہوتا ہے اور میں نے اسی پدری تقاضے کی بناء پر انہیں شہد چاٹنے دیا ہے۔"

ایک دفعہ امیر المومنین ایک گلی میں سے ہو کر گزرے تو دیکھا کہ ایک عورت مشکیزہ کاندھے پر

اٹھائے جا رہی ہے حضرت نے ازراہِ ہمدردی مشکیزہ اس سے لے کر خود اٹھا لیا اور اس سے پوچھا کہ تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو باہر کے کام انجام دے کہا کہ امیرالمومنین نے میرے شوہر کو ایک مہم پر بھیجا تھا۔ وہ وہاں شہید ہو گیا اور میرے بچے یتیم رہ گئے۔ میں خود ہی پانی بھرتی اور مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔ حضرت مشکیزہ اس کے گھر پہنچا کر واپس آئے اور تمام رات قلق و اضطراب میں گزاری۔ جب صبح ہوئی تو خورد و نوش کا سامان لے کر اس کے ہاں پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا اس نے پوچھا کہ کون ہے۔ فرمایا کہ کل جو تمہارا مشکیزہ اٹھا کر لایا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا حضرت اندر داخل ہوئے اور کھانے پینے کا سامان اُسے دیا اور فرمایا کہ تم آٹا گوندھو گی یا بچوں کو بہلاؤ گی۔ کہا کہ میں آٹا گوندھتی ہوں اور آپ بچوں کو بہلائیں۔ جب وہ آٹا گوندھ چکی تو کہا کہ اے مرد با خدا اب آپ تنور روشن کریں۔ حضرت نے تنور میں لکڑیاں ڈالیں اور انہیں آگ لگائی جب شعلے بلند ہوئے تو حضرت نے تپش محسوس کی اور فرمایا:۔

ذق یا علی ھذا جزاء من ضیع الارامل والیتمیٰ۔ — اے علی یتیموں اور رانڈوں کی طرف سے بے خبر رہنے کا مزہ چکھو۔

اس اثنا میں محلہ کی ایک عورت آئی اس نے امیرالمومنین کو تنور روشن کرتے دیکھا تو اس عورت سے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم امیرالمومنین سے خدمت لے رہی ہو۔ جب اس نے یہ سنا تو اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا، معذرت کرتے ہوئے حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین میں شرمسار ہوں کہ آپ سے خدمت لیتی رہی ہوں اور آپ کو پہچان نہ سکی۔ حضرت نے فرمایا کہ میں خود نادم ہوں کہ تمہارے بارے میں کوتاہی برتی اور تمہیں اتنے دن تکلیف اٹھانا پڑی ؂

ایں طریق عذر خواہی یادگیر — توبہ ہائے بے گناہی یادگیر

ایک دفعہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت دروازے پر کھڑی رو رہی ہے۔ حضرت نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میرا شوہر مجھ پر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور زد و کوب سے باز نہیں آتا اور آج تو اس نے قسم کھائی ہے کہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ فرمایا کہ ذرا دھوپ کی تپش کم ہونے دو تو میں تمہارے شوہر کو بلا کر سمجھاؤں گا۔ کہا کہ اس وقفہ میں خدا جانے وہ کیا کر بیٹھے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ جب اس کے مکان پر پہنچے تو اسے آواز دی۔ وُہ باہر نکلا تو حضرت نے اس سے کہا کہ اے بندۂ خدا اللہ سے ڈرو اور اپنے اہل خانہ پر ظلم نہ کرو وہ شخص حضرت کو پہچان نہ سکا کہا کہ آپ ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں۔ اگر نہیں ستاتا تھا تو اب ستاؤں گا۔ اتنے میں چند ہمسائے بھی جمع ہو گئے انہوں نے امیرالمومنین کو دیکھا تو اس

شخص سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ گستاخانہ گفتگو کس سے کر رہے ہو۔ یہ امیرالمومنین ہیں، یہ سننا تھا کہ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور لرزتے کانپتے ہوئے عذر خواہ ہوا اور اقرار کیا کہ آئندہ کبھی سختی نہیں کرے گا خواہ اس کی بیوی کی طرف سے کتنی ہی زیادتی کیوں نہ ہو۔ حضرت نے اس عورت کو گھر کے اندر بھجوایا اور اسے نصیحت کی کہ وہ شوہر کی نافرمانی نہ کرے۔

اس خدمت خلق کے ساتھ ضرورت مندوں کو مالی امداد دیتے اپنی ضروریات کو نظرانداز کر کے دوسروں کی حاجت روائی کرتے اور کسی سائل کو اپنے ہاں سے خالی نہ پھراتے۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ایک سائل نے حضرت سے سوال کیا آپ نے امام حسن سے فرمایا کہ گھر سے ایک درہم لا کر اسے دے دو۔ امام حسن نے کہا کہ گھر میں چھ درہم ہیں جو آٹا خریدنے کے لئے ہیں فرمایا کہ مومن کو اپنے ہاں کی چیز سے اللہ کے ہاں کی چیز پر زیادہ اعتماد ہونا چاہئے۔ جاؤ اسے چھ کے چھ درہم لا کر دے دو۔ امام حسن نے وہ درہم سائل کو لا کر دے دیئے۔ ابھی حضرت اپنی جگہ سے اٹھے نہ تھے کہ ایک شخص اونٹ ہنکاتا ہوا آیا حضرت نے پوچھا کہ یہ اونٹ فروخت کے لئے ہے اس نے کہا ہاں حضرت نے وہ اونٹ ایک سو چالیس درہم میں خرید لیا اور ایک ہفتہ کے بعد قیمت ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے دو سو درہم میں وہ اونٹ خرید لیا۔ حضرت نے ایک سو چالیس درہم قرضخواہ کو دیئے اور بقیہ ساٹھ درہم لے کر گھر میں تشریف لائے۔ جناب سیدہ نے درہم دیکھے تو پوچھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ فرمایا کہ اللہ نے چھ درہموں کے بدلے میں ساٹھ درہم دلوائے ہیں اور اس کا وعدہ سچا ہے کہ:۔

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔ — "جو ایک نیکی کرے اسے ویسی دس نیکیاں بدلے میں ملیں گی۔"

غلاموں سے برتاؤ

زمانہ سابق میں دنیا کے ہر گوشہ میں غلاموں کا وجود پایا جاتا تھا اور عرب میں بھی غلامی کا عام رواج تھا۔ اس غلامی کی ابتداء یوں ہوئی کہ طاقتور قبائل اپنی بالادستی منوانے کے لئے کمزوروں اور ناتوانوں پر حملہ آور ہوتے انہیں قتل و غارت کرتے اور بقیۃ السیف کے لئے آزادی کی راہیں بند کر کے انہیں غلام بنا لیتے اور پھر ان کی اولاد موروثی غلام قرار دے لی جاتی۔ رفتہ رفتہ انسانی معاشرہ میں غلاموں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا اور کھیتی باڑی اور دوسرے محنت طلب کاموں کے لئے ان کا وجود ضروری سمجھا جانے

لگا یہاں تک کہ ارسطو و فلاطون ایسے بلند نظر مفکرین نے معاشرتی ارتقار کے لئے ان کا وجود ضروری سمجھا اور آقاؤں کی بالادستی کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ ابتدائے دور غلامی سے انیسویں صدی کے وسط تک غلاموں کا یہ طبقہ اپنے مالکوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتا رہا۔ ان سے سخت سے سخت کام لئے جاتے۔ وزنی پتھر ڈھوتے جنگلوں سے درخت کاٹ کر لاتے کولہو اور ہل میں بیلوں کی جگہ جوتے جاتے اور اس محنت شاقہ کے باوجود نہ انہیں شکم سیر ہو کر کھانے کو دیا جاتا اور نہ پورا تن ڈھانکنے کے لئے لباس میسر ہوتا۔ ذرا سی غلطی یا فروگذاشت پر کوڑوں سے پٹتے شکنجے میں کھینچے جاتے اگر مالک کے ہاتھ سے قتل ہو جاتے۔ تو اس کی داد نہ فریاد اور نہ مالک سے کوئی باز پرس بلکہ رومن دستور میں اگر غلام کو قتل کرتے ہوئے مالک کا ہاتھ کانپ جاتا تو اسے اخلاقی کمزوری اور انتہائی بزدلی سمجھا جاتا۔

اسلام اس غلامی کو مٹا کر انسانی حریت کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی حکمت و مصلحت بینی کا تقاضا یہ تھا کہ غلامی کو یک لخت ختم کرنے کے بجائے رفتہ رفتہ ختم کیا جائے اور اس کے انسداد کے لئے ایسی تدابیر عمل میں لائی جائیں کہ اسلامی معاشرہ بالتدریج اس سے پاک و صاف ہو جائے۔ چنانچہ اسلام نے پہلے تو غلامی کو صرف ان کفار حربی میں محدود کر دیا جو جنگ و قتال کے نتیجہ میں اسیر کر لئے جاتے تھے۔ یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی کیونکہ جو لوگ بغاوت و سرکشی سے امن عامہ کو خطرہ میں ڈال چکے ہوں اُن سے آئندہ بھی مطمئن نہ رہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی بکھری ہوئی طاقت کو مجتمع کر کے پھر سے حملہ آور ہوں اور امن عامہ کو تباہ کریں۔ دنیا کی کوئی بھی حکومت ایسے باغیوں کو کھلی چھٹی نہیں دیا کرتی جو نظم و نسق مملکت کے تباہ کرنے کے درپے ہوں بلکہ ان کے لئے قتل یا حبس دوام کی سزا تجویز کی جاتی ہے۔ اسلام نے قتل یا حبس دوام کے بجائے سلب آزادی کی سزا تجویز کی جو حبس دوام کی ایک نرم صورت ہے۔ اس سلب آزادی میں یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ دشمنان اسلام کو نسلاً بعد نسل غلامی میں جکڑ لئے جانے کا ڈر مسلمانوں کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنے سے مانع ہو اور پھر پیغمبر اکرم نے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی اور بردہ فروشی کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے فرمایا کہ شر الناس من باع الناس۔ بدترین انسان وہ ہے جو بردہ فروشی کرے" کفارہ میں غلاموں کی آزادی کو جگہ دی۔ مصارف زکوٰۃ میں سے ایک صرف غلاموں کی آزادی کو قرار دیا۔ اگر کوئی غلام اندھا یا از کار رفتہ یا کوڑھ میں مبتلا ہو جاتا تو آزاد ہو جاتا۔ اگر کنیز صاحب اولاد ہو جاتی تو مالک کے مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتی اور جو غلامی پہ باقی رہتے ان سے نہ صرف حسن سلوک بلکہ مساویانہ سلوک کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ آنحضرت کا ارشاد ہے۔

البسوھم مما تلبسون واطعموھم — جو خود پہنتے ہو وہ انہیں پہناؤ اور جو خود کھاتے

مما تاکلون۔ (مناقب) ہو وہ انہیں کھانے کو دو۔"

امیرالمومنین غلاموں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی محنت کی کمائی ان کی آزادی اور فلاح و بہبود کے لئے مخصوص کردی اور انہیں آزادی سے بہرہ یاب کرکے اس کا موقع دیا کہ وہ ترقی کے منازل طے کرکے معاشرہ میں بلند مقام حاصل کریں اس لئے کہ ترقی کسی خاص نسل اور رنگ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک آزاد کو جتنا آگے بڑھنے کا حق ہے اتنا ایک غلام کو بھی حق حاصل ہے۔ امام جعفر صادق کا ارشاد ہے:۔

ان امیرالمومنین اعتق الف مملوک من کد یدہ۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام خرید کر آزاد کئے۔"

حضرت صرف غلاموں کی آزادی ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ایسے غلاموں کی کفالت بھی اپنے ذمہ لے لیتے تھے جو کمسنی، بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کاروکسب نہ کرسکتے تھے اور ہمیشہ اُن پر نظر توجہ رکھتے تھے۔ آپ کی شفقت و مرحمت کا یہ عالم تھا کہ انہیں یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی کوتاہی یا سرتابی کی پاداش میں انہیں سزا دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک غلام کو کسی کام کیلئے آواز دی چند بار پکارنے پر جب وہ نہ آیا تو آپ نے باہر جھانکا دیکھا کہ وہ غلام دروازے پر کھڑا ہے فرمایا کہ میں نے تمہیں کتنی بار پکارا ہے کیا تم نے میری آواز نہیں سنی کہا کہ میں اس لئے خاموش رہا کہ مجھے آپ کی طرف سے یہ خطرہ نہ تھا کہ میرے جواب نہ دینے پر آپ مجھے سزا دیں گے۔ حضرت نے یہ سنا تو فرمایا:۔

الحمد للہ الذی جعلنی من تامنہ خلقہ انھض فانت حر لوجہ اللہ۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا قرار دیا جس (کے گزند) سے خلقِ خدا اپنے کو محفوظ سمجھتی ہے۔ اٹھو تم راہِ خدا میں آزاد ہو۔"

حضرت کے ایک غلام قنبر مصری تھے جنہیں آپ انتہائی عزیز رکھتے تھے ایک مرتبہ انہیں لے کر بازار گئے اور فرمایا کہ مجھے ایک پیراہن خریدنا ہے اور تمہیں بھی پیراہن کی ضرورت ہے چنانچہ ایک پارچہ فروش کی دکان سے ایک سستا اور ایک اس سے زیادہ قیمت کا کپڑا خرید کیا اور قنبر سے کہا کہ سستا کپڑا میرے لئے رہنے دو اور قیمتی کپڑا تم لے لو۔ قنبر نے کہا کہ آپ میرے آقا ہیں بہتر ہے کہ اچھا کپڑا آپ پہنیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

انت شاب ولک شرہ الشباب دانا استحی من ربی ان اتفضل

تم جوان ہو اور تم میں جوانی کا ولولہ ہے مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے کہ میں (پوشش میں)

علیک۔ (مناقب) اپنا معیار تم سے بلند رکھوں گا۔"

شاید یہ بات نرالی اور انوکھی نہ سمجھی جائے کہ حضرت نے اپنے دورِ خلافت میں اپنے ایک غلام کے لئے عمدہ لباس پسند کیا کیونکہ دنیا میں فرمانرداؤں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ شان وشکوہ کے مظاہروں کے لئے اپنے غلاموں کو آراستہ و پیراستہ رکھتے تھے۔ چنانچہ شاہی درباروں میں ان کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ان کے جسموں پر زرق برق پوشاکیں سروں پر رنگین صافے کمر میں زرّین پٹکے جن میں موتی ٹنکے ہوئے گلے میں سنہری کنٹھے اور ہاتھ میں طلائی یا نقرئی عصا ہوتے تھے۔ ان فاخرہ ملبوسات سے ظاہری نمود و نمائش کا سامان تو ہو جاتا ہے مگر احساس غلامی ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس خاص طرز کی وضع قطع کو غلامی کا نشان سمجھ کر غلامی کا احساس اور اُبھر آتا ہے اور ہر غلام اس سج دھج کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوگا اور اس کی تمنا یہ ہوگی کہ اسے تن ڈھانکنے کے لئے چیتھڑے ملتے مگر اس کے پیروں میں غلامی کی بوجھل زنجیریں نہ ہوتیں۔ امیرالمومنین جو انسانی نفسیات و احساسات پر نظر غائر رکھتے تھے اس خیال سے کہ قنبر کو یہ احساس نہ ہو کہ انہیں عمدہ لباس غلام نوازی کی بناء پر دیا جارہا ہے یہ کہہ کر ان میں غلامی کا احساس ابھرنے نہیں دیا کہ تم نوجوان ہو اور عمدہ لباس بوڑھوں کے بجائے نوجوانوں کو زیب دیتا ہے اور اس طرح ان کا ذہنی رُخ موڑ کر یہ تاثر دیا کہ سن وسال کے لحاظ سے تو انسان کے طبعی تقاضوں میں فرق ہوسکتا ہے مگر انسان ہونے کے اعتبار سے سب کے احساسات یکساں ہوتے ہیں۔ یہ وہ طرزِ عمل تھا جس نے غلاموں کے قافلے کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، اور ان کے ذہنی شعور کو بیدار کرکے مخفی صلاحیتوں کو روبہ عمل لانے کی تحریک پیدا کی۔ چنانچہ اسی ذہنی نمو و نمود کے نتیجہ میں غلاموں میں کا ایک طبقہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی سعی و کاوش سے تختِ شاہی کی بلندیوں تک پہنچا اور سلطنتوں کا بانی قرار پایا۔

قیدیوں سے برتاؤ

قید و بند کی سزا کا دستور زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور حکومتیں جنہیں مجرم قرار دے لیتی تھیں۔ انہیں قید خانوں میں ڈال دیتی تھیں۔ چنانچہ حضرت یوسف کے زندان میں بند کئے جانے کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے:۔ فلبث فی السجن بضع سنین "یوسف کئی برس تک قید خانہ میں رہے"۔ پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں باغیوں اور جنگی اسیروں کو زیرِ حراست رکھا جاتا تھا آنحضرت کے بعد خلفاء کے دور میں بھی

لوگوں کو قید و بند کی سزا دی جاتی تھی۔ مگر کسی عمارت میں بند رکھنے کے بجائے انہیں کنوؤں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ امیرالمومنین مجرموں کو کنوؤں میں رکھنے کے بجائے قید خانہ میں رکھتے تھے اور اسلام میں سب سے پہلے آپ ہی نے قید خانہ تعمیر کرایا۔ شیخ علاؤالدین نے تحریر کیا ہے:۔

اول من بنی السجن فی الاسلام علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکان الخلفاء یحبسون فی الابار۔ (محاضرۃ الاوائل۔ صفحہ ۱۶۴)

"اسلام میں سب سے پہلے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قید خانہ کی بنیاد رکھی اور خلفاء (قیدیوں کو) کنوؤں میں بند کیا کرتے تھے۔"

حضرت نے پہلے سینٹھوں سے ایک احاطہ کی صورت میں محبس تیار کروایا اور پھر اسے پختہ عمارت کی صورت میں بدل دیا۔ علامہ زمخشری نے تحریر کیا ہے:۔

بنی سجنا من قصب فسماہ نافعا فنقبہ اللصوص ثم بنی سجنا من مدر فسماہ مخیسا۔ (فائق۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۸۸)

"حضرت نے سینٹھوں سے قید خانہ تعمیر کیا اور اس کا نام نافع رکھا اور جب چوروں نے اس میں نقب لگائی تو کنکروں پتھروں سے تعمیر کرایا اور اس کا نام مخیس رکھا۔"

اموی و عباسی دور میں جنہیں قید کی سزا دی جاتی تھی انہیں تہ خانوں میں بند رکھا جاتا تھا نہ کسی کو ان سے ملنے جلنے کی اجازت ہوتی تھی اور نہ انہیں باہر کی دنیا سے باخبر رکھا جاتا تھا ان پر اتنا تشدد کیا جاتا تھا کہ ان سختیوں کو جھیل کر کسی کے زندہ بچ کر نکلنے کی توقع نہ کی جاتی تھی۔

امیرالمومنین کسی کو انتقامی جذبہ کی بناء پر قید کی سزا نہ دیتے تھے بلکہ ایسے لوگوں کو قید میں ڈالتے تھے جو خیانت و غصب کے مرتکب ہوتے اور یتیموں کے اموال کو خورد برد کرتے تھے۔ انہیں قید میں رکھنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ کے لئے ان کی آزادی کو سلب کر کے ان کی مجرمانہ ذہنیت کی اصلاح کی جائے تاکہ معاشرہ میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکیں۔ ان پر صرف اتنی ہی پابندی عائد کی جاتی تھی جتنی پابندی ان کی ذہنی اصلاح کے لئے ضروری سمجھی جاتی۔ انہیں مقررہ اوقات میں باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ نماز کے اوقات میں جیل کے دروازے عمومی طور پر کھول دیئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ اطمینان و سکون سے نماز ادا کر سکیں۔ موسم کے لحاظ سے گرمیوں میں گرمی کا اور سردیوں میں سردی کا لباس انہیں دیا جاتا۔ اگر وہ آسودہ حال ہوتے تو کھانے پینے کا خرچ انہی پر ڈالا جاتا اور غریب و نادار ہوتے تو بیت المال سے اُن کے مخارج ادا کئے جاتے۔

ذمیوں سے برتاؤ

ذمی، اسلامی مملکت کے وہ یہودی، نصرانی اور مجوسی ہیں جو حکومت کو حسب معاہدہ جزیہ ادا کرتے ہیں اور اس کے عوض حکومت ان کے تمام معاشی و معاشرتی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتی ہے اور ان کے اموال و نفوس اسی طرح محترم قرار پا جاتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے اموال و نفوس۔ اور کسی مسلمان کو ان سے جنگ و قتال کرنے، انہیں گزند پہنچانے اور ان کے اموال چھین لینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان ذمیوں کے بارے میں امیرالمومنین کا رویہ نہایت پر شفقت تھا۔ آپ نے ان کے معاشی و معاشرتی حقوق مقرر کئے اور عصبیت و تنگ نظری سے بالاتر رہ کر انہیں مذہبی مراسم کے بجالانے کی پوری آزادی دی۔ نہ مذہبی اختلاف کی بناء پر ان کی تحقیر و تذلیل گوارا کرتے اور نہ اُن پر ظلم و زیادتی کے روادار ہوتے اور اپنے عمال کو بھی ہدایت فرماتے کہ وہ اُن کے حقوق کا لحاظ رکھیں انہیں کسی جائز حق سے محروم نہ کریں اور نہ ان پر تشدد و سختی کریں۔ چنانچہ مالک اشتر کو جو عہد نامہ لکھ کر دیا اس میں تحریر فرمایا:۔

ولا تکن علیھم سبعا ضاریا تغتنم اکلھم فانھم صنفان اما اخ لك فی الدین او نظیر لك فی الخلق۔	ان کے لئے پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ کہ انہیں نگل جانا غنیمت سمجھتے رہو اس لئے کہ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تمہارے دینی بھائی اور دوسرے تمہارے جیسی مخلوق خدا۔"

حضرت کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ آپ ہر انسان کو انسان ہونے کے اعتبار سے ایک سطح پر سمجھتے تھے۔ اور انسانیت کے رشتہ کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی اہمیت مذہبی اتحاد کو دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ عقیدہ و مذہب کے اختلاف کی بناء پر نہ کسی کی حق تلفی کی اور نہ کسی سے نفرت و بددلی کا اظہار کیا۔ اسی حسن سلوک کی بناء پر اہل ذمہ ہمیشہ آپ کے دل سے وفادار رہے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

ما اقول فی رجل تحبه اهل الذمة علی تکذیبھم بالنبوة (مقدمہ ابن ابی الحدید ص۲)	میں اس شخص کے بارے میں کیا کہوں جسے اہل ذمہ دل و جان سے چاہتے تھے حالانکہ وہ (پیغمبر کی) نبوت کی تکذیب کرتے تھے۔"

ایک دفعہ امیرالمومنین کوفہ کی طرف راہ سپار تھے کہ راستے میں ایک ذمی آپ کا ہم سفر ہو گیا اس نے

حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کدھر جائیں گے۔ فرمایا کوفہ۔ کچھ دور تک دونوں ساتھ چلتے رہے۔ جب اس ذمی نے اپنی منزل کی طرف مڑنا چاہا تو حضرت بھی اس کے ساتھ چل دیئے۔ اس نے کہا کہ یہ راستہ تو کوفہ نہیں جاتا اور آپ کو کوفہ جانا ہے۔ فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ راستہ کوفہ کو نہیں جاتا مگر حسن رفاقت اور ہمسفری کا تقاضا یہ ہے کہ میں چند قدم تمہارے ساتھ جاؤں اور تمہیں رخصت کروں اور ہمارے پیغمبر نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ اس نے کہا کیا واقعاً آپ کے پیغمبر کی یہ تعلیم ہے۔ فرمایا ہاں۔ کہا وہ دین بہترین دین ہے۔ جو ایسے اعلیٰ اخلاق کا درس دیتا ہے۔ اب میں آپ کے ہمراہ کوفہ جاؤں گا۔ چنانچہ وہ حضرت کے ہمراہ کوفہ آیا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ امیرالمومنین ہیں تو حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

اوقاف و تعمیرات خیریہ

انسانی اخوت و برادری کا تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف اپنا مفاد ہی پیشِ نظر نہ رکھے بلکہ بنی نوع انسان کی راحت رسانی کا بھی سامان کرے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لے۔ اسلام نے اسی انسانیت عامہ کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے جہاں اعمال و عبادات پر زور دیا ہے۔ وہاں رفاہِ عامہ کے کاموں کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور زکوٰۃ ایسے اہم فریضہ میں ایک مصرف فی سبیل اللہ کا تجویز کیا ہے جو تمام رفاہی امور کو شامل ہے جیسے کنوئیں اور چشمے کھدوانا مسافر خانے اور عبادت گاہیں تعمیر کرنا اور اس قبیل کے دوسرے کام انجام دینا جن سے تمام انسانوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت فائدہ پہنچے۔

امیرالمومنین نے اپنے مختصر دور حکومت میں بغاوت و خانہ جنگی ایسے سنگین مسائل سے دوچار ہونے کے باوجود عوام کی فلاح و بہبود سے چشم پوشی نہیں کی اور پوری تندہی سے رفاہی امور انجام دیتے رہے ابن شہر آشوب نے مناقب میں تحریر کیا ہے کہ امیرالمومنین نے حجاج کے لئے ینبع میں سو چشمے کھودے۔ مدینہ، کوفہ اور بصرہ میں کنوئیں کھدوائے مکہ اور کوفہ کے درمیان سڑک تعمیر کی اور اس پر میلوں کے نشانات نصب کئے ان میلوں پر "ھذا امیل علی" تحریر تھا اور حاجیوں کے لئے راہ میں متعدد کنوئیں کھدوائے۔ ایک کانجی ہاؤس تعمیر کروایا۔ جس میں آوارہ جانوروں کو بند کیا جاتا اور انہیں بیت المال سے اتنا چارہ دیا جاتا کہ وہ نہ کمزور اور دبلے ہونے پائیں اور نہ موٹے تازے۔ اگر کسی جانور کا مالک آتا اور ملکیت کا ثبوت مہیا کرتا تو وہ جانور اسے دے دیا جاتا ورنہ اسے وہیں بند رہنے دیا جاتا۔

حضرت نے اپنے ہاتھ سے متعدد چشمے کھودے باغات لگائے اور انہیں فقرائے مسلمین پر وقف کر دیا۔

چنانچہ حضرت کے ایک آزاد کردہ غلام ابو نیزر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایک مرتبہ اپنی جاگیر عین ابی نیزر اور بغیبغہ پر تشریف لائے۔ میں نے جو روکھا سوکھا کھانا پیش کیا وہ کھایا اوک سے پانی پیا اور پھاوڑہ لے کر گڑھا کھودنا شروع کیا، یہاں تک کہ پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ جب گڑھا کھودتے ہوئے چشمہ پھوٹ نکلا تو فرمایا کہ یہ صدقہ جاریہ ہے اور اپنے ہاتھ سے یہ تحریر قلمبند کی :۔

هذا ما تصدق عبد الله علی امیر المومنین تصدق بالضیعتین بعین ابی نیزر والبغیبغه علی فقراء اهل المدینة وابن السبیل لیقی بهما وجهه حر النار یوم القیامة لا تباعا ولا توهبا حتی یرثها الله وهو خیر الوارثین الا ان یحتاج الیهما الحسن والحسین فهما طلق لهما و لیس لاحد غیرهما۔
(معجم البلدان۔ ج ۱۴۔ ص ۱۷۶)

یہ وہ ہے جسے خدا کے بندے علی امیر المومنین نے صدقہ کیا ہے یہ دونوں جاگیریں عین ابی نیزر اور بغیبغہ فقراء مدینہ اور مسافروں کے لئے صدقہ کی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اپنے چہرے کو قیامت کے دن جہنم کی آنچ سے۔ بچائیں ان دونوں جاگیروں کو نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بازگشت اللہ کی طرف ہو اور وہ بہترین وارث ہے۔ البتہ اگر حسن اور حسین کو ان کی احتیاج و ضرورت ہو تو ان کے لئے کوئی بندش نہیں ہے اور ان کے علاوہ اور کسی کو یہ حق نہیں ہے"

یاقوت حموی نے تحریر کیا ہے کہ امام حسین مقروض ہو گئے۔ تو معاویہ نے عین ابی نیزر کو دو لاکھ دینار میں خریدنا چاہا مگر امام حسین نے یہ کہہ کر بیچنے سے انکار کر دیا کہ میرے پدر بزرگوار نے اسے صدقہ کیا تھا تاکہ جہنم کی آنچ سے اللہ انہیں محفوظ رکھے میں ان دونوں جاگیروں کو کسی پر فروخت نہیں کر سکتا۔

چشمۂ ابی نیزر اور بغیبغہ کے علاوہ ینبع، ارباجا، ارینہ، رغد، رزین اور رباح بھی حضرت کی وقف کردہ جاگیریں تھیں۔

حضرت نے تعمیر مساجد کی طرف بھی خصوصی توجّہ فرمائی۔ مدینہ میں مسجد فتح تعمیر کی اور کوہ احد کے دامن میں حضرت حمزہ کی قبر کے پاس ایک مسجد بنوائی۔ میقات میں ایک مسجد تعمیر کی اور کوفہ، بصرہ اور آبادان میں مسجدیں تعمیر کیں۔ صفین کی طرف جاتے ہوئے جب اقطار میں منزل کی تو وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔

ملکی انتشار اور اس کے وجوہ و اسباب

امیرالمومنین کی بیعت کی ابھی تکمیل بھی نہ ہوئی تھی کہ تخریبی کاروائیاں شروع ہوگئیں اور آپ کے گرد و پیش سازشوں کا ایک جال بن دیا گیا۔ ہر طرف سے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ایک فتنہ کو کچلا جاتا تو دوسرا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا اسے دبایا جاتا تو کسی اور گوشہ سے نیا فتنہ اُبھر آتا یہاں تک کہ آپ کا مختصر دور حکومت انہی الجھنوں کو سلجھانے اور نت نئے فتنوں کو فرو کرنے میں گزر گیا۔ ان فتنوں اور پیہم خانہ جنگیوں کی بنا پر کچھ لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ یہ شورش و بدنظمی سیاسی کمزوری کا نتیجہ تھی اور امیرالمومنین اصول سیاست سے ناواقف اور ملکی نظم و نسق کے قیام سے قاصر تھے۔ بے شک امیرالمومنین کا دور خانہ جنگی و ہنگامہ آرائی کی جولانگاہ بنا رہا اور باہم آویزیوں کی وجہ سے ملکی حدود میں توسیع نہ ہوسکی مگر اس انتشار و پراگندگی کی وجہ سیاسی کمزوری نہ تھی بلکہ یہ نتیجہ تھا ان ناگوار حالات کا جن کی داغ بیل سابقہ حکومتوں میں پڑ چکی تھی اور اب اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ واقعات شاہد ہیں کہ دولت کی فراوانی اقتدار کی محرک ہوتی ہے چنانچہ فتوحات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے اموال غنائم نے ذہنوں کے رُخ خلافت سے ملوکیت کی طرف موڑ دیئے۔ اور ہوس جاہ و اقتدار نے پوری فضا کو مسموم کر کے رکھ دیا اور کوئی گوشہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ اگر یہی حالات کسی اور مدبر و سیاست اندیش کو پیش آتے تو وہ ان ناگزیر نتائج سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکتا جن نتائج سے حضرت دوچار ہوئے بلکہ بعید نہ تھا کہ دشمن کی ستیزہ کاریوں کا مقابلہ نہ کر سکتا اور اس کی طوفانی یلغاروں کے آگے سپر انداختہ ہو جاتا۔

امیرالمومنین مسند خلافت پر اس وقت بیٹھے جب مدینہ شورشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اطراف و جوانب اور دوسرے علاقوں سے انقلاب پسند سمٹ کر مدینہ میں جمع تھے۔ سابقہ عمال، حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ معاویہ شام میں خود مختاری کے خواہاں تھے زبیر کوفہ میں اور طلحہ بصرہ میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان سب نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ہر موڑ اور ہر دوراہے پر رکاوٹیں کھڑی کیں، لشکر کشی کر کے دعوتِ مبارزت دی اور جنگ کے شعلے بھڑکا کر ملکی امن کو تباہ کرنے کی ٹھان لی۔ یہ امیرالمومنین کے سیاسی فہم و تدبر اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا کہ فرائض نظم و نسق کی انجام دہی کے ساتھ ان بغاوتوں کو بھی کچلتے رہے حالانکہ جو لوگ آپ کے پرچم کے نیچے جمع تھے ان میں کی اکثریت نہ ہم رنگ و ہم آہنگ تھی اور نہ اسے حضرت سے خلوص ہی تھا۔ ان مختلف الآراء لوگوں کے خیالات و نظریات میں ہم آہنگی پیدا

کرکے انہیں ایک وحدت بنانا اور انہیں لے کر دشمن کی دل بادل فوجوں سے ٹکرا جانا آسان مرحلہ نہ تھا مگر حضرت انہی مختلف عناصر کو لے کر دشمن سے نبرد آزما ہوئے اور اسے شکست دی اور شامیوں کی شکست بھی یقینی تھی اگر وہ حیلہ و فریب سے حضرت کے لشکر میں پھوٹ نہ ڈلواتے۔ ان معرکوں اور صف آرائیوں کے باوجود حضرت نے جس حد تک ملکی اصلاحات کیں نظم و انضباط قائم کیا اور رعایا کے فلاحی امور پر نظر رکھی وہ آپ کی عظیم سیاسی بصیرت اور نظم و نسق کی اہلیت کا روشن ثبوت ہے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

قد قال بعض المتكلمين من اصحابنا ان سياسة علي عليه السلام اذا تاملها المنصف متدبرا لها بالاضافة الى احواله التي دفع اليها مع اصحابه جرت مجرى المعجزات لصعوبة الامر و تعذره۔
(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲، ص ۱۸۳)

"ہماری جماعت کے بعض متکلمین کا قول ہے کہ اگر کوئی انصاف پسند علی علیہ السلام کی سیاست پر نظر غائر ڈالے اور یہ دیکھے کہ آپ اپنے اصحاب کے ہاتھوں کس صورت حال سے دوچار تھے تو معاملات کی سختی و پیچیدگی کی بناء پر آپ کی سیاست ایک معجزہ سے کم نہ ہو گی۔"

اس ذہنی تبدیلی کے علاوہ مندرجہ ذیل اسباب و عوامل بھی ملکی انتشار و پراگندگی میں کارفرما تھے:۔

پہلا امر یہ تھا کہ حضرت کی سیاست خالص اسلامی سیاست تھی اور آپ کسی صورت میں اخلاقی و اسلامی قدروں کو حکومت و اقتدار پر قربان کرنے کیلئے تیار نہ تھے چہ جائے کہ حیلہ گری و دنیا سازی سے کام لے کر اقتدار کے استحکام کی فکر کرتے یا دورخی سیاست اور چکنی چپڑی باتوں سے اپنا مقصد نکالتے اگر حضرت بھی وہی طریق کار اختیار کرتے جو آپ کے مخالفین نے دیانت کے تقاضوں سے منہ موڑ کر اختیار کیا تھا تو جہاں آپ کو بظاہر ناکامی سے دوچار ہونا پڑا وہاں آپ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے مگر اس صورت میں حضرت کی حکومت ملوکیت قرار پاتی اس خلافت کا عملی نمونہ نہ ہوتی جس میں نہ مکر و فریب کی گنجائش ہے اور نہ عوام فریبی کا دخل ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں ایک طرف اخلاقی آئین اور دینی ضوابط کی پابندیاں راستہ روکے کھڑی ہوں اور دوسری طرف ہر قسم کے مکر و فریب اور الزام تراشی میں باک محسوس نہ کیا جاتا ہو وہاں چیخ چیخ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر فتنہ و شر کو ہوا دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مخالفین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ حضرت اپنے مسلمہ اصولوں میں لچک پیدا نہ ہونے دیں گے آپ کے خلاف ہر

طرح کے سیاسی حربوں سے کام لیا اور آپ کی صاف دلی سے پورا فائدہ اٹھایا۔ احمد حسن الزیات نے تحریر کیا ہے:۔

لا یعرف الھوادۃ فی الدین ولا المرونۃ فی الدنیا فکانت ھذہ الخلال الکریمۃ من انصار معاویۃ الداعیۃ فی الخلاف علیہ۔ (ادب العربی صد ۱۲۴)

حضرت علی دینی معاملات میں لچک اور دنیوی امور میں زمانہ سازی سے آشنا ہی نہ تھے آپ کے یہی بلند عادات و اطوار وُہ تھے جن سے معاویہ ایسے چالاک نے فضا کو آپ کے خلاف کرنے میں مدد لی۔"

دوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت خواص کی دلجوئی کے لئے عوام کے مفاد کو نظر انداز کرنا گوارا نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کے مفاد کو خواص و سربرآوردہ افراد کے مفادات پر ترجیح دیتے تھے اور اپنے عمال کو بھی یہی ہدایت فرماتے تھے۔ چنانچہ مالک اشتر کو تحریر فرمایا:۔ "تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہیئے جو حق کے اعتبار سے بہترین انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بے اثر بنا دیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جا سکتی ہے۔" یہ طرز عمل جاہ طلب و اقتدار پسند طبیعتوں پر شاق گزرا اور انہوں نے اپنا تفوق و امتیاز برقرار رکھنا چاہا اور جب انہیں معاشرہ میں اپنا مقام حاصل ہوتا نظر نہ آیا تو نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کے درپے ہو گئے اور عوام کو اپنے انقلاب آفرین نعروں سے متاثر کر کے ہنگامہ و شورش پر اتر آئے تاکہ ان کی بالادستی اور امتیازی حیثیت برقرار رہے۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ حضرت مساویانہ تقسیم کے اصول پر کاربند تھے۔ اور اعلیٰ و ادنیٰ اور عرب و عجم کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ اس سے اگرچہ عوام اور موالی و اعجام کا طبقہ خوش ہو گیا مگر امتیاز پسند لوگوں کے دلوں میں گرہ پڑ گئی۔ وہ جس طرز عمل کے خوگر ہو چکے تھے اس کے خلاف کسی روش کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ وُہ اس پر سیخ پا ہوئے پرزور احتجاج کیا اور جب ان کی آواز موثر ثابت نہ ہوئی تو شام کا رُخ کر لیا۔ جہاں حضرت کے خلاف سازشوں کی پخت و پز ہوتی تھی۔ فضیل ابن جعدہ کہتے ہیں:۔

آکد الاسباب کان فی تقاعد العرب عن امیر المومنین امر المال فانہ لم یکن یفضل

امیر المومنین سے عرب کی روگردانی کا اصل سبب مال تھا حضرت اعلیٰ کو ادنیٰ پر اور عربی کو عجمی پر ترجیح نہ دیتے

شریفا علی مشروف ولا عربیا علی عجمی ولا یصانع الرؤسا و امراء القبائل کما یصنع الملوك ولا یستمیل احدا الی نفسه وکان معاویة بخلاف ذلك فترك الناس علیا والتحقوا بمعاویة (بحار الانوار - ج ۹ - ص ۵۳۹)

تھے اور نہ حکمرانوں کی طرح امراء و سرداران قبائل کی آؤ بھگت کرتے تھے اور نہ کسی کو اپنی طرف مائل کرتے تھے اور معاویہ کی روش اس کے برعکس تھی اس لئے لوگ علی کو چھوڑ کر معاویہ سے جا ملے۔"

جب امیرالمومنین سے یہ کہا گیا کہ جن لوگوں سے فتنہ برپا کرنے کا اندیشہ ہے یا معاویہ سے وابستہ ہو جانے کا خطرہ ہے انہیں داد و دہش سے روک لیں تو آپ نے فرمایا:۔

اتامرونی ان اطلب النصر بالجور لا واللہ لا افعل ما طلعت شمس وما لاح فی السماء نجم واللہ لو کان مالهم لی لواسیت بینهم وکیف و انما هو اموالهم (مناقب - ج ۲ - ص ۳۳)

کیا تم مجھے اس امر کا پابند کرنا چاہتے ہو کہ بے راہروی سے کچھ لوگوں کی امداد حاصل کروں تو خدا کی قسم جب تک سورج نکلتا اور ستارہ آسمان پر چمکتا رہے گا میں ایسا نہیں کروں گا اگر مسلمانوں کا مال میرا ذاتی مال ہوتا جب بھی میں اسے سب پر برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال انہی کا ہے۔"

امیرالمومنین کی اس سیرت و روش کے مقابلہ میں معاویہ کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ سیاسی مقصد براری کے لئے بے دریغ دولت لٹاتے اور خزانوں کے منہ کھول کر لوگوں کے دین و ایمان کا سودا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جاریہ ابن قدامہ، احنف ابن قیس، جون ابن قتادہ اور حتات مجاشعی معاویہ کے پاس آئے معاویہ نے حتات کو ستر ہزار اور دوسروں کو ایک ایک لاکھ درہم دیئے۔ حتات کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے معاویہ سے کہا کہ تم نے مجھے میرے قبیلہ میں رسوا کرنے کا سامان کیا ہے اوروں کو ایک ایک لاکھ اور مجھے ستر ہزار درہم دیئے ہیں۔ معاویہ نے کہا:۔

انی اشتریت من القوم دینهم۔ (تاریخ کامل - ج ۳ - ص ۲۳۱)

میں نے ان لوگوں سے ان کا دین خرید کیا ہے۔"

حتات نے کہا کہ پھر میرا دین بھی خرید لیجئے۔

اب جہاں یہ صورت ہو کہ درہم و دینار کے بدلے دین و ایمان کا کھلم کھلا سودا ہوتا ہو اور لوگ روپیہ پیسہ کے عوض دین بیچنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں یہ توقع کیونکر کی جا سکتی تھی کہ امیرالمومنین کی مختاط

روش انہیں خوش رکھ سکے گی اور وہ مال و دولت کو ٹھکرا کر محض دینی جذبہ کے زیرِ اثر حق سے وابستہ رہیں گے۔

چوتھا سبب یہ تھا کہ وہ امور جو خلاف شرع ہوتے ہوئے شرعی صورت اختیار کر چکے تھے اور دین کا جزو سمجھے جا رہے تھے۔ حضرت اپنی منصبی ذمہ داری کی بناء پر انہیں شرعی جواز دینے کے لئے تیار نہ تھے اور عوام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جو چیزیں اُن کے ذہنوں میں اتر جاتی ہیں ان سے دستبردار ہونا گوارا نہیں کرتے اور نہ اس کے خلاف کوئی آواز سننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت نے منبر پہ کچھ کہہ دیا تو عبیدۃ السلمانی نے کھڑے ہو کر کہا:۔

رایك مع الجماعة احب الینا من رایك وحدك۔	آپ ایک اکیلے کی رائے سے ہمیں آپ کی وُہ رائے زیادہ پسند ہے جو جماعت کی رائے کے موافق ہو"
(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص۱۸۴)	

اس اختلاف رائے نے بھی انتشار کے اسباب فراہم کئے اور لوگ ایسی بات کو جو ان کے پہلے طرزِ عمل کے خلاف ہوتی لے اڑتے اور لوگوں میں بدظنی پیدا کر کے فتنہ و شر پھیلاتے۔

پانچواں سبب یہ تھا کہ حضرت نے برسرِ اقتدار آتے ہی ان تمام عمال و حکام کی برطرفی کا اعلان کر دیا جو سابقہ حکومتوں کی طرف سے متعین تھے اسکا ردعمل یہ ہوا کہ ان عمال نے ان لوگوں سے جو عہدوں کے امیدوار تھے اور کامیاب نہ ہو سکے تھے گٹھ جوڑ کر کے قصاص خونِ عثمان کی تحریک چلائی اور حضرت کے خلاف محاذ جنگ قائم کر کے ملکی نظم و نسق کو تباہ کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔

ان تمام محرکات فتنہ و انتشار کے باوجود حضرت نے جس حد تک ملکی حالات کو بگڑنے سے بچایا وُہ صرف آپ کی سیاسی بصیرت معاملہ فہمی اور حسنِ تدبر کا نتیجہ تھا ورنہ شورش پسندوں نے تفرقہ و انتشار پھیلانے اور ملکی نظم کو درہم برہم کرنے میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔

عمال حکومت کی برطرفی اور اس کے وجوہ

جب امیرالمومنین برسرِ اقتدار آئے تو مملکت کے صوبوں پر سابقہ حکومت کے ان عمال و حکام کا عمل دخل تھا جنہوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ جس طرح چاہتے رعایا کو ستاتے۔ اور جو چاہتے کر گزرتے تھے نہ مرکز سے باز پرس کا اندیشہ تھا نہ پوچھ گچھ کی فکر۔ مسلمان ان کے مظالم سے تنگ

آئے ہوئے تھے اور استبدادی گرفت میں جکڑے ہوئے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ حضرت نے عنانِ حکومت ہاتھوں میں لیتے ہی انہیں برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دینی سیاست کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان لوگوں کو یک قلم معزول کر دیا جائے۔ جنہوں نے لوٹ کھسوٹ اپنا وتیرہ اور ظلم و تعدی اپنا شیوہ بنا رکھا تھا۔

اس عام معزولی کی بھنک مغیرہ ابن شعبہ کے کانوں میں پڑی تو وہ حضرت کے پاس آیا اور کہا، میں آپ کا ہمدرد و بہی خواہ ہوں اور اس ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کو یہ مشورہ دوں کہ آپ فی الحال معاویہ، عبداللہ ابن عامر اور عہد عثمانی کے دوسرے عمال کو اُن کے عہدوں پر بحال رہنے دیں اور جب وہ بیعت کر کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جائیں تو پھر جیسا چاہیں ویسا قدم اٹھائیں۔ خواہ انہیں بحال رہنے دیں خواہ انہیں برطرف کر دیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری یہ رائے دنیا سازی کے اعتبار سے موزون و مناسب ہے لیکن :۔

واللہ لا اداھن فی دینی و لا اعطی الدنیۃ فی امری۔	خدا کی قسم میں دین میں دو رخی نہیں برتوں گا اور نہ اپنی حکومت میں ذلت و پستی گوارا کروں گا۔"
(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۶۱)	

اب مغیرہ کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی منہ لٹکا کر اٹھ کھڑا ہوا اور واپس چلا آیا۔ اسے اپنے مشورہ کی بے قدری کا احساس تو تھا ہی دوسرے دن پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے کل جو رائے دی وہ صائب نہ تھی۔ مزید غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہیں معزول کر دینا ہی بہتر رہے گا۔ امیرالمومنین ابھی اس "یک بام و دو ہوا" پر حیرت زدہ تھے کہ ابن عباس حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ مغیرہ کس مقصد سے آپ کے ہاں آیا تھا فرمایا کہ وہ مجھے مشورہ دینے کے لئے کل بھی آیا تھا اور آج بھی آیا ہے۔ کل اس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں سابقہ عمال کو برقرار رہنے دوں اور ان میں کوئی رد و بدل نہ کروں اور آج یہ رائے دی ہے کہ میں انہیں معزول کر دوں۔ ابن عباس نے کہا کہ اس نے جو رائے کل دی تھی اس میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اور آج کی رائے کل کی رائے کے ٹھکرائے جانے کا ردعمل اور مکر و فریب پر مبنی ہے۔ میں اس کی پہلی رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ ابھی معاویہ کو ان کے عہدہ پر بحال رہنے دیں اور جب وہ بیعت کر کے اطاعت کا اقرار کر لیں تو انہیں برطرف کر دیں۔ حضرت نے فرمایا :۔

ان اقررت معاویۃ ما فی یدہ کنت متخذ المضلین عضدا۔	اگر میں معاویہ کو اس کے عہدہ پر باقی رہنے دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں گمراہ کرنے

والوں کو اپنا دست و بازو بنا رہا ہوں۔ (استیعاب۔ ج ۳۔ ص۲۵۹)

اسی طرح زیاد ابن حنظلہ تمیمی نے بھی کچھ ایسا ہی مشورہ دیا مگر حضرت نے ان مشوروں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور ان مشیروں کی رائے کے خلاف اپنی اصابت رائے پر بھروسا کرتے ہوئے انہیں یک لخت معزول کرنے کا مشورہ بحال رکھا۔

بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اگر حضرت ان مشیروں کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتے اور ان کے تجربہ معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھاتے تو ان الجھنوں میں گرفتار نہ ہوتے جن الجھنوں سے انہیں دو چار ہونا پڑا اور جن خانہ جنگیوں میں ان کا دورِ خلافت گزرا اس کی نوبت نہ آتی مگر یہ صرف ناپختہ ذہنوں کی خام خیالی ہے۔ اگر حضرت ان کے مشوروں پر چلتے اور عمال کو ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیتے جب بھی الجھنوں اور پریشانیوں سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا اور مملکت کو اُن کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ رکھا جا سکتا تھا اس لئے کہ یہ عمال صرف معزولی کی بناء پر آمادۂ مخالفت نہ ہوئے تھے بلکہ پہلے سے مخالف چلے آ رہے تھے۔ اگر انہیں عہدوں پر باقی رہنے بھی دیا جاتا جب بھی حکومت اور ان کے درمیان ذہنی تصادم اور نظریاتی ٹکراؤ رہتا اور وہ حکومت کو اپنے مادی اغراض کی راہ میں حائل سمجھ کر اس کے خلاف اندر ہی اندر سازشوں کے جال بچھاتے امورِ مملکت میں رخنہ انداز ہوتے اور حضرت کے لئے مسلسل پریشانی و دردسری کا باعث بنے رہتے۔ جب بحالی و برطرفی دونوں صورتوں میں پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا سامنا تھا تو آپ کی شرعی ذمہ داریوں کا تقاضا یہی تھا کہ اسی صورت کو اختیار کرتے جو دینی قدروں اور اسلامی تقاضوں سے موافقت رکھتی ہو خواہ اس کے لئے کتنی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا اور تیز آندھیوں اور طوفانوں سے ٹکرانا پڑتا۔ چنانچہ اس معزولی کے چند وجوہ یہ تھے۔ جن سے اس اقدام کے حق بجانب اور دینی سیاست سے ہم آہنگ ہونے پر ثبوت لایا جا سکتا ہے۔

اولاً یہ کہ امیرالمومنین کا مقصد اولین اسلامی حکومت کا قیام اور دینی نظام کا نفاذ تھا۔ اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری تھا کہ خود غرضی مفاد پرستی اور زر اندوزی کی راہیں بند کر کے معاشرہ کی تطہیر کی جائے اور جو غلط سیاست ملک پر چھائی ہوئی تھی اس کا پورا ڈھانچا بدل دیا جائے اور یہ مقصد صرف مسند خلافت کے خالی ہونے سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ جب تک ان عاملوں کو بھی الگ نہ کیا جاتا جو سیاسی جوڑ توڑ کا سہارا لے کر اقتدار پر چھائے ہوئے اور کنبہ پروری کے نتیجہ میں عہدوں پر قابض چلے آ رہے تھے تاریخ شاہد ہے کہ ان شوریدہ پشت و شوریدہ سر عمال کی غلط کارانہ روش کے نتیجہ میں اسلامی طرزِ معاشرت کے نقوش مٹتے جا رہے تھے۔ حرص و ہوس نے استحصال کا بازار گرم کر رکھا تھا اور دنیا استبدادی شکنجوں

میں جکڑی ہوئی گمراہ رہی تھی۔ اگر ان لوگوں کو کلیدی عہدوں پر برقرار رہنے دیا جاتا تو اسلامی حکومت کی تشکیل ممکن ہی نہ تھی کیونکہ اسلامی حکومت دینی عناصر ہی کے ذریعہ پروان چڑھ سکتی ہے جو اسلام اور اس کے احکام سے واقف دین اور اس کے آئین کے پابند اور اسلامی و اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے عادی ہوں۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا حضرت عثمان سے یہی تو مطالبہ تھا کہ وُہ ان خود سر عاملوں کو معزول کر کے ان کے بجائے انصاف پرور نیک کردار اور خوش اطوار لوگوں کو عامل مقرر کریں اور جب ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا تو انہوں نے تبدیلیٔ حالات کے لئے انقلابی قدم اٹھایا۔ اگر حضرت ان لوگوں کی رائے کے خلاف سابقہ نظامِ حکومت علیٰ حالہ باقی رہنے دیتے تو پھر اسی ظلم و سفاکی اور بے راہروی کا دور شروع ہو جاتا جو اس انقلاب کا محرک تھا اور وہ انقلاب پسند جنہوں نے سابقہ حکومت کا تختہ الٹا تھا اس حکومت کی تبدیلی کے بھی درپے ہو جاتے اور نتیجہ میں خون خرابہ ہوتا جنگ کے شعلے بھڑک اٹھتے اور اس حکومت کا بھی وہی حشر ہوتا جو سابقہ حکومت کا ہو چکا تھا۔

تیسرے یہ کہ امیرالمومنین خود ان عمال کے طور طریقوں کے شاکی تھے اور ان پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے اور حضرت عثمان کو متعدد بار یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وُہ معاویہ اور دوسرے خود سر عمال کو برطرف کر دیں۔ مگر حضرت عثمان حیل و حجت سے کام لیتے اور معاویہ کے بارے میں یہ عذر پیش کر دیتے کہ وہ حضرت عمر کے مقرر کردہ والیٔ شام ہیں۔ اگر حضرت بر سر اقتدار آنے کے بعد ان عمال کو اُن کے عہدوں پر برقرار رہنے دیتے تو عوام اس سے یہ تاثر لیتے کہ عمال کی برطرفی کا مطالبہ مفاد عامہ کے لئے نہیں تھا بلکہ آپ اصلاح حالات کی آڑ میں حکومت کا تختہ الٹ کر خود بر سر اقتدار آنا چاہتے تھے۔ اور جب مقصد میں کامیابی ہو گئی اور اقتدار حاصل ہو گیا تو سیاسی مصالح کی بنا پر معاویہ اور دوسرے عمال کی علیحدگی ضروری نہیں سمجھی اور محض اس خیال سے کہ وُہ حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں انہیں عہدوں پر بحال رہنے دیا۔ یہ روش ایک اقتدار پسند و دنیا پرست کی تو ہو سکتی ہے جو غلط سیاست اور غیر اسلامی وسائل کا سہارا لے کر اپنے اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنا چاہتا ہے مگر یہ اس کا کردار نہیں ہو سکتا جو اقتدار سے زیادہ اصول و دیانت کی بقا عزیز رکھتا ہو اور آئین اسلام سے سر مو انحراف گوارا نہ کرتا ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر حضرت اپنی حکومت و سیادت کے استحکام کے لئے معاویہ اور دوسرے عمال کو عہدوں پر بحال رکھتے تو یہ امر آپ کی سیاسی کمزوری پر محمول کیا جاتا اور کہنے والے یہی کہتے کہ آپ نے نظریاتی اختلاف کے باوجود ان لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ان کے اثر و نفوذ کو دیکھتے ہوئے انہیں برطرف کرنے

کی جرأت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دوسرے لوگ بھی اس کمزوری کو تاڑ کر جا و بیجا مطالبات پیش کرتے اور مقصد برآری کے لئے ان تمام ہتھکنڈوں کو کام میں لاتے جو کمزور حکومت کو دبانے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں اور انجام کار حکومت ایک کھلونا بن کر رہ جاتی ملک میں خلفشار بڑھتا، امن عامہ تباہ ہوتا نظم و نسق کا شیرازہ بکھرتا اور اس حکومت کا حشر بھی پہلی حکومت سے مختلف نہ ہوتا۔

پانچویں یہ کہ امیرالمومنین نے خلافت کو پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ قبول کیا تھا جس کے بعد عمال سے سرزد ہونے والے مظالم سے انہیں بے تعلق نہیں سمجھا جا سکتا تھا بلکہ بڑی حد تک ان کے افعال و اعمال کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی کہ انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے ان عمال کو لوگوں پر مسلط رہنے دیا جو استحصال پسند اور ظلم و ستمرانی کے خوگر تھے لہذا انہیں عہدوں پر برقرار رہنے دینا یا ان کی برطرفی میں تاخیر کرنا ان کے مظالم میں شرکت کے مترادف ہوتا اور حضرت یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ان کی غلط کاریوں کا ذمہ لے کر اپنا دامن داغدار کریں اس لئے آپ نے پہلے ہی مرحلہ پر ان غلط کار عمال سے اظہار بیزاری اور ان کے موقف سے بے تعلقی کا اعلان کرتے ہوئے ان کی معزولی کو ضروری قرار دے لیا۔

چھٹے یہ کہ حضرت علی اور معاویہ دو مختلف و متضاد گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ معاویہ اس گروہ کی فرد تھے جو دینی پابندیوں سے بے نیاز وقتی مصلحتوں کا پرستار اور مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر حیلہ و فریب کو جائز سمجھتا تھا۔ اس کے برخلاف امیرالمومنین کی سیاست مصلحت کی تہوں کے نیچے دبی ہوئی نہ تھی اور نہ ان کی سیاست کے اجزائے ترکیبی میں عیاری و فریب کاری داخل تھی۔ اس ذہنی تضاد اور نظریاتی اختلاف کی بنا پر معاویہ اپنے عہدہ کی بحالی پر مطمئن نہ رہ سکتے تھے بلکہ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ حضرت علی انہیں اس منصب پر باقی رکھنا کبھی گوارا نہ کریں گے اور ایک نہ ایک دن انہیں امارت سے معزول کر دیں گے۔ اس صورت میں اگر انہیں کچھ دنوں کے لئے امارت پر برقرار رہنے دیا جاتا تو وہ یہ عرصہ مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہو کر خاموشی سے نہ گزارتے بلکہ اپنے وقتی اقتدار سے فائدہ اٹھاتے مالی و عددی طاقت بڑھاتے اور ضرورت محسوس کرتے تو ہمسایہ مملکت روم سے جنگی معاہدہ کرتے۔ اس متوقع صورت کے پیش نظر کیا یہی قرین مصلحت نہ تھا کہ انہیں مزید قوت و توانائی کے فراہم کرنے کا موقع دیئے بغیر معزول کر دیا جاتا۔

ساتویں یہ کہ معاویہ کے پیش نظر صرف امارت شام کا تحفظ نہ تھا بلکہ تمام قلمرو اسلام پر اپنا جھنڈا لہرانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے حضرت عثمان کی زندگی ہی میں اپنے گرد اعوان و انصار کا جم غفیر جمع کر لیا تھا تاکہ جب موقع دیکھیں ان مددگاروں کا سہارا لے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیں۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ فضا حضرت عثمان کے خلاف ہو چکی ہے تو انہوں نے اس

موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور حضرت عثمان سے کہا کہ آپ میرے ہمراہ شام چلیئے وہاں کے باشندے آپ کے محافظ و سینہ سپر ہوں گے اور آپ کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچ سکے گا اور اگر مدینہ میں رہے تو شورش پسند آپ کا کام تمام کر دیں گے۔ معاویہ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح حضرت عثمان کو مرکز سے الگ کر کے ایک گوشہ میں بٹھا دیں اور ان کے جیتے جی مملکت کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیں تاکہ اس عارضی اقتدار کو آئندہ مستقل اقتدار کی صورت میں بے روک ٹوک منتقل کیا جا سکے مگر حضرت عثمان نے شام جانے سے انکار کر دیا اور یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ اور جب حضرت عثمان کے قتل کا حادثہ رونما ہوا تو انہوں نے اس قتل کو حصولِ اقتدار کا ذریعہ قرار دے لیا اور قصاص کے نام پر اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ اگر حضرت ان سے کوئی تعرض نہ کرتے اور انہیں امارت شام پر برقرار رہنے دیتے تو وہ امارت شام پر قناعت کر کے خاموش نہ بیٹھے رہتے بلکہ مرکز پر اپنی قوت و طاقت کا دباؤ ڈالتے جھوٹے سچے وعدوں سے لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکاتے اور عوام میں خوف و دہشت پھیلا کر حکومت کو ناکام بناتے اگر اس سے کام نہ چلتا تو ہنگامہ آرائی کے لئے کوئی اور عذر تلاش کرتے اور کچھ نہ سہی تو قتل عثمان کے سلسلہ میں حضرت کو موردِ الزام ٹھہراتے۔ اگر حضرت اس خون سے اپنی برأت کا ثبوت دیتے تو یہ شوشہ چھوڑتے کہ حضرت کا انتخاب غیر آئینی ہے کیونکہ یہ صرف اہل مدینہ کا انتخاب ہے اور انتخاب کا حق اہلِ مدینہ ہی کو کیوں ہو اہل شام کو کیوں نہ ہو جب کہ شام اپنی کثرت و طاقت کے لحاظ مرکزیت کا زیادہ سزاوار ہے۔ غرض انہیں منصب پر برقرار رکھنے کی صورت میں بھی ان کی الزام تراشی و حیلہ طرازی سے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ جب منصب کی بحالی کی صورت میں بھی ان کی فتنہ انگیزیوں اور افترا پردازیوں سے محفوظ نہ رہا جا سکتا تھا تو انہیں منصب پر باقی رکھنے میں مصلحت ہی کیا ہو سکتی تھی کہ ان کی معزولی عمل میں نہ لائی جاتی۔

آٹھویں یہ کہ یہ عمال نظم و ضبط کی اہلیت اور عوام سے جذبۂ ہمدردی کی بناء پر منتخب نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا انتخاب خلیفۂ وقت سے وابستگی اور خاندانی قرابت کا مرہونِ منت تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان نے کوفہ سے عمار یاسر کو معزول کر کے اپنے مادری بھائی ولید ابن عقبہ کو مقرر کیا بصرہ سے ابو موسیٰ کو علیحدہ کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ ابن عامر کو متعین کیا۔ مصر سے عمرو ابن عاص کو الگ کر کے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ ابن سعد کو مقرر کیا اور اسی طرح دوسرے عمال بھی زیادہ تر انہی کے خاندان کے افراد تھے سعید ابن مسیب کہتے ہیں:۔

کان کثیرا ما یولی بنی امیۃ ممن لم یکن لہ صحبۃ فکان یجئ	حضرت عثمان بیشتر بنی امیہ کے انہی افراد کو امارت کے لئے نامزد کرتے تھے جنہیں پیغمبر کی صحبت کا

من امرا مراٴہ ماینکرہ اصحاب محمد۔ (تاریخ الخلفاء۔ ص۱۱۰)

شرف حاصل نہ ہوتا تھا اور اُن کے بارے میں ایسی خبریں آتی تھیں جنہیں اصحاب پیغمبر ناپسند کرتے تھے۔"

جب یہ انتخاب جذبہ داری خویش پروری اور اہلِ افراد کی حق تلفی کے نتیجہ میں عمل میں لایا گیا تو اسے جوں کا توں باقی رکھنا ایک غلط اقدام کی تائید کے مترادف ہوتا اور امیرالمومنین سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی امر باطل کی تائید کریں گے خواہ اس سے آپ کی مخالف جماعت میں اضافہ ہوتا۔ یا مملکت کے استحکام کو دھچکا لگتا۔

نویں یہ کہ امیرالمومنین یہ دیکھتے چلے آرہے تھے کہ سابقہ حکومتوں میں انصار و بنی ہاشم کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے یہاں تک کہ جس مجلس شوریٰ کے نتیجہ میں حضرت عثمان منتخب ہوئے تھے اس میں بھی انصار کا کوئی حصہ نہ تھا اور حضرت عثمان نے بھی عہدوں کی تقسیم کا معیار اموّیت کو قرار دے لیا تھا۔ جس سے ایک طرف انصار و بنی ہاشم کو اپنے حق سے محرومی کا احساس ہو گیا تھا اور دوسری طرف گروہی عصبیت ابھر آئی تھی اگر اس گروہی و قبائلی معیار کے بجائے اہلیت و استعداد کار کو معیار قرار دیا جاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انصار اور بنی ہاشم میں سے کوئی منتخب نہ ہوتا جب کہ ان میں اہل افراد کی کوئی کمی نہ تھی۔ اب اس کا تدارک یونہی ہو سکتا تھا کہ سابقہ عمال کو معزول کر کے صرف اہلیت کی بناء پر انتخاب عمل میں لایا جاتا تاکہ امارت ایک طبقہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے اور نہ اہل افراد کو حق سے محرومی کا احساس ہونے پائے خواہ کوئی مہاجر ہو یا انصار ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی۔

دسویں یہ کہ یہ عمال باوجودیکہ حضرت عثمان کے ساختہ پرداختہ اور احسان پروردہ تھے مگر ان کے محاصرہ کے دنوں میں جو ایک مہینہ انیس دن تک رہا کسی ایک نے بھی ان سے تعاون نہ کیا حالانکہ ان کے پاس فوج بھی تھی اور سامان حرب بھی تھا۔ جب ان لوگوں نے اپنے محسن و سرپرست کے ساتھ کچھ نہ کیا تو امیرالمومنین مملکت کے نظم و انصرام کے سلسلہ میں ان سے کیا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ آڑے وقت پہ کام آئیں گے۔ یا کسی مہم میں ہاتھ بٹائیں گے۔ البتہ جب حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے تو ان میں سے چند ایک قصاص کے نام پہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ حالانکہ انہیں اس وقت اپنے صوبوں سے نکلنا چاہیئے تھا جب ان کا نکلنا مفید ثابت ہو سکتا تھا مگر اس وقت سب منقار زیر پر دبکے پڑے رہے اور اس پہلو تہی کے جواز میں کوئی معقول عذر بھی پیش نہ کر سکے یہاں تک کہ معاویہ جو سخن سازی میں مہارت رکھتے تھے اور موقع پہ بات بنا لینا بھی خوب جانتے تھے وہ بھی کوئی بات نہ بنا سکے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابوالطفیل کنانی ان کے ہاں آیا معاویہ نے اس

سے کہا کہ تم قتل عثمان کے موقع پر کہاں تھے کہا تھا تو مدینہ ہی میں مگر میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ کہا کہ تم پر ان کی نصرت و حمایت واجب تھی اور تم نے اس سے کنارہ کشی کی۔ ابو الطفیل نے کہا:۔

منعنی ما منعك اذ تربص به — جو مانع تمہارے لئے تھا وہی مانع میرے لئے تھا

ریب المنون وانت بالشام۔ — تم شام میں بیٹھے رہے اور مصیبتوں کے بادل اُن کے سر پر منڈلاتے رہے۔"

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص۶۲)

کہا کہ میری یہ نصرت و امداد کیا کم تھی کہ میں ان کے خون کے قصاص کے لئے لڑا۔ کہا کہ تمہارا اور عثمان کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا جعدی نے کہا ہے:۔

لا لفینك بعد الموت تندبنی — وفی حیاتی ما زودتنی زادا

مر گیا میں تو زمانے نے بہت یاد کیا — زیست میں کوئی مرے حال کا پرساں نہ ہوا

اب ان عمال میں سے چند نمایاں افراد کا اجمالی تعارف درج کیا جاتا ہے تاکہ ہمارے موقف کی مزید وضاحت ہو سکے۔

معاویہ ابن ابی سفیان

معاویہ ہند بنت عتبہ کے بطن سے ابو سفیان ابن حرب کے فرزند تھے۔ ہند پہلے فاکہہ ابن مغیرہ کی زوجیت میں تھی۔ جب فاکہہ بنی جذیمہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو حفص ابن مغیرہ سے عقد کر لیا اور حفص کے مرنے کے بعد ابو سفیان کے نکاح میں آئی۔ ہند مکہ کی بدنام عورتوں میں سر فہرست اور اسلام دشمنی میں پیش پیش تھی۔ غزوۂ اُحد میں جنگی ترانہ گا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دیتی رہی اور عم رسول حضرت حمزہ کا کلیجہ دانتوں سے چبا کر وحشت و بربریت کی مثال قائم کی اور اکلۃ الاکباد (جگر خوارہ) کا لقب پایا۔ اسی طرح ابو سفیان بھی پیغمبر کا بدترین دشمن اور اس سازش میں شریک تھا۔ جس سازش کے نتیجہ میں پیغمبر اکرم کو گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کرنا پڑی۔ ہجرت کے بعد بھی آنحضرت کے خلاف فوجکشی کرتا رہا اور بدر اُحد اور احزاب کی جنگیں لڑیں۔ جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو اپنے بیٹے معاویہ کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تاکہ اپنا اور اپنی اولاد کا تحفظ کر سکے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر کیا ہے:۔

اسلم هو وابوه یوم فتح مكة — معاویہ اپنے باپ ابو سفیان کے ساتھ فتح مکہ کے

وشهد حنینا وكان من المولفة — دن اسلام لایا اور غزوۂ حنین میں شریک ہوا اور

قلوبھم۔ (تاریخ الخلفاء ص۱۳۵) اس کا شمار مولفۃ القلوب میں ہوتا ہے۔"

مؤلفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی صداقت سے متاثر ہوئے بغیر اسلامی سطوت سے مرعوب ہو کر یا جان کے ڈر سے اسلام کی آڑ لے لی تھی اور جس طرح ہر مفتوح فاتح کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے انہوں نے بھی پیغمبر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ چنانچہ امیرالمومنین نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا:
واللہ ما اسلموا ولکن استسلموا۔" خدا کی قسم یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے بلکہ سر جھکا دیئے تھے۔"
اس ظاہری اسلام کے باوجود آنحضرت نے انہیں اسلامی جماعت میں شامل کر لیا تاکہ رفتہ رفتہ اسلام سے متاثر اور اس کے تعلیمات و معارف سے آگاہ ہو سکیں بلکہ ان کی دل جوئی کے لئے عام مسلمانوں سے زیادہ ان کے ساتھ مراعات برتتے۔ چنانچہ غزوہ حنین کے مال غنیمت میں سے عام مسلمانوں سے زیادہ انہیں دیا اور ابوسفیان اور اس کے دونوں بیٹوں یزید اور معاویہ کو بھی مولفۃ القلوب والا حصہ یعنی سو سو اونٹ دیئے جب کہ عام مسلمانوں کو چار چار اونٹ دیئے گئے تھے۔ حالانکہ ابوسفیان مسلمانوں کی وقتی ہزیمت پر بغلیں بجاتا تھا اور خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

شام پر معاویہ کے تسلط و اقتدار کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ حضرت ابوبکر نے شام پر لشکر کشی کا ارادہ کیا اور عمرو ابن عاص، شرجیل ابن حسنہ، ابوعبیدہ جراح اور یزید ابن ابی سفیان کی زیر کمان چار لشکر ترتیب دیئے اور ان سرداران لشکر سے یہ معاہدہ کیا کہ فتح کے بعد ابوعبیدہ حمص پر، شرجیل ابن حسنہ اردن پر، عمرو ابن عاص اور علقمہ ابن مجزز فلسطین پر اور یزید ابن ابی سفیان دمشق پر حاکم ہوں گے۔ اس قرارداد کے بعد چاروں لشکر مختلف راستوں سے روانہ ہوئے اور مقام یرموک میں جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کے سامنے رومیوں کا لشکر گراں تھا جس کے مقابلہ کی طاقت اپنے اندر نہ پاتے ہوئے انہوں نے حضرت ابوبکر سے مزید کمک طلب کی حضرت ابوبکر نے خالد ابن ولید کو نو ہزار کے لشکر کے ساتھ عراق سے یرموک جانے کا حکم دیا اور لشکر کی تعداد چالیس ہزار یا زیادہ سے زیادہ چھیالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ یزید کے لشکر میں سہیل ابن عمرو اور مکہ کے چند شیوخ مشیر کی حیثیت سے شامل تھے اور علم لشکر معاویہ کے ہاتھ میں تھا۔
اس جنگ کے دوران ۲۱ جمادی الثانی ۱۳ھ کو حضرت ابوبکر وفات پا گئے اور حکومت حضرت عمر کی طرف منتقل ہو گئی۔ ان کے دور میں ماہ رجب ۱۴ھ کو چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد دمشق فتح ہو گیا اور یزید ابن ابی سفیان دمشق کا حاکم قرار پایا۔ ۱۸ھ میں یزید طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا اور حضرت عمر نے اس کی جگہ معاویہ ابن ابی سفیان کو جو دمشق میں موجود تھے امیر مقرر کر دیا۔ حضرت عمر کے انتقال کے بعد ۲۳ھ میں جب حضرت عثمان برسر اقتدار آئے تو انہوں نے دمشق کے علاوہ اردن فلسطین لبنان حمص

اور قنسرین بھی ان کے حوالے کر دیئے اور جس اقتدار کی طرح حضرت ابو بکر نے ڈالی تھی حضرت عمر نے اسے عملی صورت دی اور حضرت عثمان نے اسے تکمیل تک پہنچایا۔

یہ امر انتہائی تعجب خیز ہے کہ وہ اکابر صحابہ جن کی اہلیت کار مسلم اور اسلامی خدمات ناقابلِ انکار ہیں نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور ان لوگوں کو جو اسلام کے دشمن بنی ہاشم کے دیرینہ معاند اور پیغمبر اسلام کے مقابلہ میں صف آرا رہے اور فتح مکہ کے موقع پر مجبوری کی صورت میں اسلام لائے۔ شام ایسی وسیع مملکت کا با اختیار حاکم بنا دیا جاتا ہے گویا۔

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

حضرت عمر نے معاویہ کو صرف امارتِ شام کا عہدہ ہی سپرد نہیں کیا بلکہ ان کے اقتدار کے دوام و استحکام کی بھی تدبیر کر گئے اور لوگوں کو یہ ہدایت دے گئے کہ وہ حالات میں تبدیلی رونما ہوتے دیکھیں تو ان کے گرد جمع ہو جائیں۔ چنانچہ ابن حجر مکی تحریر کرتے ہیں:۔

ان عمر حض الناس علی اتباع معاویۃ والھجرۃ الیہ الی الشام اذا وقعت فرقۃ (تطہیر الجنان۔ ص۱۹)	حضرت عمر لوگوں کو معاویہ کی پیروی پر ابھارتے اور انہیں آمادہ کرتے کہ جب آپس میں پھوٹ پڑے تو ہجرت کر کے معاویہ کے پاس شام چلے جائیں۔“

یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے کہ بنی امیہ کے دلوں میں بنی ہاشم کی طرف سے ہمیشہ بغض و عناد کارفرما رہا اور معاویہ کے دل میں اس موروثی دشمنی کے علاوہ حضرت علی کی طرف سے انتقامی جذبہ کی چنگاریاں بھی بھڑک رہی تھیں کیونکہ ان کا نانا عتبہ بھائی حنظلہ اور ماموں ولید حضرت ہی کے ہاتھوں سے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے تھے اور عرب کی افتاد طبیعت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہے کہ وہ انتقامی جذبات سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہیں رکھ سکتے۔ اگرچہ اسلام نے اسے ختم کرنا چاہا مگر صدیوں کی رچی بسی ہوئی خو اپنا عمل مشکل ہی سے تبدیل کیا کرتی ہے۔ حضرت عمر کی دُور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ انتقامی جذبہ افتراق و انتشار اور جنگ و جدل کی صورت میں ابھر سکتا ہے کہ لوگوں کے ذہن پلٹا کھائیں اور اقتدار کا رُخ حضرت علی کی طرف مڑ جائے۔ اس صورت میں معاویہ کا اقتدار خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ انہوں نے پیش بندی کرتے ہوئے لوگوں کو معاویہ کے اتباع اور شام کی طرف ہجرت کر جانے کی ہدایت کی تاکہ عوامی طاقت اُن کی پشت پر رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور حضرت کے برسرِ اقتدار آتے ہی لوگ جوق در جوق شام کی جانب چل دیئے اور معاویہ کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ اگر یہ افتراق

وانتشار کی صورت انہیں نظر آرہی تھی کہ جس کی بنا پر حق کے اتباع کا اور دار الہجرت مدینہ کی مرکزیت کو مضبوط کرنے کے بجائے شام کو دار الہجرت قرار دینے کا حکم دیا۔

حضرت عمر سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ معاویہ جس طرزِ زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ قیصری و کسروی طرزِ زندگی ہے جسے اسلام اور اسلام کے سادہ طرزِ معاشرت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر شام آئے تو معاویہ کے تزک و احتشام اور شان و شکوہ کو دیکھ کر کہا کہ تم تو عرب کے کسریٰ ہو اور میں نے سنا ہے کہ حاجتمند تمہارے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں اور تم گھر میں پڑے رہتے ہو۔ معاویہ نے کہا کہ ہم ایک ایسی سرزمین پر ہیں جہاں دشمن کے جاسوس ہماری ایک ایک بات پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے مرکز کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ سطوت و شکوہ کا مظاہرہ کرکے ان پر اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھیں۔ حضرت عمر نے یہ جواب سنا تو کہا کہ یہ ایک زیرک آدمی کی سخن طرازی ہے۔ علامہ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عمر کہا کرتے تھے۔

تذکرون کسری و قیصر ودھاءھما وعندکم معاویۃ۔

"تم کسریٰ و قیصر اور ان کی چالبازیوں کے تذکرے کرتے ہو حالانکہ معاویہ تمہارے درمیان موجود ہے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۴۔ صفحہ ۲۴۴)

مگر اس کے باوجود ان کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کی اور ان کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ وہ باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر خلافت پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اس طرح نفسیاتی طور پر انہیں خلافت کا امیدوار بنا دیا۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے ابو عثمان جاحظ کی کتاب السفیانیہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے اصحاب شوریٰ سے کہا:

انکم ان تعاونتم وتوازرتم وتناصحتم اکلتموھا اولادکم وان تحاسدتم وتقاعدتم وتدابرتم وتباغضتم غلبکم علی ھذا الامر معاویۃ ابن ابی سفیان۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ جزو ۱۔ صفحہ ۳۲)

"اگر تم نے باہمی تعاون دستگیری اور خیر خواہی کے جذبات سے کام لیا تو تم اور تمہاری اولادیں خلافت سے بہرہ اندوز ہوتی رہیں گی اور اگر تم نے آپس میں حسد و بغض رکھا اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے میں کوتاہی کی تو پھر معاویہ ابن ابی سفیان تمہیں مغلوب کرکے خلافت ہتھیا لے گا۔"

یہ بات معاویہ کے گوشگزار ہوئی ہوگی تو طبعاً ان کے خیالات نے کروٹ لی ہوگی اور ذہنی رخ خلافت کی طرف مڑ گیا ہوگا۔ چنانچہ ان کے حرکات و سکنات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے

حضرت عثمان کے زمانہ خلافت ہی میں اقتدار کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی اور ان کے قتل کے بعد تو اُن کی سرگرمیوں میں اور تیزی آ گئی اور ہر جائز و ناجائز طریق کار سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

جب شام پر اموی پھریرا لہرایا تو سلطنت روما کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے اس پر رومی تمدن چھایا ہوا تھا۔ حکومت کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ اسلام کے بعد بھی وہاں کے لوگوں پر رومی اثرات غالب رہے اور معاویہ نے بھی اسلام کی سادہ زندگی کو چھوڑ کر وہیں کا طرز معاشرت اختیار کر لیا۔ اپنے تعمیر کردہ قصر خضرا میں بڑے ٹھاٹ سے رہتے دروازہ پر پولیس کا پہرہ زریں کمر غلاموں کا جھرمٹ مصاحبوں کا جمگھٹا اور دربار کا کروفر قیصری و کسروی شان کا آئینہ دار تھا۔ یہ تمکنت و شکوہ اور نگاہوں میں خیرگی پیدا کرنے والا سامان آرائش عوام کو مرعوب و متاثر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لیکن جہاں انہیں یہ شبہ ہوتا کہ شاہی آن بان اور مادی ساز و سامان کا اثر نہیں لیا جائے گا تو وہاں اور طریقہ اختیار کیا جاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو ابن عاص مصریوں کے ایک وفد کے ہمراہ دمشق آئے اور چاہا کہ وفد کی نظروں میں معاویہ کی اہمیت گرائے اور ان کے کبر و غرور کو ٹھیس لگائے۔ عمرو نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب تم معاویہ کے ہاں جانا تو اُسے خلیفہ کہہ کر سلام کرنے کے بجائے عام طریقہ سے سلام کرنا اور گفتگو میں ایسا انداز اختیار کرنا کہ گویا تم ایک عام آدمی سے مخاطب ہو اور ان کے دبدبہ شاہی سے قطعاً مرعوب نہیں ہو۔ اس طرح تمہارا وقار بڑھے گا اور قدر و منزلت زیادہ ہو گی۔ معاویہ نے پہلے ہی سے تاڑ لیا تھا کہ عمرو مصریوں کی نظر میں انہیں غیر اہم ثابت کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے دربانوں کو بلا کر کہا کہ جب مصری وفد باریابی کے لئے آئے تو انہیں اس طرح جھنجھوڑنا کہ ان کے سارے کس بل نکل جائیں اور ان میں سے ہر شخص یہ سمجھنے لگے کہ اُسے موت کی طرف ڈھکیلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب وہ دربانوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بوکھلائے ہوئے معاویہ کے سامنے آئے تو ابن خیاط نامی ایک شخص آگے بڑھا اور السلام علیک یا رسول اللہ کہہ کر انہیں سلام کیا اس کے بعد جو شخص آگے بڑھتا انہیں لفظوں میں سلام کرتا اور جب دربار سے باہر نکلے تو عمرو نے برہم ہو کر کہا:۔

لعنکم اللہ نھیتکم ان تسلموا علیہ بالامارۃ فسلمتم علیہ بالنبوۃ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۴۴)	تم پر خدا کی پھٹکار میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اسے خلیفہ کہہ کر بھی سلام نہ کرنا چہ جائیکہ تم نے اسے یا رسول اللہ کہہ کر سلام کیا“

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ معاویہ اپنے بارے میں یا رسول اللہ کے الفاظ سنتے ہیں اور ان کی قوت سامعہ پر گراں نہیں گزرتے۔ حالانکہ ان لفظوں سے کسی اور کو مخاطب کیا جاتا تو اس کی روح لرز اٹھتی

اور کان کے پردے پھٹ جاتے مگر وہ چپ سادھ لیتے ہیں۔ اگر اس موقع پر خاموشی میں کوئی مصلحت تھی تو بعد میں اس کی تردید کرتے مگر وہ نہ اس کی تردید ضروری سمجھتے ہیں اور نہ کہنے والوں کو تنبیہ و سرزنش کرتے ہیں۔ کیا بعید ہے کہ وہ ڈرا سہما وفد انہیں ربّ اعلیٰ کے الفاظ سے مخاطب کرتا جب بھی وہ خاموش رہتے اور اس کی تردید غیر ضروری سمجھ کر ٹال دیتے۔

جہاں ذہن کی روش اس طرح کی ہو وہاں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام کے اصول وضوابط کا احترام یا اس کے اوامر ونواہی کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہوگی۔ چنانچہ ریشم جسے شریعت نے مردوں کے لئے حرام کیا ہے۔ بے کھٹکے پہنا جاتا سونے اور چاندی کے برتن کھنکتے شراب کے دور چلتے اور بے جھجک جام دوسروں کے سامنے پیش کئے جاتے۔ عبداللہ ابن بریدہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ہمراہ معاویہ کے ہاں گیا ہمیں فرش پر بٹھایا گیا اور کھانے کے بعد ہمارے سامنے شراب پیش کی گئی۔ میرے والد نے شراب کو دیکھا تو کہا:۔

ما شربته منذ حرمه رسول اللہ۔ (مسند احمد ابن حنبل۔ ج ۵۔ ص ۳۴۷)	جب سے رسول اللہ نے شراب کو حرام کیا ہے میں نے اُسے منہ نہیں لگایا۔"

دین میں ان کے بدعات واولیات کا سلسلہ بھی طویل ہے۔ چنانچہ اپنے باپ کی ناجائز اولاد زیاد ابن سمیہ کو فرزند ابو سفیان قرار دے کر ارشاد نبوی الولد للفراش وللزانی الحجر (بچہ شوہر کا ہوگا اور زانی کے لئے پتھر ہے) کا مذاق اڑایا خطبات میں امیرالمومنین پر سب وشتم کو رواج دیا نماز عیدین سے قبل اذان کا اجراء کیا خطبۂ عید کو نماز پر مقدم کر دیا۔ کھڑے ہو کر خطبہ دینے کے بجائے بیٹھ کر خطبہ دینے کا اجرا کیا اور ان کے بعد بنی اُمیہ نے اسے اپنا شعار بنا لیا۔ اموی دور کے بعد جب سفاح عباسی برسرِ اقتدار آیا اور اس نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا تو مجمع نے پکار کر کہا:۔

یا ابن عم رسول اللہ احییت السنة احیاك اللہ۔	اے فرزند عم رسول تم نے پھر سے سنت کو زندہ کیا خدا تمہیں زندہ رکھے۔"

(محاضرۃ الاوائل ص ۱۴۸)

نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ کا پڑھنا ترک کر دیا۔ محمد ابن عقیل تحریر کرتے ہیں:۔

هو اول من ترك الجهر بالتسمية فی الصلوٰة بالمدينة حتی انكر عليه المهاجرون والانصار وقالوا	معاویہ نے مدینہ میں سب سے پہلے نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کو ترک کیا یہاں تک کہ مہاجرین وانصار نے اس کے خلاف آواز بلند

اسرقت التسمیۃ یامعاویۃ۔ کی اور کہا اے معاویہ تم نے بسم اللہ کی چوری کی ہے۔

(نصائح کافیہ۔ صفحہ ۹۶)

اسلام کے واضح احکام میں ردوبدل کے ساتھ ان تقریبات ورسوم کو فروغ دیا جو غیر مسلموں میں رائج تھے۔ کلیدی عہدے غیر مسلموں کے سپرد کئے اور مدینہ کی مرکزیت کو منتقل کرنے کی تدبیر کی۔ چنانچہ نو روز و مہرجان کے تہوار منائے جانے اور تحائف کے نام پر رقمیں وصول کی جاتیں۔ مرکزی دفتر کا افسر ایک عیسائی سرجون رومی تھا اور حمص کے محکمہ خراج کا نگران اعلیٰ ابن اثال بھی مسیحی تھا۔ ۵۰ھ میں حج کے بعد مدینہ آئے تو منبر رسول کو شام منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اسے اٹھانے کے لئے حرکت دی تو سورج کو گہن لگ گیا۔ دیکھنے والے دہشت زدہ ہوگئے اور آخر لوگوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا اور بات یہ بنائی کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے دیمک تو نہیں لگ گئی۔

یہ واقعہ حسان ابن کلال عبدی کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے بھی یہ چاہا تھا کہ خانہ کعبہ کو مسمار کر کے اس کے پتھر یمن لے جائے مگر قدرت نے اسے ایسا جکڑا کہ وہ اپنے ارادے میں ناکام و نامراد رہا۔ اس طرح یہاں فطرت کے خشمگین تیور گہن کی صورت میں آڑے آئے اور منبر نبوی کو منتقل کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی۔

معاویہ کے وہ افعال و اعمال جو اسلامی قدروں کو پامال اور اُمت مسلمہ کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا باعث ہوئے یوں تو ان گنت ہیں مگر ان کا اپنے بدکردار اور ناہنجار بیٹے یزید کو ولیعہد بنانے کا اقدام ایک ایسا مہلک اقدام ہے کہ وہ گروہ جو صحابہ پر جرح و نقد اور ان کی باہم آویزیوں پر تبصرہ تک کا روادار نہیں وہ بھی اس کے خلاف آواز اٹھائے بغیر نہ رہ سکا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ان کے اس اقدام نے خلافت کا رُخ ملوکیت کی طرف موڑ دیا اور ایک ایسی بدعت کی داغ بیل ڈال گئے جو صدیوں تک اسلامی دنیا میں جاری و ساری رہی اور اس استبدادی و غیر آئینی کارروائی کے نتیجہ میں ہر فرمانروا جو خلیفۃ المسلمین کے نام سے مسندِ خلافت پر بیٹھا خلافت کو اپنی ملکیت و جاگیر سمجھتے ہوئے اپنے وارثوں کی طرف منتقل کرتا رہا۔

معاویہ کا یہ اقدام نہ صرف شرعی اعتبار سے غلط تھا بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی قابلِ مذمت ہے کیونکہ انہوں نے امام حسن علیہ السلام سے معاہدہ صلح میں یہ شرط تسلیم کرلی تھی کہ وہ اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کریں گے مگر ان کا یہ معاہدہ بادر ہوا ثابت ہوا اور انہوں نے عامۂ مسلمین کی ناپسندیدگی کے باوجود معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کی زمام قیادت یزید کے ہاتھوں میں دے دی۔

معاویہ کا مطمح نظر شروع ہی سے موروثی سلطنت کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے شرعی حدود تک نظر انداز کر دیئے تھے تو پھر وعدہ کی خلاف ورزی کو کیا اہمیت دیتے اور لوگوں کی ناپسندیدگی کو کیا خاطر میں لاتے انہیں تو بہر صورت یہ قدم اٹھانا تھا اور وہ اٹھا کر رہے اور جن لوگوں کے بارے میں انہیں یہ کھٹکا تھا کہ وہ اسے تسلیم نہیں کریں گے یا اسے عملی صورت دینے میں روڑے اٹکائیں گے اور اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر دوسروں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیں گے ان میں سے کسی سے مصلحتہً کوئی تعرض نہ کیا اور کسی کو ڈرا دھمکا کر مہر بلب کر دیا اور کسی کو زر و مال یا عہدہ دے کر ہموار کر لیا اور جو کسی صورت میں بکتے نظر نہ آئے انہیں خفیہ طور پر زہر دلوا کر راستے سے ہٹا دیا۔ چنانچہ امام حسن کو جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ زہر دلوایا۔ مسعودی نے تحریر کیا ہے:-

قد کان معاویة دس الیها ان احتلت فی قتل الحسن وجهت الیك بمائة الف درهم و زوجتك یزید۔

معاویہ نے اسے چپکے چپکے یہ پیغام بھیجا کہ اگر تو کسی حیلہ سے حسن کا کام تمام کر دے تو میں تجھے ایک لاکھ درہم دوں گا اور یزید سے تیرا عقد کر دوں گا"

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ صفحہ ۵۰)

اس سازش کے ماتحت اس نے زہر سے امام حسن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور اس کے صلہ میں معاویہ نے اسے ایک لاکھ درہم بھجوا دیئے اور دوسرے وعدہ سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ مجھے یزید کی زندگی عزیز ہے۔ اسی طرح خالد ابن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو زہر دلوا کر ختم کیا۔ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے کہ معاویہ نے شام میں خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ اے لوگو میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور موت کی ساعت قریب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لئے کوئی انتظام کر جاؤں۔ معاویہ کا خیال تو یہ تھا کہ لوگ سطوت و قوت سے متاثر ہو کر یا خوشامد درامد کی بناء پر یزید کا نام لیں گے اور وہ رائے جمہور کی آڑ میں اس کی ولیعہدی کا اعلان کر دیں گے مگر لوگوں سے یزید کی بدعنوانیاں مخفی نہ تھیں اور وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ خلافت کے سلسلہ میں اس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے عبدالرحمٰن ابن خالد کا نام لیا۔ معاویہ نے یزید کے بجائے عبدالرحمٰن کا نام سنا تو اس کی طرف سے ان کے دل میں گرہ پڑ گئی اور چاہا کہ یزید کے راستے سے اس سنگِ گراں کو ہٹا دیں۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کی بیماری کی خبر سنی تو اپنے ہاں کے ایک طبیب کو لالچ دے کر آمادہ کیا کہ:-

ان یاتیه فیسقیه سقیة یقتله

وہ اس کے ہاں جائے اور دوا پلا کر اس کا کام

بھا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ صفحہ ۴) تمام کر دے۔"

چنانچہ اسے دوا کے بہانے زہر دے دیا گیا۔

عبدالرحمٰن ابن ابی بکر بھی اسی حربہ کا شکار ہوئے۔ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ جب معاویہ نے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا تو عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے کہا:۔

اھرقلیة کلما مات قیصر کان قیصر مکانه لا نفعل واللہ ابدا (اصابہ۔ ج ۲۔ صفحہ ۴)

کیا وہی ہرقلی نظام کہ ایک قیصر مر جائے تو دوسرا قیصر اس کی جگہ لے لے۔ خدا کی قسم ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

معاویہ نے ان کا منہ بند کرنے کے لئے ایک لاکھ درہم بھجوائے مگر انہوں نے وہ درہم واپس کر دیئے اور کہا کہ میں دنیا کے عوض دین نہیں بیچوں گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ جاتے ہوئے ابھی دس میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے:۔

کان موته فجأة من نومة نامها۔ (اصابہ۔ ج ۲۔ صفحہ ۴)

عبدالرحمٰن سوتے میں ناگہانی طور پر مر گئے۔"

عمرو ابن عاص

عمرو کا باپ عاصی ابن وائل تھا جسے قرآن نے ابتر (بے اولاد) اور دشمن رسول کہا ہے۔ ماں کا نام سلمیٰ بنت حرملہ اور لقب نابغہ تھا۔ بنی عنزہ سے اسیر کر کے لائی گئی عکاظ کے بازار میں بکی فاکہہ ابن مغیرہ نے اسے خریدا اور پھر عبداللہ ابن جدعان کے ہاتھ بیچ ڈالا اور یوں بکتی بکاتی عاصی ابن وائل تک پہنچ گئی اور اپنی کوکھ سے عمرو کو جنم دیا۔

عمرو نے اسلام دشمنی اپنے باپ عاصی سے ورثہ میں پائی تھی۔ چنانچہ دشمنان اسلام کی صف اول میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلام کی شان میں ناسزا کلمات کہتا اور آپ کے خلاف جنگ و قتال کے معرکے گرم کرتا رہا۔ جب اسلام کے غلبہ و اقتدار کے آگے اپنے کو بے بس پایا تو اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اسے فلسطین و اردن کا امیر نامزد کیا۔ اور جب یہ علاقہ معاویہ کے زیر نگین کیا تو اسے فوج دے کر مصر روانہ کر دیا۔ اس نے مصریوں سے جنگ کر کے اسے فتح کر لیا اور مرکز کی طرف سے وہاں کا حاکم قرار پایا۔ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان نے بھی اسے

کچھ عرصہ امارت پر بحال رکھا پھر ۲۶ھ میں اسے معزول کر کے اپنے دودھ شریک بھائی عبداللہ ابن سعد کو وہاں کا والی بنا دیا جو لشکر کشی کے موقعہ پر میمنۂ لشکر کا سردار تھا۔ عمرو جو حضرت عثمان کا ہوا خواہ تھا اس برطرفی کی بناء پر ان کا شدید مخالف ہو گیا اور اسے مخالف ہونا ہی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ اس کی دوستی مفاد و خود غرضی سے وابستہ تھی۔ یہ مخالفت اس حد تک بڑھی کہ اس نے محاذ قائم کر کے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں:۔

کان عمرو ابن عاص منذ عزل عن مصر یعمل حیلۃ فی التالیب والطعن علی عثمان۔ (استیعاب۔ ج ۳۔ ص ۳۲۲)۔	حضرت عثمان نے عمرو ابن عاص کو مصر کی امارت سے الگ کیا تو وہ لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے اور اُن پر زبان طعن کھولنے لگا۔"

اس نے اسی پر بس نہ کی بلکہ طیش میں آکر اپنی بیوی ام کلثوم بنت عقبہ کو جو حضرت عثمان کی مادری بہن تھی طلاق دے دی اور ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے سرگرم عمل ہو گیا۔ حضرت عثمان نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو اسے بلا کر کہا کہ اے نابغہ کے بیٹے تم ان حرکات سے باز آؤ اور نفاق و دورخی چھوڑ کر شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرو۔ عمرو نے بھی اسی لب و لہجہ میں جواب دیا اور ان پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ حضرت عثمان اس کی باتوں پر سٹپٹائے اور تنگ آکر کہا کہ تمہیں میرے کاموں پر نکتہ چینی اور میرے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں زمانۂ جاہلیت میں بھی تم سے زیادہ محترم تھا اور اب بھی زیادہ باوقار ہوں۔ عمرو نے کہا کہ ہاں ہاں میں نے آپ کے باپ عفان کو دیکھا ہے وہ کسی لحاظ سے میرے باپ عاصی ابن وائل کا ہمپایہ نہ تھا۔ اس پر حضرت عثمان نے تو کچھ نہ کہا لیکن مروان پیچ و تاب کھانے لگا اور حضرت عثمان سے کہا اب آپ کی حیثیت یہ رہ گئی ہے کہ عمرو آپ کے باپ تک کو نہیں بخشتا۔ اس دو بدو تلخ کلامی کے بعد عمرو نے اپنی سرگرمیوں کو اور تیز کر دیا اور طلحہ و زبیر اور دوسرے لوگوں کو ان کے خلاف ابھارا اور جب عوام و خواص کے جذبات ان کے خلاف بھڑک اُٹھے اور ان کے گرد گھیرا ڈال دیا گیا تو مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور فلسطین میں جہاں اس کا عالیشان محل اور وسیع جاگیر تھی چلا آیا تاکہ دُور رہ کر اپنی کوششوں کو بارآور ہوتے دیکھے اور نتائج کی ذمہ داری سے اپنے کو بچائے جائے۔

ایک دن اپنے قصر عجلان میں سلامہ ابن روح جذامی اور اپنے دونوں بیٹوں محمد اور عبداللہ سے مصروف گفتگو تھا کہ ادھر سے ایک سوار کا گزر ہوا اسے بلا کر پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو کہا مدینہ سے کہا عثمان کا کیا حشر ہوا کہا کہ جب میں مدینہ سے نکلا تھا تو شدید محاصرہ میں تھے۔ اس کے بعد ایک اور سوار ادھر

سے گزرا اسے بھی بلا کر پوچھا اس نے کہا کہ وہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ عمرو نے سنتے ہی کہا:۔

انا ابو عبد اللہ اذا حککت قرحۃ نکاتھا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صہ ۳۹۲)

میں بھی عبد اللہ کا باپ ہوں جب کسی کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو اسے ادھورا نہیں چھوڑتا۔"

ابن اثیر نے لکھا ہے کہ جب انہیں قتل عثمان کی خبر ہوئی تو یہ کہا:۔

انا ابو عبد اللہ انا قتلتہ وانا بوادی السباع ان یل ھذا الامر طلحہ فھو فتی العرب وان یل ابن ابی طالب فھو اکرہ من یلیہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صہ ۱۴۱)

میں عبد اللہ کا باپ ہوں میں نے وادی السباع (سبع) میں رہتے ہوئے عثمان کو قتل کیا ہے اگر طلحہ خلیفہ ہوئے تو وہ جود وسخا کے لحاظ سے عرب کے جوانمرد ہیں اور اگر ابن ابی طالب کو خلافت ملی تو وہ حکمرانی کے اعتبار سے ناپسندیدہ شخصیت ہیں۔"

ابھی وہ اپنی کامیابی کی سرمستیوں میں کھویا ہوا تھا کہ حضرت علی کے خلیفہ منتخب کئے جانے کی خبر سنی سنتے ہی سر پکڑ کر رہ گیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ تو کچھ ڈھارس بندھی اور جنگ جمل کے نتیجہ کا منتظر رہا کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور جب حضرت علی کی فتحیابی کی خبر سنی تو رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی مگر جب یہ اطلاع آئی کہ معاویہ نے بیعت سے انکار کر دیا ہے تو یاس و حرمان کی اندھیاریوں میں اُمید کی کرن نظر آنے لگی۔ حکومت کی فکر تو تھی ہی کیونکہ حکومت و اقتدار کے کیف آفرین لمحوں میں ایک عرصہ گزار چکا تھا اور اب اگرچہ عمر کی آخری منزل میں پہنچ چکا تھا مگر جذبہ جاہ پسندی ایسا نہیں ہے کہ عمر کے کسی حصّہ میں سرد پڑ جائے بلکہ ؎

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

چنانچہ وہ حکومت مصر کی دیرینہ آرزو لے کر معاویہ کے ہاں پہنچ گیا اور وہاں کی حکومت کا سودا چکانے کے بعد اپنا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

عمرو ابن عاص سیاسی ہتھکنڈوں اور سازشی حربوں میں ماہر اور پھوٹ ڈلوا کر مقصد براری کے فن میں طاق تھا۔ اسی جوڑ توڑ اور سوجھ بوجھ کے نتیجہ میں کامیابی کی راہیں پیدا کرتا رہا اگرچہ کامیابی کے لئے اسے دینی و اخلاقی قدروں کی قربانی دینا پڑی مگر کشورستانی کی سیاست میں ان اقدار کو چنداں اہمیت

نہیں دی جایا کرتی جب کہ سیاست کا مقصد ہی کامیابی قرار دے لیا گیا ہے۔ خواہ وہ کذب و افترا پردازی سے حاصل ہو یا قتل و خونریزی سے۔ اور واقعات شاہد ہیں کہ ابن عاص کو ان امور کے ارتکاب سے کوئی باک نہ تھا۔ آخر ۹۰ برس کی طویل زندگی کے بعد ۴۳ھ میں عید الفطر کے دن وفات پائی۔ اس کے فرزند عبداللہ نے پہلے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر نماز عید ادا کی۔

عبداللہ ابن سعد

عبداللہ حضرت عثمان کا دودھ شریک بھائی اور سعد ابن ابی سرح کا بیٹا تھا۔ سعد کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو اسلام کی آڑ میں اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے اور اپنے طرز عمل کی بنا پر منافقین کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے:۔

وابوہ سعد من المنافقین۔ — "عبداللہ کا باپ سعد منافقین میں شامل تھا"

(المعارف۔ ص۱۳۱)

عبداللہ گو صحابی رسول اور کاتب وحی تھا مگر اس کے فکر و عمل کی پشت پر اسی کے باپ کا ذہن کام کر رہا تھا جس کا ثبوت اس کا یہ طرز عمل ہے کہ جب پیغمبر قرآن کی آیات لکھواتے تو ان میں اپنی مرضی سے ردو بدل کر دیتا۔ چنانچہ الکافرین کی جگہ الظالمین اور عزیز حکیم کی جگہ علیم حکیم لکھ دیتا۔ ایک مرتبہ انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ایک آیت لکھتے ہوئے آیت کے سباق کی مناسبت سے اس کی زبان سے فتبارک اللہ احسن الخالقین کا جملہ نکل گیا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ یہ بھی اسی آیت کا ٹکڑا ہے اسے بھی لکھ لو۔ اس نے لکھنے کو تو لکھ لیا مگر شک میں پڑ گیا کہ قرآن اللہ کا نازل کردہ کلام ہے۔ یا پیغمبر کا ساختہ اور پھر اس کی تشہیر کرنے لگا، گویا کہ قرآن میں کوئی خاص ندرت اور بشری طاقت سے بلند تر جوہر بلاغت نہیں ہے ایسا کلام تو میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ اس پر یہ آیہ قرآنی نازل ہوا۔

ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا او قال اوحی الی ولم یوح الیہ شئ ومن قال سانزل مثل ما انزل اللہ۔	"اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے اور کہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس وحی نہیں آئی یا وہ یہ دعویٰ کرے کہ جیسا قرآن اللہ نے اتارا ہے ویسا میں بھی نازل کئے دیتا ہوں"

پیغمبر اکرم نے اس کی یاوہ گوئی کی بنا پر اسے مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا چنانچہ وہ اسلام سے منحرف ہو کر مکہ میں آ گیا اور یہاں بھی لوگوں سے برملا کہنا شروع کیا کہ محمد خود آیتیں گھڑ لیتے ہیں اور وحی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت عثمان ایسے لوگوں کے پشت پناہ تو بن ہی جایا کرتے تھے انہوں نے آنحضرت سے سفارش کی کہ اسے مدینہ آنے کی اجازت دی جائے مگر پیغمبر نے کسی صورت میں اسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی۔ جب مکہ فتح ہوا اور آنحضرت فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو حکم دیا کہ عبد اللہ ابن سعد کو قتل کر دو خواہ وہ خانہ کعبہ کے پردہ سے چمٹا ہوا کیوں نہ ہو۔ حضرت عثمان نے یہ فرمانِ نبوی سنا تو بہت گھبرائے اور اسے کہیں اِدھر اُدھر کر دیا۔ جب حالات پرسکون ہوئے تو اسے لے کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ عبد اللہ ابن سعد بیعت کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اسے امان دی جائے اور اس سے بیعت لی جائے۔ مگر پیغمبر نے نہ بیعت لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا اور نہ زبان سے کچھ فرمایا اور دیر تک خاموش رہے۔ ادھر حضرت عثمان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر پیغمبر اکرم نے اس کی جان بخشی کر دی۔ جب وہ اٹھ کر چلا گیا تو آنحضرت نے ان لوگوں سے جو وہاں موجود تھے فرمایا کہ میں اتنی دیر اس لئے چپ رہا کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور اس کی گردن مار دے۔

اما کان فیکم من یقوم الی هذا الکلب قبل ان اومنه فیقتله۔	کیا تم میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کتے کی طرف بڑھتا اور قبل اس کے کہ میں اسے امان دیتا وہ اسے قتل کر دیتا۔"
(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ صہ ۳۵۸)	

حضرت عمر نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے آنکھ سے اشارہ کر دیا ہوتا تو ہم اسے قتل کر دیتے۔ آنحضرت نے فرمایا:۔

انی ما اقتل باشارة لان الانبیاء لا یکون لهم خائنة الاعین۔	میں اشارہ سے قتل کا حکم نہیں دیا کرتا۔ اور نہ انبیاء آنکھ بچا کر اشارہ بازی کیا کرتے ہیں۔"
(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ صہ ۳۵۸)	

حضرت عثمان نے اپنے دورِ خلافت میں اس کی بداعمالیوں سے چشم پوشی کر کے اسے مصر ایسی وسیع مملکت کا والی بنا دیا۔ گویا دحی میں خیانت اور ارتداد کوئی جرم ہی نہ تھا۔ اس نے امارت مصر پر قابض ہونے کے بعد وہی طرزِ عمل اختیار کیا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی تھی۔ ہر طرف جبر و استحصال کے طوفان اُمڈ آئے ملکی خوش حالی نکبت و افلاس میں بدل گئی اور حضرت عثمان کے چند ہوا خواہوں کے علاوہ تمام اہل مصر اس کے مخالف ہو گئے اور عوام کے دلوں میں مرکز کی طرف سے بھی نفرت کے جذبات بھڑک اُٹھے۔

آخر محمد ابن ابی حذیفہ نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ کر لوگوں کو اس کے چنگل سے نجات دلائی۔

محمد ابن ابی حذیفہ حضرت عثمان کے پروردہ تھے اور اپنے والد ابو حذیفہ کے جنگ یرموک میں مارے جانے کے بعد انہی کے زیر کفالت رہے۔ جب محمد بڑے ہوئے تو حضرت عثمان سے کہا کہ مجھے موقع دیجئے کہ اسلام کی ترویج و ترقی میں حصہ لوں اور کسی لشکر میں شریک ہو کر دشمنوں سے جہاد کروں۔ حضرت عثمان نے انہیں عبداللہ ابن سعد کے معاون و مددگار کی حیثیت سے مصر جانے کی اجازت دے دی اور وہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ مصر آ گئے۔ محمد ابن حذیفہ بڑے عابد و متورع اور پرہیزگار تھے انہوں نے والئ مصر کی بے راہرویوں اور انتظامی خرابیوں کو دیکھا تو عبداللہ ابن سعد کو سمجھایا کہ وہ اپنی روش کو بدلے مگر اس کے عادات و اطوار میں تبدیلی نہ آئی۔ جب وہ بار بار جھنجھوڑنے پر بھی نہ سنبھلا تو انہوں نے علانیہ لوگوں کو اس کے خلاف کہنا سننا شروع کر دیا اور حضرت عثمان پر بھی لے دے کی کہ انہوں نے ایک ایسے باغی انسان کو اہل مصر پر مسلط کر دیا ہے جس کا خون پیغمبرؐ نے مباح کر دیا تھا۔ اہل مصر محمد کے تقوے و طہارت اور محتاط طرزِ عمل سے متاثر تو تھے ہی ان کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ عبداللہ ابن سعد پہلے ہی اہلِ مصر کی نظروں سے گرا ہوا تھا اب اس کا رہا سہا وقار بھی جاتا رہا اور اس کی حکومت بے وزن ہو کر رہ گئی۔ عبداللہ ابن سعد نے یہ صورت حال دیکھی تو حضرت عثمان کو تحریر کیا کہ آپ کے پروردہ ابن ابی حذیفہ نے یہاں کی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے عوام کو حکومت کے خلاف آمادۂ بغاوت کرتے رہتے ہیں اگر اس کا بندوبست نہ کیا گیا تو بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک میرے بس میں تھا میں نے روک تھام کی مگر اب معاملہ میرے قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ حضرت عثمان کو کوئی اور تدبیر نہ سوجھی تو انہوں نے مال و دولت سے اس سیلاب پر بند باندھنا چاہا۔ چنانچہ چند قیمتی پارچے اور تیس ہزار درہم ابن ابی حذیفہ کو بھجوائے مگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور ابن ابی حذیفہ لالچ کا شکار نہ ہو سکے انہوں نے وہ پارچے اور درہم مسجد میں لا کر ڈھیر کر دیئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

یا معشر المسلمین الا ترون الی عثمان یخادعنی عن دینی دیرشونی علیہ۔	اے گروہ مسلمین تم عثمان کی اس حرکت کو نہیں دیکھتے کہ وہ دین کے معاملہ میں مجھے فریب دینا چاہتے ہیں اور یہ مال رشوت کے طور پر مجھے بھیجا ہے۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۳۵)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت اور شدید ہو گئی۔ بغاوت کے جذبات ابھر آئے اور لوگوں نے علانیہ عبداللہ ابن سعد کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت عثمان کو اس کا پتا چلا تو انہوں نے ابن ابی حذیفہ کو

تحریر کیا کہ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم میرے احسانات کو یکسر فراموش کر دو گے اور خود بھی علم بغاوت بلند کرو گے اور رعایا کو بھی میرے خلاف بغاوت پر اکساؤ گے۔ مگر ابن ابی حذیفہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر عبداللہ کے خلاف تحریک چلاتے رہے۔ آخر اہل مصر کا ایک جتھا مدینہ روانہ ہو گیا تا کہ حضرت عثمان کو مجبور کرے کہ وہ عبداللہ ابن سعد کو اس کے عہدہ سے معزول کر کے کسی دوسرے کا تقرر کریں۔ اس جتھے میں محمد ابن ابی بکر بھی تھے جو مصر میں ابن ابی حذیفہ کے اس تحریک میں معاون تھے۔

اس وفد کے بعد عبداللہ ابن سعد نے بھی مدینہ کا رخ کر لیا اور مصر کا نظم و نسق ابن ابی حذیفہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جب عبداللہ مدینہ جاتے ہوئے مقام ایلہ پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مصریوں نے عراقیوں کے ساتھ مل کر حضرت عثمان کو محاصرہ میں لے لیا ہے اور وہاں جانا خطرہ سے خالی نہیں ہے وہ وہیں سے واپس مصر کی طرف پلٹا مگر ابن ابی حذیفہ نے اسے حدود مصر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ جب اُسے کوئی ٹھکانا نظر نہ آیا تو فلسطین کی طرف چل دیا اور فلسطین سے متصل مصر کی آخری سرحد پر پہنچ کر ٹھہر گیا اور اس انتظار میں رہا کہ دیکھئے حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں اور اس محاصرہ کا نتیجہ کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اسی زمانۂ قیام میں ایک شخص ادھر سے گزرا اس سے دریافت کیا کہ تمہیں مدینہ کی شورش کے بارے میں کچھ علم ہے۔ اس نے کہا کہ عثمان قتل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سنا تو انا للہ و انا الیہ راجعون کہا۔ اور پھر پوچھا کہ خلافت کے لئے کون منتخب ہوا ہے کہا علی ابن ابی طالب۔ یہ سن کر اس نے پھر انا للہ و انا الیہ راجعون کہا۔ اس شخص نے کہا کہ تم حضرت عثمان کے قتل اور حضرت علی کی خلافت دونوں کو ایک طرح کا المیہ سمجھتے ہو۔ پھر غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم عبداللہ ابن سعد تو نہیں ہو کہا کہ ہاں میں عبداللہ ابن سعد ہوں۔ کہا کہ پھر بھاگ کر اپنی جان بچاؤ۔ ورنہ امیرالمومنین تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیں گے یا ملک سے نکال باہر کریں گے۔ عبداللہ وہاں سے دمشق کی طرف چل دیا اور کچھ عرصہ معاویہ کے زیر سایہ رہنے کے بعد ۳۶ھ یا ۳۷ھ میں عسقلان میں وفات پا گیا۔

ولید ابن عقبہ

ولید اروی بنت کریز کے بطن سے عقبہ ابن ابی معیط کا بیٹا اور حضرت عثمان کا مادری بھائی تھا عقبہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف محاذِ جنگ قائم کرنے والوں میں شامل تھا۔ مسلمانوں نے اسے اسیر کر کے آنحضرت کے پیش کیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ ولید اور اسکے بھائی

عمارہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا یہ اسلام، حق کو حق سمجھنے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک طرح کی اطاعت و سرافگندگی تھی جو مجبوری کی حالت میں اختیار کی جایا کرتی ہے۔

پیغمبر اکرم نے جب زکوٰۃ و صدقات کی وصولی کے لئے مختلف افراد مختلف قبائل کی طرف بھیجے تو ولید کو بنی مصطلق کی طرف بھیجا۔ جب وُہ ان کی بستیوں کے قریب پہنچا تو انہوں نے خیر سگالی کے طور پر اس کا استقبال کرنا چاہا اس نے انہیں آگے بڑھتے دیکھا تو خوفزدہ ہو کر واپس پلٹ آیا اور پیغمبر اکرم سے کہا کہ وہ لوگ اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ آنحضرت نے اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور ان کی تادیب و سرزنش کے لئے قدم اٹھانا چاہا۔ بنی مصطلق کو خبر ہوئی تو وہ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ ہمارے بارے میں جھوٹ بولا گیا ہے اور ہم پہ بہتان باندھا گیا ہے۔ ہم نہ اسلام سے منحرف ہوئے اور نہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجہالۃ۔	اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو بے خبری کی بناء پر نقصان پہنچاؤ۔"

ایک مرتبہ اس نے حضرت علی سے کہا کہ میں شمشیر زنی و صف شکنی میں آپ سے کم نہیں ہوں۔ حضرت نے فرمایا اسکت یا فاسق "اے فاسق چپ رہ" اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

افمن کان مومنا کمن کان فاسقا لا یستوون۔	کیا جو شخص ایماندار ہو اس شخص کے برابر ہو جائے گا جو فاسق ہو یہ (دونوں) برابر نہیں ہو سکتے۔"

ابن عباس کہتے ہیں:۔

نزلت فی علی ابن ابی طالب والولید ابن عقبہ۔	یہ آیت علی ابن ابی طالب اور ولید ابن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔"

(استیعاب۔ ج ۳۔ صہ ۵۹۶)

ان دونوں آیتوں میں اسے فاسق کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اس کے بعد ہر مجلس اور ہر اجتماع میں اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ اور جب تک قرآن پڑھا جاتا رہے گا اسی نام سے یاد کیا جاتا رہے گا۔

حضرت عثمان نے سعد ابن ابی وقاص کو جنہیں حضرت عمر نے مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کیا تھا امارت کوفہ سے معزول کر کے اس فاسق کو کوفہ کی گورنری کے لئے نامزد کیا اور پروانہ حکومت دے کر ادھر بھیج دیا۔

جب یہ کوفہ پہنچا تو چلچلاتی دھوپ میں سعد کے مکان پر آیا سعد کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ برطرفی کا حکم لے کر آیا ہے۔ پوچھا کہ کیسے آنا ہوا کہا کہ مجھے عثمان نے والیٔ کوفہ بنا کر بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں تمہیں امارت سے برطرف کر کے بیت المال اور تمہارے مقرر کردہ عمال کا جائزہ لوں۔ سعد نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ تم لوگ زیادہ زیرک و دانا ہو گئے ہو یا ہم حماقت و سفاہت کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ ردو بدل اور نصب و عزل کا کیا چکر ہے۔ کہا کہ اس حکومت نے کس سے وفا کی ہے جو تم سے وفا کرتی یہ صبح کو کسی کی ہوتی ہے اور شام کو کسی کی۔ لہٰذا جو چیز صبح ہے اور شام نہیں اس کے جانے پر غم نہ کیجئے آخر اسے ایک نہ ایک دن جانا ہی تھا۔ سعد نے کہا کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ تم نے اس ملک کو اپنے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جاگیر قرار دے لیا ہے کہ جسے چاہا بخش دیا اور جس سے چاہا چھین لیا۔

سعد کوفہ کی امارت ولید کے سپرد کر کے مدینہ واپس آ گئے۔ ولید برسر اقتدار آتے ہی اقتدار کے نشہ میں کھو گیا نائے نوش کی مجلسوں میں رونق آ گئی علانیہ شراب کے دور چلنے لگے اور خم کے خم لنڈھائے جانے لگے۔ ابن البر نے تحریر کیا ہے:۔

کان الاصمعی و ابوعبیدۃ و ابن الکلبی وغیرھم یقولون کان الولید ابن عقبہ فاسقا شریب خمر۔ (استیعاب۔ ج۳۔ ص۵۹۶)	اصمعی، ابو عبیدہ، ہشام ابن کلبی اور دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ ولید ابن عقبہ فاسق اور بلا کا شراب نوش تھا۔

ولید کے مصاحبین میں ایک عیسائی ابو زبید طائی مصاحب خاص اور اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ ولید نے مسجد سے متصل ایک مکان لے کر اسے دے دیا تھا وہ مسجد کے صحن سے گزر گاہ کا کام لیتا۔ اور اُدھر ہی سے آتا جاتا۔ لوگ ایک عیسائی کو شراب کے نشہ میں جھومتے لڑکھڑاتے آتے جاتے دیکھتے، تو پیچ و تاب کھاتے مگر کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ درباری ندیم کو روکے ٹوکے اور مسجد میں سے ہو کر گزرنے سے منع کرے۔ ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور دبی گھٹی آوازیں چیخ بن کر گونج اٹھیں۔ ہوا یہ کہ ولید نے نشہ کی ترنگ میں صبح کی نماز دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھا دی اور نمازیوں سے کہا کہ آج ہم وجد و بے خودی کے عالم میں ہیں اگر کہو تو اور پڑھا دیں۔ اور نماز میں قرأت کے بجائے یہ شعر دہراتا رہا۔

علق القلب الربابا   بعدما شابت و شابا

"دل بھی بوڑھا ہو گیا اور رباب بھی بوڑھی ہو گئی مگر دل ابھی تک اسی میں اٹکا ہوا ہے۔"

اہل کوفہ نے تنگ آکر حضرت عثمان سے شکایت کی اور ولید کی شراب نوشی پر گواہ پیش کیے۔ حضرت عثمان نے کوئی چارہ نہ دیکھا تو اسے مدینہ طلب کیا اور کوڑے لگوائے اور اس کی جگہ سعید ابن عاص کو حاکم کوفہ بنا کر بھیج دیا۔ سعید نے کوفہ میں وارد ہونے کے بعد حکم دیا کہ جس منبر پر ولید ایسا نجس و ناپاک آدمی بیٹھتا تھا اسے دھو کر پاک و صاف کیا جائے۔ اور جب تک اسے دھویا نہ گیا سعید نے اس پر بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ جب امیرالمومنین برسرِ اقتدار آئے تو ولید مدینہ کی سکونت چھوڑ کر بصرہ میں مقیم ہو گیا اور پھر وہاں سے رقہ کی طرف منتقل ہو گیا اور رقہ ہی میں وفات پائی اور وہیں پر ابوزبید طائی کے پہلو میں دفن ہوا۔

سعید ابن عاص

سعید، عاص ابن سعید کا بیٹا تھا جو جنگ بدر میں حضرت علی کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ سعید نے اپنے باپ کے مارے جانے کے بعد یتیمی کا زمانہ حضرت عثمان کے زیر سایہ گزارا۔ فتح شام کے بعد معاویہ کے پاس چلا گیا۔ پھر شام سے مدینہ چلا آیا اور ۳۰ھ میں ولید کی برطرفی کے بعد کوفہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔

سعید ایک خود پسند خودسر اور متشدد قسم کا آدمی تھا۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:-

کان فی سعید تجبر وغلظة وشدة سلطان۔ (استیعاب۔ ج ۲ ص ۹)

سعید جابر، درشت خو اور تشدد پسند تھا۔

اس کی تند خوئی و درشت مزاجی کے ثبوت میں یہ واقعہ کافی ہے کہ ایک مرتبہ عید کے چاند کے بارے میں اس نے لوگوں کو اپنے ہاں جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ تم میں سے کسی نے چاند دیکھا ہے؟ ہاشم ابن عتبہ نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے۔ اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہم نے نہیں دیکھا۔ اس پر سعید نے کہا کہ اس کانے نے تو چاند دیکھ لیا ہے اور تم لوگ نہیں دیکھ پائے۔ ہاشم کی ایک آنکھ جنگ یرموک میں جاتی رہی تھی۔ انہیں اس اندازِ تخاطب پر غصہ آیا اور کہا کہ تم میری یک چشمی پر کیا طنز کرتے ہو یہ آنکھ اللہ کی راہ میں جاتی رہی ہے۔ ہاشم تو یہ کہہ کر واپس آ گئے مگر چاند کی تصدیق کے لئے لوگوں کا اُن کے ہاں تانتا بندھ گیا۔ سعید کو یہ امر ناگوار گزرا اس نے چند آدمیوں کو بھیج کر انہیں بری طرح سے پٹوایا اور اُن کا گھر جلوا دیا۔ جب مدینہ میں یہ خبر پہنچی تو سعد ابن ابی وقاص نے حضرت عثمان سے کہا کہ اس ظلم و تشدد کی روک تھام ہونا چاہیئے۔ اور جب کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تو انہوں نے سعید کا گھر جو مدینہ میں تھا جلا دینا چاہا مگر حضرت عائشہ کے کہنے سننے سے رُک گئے۔

سعید جتنا عرصہ برسر اقتدار رہا۔ عوام اس کے ظلم و استحصال کا تختہ مشق بنے رہے۔ بیت المال کو ذاتی ملکیت سمجھ کر جسے چاہتا اور جو چاہتا بطور عطائے خسروانہ بخش دیتا۔ نہ اللہ کا ڈر تھا اور نہ مرکز کی طرف سے احتساب کا خطرہ۔ اگر اس کے خلاف کوئی آواز بلند کرتا تو اسے سختی سے دبا دیتا۔ اس کی جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک دفعہ جب کہ اعیان و اشراف کوفہ سے دربار چھلک رہا تھا برملا کہنے لگا۔

انما هذا السواد بستان قریش   عراق کی زمینیں صرف قریش (بنی اُمیہ) کی ہیں۔"

(تاریخ کامل۔ج ۳۔ص)

مالک ابن حارث اشتر یہ سن کر خاموش نہ رہ سکے کہنے لگے کہ جو زمینیں ہماری تلواروں نے فتح کی ہوں وہ تمہاری اور تمہاری قوم کی جاگیر نہیں ہو سکتیں۔ اس پر پولیس کا ایک افسر عبدالرحمٰن ابن حبیش اسدی بول اٹھا کہ امیر سچ تو کہتے ہیں اور مالک اشتر سے الجھنے لگا اور سخت کلامی پہ اُتر آیا۔ جب بات بڑھی تو مالک اشتر کا ایما پا کر بنی نخع اور اشراف کوفہ نے اس کو زدوکوب کیا اور اس قابل نہ چھوڑا کہ پیروں پر چل کر اپنے گھر جا سکے۔ اس واقعہ کے بعد نفرت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ جہاں چند لوگ جمع ہوتے سعید کو بُرا بھلا کہتے اور حضرت عثمان کو بھی کوستے جنہوں نے ایسے مطلق العنان لوگوں کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا۔ جو ان کے اموال کو خرد برد کرنے میں ذرا باک محسوس نہ کرتے تھے۔ سعید اور تو کچھ نہ کہہ سکا۔ ان لوگوں کا اپنے ہاں آنا جانا بند کر دیا اور حضرت عثمان کو لکھا کہ فلاں اور فلاں حکومت کے خلاف آمادۂ شورش و بغاوت ہیں اگر ان کا تدارک نہ کیا گیا تو وہ حکومت کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ حضرت عثمان نے جواباً تحریر کیا کہ ان لوگوں کو شام جلاوطن کر دیا جائے اور امیر شام معاویہ کو لکھا کہ چند شرپسند اور فتنہ جو لوگ شام بھیجے جا رہے ہیں ان کو اس طرح جھنجھوڑو کہ آئندہ حکومت کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کر سکیں۔ چنانچہ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور انہیں بجبر و قہر شام روانہ کر دیا گیا۔

یہ لوگ جنہیں شرپسند اور فتنہ پرداز قرار دیا گیا کوفہ کے اعیان و اشراف قاریان قرآن حفاظ حدیث اور صحابہ و تابعین تھے جو اپنے زہد و اتقاء علم و عمل اور فضل و شرف کے اعتبار سے اسلام کا عظیم سرمایہ تھے۔ ان میں مالک ابن حارث اشتر، مالک ابن کعب ارحبی، اسود ابن یزید نخعی، علقمہ ابن قیس نخعی، صعصعہ ابن صوحان عبدی، زید ابن صوحان، حارث ابن عبداللہ اعور، ثابت ابن قیس ہمدانی، کمیل ابن زیاد نخعی، جندب ابن زہیر غامدی، جندب ابن کعب ازدی، عروہ ابن جعد اور عمرو ابن حمق خزاعی ایسے عمائد کوفہ شامل تھے۔ ان کا جرم جس کی پاداش میں انہیں دربدری و جلاوطنی کی سزا دی گئی یہ تھا کہ انہوں نے حق کے قیام کے لئے باطل کی ہمنوائی نہیں کی اور حکمران طبقہ کی بے راہرویوں پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے حریت

ضمیر کو برقرار رکھا۔ اگر انہوں نے ایک ایسی حکومت میں جسے انتخابی و جمہوری حکومت کا نام دیا جاتا ہے اور جس میں آزادانہ اظہار رائے کا حق تسلیم کیا جاتا ہے حق گوئی و صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ مسلمانوں کی مشترکہ زمینوں پر ایک مخصوص گروہ کا قبضہ و تسلط غلط ہے تو کیا غلط کہا۔ اگر یہی لوگ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا شعار بنا لیتے اور سطوت و طاقت کے سامنے جھک کر ظلم کو عدل، بدی کو نیکی اور باطل کو حق کہنے لگتے تو غلط کار حکمرانوں کو ان کی غلط کاریوں پر روکنے ٹوکنے کی اُمید کس سے کی جاسکتی تھی یہی تو وہ لوگ تھے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ نظر انداز کر کے کبھی ظلم و عدوان سے رواداری برتنے پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ اور اگر اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ تشدد آمیز رویہ بھی اختیار کیا تو یہ ان کے دینی احساس اور اخلاقی فرض کا تقاضا اور حکومت کی بے اثری و بے وقعتی کا کرشمہ تھا۔

جب یہ لوگ جلاوطن ہو کر دمشق پہنچے تو انہیں کنیسہ مریم میں جگہ دی گئی اور معاویہ نے سخت گیری کے بجائے سیاسی لب و لہجہ میں انہیں ہمنوا بنانے کی کوشش کی اور کہا کہ تم لوگ اسلام کی بدولت ایک بلند مرتبہ و مقام پر پہنچے ہو اور دوسری قوموں پر غلبہ و فتح مندی حاصل کی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم قریش اور عمال حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہو اور انہیں علانیہ بُرا بھلا کہتے ہو اگر قریش نہ ہوتے تو تم ذلت و گمنامی کے گوشے میں پڑے رہتے اور تمہیں کوئی بھی نہ پوچھتا۔ تمہارے حکمران تمہاری سپر ہیں اسے توڑنے کی کوشش نہ کرو۔ حکومت اب تک تمہاری ناز یبا حرکتیں برداشت کرتی رہی ہے اگر تم باز نہیں آؤ گے تو اللہ تمہیں مصیبتوں میں جکڑ لے گا اور ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دے گا۔ صعصعہ نے کہا کہ تم نے قریش کے تفوق و امتیاز کا ذکر کیا ہے تو قریش کسی دور میں ہم سے گنتی میں زیادہ نہ تھے اور نہ ہم سے قوی و توانا تر تھے۔ رہا تمہارا یہ قول کہ فرمانروا ہماری سپر ہیں تو اسے ٹوٹنے دیجئے ہم خود اپنی سپر بن جائیں گے۔

اسی طرح بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا اور آپس میں سوال و جواب ہوتا رہا۔ ایک مرتبہ معاویہ نے دوران گفتگو میں کہا کہ قریش سے یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ میرا باپ ابوسفیان قریش میں سب سے زیادہ معزز و باوقار تھا البتہ آنحضرت کو نبوت مل گئی جو کسی اور کو نہ مل سکی۔ اگر تمام لوگ ابوسفیان کی اولاد ہوتے تو سب کے سب زیرک و دانا ہوتے۔ صعصعہ نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ حضرت آدم جو ابوسفیان سے بہر حال بہتر تھے اللہ نے انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ان میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں کو ان کے سجدہ پر مامور فرمایا۔ ان کی اولاد میں عقلمند بھی ہیں اور بے وقوف بھی اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ معاویہ سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور چپ سادھ لی۔ ایک اور ملاقات میں کہا کہ تمہیں اپنی بھلائی پر نظر کرنا چاہئے۔ جو تمہارے

اور تمہارے قبیلہ اور عامہ اہل اسلام کے لئے مفید ہو۔ صعصعہ نے کہا کہ یہ تم نے نیکی و ہدایت کا درس دینا کب سے شروع کیا ہے کیا اس میں کوئی فلاح و بہبود کا پہلو ہے کہ ہم اللہ کی معصیت کرتے ہوئے تمہاری اطاعت کریں۔ معاویہ نے کہا کہ میں نے یہی تو کہا ہے کہ اللہ سے ڈرو، نبی کی پیروی کرو اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ پردازی سے باز آؤ۔ صعصعہ نے کہا کہ تم نے کب رسول کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی اور تفرقہ و انتشار کو ہوا نہیں دی۔ معاویہ نے کہا کہ اگر ایسا ہوا ہو تو میں توبہ کرتا ہوں اور اور اب تمہیں تقویٰ و اطاعت اور جماعت سے وابستگی کا حکم دیتا ہوں تم اپنے حکمرانوں کی عزت و توقیر کرو اور ان سے تعاون کرتے ہوئے دوستی و خیر خواہی کی فضا میں انہیں مشورے دو۔ صعصعہ نے کہا کہ پھر ہم تمہیں خلوص نیت سے یہ مشورہ دیتے ہیں۔ کہ تم امارت شام کے منصب سے الگ ہو جاؤ اور جو اس منصب کا تم سے زیادہ حقدار ہے اس کے لئے جگہ خالی کرو۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ عرب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کے اسلامی خدمات تم سے کہیں زیادہ ہیں کہا کہ یہ صحیح ہے مگر اس وقت بار حکومت اٹھانے کا مجھ سے زیادہ کوئی اہل نہیں ہے۔ اگر مجھ میں کوئی کمزوری ہوتی تو حضرت عمر میری پاسداری نہ کرتے اور مجھے اس عہدہ پر باقی نہ رہنے دیتے۔ لہٰذا امارت شام سے دستبردار ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا یہ مشورہ شیطانی وسوسہ ہے اور شیطان کی اطاعت کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس پر صعصعہ اور دوسرے لوگ بگڑ گئے۔ اور معاویہ پر جھپٹے۔ معاویہ نے کہا کہ یہ کوفہ نہیں ہے۔ سر زمین شام ہے اگر یہاں کے لوگوں کو تمہاری اس حرکت کا علم ہو گیا تو وہ تمہیں قتل کئے بغیر نہیں رہیں گے یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور منزل پر پہنچ کر حضرت عثمان کو تحریر کیا کہ وہ لوگ جو ہمارے یہاں آئے ہیں انہیں نہ عقل و شعور سے واسطہ ہے اور نہ دین و مذہب سے لگاؤ۔ ان کا مقصد صرف فتنہ گری اور شر انگیزی ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ لوگ یہاں رہے تو فتنہ و شر پھیلائیں گے اور شامیوں کو آمادہ بغاوت کریں گے لہٰذا مناسب ہو گا کہ انہیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیا جائے۔ حضرت عثمان نے لکھا کر انہیں سعید ابن عاص کے پاس کوفہ روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہیں واپس کوفہ بھیج دیا گیا۔ سعید سے کشیدگی تو تھی ہی یہاں آنے پر حالات رو باصلاح ہونے کے بجائے اور بگڑ گئے۔ حضرت عثمان کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مالک اشتر کو تحریر کیا کہ تم لوگ کوفہ خالی کر دو اور یہاں سے حمص چلے آؤ۔ اشتر نے یہ فرمان پڑھا تو کہا:۔

اللّٰھم اسوانا نظر اللراعیة	بار الہا! ہم میں سے جو رعیت کا بدخواہ اور
واعملنا فیھم بالمعصیة فعجل	اس کے حق میں معصیت کار ہو اس پر جلد عذاب

له النقمة۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۳۶۷) نازل کرے"

یہ لوگ کوفہ سے حمص چلے آئے والی حمص عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید نے ان کی تذلیل و تحقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور انہیں طرح طرح کے شدائد و آلام میں جکڑے رکھا۔ جب انہیں ایک مہینہ قید و بند میں سختیاں جھیلتے گزر گیا تو انہیں پھر کوفہ بھیج دیا گیا۔ اب رعایا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا لوگ عثمانی عمال کے ہاتھوں پہلے ہی نالاں تھے کہ حضرت عثمان کے اس طرز عمل سے جو ان معزز و سربلند افراد کے ساتھ روا رکھا گیا ہر طرف غضب و انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے۔ نظم مملکت تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ حضرت عثمان ان بدلے ہوئے حالات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس ہمہ گیر شورش کو دبانے کے لئے ۳۴ھ میں عمال و حکام کو مدینہ میں طلب کیا۔ سعید ابن عاص بھی کوفہ سے مدینہ آیا اور جب یہاں سے فارغ ہو کر کوفہ کی طرف پلٹا تو قادسیہ کے قریب جرعہ کے مقام پر اسے روک دیا گیا اور مالک اشتر اور ان کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ ہم تمہیں کوفہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے تم جدھر سے آئے ہو ادھر واپس چلے جاؤ۔ سعید نے کچھ حیل حجت کی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی اور سب نے کہا کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے، کہ واپس پلٹ جاؤ اب عوام کے ریلے کو روکنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ وہ وہیں سے واپس مدینہ آ گیا۔ حضرت عثمان نے اس کی جگہ ابو موسیٰ اشعری کو بھیج دیا۔ جن کی کارگزاریوں کا تذکرہ جمل اور تحکیم کے سلسلہ میں ہو گا۔

قصاص خون عثمان

قصاص یعنی خون کے بدلے خون ایک ایسا ضابطہ ہے جسے نہ عقل غلط کہتی ہے اور نہ شرع بلکہ تمام ملل و ادیان اس کی ضرورت پر متفق ہیں مگر ہر قاعدہ و قانون میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور یہ ضابطہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی جرم کی پاداش میں قتل کر دیا جاتا ہے یا کہ کوئی شخص اپنی جان کے بچاؤ کے لئے حملہ آور کو قتل کر دیتا ہے جب کہ جان کا تحفظ اس کے قتل پر منحصر ہو تو ان دونوں صورتوں میں اگرچہ فعل قتل کا ارتکاب ہوا ہے مگر نہ شرع قصاص کا حکم دیتی ہے اور نہ عقل۔ اسی طرح متعدد ایسے موارد شمار کئے جا سکتے ہیں جہاں قصاص کا حکم عائد نہیں ہوتا جہاں تک نفسِ قصاص کا تعلق ہے اس کی مشروعیت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے البتہ اس کے موارد میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

امیرالمومنین کے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جب قصاص خونِ عثمان کا مسئلہ چھڑا تو یہ مسئلہ بھی اختلافی بن گیا یا بنا دیا گیا اور لوگ دو مختلف اور متضاد گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ حضرت عثمان کے قتل کو جائز قرار دیتا تھا اس کے نزدیک قصاص کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور ایک گروہ اس قتل کو ناروا سمجھتا تھا اور قصاص کا پُرزور حامی تھا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ مطالبہ صحیح تھا یا غلط جو بھی صورت ہو عملی اعتبار سے یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا کہ اس کا فوری حل نکل آتا اور ان پیچیدگیوں اور دشواریوں کو بآسانی دور کیا جا سکتا جو اس راہ میں حائل تھیں اگر امیرالمومنین اس قتل کو ناروا سمجھتے ہوئے قصاص کی طرف متوجہ ہوتے تو اس گروہ کے بگڑنے کا اندیشہ تھا جو اس قتل کو بربنائے تادیل جائز سمجھتا تھا۔ اور قصاص کے خلاف تھا۔ اور اگر قصاص سے پہلو تہی کرتے تو وہ گروہ آمادۂ بغاوت نظر آتا تھا جو اس خون کو خونِ ناحق قرار دیتا تھا۔ اس وقت ایک طرف جھکاؤ انتہائی خطرناک تھا اور حکومت میں بھی استادم نہ تھا کہ دونوں گروہوں کے جذبات کو متوازن سطح پر لا کر اس گتھی کو سلجھایا جا سکتا۔ ابھی نہ ملکی معاملات منضبط ہوئے تھے نہ حکومت میں استحکام پیدا ہوا تھا۔ ہر طرف کھینچا تانی اور افراتفری کا عالم تھا، نہ قصاص طلب کرنے والوں کے جذبات کو فرو کیا جا سکتا تھا اور نہ بلوائیوں کو بآسانی گرفت میں لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب طلحہ و زبیر اور ان کے ہم خیال لوگوں نے حضرت سے قصاص کے بارے میں کہا تو آپ نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا" جو تم جانتے ہو میں اس سے بے خبر نہیں ہوں لیکن میرے پاس اس کی قوت و طاقت کہاں ہے۔ جب کہ فوج کشی کرنے والے اپنے انتہائی زوروں پر ہیں وہ اس وقت ہم پر مسلط ہیں ہم ان پر مسلط نہیں اور عالم یہ ہے کہ تمہارے غلام بھی اُن کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور صحرائی عرب بھی اُن سے مل جل گئے ہیں اور اس وقت بھی وہ تمہارے درمیان اس حالت میں ہیں کہ جیسا چاہیں تمہیں گزند پہنچا سکتے ہیں۔ کیا تم جو چاہتے ہو اس پر قابو پانے کی کوئی صورت تمہیں نظر آتی ہے۔"

حضرت نے اس وقت کے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس وقت مدینہ پر بلوائی چھائے ہوئے تھے اور ہر طرف انہی کا عمل دخل تھا۔ وہ جو چاہتے کرتے کسی کو ان کے خلاف عملی اقدام تو درکنار لب کشائی کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اگر امیرالمومنین اس وقت قصاص کے لئے قدم اٹھاتے تو ایسا نہ تھا کہ وہ چپکے سے تلوار کے آگے سر خم کر دیتے اور کوئی مزاحمت نہ کرتے بلکہ وہ پوری قوت و طاقت سے مقابلہ کرتے اور وہ خونی ہنگامہ برپا ہوتا کہ مدینہ کے کوچہ و بازار لاشوں سے پٹ جاتے۔ آخر وہ اتنے کمزور نہ تھے کہ بآسانی ان پر قابو پا لیا جاتا۔ اگر وہ اتنے ہی کمزور ہوتے تو محاصرہ کے دنوں میں ہی طالبانِ

قصاص اہلِ مدینہ کے تعاون سے انہیں روکتے قتل سے مانع ہوتے اور اگر باز نہ آتے تو ان سے جنگ کرتے مگر اس وقت تو ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور گھروں کے گوشوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اور جب حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے تو حضرت پر قصاص کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ان بلوائیوں کی قوت و طاقت اور ان کے مقابلہ میں اپنی کمزوری و بے بسی کے یہ خود معترف تھے۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے حضرت کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا اور حضرت عائشہ نے یہ رائے دی کہ مدینہ پر حملہ کرنا چاہئے کیونکہ قاتلانِ عثمان مدینہ ہی میں ہیں تو طلحہ و زبیر اور دوسرے لوگوں نے کہا:۔

یا ام المومنین دعی المدینۃ فان	اے ام المومنین مدینہ کا ارادہ ترک کیجئے اس لئے
من معنا لا یقرنون لتلک الغوغأ	کہ وہ لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ان بلوائیوں کا
التی بہا و اشخصی معنا الی البصرۃ	مقابلہ نہیں کر سکتے جو مدینہ میں ہیں آپ ہمارے
(تاریخ طبری - ج ۳ - ص۴)	ہمراہ بصرہ چلئے"

جب یہ لوگ سامانِ جنگ اور فوجی طاقت کے ہوتے ہوئے مدینہ میں جنگ نہیں چھیڑتے اور عذر یہ کرتے ہیں کہ بلوائیوں کے مقابلہ کی قوت و طاقت اپنے اندر نہیں پاتے اور اگر یہی عذر حضرت پیش کریں تو اس کے تسلیم کرنے میں پس و پیش کیوں۔ اگر ان لوگوں کا مقصد قصاص ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قاتلین کو مدینہ میں چھوڑ کر بصرہ کا رخ کرتے ان کا مقصد تو قصاص کی آڑ میں حضرت کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا تھا تاکہ حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے اقتدار کی راہ ہموار کریں ورنہ یہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ آخر قصاص کس سے لیا جائے جب کہ حضرت عثمان کے قتل کی ذمہ داری ایک یا دو چار گنے چنے افراد پر عائد نہیں ہوتی بلکہ مدینہ، مصر، بصرہ اور کوفہ کے لوگ اس میں شریک تھے اور وہ صحابہ بھی اس میں ملوث تھے جنہوں نے خطوط لکھ کر بلوائیوں کو حضرت عثمان کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اور وہ مہاجرین و انصار اور صحابہ کبار بھی شامل تھے جنہوں نے بیرونی حملہ آوروں کی پشت پناہی کی تھی۔ اگر وہ ان کی حمایت و پشت پناہی نہ کرتے تو انہیں خلیفۂ وقت کو محاصرہ میں لے کر قتل کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔

اب قصاص کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ان تمام لوگوں کو جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں اس میں حصہ لیا تھا نہ تیغ کر دیا جاتا خواہ کوئی صحابی ہو یا تابعی، مدنی ہو یا مصری، کوفی ہو یا بصری اور دوسری صورت یہ تھی کہ بلوائیوں کی جماعت میں سے اصلی قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا اور انہیں قصاصاً قتل کیا جاتا۔ پہلی صورت ممکن ہی نہ تھی اور نہ اس کا کوئی شرعی جواز تھا کہ ایک کے بدلے میں ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور دوسری صورت میں ضروری تھا کہ قاتلوں کی نشاندہی کی جاتی ان کے خلاف شہادتیں ہوتیں اور

ثبوت جرم کے بعد انہیں قتل کیا جاتا مگر ان کے خلاف گواہی کی نوبت تو اس وقت آتی جب کوئی موقع واردات پر موجود ہوتا۔ جو چند اموی حضرت عثمان کے گھر میں جمع تھے وہ تو حملہ کے وقت اِدھر اُدھر ہو گئے یا ام حبیبہ کے گھر میں جا چھپے اور جو رہ گئے وہ مارے گئے البتہ حضرت عثمان کی زوجہ نائلہ بنتِ فرافصہ موقع پر موجود تھیں تو وہ کسی کی نشاندہی نہ کر سکیں۔ چنانچہ امیرالمومنین نے قاتلوں کے بارے میں اُن سے پوچھا تو انہوں نے کہا:۔

لا ادری دخل علیہ رجلان لا اعرفہما و معہما محمد ابن ابی بکر۔ (صواعق محرقہ۔ ص۱۱۸)	مجھے معلوم نہیں ہے البتہ محمد ابن ابی بکر کے ساتھ دو آدمی اندر گھسے تھے میں ان دونوں کو نہیں پہچانتی۔"

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قاتل زندہ موجود تھے اور ان پر قتل کا جرم بھی ثابت تھا پھر بھی اس امر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا وجوہ تھے جن کی بناء پر وہ قتل ایسے سنگین جرم پر اُتر آئے۔ یہ امر تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ قتل ہنگامی جذبات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ مسلسل گفت و شنید اور باہمی مفاہمت کی ناکامی کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی۔ چنانچہ مختلف شہروں کے وفود حضرت عثمان کے ہاں آتے رہے۔ عمال کی بے عنوانیاں ان کے گوش گزار ہوتی رہیں اور وہ ہر مرتبہ رفع شکایات کے وعدے کرتے رہے۔ مگر یہ وعدے کسی منزل پر پورے نہ ہوئے جب انہیں وعدے یاد دلائے گئے اور عمال کی برطرفی پر زور دیا گیا تو یہ جواب دیا گیا:۔

ان کنت مستعملا من اردتم وعازلا من کرہتم فلست فی شیئ والامر امرکم۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۸۶)	جسے تم چاہو میں عامل مقرر کروں اور جسے تم نہ چاہو اسے معزول کروں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں کوئی چیز ہی نہیں اور حکم چلتا ہے، تو تمہارا چلتا ہے۔"

اس پر ان لوگوں کو برہم ہونا ہی تھا انہوں نے بگڑ کر کہا کہ اگر مظالم کا ازالہ اور عمال کی برطرفی آپ کے بس کی بات نہیں ہے تو خلافت سے دستبردار ہو کر گھر میں بیٹھ جائیے ہم آپ سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہم آخری قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ تم کس جرم کی پاداش میں مجھے قتل کرو گے۔ قتل سزا ہے ارتداد کی یا زنائے محصنہ کی یا قتل ناحق کی اور میں ان چیزوں میں سے کسی ایک کا بھی مرتکب نہیں ہوا انہوں نے کہا کہ جو زمین میں فساد پھیلائے یا باغیانہ قدم اٹھائے یا دوسروں کے حقوق میں حائل ہو کر قتال کرے ان کے لئے بھی کتاب اللہ میں قتل کا

حکم ہے اور آپ ان تمام چیزوں کے مرتکب ہوئے ہیں آپ نے حکومت کے بل پر معزز ترین صحابہ کو پٹوایا انہیں خوفزدہ کیا اور در بدر پھرایا رعایا پر مظالم ڈھائے لوگوں کے حقوق پامال کئے اور حق کا مطالبہ کرنے والوں کے سروں پر تلواریں آویزاں کیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ لوگ جو تلواریں لئے آپ کے سینہ سپر بنے ہوئے ہیں آپ کی مرضی کے خلاف لڑ بھڑ رہے ہیں تو وہ اسی لئے تو لڑ رہے ہیں کہ آپ مسند خلافت سنبھالے ہوئے ہیں اگر آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو ان کی تلواریں بھی کند ہو جائیں گی اور وہ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جائیں گے۔ حضرت عثمان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور خاموشی کے ساتھ اندر چلے گئے۔

اس گفتگو سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے آخری قدم اس وقت اٹھایا جب حضرت عثمان پر حجت تمام کر دی اور یہ سمجھ لیا کہ قرآن وسنت کی رُو سے اُن کا قتل جائز ہے اور اس جواز کو تقویت ان صحابہ کے قول و عمل سے بھی حاصل ہوئی جو اس قتل کے جواز پر متفق تھے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ طلحہ ابن عبیداللہ، زبیر ابن عوام، عمرو ابن عاص اور دوسرے اکابر صحابہ قتل کے جواز کے فتوے دے رہے تھے۔ اگر جنگ جمل میں طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے اقدام کو اجتہادی غلطی قرار دیا جاتا ہے۔ تو اس موقع پر بھی ان کے اجتہاد کو تسلیم کر کے اسے کم از کم اجتہادی غلطی قرار دینا چاہیئے۔ بہر حال ان لوگوں نے قرآنی شواہد پیش کرنے کے بعد یہ اقدام کیا اور بر بنائے تاویل قتل کے مرتکب ہوئے اور جو قتل تاویل کی بناء پر ہو اس میں شرعاً قصاص کا جواز ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری تحریر کرتے ہیں :۔

انما لم یقتل علی قتلۃ عثمان لانھم کانوا البغاۃ اذا الباغی لہ منعۃ و تاویل و کانوا فی قتلہ متاولین و کان لھم منعۃ فانھم کانوا مستحلین ذلک بما نقموا من الامور والحکم فی الباغی اذا انقاد لامام العدل ان لا یواخذ بما سبق من اتلاف اھل العدل وسفک دمائھم و

حضرت علی نے عثمان کے قاتلین کو قتل نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ باغی تھے اور جو باغی ہوتا ہے وہ قوت و طاقت بھی رکھتا ہے۔ اور اپنے اقدام کے جواز کی تاویل بھی۔ وہ لوگ حضرت عثمان کے قتل میں تاویل بھی رکھتے تھے اور حکومت سے ٹکراؤ کی قوت بھی۔ اور حضرت عثمان کی ناپسندیدہ باتوں کی وجہ سے اس اقدام کو جائز و حلال سمجھتے تھے۔ اور ایسے باغیوں کا حکم شرعی یہ ہے کہ جب وہ امام عادل کے مطیع ہو جائیں تو جو کچھ وہ پہلے اہل عدل کا نقصان کر چکے ہوں ان کا خون بہا چکے ہوں اور ان کے بدنوں کو مجروح کر چکے ہوں

جرحاً ابداً انهم فلم یجب علیه قتلهم ولا دفعهم الی الطالب۔ (شرح فقہ اکبر۔ صہ)

ان سے ان چیزوں کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا حضرت علی کے لئے ضروری نہ تھا کہ وہ انہیں قتل کریں۔ یا قصاص طلب کرتے والوں کے حوالے کریں۔"

جنگِ جمل

جنگِ جمل تاریخ اسلام کی وہ بلا خیز و ہلاکت آفریں جنگ ہے جو امیرالمومنین کے اوائل عہد حکومت میں خونِ عثمان کے نام پہ لڑی گئی اس خونریز جنگ کے نتائج و عواقب اور تفریق بین المسلمین کی ذمہ داری بڑی حد تک ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر پہ عائد ہوتی ہے جو حضرت عثمان کے خون کا قصاص لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ یہی لوگ ان کی زندگی میں سخت مخالفت کرتے اور لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رسول اللہ کے نعلین اور پیراہن مبارک کو حضرت عثمان کے سامنے رکھ کر برملا کہا کرتی تھیں کہ ابھی یہ چیزیں کہنہ بھی نہیں ہونے پائیں کہ تم نے رسولِ خدا کے دین اور ان کے سنن و احکام کو سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے۔ حضرت عائشہ عوامی مزاج کے سمجھنے میں کافی درک رکھتی تھیں انہوں نے عوام کے جذبات بھڑکانے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو موثر ترین ہو سکتا تھا وہ سمجھتی تھیں کہ لوگ پیغمبر سے والہانہ عقیدت کی بناء پر آپ کے جسم مبارک سے مس ہونے والے آثار کو دیکھنے کی انتہائی تڑپ رکھتے ہیں اور جب یہ چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں گی تو ان میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان چیزوں کو دیکھتے ہی لوگوں کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے قصر خلافت کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اور جب ام المومنین نے یہ دیکھا کہ محاصرین کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے تو مروان ابن حکم، عبدالرحمٰن ابن عتاب اور زید ابن ثابت کے روکنے کے باوجود حضرت عثمان کو محاصرہ میں چھوڑ کر مکہ روانہ ہو گئیں اور دورانِ سفر میں بھی لوگوں کو ان کے خلاف کہتی سنتی اور برانگیختہ کرتی رہیں۔ چنانچہ جب مدینہ سے سات میل کے فاصلہ پر مقام صلصل میں پہنچیں تو ابن عباس سے جو امیرحج کی حیثیت سے مکہ جا رہے تھے پرزور الفاظ میں کہا:۔

یابن عباس انشدك الله فانك قد اعطیت لسانا ازعیلا ان تخذل الناس من هذا الرجل

اے عباس تم کو گویائی و چرب زبانی کا جوہر عطا ہوا ہے میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں کہ تم لوگوں کو اس شخص (عثمان) کی مدد سے روکو۔ اور

وان تشكك فيه الناس فقد بانت لهم بصائرهم وانهجت ورفعت لهم المنار وتجلبوا من البلدان لامر قد حم وقد رأيت طلحة ابن عبيد الله قد اتخذ على بيوت الاموال والخزائن مفاتيح فان يل يسره بسيرة ابن عمه ابي بكر (تاریخ طبری۔ ج۔ صہ ۴۴۲)

ان کے بارے میں لوگوں کو شک وشبہ میں ڈالو۔ یوں بھی لوگوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ حقیقت کی راہ ہموار اور روشنی کا مینار بلند ہو چکا ہے لوگ مختلف شہروں سے فیصلہ کن امر کے لئے جمع ہو چکے ہیں آپ جانتے ہیں کہ طلحہ ابن عبید اللہ بیت المال اور خزانے کی کنجیوں پر قابض ہو چکا ہے اگر خلافت اس کے سپرد کی گئی تو وہ قدم بقدم اپنے ابن عم ابو بکر کی سیرت پر چلے گا"

حضرت عائشہ حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی چھ سالوں تک تو ان کی خیر خواہی و ہمنوائی کرتی رہیں مگر اس کے بعد ان سے ان بن ہو گئی اور علانیہ مخالفت پر اتر آئیں۔ اس عناد و مخالفت کی وجہ بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ حضرت عثمان نے ان کا وہ وظیفہ جو انہیں سابقہ حکومت کی طرف سے ملتا تھا کم کر دیا تھا۔ چنانچہ مؤرخ یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

وكان بين عثمان وعائشة منافرة وذالك انه نقصها مما كان يعطيها عمر ابن الخطاب وصيرها اسوة غيرها من نساء رسول الله (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صہ ۱۳۲)

حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کے درمیان نفرت کی خلیج حائل تھی اور انہوں نے وہ وظیفہ جو انہیں حضرت عمر دیا کرتے تھے کم کر دیا اور رسول خدا کی دوسری بیویوں کے برابر انہیں دینا شروع کر دیا۔"

حضرت عثمان اور ان کے عمال کی آمرانہ روش کی وجہ سے فضا کچھ تو پہلے ہی ان کے خلاف تھی کہ ام المومنین کی اشتعال انگیز باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

آتشم تیز است و داماں مے زنم

اس مخالفت نے زور پکڑ لیا اور لوگ ان کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے خصوصاً طلحہ ابن عبید اللہ اور ان کا قبیلہ بنی تیم اس مخالفت میں پیش پیش تھا۔ طلحہ نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے اور ان کے قتل کے اسباب فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

لم يكن احد من اصحاب النبي اشد على عثمان من طلحة۔

اصحاب نبی میں طلحہ سے بڑھ کر حضرت عثمان پر سخت گیر کوئی

نہ تھا" (انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۱۱۳)

چنانچہ انہی نے محاصرہ کے دنوں میں لوگوں کو ان تک پانی پہنچانے سے منع کیا۔ انہی نے رات کے اندھیرے میں ان کے گھر پر تیر برسائے اور لوگوں کو ان کے خلاف مشتعل کیا اور گھیرا ڈالنے والوں کے سرگروہ اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے اصحابی عبدالرحمٰن ابن عدیس کو تاکید کی کہ وہ کسی کو ان کے گھر کے اندر جانے اور باہر نکلنے کی اجازت نہ دے۔ حضرت عثمان کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا:۔

اللھم اکفنی طلحۃ ابن عبید اللہ — خدایا مجھے طلحہ ابن عبید اللہ کے شر سے بچائے رکھ

فانہ حمل علیٰ ھٰؤلاء والبھم — اسی نے لوگوں کو میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ اور میرے گرد گھیرا ڈلوایا ہے" (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۱۱)

طلحہ کا یہ رویہ حضرت عثمان کی زندگی تک ہی نہ تھا بلکہ ان کے قتل کے بعد بھی ان کی روش میں فرق نہ آیا اور ان کی نعش پر اور تجہیز و تکفین کرنے والوں پر پتھر برسوائے اور جنۃ البقیع میں دفن ہونے سے مانع ہوئے۔

اسی طرح زبیر جن کے گھر میں حضرت عائشہ کی ہمشیرہ اسماء تھیں محاصرہ کے دنوں میں لوگوں کو یہ کہتے سنے گئے:۔

اقتلوہ فقد بدل دینکم۔ — عثمان کو قتل کر دو اس نے تو تمہارا دین ہی بدل ڈالا ہے" (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص ۴۰۴)

انہی لوگوں نے حضرت عثمان کے قتل کی بنیاد رکھی اور ان کے خلاف ایسی فضا پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں وہ قتل کر دیئے گئے۔ اگر قتل عثمان جرم تھا تو ان لوگوں کو اس جرم سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اعانتِ جرم بھی جرم ہوتی ہے۔ اگرچہ ام المومنین قتل عثمان کے موقع پر مدینہ میں موجود نہ تھیں مگر انہوں نے مدینہ قتل عثمان سے صرف بیس دن پہلے چھوڑا تھا جب کہ انہیں اپنے لگائے ہوئے پودے کے بار آور ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ اس موقع پر روانگی کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ مدینہ کی شورش و ہنگامہ آرائی سے انہیں بے تعلق سمجھا جائے اور جب وہ قتل ہو جائیں تو طلحہ یا زبیر کو برسرِ اقتدار لا کر اس مالی نقصان کو جو انہیں موجودہ حکومت سے پہنچا تھا تلافی کر لیں مگر ام المومنین اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکیں اور اہلِ مدینہ نے ان کی عدم موجودگی میں حضرت علی کی خلافت کا فیصلہ کر لیا۔

طلحہ و زبیر حضرت عمر کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے نامزد رکن تھے اور اس رکنیت کی وجہ سے اپنے ذہن کو خلافت کے تصور سے خالی نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ قتلِ عثمان کے سلسلہ میں تگ و دو اسی مقصد

کے حصول کے لئے تھی۔ مگر جب یہ دیکھا کہ لوگ حضرت علی کی خلافت پر مصر ہیں اور ان کے علاوہ کسی اور کی بیعت پر رضامند نہیں ہیں اور نہ ان کے سوا کوئی دوسرا ان کے معیار پر پورا اترتا ہے تو انہوں نے رائے عامہ کا رُخ دیکھ کر بیعت میں پیش قدمی کی اور اطاعت و سرافگندگی کا اظہار کرتے ہوئے بیعت کر لی۔ اگر انہیں برسراقتدار آنے کی کچھ بھی گنجائش نظر آتی تو وہ ہاتھ پیر مارتے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ "مگر عصمت بی بی از بے چادری انہیں چپ سادھنا پڑی اور چپ کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت دو گروہوں میں سے ایک گروہ کی پشت پناہی ضروری تھی اور انہیں کسی ایک گروہ کی بھی حمایت حاصل نہ تھی۔ ایک گروہ وہ جو حضرت عثمان کے عادات و اطوار اور ان کے طرزِ عمل سے نالاں تھا اور ایک وہ جو ان سے وابستگی کی بنا پر ان کا دوست و ہمنوا تھا۔ وہ گروہ جو ان کے طرزِ عمل کا شکوہ سنج تھا وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی برسراقتدار لانا نہ چاہتا تھا اس لئے کہ ان کے طور طریقے بھی وہی تھے جن طور طریقوں کی وجہ سے لوگ حضرت عثمان کے خلاف ہوگئے تھے اور انہیں اپنا رویہ بدلنے یا خلافت سے دستبردار ہونے پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان اگر دولت کی جمع آوری کی طرف مائل تھے تو انہیں بھی زہد و قناعت سے کوئی ربط اور سادگی و سادہ معاشرت سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ دولت کے بے پناہ ذخائر کے باوجود حرص و آز کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے اور دولت پر دولت سمیٹتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ طلحہ نے عراق و سراۃ میں کثیر جائیدادیں پیدا کیں کوفہ و بصرہ میں محلات تعمیر کئے اور بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑ گئے ابن عبد ربہ نے تحریر کیا ہے:۔

لما قتل طلحة ابن عبيد الله وجدوا في تركته ثلثمائة بهار من ذهب وفضة۔	جب طلحہ ابن عبید اللہ مارے گئے تو ان کے ترکہ میں پوری پوری کھال کے بنے ہوئے تین سو تھیلے پائے گئے جن میں سونا اور چاندی بھری ہوئی تھی۔"
(عقد الفرید۔ ج ۳۔ صد ۱۰۳)	

زبیر ابن عوام بھی اپنے دور میں امیر الامراء اور عظیم سرمایہ دار تھے۔ چنانچہ ذہبی نے تحریر کیا ہے:۔

كان له الف مملوك يؤدون اليه الخراج۔	ان کے ہاں ایک ہزار غلام تھے جو انہیں خراج ادا کرتے تھے۔"
(تاریخ اسلام۔ ج ۲۔ صد ۱۵۴)	

انہوں نے اسکندریہ مصر بصرہ اور کوفہ میں قصر تعمیر کئے اور غلاموں کنیزوں اور اونٹ گھوڑوں کے علاوہ ان کی سینت سینت کے رکھی ہوئی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وصیت کے مطابق

ایک تہائی ان کے پوتے کو دینے کے بعد:-

صار لکل امرأۃ من نسائہ۔ وکان لہ اربع نسوۃ۔ فی ربع الثمن الف الف ومائۃ الف۔

(عقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۱۰۴)

ان کی چاروں بیویوں میں سے ہر ایک کو گیارہ گیارہ لاکھ ملا جو آٹھویں حصہ کی ایک چوتھائی تھا۔"

اب رہا دوسرا گروہ جو حضرت عثمان کا ہواخواہ تھا تو وہ ان دونوں کو قتل عثمان کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کرنے کی وجہ سے مسند خلافت پر دیکھ نہ سکتا تھا۔ اگرچہ طلحہ نے حضرت عثمان کی زندگی ہی میں بیت المال کی کنجیوں پر قبضہ کرکے خلافت کی تمہید بٹھالی تھی مگر نہ انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور نہ زبیر کو۔

جب مسند اقتدار کو خالی کروانے کے باوجود انہیں مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو جزوی اقتدار کی کی طرف رخ کیا اور بیعت کے دوسرے ہی دن حضرت سے یہ مطالبہ کر دیا کہ انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت دے دی جائے اور بیعت میں پیش قدمی کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس طرح حضرت کو ممنونِ احسان کرکے حکومت میں کوئی امتیازی عہدہ حاصل کر لیں۔ مگر حضرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ مملکت کے ان علاقوں کو جو حکومت کے محاصل کا سرچشمہ تھے ان کی بڑھتی ہوئی حرص و ہوس کی آماجگاہ بننے دیں۔ چنانچہ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تمہارے معاملہ میں جو بہتر سمجھوں گا وہ کروں گا فی الحال تم دونوں کا مرکز میں میرے قریب رہنا زیادہ بہتر ہے۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ چونکہ انہیں کوفہ و بصرہ میں اثر و نفوذ حاصل ہے اور انہی کی بھاگ ڈور سے وہاں کے لوگ مرکزی حکومت میں انقلاب لانے کے لئے جمع ہوئے تھے اس لئے حضرت ان کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے بلا تامل انہیں کوفہ و بصرہ کی حکومت کا پروانہ دے دیں گے اور رکن شوریٰ ہونے کی وجہ سے وہ اسے اپنا جائز حق بھی سمجھتے تھے مگر انہیں یاس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اس حکومت میں نہ انہیں من مانی کرنے کا موقع ملے گا اور نہ وہ خصوصی مراعات حاصل ہوں گی جو سابقہ حکومتوں میں حاصل تھیں۔ اب انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے غیر آئینی خطوط پر سوچنا شروع کر دیا اور اپنی نگاہوں کا رُخ حضرت عائشہ کی نقل و حرکت کی طرف موڑ دیا تاکہ ان کے عزائم کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دیں۔

حضرت عائشہ یہ چاہتی تھیں کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد طلحہ کو برسر اقتدار لائیں اور اس طرح خلافت کو مستقل طور پر اپنے قبیلہ بنی تیم میں منتقل کر دیں اس لئے وہ مکہ میں قیام کے بعد بلوائیوں کی یورش

کا نتیجہ سننے کے لئے بے چین رہتی تھیں اور ہر آنے جانے والے سے مدینہ کے حالات اور حضرت عثمان کے انجام کے بارے میں دریافت کرتی رہتی تھیں۔ اس اثنا میں مدینہ سے اخضر نامی ایک شخص مکہ آیا۔ حضرت عائشہ نے اسے بلوا کر پوچھا کہ مدینہ کی شورش انگیزی کا کیا نتیجہ ہوا اس نے کہا کہ حضرت عثمان نے مصر کے بلوائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور ہنگامہ و شورش پر قابو پا لیا ہے۔ ام المومنین تو دوسرے ہی قسم کے تصورات کی پخت و پز میں مصروف تھیں کہ اس خبر نے ان کے خیالات کا شیرازہ درہم برہم کر دیا اور انہوں نے تاسف آمیز لہجہ میں کہا:۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔	"انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کیا ان لوگوں کو قتل
ایقتل قوما جاؤ و ایطلبون	کر ڈالا ہے جو اپنا حق مانگنے اور ظلم کے خلاف
الحق و ینکرون الظلم واللہ	آواز بلند کرنے کے لئے آئے تھے۔ خدا کی قسم ہم
لا نرضی بھذا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۶۸)	اس پر راضی نہیں ہیں۔"

ابھی وہ افسردگی و دل شکستگی کی حالت میں تھیں کہ ایک دوسرے شخص نے آ کر بتایا کہ اخضر کی دی ہوئی اطلاع غلط ہے مصریوں میں سے کوئی نہیں مارا گیا۔ وہ مدینہ میں کھلے بندوں دندناتے پھر رہے ہیں بلکہ حضرت عثمان ان کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ یہ سن کر ام المومنین کو ایک گونہ اطمینان ہوا اور کہنے لگیں:۔

ابعدہ اللہ ذلک بما قدمت	"خدا اسے اپنی رحمت سے دور رکھے یہ اس کی
یداہ وما اللہ بظلام للعبید۔	کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور خدا تو اپنے بندوں پر
(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص ۷۷)	ظلم نہیں کرتا۔"

اب مکہ میں قیام کے بجائے مدینہ جانا ان کے لئے ضروری ہو گیا تا کہ اپنے اثر و نفوذ سے مخالف رایوں کو دبا کر جسے برسر اقتدار لانا چاہتی تھیں اس کے لئے فضا سازگار بنائیں۔ چنانچہ فوراً سفر کا ساز و سامان کیا اور مدینہ روانہ ہو گئیں۔ ابھی مکہ سے چھ میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ مقام سرف پر عبید ابن ابی سلمہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ آپ نے حضرت عثمان اور مدینہ کے سیاسی اوضاع کے بارے میں اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے ہیں۔ کہا کہ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ اہل مدینہ نے حضرت علی کی بیعت کر لی ہے۔ سننے کو تو یہ سن لیا مگر زمین پیروں تلے سے کھسکتی اور آسمان دھواں بن کر اڑتا نظر آنے لگا۔ کانوں کو یقین نہ آیا تو پھر پوچھا کہ کیا علی کی بیعت ہو گئی؟ کہا کہ ہاں علی کی بیعت ہو چکی اور ان سے زیادہ اس مسند پر بیٹھنے کا سزاوار تھا بھی کون۔ اب ام المومنین کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل

ہو گیا اور بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا :۔

لیت ھذہ انطبقت علی ھذہ	اگر علی کی بیعت ہو گئی ہے تو کاش یہ آسمان زمین
ان تم الامر لصاحبك ردونی	پر پھٹ جائے اب مجھے مکہ واپس جانے دو۔"

ردونی۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۰۵)

چنانچہ انہی قدموں پر مکہ کا رُخ کر لیا اور قتل عثمان پر اپنے رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

قتل واللہ عثمان مظلوما واللہ	خدا کی قسم عثمان مظلوم مارے گئے ہیں خدا کی قسم
لاطلبن بدمہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۰۵)	میں اُن کے خون کا انتقام لے کر رہوں گی۔"

عبید ابن ابی سلمہ اس فوری انقلاب اور متضاد طرزِ عمل کو دیکھ کر حیرت میں کھو گیا اور آگے بڑھ کر کہا کہ آپ تو عثمان کے بارے میں علانیہ اور بار بار کہا کرتی تھیں کہ :۔

اقتلوا نعثلا فقد کفر۔	اس نعثل کو قتل کر ڈالو یہ کافر ہو گیا ہے۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۰۵)

اور اب ایک دم آپ کی رائے میں تبدیلی کیسے آگئی؟ کہا کہ ہاں میں پہلے یہی کہا کرتی تھی اور میں کیا سب ہی یہ کہا کرتے تھے۔ مگر انہوں نے آخر وقت میں توبہ کر لی تھی اب میری یہ رائے پہلی رائے سے زیادہ صائب ہے۔

حضرت عائشہ کے اس عذر کی بھی ایک ہی رہی کہ حضرت عثمان نے توبہ کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب تک ام المومنین مدینہ میں موجود رہیں اس وقت تک تو توبہ کی نہ تھی ورنہ انہیں محاصرہ میں بلوائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مکہ میں نہ آتیں۔ اور مکہ میں قتل عثمان کی خبر ملنے پر بھی اس توبہ کا علم حاصل نہ ہو سکا تھا ورنہ اس قتل پر اظہار اطمینان نہ کیا جاتا۔ پھر مکہ سے وادی سرف تک کی مختصر مسافت اور مختصر مدت میں بھی کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا۔ جس سے انہیں توبہ کا علم حاصل ہوتا۔ پھر یک لخت امیرالمومنین کی خبر خلافت سن کر حضرت عثمان کی مظلومیت بھی یاد آگئی اور توبہ کا علم بھی ہو گیا۔ آخر وہ کون سے ذرائع یا کون سے قرائن تھے جن سے انہیں توبہ کا علم ہوا جب کہ آخر وقت تک تمام معاملات جوں کے توں رہے اور ان میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لوگوں کی شکایتوں کا سلسلہ ویسے ہی رہا نہ مظلموں کو ختم کیا گیا اور نہ شکایات کا ازالہ ہوا۔ اور اگر دفع الوقتی کے لئے وعدہ کیا بھی تو وہ آخر وقت تک شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔ جب ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوئی تو توبہ کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ آخر محاصرین کا مطالبہ بھی تو یہی تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے توبہ کریں اپنی روش بدلیں مظالم کو ختم کریں یا خلافت

سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر وہ مظالم کے ختم کرنے کا اقدام کر چکے ہوتے تو ان کے قتل کی نوبت ہی کیوں آتی امر واقعہ تو یہ ہے کہ جب ام المومنین اس تبدیلی کا کوئی معقول عذر پیش نہ کر سکیں تو توبہ کی بات بنائی اور لے دے کے یہی ایک بات تو بنائی جا سکتی تھی۔ مگر وہ اس بات سے عبید ابن ابی سلمہ کو مطمئن نہ کر سکیں۔ چنانچہ عبید نے صاف صاف کہہ دیا:۔

عذر واللہ ضعیف یا ام المومنین ۔۔۔۔ اے ام المومنین قسم بخدا یہ بالکل بودا عذر ہے۔"

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱۔ ص ۵۲)

ام المومنین جلد از جلد مکہ پہنچ جانا چاہتی تھیں انہوں نے عبید کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے بڑھ گئیں۔ جب مکہ میں وارد ہوئیں تو لوگوں نے کہا کہ اے ام المومنین ابھی تو آپ روانہ ہوئی تھیں کہ پلٹ بھی آئیں۔ کہا کہ عثمان بے گناہ مارے گئے ہیں میں ان کا خون رائیگاں نہیں جانے دوں گی اور اس وقت تک واپس نہیں جاؤں گی جب تک ان کے خون کا انتقام نہ لے لوں لوگ ان کی موجودہ اور سابقہ روش کے تضاد پر نظر کرتے ہوئے حیران تو ہوئے مگر کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو گئے۔

ام المومنین نے یہاں آتے ہی عثمان کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ کر حضرت علی کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ جب طلحہ و زبیر کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ مکہ میں عثمان کی مظلومیت کا پرچار کر رہی ہیں اور علی کو ان کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہیں تو انہوں نے عبداللہ ابن زبیر کو چند خطوط دے کر ام المومنین کے پاس مکہ بھیجا اور ان پر زور دیا کہ وہ لوگوں کو عثمان کے بے گناہ مارے جانے کا یقین دلا کر انتقام کی تحریک چلائیں اور جس طرح بن پڑے انہیں علی کی بیعت سے روکیں۔ ان پیغامات نے اُن کے ارادہ کو اور تقویت دی اور انہوں نے پورے زور و شور سے قصاص عثمان کے نام پر لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دی۔ سب سے پہلے عبداللہ ابن عامر حضرمی نے جو حضرت عثمان کی طرف سے والی مکہ تھا اس آواز پر لبیک کہی اور سعید ابن عاص، ولید ابن عقبہ اور دوسرے اموی اُن کے ہمنوا بن کر کھڑے ہو گئے۔

طلحہ و زبیر قصاص کی آڑ میں ہنگامہ کھڑا کر کے اپنی محرومی و ناکامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن مدینہ کی فضا اس ہنگامہ آرائی کے لئے سازگار نہ تھی کیونکہ قتل عثمان کے سلسلہ میں اہل مدینہ ان کا کردار دیکھے ہوئے تھے جس کے بعد اس کی صورت نہ تھی کہ وہ انتقام کی آواز پر انہیں اپنے گرد جمع کر لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ البتہ مکہ میں یہ تحریک کامیاب ہو سکتی کیونکہ ام المومنین، سابق والی مکہ عبداللہ ابن عامر مروان ابن حکم اور مدینہ سے نکل کھڑے ہونے والے بنی امیہ یہاں پر جمع تھے اور لوگوں کو حضرت کے خلاف کرنے میں پیہم مصروف تھے اور ایک طبقہ کو اپنا ہمنوا بھی بنا چکے تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے چار مہینے جوں توں کر کے

مدینہ میں گزارے اور پھر اپنی مہم کی تکمیل کے لئے مکہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور حضرت سے کہا کہ ہمارا ارادہ عمرہ کا ہے ہمیں مکہ جانے کی اجازت دی جائے۔ آپ ان کے تیوروں کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ وہ بیعت کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر مکہ کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

واللہ ما ارادا العمرۃ ولکنھما ارادا الغدرۃ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۲ ص۱۵۶)	خدا کی قسم ان کا ارادہ عمرہ کا نہیں ہے بلکہ عذر و فریب پر اتر آئے ہیں۔"

امیرالمومنین مکہ جانے کا خیال اُن کے ذہنوں سے نکال دینا چاہتے تھے مگر یہ خیال اُن کے ذہنوں سے نہ نکلا اور وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر حضرت نے ان سے دوبارہ بیعت لے کر انہیں مکہ جانے کی اجازت دے دی۔ ان دونوں نے مکہ پہنچ کر حضرت عثمان کے خون کی ذمہ داری حضرت پر عائد کر کے ام المومنین کے موقف کی تائید کی اور ان کی جماعت کے سرگرم رکن بن گئے۔

اس موقع پر ممکن ہے کہ بعض ذہنوں میں خیال پیدا ہو کہ جب حضرت یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مقصد بیعت توڑ کر ہنگامہ آرائی کرنا ہے تو انہیں مکہ جانے کی اجازت ہی کیوں دی اس طرح تو حضرت نے خود اپنے خلاف حریف کو صف آرائی کا موقع دیا۔ اگر انہیں اجازت نہ دی جاتی تو وہ نہ فوج کشی کر کے ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کرتے نہ انتشار و بدامنی پھیلاتے اور نہ بصرہ کی خونریز جنگ کی نوبت آتی۔ مگر جب اس صورت کے علاوہ دوسری متبادل صورتوں کو دیکھا جاتا ہے تو پھر بھی ایک صورت قابل عمل اور تقاضائے وقت کے مطابق نظر آتی ہے ان متبادل صورتوں میں سے ایک صورت تو یہ تھی کہ پیش بندی کرتے ہوئے انہیں پابند مسکن کر دیتے اور کہیں آنے جانے سے روک دیتے۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ من وعن ان کا مطالبہ تسلیم کر کے انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت سپرد کر دیتے۔ مگر یہ دونوں صورتیں ناقابل عمل تھیں۔ پہلی صورت کہ حضرت انہیں محصور یا نظربند کر دیتے تو یہ اقدام سزا قبل جرم اور فکر و عمل کی آزادی کے سلب کرنے کے مترادف ہوتا اور یہ دونوں چیزیں نہ اسلام کے مزاج سے سازگار تھیں اور نہ امیرالمومنین کی سیرت سے ہم آہنگ۔ پھر یہ کہ انہی ایام میں بنی امیہ کے وہ افراد جو کہیں آجا سکتے تھے کچھ مکہ چلے گئے اور کچھ شام روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت نے نہ ان کی نقل و حرکت پر کوئی پہرا بٹھایا اور نہ انہیں مدینہ چھوڑ کر جانے سے منع کیا۔ اب اگر ان دونوں کو روک لیتے تو یقیناً ان کے ہمنوا چیخ اٹھتے اور اس کے خلاف آواز اٹھاتے کہ حضرت نے دوسروں کو جہاں وہ جانا چاہتے تھے جانے دیا اور ان دو بزرگ صحابیوں اور مجلس شوریٰ کے ممتاز رکنوں پر جو بظاہر بے گناہ ہیں قدغن لگا دی ہے اور اپنی حراست میں لے لیا ہے۔ مصلحت اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں روک کر اہل مدینہ اور ان کے ہمنواؤں کی مخالفت مول نہ

لی جاتی خصوصاً ان حالات میں کہ ابھی حکومت کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہیں ہوئی اور امیر شام ایسا ہوشیار و عیار حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی فکر میں ہے ۔ بے شک ظاہری مصالح کا لحاظ اس مقام پر جہاں اسلام کے کسی حکم سے تصادم ہوتا ہو درست نہیں ہے مگر جہاں قانون اسلام کی پابندی کے ساتھ کوئی مصلحت بھی کارفرما ہو تو اسے ملحوظ رکھنے میں کوئی مانع نہیں ہے ۔ رہی دوسری صورت کہ حضرت انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت سونپ دیتے آخر کسی نہ کسی کو وہاں کی حکومت سپرد کرنا ہی تھی مگر حضرت ان دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے سمجھ رہے تھے کہ انہیں نہ آپ کے زیر اقتدار رہنا پسند ہے اور نہ آپ کی اطاعت ہی گوارا ہے اس لئے کہ جو حکومت کا خود متوقع ہوتا ہے اسے دوسرے کی جسے بزعم خود اپنے ہی درجہ کا سمجھتا ہو اطاعت شاق گزرا ہی کرتی ہے اس صورت میں اگر انہیں بصرہ و کوفہ کی حکومت دے بھی دی جاتی جب بھی وہ اس جزوی اقتدار پر قناعت کر کے مرکزی حکومت کے تابع رہنا پسند نہ کرتے خصوصاً جب کہ زبیر کو اہل کوفہ کی اور طلحہ کو اہل بصرہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی اور وہ انہیں بحیثیت خلیفہ پوری مملکت پر فرمانروا دیکھنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار بھی کر چکے تھے ۔ ان حالات میں یہی ہوتا کہ وہ پاؤں جمانے کے بعد مرکز سے رشتہ توڑ لیتے اور اپنے زیر اثر عوام کے تعاون سے مستقل حکومت قائم کرتے اس طرح کہ کوفہ پر زبیر کی حکومت ہوتی اور بصرہ اور اس کے مضافات پر طلحہ کا اقتدار ہوتا اور شام میں معاویہ کا پرچم پہلے ہی سے لہرا رہا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک ہی ریاست میں قبائلی طرز کی متعدد حکومتیں قائم ہو جاتیں مرکزیت لامرکزیت میں بدل جاتی ہر طرف طوائف الملوکی پھیل جاتی اور اسلامی ریاست اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی کہ ان پاشان و پریشان ٹکڑوں کو یکجا کرنا مشکل ہو جاتا ۔ اب ایک یہی صورت رہ جاتی کہ جہاں وہ جانا چاہتے تھے انہیں جانے دیا جائے اور اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ حکومت کے خلاف کوئی غلط قدم اٹھائیں تو اس کے نتائج کی ذمہ داری انہی پر عائد ہو اور ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی عمل میں آئے تو حکومت کو مورد الزام قرار نہ دیا جا سکے ۔

غرض یہ لوگ ایک لگے بندھے منصوبہ کے ماتحت مکہ میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے اور بنی ہاشم اور خصوصاً حضرت علی پر قتل عثمان کا الزام عائد کر کے باقاعدہ قصاص کی مہم شروع کر دی ۔ اس مہم کو روبکار لانے کے لئے سرمایہ کی بھی ضرورت تھی اس کا حل یوں نکل آیا کہ بصرہ کا معزول حاکم عبداللہ ابن عامر ابن کریز بیت المال کی جمع جتھا لے کر مکہ پہنچ گیا اور یمن سے یعلی ابن امیہ چھ لاکھ درہم اور چھ سو اونٹ اپنے ساتھ لایا اور یہ تمام سرمایہ جنگی اخراجات کے لئے مخصوص کر دیا گیا ۔ ابوالفداء نے تحریر کیا ہے :۔

خرج یعلی واخذ ما کان من — یعلی تمام پونجی سمیٹ کر نکل کھڑا ہوا اور مکہ

المال ولحق بمكة وصار مع	پہنچ کر حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے ساتھ ہو گیا
عائشہ وطلحة والزبیر و سلم	اور وہ مال ان کی تحویل میں دے دیا۔"
الیھم المال۔ (تاریخ ابوالفداء۔ ج۔ ص۱۷۱)	

اہل مکہ سے بھی سرمایہ فراہم کیا گیا اور مالی لحاظ سے مطمئن ہو گئے۔ جب یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے تو حضرت عائشہ کی رہائش گاہ پر باہمی صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ جنگ کا مسئلہ تو طے شدہ تھا البتہ محاذ جنگ کا ابھی کوئی تصفیہ نہ ہوا تھا حضرت عائشہ کی رائے تھی کہ مدینہ کو محاصرہ میں لے کر جنگ چھیڑ دی جائے مگر اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ بلوائیوں کے ہوتے ہوئے اہل مدینہ سے نمٹنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ شام جانا چاہیئے۔ اس پر ابن عامر نے کہا:۔

قد کفاکم معاویۃ الشام	شام میں معاویہ کے ہوتے ہوئے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۰۶)	

شام کو محاذ جنگ بنانے سے یہ امر بھی مانع تھا کہ معاویہ جنہوں نے حضرت عثمان کے ماتحت ہوتے ہوئے ان کی مدد سے گریز کیا ہو وہ ان لوگوں کی مدد پر کیوں آمادہ ہوتے اور جنہوں نے حضرت علی کی بیعت پر آمادگی ظاہر نہ کی ہو وہ ان کی کامیابی کے بعد طلحہ یا زبیر کی خلافت بلا چون و چرا کس طرح تسلیم کر لیتے۔ بے شک معاویہ ان کے ہمنوا تھے مگر اسی حد تک جس حد تک امیرالمومنین کو اقتدار سے الگ کرنے کا تعلق تھا مگر اس مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد طلحہ یا زبیر کی خلافت کو تسلیم کر لینا ان کی اقتدار پسند طبیعت سے ناممکن تھا۔ آخر بصرہ کے معزول حاکم عبداللہ ابن عامر کے کہنے سے بصرہ پر اتفاق رائے ہو گیا۔ بصرہ کو محاذ جنگ قرار دینے میں جہاں یہ مصلحت کارفرما تھی کہ وہاں پر ان کے ہمنوا و ہم خیال کثرت سے موجود ہیں۔ جو جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے وہاں یہ فائدہ بھی نظر آ رہا تھا کہ حجاز کی ایک سمت شام واقع ہے اور دوسری سمت عراق۔ اگر بصرہ کو محاذ جنگ بنا کر عراق پر تسلط قائم کر لیا گیا تو حجاز ان دو مخالف طاقتوں میں گھر کر رہ جائے گا جس کے بعد امیرالمومنین کی سپاہ کو بآسانی شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کیا جا سکتا ہے یا ان دو طاقتوں کے زیر اثر رکھا جا سکتا ہے۔

اس تجویز سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پیش نظر خون عثمان کا قصاص نہ تھا۔ اگر ان کا مقصد قصاص ہوتا تو بصرہ پر دھاوا کرنے کے بجائے مدینہ پر حملہ آور ہوتے جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا اور جہاں اس حادثہ کے ذمہ دار افراد موجود تھے اور بصرہ میں نہ حضرت عثمان کا کوئی قاتل تھا اور نہ وہاں کے باشندے ان کے مقصد میں حائل تھے کہ انہیں راہ سے ہٹانا ضروری ہوتا۔ غرض محاذ جنگ کے تصفیہ کے

بعد کوچ کی تیاری شروع ہو گئی۔ یعلی نے قبیلہ عرینہ کے ایک شخص سے چھ سو درہم میں ایک اونٹ خرید کر ام المومنین کی خدمت میں پیش کیا اور عمومی اعلان کیا کہ جس کے پاس سامان سفر ہتھیار اور سواری نہ ہو وُہ آئے اسے تمام چیزیں مہیا کی جائیں گی۔ چنانچہ امیر المومنین نے یعلی کے بارے میں فرمایا:۔

کان یعطی الرجل الواحد الثلثین دینارا والسلاح و الفرس علیٰ ان یقاتلنی۔

وہ میرے خلاف لڑنے کے لئے ہر شخص کو گھوڑا ہتھیار اور تیس تیس دینار دیتا تھا۔"

(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج ۲۔ ص۱۴۰)

طلحہ و زبیر نے عبداللہ ابن عمر پر بھی زور دیا کہ وہ اُن کی موافقت و ہمراہی اختیار کرے۔ مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ:۔

ان بیت عائشة خیر لها من هودجها وانتما المدینة خیر لکما من البصرة۔

عائشہ کے لئے ہودے میں بیٹھنے سے گھر میں ٹکنا اور تمہارے لئے بصرہ جانے سے مدینہ میں رہنا زیادہ بہتر ہے۔"

(الامامة والسیاسة۔ ج ۱۔ ص۶۱)

حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ اور دوسری امہات المومنین کو جو حج کے بعد مکہ میں قیام فرما تھیں۔ اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی اور انہیں بھی اپنے ہمراہ جنگ کرنے میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ حضرت حفصہ تو بلا تامل تیار ہو گئیں مگر بقیہ ازواج پیغمبر نے انکار کر دیا۔ اور آخر عبداللہ ابن عمر کے منع کرنے سے حضرت حفصہ کو بھی رُک جانا پڑا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

وکان ازواج النبی معها علی قصد المدینة فلما تغیر رایها الی البصرة ترکن ذلك واجابتهم حفصة الی المسیر معهم فمنعها اخوها عبد الله ابن عمر۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۰۶)

ازواج رسول حضرت عائشہ کے ہمراہ مدینہ جانے کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن جب حضرت عائشہ کی رائے بدل گئی اور وہ بصرہ جانے پر آمادہ ہوئیں تو ازواجِ نبی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور حفصہ نے حضرت عائشہ کے ہمراہ جانا قبول کر لیا مگر ان کے بھائی عبداللہ ابن عمر نے انہیں روک لیا۔"

حضرت حفصہ کی آمادگی خلاف توقع نہ تھی بلکہ انہیں آمادہ ہونا ہی چاہیئے تھا اس لئے کہ ان کے اور حضرت عائشہ کے نظریات میں بڑی حد تک وحدت و ہم آہنگی پائی جاتی تھی نہ ان کی رایوں میں تضاد

ہو سکتا تھا اور نہ ان کی طبیعتوں میں اختلاف۔ اور اسی اتحاد مذاق کی وجہ سے دونوں ایک ہی حزب و گروہ سے وابستہ سمجھی جاتی تھیں چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے تحریر کیا ہے:۔

ان نساء رسول اللہ کن حزبین فحزب فیہ عائشۃ وحفصۃ و سودۃ والحزب الآخر ام سلمۃ وسائر نساء رسول اللہ۔

(صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۵۹)

"ازواج پیغمبر کے دو گروہ تھے ایک گروہ میں عائشہ حفصہ اور سودہ تھیں اور دوسرے گروہ میں ام سلمہ اور بقیہ ازواج رسول تھیں"

حضرت ام سلمہ کی تمام ہمدردیاں حضرت علی کے ساتھ تھیں۔ جب حضرت عائشہ نے انہیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی تو وہ حضرت کے خلاف کوئی بات سننا بھی گوارا نہ کر سکتی تھیں چہ جائیکہ حضرت کے خلاف قدم اٹھاتیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی اور انہیں اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے تحریر کیا:۔

لو علم رسول اللہ ان النساء یحتملن الجہاد عہد الیک اما علمت انہ قد نہاک عن الفراطۃ فی الدین فان عمود الدین لا یثبت بالنساء ان مال ولا یدأب بھن ان انصدع جہاد النساء غض الاطراف و ضم الذیول وقصر المواد ۃ ما کنت قائلۃ لرسول اللہ لو عارضک ببعض ھٰذہ الفلوات ناصۃ قعودا عن منہل الی منہل و غدا تردین علی رسول اللہ واقسم لو قیل لی یا ام سلمۃ ادخلی

اگر رسول اللہ یہ جانتے کہ عورتیں جہاد کا بار اٹھا سکتی ہیں تو وہ تمہیں حکم دے جاتے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ تمہیں دینی معاملات میں تجاوز سے منع فرما گئے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر دین کا ستون جھک جائے تو وہ عورتوں کے ذریعہ تھم نہیں سکتا اور اگر اس میں شگاف پڑ جائے تو عورتوں کے ذریعہ اس کی درستی و اصلاح نہیں ہو سکتی۔ عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں اپنے دامن کو سمیٹیں اور تعلقات محدود رکھیں۔ اگر رسول اللہ تمہیں ان صحراؤں میں اونٹ دوڑاتے ہوئے۔ ایک چشمہ سے دوسرے چشمہ تک جاتے ہوئے دیکھ پائیں تو تم انہیں کیا جواب دو گی۔ کل تمہیں رسول اللہ کے سامنے جانا ہی ہو گا۔ خدا کی قسم اگر مجھ سے کہا گیا کہ اے ام سلمہ جنت میں داخل ہو جاؤ تو اگر

الجنة لاستحییت ان القی رسول اللہ ھاتکۃ حجابا ضربہ علی فاجعلیہ ستراک وقائمۃ البیت حصنک (عقد الفرید۔ ج ۳۔ صد ۹۹)

اگر میں نے اس حجاب کو توڑ ڈالا ہو جس کا مجھے پابند بنا گئے تھے تو مجھے پیغمبر کا سامنا کرتے ہوئے شرم آئے گی لہٰذا تم پردہ کی پابند اور گھر کی چار دیواری میں بند رہو۔"

حضرت عائشہ نے جناب ام سلمہ کی نصیحت آموز تحریر سے اثر لینے کے بجائے یہ جواب دیا کہ میں دو متحارب گروہوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے جا رہی ہوں اور فضا کو پُرامن رکھنے کے لئے یہ اقدام ناگزیر ہے۔ ام المومنین کا یہ جواب دفع الوقتی کے لئے تھا ورنہ یہ حقیقت ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ وہ اس نزاع میں خود ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھیں اگر وہ گھر میں بیٹھی رہتیں اور لاؤ لشکر جمع کر کے بصرہ کا رُخ نہ کرتیں تو دو فریق پیدا ہی نہ ہوتے اور نہ اُن میں جنگ و قتال کی نوبت آتی اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وُہ دو مخالف گروہوں کے درمیان صلح و صفائی کا مقصد لے کر بصرہ جانے پر تیار ہوئی تھیں تو اس کے لئے سامان حرب و ضرب اور لشکر گراں کے جمع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ام المومنین سات سو کی جمیعت کے ساتھ جو اس وقت تک ان کے پرچم کے نیچے جمع ہو چکی تھی بصرہ کی سمت روانہ ہوگئیں راستے میں اور لوگ بھی کچھ بے سوچے سمجھے اور کچھ ان کی باتوں سے متاثر ہو کر ساتھ ہوتے گئے۔ اور لشکر کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ جب یہ لشکر ذاتِ عرق میں پہنچا جہاں سے بصرہ کی راہ لینا تھی تو سعید ابن عاص نے مروان اور اس کے چند مخصوص ہمنواؤں سے تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ کدھر منہ اٹھائے چلے جا رہے ہیں اور ہمارا اس دشت پیمائی سے مقصد و مدعا کیا ہے۔ مروان نے کہا کہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہم بصرہ جا رہے ہیں اور مقصد قاتلانِ عثمان سے انتقام لینا ہے کہا:۔

ثارکم علی اعجاز الابل اقتلوھم ثم ارجعوا الی منازلکم لا تقتلوا انفسکم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صد ۴۷۲)

عثمان کے قاتل (طلحہ و زبیر) تمہارے ساتھ اونٹوں پر سوار ہیں انہیں قتل کر دو اور اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور ناحق ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔"

مروان نے کہا کہ اب گھروں کو کس منہ سے جائیں ہمیں بصرہ جانا ہی ہوگا تاکہ تمام قاتلان عثمان سے انتقام لے سکیں۔ سعید ان سے گفتگو کرنے کے بعد طلحہ و زبیر کے پاس آیا اور اُن سے پوچھا کہ اگر تم نے یہ جنگ جیت لی اور مقصد میں کامیاب ہوگئے تو مسندِ خلافت پر کسے بٹھاؤ گے کہا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ہم دونوں میں سے جسے لوگ منتخب کر لیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ سعید نے کہا کہ جب تم قصاص

عثمان کے لئے گھروں سے نکلے ہو تو تمہیں عثمان کے بیٹوں میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہیئے اور ان کے دونوں بیٹے ابان اور ولید لشکر میں موجود ہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم خون عثمان کے قصاص کا لبادہ اوڑھ کر اپنے لئے اقتدار کی راہ ہموار کرنے کے لئے نکلے تھے۔ طلحہ و زبیر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا:۔

ندع شیوخ المهاجرین و نجعلها لابناءهم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صہ ۴۷۲)

"کیا ہم سن رسیدہ مہاجرین کو چھوڑ کر ان کے لڑکے بالوں کو خلیفہ بنائیں"

سعید سمجھ گیا کہ یہ لوگ قصاص طلبی کے لئے نہیں نکلے بلکہ یہ سارا ہڑبونگ حکومت و اقتدار کے لئے ہے۔ چنانچہ وہ ان سے الگ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ عبداللہ ابن خالد، مغیرہ ابن شعبہ اور قبیلہ بنی ثقیف کے لوگ بھی علیحدہ ہو کر طائف کی طرف چلے گئے اور باقی لشکر منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اثنائے سفر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ام المومنین کے عزم و ارادہ کو وقتی طور پر متزلزل کر دیا اور وہ یہ کہ جب لشکر ایک چشمہ پر جو ایک عورت حوأب بنت کلب ابن وبرہ کے نام پر حوأب کہلاتا تھا۔ شب بسری کے لئے فروکش ہوا تو حضرت عائشہ نے ایک سمت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں۔ یہ کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہ تھی مگر ام المومنین کے ذہن میں کچھ الجھن سی پیدا ہوئی۔ پاس ہی ساربان کھڑا تھا۔ اس سے پوچھ لیا کہ یہ کون سا مقام ہے اس نے کہا کہ یہ حوأب ہے۔ حوأب کا نام سننا تھا کہ دہشت و خوف سے لرز اٹھیں اور چیخ چیخ کر کہنے لگیں:۔

ردونی ردونی انا واللہ صاحبة ماء الحوأب۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صہ ۱۰۰)

"مجھے واپس جانے دو مجھے واپس جانے دو۔ خدا کی قسم میں ہی چشمہ حوأب والی ہوں"

طلحہ و زبیر اور ساتھ والوں کو اس ایک دم تبدیلی پر حیرت ہوئی۔ کہا کہ یہ مقام حوأب ہے تو ہوا کرے آپ سراسیمہ و پریشان کیوں ہیں اور واپسی پر اصرار کس لئے ہے؟ کہا:۔

سمعت رسول اللہ یقول و عندہ نساؤہ لیت شعری ایتکن تنبحها کلاب الحوأب

"ایک مرتبہ رسول اللہ کی بیویاں آپ کے گرد جمع تھیں کہ میں نے آپ کو فرماتے سنا تم میں کون ہے جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صہ ۱۰۰)

اب مجھے کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ اس سے میں ہی مراد تھی اور میری ہی طرف آنحضرت کا اشارہ تھا لہذا مجھے یہیں سے واپس چلا جانا چاہیئے۔ جب ان کے ہمراہیوں نے کام بگڑتے دیکھا تو کہا کہ ساربان نے

غلط کہا ہے یہ چشمۂ حواب نہیں ہے۔ اور عبداللہ ابن زبیر نے اڑوس پڑوس سے پچاس آدمیوں کو جمع کر کے اور انہیں کچھ دے دلا کر اس پر گواہی بھی دلوا دی۔ امام شعبی کہتے ہیں:۔

ھی اول شھادۃ زور اقیمت فی الاسلام (تذکرہ خواص الامہ ص ۳۹)	یہ پہلی جھوٹی گواہی تھی جو اسلام میں دی گئی۔"

ابھی ام المومنین ذہنی کش مکش اور تذبذب کے عالم میں تھیں کہ ایک طرف سے یہ شور سنائی دیا:۔

النجاء النجاء قد ادرککم علی ابن ابی طالب۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۰۶)	جلدی کرو جلدی کرو علی ابن ابی طالب تمہارے سروں پر پہنچ گئے ہیں۔"

اس آواز کے سنتے ہی لوگ افراتفری کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ام المومنین کے خیالات نے اس طرح پلٹا کھایا کہ نہ حواب یاد رہا اور نہ قول رسول بلکہ بجھے ہوئے جوش اور پژمردہ حوصلے میں پھر سے زندگی آگئی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بصرہ کی سمت چل دیں۔

ادھر امیرالمومنین بغاوت شام کو فرو کرنے کی فکر میں تھے اور ایک لشکر ترتیب دے کر شام کی طرف حرکت کرنا چاہتے تھے کہ طلحہ و زبیر کی بیعت شکنی اور حضرت عائشہ کی لشکر کشی کی اطلاع مدینہ میں پہنچی حضرت کو طلحہ و زبیر کی طرف سے تو یہ اندیشہ تھا کہ وہ معاویہ سے ساز باز کر کے فتنہ و شر کو ہوا دیں گے۔ مگر حضرت عائشہ کی طرف سے یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ وہ معرکہ آرائی کے لئے فوج کشی کریں گی اور خدا و رسول کے حکم کے خلاف گھر سے نکل کھڑی ہوں گی۔ مجبوراً آپ کو شام کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تا کہ پیش آیند صورت حال سے نمٹ سکیں۔ حضرت نے مدینہ کے سرکردہ اشخاص کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور فرمایا کہ تمہیں طلحہ و زبیر کے باغیانہ اقدام کا علم ہو چکا ہے تم میرا ساتھ دو تا کہ ان لوگوں کو بصرہ پہنچنے سے پہلے راستہ میں روک لیا جائے۔ کچھ لوگ حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر ایسی با اثر شخصیتوں کے مقابلہ میں کھڑے ہونے سے ہچکچانے لگے اور کچھ لوگوں نے جن میں سعد بن ابی وقاص، اسامہ ابن زید، محمد ابن سلمہ اور عبداللہ ابن عمر شامل تھے صاف انکار کر دیا۔ البتہ ہیثم ابن تیہان زیاد ابن حنظلہ ابو قتادہ انصاری وغیرہ نے حمایت حق کے جذبہ سے متاثر ہو کر بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور ابو قتادہ نے پرجوش لہجے میں کہا:۔

یا امیرالمومنین ان رسول اللہ قلدنی ھذا السیف وقد اغمدتہ زمانا وقد حان تجریدۃ علی ھؤلاء القوم	یا امیرالمومنین یہ تلوار مجھے رسول اللہ نے باندھی تھی اور ایک عرصہ سے یہ نیام میں بند پڑی ہے اب وقت آگیا ہے کہ میں ان ظالموں کے خلاف اسے بے نیام کروں جو امت کو فریب دینے سے

الظالمین الذین لایالون الامۃ غشا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۳) دریغ نہیں کر رہے ۔"

حضرت ام سلمہ نے اپنے فرزند عمر ابن ابی سلمہ کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا :۔

قد دفعتہ الیک وھو اعزّ علیّ من نفسی فلیشھد مشاھدک حتی یقضی اللہ ما ھو قاض فلو لا مخالفۃ رسول اللہ لخرجت معک کما خرجت عائشۃ مع طلحۃ والزبیر۔ (انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۴۳)

"میں اسے آپ کے سپرد کرتی ہوں یہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے یہ تمام معرکوں میں آپ کے ہمرکاب رہے گا یہاں تک کہ خداوند عالم وہ فیصلہ کرے جو وہ کرنے والا ہے۔ اگر رسول اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہوتی تو میں آپ کے ہمراہ جاتی جس طرح عائشہ، طلحہ و زبیر کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی ہیں ۔"

امیرالمومنین نے مدینہ میں سہل ابن حنیف انصاری کو مکہ میں قثم ابن عباس کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور علی اختلاف الروایۃ چھ سو سے ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ جس میں چار سو بیعت رضوان میں شریک ہوتے والے صحابہ تھے شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جب مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام ربذہ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آگے جا چکے ہیں اور بصرہ سے ادھر دم نہیں لیں گے اب انہیں راستے میں روک لینے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور جنگ و قتال کے بغیر ان پر قابو پانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ امیرالمومنین نے جنگ کے امکان کے پیش نظر وہاں پر پڑاؤ ڈال دیا اور چند آدمیوں کو مدینہ بھیج کر وہاں سے اسلحۂ جنگ اور سواریاں طلب کیں اور فوج کی فراہمی کے لئے محمد ابن جعفر اور محمد ابن ابی بکر کو کوفہ روانہ کیا تاکہ وہاں کے لوگوں سے عسکری امداد حاصل کریں اور جنگ کی صورت میں انہیں دشمن کے خلاف لڑنے کی دعوت دیں۔ جب وہ کوفہ پہنچے اور اہل کوفہ کو امیرالمومنین کا پیغام دیا تو والی کوفہ ابوموسیٰ اشعری بیچ میں دیوار بنکر حائل ہو گیا اور یہ کہہ کر لوگوں کو روکنا شروع کیا کہ یہ اقتدار کی جنگ ہے جو دنیا کا طلب گار ہو وہ جائے اور جو آخرت کا خواستگار ہو وہ گھر کے گوشہ میں بیٹھا رہے اور اس طرح امیرالمومنین کا معاون و مددگار ثابت ہونے کے بجائے مخالفین کی تقویت کا باعث بن گیا۔ محمد ابن جعفر اور محمد ابن ابی بکر نے اسے بہتیرا سمجھایا بجھایا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا آخر یہ دونوں بے نیل مرام واپس پلٹ آئے۔ حضرت ربذہ سے روانہ ہو کر فید، ثعلبیہ اور اساد سے ہوتے ہوئے مقام ذیقار میں جو کوفہ و واسط کے درمیان واقع ہے تشریف فرما تھے کہ ان دونوں نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر ابوموسیٰ کی رخنہ اندازیوں کی تفصیل بیان کی۔ امیرالمومنین نے ذیقار

سے ابن عباس اور مالک اشتر کو کوفہ بھیجا کہ اُسے سمجھائیں کہ وہ آنے والوں کے لئے سدِ راہ نہ ہو۔ ابھی یہ دونوں کوفہ ہی میں تھے کہ حضرت نے ان کے عقب میں اپنے فرزند امام حسن اور عمار یاسر کو روانہ کیا۔ یہ دونوں بزرگوار کوفہ میں وارد ہونے کے بعد مسجد جامع میں فروکش ہوئے اور لوگوں کو امیرالمومنین کی نصرت کی دعوت دی۔ ابو موسیٰ کو امام حسن کے آنے کی اطلاع دی گئی تو وہ حاضر ہوا امام حسن نے اس سے کہا کہ تمہارے متعلق یہ خبریں سننے میں آ رہی ہیں کہ تم لوگوں کو امیرالمومنین کی نصرت سے منع کرتے ہو حالانکہ ان کا مقصد فتنہ و شر کا انسداد اور اصلاح بین الناس ہے۔ کہا کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے :۔

انها ستکون فتنة القاعد فيها خير من القائم والقائم خير من الماشي والماشي خير من الراكب۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۱)	عنقریب ایک فتنہ برپا ہو گا جس میں بیٹھنے والا کھڑا ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا سوار ہونے والے سے بہتر ہو گا"

آخر وہ لوگ ہمارے بھائی بند ہیں نہ ان کا خون بہانا ہمارے لئے مباح ہے اور نہ ان کا مال چھیننا ہمارے لئے جائز ہے۔ اس پر عمار یاسر نے بگڑ کر کہا :۔

انت فيها قاعدا خير منك قائما۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۱)	بے شک تمہارا گوشہ میں بیٹھا رہنا تمہارے نکل کھڑے ہونے سے بہتر ہے"

اور دونوں ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ ابو موسیٰ اسی پر اصرار کرتا رہا کہ یہ ایک فتنہ ہے اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ اِدھر یہ کشمکش جاری تھی اُدھر زید ابن صوحان نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر دو تحریریں پڑھ کر سنائیں جو حضرت عائشہ کی طرف سے ایک اُن کے نام تھی اور ایک اہل کوفہ کے نام۔ ان تحریروں میں درج تھا کہ "تم لوگ میری مدد کے لئے آؤ۔ اور اگر مدد کے لئے نہ آسکو تو لوگوں کو منع کرو کہ وہ علی کی مدد کو نہ آئیں۔ ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد مجمع سے مخاطب ہو کر کہا :۔

امرت ان تقر في بيتها وامرنا ان نقاتل حتى لا تكون فتنة فامرتنا بما امرت به وركبت ما امرنا به۔ (تاریخ طبری کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۱)	انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھیں۔ اور ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جنگ و قتال کریں تاکہ فتنہ کھڑا نہ ہو۔ لیکن جس چیز کا انہیں حکم دیا گیا۔ وُہ ہمیں دے رہی ہیں (کہ ہم گھر میں بیٹھیں) اور جس چیز کا ہمیں حکم دیا گیا (کہ جنگ کریں)، اس پر وُہ عمل کر رہی ہیں"

پھر ابوموسیٰ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے موسیٰ اگر تم دریا کے بہاؤ کو روک سکتے ہو تو ان لوگوں کو بھی جانے سے منع کر سکتے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ جو بات تمہارے اختیار سے باہر ہے اس سے دستبردار ہو جاؤ اور لوگوں کو روکنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ گھر بیٹھ جاؤ۔ مگر اس پر کسی کی بات کا اثر نہ ہوا اور وہ برابر یہ رٹ لگاتا رہا کہ یہ ایک فتنہ ہے اس سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ امام حسن نے اس کا یہ معاندانہ رویہ دیکھا تو پر غضب لہجے میں کہا:۔

اخرج من مسجدنا وامض حیث شئت۔ (اخبار الطوال صہ ۱۴۵)	ہماری مسجد سے باہر نکلو اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ۔"

اور پھر منبر پر بلند ہو کر تقریر فرمائی اور لوگوں کو امیرالمومنین کی نصرت پر آمادہ کیا۔ عمار ابن یاسر اور حجر ابن عدی کندی نے بھی لوگوں کو کہنا سننا شروع کیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اہل کوفہ نے کروٹ لی اور ہر طرف سے سمعاً وطاعۃً کی آوازیں آنے لگیں۔

جب کوفہ کی فضا سازگار ہو گئی تو مالک اشتر نے دارالامارہ کا رُخ کیا اور اندر داخل ہو کر ابوموسیٰ کے غلاموں کو مار پیٹ کر باہر نکال دیا اور قصر پر قبضہ کر لیا۔ ابوموسیٰ کے غلام بھاگم بھاگ مسجد میں آئے اور ابوموسیٰ سے فریاد کی کہ اشتر نے ڈرا دھمکا کر دارالامارہ سے باہر نکال کیا ہے اور قصر پر قبضہ کر لیا ہے۔ ابوموسیٰ دوڑتا ہوا قصر کی طرف آیا اور اندر داخل ہونا چاہا مگر مالک نے اسے روک دیا اور بلند آواز سے کہا:۔

اخرج من قصرنا لا ام لک اخرج اللہ نفسک فو اللہ انک لمن المنافقین قدیماً۔	اے ابوموسیٰ تمہاری ماں مرے ہمارے قصر سے باہر نکلو۔ خدا تمہیں نکالے۔ خدا کی قسم تم ہمیشہ منافقوں میں شامل رہے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صہ ۵۰۱)

ابوموسیٰ نے گڑگڑا کر کہا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دیجیئے۔ کہا کہ تمہیں عشاء تک کی مہلت دی جاتی ہے اور رات کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے چاہا کہ دارالامارہ میں گھس کر اس کا مال و اسباب لوٹ لیں مگر مالک نے منع کیا اور کہا کہ تم اب اسے کچھ نہ کہو میں نے اسے نکل جانے کا حکم دے دیا ہے۔ لوگ اُن کے کہنے سے رُک گئے اور ابوموسیٰ رات کے اندھیرے میں قصر سے نکل کر کوفہ کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور صبح ہوتے ہی شام کی طرف چل دیا۔ ادھر اہل کوفہ گروہ در گروہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ابوموسیٰ کے روکنے اور حضرت عائشہ کے خطوط لکھنے کے باوجود بارہ ہزار شمشیر زن مقام ذیقار میں

امیرالمومنین کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے۔

ابو موسیٰ کی ذہنی ساخت اور اس کے طرز عمل پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو وہ مملکت کے ایک کلیدی عہدہ پر تا حال فائز ہے اور دوسری طرف سربراہ مملکت کے دشمنوں اور ملکی تنظیم کے منتشر کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی صوابدید میں اصحاب جمل سے جنگ کو ناجائز سمجھتا تھا تو اسے پہلے اپنے عہدہ سے خود ہی دستبردار ہو جانا چاہئے تھا اور پھر آزادانہ اپنی رائے اظہار کرنا چاہیئے تھا لیکن وہ مملکت کا عہدہ دار اور آئینی طور پر رئیس مملکت کے احکام کا پابند ہونے کے باوجود علانیہ سرتابی کرتا ہے اور دست تعاون بڑھانے کے بجائے امن شکنوں کی حوصلہ افزائی کا سامان کرتا ہے۔ اس طرز عمل کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ درپردہ حضرت کے مخالفین سے ساز باز کئے ہوئے تھا اور کھلم کھلا مخالف جماعت میں شامل ہو کر عہدہ کو اپنے ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ منصب پر باقی رہتے ہوئے فریق مخالف کی تقویت کا سامان کرتا اور اپنے منصبی تقاضوں کا کوئی پاس و لحاظ نہ کرتا اور اس پر مزید یہ کہ وہ جارحانہ اقدام کے مقابلہ میں اس دفاعی و نظامی اقدام کو فتنہ سے تعبیر کرتا ہے اور حدیث پیغمبر کو اس پر چسپاں کر کے اپنے غلط موقف کا جواز ثابت کرتا ہے۔ آخر اس پر نظر کرنی ضرورت تھی کہ امیرالمومنین کے لئے اس کے سوا اور چارۂ کار کیا تھا۔ کیا طلحہ و زبیر اور اس کے ہمراہیوں کو من مانی کرنے دیتے اور چپ سادھے رہتے اور ملک کے نظم و نسق کو درہم و برہم ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھتے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ اگر مملکت کے خلاف سازش کرنے اور اس کے نظم و ضبط کو تباہ کرنے والوں کے خلاف دفاعی فریضہ کی انجام دہی فتنہ ہے تو پھر ہر دفاعی جنگ کو فتنہ سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اور ان جنگوں کو بھی فتنہ قرار دینا چاہیئے جو رسول اللہ کے بعد ان لوگوں سے لڑی گئیں جنہوں نے حاکم وقت کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اور ادائے زکوٰۃ سے مانع ہوئے تھے۔ آخر اس کا کیا جواز ہے کہ اس حدیث کا مورد صرف حضرت کے اس اقدام کو قرار دیا جائے اور سابقہ جنگوں کو فتنہ کہنے سے گریز کیا جائے۔ جب کہ قرب زمانہ کے اعتبار سے فتنہ انہی پر زیادہ صادق آتا ہے اور امیرالمومنین کی یہ جنگ تو ان جنگوں میں سے ایک ہے جن کے لڑنے کی پیغمبر اکرم نے انہیں ہدایت کی تھی اور ان مہموں میں سے ایک مہم ہے جنہیں سر کرنے پر انہیں مامور فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری کہتے ہیں:-

امر رسول اللہ علیا بقتال الناکثین والقاسطین والمارقین۔
(مستدرک حاکم۔ ج ۳۔ ص ۱۳۹)

رسول اللہ نے حضرت علی کو حکم دیا تھا کہ وہ بیعت شکنوں (اصحاب جمل)، بے راہ روؤں (اصحاب صفین) اور بے دینوں (خوارج) سے جنگ کریں۔"

اور پھر پیغمبر نے حضرت علی کے اس اقدام کو ایک مظلوم و حق پرست کا اقدام اور اس کے مقابلہ میں زبیر کی جنگ کو ظالمانہ و جارحانہ قرار دیتے ہوئے بطور پیشین گوئی فرمایا تھا :-

لتقاتلنه وانت له ظالم -	اے زبیر تم علی سے جنگ کرو گے اور تم ان کے حق میں ظالم ہو گے ۔"
(تاریخ کامل - ج ۳ - صد ۱۲۲)	

اور چشمہ حواب کے سلسلہ میں حضرت عائشہ کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا :-

وایاك ان تکونی انت یا حمیرا -	خبردار اے عائشہ کہیں وہ تم ہی نہ ہونا ۔"
(تاریخ یعقوبی - ج ۲ - صد ۱۵۷)	

ان ارشاداتِ پیغمبر کے علاوہ قرآنِ مجید میں بھی علم بغاوت بلند کرنے والوں کے خلاف واضح طور پر جنگ و قتال کا حکم آیا ہے - چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے :-

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احدهما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر الله -	اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں آمادۂ جنگ و قتال ہوں تو ان میں صلح کراؤ - اگر ان میں سے ایک دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو تم اس زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو - یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف پلٹ آئے ۔"

ان نصوص کے ہوتے ہوئے پھر اسے فتنہ سے تعبیر کرنا عمداً حق پوشی یا صریحاً کج ذہنی کا ثبوت مہیا کرنا ہے -

بہرحال جب ام المومنین کا لشکر چشمہ حواب سے آگے بڑھ کر چاہ ابوموسیٰ پر پہنچا اور حاکم بصرہ عثمان ابن حنیف کو اس لشکرِ گراں کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے ابوالاسود دئلی اور عمران ابن حصین کو حضرت عائشہ کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے بصرہ میں آنے کا سبب دریافت کریں - چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر ابوالاسود نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ اے مادرِ گرامی آپ کس مقصد سے یہاں تشریف لائی ہیں اور یہ فوج و سپاہ آپ کے ہمراہ کیوں ہے - کہا کہ میں خونِ عثمان کا انتقام لینا چاہتی ہوں جنہیں لوگوں نے بے جرم و خطا گھر کے اندر قتل کر ڈالا ہے - ابوالاسود نے کہا کہ بصرہ میں تو ان کا قاتل کوئی نہیں ہے کہا کہ یہ صحیح ہے مگر میں اہلِ بصرہ کے تعاون سے ان کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتی ہوں جو علی کے گرد و پیش جمع ہیں - ابوالاسود نے کہا کہ آپ حرمِ رسولِ خدا ہیں وہ آپ کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دے گئے تھے آپ کو ان معرکہ آرائیوں سے کیا مطلب اور ان خونی ہنگاموں سے کیا سروکار یہ امر آپ کے شایان

شان نہیں کہ آپ گھر کا گوشہ چھوڑ کر میدانِ کارزار گرم کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوں۔ کہا کہ ہم سے دو بدو ہو کر لڑنے کی ہمت و جرأت کس کو ہو سکتی ہے۔ ابوالاسود نے کہا کہ ہم لڑیں گے اور دنیا دیکھے گی کہ اس طرح لڑا جاتا ہے۔

ام المومنین کا یہ یقین تھا کہ ان کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کی جرأت کسی کو نہ ہو گی شائد اس بنا پر ہو کہ حضرت علی کے ہمرکاب تو وہی گنے چنے چند افراد ہوں گے جنہیں آپ مدینہ سے لے کر چلے ہوں گے اور کوفہ جہاں سے جنگجو افراد فراہم ہو سکتے ہیں ابوموسیٰ کے زیر اثر ہے اور اس کے ہوتے ہوئے وہاں سے عسکری امداد کے حاصل ہونے کا بظاہر امکان نہیں ہے۔ اس صورت میں حضرت کی مختصر سپاہ ان کے لشکر گراں کے مقابلہ میں جم نہ سکے گی اور بن لڑے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی یا اس بناء پر ہو کہ حرم رسول ہونے کی وجہ سے وہ انتہائی عزت و توقیر کی مستحق ہیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت اور عزت و احترام بھی ہے اس صورت میں کون ہو گا جو ان سے نبرد آزما اور برسرپیکار ہو گا مگر انہوں نے جو سوچا تھا، معاملہ اس کے برعکس تھا اور اہلِ کوفہ جوق در جوق اٹھ کھڑے ہوئے اور امیرالمومنین کی سپاہ میں شامل ہو کر پورے لشکر پر چھا گئے اور ابوموسیٰ منہ دیکھتا رہ گیا۔ البتہ دوسرا خیال کہ ان کی عزت و حرمت مقابلہ سے مانع ہو گی تو یہ خیال ایک حد تک درست ہو سکتا تھا بشرطیکہ وہ خود اس احترام کا لحاظ رکھتیں اور گھر کا گوشہ چھوڑ کر فوج و سپاہ کے ساتھ نہ نکل کھڑی ہوتیں اور جب انہوں نے خود اپنے مقام و مرتبہ کا لحاظ نہ رکھا تو یہ توقع کیونکر رکھتی تھیں کہ جو احترام انہیں گھر کے اندر رہنے کی صورت میں حاصل تھا وہ اب بھی باقی و برقرار رہے گا۔

ابوالاسود حضرت عائشہ سے گفتگو کرنے کے بعد طلحہ و زبیر کے پاس آئے اور ان سے بھی وہی سوال کیا جو ام المومنین سے کر چکے تھے۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو ام المومنین دے چکی تھیں کہ ہمارے یہاں آنے کا مقصد خونِ عثمان کا قصاص ہے۔ ابوالاسود نے کہا کیا تم دونوں نے حضرت علی کی بیعت نہیں کی تھی کہا کی تو تھی مگر اس حالت میں کہ تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی تھی اور بیعت کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ابوالاسود ان کے اندازِ گفتگو سے سمجھ گئے کہ وہ فتنہ و شورش پر آمادہ اور جنگ و قتال پر تلے ہوئے ہیں اور ان سے مزید گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ انہوں نے پلٹ کر عثمان ابن حنیف کو ان لوگوں کے عزائم سے آگاہ کیا اور دفاعی انتظامات کو مضبوط تر کرنے کا مشورہ دیا۔ عثمان ابن حنیف نے اہلِ شہر کو مسجد میں جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ہتھیار مہیا رکھیں اور دفاع کے لئے مستعد رہیں۔

ام المومنین کے لشکر نے چاہ ابوموسیٰ پر کچھ توقف کرنے کے بعد حرکت کی اور حدودِ بصرہ میں

داخل ہو کر مربد (اونٹوں کی منڈی) میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اہلِ شہر نے حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے آنے کی خبر سنی تو چاروں طرف سے سمٹ کر مربد میں جمع ہو گئے اور اپنے اپنے خیال اور اپنے اپنے نظریئے کے مطابق تبصرے کرنے لگے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ "یہ لوگ اگر کسی خوف و دہشت کی بناء پر اپنے گھروں سے نکلے ہیں تو یہ اس شہر سے آئے ہیں جہاں پرندوں تک کو امان حاصل ہے۔ اور اگر خون عثمان کے انتقام کے لئے آئے ہیں تو ہم اُن کے قاتل نہیں ہیں۔ اے اہل بصرہ میری بات غور سے سنو اور انہیں یہیں سے واپس جانے پر مجبور کر دو۔ اس پر طلحہ و زبیر کے ہمنواؤں نے اس پر پتھر برسائے اور اُسے خاموش کر دیا۔ جاریہ ابن قدامہ نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر حضرت عائشہ سے کہا:۔

يا ام المومنين والله لقتل عثمان اهون علينا من خروجك من بيتك على هذا الجمل الملعون عرضة للسلاح انه قد كان لك من الله ستر وحرمة فهتكت سترك وابحت حرمتك انه من راى قتالك يرى قتلك ان كنت اتيتنا طائعة فارجعي الى منزلك وان كنت اتيتنا مستكرهة فاستعيني بالناس

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۸۲)

"اے ام المومنین آپ کا اس ملعون اونٹ پر بیٹھ کر ہتھیاروں کا نشانہ بننے کے لئے نکل کھڑا ہونا قتل عثمان سے بڑھ کر مصیبت ہے آپ کے لئے خدا کی طرف سے حجاب و احترام تھا مگر آپ نے اس پردے کو چاک کر ڈالا ہے اور اپنا احترام کھو دیا ہے۔ جو شخص آپ سے جنگ و قتال صحیح سمجھتا ہے وہ آپ کو قتل کرنے میں بھی باک نہیں کرے گا۔ اگر آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ تو اپنے گھر واپس جائیے اور اگر آپ کو مجبور کر کے لایا گیا ہے تو اس کے خلاف لوگوں سے مدد حاصل کیجیے۔"

ام المومنین نے ان باتوں کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا چہ جائیکہ ان سے اثر لیتیں یا ان پر غور کرتیں انہوں نے تمام تر توجہ اپنی قوت بڑھانے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے پر مرکوز کر دی تا کہ پوری توانائیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کر سکیں۔ اہلِ بصرہ کو ہمنوا بنانے کے لئے ضروری تھا کہ ان کے یہ ذہن نشین کر دیا جائے کہ [illegible]ی کی انگیخت پر عثمان قتل ہوئے ہیں اور چند شورش پسندوں کے بل بوتے پر انہوں نے خلافت پر قبضہ کیا ہے نہ انہیں اصحاب شوریٰ کا تعاون حاصل ہے اور نہ رائے عامہ کی تائید۔ چنانچہ ام المومنین اور طلحہ و زبیر نے عوام کو اس قسم کے تاثرات دینے کے لئے اس اجتماع سے خطاب کرنا چاہا اگرچہ چاروں طرف شور و غل مچا ہوا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تاہم لوگوں کو خاموش کرنے کی کوشش کی گئی اور طلحہ نے

طلحہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اے لوگو ہم عثمان کی خوشنودی کے دل و جان سے خواہاں تھے مگر چند بے وقوفوں نے عقلمندوں کو مغلوب کر کے انہیں قتل کر دیا اب ہم ان کے خون کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔" ابھی یہیں تک کہنے پائے تھے کہ لوگوں نے کہا کہ اے ابو محمد (طلحہ) تمہارے خطوط تو اس کے خلاف ہمارے پاس آتے رہے ہیں۔ طلحہ کوئی جواب نہ دے سکے اور خاموش ہو گئے۔ اب زبیر کی نوبت آئی اور انہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میری طرف سے تو کوئی تحریر تمہارے پاس نہیں آئی۔ پھر انہوں نے قتل عثمان کے واقعات دہرائے اور امیر المومنین کو موردِ الزام قرار دیتے ہوئے ان پر سخت لب و لہجہ میں نکتہ چینی کی۔ اس پر قبیلۂ عبد القیس کا ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑا ہونے پر پھر شور مچا۔ کچھ لوگوں نے اسے منع کرنا چاہا مگر اس نے شور و شغب اور مخالف آوازوں کی پروا کیے بغیر تقریر شروع کر دی۔ تمہید میں اس نے تینوں خلافتوں کا ذکر کیا اور پھر امیر المومنین کی خلافت کے متعلق کہا کہ تم لوگوں نے ہم سے مشورہ کیے بغیر علی کی بیعت کر لی اور انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ اب کیا بات ہوئی ہے کہ تم ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہو ہمیں بتاؤ تاکہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہو کر ان سے لڑیں۔ کیا انہوں نے مال غنیمت دبا لیا ہے یا کوئی خلاف شرع قدم اٹھایا ہے یا کوئی ایسا کام کیا ہے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ بتاؤ انہوں نے کیا کیا ہے۔ تاکہ ہم بھی تمہارا ساتھ دیں۔ اگر یہ کچھ نہیں ہے تو پھر یہ شور و ہنگامہ بے معنی ہے۔" ابھی وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ طلحہ و زبیر کے ساتھی اس کی طرف لپکے تاکہ اسے مار ڈالیں مگر اس کے قبیلہ والے آڑے آئے اور اسے بچا کر لے گئے۔ مگر دوسرے دن ام المومنین کے آدمیوں نے حملہ کر کے اسے اور اس کے ستر آدمیوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔

مورخ طبری نے لکھا ہے:

لما کان الغداۃ ثبوا علیہ وعلیٰ من کان معہ فقتلوا سبعین رجلا۔	دوسرے دن اس پر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا اور ان میں کے ستر آدمی قتل کر دیئے۔"

(تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۸۶)

ان تقریروں کے بعد حضرت عائشہ کی باری آئی انہوں نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں حضرت عثمان کی مظلومیت و بے گناہی کا تذکرہ کیا اور لوگوں کو ان کے انتقام پر ابھارا اور دوران تقریر میں کہا کہ ان کے قاتلوں کو ایک ایک کر کے قتل کر ڈالو اور خلافت کا مسئلہ حضرت عمر کے منتخب کردہ ارکان شوریٰ کے سپرد کر دو اور جو قتل عثمان میں متہم ہو اسے شوریٰ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ ام المومنین کی یہ تجویز بڑی معنی خیز ہے۔ انہوں نے شوریٰ پر عمل پیرا ہوتے کا مشورہ دے کر بڑی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور

خلافت کا رُخ ادھر موڑ دیا جدھر وہ موڑنا چاہتی تھیں اس طرح کہ اس وقت شوریٰ کے صرف چار رکن باقی تھے۔ علی ابن ابی طالب، سعد ابن ابی وقاص، طلحہ اور زبیر۔ حضرت تو اُن کے نزدیک خون عثمان میں متہم تھے۔ لہٰذا انہیں شوریٰ میں شامل کئے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رہے سعد ابن ابی وقاص تو وُہ ان کے حصول مقصد میں حائل نہ ہو سکتے تھے اس لئے کہ حضرت عمر نے طریق انتخاب یہ تجویز کیا تھا کہ جدھر اکثریت ہو خلیفہ کا انتخاب اس میں سے ہو گا۔ طلحہ و زبیر میں کوئی بھی سعد کے حق میں رائے دینے کو تیار نہ تھا اس لئے کہ وہ دونوں خود خلافت کی آس لگائے بیٹھے تھے اور اسی کے لئے یہ ساری ہنگامہ آرائی تھی اب سعد ہی کو ان دو میں سے ایک کا ساتھ دینا تھا اگر وہ طلحہ کا ساتھ دیتے تو وہ خلیفہ ہوتے اور زبیر کا ساتھ دیتے تو انہیں خلافت ملتی اور ام المومنین کا مقصد دونوں طرح پورا ہوتا تھا اس لئے کہ وہ حضرت علی کو اقتدار سے الگ کر کے خلافت کو انہی دو میں منحصر دیکھنا چاہتی تھیں۔

ام المومنین کی اس تقریر کو مجمع نے بڑے سکون سے سنا مگر خاتمہ تقریر پر ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا۔ اور مختلف زبانوں سے مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ام المومنین صحیح کہتی ہیں اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف کہا۔ اور اہلِ بصرہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ طلحہ و زبیر کی حمایت پر اتر آیا اور ایک گروہ عثمان ابن حنیف کا ہمنوا ہو گیا اور ایک دوسرے پر ڈھیلے پھینکنے اور پتھر برسانے لگے البتہ ایک گروہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ کس کا ساتھ دے اور کس کا ساتھ نہ دے۔ غرض ان لوگوں کی آمد سے گھر گھر میں پھوٹ اور بھائی بھائی میں تفرقہ پڑ گیا۔

اب ان لوگوں نے دائرۂ کار وسیع کرنے کے لئے مختلف جگہوں پر پیغامات بھیجے اور وہاں کے باشندوں سے تعاون کی خواستگاری کی۔ چنانچہ ام المومنین نے احنف ابن قیس کو جو قبیلۂ بنی تمیم کا سردار اور ان اطراف کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھا اپنے ہاں بلوایا اور اس سے کہا کہ تم قاتلان عثمان کے خلاف جہاد سے پہلوتہی کرتے نظر آتے ہو کل اپنی کوتاہی کا کیا عذر کرو گے اور اللہ کو کیا جواب دو گے جب کہ تمہارے قبیلہ میں نہ افراد کی کمی ہے اور نہ تمہاری کوئی بات رد کی جاتی ہے۔ احنف نے کہا اے ام المومنین ابھی کل کی بات ہے آپ ان پر لے دے کرتی تھیں اور انہیں مطعون کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور آج اُن کا قصاص لینے کے لئے میدان میں اتر آئی ہیں۔ کہا کہ لوگوں نے انہیں اس طرح دھو ڈالا جس طرح برتن کو رگڑ رگڑ کر دھویا جاتا ہے۔ اور جب وہ گناہوں سے پاک صاف ہو گئے تو انہیں قتل کر ڈالا۔ احنف نے کہا:۔

یا ام المومنین انی اخذ بامرک	اے ام المومنین میں آپ کا وہ حکم تو مان سکتا ہوں

وانت راضیۃ وادعہ وانت ساخطۃ۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲۰)

جو آپ نے رضامندی کی حالت میں دیا ہو اور وہ حکم ماننے کو تیار نہیں جو آپ نے غیظ و غضب کے عالم میں دیا ہو"

احنف نے تو ان کی طرف داری سے دامن بچا لیا لیکن بصرہ والوں کی اکثریت ان کے ساتھ ہو گئی۔ اب انہوں نے چاہا کہ امیرالمومنین کے وارد بصرہ ہونے سے پہلے بیت المال اور شہر کے نظم و نسق پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے شہر کی طرف قدم بڑھایا۔ عثمان ابن حنیف بلا کسی پس و پیش کے شہر اُن کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ انہوں نے راستوں کی ناکہ بندی کر کے جہاں تک ممکن تھا شہر کا تحفظ کر لیا۔ حملہ آور جس راستے سے بڑھتے عثمان کے ساتھی آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے اور انہیں آگے بڑھنے سے روک دیتے اور کچھ لوگ چھتوں پر سے پتھر پھینک کر انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے۔ لیکن فوجوں کے بڑھتے ہوئے ریلے کو کب تک روکا جا سکتا تھا۔ ان گنتی کے آدمیوں میں نہ مسلح فوج کے مقابلہ کی طاقت تھی اور نہ مقابلہ میں کامیابی کی کوئی صورت تھی۔ عثمان نے یہ دیکھا کہ شہر کو ان لوگوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تو وہ ایک دستہ فوج کو لے کر طلحہ و زبیر کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ تمہارا مطالبہ کیا ہے اور یہ شورش و ہنگامہ آرائی کیوں ہے کہا کہ ہم خون عثمان کا قصاص لینا چاہتے ہیں۔ کہا قصاص لینے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم خلافت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کہا کہ اگر ایسا ہو بھی تو علی ہم سے زیادہ خلافت کے حقدار نہیں ہیں۔ آخر دونوں طرف سے بات بڑھنے لگی اور بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھی کہ فریقین نے تلواریں نکال لیں اور خونریز جنگ چھڑ گئی۔ جب دونوں طرف سے اچھے خاصے آدمی مارے گئے تو حضرت عائشہ نے امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ رکوا دی اور فریقین میں یہ معاہدہ طے پایا کہ جب تک امیرالمومنین تشریف نہیں لے آتے لڑائی بند کر دی جائے۔ عثمان بدستور دارالامارہ میں رہیں اور حکومت کے انتظامی امور میں کوئی رد و بدل نہ کیا جائے۔

اس معاہدہ کو طے پائے ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ ایک سرد و تاریک رات میں ان لوگوں نے عثمان پر شبخون مارا اور انہیں گرفتار کر کے چالیس کوڑے مارے اور ڈاڑھی بھوؤں اور پلکوں کے بال نوچ ڈالے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے :۔

لم یلبث الا یومین او ثلاثۃ ایام حتی وثبوا علی عثمان عند بیت الرزق فظفروا

ابھی دو یا تین دن گزرے ہوں گے کہ انہوں نے بیت الرزق کے نزدیک عثمان ابن حنیف پر حملہ کر دیا اور گرفتار کر کے چاہا کہ انہیں قتل کر

به واراد وا قتله ثم خشوا غضب الانصار فنتفوا شعر راسه ولحيته وحاجبيه و حبسوه۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۱)

دیں مگر اس خیال سے کہ کہیں انصار غضب ناک نہ ہو جائیں اقدام قتل سے ڈر گئے مگر ان کے سر ڈاڑھی اور بھوؤں کے بالوں کو اکھیڑ کر انہیں قید میں ڈال دیا۔"

جب عثمان ابن حنیف گرفتار کر کے قید میں ڈال دیئے گئے تو ان کے بارے میں حضرت عائشہ کا مشورہ لینا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان کے فرزند ابان کو اُن کے ہاں بھیجا گیا تاکہ ان سے دریافت کرے کہ عثمان کو قید میں رہنے دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ انہیں قتل کر دو ایک عورت نے یہ سنا تو چیخ کر کہا کہ اے ام المومنین میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں ان پر رحم کیجئے اور انہیں قتل ہونے سے بچایئے آخر وہ رسول اللہ کے صحابی ہیں کہا کہ اچھا ابان کو بلاؤ۔ ابان پلٹ کر آیا تو کہا کہ انہیں قتل نہ کرو اور قید میں رہنے دو۔ ابان نے یہ دوسرا حکم سنا تو کہا:۔

لو علمت انك تدعيني لهذا لم ارجع۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۸۵)

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس لئے بلا رہی ہیں تو میں پلٹ کر نہ آتا۔"

ام المومنین کے حکم سے عثمان تو اُن کی خون آشام تلواروں سے بچ گئے مگر ان کے ساتھیوں میں سے چالیس آدمی قتل کر دیئے گئے اس کشت و خون کے بعد انہوں نے بیت المال کے محافظ سپاہیوں کو جن کی تعداد پچاس تھی جکڑ باندھ لیا اور پھر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا۔ حکیم ابن جبلہ کو جو بصرہ کی ایک ممتاز شخصیت تھے اس سفاکی و خونریزی اور عثمان پر ظلم و تشدد کی اطلاع ہوئی تو وہ تڑپ اٹھے اور کہا کہ اگر میں نے اس موقع پر عثمان ابن حنیف کی مدد نہ کی تو گویا میں خوف خدا سے آشنا ہی نہیں ہوں۔ چنانچہ وہ بنی بکر اور بنی عبد القیس کے تین سو آدمیوں کو لے کر مدینۃ الرزق کی طرف بڑھے جہاں عبداللہ ابن زبیر اپنے آدمیوں میں غلہ تقسیم کر رہا تھا اس نے حکیم کو آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر پوچھا کہ تم کیسے آئے ہو کہا کہ اس غلہ میں سے ہمارا حصہ ہمیں دیا جائے۔ عثمان ابن حنیف کو رہا کیا جائے اور اس وقت انہیں دارالامارہ میں رہنے دیا جائے۔ جب تک امیر المومنین یہاں تشریف فرما نہیں ہوتے۔ خدا کی قسم اگر ہمارے پاس یار و انصار ہوتے تو ہم اس خونریزی و غارت گری پر خاموش نہ رہتے اور ان لوگوں کا ضرور انتقام لیتے جنہیں تم لوگوں نے بے جرم و خطا قتل کر ڈالا ہے۔ ابن زبیر نے کہا کہ ہم نے خونِ عثمان کا بدلہ لیا ہے۔ کہا کہ جن لوگوں کو تم نے قتل کیا ہے کیا وہ عثمان کے قاتل تھے۔ تم لوگ اللہ کے غضب سے کیوں نہیں ڈرتے اور اس قتل و خونریزی کا سلسلہ کیوں نہیں روکتے کہا تم لاکھ چیخو چلاؤ

نہ نہیں اس میں سے کچھ دیا جائے گا اور نہ ابن حنیف کو رہا کیا جائے گا۔ ہاں اگر وہ علی کی بیعت توڑ دیں تو انہیں رہا کیا جا سکتا ہے۔ حکیم نے یہ صورت حال دیکھی تو کہنے لگے" بار الٰہا تو حاکم عادل ہے تو ان لوگوں کے ظلم و جور پر گواہ رہنا" پھر اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

لست فی شک من قتال ھٰؤلآء   مجھے ان لوگوں سے جنگ و قتال کے جواز میں کوئی
فمن کان فی شک فلینصرف۔   شبہہ نہیں ہے جسے شک ہو وہ واپس چلا جائے"

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۴۹۱)

یہ کہہ کر حکیم نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور اپنے گنے چنے ساتھیوں کو لے کر میدان میں اتر آئے۔ ادھر وہ لوگ بھی شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور تلواریں تلواروں سے ٹکرا کر خون برسانے لگیں۔ دوران جنگ میں ایک شخص نے حکیم کے پیر پر تلوار ماری اور اسے کاٹ دیا۔ حکیم نے وہی کٹا ہوا پیر اٹھا کر اس زور سے اس کی طرف پھینکا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ حکیم گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور اُسے نیچے دبوچ کر اس پر بیٹھ گئے اور اس وقت تک الگ نہ ہوئے جب تک اس نے دم توڑ نہ دیا۔ حکیم جہاں تک ممکن تھا لڑتے رہے مگر ایک مختصر سا فوجی دستہ کہاں تک اس لشکر گراں کا مقابلہ کرتا آخر ایک ایک کر کے سب مارے گئے اور حکیم اور ان کے فرزند اشرف اور بھائی رعل ابن جبلہ بھی اس جنگ میں کام آ گئے۔ یہ جنگ جمل اصغر کے نام سے موسوم ہے جو ۲۵ ربیع الثانی ۳۶ھ میں ہوئی۔

حکیم اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے بعد طلحہ و زبیر نے چاہا کہ عثمان کو بھی تہ تیغ کر دیں عثمان نے ان کے تیوروں سے بھانپ لیا کہ اب انہیں قتل کرنے کا ارادہ ہے انہوں نے کہا کہ اگر تم لوگوں نے مجھے قتل کر دیا تو یاد رکھو کہ میرا بھائی سہل ابن حنیف اس وقت حاکم مدینہ ہے وہ میرے خون کے بدلے میں وہاں تمہارے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چن چن کر قتل کرے گا۔ انہوں نے یہ سنا تو اپنے عزیزوں کی جانوں کو خطرہ میں دیکھ کر انہیں چھوڑ دیا اور وہ جان بچا کر بصرہ سے نکل کھڑے ہوئے اور مقام ذیقار میں امیر المومنین کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضرت نے عثمان ابن حنیف کی حالت زار دیکھی تو آبدیدہ ہو گئے۔ اور ان سے بصرہ کے حالات اور اصحاب جمل کے مظالم کے واقعات سنے تو غیظ و غضب سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسی وقت لشکر کی صف بندی کی میمنہ و میسرہ ترتیب دیا۔ میمنہ پر عبداللہ ابن عباس کو میسرہ پر عمر ابن ابی سلمہ کو اور مقدمہ پر ابو لیلیٰ ابن عمر کو امیر نامزد کیا علم لشکر محمد ابن حنفیہ کے سپرد فرمایا اور بصرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں قبیلۂ عبدالقیس کے ہاں کچھ دیر کے لئے قیام فرمایا۔ یہ قبیلہ حضرت کا ارادتمند تو

تھا ہی پیش آیند مہم کو دیکھ کر آپ کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

جب امیرالمومنین کا لشکر نواحی بصرہ میں پہنچا تو احنف ابن قیس جو قتل عثمان کے بعد آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ یا امیرالمومنین میں دو باتیں پیش کرتا ہوں اگر حکم ہو تو میں آپ کے ہمرکاب رہ کر جنگ کروں یا چار ہزار تلواریں جو آپ کے خلاف کھنچی ہوئی ہیں۔ انہیں روک دوں۔ حضرت نے دوسری تجویز مان لی اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اب حضرت بصرہ کی شمالی سمت بڑھے اور مقام زاویہ میں منزل کی اور چند خطوط اور مختلف قاصد طلحہ، زبیر اور ام المومنین کے پاس بھیجے اور انہیں حرب و پیکار اور خانہ جنگی سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر یہ بات ان کے ذہنوں میں اتر نہ سکی کہ یوں تو تمام جنگیں تباہ کن ہوتی ہیں مگر خانہ جنگی تمام جنگوں سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے۔ وہ سمجھانے بجھانے کے باوجود جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب امیرالمومنین کے قاصد مصالحت سے مایوس ہو کر پلٹ آئے اور یہ امر واضح ہو گیا کہ وہ جنگ کے علاوہ کسی چیز پر رضامند نہیں ہیں، تو زاویہ سے قدم آگے بڑھایا اور قصر عبیداللہ ابن زیاد کے پاس پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ امیرالمومنین کے لشکر کی تعداد بیس ہزار تھی اور طلحہ و زبیر نے بنی ازد، بنی ضبہ، بنی حنظلہ، بنی سلیم وغیرہ مختلف قبائل کو اپنا ہمنوا بنا کر ان سے قصاص کے نام پر بیعت لے لی تھی اور اس طرح ان کے لشکر کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ جب دونوں طرف کے لشکر میدان میں اتر آئے تو حضرت نے پھر انہیں جنگ کی تباہ کاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے سمجھایا بجھایا مگر انہوں نے اپنی کثرت و قوت پر بھروسا کرتے ہوئے ان باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور انجام سے آنکھیں بند کر کے یالثارات عثمان کے نعرے لگاتے ہوئے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے بھی ان کی صفوں کے بالمقابل صفیں جما دیں اور اپنے لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا "جب تک دشمن ابتدا نہ کرے تم آگے نہ بڑھنا اور جب تک وہ حملہ نہ کرے تم وار نہ کرنا کسی بھاگنے والے کا راستہ نہ روکنا نہ کسی زخمی پر ہاتھ ڈالنا کسی صاحب عزت کی پردہ دری نہ کرنا نہ کسی کے ہاتھ پیر کاٹنا نہ کسی کی لاش کی بے حرمتی کرنا اور نہ کسی عورت کو گزند پہنچانا۔" جب لشکر کو یہ ہدایات دے چکے تو بے زرہ و سلاح گھوڑے پر سوار ہو کر صفوں سے باہر نکلے اور پکار کر کہا کہ زبیر کہاں ہے۔ زبیر پہلے تو سامنے آنے سے ہچکچائے اور پھر زرہ بکتر اور آلات حرب سے آراستہ ہو کر حضرت کے قریب آئے۔ آپ نے فرمایا اے زبیر بصرہ میں کیوں آئے ہو اور یہ خطرناک قدم کیوں اٹھایا ہے کہا خون عثمان کے قصاص کے لئے۔ فرمایا:۔

انطلب منی دم عثمان و قد — کیا مجھ سے خون عثمان کا قصاص چاہتے ہو حالانکہ

قتلته سلط الله علی اشدنا علیه الیوم مایکرہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۵۱۱)

تم نے انہیں قتل کیا۔ خدا اُس پر موت ایسی ناگوار چیز کو مسلط کرے جو ہم میں سے ان پر زیادہ سختی و تشدد کو روا رکھتا تھا"

زبیر اس کی تردید نہ کر سکے کہنے لگے :۔

لا اراك لهذا الامر اهلا ولا اولی به منا۔ (تاریخ طبری: ج ۳ ص ۵۱۹)

ہم آپ کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے اور نہ آپ ہم سے زیادہ اس کے سزاوار ہیں"

حضرت نے فرمایا کہ آج تو تم ہمیں خلافت کا اہل نہیں سمجھتے اور ہم تو تمہیں عبدالمطلب ہی کی اولاد سمجھتے رہے ہیں یہاں تک کہ تمہارے ناہنجار بیٹے نے ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ڈلوا دی۔ اے زبیر میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے رسول اللہ کو یہ فرماتے نہیں سنا کہ :۔

انك تقاتلنی وانت ظالم لی (تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج ۲۔ ص ۱۵۱)

تم مجھ سے جنگ کرو گے اور میرے حق میں ظالم ہو گے"

زبیر نے پیغمبر اکرم کی یہ پیشین گوئی سنی تو کہا کہ ہاں رسول اللہ نے فرمایا تو تھا۔ کہا پھر کیوں آئے ہو کہا بھول گیا تھا اس بھولی بسری بات کو سن کر اور یہ دیکھ کر کہ عمار یاسر امیرالمومنین کے لشکر میں موجود ہیں، جن کے بارے میں پیغمبر نے فرمایا تھا" اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا" جنگ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور کہا کہ اب میں آپ سے نہیں لڑوں گا اور بن لڑے واپس چلا جاؤں گا۔ چنانچہ وہ مرجھائے ہوئے چہرے اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ حضرت عائشہ کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے اس وقت تک جو قدم اٹھایا سوچ سمجھ کر اٹھایا۔ مگر اس جنگ میں نہ میری عقل کام کرتی ہے اور نہ میری بصیرت میرا ساتھ دیتی ہے لہذا میں علی کے خلاف جنگ میں حصہ نہ لوں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ یہ کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہو۔ عبداللہ نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ فرزندانِ عبدالمطلب کی چمکتی ہوئی تلواریں، لہراتے ہوئے پھریرے اور موت کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر ڈر گئے ہیں۔ کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ علی نے ایک بھولی ہوئی بات یاد دلا دی ہے۔ اب میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں اور کسی صورت سے رک نہیں سکتا۔ یہ کہا اور میدان چھوڑ کر چل دیے۔ اور بصرہ سے سات فرسخ کے فاصلہ پر وادی السباع میں عمرو ابن جرموز کے ہاتھ سے مارے گئے۔

اور امیرالمومنین کے اس قول کی تصدیق ہو گئی جو زبیر کے طلب قصاص کے جواب میں فرمایا تھا۔ زبیر کا یہ اقدام بجائے خود ایک ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے سابقہ موقف کو غلط سمجھا کیونکہ ان کا

پہلا موقف صحیح ہو تو یہ دوسرا اقدام صحیح نہیں ہو سکتا اور اگر دوسرا اقدام درست تھا تو پہلا اقدام لامحالہ غلط ہو گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ علی سے جنگ کرنا بھی صحیح ہو اور ان کے مقابلہ میں جنگ سے گریز کرنا بھی درست ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ ابن زبیر نے ابن عباس پر طعن کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں نے ام المومنین سے جنگ کی اور حواریٔ رسول زبیر سے لڑے تو انہوں نے زبیر کے اسی موقف کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ حقیقت امر تو یہ ہے کہ تمہارے والد بزرگوار حضرت عائشہ کو گھر سے نکال کر میدان میں لائے اور علی کے مقابلہ میں صف آراء ہوئے۔ میں تم سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ تم علی کو مومن سمجھتے ہو یا (معاذاللہ) کافر اگر مومن سمجھتے ہو تو تم ان سے جنگ لڑ کر گمراہ ہوئے اور اگر کافر سمجھتے ہو تو تمہارے والد (زبیر) گمراہ اور مستحق عذاب ٹھہرے اس لئے کہ انہوں نے ایک کافر کے مقابلہ میں جہاد سے منہ موڑا اور راہِ فرار اختیار کی اب تمہاری مرضی جسے چاہو اسے گمراہ سمجھو۔

زبیر کے بعد حضرت نے چاہا کہ طلحہ پر بھی حجت تمام کر دیں۔ چنانچہ انہیں مخاطب کر کے کہا:۔

یا طلحہ جئت بعرس رسول اللہ تقاتل بہا وخبأت عرسك فی البیت اما بایعتنی۔

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۵۲۰)

"اے طلحہ تم رسول اللہ کی بیوی کو جنگ و قتال کے لئے لے آئے ہو اور اپنی بیوی کو گھر کے اندر پردہ میں چھوڑ آئے ہو کیا تم نے میری بیعت نہیں کی تھی؟"

جب طلحہ پر اپنی بیعت کے ذریعہ اتمام حجت کر چکے تو آپ نے قرآن اپنے ہاتھوں میں لیا اور صفوں کا ایک چکر کاٹ کر بلند آواز سے کہا کہ تم میں کون ہے جو یہ قرآن لے کر صف اعداء کے سامنے جائے اور انہیں قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے اور اسی کتاب کا واسطہ دے کر انہیں فتنہ انگیزی سے منع کرے۔ مگر یہ سمجھ لے کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ کوفہ کے ایک جوان مسلم ابن عبداللہ مجاشعی نے کہا کہ میں جاؤں گا۔ حضرت کے تین مرتبہ کہنے پر جب مسلم کے سوا کوئی اور تیار نہ ہوا تو آپ نے اسے دعائے خیر دی اور قرآن اس کے حوالے کیا۔ وہ مصحف ہاتھوں پر اٹھائے مخالف صفوں کے سامنے آیا اور انہیں قرآن کے اوامر و نواہی یاد دلائے اور ان پر عمل کرنے کی دعوت دی مگر اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور کسی نے توجہ نہ کی۔ اتنے میں حضرت عائشہ کے ایک غلام نے تلوار سے حملہ کیا اور اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے۔ مسلم نے قرآن کو سینے سے لگا لیا اور تلوار کا وار کھا کر شہید ہو گیا۔ اور قرآن بھی تیروں کی بوچھار سے چھلنی ہو گیا۔ امیرالمومنین نے یہ اسلام سوز منظر دیکھا تو فرمایا:۔

الآن حل قتالھم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص ۵۲۲)

"اب ان لوگوں سے جنگ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔"

مسلم مجاشعی کی اس مجاہدانہ سرفروشی کے بعد عمار بن یاسر دشمنوں کی صفوں کے قریب آئے اور ان سے مخاطب ہوکر کہا "اے لوگو! تم نے اپنی عورتوں کو گھروں کے اندر پردے میں بٹھا رکھا ہے اور پیغمبر اکرم کی بیوی کو تلواروں نیزوں اور بھالوں کے سامنے لے آئے ہو۔ تم خون عثمان کا انتقام لینے آئے ہو حالانکہ تمہیں بخوبی علم ہے کہ عثمان کے قاتل کون تھے اور ان کے قتل کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے"۔ عمار اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ تیروں کی بوچھار نے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ پلٹ کر حضرت سے کہا کہ یا امیر المومنین اب کس بات کا انتظار ہے یہ لوگ جنگ کے علاوہ کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔

امیر المومنین کے صبر و سکوت اور صلح پسندانہ روش سے دشمن کے حوصلے بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے آپ کی صفوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ جانباز سپاہیوں کے سینے چھلنی ہوگئے اور زخموں سے نڈھال ہو کر زمین پر گرنے لگے۔ اس اثنا میں ایک شخص کو اٹھا کر حضرت کے سامنے لایا گیا جو تیروں سے چھلنی ہو کر جاں بحق ہو چکا تھا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو لایا گیا وہ بھی دشمن کے تیروں سے شہید ہو چکا تھا۔ پھر عبداللہ ابن بدیل اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو لائے جو تیر کھا کر دم توڑ چکا تھا۔ حضرت نے یہ کیفیت دیکھی تو پیشانی پر بل آیا تیور بدلے اور فرمایا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اب میدان میں اترے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ حجت ہر طرح سے تمام ہو چکی تھی۔ صلح کے آثار ختم ہو چکے تھے اور دشمن کی طرف سے پہل ہو چکی تھی آپ نے پیغمبر خدا کی زرہ ذات الفضول طلب فرمائی اور اسے زیب تن کیا سر پہ سیاہ عمامہ باندھا ذوالفقار ہاتھ میں لی میمنہ کی قیادت مالک اشتر کے اور میسرہ کی کمان عمار یاسر کے سپرد کی رسول اللہ کا سیاہ علم عقاب محمد ابن حنفیہ کو دیا۔ اور فرمایا بیٹا آگے بڑھو۔ محمد علم لے کر آگے بڑھے تو تیروں کی بوچھار نے راستہ روکا۔ حضرت نے آگے بڑھ کر علم محمد کے ہاتھ سے لے لیا۔ ایک ہاتھ سے علم سنبھالا اور ایک ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا اور فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح لڑے کہ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر اور سروں کے انبار لگ گئے۔ جب لشکر کو تہ و بالا کر چکے تو پلٹ کر علم محمد ابن حنفیہ کو دیا انہوں نے بھی اس طرح مردانہ وار حملہ کیا کہ لاشیں خاک و خون میں تڑپتی نظر آنے لگیں۔

اس ہنگامہ دار و گیر میں مروان طلحہ کی تاک میں تھا کہ کسی طرح انہیں ختم کر کے خون عثمان کا انتقام لے کیونکہ قتل عثمان کی ایک حد تک ذمہ داری ان پہ بھی عائد ہوتی تھی۔ اس انتقامی جذبہ کے علاوہ انہیں ٹھکانے لگانے میں ایک سیاسی مقصد بھی کارفرما تھا اور وہ یہ کہ مروان سمجھتا تھا کہ جب تک طلحہ و زبیر زندہ ہیں خلافت بنی امیہ کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی البتہ ان دونوں کو ختم کرنے کے بعد اس کا امکان ہو سکتا ہے۔ زبیر تو محاذ جنگ سے جا چکے تھے۔ اگر وہ میدان میں رہ جاتے تو بعید نہ تھا کہ مروان

کے ترکش کا تیر انہیں بھی نشانہ بناتا۔ اس نے طلحہ کو ہلاک کرنے کا موقع ڈھونڈھ نکالا اور اپنے ایک غلام کی اوٹ لے کر زہر آلود تیر ان پر چلایا جو ان کی پنڈلی کو چیرتا ہوا گھوڑے کے شکم میں پیوست ہو گیا گھوڑا زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا اور ایک خرابہ میں جا کر رُکا اور وہیں پر طلحہ نے دم توڑ دیا۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

ان مروان ابن الحکم رمی طلحۃ یوم الجمل وھو واقف الی جنب عائشۃ بسھم فاصاب ساقہ ثم قال واللّٰہ لا اطلب قاتل عثمان بعدک ابدا۔

جمل کے دن مروان ابن حکم نے طلحہ کو جو حضرت عائشہ کے پہلو میں کھڑے تھے تیر مارا جو اُن کی پنڈلی پر لگا۔ پھر مروان نے کہا کہ خدا کی قسم تمہارے بعد مجھے قاتل عثمان کے ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔"

طلحہ کے مارے جانے اور زبیر کے میدان خالی کر جانے سے اصحاب جمل کے نہ حوصلے پست ہوئے اور نہ ولولے سرد پڑے بلکہ استقلال و پامردی سے میدان میں جمے اور لڑنے مرنے پر تلے رہے اس لئے کہ وہ جنگ کا مرکزی کردار حضرت عائشہ کو سمجھتے تھے اور انہی سے ان کی عقیدتیں وابستہ تھیں۔ کوئی رہے یا جائے اس سے انہیں کوئی غرض نہ تھی۔ یہ عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ان کے اونٹ کی مینگنیاں اٹھا اٹھا کر ہاتھوں سے توڑتے انہیں سونگھتے اور کہتے کہ یہ ہماری مادر گرامی کے اونٹ کی مینگنیاں ہیں ان سے مشک و عنبر کی خوشبو آ رہی ہے۔ وُہ اونٹ کی حفاظت علم لشکر کی طرح کرتے اور ہمہ وقت اُس کے گرد حصار باندھے کھڑے رہتے اگرچہ مہار پکڑنے پر ہاتھ کٹتے سینے چھدتے خون بہتے مگر ثابت قدم رہتے اور اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتے۔ حضرت عائشہ ہودج کے اندر سے مہار پکڑنے والوں کو کٹ کٹ کر گرتے دیکھتی تھیں اور اُن کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔ اس ہمت افزائی کے نتیجہ میں جب بھی کوئی گرتا فوراً اس کی جگہ پر دوسرا آ کھڑا ہوتا اور مہار اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ ان مہار پکڑنے والوں میں زیادہ تر بنی ضبہ۔ بنی ناجیہ بنی ازد اور قریش کے آدمی ہوتے تھے جو اپنی اپنی نوبت پر مہار پکڑتے رجزیہ اشعار پڑھتے اور بے جگری سے لڑتے ہوئے جان دے دیتے۔ یوں تو اُن مہار پکڑنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف قریش میں سے ستر آدمی مہار پکڑنے پر مارے گئے تھے مگر ان میں سے چند ایک کا ذکر تاریخ میں نمایاں ہے۔ ان میں سے ایک بصرہ کا قاضی کعب ابن سوار تھا اگرچہ وہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا مگر طلحہ و زبیر نے حضرت عائشہ سے کہا کہ وہ اسے بلا کر یا خود اس کے ہاں جا کر اسے تعاون پر آمادہ کریں اس لئے کہ اگر کعب شریک نہ ہوا تو قبیلہ بنی ازد میں سے کوئی بھی ہمارا

ساتھ نہیں دے گا۔ ام المومنین نے کسی کے ہاتھ اسے بلوا بھیجا مگر وہ ٹال گیا۔ آخر ام المومنین خود اُن کے ہاں گئیں اور اسے آواز دی مگر وُہ چپ سادھے بیٹھا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ جواب کیوں نہیں دیتے کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں اس پر کعب نے دروازہ کھول دیا۔ ام المومنین نے اسے شریک جنگ ہونے کے لئے کہا اس نے کچھ دیر پس و پیش کیا اور آخر ہتھیار ڈال دیئے اور ام المومنین اسے میدان حرب و ضرب میں کھینچ لائیں۔ اس کی وجہ سے بنی ازد بھی شریک ہو گئے۔ کعب میدان جنگ میں گلے میں قرآن حمائل کئے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں مہار پکڑے کھڑا تھا کہ ایک نامعلوم سمت سے سنسناتا ہوا تیر آیا جس نے اُسے وہیں پر ٹھنڈا کر دیا۔

جب عرب کے مشہور شمشیر زن عمرو ابن یثربی نے مہار پکڑی تو امیر المومنین کے لشکر سے ہند ابن عمرو اس سے لڑنے کے لئے نکلے۔ عمرو نے مہار اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دی اور مقابلہ کے لئے سامنے آیا کچھ دیر تک دونوں زور آزمائی کرتے رہے۔ آخر ابن یثربی غالب آیا اور ہند اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ہند کے بعد علباء ابن ہیثم اور زید ابن صوحان اس کے مقابلہ کے لئے نکلے اور دونوں اس کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ عمار ابن یاسر نے یہ دیکھا تو ان کی رگوں میں خون شجاعت جوش مارنے لگا لیف خرما کی رسّی سے کمر کس کر باندھی ہتھیار سجے اور تلوار لے کر میدان کی طرف بڑھے۔ عمار نوے برس کے بوڑھے تھے اور حریف کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں نظر آ رہے تھے۔ لوگوں نے انہیں دیکھا تو کہا کہ ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو پہلے جانے والوں کا ہو چکا ہے۔ ابن یثربی نے انہیں جنگ کے ارادہ سے آتے دیکھا تو اُونٹ کی مہار عمرو ابن بجرہ کے سپرد کی اور تیزی سے ان کی طرف لپکا اور قریب پہنچ کر تلوار کا بھرپور ہاتھ چلایا۔ عمار نے تلوار ڈھال پر روکی ڈھال کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ تلوار اس کی کڑیوں میں گڑ گئی اس نے جھٹکا دے کر اسے نکالنا چاہا تو عمار نے جھک کر اس کی ٹانگوں پر تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور بے بس ہو گیا۔ لوگ اسے اٹھا کر امیر المومنین کے سامنے لائے حضرت نے تینوں شہیدوں کے قصاص میں اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ عمرو ابن بجرہ نے جب دیکھا کہ ابن یثربی مارا گیا ہے تو وہ مہار چھوڑ کر میدان میں نکل آیا ادھر سے ربیعہ عقیلی نکلے اور دونوں تلوار لے کر ایک دوسرے پر جھپٹے اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے مارے گئے۔

جب مہار دست بدست گردش کرتی ہوئی عوف ابن قطن ضبی کے ہاتھ میں آئی تو اس نے کہا کہ قتل عثمان کی ذمہ داری علی اور اُن کے بیٹوں پر عائد ہوتی ہے میں اس خون کا انتقام انہی سے لوں گا۔ چنانچہ یہ رجز پڑھا اور میدان میں نکل آیا۔

یا ام ام خلا منی الوطن　　　لا ابتغی القبر ولا ابغی الکفن

اے ماں! اے ماں! وطن مجھ سے چھوٹ گیا اب نہ مجھے قبر کی خواہش ہے نہ کفن کی تمنا۔"

من ھٰھنا یحشر عوف ابن قطن　　　ان فاتنا الیوم علی فالغبن

اسی مقام سے عوف ابن قطن کا حشر و نشر ہوگا۔ اگر آج علی ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے تو یہ سراسر نقصان ہے۔"

او فاتنا ابناہ حسین وحسن　　　اذن امت بطول هم وحزن

یا ان کے دونوں بیٹے حسن و حسین ہمارے ہاتھ سے بچ گئے تو میں اسی رنج و غم سے مر جاؤں گا۔"

اس رجز کے بعد حملہ آور ہوا اور کچھ دیر لڑتا رہا۔ آخر محمد ابن حنفیہ کی شمشیر شرر بار اس کے سر پر چمکی اور وہ علی و فرزندان علی کو قتل کرنے کی حسرت دل میں لئے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

ان مہار پکڑنے والوں میں عبداللہ ابن ابزی بھی تھا اس نے پہلے مہار پکڑی اور پھر یہ رجز پڑھتا ہوا حضرت کی صفوں پر حملہ آور ہوا:۔

اضربهم ولا اری ابا الحسن　　　ها ان هذا حزن من الحزن

میں ان پر تلوار چلاؤں گا اور ابوالحسن کو بھی نگاہ میں نہیں لاؤں گا۔ یہ جنگ ایک المناک حزنیہ ہے۔"

امیرالمومنین نے آگے بڑھ کر اس پر نیزہ مارا اور فرمایا تمہیں ابوالحسن کو دیکھنے کی خواہش تھی کہو انہیں کیسا پایا اور نیزہ اسی کے سینہ میں گڑا رہنے دیا۔

اصحاب جمل میں کا ایک نامور سردار خباب ابن عمرو راسبی یہ رجز پڑھتا ہوا مبارز طلب ہوا۔

اضربهم ولو اری علیا　　　عممته ابیض مشرفیا

میں ان پر تلوار چلاؤں گا اور اگر میں نے علی کو دیکھ لیا تو انہیں چمکتی ہوئی تیز دھار تلوار کی لپیٹ میں لے لوں گا۔"

مالک اشتر آگے بڑھے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کے بعد عتاب ابن اسید جو اشراف قریش میں سے تھا یہ رجز پڑھتا ہوا نکلا:۔

انا ابن عتاب وسیفی ولول　　　والموت عند الجمل المجلل

میں عتاب کا بیٹا ہوں میری تلوار کا نام ولول ہے اور میری موت اونٹ کے گرد و پیش ہے۔

مالک اشتر نے حملہ کر کے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور یوں اس کی موت تو اونٹ کے قدموں میں ہوئی مگر اس کی تلوار جس پر اسے ناز تھا کسی کام نہ آئی۔

بصرہ کے ایک شہسوار عمرو ابن اشرف عتیکی نے ایک ہاتھ میں مہار پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں تلوار اور جو اس کے قریب آتا اسے تلوار کی زد پر رکھ لیتا اور یہ رجزیہ اشعار پڑھتا۔

یا امّنا یا خیر ام نعلم　　　　والام تغذ و ولدھا و ترحم

اے ہماری ماں ہمارے علم میں آپ بہترین ماں ہیں۔ ماں اپنے بچوں کو غذا دیتی اور اُن پر ترس کھاتی ہے۔"

الا ترین کم شجاع یکلم　　　　و تختلی ھامتہ والمعصم!

کیا آپ دیکھتی نہیں ہیں کہ کتنے بہادر زخمی ہو رہے ہیں اور سر اور کلائیاں کٹ کٹ کر گر رہی ہیں۔"

حارث ابن زہیر ازدی اس کے مقابلہ کے لئے نکلے دونوں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ اور ایک دوسرے کی تلوار سے گھائل ہو کر گرے اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ختم ہو گئے۔ ابن اشرف کے ہمراہ اس کے گھر کے بھی تیرہ افراد کام آئے۔

عبداللہ ابن خلف خزاعی رئیس بصرہ جس کے ہاں ام المومنین وارد بصرہ ہونے کے بعد مقیم تھیں میدان میں اترا اور یہ رجز پڑھتے ہوئے حضرت علی سے مبارز طلب ہوا۔

یا ابا تراب ادن منی فترا　　　　فاننی دان الیک شبرا

وان فی صدری علیک غمرا

اے ابو تراب مجھ سے کچھ قریب ہو۔ تم جتنا قریب ہو گے میں اس سے زیادہ قریب ہوں گا۔ میرے سینہ میں تمہارے خلاف غم و غصہ بھرا ہوا ہے۔"

حضرت نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر تلوار ماری اور اسے دو پارہ کر دیا۔"

عبداللہ ابن حکیم جو قریش کے دستہ کا علمبردار تھا مقابلہ کے لئے نکلا ادھر سے عدی ابن حاتم اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے بڑھے اس نے عدی پر حملہ کیا اور نیزے سے ان کی ایک آنکھ پھوڑ دی اس صورت میں حریف کو زیر کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ مالک اشتر نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ بٹایا اور دونوں نے مل کر اسے قتل کر دیا۔

ام المومنین ہر مہار پکڑنے والے سے پوچھ لیتی تھیں کہ تم کون ہو۔ اس دوران عبداللہ ابن زبیر نے

مہار پکڑی تو معمول کے مطابق پوچھا کہ تم کون ہو اس نے کہا کہ میں آپ کا بھانجا عبداللہ ہوں۔ عبداللہ کا نام سنا تو تڑپ اٹھیں اور پراندوہ لہجہ میں کہا واثکل اسماء (ہائے اسماء کی کوکھ اجڑ گئی) عبداللہ مہار پکڑے ہوئے تھا کہ سامنے سے مالک اشتر گزرے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تاکا اور تلوار تولتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹے۔ مالک نے عبداللہ کے سر پر ضرب لگائی اور اسے شدید مجروح کر دیا اور خود بھی اس کے ہاتھ سے معمولی زخمی ہو گئے۔ دونوں زخم خوردہ آپس میں گتھ گئے اور مالک عبداللہ کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ عبداللہ نے جان بچتے نہ دیکھی تو چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا اقتلونی ومالکا واقتلوا مالکا معی۔ (مجھے اور مالک دونوں کو قتل کر ڈالو) لوگوں نے اس آواز پر توجہ نہ دی کیونکہ اکثر لوگ مالک کو اشتر ہی کے نام سے جانتے پہچانتے تھے اگر عبداللہ مالک کے بجائے اشتر کہتا تو لوگ یقیناً ان پر ٹوٹ پڑتے اور انہیں قتل کر دیتے۔ عبداللہ جوان اور تنومند تھا اور مالک بوڑھے تھے وہ زور کر کے ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عبداللہ نے بھاگ کر اپنی جان تو بچا لی مگر فرار کا دھبا ہمیشہ کے لئے اس کے دامن پر رہ گیا۔ اور لوگوں میں اس کا چرچا بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے عدی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری یہ آنکھ کب پھوٹی تھی عدی نے اس کے فرار کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا:-

یوم طعنتک فی استک وانت مول۔ (عقد الفرید۔ ج ۲۔ ص ۳۵۴)	جب ہم نے تمہارے سرین پر نیزہ مارا تھا اور تم پیٹھ پھرائے بھاگے جا رہے تھے۔

ام المومنین عبداللہ کی طرف سے انتہائی فکرمند تھیں۔ جب انہیں یہ خبر دی گئی کہ وہ بھاگ کر اپنی جان بچا لے گیا ہے۔ تو ام المومنین نے اطمینان کی سانس لی اور خبر لانے والے کو چار ہزار درہم انعام دیئے۔

اسود ابن البختری قرشی بھی مہار پکڑنے پر مارا گیا۔ جندب ابن زہیر غامدی اور عبدالرحمٰن ابن اسید مالک کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ جب سب سے آخر میں مہار زفر ابن حارث کے ہاتھوں میں آئی تو گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ صفوں پر صفیں ٹوٹ پڑیں اور ہر طرف خون کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ ام المومنین نے یہ خونی منظر دیکھا تو کچھ کنکریاں لے کر حضرت کے لشکر کی طرف پھینکیں اور کہا شاہت الوجوہ (یہ چہرے سیاہ ہوں)، یہ چربہ تھا اس معجزانہ عمل کا جو جنگ حنین میں رسول اللہ سے ظہور میں آیا تھا۔ مگر وہاں پیغمبر کا عمل کفار کے مقابلہ میں اور وحی الٰہی کے ماتحت تھا۔ اور یہاں مقابلہ میں حضرت علی اصحاب بدر مبایعین تحت الشجرہ اخیار صحابہ اور ممتاز تابعین تھے۔ اس عمل کا اثر کیا ہونا تھا۔ کسی نے اسے قابل

توجہ بھی نہ سمجھا بلکہ ایک بگڑے دل سپاہی نے یہ آیت ذرا سے تغیر کے ساتھ پڑھ دی:۔

ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱۔ ص۸۵) | جب تم نے کنکریاں پھینکیں تو تم نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں۔"

امیرالمومنین نے مالک اشتر کو میمنہ لشکر پر اور ہاشم ابن عتبہ کو میسرہ پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ یہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ تلواریں علم کئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس شدت سے حملہ کیا کہ میمنہ کے قدم اکھڑ گئے اور میسرہ اپنی جگہ سے ہٹ کر قلب لشکر سے مل گیا۔ سردار میمنہ ہلال ابن وکیع مالک اشتر کے ہاتھ سے قتل ہوا اور لشکر بھاگ کر حضرت عائشہ کے گرد پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ سپاہ امیرالمومنین نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا اور اونٹ کے گرد گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ بنی ازد بنی ناجیہ اور باہلہ اونٹ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اس کی حفاظت کر رہے تھے اور تیروں اور تلواروں کے وار سینہ پر روک رہے تھے۔ جنگ زوروں پر لڑی جا رہی تھی اور تیروں کی بوچھار اور تلواروں کی جھنکار سے میدان گونج رہا تھا۔ زمخشری نے کسی کا قول نقل کیا ہے کہ:۔

ما شبہت وقع السیوف علی الھام الا بضرب البیاذر علی المواجن۔ (فائق۔ ج ۱۔ ص۳۵) | سروں پر تلواروں کے پڑنے سے ایسی آوازیں آتی تھیں جیسے کپڑا دھونے کے پٹڑے پر چوب مارنے کی آواز ہوتی ہے۔"

امیرالمومنین نے دیکھا کہ جنگ ابھی فیصلہ کن مرحلہ میں داخل نہیں ہوئی اس لئے خود میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مہاجرین وانصار کے ایک دستہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ امام حسن اور امام حسین دائیں بائیں تھے اور محمد ابن حنفیہ علم لئے آگے آگے چل رہے تھے۔ آپ نے محمد ابن حنفیہ سے فرمایا کہ آگے بڑھو اور صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ کر دم لو جہاں عائشہ کا اونٹ کھڑا ہے۔ محمد علم لہراتے آگے بڑھے مگر دشمن کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی اور محمد کے قدم رک گئے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر اپنا بایاں ہاتھ محمد کے داہنے کندھے پر رکھا اور محمد کے ہاتھ سے علم لے لیا۔ بائیں ہاتھ سے علم سنبھالا اور دائیں ہاتھ میں ذوالفقار لی اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح حملہ کیا کہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور اس طرح تابڑ توڑ تلوار چلائی کہ اس میں خم آ گیا۔ جب دشمن کی صفوں کو درہم و برہم کر چکے تو اپنی صفوں کے قریب آئے تلوار کو گھٹنے پر رکھ کر سیدھا کیا اور دوبارہ حملہ کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد ابن حنفیہ عمار ابن یاسر عدی ابن حاتم اور امام حسن و امام حسین نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین آپ ٹھہرئیے۔ ہم میدان میں جاتے ہیں مگر آپ نے کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا اور نہ کسی کی بات کا

جواب دیا چہرہ غیظ وغضب سے تمتما رہا تھا آنکھ سے شرارے برس رہے تھے اور سینہ سے شیر کے غرانے کی سی آواز آرہی تھی۔ اب کس میں جرأت تھی کہ کچھ کہے اور زبان کھولے سب خاموش ہو گئے۔ آپ نے علم محمد کے سپرد کیا اور اکیلے دشمن کی صفوں پر بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ آور ہوئے اور صفوں کے اندر گھس کر اس طرح تلوار چلائی کہ صفیں الٹ گئیں میدان لاشوں سے پٹ گیا اور لڑتے لڑتے تلوار پھر ٹیڑھی ہو گئی۔ آپ اپنی صف کے قریب آئے اور گھوڑے سے نیچے اُتر کر تلوار سیدھی کی۔ جب آپ کے اعوان وانصار نے دیکھا کہ پھر میدان کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے آپ کو قسم دی کہ اپنی حالت پر رحم کھائیے آپ نہ لڑیں ہم لڑیں گے۔ اگر آپ پر آنچ آئی تو دین پر بن جائے گی اور اسلام کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ حضرت نے ان لوگوں کے کہنے سننے سے ہاتھ روک لیا اور پلٹ کر محمد ابن حنفیہ سے کہا، کہ دیکھو بیٹا اس طرح سے جنگ کی جاتی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین کس میں دم خم ہے جو آپ کی طرح لڑے اور کس کے بازوؤں میں کس بل ہے جو اس طرح تلوار چلائے۔

اس پر زور حملہ سے اصحاب جمل پر شکست کے آثار طاری ہو چکے تھے اگرچہ ان کے سروں پر تلواریں چل رہی تھیں۔ سینوں کے اندر خنجر اتر رہے تھے اور سر بازو اور کلائیاں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں مگر اس وقت تک میدان چھوڑنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ جب تک اونٹ ان کے درمیان کھڑا تھا اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اس کی جھول اور ام المومنین کے کجاوہ میں تیر اس طرح پیوست تھے جس طرح ساہی کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں اور وہ اس خونی ہنگامہ کی تاب نہ لا کر اس طرح گھوم رہا تھا جس طرح چکی گھومتی۔ حضرت نے دیکھا کہ جب تک اونٹ میدان میں کھڑا ہے جنگ ختم ہونے میں نہیں آئے گی ادھر بصرہ والے کسی کو اونٹ کے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے اور اس پر تلے ہوئے تھے کہ جان جائے مگر اونٹ کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ حضرت نے اسے میدان سے ہٹانے کا ارادہ کیا اور قبیلۂ نخع اور ہمدان کے جوانمردوں کو لے کر میدان کی طرف بڑھے۔ حضرت کو دیکھ کر فوجیں ہٹیں پرے ٹوٹے اور آپ اپنے ہمراہیوں سمیت اونٹ کے قریب پہنچ گئے اور اپنی فوج کے ایک سپاہی بجیر ابن دلجہ نخعی سے کہا کہ آگے بڑھ کر اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالو۔ بجیر نے آگے بڑھ کر اونٹ کے پیروں پر وار کیا۔ اونٹ نے ایک مہیب چیخ ماری اور پہلو کے بل زمین پر گرا۔ اونٹ کے گرتے ہی جنگ رک گئی اور ایک عام بھگدڑ مچ گئی کسی کو سر وپا کا ہوش نہ رہا۔ لاشوں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کو روندتے ہوئے جدھر منہ آیا ادھر بھاگ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان پر سناٹا چھا گیا۔ محمد ابن ابی بکر اور عمار یاسر نے حضرت کے حکم سے اونٹ کے تسمے کاٹے اور ہودج کو اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ محمد ابن ابی بکر نے ہودج کے اندر ہاتھ

ڈالا۔ ام المومنین نے بگڑ کر پوچھا کہ کون ہو کہا کہ آپ کا ناپسندیدہ بھائی کہا کیا خثعمیہ کے بیٹے ہو کہا ہاں۔ کہ آپ کو کوئی گزند تو نہیں پہنچا کہا کہ ایک تیر بازو کو چھوتا ہوا گذر گیا تھا اور کوئی خاص گزند نہیں پہنچا۔ اس کے بعد عمار ابن یاسر ہودج کے قریب آئے اور کہا کہ اے مادر گرامی آپ نے اپنے بیٹوں کی جنگ دیکھ لی اس پر ام المومنین نے بگڑ کر کہا :۔

لست لک بام۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۳۰) "میں تمہاری ماں نہیں ہوں"

عمار نے کہا کہ آپ ماں تو ہیں خواہ مانیں یا نہ مانیں۔

ام المومنین کا یہ انکار قرآن مجید کی رُو سے درست نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے کہ آپ بنص قرآن وازواجہ امہاتھم (پیغمبر کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں) ماں تھیں جس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں اور نہ انکار ہو سکتا ہے۔ اس انکار کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ جب عمار نے ان کے خلاف جنگ میں حصہ لیا ہے تو گویا انہوں نے مادری حقوق کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لہذا وہ بیٹے کہاں رہے اور آپ ماں کہاں رہیں۔ لیکن یہ حرب و پیکار ماں کے ماں اور بیٹے کے بیٹا ہونے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ بحیثیت حرم رسول ماں ہونا اور ہے اور ان کی اطاعت و ہمنوائی اور بات ہے۔ اگر کوئی ان کی ہمنوائی نہیں کرتا تو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بیٹا نہیں رہا اور آپ ماں نہیں رہیں۔ جہاں تک اطاعت و فرمانبرداری کا تعلق ہے وہ صرف حقیقی ماؤں تک محدود ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ازواج رسول اگر امت کی مائیں تھیں تو حقیقی ماؤں کی طرح ان کی اطاعت بھی واجب تھی اس طرح کہ ان کے حکم سے سرتابی معصیت قرار پائے۔ وہ مائیں ہیں تو اس لحاظ سے کہ پیغمبر کے گھر میں آنے کے بعد دوسرے کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتیں اور اسی طرح حرام تھیں جس طرح مائیں اولاد پر حرام ہوتی ہیں۔ چنانچہ حکم پردہ کے بعد جب کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم پیغمبر کے بعد ان کی بیویوں سے عقد کریں گے۔ تو ان کی تنبیہ و سرزنش کے لئے یہ آیت نازل ہوئی :۔

وما کان لھم ان تؤذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا۔ "تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم رسولِ خدا کو اذیت دو اور یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ تم ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو"

اس حرمت نکاح کے علاوہ وہ احکام جو حقیقی ماں ہونے کی حیثیت سے اولاد پہ اور اولاد ہونے کی حیثیت سے ماں پہ عائد ہوتے ہیں۔ یہاں ثابت نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ اولاد پر ماں کا نان ونفقہ واجب ہوتا ہے اور بیٹا ماں کا اور ماں بیٹے کی وارث ہوتی ہے اور ماں کا اولاد سے پردہ نہیں ہوتا مگر یہاں

نہ ان کا نفقہ امت پر واجب تھا اور نہ وہ اُمت کی اور نہ امت اُن کی وارث قرار پاتی ہے۔ اور نہ وہ حکم پردہ سے مستثنیٰ تھیں۔ اسی طرح حقیقی ماؤں کی طرح ان کی اطاعت و ہمنوائی بھی واجب نہ تھی۔ صرف حرمت عقد کے سلسلہ میں انہیں ماں کا درجہ دینے سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ان پر حقیقی ماؤں کے تمام احکام بھی مترتب ہوتے ہیں۔ آخر رضاعی ماں کو بھی ماں قرار دیا گیا ہے مگر وہ ماں ہونے کے باوجود نہ ورثہ پاتی ہے نہ واجب النفقہ ہوتی ہے اور نہ اولاد پر اس کی اطاعت ہی واجب ہے اسے صرف حرمت نکاح کے اعتبار سے ماں قرار دیا گیا ہے۔ اور پھر حقیقی ماں ہو یا رضاعی ماں یہود یہ بھی ہو سکتی ہے اور نصرانیہ بھی مگر ان امور میں جو خلاف شرع اسلام ہوں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ام المومنین کی اطاعت ماں ہونے کی حیثیت سے امت پر واجب تھی تو اس مورد پر جب کہ حقیقی ماں کی بھی اطاعت نہیں ہے ان کی اطاعت کیونکر ضروری ہو سکتی ہے کیونکہ ان کا یہ اقدام امام برحق کے خلاف جارحانہ حیثیت رکھتا تھا جو آئینِ اسلام کے خلاف اور کسی طرح جائز نہ تھا اور امر ناجائز میں اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

لا طاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف۔ (مشکوٰۃ۔ صہ ۳۱۹)

"اطاعت گناہ میں نہیں بلکہ صرف نیک کام میں ہوتی ہے۔"

شائد ام المومنین کو بھی اس کا احساس تھا کہ ان کا یہ اقدام جارحانہ اور سفر بصرہ سفر معصیت ہے چنانچہ ان کے اس طرز عمل کے بارے میں کہ وہ سفر میں نماز قصر نہیں کرتی تھیں۔ ایک تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ ان کا یہ عمل صرف سفر بصرہ کے دوران تھا اور وہ اس سفر کو سفر معصیت سمجھتے ہوئے نماز پوری پڑھتی تھیں کیونکہ قصر کا حکم سفر کے مباح ہونے کی صورت میں ہے۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی نے اس تاویل کے سلسلہ میں ایک قول یہ نقل کیا ہے:۔

انما اتمت فی سفرھا الی البصرۃ الی قتال علی والقصر عندھا انما یکون فی سفر طاعۃ۔ (فتح الباری۔ ج ۲ صہ ۴۰۶)

"حضرت عائشہ حضرت علی سے بقصد جنگ بصرہ جاتے ہوئے نماز پوری ادا کرتی تھیں اور ان کے نزدیک قصر کا حکم صرف سفر اطاعت کی صورت میں تھا۔"

بہر حال ام المومنین ابھی میدانِ جمل ہی میں تھیں کہ امیر المومنین ہودج کے قریب آئے۔ اور اسے لکڑی سے کھٹکھٹایا اور فرمایا اے حمیرا کیا رسولِ خدا نے آپ کو یہی حکم دیا تھا۔ کہا ملکت فاسجح (آپ غالب آئے ہیں تو حسنِ سلوک کیجئے) آپ نے محمد ابن ابی بکر کو حکم دیا کہ ہودج کے اوپر خیمہ نصب کر دو۔

اور اس کی نگرانی کرو تا کہ کوئی شخص اس کے قریب نہ آنے پائے اور جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو انہیں عبداللہ ابن خلف کی بیوہ صفیہ بنت حارث کے ہاں پہنچا دیا۔ اور اونٹ کے بارے میں حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے اور اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے۔ چنانچہ اسے جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی گئی۔ پھر فرمایا خدا لعنت کرے اس چوپائے پر یہ بنی اسرائیل کے گوسالہ سے کتنی مشابہت رکھتا تھا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:۔

وانظر الی الٰھك الذی ظلت	اپنے معبود کو تو دیکھو جس کی عبادت پر تم جمے ہوئے
علیہ عاکفا لنحرقنہ ثم لننسفنہ	تھے ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور پھر اُسے
فی الیم نسفا۔	پراگندہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔

خاتمہ جنگ پر حضرت نے اپنے لشکر میں اعلان فرمایا کہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرنا کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا لوگوں کے گھروں میں داخل نہ ہونا۔ جو ہتھیار اتار کر رکھ دے اور جو گھر کا دروازہ بند کر لے اس کے لئے امان ہے۔ فریق مخالف کے اموال سے کوئی تعرض نہ کرنا البتہ جو ہتھیار برتن اور سواریاں میدانِ جنگ میں تمہارے ہاتھ لگیں وہ تمہارا مال ہے اس کے علاوہ کسی چیز کو روا نہ سمجھنا۔ اور عورتوں اور کنیزوں پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ اس پر کچھ لوگ معترض ہوئے اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کا خون بہانا تو ہمارے لئے مباح ہو اور انہیں غلام و کنیز بنانا جائز نہ ہو۔ ہمیں مردوں اور بچوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز بنانے کی اجازت ہونا چاہیے۔ شاید یہ نظریہ اس بناء پر قائم کیا ہو کہ دورِ اول میں جب مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی گئی تو بقیۃ السیف کو غلام و کنیز بنا لیا گیا تھا۔ لہذا یہاں فریقِ ثانی کو غلام و کنیز بنانے میں کیا امر مانع ہے۔ مگر حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ میں نے وہی فیصلہ کیا ہے جو رسولؐ اللہ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا تھا اگر تم بضد ہو تو بتاؤ کہ تم میں کون ہے جو اپنی ماں عائشہ کو اپنے حصہ میں لینا چاہتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کہنے والوں پر سناٹا چھا گیا اور سب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کہنے لگے کہ یا امیرالمؤمنین آپ نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہی صحیح ہے ہم ہی لوگوں نے غلط نظریہ قائم کیا تھا اور ناروا مطالبہ پیش کیا تھا۔

حضرت تین دن تک میدانِ جمل میں تشریف فرما رہے اور مقتولین کو دفن کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے اور سیدھے مسجد جامع میں تشریف لے گئے اور نماز سے فارغ ہو کر مصلّے کی دائیں جانب دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور اہل بصرہ کو ان کی بے راہروی و کج ذہنی پر سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:۔

کنتم جند المرأۃ واتباع	تم ایک عورت کی سپاہ اور ایک چوپائے کے
البھیمۃ رغا فاجبتم دعقر	تابع تھے وہ بلبلایا تو تم لبیک کہتے ہوئے بڑھے

فهریتم اخلاقلکم دقاق عهدکم شقاق ودینکم نفاق وماءکم زعاق والمقیم بین اظهرکم مرتهن بذنبه والشاخص عنکم متدارك برحمة۔

(نہج البلاغہ)

اور وہ زخمی ہوا تو تم بھاگ کھڑے ہوئے تم پست اخلاق و عہد شکن ہو تمہارے دین کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ تمہاری سرزمین کا پانی تک شور ہے تم میں اقامت کرنے والا گناہوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے اور تم میں سے نکل جانے والا اپنے پروردگار کی رحمت کو پا لینے والا ہے۔"

خطبہ سے فارغ ہو کر اہل بصرہ سے بیعت لی اور انہیں فتنہ و شر انگیزی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے باہر نکلے اور ابوالاسود دئلی وغیرہ کے ہمراہ بیت المال میں تشریف لائے اور سرسری نگاہوں سے بیت المال کا جائزہ لیا اور حکم دیا کہ یہ تمام رقم شرکاء جنگ میں تقسیم کر دی جائے اور ہر سپاہی کو پانچ پانچ سو درہم دیئے جائیں۔ جب وہ رقم تقسیم کی گئی تو نہ ایک درہم گھٹا اور نہ ایک درہم بڑھا اور سب پر برابر تقسیم ہو گئی۔ حبۃ العرنی کہتے ہیں کہ امیر المومنین نے بھی اپنا حصہ دوسروں کے برابر لیا اور جب لے چکے تو ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ یا امیر المومنین میں جنگ میں شریک تو نہ ہو سکا مگر میرا دل آپ کے ساتھ تھا اور میری ہمدردیاں آپ سے وابستہ تھیں مجھے بھی اس مال میں سے حصہ ملنا چاہیئے۔ حضرت نے اپنے حصہ کے پانچ سو درہم اسے دے دیئے اور خالی ہاتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

حضرت عائشہ ابھی تک بصرہ میں مقیم تھیں۔ حضرت نے ابن عباس کو ان کے ہاں بھیجا کہ انہیں کہیں کہ وہ مدینہ واپس جانے کی تیاری کریں اب نہ یہاں ان کا کوئی کام ہے اور نہ ان کا مدینہ سے زیادہ عرصہ تک باہر رہنا مناسب ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں حضرت کا پیغام لے کر ان کے ہاں گیا اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ مگر انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے مجبوراً اجازت لئے بغیر اندر داخل ہونا پڑا اور ایک بوریا اٹھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ ام المومنین نے پردہ کے پیچھے سے دیکھا تو کہا کہ اے ابن عباس تم نے آداب شریعت کا کوئی لحاظ نہیں کیا تم بغیر اجازت کے میرے مکان میں داخل ہوئے اور بغیر اجازت کے اس بوریئے پر بیٹھ گئے۔ ابن عباس نے کہا کہ ہم بہتر سمجھتے ہیں آداب شریعت کو اور آپ نے آداب و احکام شریعت سیکھے ہیں تو ہم سے۔ یہ آپ کا گھر تو ہے نہیں کہ ہمیں آپ سے اجازت لینے کی ضرورت ہو آپ کا گھر وہ ہے جہاں رسول اللہ آپ کو چھوڑ گئے تھے۔ جب آپ اس گھر میں ہوں گی تو ہم آپ کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں گے۔ مجھے یہاں بہرصورت آنا تھا تاکہ امیر المومنین کا یہ فرمان آپ کے گوش گزار کروں کہ آپ یہاں سے جلد مدینہ روانہ ہو جائیں۔ کہا کہ

امیرالمومنین تو عمر ابن خطاب تھے کہا ہوں گے مگر میری مراد امیرالمومنین سے علی ابن ابی طالب ہیں کہا میں تو انہیں امیرالمومنین نہیں مانتی کہا کہ آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور آپ نے کب سے یہ منصب سنبھالا ہے کہ آپ امیرالمومنین مانیں تو وہ امیرالمومنین ہیں ورنہ نہیں ہیں اس پر ام المومنین رونے لگیں اور کہا کہ میں خود اس شہر کو چھوڑ کر جلد جانا چاہتی ہوں۔

فان ابغض البلد ان الی بلد انتم فیہ۔ (عقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۱۰۰)

اس لئے کہ وہ شہر مجھے انتہائی ناپسند ہے جس میں تم لوگوں کی بود و باش ہو۔"

ابن عباس نے کہا کہ یہ حق شناسی کی انتہا ہے۔ کیا یہ اس کا صلہ ہے کہ ہم نے آپ کو ام المومنین بنایا اور آپ کے والد بزرگوار صدیق کہلائے۔ کہا کیا تم رسول اللہ کے ذریعہ ہم پر تفوق و احسان جتلانا چاہتے ہو۔ کہا کہ آپ پیغمبر کی نو بیویوں میں سے ایک بیوی ہی تو ہیں مگر اتنی سی بات پر آپ کا ہر حکم مانا جاتا ہے اور آپ کی آواز پر لبیک کہی جاتی ہے اور ہم تو رسول کا گوشت و پوست ہیں اور انہی کا خون ہماری رگوں میں گردش کر رہا ہے اگر یہ چیز آپ کو حاصل ہوتی تو کیا آپ ہم پر تفوق و برتری نہ جتائیں۔ اس پر ام المومنین خاموش ہو گئیں اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔ ابن عباس نے پلٹ کر یہ تمام گفتگو حضرت کے سامنے دہرائی۔ آپ سن کر خوش ہوئے اور یہ آیت پڑھی:۔

ذریۃ بعضھا من بعض واللہ سمیع علیم۔

برگزیدہ کیا اللہ نے بعض کی اولاد کو بعض سے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

ام المومنین نے جب واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو امیرالمومنین نے سواری زاد راہ اور دوسری سہولتیں اُن کے لئے مہیا کر دیں اور محمد ابن ابی بکر کو ان کے ہمراہ جانے کا حکم دیا اور انہیں بحفاظت تمام مدینہ روانہ کر دیا۔ یہ واپسی یکم رجب ۳۶ھ روز شنبہ کو ہوئی۔

امیرالمومنین نے اس جنگ میں اوّل تا آخر جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ آپ کی امن پسندی صلح جوئی اور بلند نفسی کی زندہ مثال ہے۔ اگرچہ آپ کو خونی فتنہ کے انسداد کے لئے خونریز جنگ لڑنا پڑی مگر آپ نے اس وقت تک نہ خود ہاتھ اٹھایا اور نہ کسی کو اٹھانے دیا جب تک دوسرے فریق نے تیرباراں کر کے جنگ شروع نہ کر دی۔ حالانکہ ان لوگوں نے حضرت کے وارد بصرہ ہونے سے پہلے آپ کے سینکڑوں دوستوں اور ہمنواؤں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ والی بصرہ عثمان ابن حنیف پر شب خون مار کر عہد شکنی کی تھی۔ بیت المال اور بیت الرزق پر قبضہ کر لیا تھا اور قتل و غارت گری سے ہر طرف دہشت پھیلا دی تھی۔ ان چیزوں سے اگرچہ جنگ کا جواز پیدا ہو چکا تھا مگر آپ نے یہی کوشش کی کہ جنگ و قتال کی نوبت نہ آئے

اور افہام اور تفہیم سے معاملہ طے ہو جائے۔ چنانچہ طلحہ زبیر اور ام المومنین کو سمجھایا بجھایا اور انہیں جنگ کے ہولناک انجام سے ڈرایا اور مسلم مجاشعی کے ہاتھ قرآن بھیج کر انہیں قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی اور جب یہ تمام چیزیں بے اثر اور تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور آپ کی صلح جویانہ روش کو کمزوری پر محمول کیا جانے لگا اور پیغام صلح کا جواب تیر وسنان کی زبان میں دیا جانے لگا تو آپ نے مجبور ہو کر جنگ کی اجازت دی۔ اور جب جنگ چھڑ ہی گئی تو صفوں کے مقابلہ میں صفیں جما کر اس طرح لڑے کہ ان پر ثابت کر دیا کہ جنگ سے بچنے کی یہ تمام کوششیں کمزوری و بزدلی اور خوف و ہراس کی بنا پر نہ تھیں بلکہ اتحاد و یکجہتی کے برقرار رکھنے اور صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے تھیں۔

امیرالمومنین نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو جن چیزوں پر کاربند رہنے کا حکم دیا تھا کہ جنگ میں پہل نہ کریں کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کریں اور چند ایک چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔ سب نے ایک ایک بات پر عمل کیا۔ چنانچہ جب تک تیروں کی بوچھار سے لاشیں گری نہیں جنگ کے لئے قدم نہیں بڑھایا اور جب میدان میں خون برسنے لگا تو کسی زخمی پر ہاتھ نہیں ڈالا اور جب فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی تو کسی کا تعاقب نہیں کیا اور نہ اس کے چھوڑے مال و اسباب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ دنیوری نے تحریر کیا ہے :۔

جعلوا یمرون بالذھب و الفضۃ فی معسکرھم والمتاع فلا یعرض لہ احد الا ما کان من السلاح الذی قاتلوا بہ والدواب التی حاربوا علیھا۔	وہ میدانِ جنگ میں سونا چاندی اور دوسرا ساز و سامان دیکھتے مگر کوئی ان چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا سوائے فریق مخالف کے ان ہتھیاروں اور سواریوں کے جنہیں وہ لڑائی کے موقع پر کام میں لائے تھے۔

(اخبارالطوال۔ ص۱۵۱)

دنیا کی جنگوں کا دستور ہے کہ فاتح کامرانی و فتح یابی کے نشہ میں سرشار ہو کر حریف فوج کے افسروں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیتا ہے یا موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے مگر حضرت نے انتقامی جذبات سے بلند تر ہو کر اہل بصرہ میں سے جنہوں نے جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا کوئی باز پرس نہیں کی عبداللہ ابن زبیر، مروان ابن حکم، ولید ابن عقبہ، عبداللہ ابن عامر ایسے غارت گرانِ امن کو بیک جنبش قلم معاف کر دیا اور ام المومنین کو جنہوں نے آپ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ ان کے شایانِ شان حفاظتی انتظامات کے ساتھ مدینہ بھجوا دیا اور مسلمانوں سے جہاد اور کفار سے جہاد کے لطیف فرق کو اس طرح واضح

کیا کہ جو لوگ مال غنیمت میں عورتوں کو شامل کرنا چاہتے تھے انہیں بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی جواب نہ بن پڑا اور بصرہ کے بیت المال کو مرکز میں منتقل کرنے کے بجائے فوج و سپاہ پر تقسیم کر دیا۔ جس سے ایک طرف یہ تاثر دیا کہ جنگ کا مقصد مال کی جمع آوری اور دولت کی فراہمی نہیں ہے اور دوسری طرف سپاہ کو مالی لحاظ سے مطمئن کر کے پیش آئند جنگوں میں ان کے جوش و ولولہ کو نفسیاتی طور پر مضمحل ہونے سے محفوظ کر دیا۔

ام المومنین جو عامۂ مسلمین کے نزدیک ایک عالمہ اور محدثہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس سے بے خبر نہ تھیں کہ خون عثمان کے قصاص کا انہیں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ یہ حکومت وقت کا حق ہے یا اولیاء مقتول کا۔ اور حضرت عائشہ نہ مسلمانوں کے اقتدار کی مالک تھیں اور نہ حضرت عثمان کے وارثان بازگشت میں شامل تھیں۔ اس کے باوجود وہ قصاص کے نام پر حکومت وقت سے ٹکرانے کے لئے میدان میں اُتر آتی ہیں اور ایک عظیم جمعیت کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیتی ہیں۔ حالانکہ ازواج رسول اپنے گھروں میں ٹھہرے رہنے کی پابند تھیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ۔ — اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھی رہو اور سابقہ زمانہ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر نہ نکلو"

اس حکم قرآنی کے پیشِ نظر ام المومنین زینب بنت جحش اور ام المومنین جناب سودہ نے مدینہ سے باہر نکلنا گوارا نہیں کیا اور زندگی بھر اس حکم کی سختی سے پابند رہیں یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے جناب سودہ سے کہا کہ آپ حج و عمرہ کے لئے مکہ کیوں نہیں جاتیں کہا کہ فریضۂ حج سے سبکدوش ہو چکی ہوں۔ اب تو مجھے اسی گھر میں رہنا ہو گا جس گھر میں مجھے رسول اللہ بٹھا گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبر کے بعد حجرہ سے قدم باہر نہیں نکالا اور یہ عورتوں کا منصب بھی نہیں ہے کہ وہ گھر کا گوشہ چھوڑ کر میدان حرب و ضرب میں پھاند پڑیں اور کشت و خون کا بازار گرم کریں۔ چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ:۔

استاذنت النبی فی الجھاد فقال جھادکن الحج۔ — میں نے پیغمبر اکرم سے جہاد کی اجازت چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ تم عورتوں کا جہاد فریضۂ حج کی ادائیگی ہے"

(صحیح بخاری۔ ج ا ص۱۱)

اور خود ام المومنین کا قول ہے:۔

المغزل بید المرأۃ احسن من الرمح بید المجاھد فی — عورت کے ہاتھ میں تکلا اس نیزے سے کہیں بہتر ہے جو راہ خدا میں لڑنے والے مجاہد کے ہاتھ

سبیل اللہ۔ (عقدالفرید۔ ج ۲ ص۷)   میں ہوتا ہے۔"

مگر ان تمام چیزوں پر مطلع ہونے کے باوجود وہ ہزاروں کے مجمع کے ساتھ مکہ سے بصرہ میں آئیں اور لشکر کی قیادت کرتے ہوئے میدان میں اُتریں حالانکہ وہ دیکھ رہی تھیں کہ اس اقدام کے نتیجہ میں ہزاروں بچے یتیم رہ جائیں گے۔ ہزاروں عورتیں اپنا سہاگ کھو بیٹھیں گی اور مسلمانوں کا خون مسلمانوں کی تلواروں سے پانی کی طرح بہے گا مگر انہوں نے نتائج و عواقب کی پرواکئے بغیر یہ قدم اٹھایا اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی تلواروں کے سامنے لاکھڑا کیا۔ بلاشبہ اس اتلاف جان کی زیادہ تر ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے اور ان کے دور میں بھی یہی تاثر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ام ادفی العبدیہ نے جن کے قبیلہ کے سینکڑوں آدمی امیرالمومنین کی حمایت میں مارے گئے تھے۔ حضرت عائشہ سے پوچھا کہ اے ام المومنین آپ اس عورت کے بارے میں کیا فرماتی ہیں جس نے اپنے ایک کمسن بچے کو مار ڈالا ہو کہا وہ دوزخ میں جائے گی۔ کہا پھر اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے اپنے بیس ہزار جوان سال بیٹے ایک ہی جگہ پر قتل کر دیئے ہوں۔ ام المومنین اس کے طنزیہ اشارہ پر بگڑ گئیں اور کہا:۔

خذوا بید عدوة اللہ۔   "اس خدا کی دشمن کو جانے نہ دینا۔"

(عقدالفرید۔ ج ۳ ص۱۰)

ابوعثمان جاحظ نے ایک لطیف پیرایہ میں یہ مطلب یوں ادا کیا ہے:۔

کانھا فی فعلھا ھرۃ   تریدان تاکل اولادھا

"وہ اپنی اس کارگزاری میں اس گربۂ مسکین کے مانند تھیں جو اپنے بچوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہے۔"

بہرحال یہ اقدام کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہ تھا اور ان کے خاندان کے افراد تو اسے باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر ام المومنین نے اپنے بھتیجے ابن ابی عتیق سے کسی ضرورت کے لئے خچر طلب کیا اس نے ام المومنین کا پیغام سنا تو قاصد سے کہا کہ ام المومنین سے کہنا:۔

واللہ ما دحضنا عاد یوم الجمل   خدا کی قسم ابھی تک تو ہم یوم جمل کا دھبا نہیں
افتریدین ان تاتینا بیوم   دھو سکے کیا اب یوم بغل (خچر) قائم کرنے کا ارادہ
البخلة۔ (انساب الاشراف۔ ج ۱ ص۴۲۱)   ہے۔"

ابن ابی عتیق نے تو طنزاً یہ بات کہی تھی مگر یوم جمل کے بعد یوم بغل بھی دنیا والوں نے دیکھ لیا۔ چنانچہ جب امام حسنؑ کی نعش مبارک کو حجرۂ رسول میں دفن کے ارادہ سے لایا گیا اور مروان ابن حکم اور ان

کے ہمراہی ہتھیار باندھ کر دفن سے مانع ہوئے تو اس موقع پر حضرت عائشہ بھی اس گروہ کے ساتھ تھیں چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی نے تحریر کیا ہے :۔

قال ابوالفرج فامایحیی ابن الحسن صاحب کتاب النسب فانہ روی ان عائشۃ رکبت ذلک الیوم بغلا واستنفرت بنی امیۃ مروان ابن الحکم ومن کان ھناک منھم ومن حشمھم وھو قول القائل :۔
"فیوما علی بغل ویوما علی جمل"

ابوالفرج کہتے ہیں کہ یحییٰ ابن حسن صاحب کتاب النسب روایت کرتے ہیں کہ اس دن حضرت عائشہ خچر پر سوار ہوئیں اور مروان ابن حکم اور بنی امیہ اور ان کے اہالی موالی کو جو وہاں موجود تھے ابھار رہی تھیں اور اسی کے متعلق کسی نے کہا ہے "
" گاہے اشتر پر سوار اور گاہے خچر پر سوار "

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۴ ص۱۵)

اس سلسلہ میں طلحہ و زبیر کا کردار بھی ام المومنین کے کردار سے کچھ کم نہیں ہے۔ انہوں نے قصاص عثمان کے نام پر بصرہ میں پہنچ کر قتل عام شروع کر دیا اور بے دیکھے بھالے کہ کون مجرم ہے سب کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا۔ حالانکہ انہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اہل بصرہ کو قصاصاً قتل کریں۔ جب کہ اسے وارثان مقتول کا حق اور خلیفۂ وقت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے اور وہ نہ خلیفۂ وقت تھے اور نہ حضرت عثمان کے قرابت دار ہی تھے کہ انہیں بربنائے قرابت حق قصاص پہنچتا۔ اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بیعت شکنی کو جائز اور اس جارحانہ اقدام کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے حضرت کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے بے خبر نہ تھے، کہ قتل عثمان کے سلسلہ میں ان کا طرز عمل کیا تھا اور حضرت کا موقف کیا تھا۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے :۔

واللہ ان طلحۃ والزبیر وعائشۃ لیعلمون انی علی الحق وانھم مبطلون۔ (استیعاب۔ ج ۲ ص۲۱۴)

خدا کی قسم طلحہ زبیر اور عائشہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں حق پر ہوں اور وہ باطل پر ہیں "

اگر وہ واقعاً حضرت کو قتل عثمان میں شریک سمجھتے تھے تو بیعت سے پہلے یہ آواز اٹھاتے مگر نہ قتل عثمان کے موقع پر اور نہ اس سانحۂ قتل اور حضرت کی بیعت کے درمیانی عرصہ میں آپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور نہ آپ پر قتل یا اعانت قتل کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ محمد ابن سیرین کہتے ہیں :۔

ماعلمت ان علیاً اتهم فی دم عثمان حتی بویع فلما بویع اتہمہ الناس۔

(عقد الفرید۔ ج ۳ ص ۹۳)

مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے حضرت علی پر قتل عثمان کی تہمت لگائی ہو یہاں تک کہ اُن کی بیعت ہوئی اور جب بیعت ہو چکی تو لوگوں نے انہیں متہم کرنا شروع کر دیا۔"

ان متہم کرنے والوں کے سرغنہ یہی دونوں طلحہ و زبیر تھے اور ان کی زبانیں بھی اس وقت کھلتی ہیں جب ان کے مفادات پر ضرب لگتی ہے اور امیر المومنین انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت دینے سے انکار کر دیتے ہیں اگر اس قصاص طلبی میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ کار فرما تھا تو ان کی ہمدردیوں کو قتل کے موقع پر ظاہر ہونا چاہیئے تھا اور حضرت کی بیعت کے بجائے ان سے قصاص کا مطالبہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر وہ اس وقت تک خاموش رہتے ہیں جب تک انہیں امارت کی توقع رہتی ہے اور جب ادھر سے مایوسی ہو جاتی ہے تو آپ پر خون کا الزام عائد کر کے قصاص کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ اس قصاص کی آڑ میں اپنے اقتدار کی راہ ہموار کریں۔ واقعات کی روشنی میں یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس شورش و ہنگامہ آرائی کا مقصد صرف حصول اقتدار تھا۔ چنانچہ انہوں نے بیعت توڑ کر دوسروں کو بیعت شکنی پر اُبھارا اور حکیم ابن جبلہ سے واشگاف لفظوں میں کہا گیا کہ جب تک عثمان ابن حنیف حضرت کی بیعت نہیں توڑیں گے انہیں رہا نہیں کیا جائے گا اور خود حضرت کے سامنے بھی اس کا اظہار کیا کہ وہ انہیں خلافت کا اہل نہیں سمجھتے۔ اور سعید ابن عاص کے دریافت کرنے پر صاف صاف کہہ دیا کہ ہم عثمان کے لڑکوں کو خلیفہ نہیں بنائیں گے بلکہ ہم دونوں میں سے جسے لوگ منتخب کریں گے وہی خلیفہ ہو گا۔ اسی اقتدار کی خاطر انہوں نے حضرت عثمان کے قتل کا سر و سامان کیا اور ان کے قتل کے بعد جب امیر المومنین بر سر اقتدار آئے تو قصاص کی آڑ میں ام المومنین کی عملی تائید کے سہارے مقابلہ پر اُتر آئے۔

غرض ام المومنین ہوں یا طلحہ و زبیر ان کے اس اقدام کا نہ کوئی اخلاقی جواز ہے اور نہ شرعی۔ انکی شخصیتیں کتنی ہی اہم سہی مگر جرم بہر حال جرم ہوتا ہے خواہ وہ اس کا مرتکب کوئی ہو بلکہ شخصیت کی نمود جرم کو اور سنگین بنا دیا کرتی ہے۔ انہوں نے ایک ایسا خونریز اقدام کیا جس سے نہ انکار کی کوئی گنجائش ہے۔ اور نہ کشت و خون کی ذمہ داری سے انہیں بری ثابت کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک طبقہ نے صحابیت کے تحفظ کے لئے مختلف حیلے بہانوں سے اس جرم کی سنگینی کو ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے جواز کے لئے خطائے اجتہادی کا سہارا ڈھونڈھ نکالا ہے۔ یہ خطائے اجتہادی کی کار فرمائی صرف اسی مورد کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام حربہ ہے کہ جہاں کوئی جواب بن نہیں پڑتا وہاں اس کی آڑ لے لی جاتی ہے اور

غلط سے غلط اقدام کے لئے جواز کا پہلو پیدا کر لیا جاتا ہے تاکہ وابستگانِ دامن کی عقیدتوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔ اسے لاکھ خطائے اجتہادی سے تعبیر کیا جائے۔ مگر اربابِ فکر و نظر کو یہ ذہنی خلش ضرور محسوس ہوگی کہ اگر یہ خطائے اجتہادی ہے تو خطائے منکر اور خطائے غیر اجتہادی کس چیز کا نام ہے۔ اگر اس عظیم کشت و خون کو خطائے اجتہادی کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے تو اس خطائے اجتہادی کے مرتکبین پر نقد و تبصرہ کیوں جائز نہیں ہے اور اگر ان کے خلاف رائے قائم کی جائے تو اسے خطائے اجتہادی پر محمول کر کے نظر انداز کرنے میں کیا مانع ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ اجتہاد کون سے شرعی اصول و قواعد کے ماتحت تھا اور کن دلائل سے ایک خون کے بدلے میں ہزارہا بے گناہوں کا خون بہانا جائز ہوگیا تھا۔ کیا قرآن مجید کا کوئی حکم تھا یا پیغمبر اکرم کی کوئی حدیث تھی یا اہل حل و عقد کا اجماع تھا یا کسی مناط شرعی پر مبنی قیاس تھا اور یہی چاروں چیزیں مدعیان خطائے اجتہادی کے نزدیک اجتہاد کا ماخذ سمجھی جاتی ہیں اور جب ان میں سے کوئی چیز ثابت نہیں کی جاسکتی تو اجتہاد ہی کہاں رہا کہ اسے خطا پر محمول کر کے ان کے موقف کی صفائی پیش کی جاسکے۔

اس سلسلہ میں کچھ لوگوں نے یہ بات بنائی کہ امیر المومنین کے لشکر میں سے ان لوگوں کو جو قتلِ عثمان میں پیش پیش تھے فریقین میں صلح کے آثار نظر آئے تو انہوں نے صلح کو اپنے مقصد و مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے ابن سبا کی انگیخت پر منہ اندھیرے ام المومنین کے لشکر پر دھاوا بول دیا اور اصحاب جمل کا ردِ عمل دھار کر حضرت کے لشکر پر حملہ آور ہوئے اور ہر فریق اپنے مقام پر یہ سمجھا کہ دوسرے فریق نے جنگ کا آغاز کر دیا ہے اور اس طرح فریقین میں غلط فہمی کی بنا پر جنگ چھڑ گئی لہٰذا جنگ میں پہل کرنے کی ذمہ داری فریقین میں سے کسی فریق پر عائد نہیں ہوتی اگر کسی پر عائد ہوتی ہے تو اس سازشی گروہ پر جس کا سرغنہ ابن سبا تھا اور جو دونوں فریق کو جنگ میں الجھا کر اپنا تحفظ اور مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ واقعہ ایک خود ساختہ افسانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور روایت و درایت دونوں اعتبار سے مقدوح اور ناقابل اعتماد ہے۔ اس واقعہ کو پہلے پہل ابن جریر طبری نے اپنی مشہور تاریخ میں درج کیا اور طبری سے قبل نہ کسی مورخ نے اسے بیان کیا اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ البتہ بعد کے مؤرخین نے طبری کے حوالہ سے اس روایت کو خوب خوب اچھالا ہے۔ اور ام المومنین اور طلحہ و زبیر کی تمام سرگرمیوں سے چشم پوشی کر کے اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری اسی مجہول شخصیت ابن سبا اور اس کے ساتھیوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ طبری نے اسے سیف ابن عمر تمیمی متوفی ۱۷۰ھ کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ اور سیف ابن عمر تمام علمائے رجال کے نزدیک مفتری و کذاب اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ چنانچہ ذہبی

نے میزان الاعتدال میں تحریر کیا ہے کہ یحییٰ کہتے ہیں فلس خیر منه (ایک کوڑی بھی اس سے بہتر ہے) ابوداؤد کہتے ہیں لیس بشیء (کوئی چیز ہی نہیں) ابو حاتم کہتے ہیں متروك (ناقابلِ روایت ہے) ابن حبان کہتے ہیں اتهم بالزندقه (بے دینی و الحاد سے متہم ہے) اور کسی ایک فرد نے بھی اس کی توثیق نہیں کی اور نہ اسے قابل روایت سمجھا ہے۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کی روایت پر جو بالاتفاق ساقط عن الاعتبار ہو اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس روایت میں اگر کچھ بھی واقعیت ہوتی تو طبری سے پہلے کا کوئی مورخ اس کا ذکر کرتا۔ بلاذری صاحب انساب الاشراف ابن سعد صاحب طبقات اور طبری کے معاصر ابن اعثم صاحب تاریخ اس کا تذکرہ کرتے اور سیف ابن عمر کے سلسلہ کے علاوہ کسی اور واسطہ سے بھی اسے نقل کیا جاتا۔ بلکہ واقعہ کی نوعیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کا عمومی چرچا ہوتا اور مختلف طبقوں میں عام طور پر اس کا ذکر آتا۔ مگر اس کا ذکر آتا ہے تو اس شخص کے سلسلۂ روایت میں جس کی کذب بیانی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ کیا ایسی روایت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لینا حقائق سے عمداً چشم پوشی کے مترادف نہیں ہے؟

اب اس روایت کو درایۃً دیکھئے اور پرکھئے کہ کہاں تک صحیح تسلیم کئے جانے کے قابل ہے۔ جس شخص کے بھی سامنے واقعات جمل کے اسباب و علل اور اصحاب جمل کے عزائم و مقاصد ہیں وہ اس سے انکار نہ کر سکے گا کہ یہ روایت واقعات میں ایک غیر متعلقہ اضافہ اور حقائق کے دامن میں ایک بے جوڑ پیوند ہے۔ جس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اس جنگ کو غلط فہمی کا نتیجہ قرار دے کر اصحاب جمل کو معذور اور حق بجانب ثابت کیا جائے۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا گیا کہ یہ جنگ غلط فہمی کا نتیجہ تھی مگر تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ باقاعدہ جنگ کے چھڑنے سے پہلے حضرت علی اور فریق ثانی کے نمائندوں میں گفت و شنید اور انہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا اور حضرت نے طلحہ و زبیر سے رُو در رُو گفتگو کی اور انہیں جنگی عزائم سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ کیا وہ اس موقع پر یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو صلح پر آمادہ تھے آپ ہی کے لشکر نے ہم پر اچانک حملہ کیا اور جنگ چھیڑ دی مگر وہ اس کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کرتے حالانکہ اس موقع پر زبان بند رکھنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ یا جنگ سے پہلے جب حضرت نے مسلم مجاشعی کو قرآن دے کر بھیجا تھا کہ وہ انہیں قرآن کے تعلیمات یاد دلائیں تو انہیں یہ کہنا چاہئے تھا کہ اب علی نے قرآن کو بیچ میں لا کر معاملہ کو نمٹانا چاہا ہے اور مصالحت کی پیش کش کی ہے حالانکہ انہی کے لشکر نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شبخون مارا ہے اور جنگ و قتال کا آغاز کیا ہے۔ مگر اس موقع پر بھی ان کی زبان سے اس قسم کی کوئی بات نہیں نکلتی۔ اسی طرح ام المومنین اس کی طرف کبھی تو اشارہ کرتیں کہ ایسا غلط

فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔ حالانکہ جنگ کے بعد جب ان سے اس اقدام کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ خاموشی کے بجائے اس چیز کو اپنے موقف کے حق بجانب ہونے کے ثبوت میں پیش کر کے پوچھنے والوں کو ایک حد تک مطمئن کر سکتی تھیں۔ اور پھر اس مفروضہ شبخون سے پہلے جو کشت و خون کیا گیا تھا اور سینکڑوں آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا وہ کس غلط فہمی کی بنا پر اور کس کی انگیخت پر ہوا تھا تو جو لوگ یوں بے گناہوں کو قتل و غارت کر سکتے ہیں۔ انہیں جنگ لڑنے میں کیا باک تھا کہ یہ کہا جائے کہ فریقین غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

اس سلسلہ میں جس مجہول شخصیت ابن سبا کو شبخون کا محرک قرار دیا جاتا ہے وہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جورج جرداق اور دوسرے محققین کے نزدیک کوئی تاریخی وجود ہی نہیں رکھتا ورنہ جس شخصیت کا نام قتلِ عثمان اور جنگِ جمل میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس کا نام صفین تحکیم اور جنگِ نہروان کے موقع پر بھی سنائی دیتا اور ان موقعوں پر اس کا کوئی کارنامہ نہ بھی ہوتا جب بھی اس کا نام تو کہیں نہ کہیں آتا۔ مگر جنگ جمل کے بعد وہ صفحاتِ تاریخ سے اس طرح ناپید ہو جاتا ہے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ شبخون مارنے کے بعد کہاں غائب ہوا اور کہاں مر کھپ گیا حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانوی شخصیت ہنگامہ آراؤں کی خونچکاں حرکتوں کا جواز پیدا کرنے کے لئے وقتی طور پر گھڑی گئی اور جب اس کی ضرورت نہ رہی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دی گئی۔

جنگ جمل وسط جمادی الثانیہ ۳۶ھ (نومبر ۶۵۶ء) میں واقع ہوئی۔ مقتولین کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ ام المومنین کے تیس ہزار کے لشکر میں سے پانچ ہزار یا ایک ہزار ستر شہید ہوئے اور یہ معارکہ ایک گروہ کی شکست اور دوسرے گروہ کی فتح پر ختم ہو گیا۔ اگرچہ یہ جنگ ایک وقتی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے دلوں میں گرہ پڑ گئی۔ امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور مسلمانوں میں پیہم خونریزیوں کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ جنگ جمل کے بعد شام سے جنگ کے شعلے بھڑکے اور مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے سروں پر بے دریغ چلیں۔ اگر ام المومنین اور طلحہ و زبیر میدانِ جنگ میں نہ اترتے تو معاویہ کو حضرت علی کے مقابلہ میں کبھی فوج کشی کی جرأت نہ ہوتی۔ مگر ان لوگوں کے صف آرا ہونے سے نہ صرف ان کی ہمت بندھی بلکہ انہیں اتنا موقع مل گیا کہ وہ جنگ کے لئے لشکر کی فراہمی اور سامان حرب و ضرب کی تکمیل کر سکیں اور حضرت سے برسر پیکار ہونے کا جواز تو انہیں جنگ جمل سے مل ہی چکا تھا اس طرح کہ اگر ام المومنین قبیلہ بنی تیم سے ہوتے ہوئے انتقام خونِ عثمان کے لئے کھڑی ہو سکتی ہیں تو وہ کیوں کھڑے نہیں ہو سکتے جب کہ وہ حضرت عثمان کے ہم قبیلہ اور عزیز بھی تھے۔ یہ ایک ایسا مضبوط سیاسی حیلہ تھا جسے معاویہ نے جنگ کے جواز میں پیش کیا اور طلحہ و زبیر ایسی اہم شخصیتوں

کے اقدام سے اپنے باغیانہ اقدام کے حق بجانب ہونے پر ثبوت مہیا کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے قصاص عثمان ہی کے نام پر لوگوں کو بھڑکا کر جنگ صفین برپا کی اور پہلے اپنے علاقائی اقتدار کا تحفظ کیا اور پھر خلافت پر قابض ہو کر خلیفۃ المسلمین بن گئے۔ پھر اس جنگ صفین کے نتیجہ میں خوارج کی جماعت ابھری۔ جس نے امیرالمومنین سے جنگ لڑنے کے بعد مدتوں تک اسلامی شہروں میں کشت و خون اور تاخت و تاراج کا بازار گرم رکھا اور ایسے ایسے خونی کھیل کھیلے کہ ریگستانِ عرب کے ذرات تک خون میں ڈوب گئے۔ غرض جنگ جمل سے جنگ صفین نے اور جنگ صفین سے جنگ نہروان نے جنم لیا اور ان جنگوں کے نتیجہ میں اسلام میں ایسے رخنے پڑے جو آج تک پُر نہ ہو سکے اور نہ آئندہ ان کے پُر ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

پایۂ تخت کی تبدیلی

عہد ثانی میں جب حدود ایران پر فوج کشی کے نتیجہ میں ایرانی علاقے اسلامی مقبوضات میں داخل ہوئے تو مسلمانوں نے اپنی بود و باش کے لئے عراق میں دو نئے شہروں کی بنیاد ڈالی ایک بصرہ اور دوسرا کوفہ۔ بصرہ سمندر کے ساحل پر واقع ہے اور یہ نام بس راہ کی معرب صورت ہے جو راستوں کی کثرت کی بنا پر تجویز ہوا یا اس لئے کہ بصرہ کے معنی نرم و سفید پتھر کے ہیں اور یہاں اس قسم کے پتھروں کی بہتات تھی۔ اور کوفہ حیرہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے جہاں ۱۷ھ میں سعد ابن ابی وقاص نے مدائن سے نقل مکانی کر کے گھانس پھونس اور سینٹھوں کے چھپر ڈال کر ایک لاکھ آدمی آباد کئے تھے اس عظیم اجتماع کی بنا پر اس کا نام کوفہ یا کوفان قرار پایا۔ کیونکہ کوفہ تکوف سے ماخوذ ہے جس کے معنی اجتماع کے ہیں یا اس وجہ سے کہ وہاں کی زمین ریتیلی تھی جس میں سنگریزے بکھرے پڑے تھے۔ اور کوفہ یا کوفان اس سرزمین کو کہتے ہیں۔ جس میں ریت مٹی کے علاوہ پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوں۔ کوفہ دریائے فرات کے قریب معتدل آب و ہوا باغات و نخلستان اور شادابی و زرعی پیداوار کی وجہ سے ریگستان حجاز کے باشندوں کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا۔ انہوں نے آتشزدگی کے ایک حادثہ کے بعد اینٹ پتھر کے پختہ مکانات تعمیر کر کے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی اور جب امیرالمومنین کے دورِ خلافت میں اسلامی ریاست کا دارالحکومت قرار پایا تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور علماء و رجال اسلام کے جمع ہو جانے سے علمی دینی اور سیاسی اعتبار سے عالم اسلام کا مرکز بن گیا۔

جنگ جمل میں اہل بصرہ نے اصحاب جمل کا اور اہل کوفہ نے حضرت کا ساتھ دیا تھا۔ آپ نے خاتمہ

جنگ پر عبداللہ ابن عباس کو بصرہ کا حاکم اور زیاد کو خراج و بیت المال کا ناظم مقرر کر کے اہل کوفہ کی دلجوئی کے لئے کوفہ کا قصد فرمایا۔ جب بصرہ کے حدود سے نکل کر مربد میں جہاں حضرت عائشہ کے لشکر نے وارد بصرہ ہونے کے بعد پڑاؤ ڈالا تھا آئے تو بصرہ کی طرف رُخ کر کے فرمایا:۔

الحمد للہ الذی اخرجنی من شر البقاع و اسرعھا خرابا و اقربھا من الماء و ابعدھا من السماء (اخبار الطوال صـ۱۵۲)	تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے اس بدترین کرۂ زمین سے باہر کیا جو تیزی سے تباہی کی طرف بڑھنے والا (سمندر کے) پانی سے قریب اور آسمان (کی برکتوں) سے دُور ہے۔"

جب ۱۲ رجب ۳۶ھ کو کوفہ کے حدود میں داخل ہوئے تو وہاں کے اعیان و اشراف جنہیں فتح و کامیابی کی اطلاع پہنچ چکی تھی استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل آئے اور حضرت کے ہمرکاب شہر میں داخل ہوئے اور عرض کیا کہ آپ دارالامارہ میں قیام فرمائیں مگر حضرت نے دارالامارہ میں قیام پسند نہ کیا اور سیدھے مسجد میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد خطبہ دیا اور اہل کوفہ کی ہمدردی و تعاون پر تحسین آمیز کلمات کہے پھر محلہ رحبہ میں تشریف لائے اور ایک متوسط درجہ کے مکان میں قیام فرما ہوئے اور وقتی طور پر مدینہ کے بجائے کوفہ کو دارالحکومت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

یہ تبدیلی حسب ذیل وجوہ کی بناء پر عمل میں لائی گئی:۔

(۱) کوفہ اسلامی مملکت کے وسط میں واقع تھا جہاں سے چاروں طرف کے علاقوں کی نگرانی ہو سکتی تھی فارس کی سرحد قریب تھی۔ بری و بحری سفر کی سہولتیں حاصل تھیں۔ رسل و رسائل اور آمد و رفت میں ہر طرح سے آسانی تھی مختلف شہروں کے باشندوں کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے مختلف مقامات کے حالات بآسانی معلوم ہو سکتے تھے اور مرکزی حکومت کے احکام بسہولت دوسری جگہوں پر پہنچائے اور دشمن کے حملہ آور ہونے کی صورت میں دفاعی اقدامات عمل میں لائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ جب شامی فوجوں نے آپ کے مقبوضہ علاقوں پر یلغار شروع کی تو بیشتر کوفہ سے اس کا تدارک ہوتا رہا۔ مدینہ میں رہتے ہوئے اس سے بہتر طریق پر ممکن نہ تھا۔

(۲) امیرالمومنین کو مسند خلافت پر بیٹھے اگرچہ سات ماہ ہو چکے تھے مگر معاویہ نے ابھی تک نہ آپ کی خلافت کو تسلیم کیا تھا اور نہ بیعت پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اس صورت میں ان کی ریشہ دوانیوں اور رخنہ اندازیوں سے مطمئن نہ رہا جا سکتا تھا بلکہ یہ خطرہ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے منصب کی بحالی کے لئے جنگی اقدامات اور کشت و خون سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایک ایسی جگہ کا انتخاب ضروری تھا جہاں

سے فوجی نقل و حرکت میں آسانی ہو اور بر وقت مدافعانہ قدم اٹھایا جاسکے۔ اس اعتبار سے کوفہ موزوں تر مقام تھا کیونکہ کوفہ معاویہ کے پایۂ تخت دمشق سے قریب تھا اور فوجوں کی نقل و حرکت میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اس کے برعکس مدینہ دمشق سے کافی فاصلہ پر واقع تھا۔ جہاں سے نہ فوجوں کی نقل و حرکت آسان تھی اور نہ بر وقت رسد اور فوجی امداد مہیا ہو سکتی تھی۔

(۳) جنگ جمل سے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ جتنی عسکری امداد کوفہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اتنی کمک کی توقع مدینہ سے نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ والیٔ کوفہ ابو موسیٰ کی انتہائی مخالفت کے باوجود کوفہ کی بڑی اکثریت نے حضرت کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اور آپ کے پیغام پر بارہ ہزار شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور مدینہ سے بمشکل ایک ہزار افراد نے جنگ میں حصہ لیا ہو گا۔ اس صورت میں دُور اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ کوفہ کو مستقر قرار دیا جائے تاکہ بر وقت اہل کوفہ سے دشمن کے مقابلہ میں مدد حاصل کی جا سکے۔

(۴) کوفہ ایک چھاؤنی اور فوجی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جہاں جنگجو لوگ آباد کئے گئے تھے۔ اور ان کی اولاد بھی طبعاً جنگ و قتال کی طرف مائل اور فوجی خو بو رکھتی تھی۔ اور مدینہ کے اکثر لوگ دولت کی فراوانی کے نتیجہ میں آرام طلب و عافیت کوش ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب حضرت نے کوفہ کو دارالسلطنت قرار دیا تو اس کے خلاف اہل مدینہ نے کوئی آواز بلند نہیں کی بلکہ اس پر احتجاج کرنے کے بجائے ایک گونہ سکون محسوس کیا کہ اب وہ گھر کا پُر امن ماحول چھوڑ کر میدانِ جنگ کی کڑیاں جھیلنے کے لئے مجبور نہیں کئے جائیں گے۔ ان حالات میں جب کہ جنگ کے امکانات قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر کے جو حرب و ضرب کے عادی اور معرکہ آرائی کے خوگر ہوں عافیت پسند لوگوں پر سہارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۵) امیرالمومنین دیکھ چکے تھے کہ پیغمبر اکرم کی رحلت کے بعد گنے چنے افراد کے علاوہ اہل مدینہ نے آپ کے حق کی فوقیت کا اعتراف تو درکنار ایک طرح سے بیگانگی و سرد مہری کا برتاؤ کیا تھا اور پچیس سال کے طویل عرصہ کے بعد جب حالات سدھرتے نظر نہ آئے تو آپ کو خلافت کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور بیعت کر لی مگر زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ان میں کا ایک گروہ بیعت توڑ کر جنگ و قتال پر اُتر آیا اور جو لوگ بیعت پر قائم رہتے ہوئے اس گروہ میں شامل نہ ہوئے انہوں نے بھی بے حسی اور جذبات کی کمزوری ہی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ قریش تعاون میں سرگرم عمل نظر نہیں آتے بنی امیہ کے اکثر افراد معاویہ کے پاس شام چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بنی تیم طلحہ کو برسر اقتدار لانے کے خواہش مند تھے بنی عدی عبداللہ ابن عمر کے ہوا خواہ تھے جس نے حضرت کی بیعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح مختلف اشخاص مختلف وجوہ

کی بنا پر تعاون سے گریز کرتے رہے۔ اس ماحول میں کیونکر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ آڑے وقت پر کام آئیں گے اور معاویہ سے جنگ چھڑنے کی صورت میں تعاون کریں گے۔

(۶) مدینہ اپنی حرمت و تقدیس کی وجہ سے اس حد تک خطرات میں گھرا ہوا نہ تھا جس حد تک عراق خطرات سے دوچار تھا۔ معاویہ کی نظریں عراق پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی فکر میں تھے لہٰذا اس وقت تک عراق میں ٹھہرنا اور اسے مرکز قرار دے کر وہاں قیام کرنا ضروری تھا۔ جب تک پیش آمدہ خطرات ٹل نہ جاتے اور مملکت کی فضا پرسکون نہ ہو جاتی۔ مگر نہ وہ خطرات ٹل سکے اور نہ شامیوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ ختم ہوا۔ ہر روز نت نئے فتنے اٹھتے رہے اور ان فتنوں کو فرو کرنے کے لئے آپ کو زندگی کے بقیہ ایام کوفہ ہی میں گزارنے پڑے۔

عمال مملکت کا تقرر

جب امیرالمومنین جنگ جمل سے فارغ ہو کر کوفہ میں فروکش ہوئے تو ملکی انضباط کے لئے عمال کے تقرر کی ضرورت محسوس کی اگرچہ جنگ جمل سے پہلے چند ایک علاقوں پر عمال مقرر کئے جا چکے تھے مگر بیشتر مقامات پر جنگی مصروفیات کی بنا پر عمال کے متعین کئے جانے کی نوبت نہ آئی تھی چنانچہ حضرت نے اپنی قلمرو مملکت میں جس میں حجاز، مصر، عراق، یمن، ایران، آذربائیجان وغیرہ شامل تھے اپنی صوابدید سے ولاۃ و حکام متعین فرمائے اور ان میں پیش آئند حالات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ردوبدل ہوتا رہا اور ایسا ہونا رعایا و مملکت کے حالات پر نظر رکھنے کا نتیجہ ہے۔ ان عمال میں سے چند نمایاں شخصیات کے مختصر سوانح حیات درج کئے جاتے ہیں ان سوانح کے ذیل میں ان جگہوں کا بھی تذکرہ ہو جائے گا جہاں جہاں وہ مقرر کئے گئے۔

قیس ابن سعد:۔ پیغمبر اکرم کے بلند مرتبہ صحابی اور رئیس خزرج سعد ابن عبادہ کے فرزند تھے۔ علم و عمل کی بلندیوں پر فائز ہونے کے ساتھ قد آور، وجیہہ صورت، چوڑے چکلے اور بڑے کلے جبڑے کے آدمی تھے۔ سخاوت و شجاعت اور خطابت ان کا خاص جوہر تھا اور دور اندیشی و معاملہ فہمی میں یکتائے روزگار تھے۔ اس دور میں پانچ آدمی سیاسی جوڑ توڑ میں ماہر اور چالاکی و ہوشیاری میں طاق سمجھے جاتے تھے۔ معاویہ ابن ابوسفیان، عمرو ابن عاص، مغیرہ ابن شعبہ، عبداللہ ابن بدیل اور قیس ابن سعد ان میں سے عبداللہ ابن بدیل اور قیس ابن سعد امیرالمومنین کے طرفدار تھے۔ قیس اگرچہ سیاسی حربوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتے تھے مگر دینی تقاضوں کو نظر انداز کر کے مکر و فریب کی سیاست اختیار نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول ہے:۔

لولا الاسلام لمکرات مکرا لا تطیقه العرب۔(اصابہ ج ۳ ۔ص۲۳۹)	اگر اسلام مانع نہ ہوتا تو میں ایسی چال چلتا جس کا توڑ عرب کے بس کی بات نہ ہوتا۔"

دس برس تک پیغمبر اکرم کی خدمت میں رہے۔ انہی سے اسلام کے حقائق و معارف سیکھے۔ عہد نبوی کے تمام غزوات میں شریک ہو کر کارنمایاں انجام دیئے۔ بعض غزوات میں حامل لوائے پیغمبر رہے اور صدقات کی وصولی پر بھی مامور کئے گئے۔ جود و سخا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جیش عسرہ میں قرض کا بار اٹھا کر اور اپنی سواری کے اونٹوں کو ذبح کر کے لشکر کے کھانے پینے کا انتظام کرتے رہے۔ جب لشکر نے پلٹ کر پیغمبر اکرم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:۔

الجود من شیمه اهل ذالك البیت ۔ (اصابہ ۔ج ۳ ۔ص۲۳۹)	سخاوت اس خانوادے کی عادت ہے۔"

ابن کثیر نے البدایۃ والنہایہ میں تحریر کیا ہے کہ ہیثم ابن عدی نے بیان کیا کہ خانہ کعبہ کے پاس تین آدمی آپس میں باتیں کرتے ہوئے اُلجھ پڑے۔ ان میں سے ایک کہتا تھا کہ سب سے بڑھ کر سخی عبداللہ ابن جعفر ہیں۔ دوسرا کہتا تھا کہ قیس ابن سعد ہیں اور تیسرا کہتا تھا کہ عرابۃ الاوسی ہیں۔ جب اس اختلاف نے نزاعی صورت اختیار کر لی تو ایک شخص نے کہا کہ تم لوگ کیوں جھگڑتے ہو ابھی اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ تم میں سے جو جس کی برتری کا قائل ہے اس کے پاس جائے اور سائل کا روپ دھار کر اس سے سوال کرے پھر خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ سخاوت میں کس کا پایہ بلند تر ہے۔ یہ رائے پسند کی گئی اور ان میں سے ایک عبداللہ ابن جعفر کے ہاں گیا دیکھا کہ وہ سوار ہو کر اپنی جاگیر کی طرف جانے والے ہیں اور رکاب میں پیر رکھ چکے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا اے ابن عم رسول میں مسافر ہوں میرے پاس زاد ہے نہ سواری۔ یہ سننا تھا، کہ عبداللہ نے رکاب سے پیر نکالا اور نیچے اتر آئے اور کہا کہ تم اس پر سوار ہو جاؤ اور جو مال اس پر بار ہے وہ تمہارا ہے اور دیکھنا اس سامان میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کی تلواروں میں سے ایک تلوار بھی ہے اسے حفاظت سے رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ضائع ہو جائے۔ جب اس نے سامان کا جائزہ لیا تو اس میں چار ہزار دینار ریشمی چادریں اور متفرق اشیاء تھیں۔

دوسرا آدمی قیس ابن سعد کے مکان پر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں۔ گھر میں سے ایک کنیز نے پوچھ لیا کہ تم کس غرض سے آئے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو کہا میں ایک بے سر و سامان مسافر ہوں اور اُن سے کچھ مدد کا طالب ہوں۔ کنیز نے کہا کہ اس معمولی سے کام کے لئے انہیں جگایا نہیں جا سکتا۔ گھر میں سات سو دینار موجود ہیں وہ لے لو اور اُن کے اصطبل میں چلے جاؤ اور وہاں سے ایک اونٹنی اور

ایک غلام بھی لیتے جاؤ۔ قیس جب سو کر اُٹھے تو کنیز نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ سائل آپ کے در سے خالی ہاتھ جائے۔ قیس نے کہا کہ تم نے مجھے جگا کیوں نہ دیا۔ شاید تم نے جو اسے دیا ہے وہ اس کی ضرورت واحتیاج سے کم ہو پھر اس کنیز کی فراخ حوصلگی سے متاثر ہو کر اسے آزاد کر دیا۔

تیسرا آدمی عرابہ کے ہاں گیا۔ دیکھا کہ وہ دو غلاموں کا سہارا لے کر نماز کے لئے جا رہے ہیں اس وقت ان کی بصارت جاتی رہی تھی اور سہارے کے بغیر کہیں آ جا نہ سکتے تھے۔ اس نے قریب پہنچ کر کہا اے عرابہ میں مسافر اور بے زاد ہوں میری مدد کیجیئے۔ یہ سننا تھا کہ عرابہ نے دونوں غلاموں کے کندھوں پر سے ہاتھ اٹھایا اور ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کہا افسوس ادائے حقوق نے عرابہ کے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ تم یہ دونوں غلام لے لو۔ اس نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا سہارا چھین لوں اور تمہیں ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دوں۔ عرابہ نے کہا کہ اگر تم نہیں لوگے تو میں انہیں آزاد کر دوں گا۔ اب لے لو یا انہیں آزاد کر دو۔ اس نے وُہ دونو غلام لے لئے اور عرابہ دیوار کا سہارا لے کر مسجد کی طرف چل دیئے۔

جب یہ تینوں پلٹ کر آئے اور لوگوں نے ان کی روداد سنی تو کہا کہ اگرچہ عبداللہ ابن جعفر نے سب سے زیادہ دیا ہے مگر ان کی شخصیت اور مالی حیثیت کو دیکھتے ہوئے کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ حضرت علی کی تلوار کو اپنے سے الگ کر دینا قابلِ ذکر ضرور ہے۔ کچھ لوگوں نے قیس کو زیادہ سراہا کہ ان کی کنیز نے ان سے پوچھے بغیر جتنی رقم گھر میں موجود تھی سب دے دی۔ اور انہوں نے کنیز کے رویہ سے خوش ہو کر اُسے آزاد کر دیا۔ آخر میں عرابہ پر سب نے اتفاق کیا کہ عرب میں وہ سب سے زیادہ سخی ہے۔ انہوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا سب دے دیا اور معذور و نابینا ہونے کے باوجود غلاموں کا سہارا باقی رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

ایک مرتبہ قیس بیمار پڑے تو مزاج پرسی کے لئے بہت کم لوگ آئے وجہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا، کہ چونکہ اکثر لوگ آپ کے مقروض ہیں۔ اس لئے وہ آتے ہوئے جھجکتے ہیں کہا خدا اس مال کو رُسوا کرے۔ جو دوستوں کے آنے سے مانع ہو۔ پھر حکم دیا کہ مدینہ میں اعلان کر دیا جائے کہ جس جس کے ذمہ ہمارا قرضہ ہے وہ ہبہ کر دیا گیا ہے اور دستاویزیں چاک کر دی گئی ہیں۔ اس اعلان کے ہوتے ہی لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور اس کثرت سے لوگ آئے کہ دروازہ کی چوکھٹ ٹوٹ گئی۔

ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ کثیر ابن صلت نے قیس سے تیس ہزار درہم کسی ضرورت کے لئے قرض لئے۔ جب وہ قرضہ واپس کرنے کے لئے آیا تو قیس نے رقم واپس لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہیں اشتباہ ہوا ہے یہ رقم قرضہ نہ تھی بلکہ عطیہ ہے۔

جب امیرالمومنین برسر اقتدار آئے تو ماہ صفر ۳۶ھ میں قیس کو ان کی خاندانی وجاہت ذاتی جوہر اور سیاسی سُوجھ بُوجھ کی بنا پر مصر کی امارت کے لئے منتخب کیا اور انہیں بلا کر کہا کہ تم ایک فوج ترتیب دے کر اپنے ساتھ لے جاؤ وہاں کی رعایا سے حسن سلوک سے پیش آنا لوگوں سے نرم رویہ رکھنا اس لئے کہ نرمی و میانہ روی یمن و برکت کا باعث ہوتی ہے۔ البتہ جہاں نرمی سے کام بنتا نظر نہ آئے وہاں سختی برتنا بے جا نہ ہوگا۔ قیس نے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے فوج و سپاہ کی احتیاج نہیں ہے فوج کا مرکز میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ مجھے صرف چند آدمی ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے سات آدمی منتخب کر کے اپنے ہمراہ لے لئے اور مصر کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب مصر میں وارد ہوئے تو تقرری کے سلسلہ میں امیرالمومنین کا فرمان پڑھ کر سنایا اور منبر پر خطبہ دیتے ہوئے کہا:۔

الحمد للہ الذی جاء بالحق	تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے حق کو
و امات الباطل وکبت الظالمین	ظاہر کیا باطل کو کچلا اور ظالموں کو ذلیل و رسوا کیا
ایھا الناس انا قد بایعنا خیر	اے لوگو ہم نے اس ہستی کی بیعت کی ہے۔ جو
من نعلم بعد نبینا فقوموا	ہمارے نبی کے بعد ان تمام لوگوں سے بہتر ہے
ایھا الناس فبایعوہ علی کتاب	جنہیں ہم جانتے ہیں۔ اے لوگو اٹھو اور کتاب و
اللہ و سنۃ رسولہ فان نحن	سنت کی شرط پر اس کی بیعت کرو اگر ہم تمہارے
لم نعمل لکم بذلک فلا بیعۃ	معاملات میں کتاب و سنت پر عمل نہ کریں تو پھر
لنا علیکم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ صفحہ ۵۵۱)	تم پر اس بیعت کی کوئی پابندی نہ ہوگی۔"

پھر لوگوں سے بیعت لی اور اس بیعت میں کسی نے پس و پیش نہیں کیا سوا قصبہ خربتا کے باشندوں کے جو دس ہزار کی تعداد میں تھے اور سب کے سب عثمانی تھے انہوں نے بیعت سے انکار کیا اور یزید ابن حارث کنانی کے ذریعہ قیس کو پیغام بھجوایا کہ ہم کسی معاملہ میں آپ سے تعرض نہیں کریں گے یہ سرزمین آپ کی سرزمین ہے ہم باقاعدہ خراج ادا کرتے رہیں گے مگر جب تک حالات یکسو نہیں ہو جاتے ہم سے بیعت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ قیس نے انہیں کہلوا بھیجا کہ میں تمہیں بیعت پر مجبور نہیں کرتا البتہ تمہیں شور و شر اور فتنہ انگیزی کی اجازت نہیں دی جائے گی، اہل خربتا نے پُرامن رہنے کا یقین دلایا اور قیس نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا مگر مسلمہ ابن مخلد جو قیس ہی کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اس نے لوگوں کو خون عثمان کے انتقام پر اُبھار کر فتنہ و شر پھیلانا چاہا قیس نے اسے پیغام بھجوایا کہ تم نے میرے خلاف محاذ قائم کر کے ہنگامہ آرائی کی کوشش کی ہے میں اس فتنہ کو ختم کر سکتا ہوں لیکن مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میں تمہارا خون بہاؤں خواہ مجھے

مصر سے شام تک کی حکومت دے دی جائے۔ اس نے قیس کے اس نرم رویہ سے متاثر ہو کر انہیں کہلو بھیجا کہ جب تک آپ والیٔ مصر ہیں میں حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کروں گا۔ قیس کی اس سیاست و حکمت عملی سے ابھرتا ہوا فتنہ دب گیا۔ اور جتنا عرصہ مصر کی زمام حکومت ان کے ہاتھوں میں رہی حالات پر سکون رہے مگر اموی سیاست نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ یکم ربیع الاول ۳۶ھ سے ۵ رجب ۳۶ھ تک چار ماہ پانچ دن امارت مصر پر فائز رہنے کے بعد انہیں امارت سے الگ ہونا پڑا۔ اس برطرفی کے وجوہ و اسباب کا تذکرہ بعد کے صفحات پر ہوگا۔

قیس نے اس مختصر سے دور میں ایک قصر مصر میں تعمیر کروایا۔ جب برطرفی کے بعد پلٹ کر واپس آئے تو کچھ لوگوں کو کہتے سنا کہ قیس کا ایک مکان مصر میں ہے پوچھا کہ کیسا مکان اور کس کا مکان لوگوں نے کہا کہ وہی جو آپ نے مصر میں تعمیر کیا ہے۔ کہا کہ میں نے وہ مکان مسلمانوں سے مدد لے کر تعمیر کیا تھا وہ مسلمانوں ہی کی ملکیت ہے اور جو بھی مصر کا حاکم ہوگا وہ اسی میں ٹھہرا کرے گا۔

۵۹ھ یا ۶۰ھ میں جب کہ حکومت معاویہ کا دور آخر تھا مدینہ میں وفات پائی۔

سہل ابن حنیف انصاری :- انصار کے قبیلہ اوس کی ایک ممتاز فرد والی بصرہ عثمان ابن حنیف کے بھائی پیغمبر اکرم کی صحبت سے شرف یاب اور امیر المومنین کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ بدر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے اور احد میں جب کہ اکثر لوگوں کے قدم اکھڑ گئے تھے ان کے ثبات قدم میں لغزش نہیں آئی نہ پتھروں کی آڑ ڈھونڈی اور نہ راہ فرار اختیار کی بلکہ پیغمبر کے ہاتھ پر موت کا عہد و پیمان باندھ کر لڑے۔

ابن ہشام نے تحریر کیا ہے کہ ہجرت کے بعد جب حضرت علی قبا میں آکر ٹھہرے تو آپ نے نصف شب کے بعد ایک شخص کو دیکھا جو ایک مسلمان عورت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور جب وہ باہر نکلتی ہے تو چپکے سے ایک چیز اس کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ اُسے لے کر اندر چلی جاتی ہے۔ حضرت کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کیونکہ وہ اکیلی اور بے شوہر کے تھی۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ آدھی رات کے بعد کون ہے جو تمہارے گھر آتا ہے کہا وہ سہل ابن حنیف ہیں انہیں یہ معلوم ہے کہ میں ایک بے سہارا عورت ہوں جس کا کوئی کفیل و پرسان حال نہیں ہے۔ جب رات اندھیری ہوتی ہے تو وہ ادر گرد کے بُت خانوں پر چھاپا مارتے ہیں اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر مجھے دے جاتے ہیں تاکہ میں انہیں ایندھن کے طور پر کام میں لاؤں۔ امیر المومنین سہل کے اس عمل سے بہت خوش ہوئے اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے جذبۂ ہمدردی و غمخواری کی تعریف کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

جب امیرالمومنین اصحاب جمل کی یورش کو دبانے کے لئے بصرہ روانہ ہوئے تو انہیں اپنی قائم مقامی میں مدینہ کا حاکم مقرر کیا اور جنگ سے فارغ ہو کر جب سپاہ شام کے مقابلہ کے لئے صفین کی طرف راہ سپاہ ہوئے تو انہیں اپنے ساتھ لے لیا۔ صفین سے واپسی پر فارس کا عامل مقرر کیا۔ اہل فارس معاویہ کی بغاوت سے متاثر ہو کر سرکشی و خود سری پر اُتر آئے اور خراج سے بچنے کے لئے سہل کو فارس سے باہر نکال دیا۔ حضرت نے جاریہ ابن قدامہ کے مشورہ سے زیاد ابن عبید کو وہاں بھیجا جس نے چالاکی و ہوشیاری سے کام لے کر انہیں آپس میں لڑوا دیا اور اس طرح ان کی طاقت کو کمزور کر کے اُن پر قابو پا لیا۔

۳۸ھ میں سہل نے کوفہ میں انتقال کیا۔ امیرالمومنین نے اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا اور نماز جنازہ پڑھائی۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

اخبرنا ابو جناب الکلبی قال سمعت عمیر ابن سعید صلی علی علا سہل ابن حنیف فکبر علیہ خمساً۔ (طبقات۔ ج ۳ ص ۴۷۳)	ابو جناب کلبی کہتے ہیں کہ میں نے عمیر ابن سعید سے سنا کہ حضرت علی نے سہل ابن حنیف کی نماز جنازہ پڑھائی اور پانچ تکبیریں کہیں۔"

حضرت نے سہل کے جنازہ پر متعدد مرتبہ نماز پڑھائی۔ جب ایک نماز سے فارغ ہوتے تو اور لوگ آ جاتے اور کہتے کہ یا امیرالمومنین ہم نماز جنازہ میں شرکت سے محروم رہ گئے۔ حضرت ان کے شرف و امتیاز کی بنا پر پھر نماز پڑھاتے یہاں تک کہ قبر تک پہنچتے پہنچتے پانچ مرتبہ نماز پڑھائی اور ہر نماز میں پانچ تکبیریں کہیں۔ امیرالمومنین نے ان کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

کان من احب الناس الی لو احبنی جبل لتہافت۔ (تنقیح المقال)	سہل مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب تھے۔ اگر پہاڑ بھی مجھے محبوب رکھے گا تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔"

مالک ابن حارث اشتر، مالک نام اور اشتر لقب تھا۔ شجاعان عالم میں ممتاز اور شمشیر زنی و نبرد آزمائی میں شہرہ آفاق تھے۔ جمل و صفین میں عظیم کارنامے انجام دیئے اور اپنے حریفوں تک سے اپنی تیغ زنی کا لوہا منوایا۔ امیرالمومنین کے مخلص و معتمد اور بلند مرتبہ اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ اور حضرت سے اس درجہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مالک کا میری نظروں میں وہی مرتبہ و مقام ہے جو رسول اللہ کے نزدیک میرا مرتبہ و مقام تھا اور اپنے مقام و منزلت کے بارے میں فرمایا:۔

کانت لی منزلۃ من رسول اللہ مالم تکن لاحد من الخلائق (مسند احمد ابن حنبل ج ۱ ص ۸۵)	رسول اللہ کے نزدیک میرا وہ مقام تھا جو کائنات میں کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔"

جب حضرت ابوذر نے صحرائے ربذہ میں حکومت کے خلاف خاموش احتجاج کرتے ہوئے دم توڑا تو جن صلحائے مومنین نے ان کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا تھا ان میں اگرچہ ہلال ابن مالک مزنی احنف ابن قیس تمیمی صعصعہ ابن صوحان عبدی اسود ابن قیس تمیمی ایسے عظیم المرتبت و جلیل القدر افراد موجود تھے۔ مگر نماز جنازہ مالک اشتر نے پڑھائی جس سے ان کے علم و عدالت اور قدر و منزلت پر روشنی پڑتی ہے۔

امیرالمومنین نے مالک کو جزیرۃ العرب پر عامل مقرر کیا جو موصل نصیبین میا فارقین دارا عانات سنجار اور دوسرے شہروں پر مشتمل ایک وسیع علاقہ تھا۔ ۳۸ھ میں انہیں امارت مصر کے لئے منتخب کیا مگر مصر پہنچنے سے پہلے ایک اموی کارندے نے معاویہ کے ایما پر انہیں شہد میں زہر دے کر شہید کر دیا۔ معاویہ کو ان کے انتقال کی خبر ہوئی تو خوش ہو کر کہا:۔

ان للہ جندا من العسل۔ شہد بھی اللہ کا ایک لشکر ہے۔"

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۲)

عبداللہ ابن عباس۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم تھے ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے امیرالمومنین کے زیر سایہ تربیت پائی انہی سے علمی استفادہ کیا اور علم و حکمت اور فقہ و تفسیر میں بلند ترین درجہ پر فائز ہوئے۔ تشنگان علوم و معارف کا ان کے ہاں ہجوم رہتا تھا اور حبرالامہ اور ترجمان القرآن کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ جمل، صفین اور نہروان تینوں جنگوں میں حضرت کے ہمرکاب رہے۔ عثمان ابن حنیف کے بعد بصرہ کے حاکم مقرر کئے گئے۔ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ۶۸ھ میں طائف میں وفات پائی۔ محمد ابن حنیفہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور سپرد لحد کیا۔

محمد ابن ابی بکر۔ اسماء بنت عمیس کے بطن سے حضرت ابوبکر کے فرزند تھے۔ حجۃ الوداع کے سال پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکر کے انتقال کے بعد حضرت علی نے اسماء سے عقد کر لیا۔ تو محمد انہی کے زیر تربیت آ گئے۔ آپ نے اپنی اولاد کی طرح ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی اور انہوں نے وہی مسلک اختیار کیا جو اس تربیت کا تقاضا تھا۔ جمل و صفین کے معرکوں میں شریک رہے۔ قیس ابن سعد کی برطرفی کے بعد مصر کی امارت ان سے متعلق ہوئی۔ جب ۳۸ھ میں لشکر شام مصر پر حملہ آور ہوا تو دشمن کے ہاتھوں بڑی بے دردی سے شہید ہو گئے۔

ابوایوب انصاری:۔ ان کا نام خالد اور باپ کا نام زید تھا مگر اپنی کنیت سے شہرت حاصل کی۔ پیغمبر اکرم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں انہی کے ہاں سات ماہ قیام فرمایا تھا۔ آپ متورع و پرہیزگار ہونے کے ساتھ بہادر و نبرد آزما بھی تھے۔ اسلامی غزوات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور جمل، صفین اور نہروان میں امیرالمومنین کی صفوں میں امتیازی حیثیت سے شامل رہے۔ حضرت کی طرف سے مکہ کے والی مقرر ہوئے۔ ۵۱ھ میں

وفات پائی اور قسطنطنیہ میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار صدیوں سے زیارت گاہِ خاص و عام چلا آ رہا ہے۔

مخنف ابن سلیم ازدی:۔ امیرالمومنین کے معتمد اصحاب میں سے تھے۔ کربلا کا مشہور وقائع نگار ابو مخنف انہی کی اولاد میں سے تھا۔ ابو مخنف کا نام لوط اور شجرہ نسب یہ ہے:۔ لوط ابن یحییٰ ابن سعید ابن مخنف ابن سلیم۔ امیرالمومنین نے مخنف ابن سلیم کو ہمدان اور اصفہان کا عامل مقرر کیا۔ جب حضرت نے صفین کی طرف حرکت کرنے کا ارادہ کیا تو مخنف نے حضرت سے کوفہ آنے کی اجازت طلب کی تاکہ آپ کے ہمرکاب رہ کر شامیوں سے جہاد کریں۔ حضرت نے ان کے ولولۂ جہاد کو دیکھ کر انہیں کوفہ آنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ حرث ابن ربیع کو اصفہان پر اور سعید ابن وہب کو ہمدان پر اپنا نائب مقرر کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور قبیلہ بنی ازد کا پرچم اپنے ہاتھوں میں لے کر جنگ صفین میں شریک ہوئے۔

قرظہ ابن کعب انصاری:۔ پیغمبر کے اصحاب میں سے تھے۔ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور حضرت کی طرف سے فارس کے حاکم مقرر ہوئے۔ جمل صفین اور نہروان میں امیرالمومنین کی نصرت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت نے صفین میں انصار کا علم اُن کے سپرد کیا۔ حضرت ہی کے دورِ خلافت میں وفات پائی اور آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کے ایک فرزند عمرو ابن قرظہ انصاری کربلا میں لڑ کر شہید ہوئے۔

قثم ابن عباس:۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم اور صورت و شکل میں ان سے بہت مشابہ تھے۔ آنحضرت کے دفن کے موقع پر قبر اطہر میں اُترے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ کریم و سخی تھے۔ سائلوں کو اپنے گراں قدر عطایا سے دوسروں کے آگے جھولی پھیلانے سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ ایک شاعر داؤد ابن مسلم نے ان کے بارے میں کہا ہے:۔

یا ناق ان ادنیتنی من قثم　　　　اعقیت من حل و من رحلة

"اے میری اونٹنی اگر تو مجھے قثم کے پاس لے چلے تو آئے دن کے سفروں سے چھٹکارا پا جائے۔"

حضرت نے انہیں مکہ کا والی مقرر کیا اور ایک مکتوب میں انہیں تحریر فرمایا:۔ "صبح و شام اپنی نشست قرار دو۔ مسئلہ پوچھنے والے کو مسئلہ بتاؤ۔ جاہل کو تعلیم دو اور عالم سے تبادلۂ خیالات کرو۔" ان کلمات سے ان کی عدالت علمی منزلت اور اہلیت افتاء کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ امیرالمومنین کی شہادت کے بعد سعید ابن عثمان کے ہمراہ سمرقند چلے گئے اور جام شہادت پی کر جنت کو سدھارے۔

یزید ابن قیس ارحبی:۔ قبیلہ ہمدان کی شاخ بنی ارحب کی ایک ممتاز فرد تھے۔ کوفہ میں سکونت تھی جب حفاظ کوفہ نے حضرت عثمان کی روش کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کی تو

انہیں سربراہ منتخب کیا گیا۔ جنگ صفین میں اپنے بھائی سعید ابن قیس ہمدانی کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور بڑی دلیری وجرأت سے لڑے۔ امیرالمومنین نے انہیں اصفہان ہمدان اور رے کا عامل مقرر کیا۔

کمیل ابن زیاد نخعی :- امیرالمومنین کے مخصوصین میں سے تھے۔ نہایت عابد و پرہیزگار اور علوم و معارف آلِ محمد کے امین تھے۔ حضرت نے انہیں ایک دعا تعلیم فرمائی تھی جو" دعائے کمیل کے نام سے مشہور اور کتب ادعیہ میں موجود ہے۔ کوفہ میں سکونت رکھتے تھے۔ جنگ صفین میں حضرت کے ہمرکاب رہے۔ اور شامیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔

جب ۸۲ھ میں حجاج ابن یوسف ثقفی نے عبدالرحمٰن ابن محمد ابن اشعث کو شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کر لیا تو چن چن کر شیعیان امیرالمومنین کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا۔ شیعیان کوفہ میں کمیل کی شخصیت غیر معروف نہ تھی وہ حجاج کے ظلم و تشدد اور خونریزی و سفاکی کو دیکھ کر کہیں روپوش ہو گئے۔ حجاج نے ان کے قبیلہ والوں سے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کی مگر کسی نے ان کا پتا بتانا گوارا نہ کیا۔ آخر حجاج نے ان سب کے وظائف روک لئے۔ جناب کمیل کو معلوم ہوا تو کہنے لگے کہ میں بہت جی چکا ہوں اب مجھے جینے کی آرزو نہیں ہے۔ میں چند روزہ زندگی کے لئے اپنی قوم کو بھوکا مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاج کے ہاں پہنچ گئے۔ حجاج ان سے انتہائی سختی و درشتی سے پیش آیا۔ کمیل نے بھی اس کی ہر بات کا جواب اسی کے لب و لہجہ میں دیا اور کہا کہ میں اس وقت تمہارے قبضہ میں ہوں تم جو چاہو میرے ساتھ کر گزرو کل میرا اور تمہارا فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں ہو گا۔ مجھے موت کی پروا نہیں ہے۔ میرے سید و سردار علی ابن ابی طالب مجھے خبر دے گئے تھے کہ تم ایک ظالم و سفاک کے ہاتھ سے قتل ہو گے۔ حجاج نے کہا کہ مجھے تمہاری تلاش اسی غرض کے لئے تھی یہ کہہ کر حکم دیا کہ ان کی گردن مار دی جائے۔ چنانچہ وہ اسی مقام پر ذبح کر دیئے گئے۔ شہادت کے وقت آپ کا سن ۹۰ برس کا تھا۔ اور مزار کوفہ و نجف کے درمیان واقع ہے۔

ربیع ابن خثیم اسدی :- امیرالمومنین کے مقربین اور اجلہ اصحاب میں سے تھے۔ زہد و ورع اور تقویٰ و پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ حضرت کی طرف سے قزوین کے عامل مقرر ہوئے۔ جب امیرالمومنین صفین جانے کے لئے نخیلہ میں فروکش تھے تو ان کی آمد کے منتظر رہے اور جب وہ رے سے چار ہزار کا لشکر لے کر پہنچے تو صفین کی طرف حرکت کی۔ ۶۱ھ یا ۶۳ھ میں ایک لشکر میں شامل ہو کر خراسان گئے اور وہیں پر وفات پائی اور روضۂ امام رضا علیہ السلام سے چھ میل کے فاصلے پر مدفون ہیں۔ ان کا مدفن زیارت گاہِ خواجہ ربیع کے نام سے مشہور ہے۔ جب امام رضا علیہ السلام طوس میں وارد ہوئے تو اکثر ان کی قبر پر تشریف فرما ہوتے

اور فرماتے کہ خراسان آنے کا ماحصل خواجہ ربیع کی زیارت ہے۔

عمر ابن ابی سلمہ:۔ جناب ام سلمہ کے بطن سے ابوسلمہ ابن عبدالاسد مخزومی کے فرزند تھے۔ ۲ھ میں حبشہ میں پیدا ہوئے۔ وفات رسول کے وقت ان کا سن نو برس کا تھا۔ جنگ جمل میں امیرالمومنین کے میسرۂ لشکر کے سردار تھے۔ حضرت نے انہیں بحرین کا والی مقرر کیا۔ جب صفین کا ارادہ کیا تو انہیں جنگ میں شرکت کی غرض سے بحرین سے واپس بلا لیا۔ اور جنگ کے بعد فارس کے حاکم بنائے گئے۔ ۸۳ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔

نعمان ابن عجلان انصاری:۔ قبیلہ انصار کے سردار اور زبان آور شاعر تھے۔ امیرالمومنین کے حامی و طرف دار اور ان کے حق کی فوقیت کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے تھے۔ حضرت نے عمر ابن ابی سلمہ کی جگہ انہیں بحرین و عمان کا والی مقرر کیا۔ جنگ صفین میں حضرت کی حمایت میں لڑے۔ ان کے بھائی نعیم ابن عجلان انصاری حسینی لشکر میں شامل ہو کر روز عاشورا حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ انہوں نے امام حسن کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔

عثمان ابن حنیف انصاری:۔ انصار کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ احد اور اُس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ امیرالمومنین کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ حضرت نے جنگِ جمل سے قبل انہیں بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ جنگ کے خاتمہ پر ان کی جگہ پر عبداللہ ابن عباس متعین ہوئے۔ آپ نے کوفہ میں سکونت اختیار کی اور معاویہ کے دور میں وفات پائی۔

سعید ابن مسعود ثقفی:۔ مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کے چچا تھے۔ صفین میں اہلِ کوفہ کے سات دستوں میں سے ایک دستہ کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت کی طرف سے مدائن کے والی تھے۔ جب امام حسن فوج کی بغاوت کے نتیجہ میں ابن بشیر اسدی کے ہاتھ سے زخمی ہوئے تو مدائن میں سعید ہی کے ہاں منزل کی اور انہی نے علاج معالجہ کا سر و سامان کیا۔

عبیداللہ ابن عباس:۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم تھے۔ امیرالمومنین نے انہیں یمن کی امارت سپرد کی۔ اور افواج یمن کی سپہ سالاری کا عہدہ سعید ابن نمران ہمدانی کو دیا۔ جب بسر ابن ابی ارطاۃ نے یمن پر حملہ کیا تو یہ اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر یمن سے نکل کھڑے ہوئے۔ جس پر امیرالمومنین نے انہیں سرزنش کی۔

حسان ابن حسان بکری:۔ امیرالمومنین کی طرف سے انبار کے والی تھے۔ جب معاویہ نے عراقی سرحدوں پر تاخت و تاراج شروع کی تو سفیان ابن عوف غامدی نے چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ انبار پر حملہ کیا اور حسان اور ان کے تیس ہمراہیوں کو شہید کر دیا۔

ضحاک ابن قیس کی تاخت

امیرالمومنین جنگ جمل میں اُلجھے ہوئے تھے کہ معاویہ نے موقع تاک کر جزیرۃ العرب کے چند شہروں حران، قرقیسا اور رقہ پر فوج کشی کر دی اور وہاں کے باشندوں سے بیعت لے کر ضحاک ابن قیس فہری کو اس علاقہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ جب امیرالمومنین جنگ جمل سے فارغ ہو کر کوفہ میں وارد ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان شہروں کے باشندوں نے جو حضرت عثمان کے ہوا خواہ تھے معاویہ کی بیعت کر لی ہے اور ضحاک ابن قیس معاویہ کی طرف سے ان اطراف کا عامل قرار پا گیا ہے۔ حضرت نے مالک اشتر کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بلاد جزیرہ کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ حضرت ان کی جنگی مہارت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر پُر اعتماد تھے کہ وہ بگڑے ہوئے حالات پر قابو پالیں گے اور ضحاک کو حدود جزیرہ سے نکال باہر کریں گے۔ چنانچہ مالک فوراً ایک دستہ فوج کے ساتھ بلاد جزیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب حدود جزیرہ میں داخل ہوئے اور ضحاک کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے رقہ سے جو کوفہ و بصرہ کے عثمانیوں کی پناہ گاہ تھا فوجی امداد طلب کی چنانچہ وہاں سے سماک ابن مخرمہ اسدی کی کمان میں ایک لشکر اس کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ جب مالک حران کے قریب پہنچے تو ضحاک اور سماک دونوں اپنی اپنی فوجوں کی کمان کرتے ہوئے مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور رقہ اور حران کے درمیان مقام مرج میں جنگ چھڑ گئی۔ مالک اور اُن کے ہمراہیوں کے پُر زور حملوں نے حریف کا زور توڑ دیا۔ جب ضحاک نے شکست کے آثار دیکھے تو لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور قلعۂ حران میں پناہ لے لی۔ مالک نے لشکر کا تعاقب کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ معاویہ کو اپنے لشکر کی ہزیمت اور قلعہ بند ہونے کی خبر پہنچی تو انہوں نے خالد ابن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو سواروں اور پیادوں کے لشکر گراں کے ساتھ بھیجا۔ مالک کو جب اس شامی لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے محاصرہ اٹھا کر پہلے اس سے نمٹ لینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جس سمت سے لشکر آرہا تھا ادھر بڑھے۔ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے تو تلواریں نیاموں سے کھینچ کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے کچھ دیر تک چھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر عبدالرحمن اور اس کے ہمراہیوں کے قدم اکھڑ گئے اور انہوں نے بھاگ کر رقہ میں پناہ لے لی۔ مالک نے چاروں طرف سے رقہ کا محاصرہ کر لیا۔ ضحاک کو عبدالرحمٰن کے لشکر کی پسپائی کا علم ہوا تو وہ قلعہ حران سے نکل کر رقہ کی طرف بڑھا تاکہ شکست خوردہ فوج کو محاصرہ سے نکال لے جائے اس اثناء میں شامیوں کا ایک اور لشکر ایمن ابن حزیمہ کی زیر کمان پہنچ گیا اب ضحاک کی ہمت بڑھ گئی اور وہ پوری طاقت سے مالک کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ مالک اور اس کے ہمراہیوں نے ہتھیار سنبھال لئے اور خونریز جنگ شروع ہو گئی۔

شامی کچھ دیر تک جی توڑ کر لڑتے رہے۔ آخر عراقیوں کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکے اور گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جزیرہ شامی فوجوں سے خالی ہو گیا اور مقامی باشندے جو اموی اقتدار کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے دبک کر بیٹھ گئے۔ مالک نے ان باغیوں اور سرکشوں کی اچھی طرح گوشمالی کی اور ان سے اطاعت کا عہد و پیمان لے کر جزیرہ کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

قیس ابن سعد کی برطرفی

جنگ جمل کے بعد معاویہ کو یہ خطرہ صاف نظر آ رہا تھا کہ امیر المومنین انہیں امارت شام سے الگ کرنے کے لئے قدم اٹھائیں گے جسے وہ کسی صورت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ خطرہ مصر اور عراق دونوں طرف سے تھا۔ اگر ایک طرف سے قیس ابن سعد مصر کی فوجوں کے ساتھ اور دوسری طرف سے حضرت عراقیوں کے ساتھ شام پر حملہ آور ہوتے تو وہ اس دو طرفہ یلغار کا مقابلہ نہ کر سکتے انہوں نے چاہا کہ کسی طرح قیس کو اپنے ساتھ ملانے یا مصر کی امارت سے الگ کرنے کی تدبیر کریں۔ چنانچہ انہوں نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے قیس کو ایک خط تحریر کیا کہ "علی نے عثمان کا خون بہا کر ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اور تمہارا قبیلہ انصار بھی اس جرم میں ان کا معاون و مددگار تھا اگر تم اپنا بچاؤ چاہتے ہو تو طالبان قصاص کے گروہ میں شامل ہو کر تحریک قصاص کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ اس کے صلہ میں تمہیں عراقین کی حکومت دی جائے گی اور تمہارے گھر والوں میں سے جسے تم چاہو گے حجاز کا حاکم بنا دیا جائے گا اور اس کے علاوہ بھی جو تم چاہو گے دیا جائے گا۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔"
معاویہ نے یہ دانہ تو پھینکا مگر قیس آسانی سے زیر دام آنے والے نہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا مگر نہ کھل کر انکار کیا نہ اقرار۔ اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ دن انہیں امید و یاس کے دوراہے پر کھڑا رہنے دیں۔ چنانچہ انہیں تحریر کیا کہ :۔ "میں قتل عثمان کا مرتکب نہیں ہوا البتہ میرے قبیلہ کے لوگ اس سے بے تعلق نہیں رہے۔ تم نے حضرت علی کو اس خون میں شریک قرار دیا ہے تو میرے علم میں یہ چیز نہیں ہے۔ رہا تم سے وابستگی کا سوال تو اس کا فیصلہ بے سوچے سمجھے جلدی میں نہیں کیا جا سکتا تاہم میری طرف سے تمہیں مطمئن رہنا چاہیئے۔ کہ میں کوئی قدم ایسا نہیں اٹھاؤں گا جو تمہیں ناگوار گزرے۔" معاویہ نے یہ خط پڑھا تو کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ قیس اپنا ہاتھ کھینچ رہے ہیں یا دست تعاون بڑھا رہے ہیں۔ انہیں دوبارہ لکھا کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ تم میرے مخالف ہو یا موافق اگر تم مجھے اندھیرے میں رکھ ٹال مٹول سے

کام لینا چاہتے ہو تو میں آسانی سے فریب میں آنے والا نہیں ہوں وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ فوجیں میرے جلو میں ہوں گی اور گھوڑوں کی باگیں میرے ہاتھ میں پھر یہ حیلے حوالے کام نہیں دیں گے۔" قیس نے یہ خط پڑھا تو سمجھ گئے کہ معاویہ کو آسانی کے ساتھ ٹالا نہیں جا سکتا اور نہ باتوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہیں صاف صاف لکھا کہ "مجھے تعجب ہے کہ تم مجھے سمجھ نہ سکے اور حکومت کا لالچ دے کر مجھے بہکانے لگے کیا تم یہ تصور بھی کر سکتے ہو کہ میں اس شخص کی امارت سے باہر ہو کر آمادۂ بغاوت ہو جاؤں گا جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی قیادت و سربراہی کا اہل ہے اور جس کی حق پسندی راست روی اور رسول اللہ سے قرابت و عزیز داری مسلم ہے۔ اور کیا تمہاری اطاعت کا جوا اپنی گردن میں ڈال لوں گا جبکہ تمہیں نہ امارت و قیادت سے کوئی واسطہ اور نہ اللہ اور اس کے رسول سے کوئی لگاؤ ہے۔ تم فریب کار گمراہ اور گمراہ کرنے والے کی اولاد اور ابلیس کے گروہ کی ایک فرد ہو۔ تم نے اپنے خط میں لشکر و سپاہ کا ذکر کیا ہے تو خدا کی قسم اگر تم میرے ہاتھ سے اپنی جان بچا لے جاؤ تو بڑے خوش نصیب ہو گے۔" معاویہ نے یہ خط پڑھا تو بہت سیخ پا ہوئے اور اسی لب و لہجہ میں جواب دیا اور ادھر سے بھی ویسا ہی جواب آیا۔ آخر معاویہ قیس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ کہ انہیں نہ طمع و لالچ سے پھانسا جا سکتا ہے اور نہ خوف زدہ کر کے ہمنوا بنایا جا سکتا ہے۔ جب اس طرح کام نکلتا نظر نہ آیا تو انہوں نے تقاضائے دیانت سے منہ موڑ کر ایک چال چلی اور وہ یہ کہ قیس کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا جس میں تحریر تھا کہ:۔

"قیس ابن سعد کی طرف سے امیر شام معاویہ کے نام ہم نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کا ساتھ نہ دینا چاہیئے جن کے ہاتھ ایک پرہیزگار و نیک کردار رہنمائے اسلام کے خون سے رنگین ہیں۔ ہم اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اللہ سے اپنے دین کی سلامتی کے خواستگار ہیں۔ ہم آپ کو اپنی اطاعت کا یقین دلاتے ہیں اور عثمان مظلوم کے قاتلوں سے جنگ لڑنے پر تیار ہیں اور جلد ہی ہماری طرف سے فوجی و مالی امداد روانہ کر دی جائے گی۔" اس تحریری جعلسازی کے ساتھ زبانی بھی لوگوں کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ قیس کو بُرا نہ کہو وہ در پردہ ہمارے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ انہوں نے خربتا کے باشندوں کو ہر طرح کی سہولت و آزادی دے رکھی ہے اور تم میں سے کوئی اُن کے ہاں جاتا ہے تو اس سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔

معاویہ نے اس فرضی خط کو صرف شام ہی میں مشتہر نہیں کیا بلکہ اپنے کارندوں کے ذریعہ کوفہ میں بھی اس کی تشہیر کی تاکہ وہاں کی فضا کو قیس کے خلاف کر سکیں۔ چنانچہ کوفہ میں اس کا عام چرچا ہوا اور امیرالمومنین کے کانوں تک بھی یہ آواز پہنچ گئی آپ نے اپنے چند عزیزوں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ عبداللہ

ابن جعفر اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ قیس آپ سے برگشتہ ہو کر معاویہ سے ساز باز کئے ہوئے ہیں مناسب یہی ہے کہ انہیں برطرف کر دیا جائے۔ امیرالمومنین سمجھ رہے تھے کہ یہ معاویہ کی چال ہے اور واقع میں ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کے جواب میں فرمایا :-

انی واللہ ما اصدق بھذا علیٰ قیس۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص ۵۵۴)

خدا کی قسم میں قیس کے بارے میں ان باتوں کی تصدیق نہیں کر سکتا۔"

اس اثنا میں قیس کا ایک خط حضرت کے نام آیا۔ جس میں تحریر تھا کہ ان اطراف میں کچھ عثمانی آباد ہیں جو بیعت سے کنارہ کش رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے نمائندوں نے مجھ سے کہا ہے کہ جب تک حالات یکسو نہیں ہو جاتے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ میں نے فی الحال یہ مناسب سمجھا ہے کہ ان سے جنگ نہ کی جائے۔ ممکن ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں اور خود ہی راہِ راست پر آجائیں۔ عبداللہ ابن جعفر اس خط پر مطلع ہوئے تو انہوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ قیس دفع الوقتی کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں آپ انہیں لکھیں کہ وہ ان لوگوں سے بیعت لیں۔ اور اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو ان سے جنگ کریں۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی حضرت نے کوفہ کی فضا کو دیکھتے ہوئے قیس کو تحریر کیا کہ مصر کے جن لوگوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی ہے۔ ان سے بیعت لو اگر وہ بیعت پر آمادہ ہو جائیں تو بہتر ورنہ اُن سے جنگ کرو۔ جب قیس کو حضرت کا خط ملا تو انہوں نے جواب میں تحریر کیا کہ یا امیرالمومنین اگر ان لوگوں سے جنگ لڑی گئی تو وہ آپ کے دشمنوں کے مددگار ثابت ہوں گے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور ان سے جنگ نہ چھیڑی جائے۔ قیس کے اس جواب سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ معاویہ سے وابستہ ہو چکے ہیں اور اشعث ابن قیس، عبداللہ ابن جعفر، محمد ابن حنفیہ اور کوفہ کے دوسرے سرکردہ لوگوں نے اصرار کیا کہ انہیں معزول کر دیا جائے اور ان کے بجائے محمد ابن ابی بکر کو والیٔ مصر مقرر کیا جائے۔ حضرت انہیں برطرف کرنے کے حق میں نہ تھے۔ مگر جب آپ کو مجبور کر دیا گیا تو آپ نے قیس کی معزولی اور محمد ابن ابی بکر کی تقرری کا حکم دے دیا۔

معاویہ نے جو داؤ کھیلا تھا وہ کامیاب رہا اور اس کا نتیجہ قیس کی معزولی کی صورت میں سامنے آ گیا۔ معاویہ نے قیس کو دم جھانسا دینا چاہا اور جب وہ اُن کے فریب میں نہ آئے تو فرضی خط کے ذریعہ ایسا فضا پیدا کر دی کہ امیرالمومنین کے اعزہ و اصحاب ان سے بدظن ہو گئے اور اس طرح معاویہ نے امیرالمومنین کے ساتھیوں ہی کے ذریعہ قیس کی معزولی کا سامان کر دیا۔ ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے :-

قد امرہ علی علی مصر فاحتال علیہ معاویۃ فلم ینخدع لہ فاحتال علی اصحاب علی حتی حسنوا لہ تولیۃ محمد ابن ابی بکر فولاہ مصر۔ (اصابہ۔ ج ۳۔ ص ۲۳۹)

حضرت علی نے قیس کو مصر کا حاکم مقرر کیا تو معاویہ نے قیس کو مختلف حیلوں سے ورغلانا چاہا مگر وہ ان کے ورغلانے میں نہ آئے۔ پھر انہوں نے حضرت کے اصحاب کو ورغلایا اور انہوں نے محمد ابن ابی بکر کے تقرر کو اس خوبصورت انداز میں پیش کیا کہ حضرت نے انہیں مصر کا والی مقرر کر دیا۔"

قیس مصر کی امارت سے دستبردار ہو کر مدینہ چلے آئے اور ان لوگوں کو جو ان کے جنگی داؤ پیچ بینظیر شجاعت اور زورِ بازو سے خائف تھے اطمینان ہو گیا۔ دشمن نے مسرت کا اظہار کیا اور شماتت کرنے والوں کو شماتت کا موقع مل گیا۔ چنانچہ حسان ابن ثابت جو عثمانی گروہ کی ایک فرد تھے۔ قیس کے پاس آئے اور کہا کہ تمہاری اچھی قدر افزائی ہوئی ہے کہ تمہیں امارت مصر سے معزول کر دیا گیا حالانکہ تم قتلِ عثمان میں شریک تھے۔ قیس نے بگڑ کر کہا۔

یا اعمی القلب والبصر واللہ لو لا ان القی بین رھطی ورھطك حربا لضربت عنقك اخرج عنی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۵۵۵)

اے بے بصیرت و بے بصارت یہاں سے دور ہو جاؤ۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے اور تمہارے قبیلہ کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی تو میں تمہاری گردن مار دیتا۔"

مروان ابن حکم اور اسود ابن البختری نے بھی ڈرایا دھمکایا اور جب انہیں قید و بند اور قتل کا خطرہ نظر آیا تو سہل ابن حنیف کے ہمراہ امیر المومنین کے پاس کوفہ چلے آئے۔ جب معاویہ کو معلوم ہوا کہ قیس کوفہ چلے گئے ہیں۔ تو بگڑ کر مروان اور اسود کو لکھا:۔

امددتما علیا بقیس ابن سعد ورایہ ومکانہ فواللہ لو انکما امددتماہ بمائۃ الف مقاتل ماکان ذلك باغیظ لی من اخراجکما قیس ابن سعد الی علی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۵۵۶)

تم دونوں نے قیس کے علی کے پاس جانے کا سرو سامان کیا خدا کی قسم اگر تم ایک لاکھ جنگجو سپاہیوں سے علی کی مدد کرتے تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس سے ہوا ہے اس طرح تم نے قیس اور ان کی رائے و تدبیر سے علی کے بازوؤں کو مضبوط تر کر دیا ہے۔"

مصر سے برطرفی کے بعد امیر المومنین نے انہیں آذربائیجان کا عامل مقرر کر دیا اور سفر شام کے موقع پر حضرت کے فرمان کے مطابق عبداللہ ابن شبیل احمسی کو اپنا قائم مقام بنا کر کوفہ واپس آ گئے اور جنگ صفین

میں شریک ہو کر اپنے زورِ بازو اور زورِ خطابت کی دھاک بٹھا دی۔

قیس ابن سعد کی معزولی کے سلسلہ میں عام طور پر امیرالمومنین کی سیاست کو ہدف بنایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت کا یہ اقدام مصلحت اندیشی کے خلاف تھا انہوں نے ایسے موقع شناس، معاملہ فہم، اور جنگ آزما کو مصر کی امارت سے اس وقت الگ کیا جب معاویہ کے جنگی عزائم کے پیشِ نظر وہاں کی قیادت کو مضبوط تر کرنے کی ضرورت تھی مگر اسے قوی تر کرنے کے بجائے کمزور تر کر دیا گیا اور محمد ابن ابی بکر کو وہاں کی قیادت سونپ دی گئی جو نہ معاویہ کی دراندازیوں کو روک سکتے تھے اور نہ ملکی حدود کو دشمن کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی کمزور سیاست کے نتیجہ میں مصر حضرت کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور معاویہ کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔

بظاہر یہ اعتراض بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے مگر کسی امر کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس دور کا واقعہ ہو اس دور کے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا جائے۔ یہ واقعہ اس دور کا ہے جب مواصلات کا دائرہ محدود اور انتہائی محدود تھا ایک ہی مملکت کے اندر ایک جگہ کے واقعات و حوادث سے دوسری جگہ کے لوگ بے خبر رہتے تھے اور خبر پہنچ بھی جاتی تھی تو واقعہ کی اصل نوعیت اور اس کا پس منظر واضح نہ ہوتا تھا مصر کے سیاسی حالات کے پیشِ نظر قیس ابن سعد کا طریقِ کار کتنا ہی حزم و احتیاط کا حامل کیوں نہ ہو مگر وہاں سے جو اطلاعات پہنچتی تھیں ان سے قیس کے طرزِ عمل کا مشکوک سمجھا جانا کوئی بعید نہ تھا انہوں نے مصر پہنچنے کے بعد خربتا کے عثمانیوں سے کوئی تعرض نہ کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ ایسے لوگ حکومت کے باغیوں میں شمار ہوتے ہیں اور باغیوں سے مراعات کا جواز کسی قاعدہ و قانون سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کا جواز نکل سکتا تھا جب انہیں دبانے کی قوت و طاقت نہ ہوتی۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیس دس ہزار عثمانیوں کو کچلنے کی طاقت بہم نہ پہنچا سکتے تھے۔ پھر جب معاویہ نے انہیں اپنے حزب میں شامل ہونے کی دعوت دی تو انہوں نے کھل کر نہ ان کی پیش کش کو ٹھکرایا اور نہ اسے قبول کیا جس سے ان کا موقف اور مشکوک ہو گیا۔ اور جب انہوں نے کھل کر دو ٹوک جواب دیا تو معاویہ کو کیا ضرورت تھی کہ ان کے خط کا اعلان کرتے جب کہ وہ یہ تاثر دینے کی فکر میں تھے کہ قیس ان کے ہم خیال و ہمنوا ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرضی خط کے ذریعہ شامیوں اور کوفیوں کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا کہ قیس انہی کے آدمی ہیں۔ ان حالات میں اگر قیس کے بارے میں شبہ یا سوءظن پیدا ہو جائے تو اسے انسان کی ذہنی روش کے خلاف نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا البتہ امیرالمومنین نے ان کے بارے میں اپنے اعتماد کو بحال رکھا نہ کسی موڑ پر ان کی وفاداری میں شبہ

کیا اور نہ ان کے متعلق اڑتی ہوئی خبروں کی تصدیق کرنے پر آمادہ ہوئے۔ مگر اس کے باوجود انہیں امارت مصر پر بحال رکھنا مشکل تھا اس لئے کہ اہل کوفہ جن کے مزاج کی بے ثباتی ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے وہ اس کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور مصر میں جنگ چھڑنے کی صورت میں عملی تعاون سے گریز کرتے اور کوفہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے ضرورت کے موقع پر کمک مہیا کی جا سکتی تھی۔ اس عدم تعاون کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قیس مصریوں کی سپاہ کے ساتھ شامیوں کے مقابلہ سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے۔ اہل کوفہ نے تو محمد بن ابی بکر کی جو ان کی مرضی کے ماتحت والئ مصر مقرر کئے گئے تھے مدد نہ کی تو قیس کی مدد کے لئے کیا آمادہ ہوتے جب کہ وہ ان کی معزولی و برطرفی کے حامی تھے۔ چنانچہ جب لشکر شام مصر پر حملہ آور ہوا ہے۔ تو محمد کے چیخنے چلانے اور فریاد کرنے کے باوجود ان میں سے کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور جب امیرالمومنین کے جھنجھوڑنے کے بعد جانے پر آمادہ ہوئے تو اس وقت جب مصر پر شامیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر امیرالمومنین قیس کو معزول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ وہ دل سے ان کی برطرفی کے حق میں نہ تھے۔ اور پھر حضرت کے سامنے صرف مصر اور وہاں کے شوریدہ سر عثمانیوں ہی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ معاویہ سے جنگ آزما ہونے کی کٹھن مہم بھی درپیش تھی جسے سر کرنے کے لئے قیس ایسے افراد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا جن کی ہمت و جرأت اور اصابت رائے کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ اسی لئے قیس کا حضرتؑ کے پاس پہنچ جانا معاویہ کے لئے ایک المیہ تھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ قیس امارت سے الگ کر دیئے جانے کے بعد حضرت سے اپنی وابستگی ختم کر دیں گے اور ہمیشہ کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کر لیں گے مگر یہ چھچھوری کم ظرف اور مفاد پرست طبیعتوں کا خاصہ اور قیس کی حق پسندی اور بلند نفسی یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ منصب کے چھن جانے سے حق کا ساتھ چھوڑ دیں اور ایسے ہی موقعوں پر انسان کی بلندی کا معیار قائم ہوتا ہے اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اگرچہ معاویہ جعل و فریب کے ذریعہ قیس کو امارت مصر سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ انہیں قیس کا امارت مصر پہ باقی رہنا اتنا ناگوار نہ گزرتا جتنا جنگ صفین میں حضرت کا دست و بازو بن کر شامل ہونا ناگوار گزرا ہو گا۔ چنانچہ صفین کے آخری معرکوں میں انہیں یہ کہتے سنا گیا کہ اگر جنگ بند نہ ہوئی تو کل قیس ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر دم لیں گے۔

جنگ صفین

شام اموی اقتدار کا گہوارہ اور معاویہ ابن ابی سفیان کا پائے تخت تھا۔ جہاں وہ خلافت ثانیہ کے زمانہ سے اقتدار پر قابض تھے اور اس طویل عہد امارت کی وجہ سے انہوں نے مضبوطی سے قدم جما رکھے تھے اور ایک خود مختار حکمران کی طرح شام ایسے وسیع و زرخیز علاقہ پر اپنا پرچم لہرا رہے تھے جب امیرالمومنین مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے قلمرو مملکت کے تمام عمال کو معزول کر کے نئے عمال مقرر کیے۔ چنانچہ مصر میں قیس ابن سعد یمن میں عبیداللہ ابن عباس اور بصرہ میں عثمان ابن حنیف بھیجے گئے اور انہوں نے بغیر کسی خاص روک رکاوٹ کے عہدے سنبھال لئے کوفہ کی طرف عمارہ ابن شہاب کو اور شام کی طرف سہل ابن حنیف کو روانہ کیا گیا۔ عمارہ کوفہ جاتے ہوئے جب زبالہ کے مقام پر پہنچے تو طلحہ ابن خویلد اسدی مانع ہوا اور کہا کہ تم یہیں سے واپس چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ چنانچہ وہ واپس چلے آئے اور سہل ابن حنیف شام جاتے ہوئے جب وادیٔ تبوک کے قریب پہنچے تو معاویہ کے مقرر کردہ ایک شامی دستہ نے ان کا راستہ روک لیا اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں جانا چاہتے ہو کہا کہ میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کی طرف سے شام کا عامل ہوں۔ کہا کہ ہم معاویہ کے علاوہ کسی کو شام کا حکمران تسلیم نہیں کرتے تم جدھر سے آئے ہو اُدھر واپس پلٹ جاؤ ورنہ ہماری تلواریں تمہیں آگے بڑھنے سے روکیں گی۔ سہل اس جمعیت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مجبورًا واپس چلے آئے اور حضرت کی خدمت میں پہنچ کر صورت حال بیان کی۔ امیرالمومنین پہلے ہی سے سمجھ رہے تھے کہ معاویہ شام سے بآسانی دستبردار نہ ہوں گے اور ایک دن عراقیوں اور شامیوں کے درمیان جنگ کے شرارے بھڑکیں گے مگر آپ نے اتمام حجت سے پہلے ان کے خلاف قدم اٹھانا گوارا نہ کیا اور کوشش کی کہ گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے معاملہ یکسو ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے حجاج ابن غزیہ انصاری کو ایک خط دے کر معاویہ کے پاس بھیجا اور اُن سے مطالبہ کیا کہ وہ شامیوں کے وفد کے ساتھ مدینہ آئیں اور بیعت کریں۔ معاویہ نے خط پڑھا مگر اسے کوئی اہمیت نہ دی اور حجاج سے کہا کہ تم واپس چلے جاؤ میں اپنے آدمی کے ہاتھ جواب بھیج دوں گا۔ حجاج واپس چلے آئے اور معاویہ نے ایک پلندہ قبیصہ عبسی کو دے کر حضرت کے پاس بھیجا اس نے مدینہ پہنچ کر وہ پلندہ امیرالمومنین کو دیا۔ حضرت نے اسے کھولا تو اس میں فقط یہ لکھا تھا "معاویہ ابن ابی سفیان کی طرف سے علی ابن ابی طالب کے نام" حضرت نے اس سے دریافت کیا کہ اس کا مطلب کیا ہے اس نے ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی جو اس موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ اور ان

سے پوچھا کہ تم میں بنی عبس کے بھی لوگ ہیں ان لوگوں نے کہا کہ ہاں وہ بھی ہیں کہا کہ اب میری بات غور سے سنئے اور نتائج پر نظر کیجئے میں جامع دمشق میں پچاس ہزار شیوخ و اکابر کو عثمان کے خون بھرے پیراہن کے نیچے رونا چھوڑ کر آیا ہوں ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہیں شور و شیون کی صدائیں بلند ہیں اور وہ اللہ سے عہد کئے ہوئے ہیں کہ جب تک قاتلان عثمان کے خون سے اپنی تلواریں رنگین نہیں کر لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے اس پر خالد ابن زفر عبسی نے کہا:۔

بئس لعمرالله وافد الشام	خدا کی قسم تم شام کے بہت برے سفیر ہو۔ کیا
انت اتخوف المهاجرين والانصار	مہاجرین و انصار کو شام کے لشکر اور قمیص عثمان
بجنود اهل الشام وبكائهم على	پر ان کے رونے دھونے سے خوف زدہ کرنا چاہتے
قميص عثمان فوالله ماهو	ہو خدا کی قسم عثمان کا کرتہ یوسف کی قمیص نہیں
بقميص يوسف ولا بحزن يعقوب	ہے اور نہ ان کا رنج و غم یعقوب کا حزن و
(اخبار الطوال، صفحہ ۱۴۲)	اندوہ ہے"

حضرت نے معاویہ کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ایک فوج جمع کی اور شام جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی شام کی طرف کوچ نہ کیا تھا کہ طلحہ و زبیر کی شورش و ہنگامہ آرائی کی اطلاع پہنچی آپ نے شام جانے کے بجائے ان کا تعاقب کیا اور بصرہ میں خونریز جنگ لڑ کر اس فتنہ کو کچل دیا۔ جب اس بغاوت کو فرو کر کے کوفہ میں آئے تو معاویہ کی طرف کسی کو پیغامبر بنا کر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یمن کے معزول شدہ عامل جریر ابن عبداللہ بجلی نے اس خدمت کی انجام دہی کے لئے اپنے کو پیش کیا اور کہا کہ میں معاویہ سے اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر بیعت لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مالک اشتر نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ در پردہ اہل شام کا ہمنوا اور معاویہ کا دوست ہے یہ شخص کام سنوارنے کے بجائے اور بگاڑے گا۔ لہذا اسے نہ بھیجا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے فی الحال جانے دیا جائے دیکھیں یہ کیا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ اسے ایک خط دے کر شام روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "مہاجرین و انصار میرے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اب تمہارے لئے بیعت سے انکار کا کوئی جواز نہیں ہے تمہیں وہی طریق کار اختیار کرنا چاہئے جو اہل مدینہ نے اختیار کیا ہے۔ رہا قصاص عثمان کا مسئلہ تو تم بیعت کے بعد اسے میرے سامنے پیش کرنا میں کتاب و سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کروں گا"۔ جب جریر یہ خط لے کر معاویہ کے ہاں گیا تو انہوں نے خط پڑھ کر جریر سے کہا:۔

اكتب الى على ان يجعل لى الشام	تم علی کو لکھو کہ وہ شام کا علاقہ میرے نام کر دیں

وانا ابایع لہ۔   پھر میں بیعت کروں گا۔"

(تاریخ الاسلام ذہبی ۔ ج ۲ ۔ ص۱۶۶)

پھر کچھ سوچ بچار کے بعد کہا کہ تم کچھ دن توقف کرو تاکہ میں اہل شام سے بات چیت کرکے ان کی رائے معلوم کروں اور جو ان کی رائے ہوگی وہی میرا آخری فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی عتبہ ابن ابی سفیان کو بلاکر مشورہ کیا۔ عتبہ نے کہا کہ تم عمرو ابن عاص کو اپنے ہاں بلاؤ اور اس کی سوجھ بوجھ سے فائدہ اٹھاؤ وہ یقیناً تمہارا معاون و دست راست ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ جو شرط وہ منوانا چاہے اسے مان لو۔ معاویہ کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے عمرو ابن عاص کو تحریر کیا کہ "تمہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ علی نے طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے اور اب میری طرف متوجہ ہوئے ہیں اور جریر ابن عبداللہ بجلی کو بیعت کے لئے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں تم سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ لہذا جلد از جلد میرے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔" عمرو نے یہ خط پڑھا تو سمجھ گیا کہ معاویہ بیعت کے سلسلہ میں تو مشورہ کے طالب نہیں ہیں اس لئے کہ بیعت کا لازمی نتیجہ امارت شام سے دستبرداری ہے اور وہ کسی قیمت پر امارت کو اپنے ہاتھ سے دینا گوارا نہ کریں گے۔ یہ مشورہ علی کے مقابلہ میں محاذ جنگ قائم کرنے کے سلسلہ میں ہے اور صرف مشورہ ہی نہیں ہے بلکہ عملاً مجھے شریک جنگ کرنا چاہتے ہیں۔

عمرو نے ذہنی طور پر جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہوگا تاہم اس نے اپنے فیصلہ کی تائید حاصل کرنے کے لئے اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور محمد سے بھی اس کا ذکر کرکے ان کی رائے دریافت کی۔ عبداللہ نے کہا کہ آپ خلیفہ ہونے سے تو رہے بہتر یہ ہے کہ گھر کے گوشہ میں بیٹھے رہیئے اور تھوڑی سی دنیا کے لئے دین کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ محمد نے اس کے برخلاف رائے دی اور کہا کہ ایسے زرین مواقع ہر روز میسر نہیں آیا کرتے آپ جائیں اور ضرور جائیں۔ آپ عرب کی گمنام شخصیت نہیں ہیں آپ کی رائے کی قدر و قیمت ہے جدید حکومت کی تشکیل ہو رہی ہے اس میں آپ کی رائے کو شامل ہونا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ خلافت کا تصفیہ ہو جائے اور آپ کا کہیں ذکر تک نہ آئے۔ عمرو نے ان دونوں رایوں کو سنا تو کہا:۔

اما انت عبد اللہ فامرتنی بما هو خیر لی واخرتی واسلم فی دینی واما انت یا محمد فامرتنی بما هو خیر لی فی دنیای وشر لی فی اٰخرتی۔ (اخبار الطوال ۔ ص۱۴۱)

اے عبداللہ تم نے وہ بات کہی ہے جو میرے لئے آخرت کے لحاظ سے بہتر اور جس سے میرا دین بھی سلامت رہتا ہے اور اے محمد تم نے وہ بات کہی ہے جو میرے لئے دنیوی اعتبار سے بہتر اور عقبیٰ کے اعتبار سے تباہ کن ہے۔"

عبداللہ اور محمد کی رائے معلوم کرنے کے بعد اس نے اپنے غلام وردان سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا کہ آپ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ایک طرف دنیا ہے اور دوسری طرف آخرت، دنیا معاویہ کے ساتھ ہے اور آخرت علی کے ساتھ۔ آپ کبھی دنیا کی طرف جھکتے ہیں اور کبھی آخرت کا خیال عناں گیر ہوتا ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہتے اور کسی کا ساتھ نہ دیتے مگر مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ آپ کا اندرونی تذبذب عارضی ہے اور انجام کار آپ آخرت کے مقابلہ میں دنیا اختیار کریں گے اور علی کے مقابلہ میں معاویہ کا ساتھ دیں گے۔ عمرو نے یہ سنا تو کہا:۔

یا قاتل اللہ وردانا وقدحته ابدی لعمرک ما فی النفس وردان

"خدا ہی وردان کو اس کی باریک بینی کی داد دے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وردان نے چھپی ہوئی حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے"۔

عمرو ابن عاص کو امارت مصر کی دل سے خواہش تھی اور اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا اس سے بہتر موقع ہاتھ آنا مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے معاویہ کے ہاں جانے کا سروسامان کیا اور اپنے دونوں بیٹوں اور وردان کو لے کر دمشق پہنچ گیا۔ معاویہ منتظر تو تھے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسمی بات چیت کے بعد کہا کہ میں نے تمہیں اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے اس وقت تین الجھنوں کا سامنا ہے اور ابھی تک اُن کا کوئی حل تلاش نہیں کر سکا۔ مجھے امید ہے کہ تم انہیں سلجھانے میں میری مدد کر سکو گے کہا کہ میں سنوں کہ وہ الجھنیں کیا ہیں کہا کہ ایک الجھن تو یہ ہے کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ محمد ابن ابی حذیفہ قید خانہ کا دروازہ توڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت نکل بھاگا ہے مجھے اس سے اور اس کے ساتھیوں سے خطرناک اقدام کا اندیشہ ہے۔ دوسری الجھن یہ ہے کہ قیصر روم شام پر چڑھائی کا منصوبہ باندھ رہا ہے تاکہ اسے اپنے علاقہ میں شامل کرلے۔ اور تیسری الجھن یہ ہے کہ جریر ابن عبداللہ بجلی علی کا یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ میں بیعت کر دوں یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤں۔ عمرو نے کہا کہ اگر ابن ابی حذیفہ جیل کا دروازہ توڑ کر نکل گیا ہے تو تمہیں اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے۔ تم کچھ سوار اس کے تعاقب میں بھیج دو۔ اگر وہ گرفتار ہو گیا تو بہتر ورنہ وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ رہا قیصر روم کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ، تو اس کی روک تھام کے لئے یہ کرو کہ جتنے رومی تمہارے ہاں قید و بند میں ہیں انہیں رہا کر دو اور چند خوبصورت کنیزیں اور سونے چاندی کے ظروف اسے بطور تحفہ بھجوا دو اور صلح کا پیغام دو وہ ان چیزوں کو رد نہیں کرے گا اور صلح پر آمادہ ہو جائے گا۔ البتہ علی ابن ابی طالب کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ ایک تجربہ کار جرنیل اور جس منصب پر فائز ہیں اس کے اہل ہیں اور تمہارا اور ان کا کوئی مقابلہ ہی

نہیں ہے۔ معاویہ نے کہا کہ مجھے ان کے فضل و شرف سے انکار نہیں مگر انہوں نے فتنہ و شر کو ہوا دی جماعت میں تفرقہ ڈالا اور قاتلان عثمان کی ہمت افزائی کی ہے۔ لہٰذا ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ان سے قصاص کا مطالبہ کریں اور اسی قصاص طلبی کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ تم نے مجھے اس غرض سے بلوایا ہے کہ میں لوگوں کو بہلا پھسلا کر تمہارے پرچم کے نیچے جمع کروں اور تم نے مجھ ہی کو جل فریب دینا شروع کر دیا ہے۔ اس بات پر کون یقین کرے گا کہ تم قصاص عثمان کے لئے جنگ لڑنا چاہتے ہو جب کہ دنیا جانتی ہے کہ عثمان نے محاصرہ کے دنوں میں مدد مانگی تو تم نے عمداً پہلو تہی کی اور موت کو ان کے سر پر منڈلاتے دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی اور میں بھی انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر فلسطین چلا آیا۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ تعاون کروں تو مجھ سے لاگ لپیٹ کی باتیں نہ کرو میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ صاف بات یہ ہے کہ علی کے اسلامی خدمات علمی بلندی اور ہجرت و سبقت کے شرف کو دیکھتے ہوئے مجھے ان سے لڑنے کا حوصلہ نہیں ہوتا یہ کسی بڑے دل گردے والے ہی کا کام ہے۔ معاویہ سمجھ گئے کہ یہ ایک رسمی عذر خواہی ہے اگر وہ علی سے لڑنے پر اپنے کو آمادہ نہ پاتا تھا تو اسے ضرورت ہی کیا تھی کہ میرے پیغام پر فوراً پہنچ جاتا۔ اس نے سفر اختیار کیا ہے تو حالات کا بنظر غائر جائزہ لے کر اور یہ سمجھ کر کہ علی کے خلاف معرکہ آرائی میں حصہ لینا ہو گا اور اب اس سے دبے الفاظ میں معذرت کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ معاملہ کی سنگینی و اہمیت کو واضح کر کے منہ مانگی قیمت مانگے اور اپنا مطالبہ منوائے چنانچہ یہی ہوا۔ عمرو نے کچھ پس و پیش کے بعد کہا:۔

ولكن مالى ان شايعتك على امرك حتىٰ تنال ما تريد۔	اگر میں تمہارے ساتھ اشتراک عمل کروں یہاں تک کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ تو میرا اس میں حصہ کیا ہو گا۔
(اخبار الطوال۔ صـ ۱۵۸)	

معاویہ تو جانتے ہی تھے کہ یہ سودا بازی کئے بغیر آمادہ تعاون نہیں ہو گا پوچھا کہ مجھے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟ کہا:۔

اجعل لى مصر طعمة ما دامت لك ولاية۔ (اخبار الطوال۔ صـ ۱۵۸)	جب تک تمہاری حکومت رہے مصر کی حکومت میرے نام واگزار کر دو۔

معاویہ نے یہ مطالبہ سنا تو بہت سٹپٹائے۔ قیمت توقع سے کہیں زیادہ تھی نہ اقرار کرتے بنتی تھی اور نہ انکار۔ نظر بھر کر عمرو کی طرف دیکھا اور کہا کہ اگرچہ میں تم سے جھوٹا وعدہ کر سکتا ہوں مگر غلط بیانی کر کے تمہیں فریب دینا نہیں چاہتا۔ عمرو نے کہا کہ مجھے فریب دے کر بھی دیکھ لو میں تمہارے ہر داؤ پیچ کا توڑ

جانتا ہوں۔ معاویہ نے کہا تم ذرا مجھ سے قریب ہو جاؤ میں تمہارے کان میں ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔ عمرو آگے بڑھا اور اپنا کان معاویہ کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ معاویہ نے شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہو کیسی رہی آ گئے نا جھانسے میں۔ کہا کب اور کیسے؟ کہا کہ اسی جگہ اور اسی وقت تم ذرا سوچتے کہ اس مقام پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں ہے اور نہ اندر کی آواز باہر سنائی دی جا سکتی ہے پھر راز کی بات کہنے کے لئے تمہیں قریب کرنے اور تمہارے قریب ہونے کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں جب تم چوکنا ہونے کے باوجود فریب میں آ سکتے ہو تو بعد میں بھی تمہیں بآسانی فریب دیا جا سکتا ہے۔ میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ تم اپنے مطالبہ پر نظر ثانی کرو اور اگر تم اس پر مصر رہے تو لوگوں میں یہ چرچے ہوں گے کہ تم نے امارتِ مصر کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ لوگوں کی باتوں کو چھوڑئیے اب ان حیلہ طرازیوں سے کام نہیں چلے گا اگر تمہیں یہ شرط منظور ہے تو میری تمام کوششیں تمہارے لئے وقف ہوں گی۔ ورنہ تم جانو اور تمہارا کام میں اس معاملہ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ یہ کہہ کر عمرو اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔

عتبہ ابن ابی سفیان کو معاویہ اور عمرو کی باہمی گفتگو کا علم ہوا تو اس نے معاویہ سے کہا:۔

اما ترضی ان تشتری عمرا بمصر۔ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ مصر کے بدلے عمرو کو خرید لو۔" (اخبار الطوال ص۱۵۸)

معاویہ نے کہا کہ ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا آج رات اس پر غور کروں گا اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچ سکوں گا۔ چنانچہ اس نے وہ رات سوچ بچار میں گزاری اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ عمرو کی ہوشیاری و چالاکی سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس سے مصر کی حکومت کا وعدہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ عمرو کو بلا کر اس سے امارتِ مصر کا عہد و پیمان کیا اور رسمی طور پر ایک دستاویز تحریر کر کے دے دی۔ عمرو اس دستاویز کو لے کر خوش خوش اپنی منزل پر آیا اور اپنے ایک چچا زاد بھائی سے اس دستاویز کا ذکر کیا اس نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم قریش کو کیا منہ دکھاؤ گے اور کیونکر اپنے قبیلہ میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکو گے جب کہ تم نے دین فروشی کر کے اپنی شخصیت و شہرت کو داغدار کر لیا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اگر میں علی کے ساتھ ہوتا تو میرے لئے گھر کی چار دیواری کافی تھی اور اب تو میں معاویہ کے ساتھ ہوں۔ گھر کی چار دیواری پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ کہا کہ معاویہ نے کھلے بندوں تمہارا دین خرید لیا ہے۔ اور تم دنیا کی خاطر اس کے پیچھے لگ گئے ہو۔ معاویہ کو اس گفتگو کا علم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے اور حکم دیا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے تاکہ دوسروں کو بہکانے نہ پائے۔ اس نے گرفتاری کا حکم سنا تو چپکے سے نکل کھڑا ہوا

اور جان سلامت لے کر امیرالمومنین کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کی زبانی عمرو و معاویہ کے معاہدہ کی خبر عام ہوئی اور اُن کے جنگی عزائم کھل کر سامنے آ گئے۔

اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد عمرو نے معاویہ کو یہ دور رس مشورہ دیا کہ ابھی خلافت کا ذکر نہ چھیڑا جائے بلکہ اہل شام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ عثمان کے قتل کی ذمہ داری علی پر عائد ہوتی ہے۔ انہی نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا اور جب وہ قتل کر دیئے گئے تو ان کے قاتلوں کو اپنی پناہ میں لے لیا اور جب عوام کے ذہنوں میں یہ چیز اتر جائے تو ان کے تعاون سے جنگ چھیڑ دی جائے اور جنگ میں کامیابی کے بعد اقتدار کی راہ خود ہی ہموار ہو جائے گی۔ البتہ عوام کو ہمنوا بنانے کے لئے با اثر افراد کے تعاون کی ضرورت ہے اور اس وقت عبادہ ابن صامت انصاری شام میں موجود ہیں۔ جن کا اہل شام پر بہت اثر ہے پہلے انہیں ہمخیال بنانا چاہیئے اگر ہم انہیں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے تو شام کی ہر فرد ہمارے ساتھ اشتراک و تعاون کرے گی معاویہ نے اس تجویز کو سراہا اور ایک پیغامبر کے ذریعہ انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ جب عبادہ ان کے ہاں آئے تو معاویہ اور عمرو ابن عاص دونوں پہلو بہ پہلو کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے عبادہ کو دیکھا تو دونوں تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ عبادہ آگے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ معاویہ نے انہیں ہموار کرنے کے لئے ان کی بڑی تعریف کی اور پھر حضرت عثمان کے محاسن و فضائل بیان کر کے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان کا خون رائیگاں نہ جائے لہذا قصاص کے سلسلہ میں آپ ہمارا ساتھ دیں۔ عبادہ نے کہا کہ تم لوگوں نے جو کچھ کہا ہے میں نے سن لیا ہے مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میں عام دستور کے خلاف تم دونوں کے درمیان کیوں بیٹھا ہوں کہا کہ آپ کے فضل و شرف کا یہی تقاضا تھا کہ آپ ہم دونوں کے درمیان بیٹھیں اور ہم آپ کے دائیں بائیں بیٹھیں۔ کہا کہ یہ وجہ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ کہ ہم غزوۂ تبوک میں رسول اللہ کی رکاب میں چل رہے تھے کہ انہوں نے تم دونوں کو ساتھ ساتھ چلتے اور باتیں کرتے دیکھا تو اس موقع پر فرمایا:۔

اذا رأیتموھما اجتمعا ففرقوا بینھما فانھما لا یجتمعان علی خیرا ابدا۔ (عقد الفرید۔ ج ۳ ص ۱۱۱)	جب ان دونوں کو یکجا بیٹھا دیکھو تو انہیں الگ الگ کر دو اس لئے کہ یہ کبھی بھلائی کے کام کے لئے جمع نہیں ہوں گے۔

لہذا میں تمہیں یکجا ہونے سے منع کرتا ہوں اور تم دونوں کے درمیان بیٹھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم دونوں میں کچھ فاصلہ حائل ہو جائے۔ باقی رہا تمہاری ہمنوائی کا مسئلہ تو میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اب معاویہ نے عمرو کے مشورہ سے شرجیل ابن سمط کندی کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے تحریر کیا کہ

"کوفہ سے جریر ابن عبداللہ بجلی بیعت کا مطالبہ لے کر آیا ہے یہ معاملہ ایسا اہم ہے کہ تم سے مشورہ کئے بغیر اس کا فیصلہ کر لیا جائے لہٰذا جلد از جلد میرے پاس پہنچو۔" جب شرجیل کو یہ خط ملا تو اس نے چند نمایاں افراد سے مشورہ کیا کہ اسے جانا چاہیئے یا نہیں جانا چاہیئے۔ کچھ لوگوں نے جانے کا مشورہ دیا اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ فقیہہ شام عبدالرحمٰن ابن غنم ازدی نے کہا کہ ہم سن چکے ہیں کہ عثمان کے قتل میں علی کا ہاتھ ہے۔ اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو مہاجرین و انصار ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اور یہ بیعت ہمارے لئے حجت ہے۔ اور اگر قتل عثمان میں وہ شریک نہیں ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم معاویہ کے ہاں جاؤ اور بے سوچے سمجھے ان کے ساتھ جاؤ۔ بہتر ہے کہ کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کے بجائے تم علی کے پاس جاؤ اور ان کی بیعت کرو اور انہیں اپنے قوم و قبیلہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلاؤ مگر اس نے یہ مشورہ قابل قبول نہ سمجھا اور معاویہ کے ہاں جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

معاویہ نے عمرو کے مشورہ سے ایک داؤ یہ کھیلا کہ شرجیل کے راستے میں مختلف جگہوں پر یزید ابن اسد، بسر ابن ارطاۃ، سفیان ابن عمر، مخارق ابن حارث، حمزہ ابن مالک، حابس ابن سعد اور چند رؤسائے یمن کو کھڑا کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ جب شرجیل ادھر سے گزرے تو اپنی ملاقات کو اتفاقیہ ظاہر کر کے اسے یہ تاثر دیں کہ عثمان کے قتل کی ذمہ داری علی کے علاوہ کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اسے ہر منزل پر ان میں سے کوئی نہ کوئی آدمی ملتا اور باتوں باتوں میں اسے بتاتا کہ علی عثمان کے قتل میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ لوگ شرجیل کے نزدیک نہایت درجہ قابلِ اعتماد و وثوق تھے جو حمص سے لے کر دمشق تک برابر اس کے کان بھرتے چلے آئے جس کے بعد اسے علی کے قاتل عثمان ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ جب وہ حدودِ دمشق میں داخل ہوا تو معاویہ نے اکابر شام کو اس کی پیشوائی کے لئے کہا جنہوں نے آگے بڑھ کر اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور معاویہ کے حسب ہدایت اسے یہی تاثر دیا کہ قتل عثمان کی تمام تر ذمہ داری علی پر عاید ہوتی ہے۔ جب وہ استقبال کرنے والوں کے جھرمٹ میں معاویہ کے ہاں پہنچا تو معاویہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسمی گفتگو کے بعد کہا کہ علی مجھ سے بیعت کے طالب ہیں۔ مجھے ان کی بیعت سے انکار تو نہیں ہے مگر وہ عثمان کے قاتل ہیں۔ شرجیل نے کہا کہ پھر تمہاری کیا رائے ہے کہا کہ میری رائے وہی ہو سکتی ہے جو اہل شام کی رائے ہو۔ اگر وہ بیعت کے لئے کہیں گے تو بیعت کر لوں گا اور اگر بیعت سے روکیں گے تو رک جاؤں گا۔ اور تمہیں بلایا ہے تو اسی غرض سے بلایا ہے کہ تمہاری رائے دریافت کروں۔ کہا کہ مجھے تھوڑی سی مہلت دیجئے تاکہ میں یہاں گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لوں اور قاتلین عثمان کے سلسلہ میں مزید اطمینان کر لوں معاویہ نے کہا کہ یہ مناسب رائے ہے۔ چنانچہ

وہ نکل کھڑا ہوا۔ اور جس شخص سے بھی گفتگو کرتا وہ یہی کہتا کہ علی عثمان کے قاتل ہیں۔ اور اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت کون کرتا جب کہ زبانوں پر جبر و استبداد کا پہرہ بیٹھا ہوا تھا اور ہر طرف معاویہ کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔ جن کا کام ہی یہ تھا کہ انہیں ایک ایک بات کی خبر دیتے رہیں۔ جب شرجیل ہر سمت سے یہی ایک آواز سنتا ہوا واپس آیا تو اس کے جذبات پوری طرح سے بھڑک چکے تھے۔ اس نے آتے ہی معاویہ سے تند و تیز لہجہ کہا:۔

ابی الناس الا ان ابن ابی طالب قتل عثمان واللہ لئن بایعتہ لنخرجنک من الشام (اخبار الطوال صہ ۱۵۹)	کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہے کہ ابن ابی طالب نے عثمان کو قتل کیا ہے اگر تم نے ان کی بیعت کی تو ہم تمہیں شام سے نکال باہر کریں گے۔"

معاویہ نے جب دیکھا کہ شرجیل پر ان پر جادو چل گیا ہے اور اب اس کا یقین ڈانواں ڈول ہونے والا نہیں ہے تو اس کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہا کہ جب تمہاری یہ رائے ہے تو ہماری بھی یہی رائے ہے اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ عثمان بے گناہ مارے جائیں اور ہم ان کے قاتلوں کی بیعت کریں۔ ہمارا اولین فریضہ یہ ہے کہ ہم ان کے خون کا انتقام لیں۔ لیکن انتقام کے لئے ضروری ہے کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہو اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ عوام کو یہ بتایا جائے کہ علی، عثمان کے قاتل ہیں تاکہ ان کے تعاون سے خلیفہ مظلوم کے خون کا قصاص لیا جاسکے۔ اور یہ کام تم ہی انجام دے سکتے ہو۔ کیونکہ شام میں جتنا تمہیں اثر و نفوذ حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے ہر شخص تمہاری آواز پر لبیک کہے گا اور ایک دنیا سمٹ کر ہمارے گرد جمع ہو جائے گی۔ لہذا تم شام کے مختلف شہروں کا دورہ کرو۔ لوگوں کو بتاؤ کہ علی عثمان کے قاتل ہیں اور انہیں قصاص پر ابھارو۔ شرجیل کے جذبات مشتعل تو تھے ہی فوراً تیار ہو گیا اور معاویہ سے رخصت ہو کر عوام کو ہمنوا بنانے کے لئے چل دیا۔

جب اہل کوفہ کو یہ خبر ہوئی کہ معاویہ عوام کو غلط فہمی میں ڈال کر جنگ پر آمادہ کر رہے ہیں تو انہوں نے حضرت سے کہا کہ معاویہ کی جنگی تیاریوں کی تکمیل سے پہلے ہمیں شام پر حملہ کر دینا چاہیئے مگر حضرت نے فرمایا کہ جب تک جریر بیعت یا جنگ کا تصفیہ کر کے واپس نہیں آتا ہمیں حملہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

جریر کو شام میں آئے چار ماہ گزر چکے تھے اور امیر المومنین اسے بار بار لکھ رہے تھے کہ تم دو ٹوک فیصلہ کر کے جلد واپس آؤ۔ مگر معاویہ اسے حیلے بہانوں سے روکے رہے تاکہ اس عرصہ میں اہل شام کو جنگ پر آمادہ کر سکیں اور اپنی قوت و طاقت کا صحیح اندازہ لگا لیں۔ چنانچہ جب اُسے شرجیل کی حمایت حاصل ہو گئی

اور حالات سازگار نظر آئے تو جریر کو بلا کر کہا۔

الحق بصاحبك واعلمه انی و اهل الشام لا نجیبه الی البیعة۔	تم اپنے امیر کے پاس واپس جاؤ اور انہیں بتا دو کہ میں اور اہل شام ان کی بیعت نہیں کرینگے۔

(اخبار الطوال صفحہ ۱۶۱)

ادھر شرجیل نے شام میں گھوم پھر کر شہر شہر اور بستی بستی میں یہ اعلان کیا کہ علی نے عثمان کو قتل کیا ہے اور ان لوگوں کو جو قصاص کے لئے کھڑے ہوئے تھے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ان کا مال و اثاثہ چھین لیا ہے ان کی زمینوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب ایک شام ہی کا علاقہ ان کی دستبرد سے بچا ہوا ہے اور یہیں کے لوگ متفق ہو کر خون ناحق کا انتقام لے سکتے ہیں۔ لہذا ایک دل اور ایک جان ہو کر اٹھو اور خلیفۂ مظلوم کے انتقام اور اپنی سرزمین کے حفظ کے لئے امیر شام کے پرچم کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ شرجیل شام میں بااثر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی آواز پر مختلف شہروں کے لوگ سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ البتہ اسی کے شہر کے کچھ لوگوں نے مخالفت کی اور کہا کہ ہمیں اپنے گھروں اور مسجدوں سے مطلب ہے تم جانو اور تمہارا کام۔

اہل شام کے علاوہ بنی امیہ اور اُن کے ہمنوا بھی شام میں جمع ہو چکے تھے جن میں کے چند نمایاں افراد یہ تھے:۔ مغیرہ ابن شعبہ، عبداللہ ابن سعد، مروان ابن حکم، سعید ابن عاص، عبداللہ ابن عامر، ولید ابن عقبہ، عبیداللہ ابن عمر، سعید ابن عثمان، ابوہریرہ، ابو حذیفہ، ابوامامہ باہلی اور نعمان ابن بشیر۔ ان میں سب سے پہلے نعمان ابن بشیر آیا تھا اور اپنے ساتھ حضرت عثمان کا خون بھرا کرتہ اور ان کی زوجہ نائلہ بنت فرافصہ کی کٹی ہوئی انگلیاں بھی لایا تھا اور معاویہ نے اسی پیراہن اور کٹی ہوئی انگلیوں کو جامع دمشق کے منبر پر آویزاں کر کے لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا اور عثمان کی مظلومیت سے متاثر کیا تھا۔ اس جمعیت کے یکجا ہونے کے بعد جنگی سازوسامان کی تکمیل کی گئی اور یلغار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب امیرالمومنین کو سپاہ شام کے اس اقدام کا علم ہوا تو آپ نے اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے شام کی جانب لشکر کشی کا ارادہ کیا اور جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

ایها الناس سیروا الی اعداء السنن والقرآن سیروا الی قتلة المهاجرین والانصار سیروا الی الجفاة الطغام الذین کان	اے لوگو قرآن وسنت کے دشمنوں کی طرف چل دو مہاجرین وانصار کے قاتلوں کی طرف نکل کھڑے ہو ان درشت خو اور کمینہ فطرت لوگوں کی طرف جنہوں نے ڈر کے مارے بادل ناخواستہ اسلام قبول

اسلامھم خوفاً وکرھاً سیعدّا الی المولفۃ قلوبھم لیکفواعن المسلمین باسھم۔ (اخبار الطوال۔ ص۱۴۴)

کیا تھا اور جنہیں محض دلجوئی کے لئے مسلمانوں کی صف میں شامل کیا گیا تھا اٹھ کھڑے ہوتا کہ وہ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی سے باز آئیں۔"

قبیلۂ فزارہ کے ایک شخص اربد نامی نے یہ سنا تو اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمیں اپنے بھائی ہی کا خون بہانے کے لئے بصرہ لے گئے تھے اور ہم نے انہیں قتل کیا تھا اسی طرح اب شام پر چڑھائی کریں اور اپنے بھائیوں کے گلے پہ خنجر چلائیں۔ خدا کی قسم ہم اس کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ مالک اشتر سمجھ گئے کہ یہ معاویہ کا کارندہ ہے اور چاہتا ہے کہ اس طرح حضرت کے لشکر میں بددلی پیدا کرکے ان کی قوت و طاقت کو کمزور کرے۔ انہوں نے پکار کر کہا کہ اسے پکڑ لو مگر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ لوگوں نے اس کا پیچھا کیا اور محلہ کناسہ تک پہنچا تھا کہ اُسے پکڑ لیا اور اس طرح اسے پیروں تلے روندا کہ اس نے وہیں پر دم توڑ دیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ قاتل کا پتا نہیں چل سکتا لہٰذا اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے۔ امیر المومنین اس واقعہ سے کچھ متاثر تھے کہ مالک اشتر نے کہا یا امیر المومنین آپ اس خائن و بدبخت کی بات سے بددل نہ ہوں ہم آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں عزم و ہمت سے لڑیں گے اور آپ کی نصرت سے منہ نہیں موڑیں گے۔ ہمیں یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں جو موت سے ڈرتا ہے وہ موت سے بچ کر نہیں رہتا اور جو زندگی و بقا چاہتا ہے وہ اپنی آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی استقامت و نصرت کا عہد و پیمان کیا۔

جب کوفہ کے جنگ آزما آپ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے تو آپ نے عقبہ ابن عمرو انصاری کو اپنا نائب مقرر کیا اور نخیلہ کو چھاؤنی قرار دے کر مالک ابن حبیب یربوعی کو کوفہ میں قیام کا حکم دیا تاکہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کو لشکر گاہ کی طرف بھیجتے رہیں اور خود کوفہ سے نکل کر نخیلہ میں لشکر سمیت پڑاؤ ڈالا اور مختلف صوبوں کے عمال کو تحریر کیا کہ وہ افواج عساکر اور سامان حرب و ضرب کے ساتھ فوراً پہنچیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس بصرہ سے مخنف ابن سلیم اصفہان سے سعید ابن وہب ہمدان سے ربیع ابن خثیم اسدی رے سے اور دوسرے عمال اپنے اپنے شہروں سے سواروں اور پیادوں کے ساتھ پہنچ گئے اور اس طرح بڑھتے بڑھتے لشکر کی تعداد چوراسی ہزار تک پہنچ گئی جن میں اصحاب بدریین اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ کی بھی ایک جمعیت تھی۔ حاکم نے تحریر کیا ہے:-

شھد مع صفین ثمانون بدریاً وخمسون ومائتان ممن بایع

جنگ صفین میں حضرت علی کے ہمراہ اسّی بدر کے مجاہدین اور دو سو پچاس بیعت رضوان میں شریک

تحت الشجرۃ (مستدرک۔ ج ۲۔ ص ۱۰۴) ہونے والے صحابہ تھے۔"

وادیٔ نخیلہ فوجوں سے چھلک رہی تھی اور امیر المومنین اس عظیم لشکر کی تنظیم و ترتیب میں مصروف تھے کہ ایک عامل کے ذریعہ سے یہ اطلاع پہنچی کہ شامی فوجوں نے عراقی سرحدوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ حضرت نے آٹھ ہزار کا ایک ہراول دستہ زیاد ابن نضر حارثی کی زیر سرکردگی اور چار ہزار کا ایک دستہ شریح ابن حارث کی زیر قیادت سرحدوں کی حفاظت اور فوج مخالف کی قوت و طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے روانہ کیا اور انہیں یہ ہدایت فرمائی کہ جب تک میرا حکم نہ پہنچے یا دشمن ابتدا نہ کرے تم جنگ نہ کرنا۔ امیر المومنین نے نظم و انضباط کے پیش نظر لشکر کو سات حصوں پر تقسیم کیا اور ہر حصہ پر ایک افسر مقرر کر دیا اور ہراول دستہ کی روانگی کے چوتھے دن ۵ شوال ۳۶ھ کو اس لشکر جرار کی قیادت کرتے نخیلہ سے روانہ ہو گئے۔ جب نہر فرات کو عبور کر کے حدود کوفہ سے باہر تشریف فرما ہوئے تو نماز ظہر کا اعلان کیا۔ اور فرمایا کہ جو لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو رخصت کرنے کے لئے آئے ہیں وہ پوری نماز پڑھیں اور جو ساتھ جانے کے ارادہ سے آئے ہیں وہ نماز قصر پڑھیں اور حضرت نے بھی نماز قصر ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر آگے بڑھے اور کوفہ سے چھ میل کے فاصلہ پر دیر ابوموسیٰ میں پہنچ کر عصر کی نماز پڑھی اور یہاں سے روانہ ہو کر کوفہ و حلہ کے درمیان مقام برس میں مغرب کی نماز ادا کی اور رات وہیں گزاری اور نماز صبح کے بعد نہر قبین کو پار کر کے مقام ببعہ میں قیام فرمایا تاکہ لوگ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ جب یہاں سے روانہ ہو کر سرزمین بابل پر قدم رکھا تو شہر کے کھنڈر دیکھ کر اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دو اور انہیں تیز چلاؤ تاکہ اس نامبارک سرزمین سے جلد نکل جائیں کیونکہ یہ شہر مورد عتاب رہا ہے۔ اور کئی بار زمین میں دھنس چکا ہے۔ چنانچہ آپ نے باگیں ڈھیلی چھوڑ کر مہمیز لگائی اور دوسرے لوگوں نے بھی گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور نہر صراۃ کو کشتیوں کے پل کے ذریعہ عبور کیا اور نہر کی دوسری سمت اتر کر نماز عصر باجماعت ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر سوار ہوئے اور دیر کعب سے ہوتے ہوئے سرزمین کربلا پر وارد ہوئے۔ اس زمین کو دیکھ کر چہرے پر غم و حزن کے آثار نمایاں ہوئے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کچھ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو حادثۂ فاجعہ کربلا کی خبر دی اور ان جگہوں کی نشاندہی کی جو سید الشہداء امام حسین اور ان کے اعزہ و انصار کے خون سے رنگین ہونے والی تھیں۔ یہاں سے روانہ ہو کر ساباط میں منزل کی اور رات کو وہیں پر قیام فرمایا۔ اہل ساباط نے فوج کے لئے رسد اور چوپایوں کے لئے چارہ کی پیش کش کی۔ مگر حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تم لوگوں پر یہ بار نہیں ڈالا جا سکتا۔ ساباط کے قریب دجلہ کے کنارے شہر مدائن تھا۔ مدائن کے لوگ ابھی تک حضرت کے لشکر میں شامل نہ ہوئے تھے آپ

نے حارث ابن عبداللہ اعور کو حکم دیا کہ وہ مدائن والوں سے کہیں کہ ان میں کے جوانمرد و جنگجو افراد نماز عصر میں شریک ہوں۔ جب وہ لوگ آئے تو فرمایا کہ مجھے تعجب ہے کہ تم ہمارے لشکر سے علیحدگی اختیار کئے ہو۔ حالانکہ دشمن کی فوجیں ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم آپ کے حکم کے منتظر تھے ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے۔ آپ نے عدی ابن حاتم اور ان کے فرزند زید کو مامور فرمایا کہ وہ مدائن سے لشکر کی فراہمی کریں۔ عدی نے تین دن کے قیام میں آٹھ سو اور زید ابن عدی نے چار سو افراد جمع کئے اور انہیں لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ امیرالمومنین نے مدائن سے تین ہزار کا ایک لشکر معقل ابن قیس کی ماتحتی میں آگے روانہ کیا اور ان سے کہا کہ میں رقہ جا رہا ہوں تم موصل (جو اس وقت صرف قافلوں کی فرودگاہ تھا) اور نصیبین سے ہوتے ہوئے میرے پاس رقہ پہنچ جاؤ۔ امیرالمومنین مدائن سے روانہ ہو کر بہرسیر میں قیام فرما ہوئے۔ یہ جگہ شاہان عجم کی سیرگاہ تھی جہاں کبھی سایہ دار درختوں دلکش باغوں اور بلند و بالا عمارتوں کی بہتات تھی مگر دستبرد زمانہ سے باغات اجڑ چکے تھے اور عمارتوں کی جگہ خاک کے تودے باقی رہ گئے تھے۔ حریز ابن سہم نے ان کھنڈروں اور اجڑے باغوں کو دیکھا تو ابن یعقوب تمیمی کا یہ شعر پڑھا:۔

جرت الریاح علی مکان دیارھم فکانما کانوا علی میعاد

"جہاں ان کے گھربار تھے وہاں چوبائی ہوائیں چل رہی ہیں گویا وہ ایک معینہ مدت کے لئے آباد کئے گئے تھے۔"

حضرت نے یہ شعر سنا تو فرمایا کہ اس کے بجائے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھو:۔

کم ترکوا من جنات و عیون و زروع و مقام کریم و نعمة کانوا فیها فاکهین و اورثناها قوما اخرین فما بکت علیهم السماء والارض وما کانوا منظرین۔"

وہ لوگ کتنے باغات چشمے کھیت عمدہ مکان اور نعمتوں کا ساز و سامان جن میں خوش خوش گزر بسر کرتے تھے چھوڑ گئے۔ ایسا ہی ہے اور ہم نے ان تمام چیزوں کا دوسروں کو مالک بنا دیا ان لوگوں پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔"

بہرسیر سے روانہ ہو کر انبار میں منزل کی یہاں کے عجمی باشندوں بنی خوشنوشک نے حضرت کو لشکر کے ہمراہ دیکھا تو اچھلنے کودنے اور دوڑنے لگے۔ حضرت نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں حکمرانوں کی تعظیم و تکریم کے اظہار کا یہی طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اس سے نہ تمہارے حکمرانوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ تمہیں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بے نتیجہ مشقت کو ختم کرو۔ اس رسمی استقبال کے بعد انہوں نے

گھوڑے خچر اور چارہ کی پیش کش کی اور فوج کے کھانے کا انتظام کرنا چاہا مگر حضرت نے ان کے ہاں کا کھانا منظور نہ کیا۔ البتہ گھوڑوں اور خچروں کو اس شرط پر قبول کر لیا کہ انہیں خراج میں محسوب کر لیا جائے گا۔ انبار میں دو دن قیام کرنے کے بعد ہیت کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں سے چل کر اقطار میں قیام فرمایا اور پھر دریائے فرات عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہوئے۔ یہاں نمر ابن قاسط نے قبیلۂ بنی تغلب کے ساتھ پر جوش استقبال کیا۔ جب یہاں سے آگے بڑھے اور قرقیسا کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ زیاد ابن نضر اور شریح ابن ہانی جنہیں آپ نے نخیلہ سے بطور ہراول دستہ بھیجا تھا اپنے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اچھا ہراول دستہ ہے جو آگے بڑھنے کے بجائے ہمارے عقب سے آرہا ہے۔ زیادہ اور شریح نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نخیلہ سے روانہ ہوئے تو دریائے فرات کے کنارے کنارے عانات پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ آپ دریا عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہو چکے ہیں ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ اگر معاویہ کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی تو ہمارا مختصر سا فوجی دستہ اس کے لشکر گراں کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور دریا کے حائل ہونے کی وجہ سے آپ کی طرف سے بروقت کمک پہنچنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ہم نے چاہا کہ عانات سے دریا عبور کر کے پار اتر جائیں مگر اہلِ عانات نے ہمیں دیکھ کر کشتیوں کا پل اتار دیا اور قلعہ بند ہو کر محفوظ و مطمئن ہو گئے۔ ہمیں مجبوراً پیچھے پلٹنا پڑا اور مقام ہیت سے دریا عبور کر کے ادھر نکل آئے ہیں۔ حضرت نے ان کے عذر کو صحیح سمجھا اور انہیں ساتھ لے کر آگے روانہ ہو گئے۔ جب شہر رقہ کے قریب پہنچے تو نہر بلیخ کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ معقل ابن قیس جنہیں امیرالمومنین نے تین ہزار کے لشکر کے ساتھ مدائن سے نصیبین کے راستے روانہ کیا تھا وہ بھی رقہ پہنچ گئے۔ رقہ دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر واقع تھا اور لشکر کو دریا عبور کر کے غربی کنارے پر اُترنا تھا مگر رقہ کی آبادی عثمانیوں پر مشتمل تھی اور سماک ابن مخرمہ اسدی جو اپنے قبیلہ کے آٹھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں مقیم تھا اہل رقہ کی طرح اہل شام کا ہم مسلک تھا۔ یہ لوگ معاویہ کے ہاں جانے کے لئے کوفہ سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور اُن سے ساز باز کر کے حضرت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دریا پر سے پل اُتار دیا اور گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ امیرالمومنین نے ان کی اس حرکت کے باوجود اُن سے الجھنا گوارا نہ کیا اور لشکر کو لے کر دریا کے کنارے کنارے آگے چل دیئے تاکہ مقام منبج پر پہنچ کر وہاں سے پل کے ذریعہ دریا پار کریں۔ مالک اشتر کو اسدیوں کی یہ معاندانہ روش نہایت ناگوار گزری۔ جب امیرالمومنین آگے نکل گئے تو انہوں نے اسدیوں کو للکارا اور انہیں ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ اگر تم کشتیوں کو جوڑ کر پل نہ باندھا تو میں پوری بستی کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔ اور تم میں سے کوئی بھی اپنی جان کو بچا کر نہ لے جا سکے گا۔ مالک

گر یہ ڈھنگ کارگر ثابت ہوئی اور وہ ڈرے سہمے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے اور کشتیوں کو جوڑ کر پل باندھنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ حضرت لشکر سمیت واپس پلٹے اور دریا عبور کر کے غربی کنارے پر اُتر گئے۔

امیرالمومنین نے یہاں سے پھر زیاد ابن نضر اور شریح ابن ہانی کو بطور ہراول شام کی جانب روانہ کیا تاکہ پیش آمدہ حالات سے حضرت کو آگاہ کرتے رہیں۔ جب یہ دونوں منزلیں طے کرتے ہوئے سور روم کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ابوالاعور سلمی پچیس ہزار شامیوں کے ساتھ چھاؤنی ڈالے پڑا ہے ان دونوں نے فوراً حارث ابن جمہان کو ایک خط دے کر حضرت کی خدمت میں بھیجا اور انہیں اطلاع دی کہ ابوالاعور سور روم کے قریب ایک لشکر گراں کے ساتھ فروکش ہے۔ حضرت نے صورت حال پر مطلع ہونے کے بعد مالک اشتر کو تین ہزار کے لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا اور اُن سے فرمایا کہ تم وہاں پہنچ کر لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لینا اور جب تک دشمن پہل نہ کرے تم ابتداء نہ کرنا اور اُن پر حجت تمام کرنے سے پہلے ہاتھ نہ اٹھانا اور جنگ چھڑ جائے تو تم قلب لشکر میں اپنی جگہ بنانا اور میمنہ زیاد کے اور میسرہ شریح کے سپرد کرنا۔ اور دشمن سے اتنا قریب نہ ہونا کہ وہ سمجھے کہ تم جنگ چھیڑنا چاہتے ہو اور نہ اتنا دور رہنا کہ وہ خیال کرے کہ تم جنگ سے خائف و ترساں ہو اور میں بھی بقیہ لشکر کو لے کر تمہارے عقب میں آیا چاہتا ہوں۔

مالک فوراً روانہ ہو گئے اور زیاد اور شریح کے لشکر کو ساتھ ملا کر سپاہِ شام سے کچھ فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اگرچہ دونوں لشکر آمنے سامنے تھے مگر مالک اور اُن کے ہمراہیوں نے امیرالمومنین کی ہدایت کو پیش نظر رکھا اور جنگجویانہ انداز اختیار نہ کیا۔ ابوالاعور نے بھی کچھ ایسا ہی تاثر دیا کہ وہ جنگ چھیڑنا نہیں چاہتا۔ جب دن گزرا اور رات ہوئی تو مالک اور ان کا لشکر دشمن کی طرف سے مطمئن ہو کر سونے کی تیاری کرنے لگا ابھی ایک آدھ جھپکی لی ہو گی کہ ابوالاعور نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر شبخون مارا۔ مالک اور ان کے ہمراہی کھڑ بڑا کر اٹھے تلواروں کے قبضے پر ہاتھ ڈالا اور جوابی حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

دشمن کی طرف سے پہل تو ہو ہی چکی تھی۔ صبح ہوتے ہی مالک اشتر اور ہاشم ابن عتبہ مرقال سواروں اور پیادوں کو لے کر میدان میں نکل آئے۔ ادھر سے ابوالاعور بھی سوار اور پیادے لے کر مقابلہ پر آ گیا جنگ چھڑ گئی اور سواروں نے سواروں پر اور پیادوں نے پیادوں پر حملہ کر دیا۔ کچھ دیر تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے آخر شامیوں کا مشہور شہسوار عبداللہ ابن منذر تنوخی اپنے چند سواروں سمیت مارا گیا اور ابوالاعور ہزیمت اٹھا کر پیچھے ہٹا اور ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ مالک نے چاہا کہ ابوالاعور سے دو دو ہاتھ کر لیں اور اسے اصول جنگ کی خلاف ورزی کا مزہ چکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قبیلے کے ایک نوجوان

سنان ابن مالک نخعی سے کہا کہ تم ابوالاعور کے پاس جاؤ اور اسے مقابلہ میں آنے کی دعوت دو۔ سنان نے کہا کہ اپنے مقابلہ کے لئے یا آپ کے مقابلہ کے لئے؟ مالک نے اُسے حیرت و استعجاب سے دیکھا اور کہا کہ اگر میں تمہیں اس کے مقابلہ کے لئے کہوں تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں، تو میں صفوں کو چیر کر اور تلواروں کے حصار کو توڑ کر اس پر ٹوٹ پڑوں اور اُسے تہ تیغ کئے بغیر دم نہ لوں۔ مالک مسکرائے اور اس کی ہمت و جرأت کی تعریف کی اور کہا کہ تم اگرچہ عزت و شرف کے لحاظ سے کم نہیں ہو مگر ابھی نوجوان ہو اور وُہ کسی نوجوان کے مقابلہ میں آنا اپنی توہین سمجھے گا۔ تم میری طرف سے اسے مقابلہ کی دعوت دو۔ سنان اٹھ کھڑا ہوا اور شامیوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر کہا کہ میں پیغامبر ہوں مجھے امان دی جائے۔ شامیوں نے اسے امان دی اور وہ ابوالاعور کے پاس آیا اور مالک کا پیغام دیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہا پھر کہا کہ مالک وہی تو ہیں جنہوں نے عثمان کے گھر پر حملہ کیا اور اُن کے قتل میں شریک ہوئے۔ وہ فتنہ انگیز ہیں اور یہ تمام فتنے انہی کے جگائے ہوئے ہیں۔ سنان نے کہا کہ پھر اس کا جواب بھی سن لو کہا کہ میں تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں اور نہ تمہارے لائے ہوئے پیغام کا کوئی جواب دوں گا۔ اس پر سنان نے کچھ کہنا چاہا تو شامی اس پر برس پڑے اور اسے وہاں سے باہر دھکیل دیا۔ مالک کی اس دعوت مبارزت سے ابوالاعور کے دل پر ایسا خوف بیٹھا کہ اسے ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور جب رات کا اندھیرا پھیلا تو لشکر سمیت میدان چھوڑ کر چلا گیا اور مقام افیح میں جہاں معاویہ اور اُن کا لشکر خیمہ زن تھا پہنچ گیا۔

معاویہ نے جب عراقی فوجوں کی آمد اور جھڑپوں کا حال سنا تو ابوالاعور اور سفیان ابن عمر سے کہا کہ تم دونوں آگے بڑھ کر جنگ کا کوئی میدان تلاش کرو اور مجھے فوراً اطلاع دو۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور فرات کی غربی سمت رقہ اور بالس کے درمیان مقام صفین کا انتخاب کیا اور جنگ کے لئے ایک مناسب جگہ منتخب کر کے پڑاؤ ڈال دیا۔ معاویہ بھی ان کے عقب میں لشکر کی کمان کرتے ہوئے پہنچ گئے اور آتے ہی ابوالاعور کو حکم دیا کہ:۔

ان یقف فی عشرۃ آلاف من	وہ دس ہزار شامیوں کو لے کر گھاٹ کے راستے پر
اھل الشام علی طریق الشریعۃ	کھڑا ہو جائے اور عراقیوں میں سے جو پانی لینے
فیمنع من اراد السلوک الی الماء	کے لئے آئے اسے روک دے۔"
من اھل العراق۔ (اخبار الطوال)	

مالک اشتر بھی فوج کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور جب صفین میں پہنچے تو شامیوں کی

انبوہ در انبوہ فوجوں کو دیکھ کر ٹھٹکے اور ان سے تھوڑے فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ دوسرے دن امیرالمومنین بھی افواج وعساکر کے ساتھ پہنچ گئے۔ آپ نے دیکھا کہ شامیوں نے ایک ہموار میدان میں پڑاؤ ڈال کر گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس پر کڑا پہرہ بٹھا دیا ہے اور عراقیوں میں سے کوئی پانی لینے کے لئے جاتا ہے تو اسے سختی سے روک دیا جاتا ہے۔ آپ نے اس پر الجھنے کے بجائے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ کوئی دوسرا گھاٹ تلاش کریں مگر تگ و دو کے باوجود آس پاس کوئی گھاٹ نظر نہ آیا۔ اگر تھا تو وہاں تک پہنچنا انتہائی دشوار تھا کیونکہ فرات کے کنارے کنارے دھسان اور دلدل تھی جس میں گھنی اور خاردار جھاڑیوں کا پھیلاؤ چھ سات میل تک چلا گیا تھا۔ جہاں ایک طرف زمین میں پیر دھنس جاتے تھے اور دوسری طرف جھاڑیوں کے اندر کوئی پگڈنڈی یا راستہ نہ تھا کہ اسے طے کر کے دوسرے گھاٹ تک پہنچا جا سکے جب پانی کے حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نظر نہ آیا تو حضرت نے صعصعہ ابن صوحان کے ہاتھ معاویہ کو پیغام بھیجا کہ ہم حجت تمام کرنے سے پہلے جنگ کرنا پسند نہیں کرتے تم سواروں اور پیادوں کو لے کر جنگ کیلئے نکل کھڑے ہوئے ہو اور گھاٹ پر قبضہ کر کے ہمیں پانی سے روک دیا ہے بہتر ہے کہ تم پانی پر سے پہرا اٹھا لو اور جو چیز ہم میں وجہ نزاع ہے اس پر بات چیت کرو اگر تم یہ چاہتے ہو کہ مصالحت کی گفتگو چھوڑ کر پانی پر جنگ کی جائے تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں مگر یاد رکھو کہ پھر جو غالب ہو گا وہی پانی پی سکے گا۔ معاویہ نے یہ پیغام سنا تو مشورہ لینے کے لئے اپنے مشیروں کو جمع کیا۔ ولید ابن عقبہ نے کہا:۔

امنعھم الماء کما منعوہ امیر المومنین عثمان اقتلھم عطشا قتلھم اللہ۔ (اخبار الطوال صفحہ ۱۶۸)

ان پر پانی بند رہنے دو اور انہیں پیاسا مارو خدا انہیں مارے آخر انہوں نے امیرالمومنین عثمان کے ساتھ بھی تو یہی برتاؤ کیا تھا۔"

عبداللہ ابن ابی سرح نے کہا:۔

امنعھم الماء الی اللیل فانھم ان لم یقدروا علیہ رجعوا وکان رجوعھم ھزیمۃ امنعھم الماء منعھم اللہ ایاہ یوم القیامہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۴۵)

رات تک ان پر پانی بند رہنے دو۔ جب یہ پانی کے حاصل کرنے میں ناکام ہو جائیں گے تو واپس پلٹ جائیں گے اور یہ پلٹنا ان کی شکست و ہزیمت ہو گا ان پر پانی بند کر دو۔ خدا انہیں قیامت کے دن پیاسا رکھے۔"

اس پر صعصعہ ابن صوحان نے بگڑ کر کہا:۔

انما یمنعہ اللہ الفجرۃ وشربۃ

خداوند عالم تو فاجروں اور شراب خواروں کو سیرابی

الخمر لعنك اللہ ولعن ھذا الفاسق۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۴۵) — سے محروم کرے گا تجھ پر خدا کی پھٹکار اور اس فاسق (ولید) پر بھی خدا کی لعنت"

عمرو ابن عاص نے کہا کہ اے معاویہ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ علی اور ان کے ہمراہی جب کہ ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں اور لچکتے ہوئے نیزے ہیں کبھی پیاسے نہیں رہیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ تم انہیں پانی سے نہ روکو اور خود سے پہرا اٹھا لو ورنہ وہ تمہیں پہرا اٹھا لینے پر مجبور کر دیں گے۔ معاویہ نے کہا:۔

لا واللہ او یموتوا عطشا کما مات عثمان۔ (مروج الذہب ج ۲ ص ۳۸۶) — خدا کی قسم انہیں پانی نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ پیاسے مرجائیں گے جس طرح عثمان پیاسے سدھارے تھے"

بندش آب کا فیصلہ اگرچہ اہل شام کے لئے بڑا خوش آئند تھا کیونکہ سیر و سیراب فوج کی نسبت پیاسی فوج کو شکست دینا آسان ہوتا ہے مگر اخلاقی اعتبار سے یہ حرکت اتنی غیر انسانی اور وحشیانہ تھی کہ خود سپاہ شام کے چند آدمیوں نے اس کی برملا مذمت کی۔ چنانچہ لشکر شام میں سے ایک شخص معری ابن اقبل ہمدانی نے اس اقدام پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے معاویہ سے کہا کہ اے امیر ہم نے پیش قدمی کرکے گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے اگر وہ ہم سے پہلے پہنچ جاتے اور دریا پر قابض ہو جاتے تو کبھی ہمیں پانی سے منع نہ کرتے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے لشکر میں غلام مزدور سن رسیدہ ضعیف و کمزور اور بیگناہ افراد بھی ہیں ان پر پانی بند کرنا سراسر ظلم و زیادتی ہے لہذا اپنا فیصلہ واپس لیجیے اور انہیں پانی لینے کی اجازت دیجیے۔ معاویہ نے یہ الفاظ سنے تو اسے سختی سے جھڑکا اور عمرو ابن عاص نے بھی اسے سخت سست کہا۔ اس مرد ہمدانی نے ان کا یہ طرز عمل دیکھا تو رات کے اندھیرے میں نکل کھڑا ہوا اور حضرت کی فوج میں آکر شامل ہو گیا۔ اور اپنے جذبات کا اظہار ان اشعار میں کیا:۔

الا للہ درک یا بن ھند — لقد ذھب الحیاء فلا حیاء

"اے ہند کے بیٹے تمہاری خوبیوں کا کیا کہنا جب شرم و حیا جاتی رہے تو پھر حیا کہاں"

اتحمون الفرات علی رجال — وفی ایدیھم الاسل الظماء

"کیا ان جوانمردوں کو فرات سے روکنا چاہتے ہو جن کے ہاتھوں میں لچکتے ہوئے پیاسے نیزے ہیں"

وفی الاعناق اسیاف حداد — کان القوم عندکم نساء

"اور ان کی گردنوں میں تیز دھار تلواریں لٹک رہی ہیں تم نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ مرد

نہیں عورتیں ہیں۔"

فتزجوا ان یجاور کم علی   بلا ماء و للاحزاب ماء

"کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ علی تمہارے قرب میں پیاسے رہیں گے اور دوسرے لوگ پانی پئیں گے۔"

فرات شامیوں کے قبضہ میں تھا اور عراقی دور سے فرات کی روانیوں کو دیکھ کر کلیجہ مسوس کر رہ جاتے تھے۔ اُدھر غرور و انانیت سے گردنیں اکڑی ہوئی اور سینے تنے ہوئے تھے اور ادھر جذبۂ امن پسندی جوشِ شجاعت کو روکے ہوئے تھا۔ آخر جب ایک شبانہ روز پانی نہ ملا تو سپاہِ عراق کے تیور بدلے اور دشمن کی اس کمینہ حرکت پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم کب تک شامیوں کو سیراب ہوتے دیکھیں گے اور خود پانی کے لئے تڑپتے رہیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ اب پانی کے لئے جنگ ناگزیر ہے لہٰذا اٹھو اور تلوار کے زور سے پانی حاصل کرو۔ جب حضرت کی طرف سے اجازت مل گئی تو مالک اشترؔ اور اشعث ابن قیس نے لشکر میں اعلان کیا کہ گھاٹ پر سے دشمن کو ہٹانے کے لئے تیار ہو جاؤ اس آواز پر بارہ ہزار سپاہی جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور کندھوں پر کمانیں تھیں آگے بڑھے۔ مالک اشترؔ نے علم جنگ حارث ابن ہمام نخعی کے سپرد کیا اور اشعث نے لوائے جنگ معاویہ ابن حارث کو دیا اور دونوں سپہ سالار اپنے اپنے دستوں کی قیادت کرتے اور گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے شامیوں کی صفوں کے قریب پہنچ گئے اور انہیں گھاٹ پر سے پہرا اٹھانے کے لئے کہا انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک گھاٹ نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک تمہارے خون سے اپنی تلواروں کی پیاس نہ بجھا لیں گے۔ ادھر بھی تھڑدلے اور جنگ سے جی چرانے والے نہ تھے کہ اہلِ شام کی خون آشام تلواروں سے مرعوب ہو جاتے۔ مالک للکارتے ہوئے بے دھڑک آگے بڑھے۔ شامیوں نے ہتھیار سنبھالے نیزے تانے اور راستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان میں کا ایک سوار صالح ابن فیروز مقابلہ کے لئے بڑھا مالک نے اس کے سینہ پر نیزہ مارا اور اسے وہیں پر ٹھنڈا کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے مالک ابن ادہم، ریاح ابن عتیک، ابراہیم ابن وضاح جمحی، زامل ابن عبید خزاعی اجلح ابن منصور کندی اور محمد ابن روضہ جمحی مقابلہ کے لئے نکلے اور مالک نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان مقتولین کے بعد جب کسی اور کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی تو مالک اپنے ہمراہیوں کو لے کر دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور لشکر کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا ادھر سے بھی کمانیں کڑکیں اور تیر رہا ہوئے مگر دلیروں کے قدم نہ رکے اور تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ جب شامیوں کے سروں پر تلواریں برسنے لگیں تو اُن کے پاؤں اکھڑ گئے اور پناہ لینے کے لئے ادھر اُدھر دوڑ پڑے۔ راستہ صاف ہو

گیا اور عراقیوں نے آگے بڑھ کر گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔

جب گھاٹ امیرالمومنین کی فوجوں کے قبضہ میں آ گیا تو معاویہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ ہو جو سلوک انہوں نے عراقیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ عمرو ابن عاص نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے کیا علی تم پر اور تمہاری فوج پر پانی بند نہ کر دیں گے اور جس طرح انہوں نے لڑ کر فرات لے لیا ہے تم بھی اسی طرح لڑ کر لے سکو گے۔ معاویہ نے بگڑ کر کہا کہ یہ وقت ان طنز آمیز باتوں کا نہیں ہے تم سنجیدگی سے بتاؤ کہ کیا علی بھی ہم سے وہی سلوک کریں گے جو ہم نے کیا تھا یا ہمیں پانی لینے کی اجازت دیں گے۔ عمرو نے کہا:۔

ظنی انه لا یستحل منك ما استحللت منه لانه اتاك فی غیر امر الماء۔

(اخبار الطوال۔ صـ۱۶۹)

میرا خیال غالب یہ ہے کہ جس چیز کو تم نے ان کے لئے روا رکھا تھا وہ تمہارے لئے اُسے روا نہیں رکھیں گے اس لئے کہ اُن کے آنے کا مقصد پانی نہیں ہے کچھ اور ہے۔"

عراقیوں کے دلوں میں معاویہ کی طرف سے غم و غصّہ تو تھا ہی انہوں نے دریا پر قبضہ کرتے ہی کہہ دیا کہ ہم کسی شامی کو پانی لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اور جس طرح انہوں نے گھاٹ پر قبضہ کر کے ہمیں پانی سے روکا تھا اسی طرح ہم بھی انہیں پانی لینے سے روک دیں گے۔ امیرالمومنین کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو فرمایا کہ اگر اہل شام نے جاہلانہ قدم اٹھایا تھا تو تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ دینی و اخلاقی قدروں کو کچل کر پانی بند کر دو اور اسی وقت معاویہ کو پیغام بھجوایا کہ اگرچہ فرات پر ہمارا قبضہ ہے مگر تم اور تمہاری فوج جب چاہے اور جتنا چاہے پانی لے سکتی ہے ہماری طرف سے کوئی بندش نہیں ہے۔ اس عمومی اجازت کے بعد شامی بغیر روک ٹوک کے گھاٹ پر آتے خود سیراب ہوتے جانوروں کو سیراب کرتے اور حسب ضرورت پانی لے جاتے۔

امیرالمومنین کے لشکر نے دریا کے قریب پڑاؤ ڈال دیا اور دلجمعی سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس اثناء میں ایک سنسناتا ہوا تیر آیا جس پر تحریر تھا کہ میں تمہارا ہمدرد و خیر خواہ ہوں اور اس خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ معاویہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دریا کا بند توڑ کر پانی کا رخ تمہاری طرف موڑ دے تاکہ تم سب کو بہا لے جائے۔ یہ تیر کوفہ کے ایک شخص کے ہاتھ جا لگا اس نے یہ تحریر پڑھی تو تیر دوسرے کے حوالے کر دیا۔ دوسرے نے تیسرے کو دیا اور یونہی دست بدست گردش کرتا ہوا امیرالمومنین تک پہنچ گیا۔ حضرت فوراً سمجھ گئے کہ یہ معاویہ کی سجھائی ہوئی چال ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ عراقی ڈر

کے مارے یہ جگہ خالی کر دیں اور شامی فوجیں اس مقام پر آجائیں۔ مگر عراقیوں میں کھلبلی مچ گئی لوگ پریشان وسراسیمہ ہوگئے اور اپنا اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ تمہیں اس جگہ سے ہٹانے کا پُرفریب حیلہ ہے تم اپنی جگہ نہ چھوڑو اور سکون و اطمینان سے بیٹھے رہو۔ کچھ لوگ مطمئن ہوگئے اور کچھ لوگ چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ معاویہ کا عملہ بیلچے اور پھاوڑے لے کر پہنچ گیا ہے۔ اور انہوں نے بند کاٹنا شروع کر دیا ہے۔ اگر ہم نے نقل مکانی میں تاخیر کی تو سب کے سب بہہ جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم اطمینان رکھو معاویہ کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ وہ دریا کا رُخ تمہاری طرف موڑ دے۔ مگر فوج میں کم حوصلہ و ہمت لوگ بھی تھے وہ پیچھے ہٹے تو ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی جگہ چھوڑ دی اور حضرت کے سمجھانے بجھانے کے باوجود میدان خالی کر کے پیچھے ہٹ آئے۔ معاویہ نے میدان خالی دیکھا تو شامیوں کو لے کر اس مقام پر آگئے۔ جب عراقیوں نے سپاہِ شام کو اس جگہ پر آتے دیکھا تو جنہوں نے معاویہ کے دھوکے کو نہ سمجھا تھا وہ بھی سمجھ گئے کہ یہ جگہ خالی کرانے کا ایک حیلہ تھا۔ اب انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے جگہ چھوڑ کر غلط قدم اٹھایا ہے اور وہی لوگ جو جگہ چھوڑنے پر اصرار کر رہے تھے، نادم و پشیمان ہو کر حضرت کے پاس آئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے جس بے تدبیری کا مظاہرہ کیا ہے اس کا تدارک کریں گے اور جس طرح بن پڑے گا شامیوں کو ہٹا کر اس جگہ کو واپس لیں گے۔ چنانچہ اشعث ابن قیس بنی کندہ کے پیادوں اور مالک اشتر سواروں کو لے کر شامیوں پر حملہ آور ہوئے اور انہیں بزور شمشیر خیمہ و خرگاہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا اور پھر واپس اپنے مقام پر آگئے۔

فرات کی مہم سر ہو چکی۔ اہلِ عراق کو دریا پر قبضہ کئے دو دن گزر گئے مگر ان دونوں میں نہ کوئی گفت و شنید ہوئی اور نہ نامہ و پیام کی نوبت آئی۔ عراقی اپنی فتح یابی پر خوش اور دشمن سے بھڑنے کے لئے بے چین تھے مگر امیرالمومنین کی خاموشی انہیں الجھن میں ڈالے ہوئے تھی اور وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ کیا امیرالمومنین جنگ سے بچنا چاہتے ہیں یا ان لوگوں سے جنگ کے جواز میں انہیں شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اس کی وجہ نہ جنگ سے جی چرانا ہے اور نہ اس کے جواز میں کوئی شک و شبہ ہے۔ بلکہ اس ڈھیل دینے کا مقصد یہ ہے کہ شاید اس وقفہ میں کوئی ضلالت و گمراہی کی تاریکی سے نکل کر رشد و ہدایت کی روشنی میں آجائے۔ یا کم از کم ہماری طرف سے ان پر حجت تمام ہو جائے۔ آخر اس توقف کے بعد یکم ذی الحجہ ۳۶ھ کو اتمام حجت کے لئے بشیر ابن عمرو انصاری، سعید ابن قیس ہمدانی اور شبث ابن ربعی تمیمی کو بلا کر کہا کہ تم معاویہ کے پاس جاؤ اور اسے سمجھاؤ کہ وہ اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ نہ کرے افتراق و انتشار سے باز آئے اور میری خلافت کو تسلیم کر کے بیعت کرے۔ بشیر ابن عمرو نے کہا کہ ہمیں توقع

نہیں ہے کہ وہ ہماری بات پر کان دھرے اور بیعت پر آمادہ ہو جائے۔ فرمایا کہ تم جاؤ اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور معاویہ کے ہاں پہنچے۔ بشیر ابن عمرو نے گفتگو کا آغاز کیا اور معاویہ سے مخاطب ہو کر کہا "اے فرزندِ ابوسفیان اس دنیا نے ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ اور تمہارا بھی ہمیشہ ساتھ نہیں دے گی۔ تمہیں ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں تمہارے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور پھر جیسے اچھے بُرے اعمال ہوں گے ویسا بدلہ ملے گا۔ میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم فتنہ و شر سے باز آؤ اور اپنے منفی طرزِ عمل سے امت میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔" معاویہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ تم یہ نصیحت علی کو کیوں نہیں کرتے۔ بشیر نے کہا کہ وہ کہاں اور تم کہاں، وہ سابق الاسلام پیغمبر کے قریبی عزیز اور عظمت و فضیلت کے تاجدار ہیں نہ اُن کا کوئی ہم پایہ ہے اور نہ ان سے زیادہ کوئی خلافت کا اہل ہے۔ معاویہ نے کہا کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ کہا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم حق کو پہچانو اس کا ساتھ دو اور اُس سے منہ نہ موڑو اس طرح تم دنیا میں بھی سرخرو ہو گے اور آخرت میں بھی۔ معاویہ نے کہا:۔

ونترك دم ابن عفان لا واللہ لا افعل ذلك ابدا۔	کیا ہم فرزندِ عفان کے قصاص سے دستبردار ہو جائیں۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہوگا۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۴۶)

پھر شبث ابن ربعی نے معاویہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اے معاویہ ہم سے تمہارا اصل مقصد پوشیدہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس لوگوں کو بہکانے اور ان کے جذبات کو بھڑکانے کا لے دے کے یہی تو ایک حربہ ہے کہ تم ان سے یہ کہو کہ اے لوگو! تمہارا امام مظلوم مارا گیا ہے اور میں اُن کے خون کا قصاص لینا چاہتا ہوں تم نے اس آواز پر چند جاہل اور خودسر لوگ اپنے گرد جمع کر لیئے ہیں حالانکہ تم وہی ہو جس نے عثمان کی نصرت سے عمداً پہلو تہی کی اور یہ چاہا کہ وہ قتل کر دیئے جائیں تاکہ ان کے قصاص کے نام پر جنگ چھیڑ کر اقتدار کی راہ ہموار کرو۔ یاد رکھو کہ دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جو کسی چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں مگر اللہ ان کی خواہشوں میں انہیں کامیاب نہیں ہونے دیتا اور کچھ لوگ وہ ہیں جو اپنی توقع سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن تمہارے لئے کامیابی و ناکامی دونوں صورتوں میں فلاح و بہبود نہیں ہے۔ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو عرب میں تم سے زیادہ کوئی بدبخت و پراگندہ حال نہ ہوگا اور اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی روسیاہی اور جہنم کے سوا کیا رکھا ہے۔ اے معاویہ اللہ سے ڈرو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑو و تمرد و سرکشی سے باز آؤ جو خلافت کا صحیح حقدار ہے اس سے الجھنے کی کوشش نہ کرو۔ معاویہ شبث کی بے باکانہ گفتگو سے بوکھلا اٹھے اور کسی بات کی تردید کرنے کے

بجائے تلخ کلامی پر اُتر آئے اور پُر غضب لہجہ میں کہا:۔

انصرفوا من عندی فلیس بینی وبینکم الا السیف۔

تم میرے پاس سے چلے جاؤ اب ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۴۶)

اس پر سعید ابن قیس ہمدانی نے کہا:۔

اتھول بالسیف اقسم باللّٰہ لنعجلنھا الیک۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۴۶)

کیا ہمیں تلواروں سے ڈراتے ہو خدا کی قسم ہم جلد ہی تلواریں لے کر تمہاری طرف بڑھیں گے۔

اس وفد کی واپسی کے بعد چند قرّاء و حفاظ معاویہ کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ تم چاہتے کیا ہو اور یہ لاؤ لشکر کیوں جمع کیا ہے؟ کہا کہ میرا مقصد قصاص خونِ عثمان ہے۔ کہا یہ قصاص کس سے لینا چاہتے ہو؟ کہا علی سے۔ کہا کیا علی نے انہیں قتل کیا ہے؟ کہا ہاں وہی تو قاتل ہیں۔ ان لوگوں نے پلٹ کر حضرت سے کہا کہ معاویہ آپ پر یہ الزام عائد کرتا ہے کہ آپ نے عثمان کو قتل کیا ہے۔ فرمایا یہ سراسر افتراء و بہتان ہے۔ میں ہرگز قاتل نہیں ہوں۔ ان لوگوں نے معاویہ سے یہ جواب نقل کیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے ہاتھ سے تو قتل نہیں کیا بلکہ دوسروں کو اُن کے قتل پر اُبھارا ہے۔ ان لوگوں نے حضرت سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بھی غلط ہے۔ انہوں نے معاویہ سے حضرت کا یہ جواب نقل کیا۔ معاویہ نے کہا کہ اگر علی سچ کہتے ہیں تو اُن کے قاتل ہمارے حوالے کریں جو ان کے لشکر میں موجود اور اُن کے قوتِ بازو بنے ہوئے ہیں ان لوگوں نے پلٹ کر حضرت سے اس کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے انہیں قتل کیا ہے وہ قرآن سے اُن کے قتل کے جواز پر دلیل لاتے ہیں اور جو قتل تاویلاً ہو اس کا قصاص نہیں ہے۔ جب معاویہ سے اس کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو علی کو یہ حق کہاں سے پہنچا ہے کہ وہ ہمارے مشورہ کے بغیر مسند خلافت پر بیٹھ جائیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مہاجرین و انصار جو اہل حل و عقد ہیں ان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے اور دوسرے مسلمان انہی کے فیصلہ کے پابند ہیں۔ معاویہ نے کہا کہ جو مہاجرین و انصار ہمارے ہاں ہیں انہوں نے نہ بیعت کی ہے اور نہ اس پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ غرض وہ اس طرح کے حیلے حوالوں سے کام لیتے رہے اور بیعت سے کنارہ کشی کی کوئی معقول توجیہہ نہ کرسکے وہ سمجھتے تھے کہ اگر بیعت کرلیں گے تو پھر حضرت پر خونِ عثمان میں شرکت یا قاتلین کی اعانت کا الزام عائد نہ کرسکیں گے۔ اور ان کے پاس لے دے کر یہی ایک حربہ تھا جس سے جنگ کا جواز ثابت کرسکتے تھے۔

اس سلسلہ میں ابو امامہ باہلی اور ابوالدرداء نے بھی معاویہ سے بات چیت کی اور ان سے کہا کہ تم

کیوں علی سے برسرِ پیکار ہو جب کہ وہ تم سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں۔ کہا کہ میں خونِ عثمان کے قصاص کے لئے لڑ رہا ہوں۔ ان دونوں نے کہا کہ کیا علی ان کے قاتل ہیں؟ کہا انہوں نے خود تو قتل نہیں کیا لیکن ان کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر وہ انہیں ہمارے حوالے کر دیں تو میں سب سے پہلے ان کی بیعت کروں گا۔ یہ بات اُن کے دل کو لگی اور وہ اٹھ کر امیرالمومنین کے پاس آئے اور معاویہ کی بات دہرائی حضرت سمجھ گئے کہ وہ ایک ناممکن چیز کا مطالبہ کر کے انہیں فریب دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے جال میں پھنسے رہیں آپ ان دونوں کو لے کر اپنے لشکر کی صفوں کے پاس آئے اور پوچھا کہ تم میں کون کون قاتلِ عثمان ہے لشکر میں سے بیس ہزار افراد نے باآواز بلند کہا:۔

نحن جمیعًا قتلنا عثمان۔ ہم سب نے عثمان کو قتل کیا ہے۔"

(اخبار الطوال۔ صفحہ ۱۷۱)

ابوالامامہ اور ابوالدرداء نے سوچا کہ ایک فرد کے خون کے بدلے بیس ہزار افراد کا خون تو مباح ہو نہیں سکتا اور نہ ان لوگوں کو معاویہ کے حوالے کرنے کا کوئی جواز ہے وہ معاویہ کے ہاں جانے کے بجائے بعض ساحلی مقامات کی طرف چلے گئے اور فریقین میں سے کسی فریق کا ساتھ نہ دیا۔

امیرالمومنین کی برابر یہ کوشش رہی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور معاملہ افہام و تفہیم اور گفت و شنید سے طے ہو جائے مگر معاویہ سمجھتے تھے کہ صلح کا آخری نتیجہ بیعت اور اطاعت و فرمانبرداری ہے اور یہ ان کے لئے سراسر ہزیمت و شکست تھی اس لئے وہ مصالحت کی ہر گفتگو سے پہلو بچالے جاتے اور امیرالمومنین کی صلح پسندانہ روش کو جنگ سے گریز پر محمول کر کے دھمکیوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر ان اشتعال انگیزیوں کے نتیجہ میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور ابتدائی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اس طرح کہ دونوں طرف سے جنگ آزما میدان میں اُتر کر حریف کو للکارتے کچھ دیر جنگ کے شعلے بھڑکاتے اور اپنی صفوں میں واپس چلے جاتے۔ شامیوں کی طرف سے عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید، ابوالاعور، حبیب ابن مسلمہ فہری، ابن ذی الکلاع حمیری، عبیداللہ ابن عمر، شرجیل ابن سمط کندی اور حمزہ ابن مالک باری باری فوجی دستوں کو لے کر میدان میں آتے۔ اور عراقیوں کی طرف سے مالک اشتر، حجر ابن عدی، شبث ابن ربعی، خالد ابن معمر، زیاد ابن نضر حارثی، زیاد ابن خصفہ تیمی، سعید ابن قیس ہمدانی، معقل ابن قیس ریاحی اور قیس ابن سعد انصاری اپنی اپنی نوبت پر مقابلہ کے لئے نکلتے اور دشمن کو نیزوں اور تلواروں کی زد پر رکھ کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے۔ یوں تو یہ سب کے سب مانے ہوئے جنگجو اور نبرد آزما تھے مگر مالک اشتر سے اچھے اچھے شہزور پناہ مانگتے تھے اور انہیں میدان میں دیکھ کر ان کے چہروں کا رنگ اُڑ جایا کرتا تھا۔

چنانچہ انہی جنگ کے ابتدائی ایام میں سہم ابن ابی العیزار فوج مخالف سے باہر نکل کر مبارز طلب ہوا۔ یہ سپاہ شام کا مانا ہوا شہسوار غیر معمولی قدو قامت اور بڑے ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اس کوہ پیکر کو دیکھ کر بڑے بڑے ساونت پہلو کترا کر نکل جاتے تھے۔ مالک اشتر نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ کیا اور صفوں سے نکل کر آگے بڑھے لوگوں نے انہیں روکا کہ آپ نہ جائیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی جسامت اور قدو قامت کی وجہ سے آپ پر چھا جائے۔ مالک نے سنی ان سنی کر دی اور بے خوف و خطر آگے بڑھ کر اُسے للکارا۔ اسے اپنی قوت و طاقت پر گھمنڈ تو تھا ہی فوراً گھوڑا کدا کر سامنے آیا اور تلوار لے کر مالک پر جھپٹا مالک نے اس کا وار خالی دے کر ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ سنبھل نہ سکا زخمی ہو کر زمین پر گرا اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ سپاہ شام میں سے ایک ازدی نے اسے گرتے دیکھا تو کہا کہ میں اس کے بدلے میں مالک کو قتل کروں گا۔ چنانچہ اس نے مالک کو مقابلہ کی دعوت دی۔ مالک نے اس پر تلوار کا وار کیا جس سے وہ بے بس ہو کر گھوڑے کے سموں میں گرا مالک نے چاہا کہ دوسرا وار کر کے اُسے ختم کریں کہ شامی ہجوم کر کے آگے بڑھے اور اسے چھڑا لے گئے۔ غرض ذی الحجہ کا مہینہ انہی جھڑپوں میں گزرا ہر روز ایک یا دو جھڑپیں ہو جاتیں اور فیصلہ کن جنگ کی نوبت نہ آسکی۔

جب محرم ۳۷ھ کا آغاز ہوا تو اس مہینہ کی حرمت کی وجہ سے جنگ روک دی گئی۔ امیرالمومنین نے اس وقتی التوائے جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر سمجھوتے کی کوشش کی اور نامہ و پیام اور سفارتوں کا سلسلہ شروع کیا اور عدی ابن حاتم، یزید ابن قیس اور شبث ابن ربعی اور زیاد ابن حصفیہ کو معاویہ کے پاس بھیجا تا کہ انہیں سمجھائیں بجھائیں۔ چنانچہ یہ لوگ معاویہ کے پاس آئے عدی ابن حاتم نے گفتگو شروع کی اور معاویہ سے کہا کہ ہم تمہارے پاس مصالحت کا پیغام لے کر آئے ہیں اگر تم ہماری آواز پر لبیک کہو تو یہ جنگ و خونریزی بند ہو سکتی ہے افتراق ختم کیا جا سکتا ہے اور امن بحال ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ حضرت علی کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی زمام قیادت ہے سبقت و فضیلت اور اسلامی خدمات میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے علاوہ تمام اسلامی ممالک ان کی خلافت تسلیم کر چکے ہیں۔ تم ہٹ دھرمی سے باز آؤ اور اس معاندانہ طرز عمل کو چھوڑ دو ورنہ تم بھی ان مصائب و آلام کا شکار ہو سکتے ہو جن کا سامنا اصحاب جمل کو کرنا پڑا تھا۔ معاویہ نے کہا کہ تم مجھے ڈرانا دھمکانا اور مرعوب کرنا چاہتے ہو میں حرب کا بیٹا ہوں ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم تم عثمان کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے والے اور ان کے قاتلوں کے زمرہ میں شامل ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی پاداش میں تم قتل کئے جاؤ گے۔ اس پر شبث ابن ربعی اور زیاد ابن خصفہ نے کہا کہ ان باتوں کو چھوڑو ان سے نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ہمیں۔ وُہ بات کہو جو دونوں فریق کے لئے فائدہ رساں ہو اور ہم ایک دوسرے سے دُور

ہونے کے بجائے قریب ہوسکیں۔ یزید ابن قیس نے کہا کہ ہم پیغامبر ہیں۔ ہمارا کام پیغام پہنچانا تھا وُہ ہم نے پہنچا دیا ہے۔ اب تم جو کہوگے وہ ہم امیرالمومنین تک پہنچا دیں گے۔ البتہ تم پر ہم اتمام حجت کریں گے۔ اور تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دیں گے۔ جس سے امتِ مسلمہ میں تفرقہ کے بجائے یک جہتی و ہم آہنگی پیدا ہو۔ رہا علی کا فضل و شرف تو وہ نہ تم سے مخفی ہے اور نہ مسلمانوں سے۔ اور تمہاری اور ان کی برابری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور ان کے خلاف جنگی اقدامات سے باز آؤ۔ خدا کی قسم ہم نے زہد و تقوےٰ اور اوصاف و کمالات میں ان سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ معاویہ نے کہا کہ تم لوگوں نے مجھے جماعت سے وابستگی کی دعوت دی ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جسے تم جماعت کہتے ہو وہ میرے ساتھ ہے۔ میں جماعت سے اور جماعت مجھ سے وابستہ ہے۔ رہی تمہارے امیر کی اطاعت تو یہ مجھے منظور نہیں ہے اس لیئے کہ انہوں نے عثمان کو قتل کیا۔ جماعت میں تفرقہ ڈالا اور اُن کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ اگر میں یہ تسلیم بھی کرلوں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے عثمان کو قتل نہیں کیا لیکن اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قاتلین عثمان اُن کے لشکر میں ہیں۔ وہ انہیں ہمارے حوالے کردیں تاکہ ہم انہیں قصاصاً قتل کریں پھر ہم اطاعت بھی کریں گے اور جنگ سے دستبردار بھی ہوجائیں گے۔ شبث ابن ربعی نے کہا کہ اے معاویہ اگر عمار ابن یاسر کو تمہارے حوالے کردیا جائے تو کیا تم گوارا کروگے کہ انہیں قتل کردو؟ کہا کہ میرے لئے مانع ہی کیا ہے۔ خدا کی قسم عثمان تو عثمان میں اُن کے آزاد کردہ غلام ناتل کے عوض بھی انہیں قتل کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ شبث نے کہا زمین و آسمان کے مالک کی قسم تم بہت اونچی اڑان اڑنے لگے ہو اور ان بلندیوں کو چھونے کی کوشش کررہے ہو جو تمہاری پہنچ سے بالاتر ہیں۔ تم عمار پر اس وقت تک قابو نہیں پاسکتے جب تک میدان لاشوں سے پٹ نہ جائے اور سروں کے انبار نہ لگ جائیں۔ آخر جب گفتگو کسی نتیجہ پر پہنچتی نظر نہ آئی تو یہ چاروں مایوس ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابھی آدھا راستہ طے کرنے پائے ہوں گے کہ معاویہ نے ایک شخص کو بھیج کر زیاد ابن خصفہ کو بلایا اور اُن سے کہا کہ میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے بلوایا ہے۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ علی نے عثمان کو قتل کرایا ہے اور ان کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر تم میری بات مانو تو قصاص کے سلسلہ میں میرا ہاتھ بٹاؤ اور اپنے قبیلہ سمیت میرا ساتھ دو۔ میں اللہ کو گواہ کرکے تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے کامیابی حاصل ہوئی تو میں کوفہ و بصرہ میں سے جس جگہ کی حکومت تم چاہوگے تمہیں دوں گا۔ جب معاویہ اپنی بات ختم کرچکے اور پُرامید نظریں زیاد کی طرف اٹھائیں تو زیاد نے کہا:۔

انی علی بینۃ من ربی وما انعم — میں اپنے پروردگار کی جانب سے اپنے موقف

اللہ علی فلن اکون ظھیر للمجرمین
(تاریخ کامل ج ۳۔ صفحہ ۱۴۸)

کی صداقت پر دلیل و برہان رکھتا ہوں۔ اور یہ مجھ پر اللہ کا انعام و احسان ہے میں کبھی مجرموں کا پشت پناہ بننا گوارا نہیں کر سکتا۔"

معاویہ نے یہ جواب سنا تو سر نیچے ڈال دیا اور عمرو ابن عاص سے کہا کہ خدا ان لوگوں کو غارت کرے ان سب کے دلوں کی دھڑکن اور لبوں کی جنبش یکساں ہے۔

ان سفارتوں کے جانے اور ناکام پلٹنے سے یہ تاثر لیا جا سکتا تھا کہ حضرت تو بات چیت کے ذریعہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں مگر معاویہ گفتگو کے بجائے جنگ کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں لہذا معاویہ نے اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے ان سفارتوں کے جواب میں حبیب ابن مسلمہ فہری، شرجیل ابن سمط کندی اور معن ابن یزید اسلمی کو حضرت کے پاس گفتگو کے لئے بھیجا۔ جب یہ تینوں حضرت کے ہاں آئے تو حبیب ابن مسلمہ نے کہا کہ اے علی حضرت عثمان خلیفہ راشد متقی و پرہیزگار اور قرآنی تعلیمات کے پابند تھے مگر تم لوگوں کو ان کا جینا گوارا نہ ہوا اور ہجوم کر کے انہیں بے جرم و خطا قتل کر ڈالا۔ ان کے قاتل ہمارے حوالے کیجئے تاکہ ہم انہیں قصاص میں قتل کریں۔ اور خلافت کو شوریٰ کے سپرد کر کے علیحدہ ہو جایئے تاکہ ہم اتفاق رائے سے کسی کو خلیفہ منتخب کریں۔ حضرت نے اس کا یہ طرزِ تخاطب دیکھا تو فرمایا:۔

وما انت لا ام لک والعزل وھذا الامر فانک لست ھناک ولا باھل
(تاریخ طبری ج ۴ ص۲)

تو خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کرنے والا کون ہوتا ہے جب کہ تو اس معاملہ میں دخل دینے کا اہل ہی نہیں ہے۔"

حبیب پیچ و تاب کھاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ جب میرا اور تمہارا سامنا ہوگا تو پھر دیکھ لیجئے گا کہ میں کس طرح پیش آتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ تو سواروں اور پیادوں کے لشکر جرار کو لے کر بھی مجھ پر ٹوٹ پڑے تو میں تیری حقیقت کچھ نہیں سمجھتا جا جو بن پڑے کر۔ شرجیل نے کہا کہ میں بھی وہی کہنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھی نے کہا ہے اور کیا مجھے بھی وہی جواب دیا جائے گا جو اُسے دیا گیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں نے اُسے جو جواب دیا ہے وہ اسی کا اہل تھا البتہ تمہیں دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے اس کے بعد حضرت نے رسول کی بعثت اور پہلے اور دوسرے دَور کا ذکر کیا پھر فرمایا کہ جب عثمان خلیفہ ہوئے تو اُن سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جنہیں لوگوں نے بُرا سمجھا اُن پر نکتہ چینی کی اور انہیں سمجھایا بجھایا۔ اور جب کہنے سننے کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ان کے گرد گھیرا ڈالا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر لوگ جمع ہو کر میرے پاس آئے اور مجھ سے بیعت کے طالب ہوئے میں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ انکار کر دوں۔ چنانچہ

میں نے واضح الفاظ میں انکار کر دیا مگر انہوں نے اصرار کیا اور اصرار کی حد کر دی اور کہنے لگے کہ لوگ آپ کے علاوہ کسی کی بیعت پر رضامند نہیں ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے بیعت کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا تو لوگوں میں پھوٹ پڑ جائے گی امن عامہ تباہ ہو جائے گا۔ اور اسلام کو خطرناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان حالات میں مجھے بیعت کے لئے مجبور ہونا پڑا اور جب بیعت ہو چکی تو دو شخص (طلحہ و زبیر) تمرد و سرکشی پر اُتر آئے حالانکہ وہ دونوں بخوشی میری بیعت کر چکے تھے۔ پھر معاویہ نے علم بغاوت بلند کیا حالانکہ اسے نہ دین میں کوئی سبقت اور نہ اسلام میں کوئی درجہ حاصل ہے۔ وہ آزاد کردہ اور آزاد کردہ کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ اور وہ خود ہمیشہ اللہ اور اس کے رسُول کے دشمن رہے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تو مجبوری کی صورت میں۔ مجھے تعجب ہے کہ تم نے اہلبیت رسول سے روگردانی اختیار کر لی ہے اور معاویہ کے دامن سے وابستہ ہو کر اس کے اشاروں پر چلنے لگے ہو حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم آل نبی کا ساتھ دیتے اور کسی کو ان کے مقابلہ میں نہ لاتے۔ میں تمہیں اللہ کی کتاب اور رسُول کی سنت کو زندہ کرنے دین کے آثار کو باقی رکھنے اور باطل کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ شرجیل نے اس آوازِ حق کو سُنا مگر اس سے کوئی اثر نہ لیا اور کہنے لگا کہ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ عثمان مظلوم مارے گئے ہیں فرمایا کہ میں نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ مظلوم تھے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم تھے۔ اس پر شرجیل اور معن ابن یزید بھڑک اٹھے اور کہا کہ جو یہ عقیدہ نہ رکھے کہ عثمان مظلوم مارے گئے تھے۔ ہم اس سے بیزار ہیں اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور واپس چلے گئے۔ حضرت کو ان لوگوں کے متاثر ہونے کی پہلے ہی سے کوئی توقع نہ تھی تاہم ان پر حجت تمام کر دی اور جب انہیں جاتے دیکھا تو یہ آیت پڑھی:۔

انك لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرين وما انت بهادی العمی عن ضلالتهم ان تسمع الا من يؤمن بآياتنا فهم مسلمون

"تم نہ مردوں کو اپنی بات سنا سکتے ہو اور نہ بہروں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہو اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گمراہی سے راہِ راست پر لا سکتے ہو۔ تم انہی لوگوں سے اپنی بات منوا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور یہی لوگ تو ماننے والے ہیں۔"

اس کے بعد حضرت اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

لا یکن هولاء اولی بالجد فی ضلالهم منکم بالجد فی

ایسا نہ ہو کہ ضلالت و گمراہی میں ان لوگوں کی کوششیں تمہاری کوششوں سے بڑھ جائیں جب

حقکم وطاعۃ ربکم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۵)

کہ تمہاری کوششیں حق اور اپنے پروردگار کی اطاعت کے سلسلہ میں ہیں۔"

جب محرم کا آخری دن گزرا اور افق پر صفر کا چاند دکھائی دیا تو امیر المومنین نے صلح کی ہر کوشش سے مایوس ہو کر مرثد ابن حارث جشمی کو فریق مخالف کی طرف بھیجا جنہوں نے سپاہِ شام کے سامنے کھڑے ہو کر اعلان کیا:۔

الا ان امیر المومنین یقول لکم انی قد استدمتکم لتراجعوا الحق وتنیبوا الیہ واحتججت علیکم بکتاب اللہ عز وجل فدعوتکم الیہ فلم تناھوا عن طغیان ولم تجیبوا الیٰ حق انی قد نبذت الیکم علیٰ سواء ان اللہ لا یحب الخائنین۔

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۶)

اے اہلِ شام امیر المومنین تم سے فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں مہلت دی تاکہ حق کو دیکھو بھالو اور اس کی طرف رجوع کرو میں نے تم پر خدائے بزرگ و برتر کی کتاب سے حجت تمام کر دی اور اس کی پیروی کی تمہیں دعوت دی مگر تم تمرد و سرکشی سے باز نہیں آئے اور نہ حق کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہوئے اب میں نے تمام تعلقات اور گفت و شنید کا سلسلہ قطع کر دیا ہے بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس اعلان کے ہوتے ہی جنگ کی تیاری شروع ہو گئی آگ کے آلاؤ روشن کئے گئے مشعلیں جلائی گئیں اور راتوں رات پرے بندھ گئے صفیں جم گئیں اور عراقیوں اور شامیوں نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ امیر المومنین نے اپنے لشکر کو ترتیب دیا۔ سواروں پر عمار ابن یاسر کو اور پیادوں پر عبد اللہ ابن بدیل خزاعی کو افسر مقرر کیا اور کوفہ کے سواروں پر مالک اشتر کو اور بصرہ کے سواروں پر سہل ابن حنیف کو اور اہلِ بصرہ کے پیادوں پر قیس ابن سعد کو سالار متعین کیا۔ میمنہ اشعث ابن قیس کے اور میسرہ عبد اللہ ابن عباس کے زیر نگین کیا۔ میمنہ کے پیادوں کو سلیمان ابن صرد کے اور میسرہ کے پیادوں کو حارث ابن مرہ عبدی کی ماتحتی میں دیا اور ہر قبیلہ پر اسی قبیلہ کا ایک ایک سردار نامزد کیا اور رایت جنگ ہاشم ابن عتبہ مرقال کے سپرد کیا اور لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: "جب تک وہ پہل نہ کریں تم ان سے نہ لڑنا کیونکہ تم بحمد اللہ دلیل و حجت رکھتے ہو اور تمہارا انہیں چھوڑ دینا کہ وہ پہل کریں۔ یہ ان پر دوسری حجت ہو گی۔ خبردار جب دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو تو کسی پیٹھ پھرانے والے کو قتل نہ کرنا کسی بے دست و پا پر ہاتھ نہ بڑھانا کسی زخمی کی جان نہ لینا اور عورتوں کو اذیت نہ پہنچانا چاہے وہ تمہیں برا بھلا کہیں اور تمہارے افسروں کو

گالیاں دیں۔"

معاویہ نے میمنہ پر عبید اللہ ابن عمر کو اور میسرہ پر حبیب ابن مسلمہ کو مقرر کیا۔ سواروں پر عمرو ابن عاص اور پیادوں پر مسلم ابن عقبہ مری کو امیر بنایا اور مختلف شہروں اور قبیلوں کے انہی میں سے سردار نامزد کئے اور علم جنگ عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید کو دیا۔

یکم صفر روز چہار شنبہ صبح ہی صبح دونوں طرف کے فوجی دستے نئے ولولے اور نئے حوصلے کے ساتھ صفیں باندھ کر کھڑے ہوگئے اور باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہوگیا۔ عراقی دستہ کی کمان مالک اشتر کے ہاتھ میں تھی اور شامی دستہ حبیب ابن مسلمہ کی ماتحتی میں تھا۔ دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کی قوت طاقت کا جائزہ لیا اور پھر تلواریں لے کر فریق مخالف پر ٹوٹ پڑے۔ دن بھر تلواریں تلواروں سے ٹکراتی رہیں اور شام کے جھٹپٹے تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔ جب فضا تاریک ہوگئی تو دونوں لشکر اپنی اپنی قیامگاہوں کی طرف پلٹ آئے۔

دوسرے دن حضرت کی سپاہ میں سے ہاشم مرقال سواروں اور پیادوں کے دستے لے کر میدان میں آ کھڑے ہوئے ادھر سے ابوالاعور سلمی سواروں اور پیادوں کے جم غفیر کے ساتھ نکلا دونوں فریق نے تلواریں علم کیں اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے دن بھر سخت رن پڑا سروں پر تلواریں چمکتی رہیں اور سینوں میں نیزے اترتے رہے۔

تیسرے دن عمرو ابن عاص ایک نیزے پر کالا پھریرا لٹکائے دستہ فوج کے ساتھ نکلا اس سیاہ پھریرے کو دیکھ کر سرگوشیاں شروع ہوگئیں اور کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ وہی پارچہ ہے جو پیغمبر اکرم نے چوب علم پر آویزاں کر کے عمرو کو دیا تھا اور اسے علمبرداری کا شرف بخشا تھا۔ امیرالمومنین نے سنا تو فرمایا اے لوگو اس جھنڈے کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت نے علم اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس جھنڈے کو اٹھائے اور اس کا حق ادا کرے۔ عمرو ابن عاص نے کہا کہ یا رسول اللہ وہ شرائط کیا ہیں جن سے ان کا حق ادا ہوتا ہے فرمایا کہ اسے لے کر کسی کافر کے مقابلہ سے نہ بھاگے اور کسی مسلمان سے جنگ نہ کرے مگر اس نے یہ حق یوں ادا کیا کہ:۔

قد فر بہ من الکافرین فی حیاۃ رسول اللہ وقد قاتل بہ المسلمین الیوم۔ (اخبار الطوال۔ صد ۱۷۴)	رسول اللہ کی زندگی میں اسے لے کر کافروں کے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا اور آج اسی جھنڈے کو لے کر مسلمانوں سے جنگ و قتال کر رہا ہے۔"

عمرو ابن عاص کا مقصد تو یہ تھا کہ اس علم کی نمائش کر کے دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر رُعب

بٹھائے اور انہیں یہ تاثر دے کہ وُہ زمانہ رسول میں اُن کے ہاتھوں سے علم لے چکا ہے اور یہ وہی علم ہے جسے آج میدان میں لے کر آیا ہے اور اس طرح اپنے موقف کے حق بجانب ہونے کا ڈھنڈورا پیٹے مگر امیرالمومنین نے کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کا ازالہ کر دیا اور یہ بتایا کہ صرف رسول اللہ کے ہاتھ سے علم لے لینا فضیلت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ جب تک علمبرداری کے تقاضوں کو پُورا نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد اگر کسی ذہن میں کچھ الجھن تھی تو وہ جاتی رہی اور لوگوں نے اس پھریرے کی نمائش کو ایک افسوں گری سے زیادہ اہمیت نہ دی۔

جب عمرو میدان میں اترا تو زیاد ابن نضر سواروں کا دستہ لے کر اور عمار ابن یاسر پیادوں کو لے کر جن میں مہاجرین وانصار اور اصحاب بدر شامل تھے مقابلہ کے لئے نکلے۔ عمار دشمن کی صفوں کو تہ و بالا کرتے ہوئے آگے بڑھے تو اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا :۔

یا اھل العراق اتریدون ان تنظروا الی من عادی اللہ و رسولہ وجاھدھما وبغی علی المسلمین وظاھر المشرکین فلما رأی اللہ یعزدینہ ویظھر رسولہ اتی النبی فاسلم وھو فیما نری راھب غیر راغب ثم قبض اللہ عزوجل رسولہ فو اللہ ان زال بعدہ معروفا بعداوۃ المسلم و ھوادۃ المجرم فاثبتوا لہ وقاتلوہ فانہ یطفیٔ نور اللہ ویظاھر اعداء اللہ۔

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۳۸)

اے اہل عراق کیا تم اس شخص (معاویہ) کو دیکھنا چاہتے ہو جس نے اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کی اور ان سے جنگیں لڑیں مسلمانوں کے خلاف بغاوت کو ہوا دی اور مشرکوں کی پشت پناہی کی اور جب یہ دیکھا کہ اللہ نے اپنے دین کو استحکام بخشا ہے اور اپنے رسول کو غلبہ دیا ہے، تو پیغمبر کے پاس آیا اور مسلمان ہو گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ڈر کے مارے مسلمان ہوا تھا اور اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب اللہ نے اپنے رسول کو دنیا سے اٹھا لیا تو خدا کی قسم یہ مسلمانوں کا دشمن اور کافروں کا دوست ہی رہا۔ لہذا اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور اس سے جنگ و قتال کرو کیونکہ یہ اللہ کے نور کو بجھانا اور دشمنان خدا کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے۔"

پھر اپنے ہمراہیوں کو لے کر اس شدت سے حملہ کیا کہ شامیوں کے قدم اکھڑ گئے اور عمرو جو بڑی آن بان سے سیاہ علم لہراتا ہوا میدان میں آیا تھا اپنی جگہ چھوڑ کر پچھلی صفوں میں روپوش ہو گیا۔

زیاد ابن نضر اپنے سواروں کے ساتھ شامی سواروں پر حملہ آور تھے کہ ایک سوار اُن کے مقابلہ کے لئے بڑھا زیاد نے پوچھا کہ تم کون ہو اس نے کہا کہ میں معاویہ ابن عمرو عقیلی ہوں۔ زیاد یہ نام سن کر حملہ کرنے میں متردد ہوئے کیونکہ وہ ان کا مادری بھائی تھا۔ ان دونوں کی ماں قبیلۂ زبیدہ کی ایک عورت ہند تھی انہوں نے لڑنا مناسب نہ سمجھا اور امیرالمومنین سے اجازت لے کر واپس چلے آئے۔

چوتھے دن محمد ابن حنفیہ فوج و سپاہ کے ساتھ میدان میں آئے ادھر سے عبیداللہ ابن عمر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ نکلا اور دونوں نے ایک دوسرے کے بالمقابل صفیں جمائیں۔ نیزوں کی طرف ہاتھ بڑھے تلواریں نیاموں سے نکل آئیں اور جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ عبیداللہ ابن عمر نے ابن حنفیہ کو مقابلہ کی دعوت دی۔ محمد ابن حنفیہ اس کی آواز پر تڑپ کر باہر نکلے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھے۔ امیرالمومنین نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے بتایا گیا کہ ابن حنفیہ ہیں جو عبیداللہ ابن عمر کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں۔ حضرت نے یہ سنا تو محبت کا جوش رُک نہ سکا فوراً گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھا اور ابن حنفیہ کے قریب پہنچ کر نیچے اُترے اور فرمایا کہ تم میری سواری کی باگ تھامے رہو۔ میں ابھی پلٹ کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ ابن عمر کے قریب آئے اس نے ابن حنفیہ کے بجائے امیرالمومنین کو دیکھا تو چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ کہنے لگا میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا اور یہ کہہ کر پچھلی صفوں میں چلا گیا۔ حضرت واپس ہوئے اور جب اپنی سواری کے پاس پہنچے تو ابن حنفیہ نے کہا کہ بابا آپ نے مجھے کیوں روک دیا اگر مجھے جانے دیتے تو میں اسے قتل کئے بغیر نہ پلٹتا۔ فرمایا مجھے تم سے یہی امید تھی مگر میں پوری طرح مطمئن نہ تھا کہ تم اسے مار گراؤ گے اس لئے مجھے خود جانا پڑا۔ کہا کہ بابا میں آپ کو روکنے کی جراٴت نہ کر سکا ورنہ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ آپ اس ذلیل و کمینہ فطرت کے مقابلہ میں جاتے۔

پانچویں دن عبداللہ ابن عباس سواروں اور پیادوں کے دستے لے کر نکلے اور ادھر سے ولید ابن عقبہ اپنے سواروں اور پیادوں کی قیادت کرتا ہوا نکلا۔ اس نے جب ابن عباس کو دیکھا تو اپنی بدفطری و بدطینتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنی عبدالمطلب پر زبان درازی شروع کر دی اور ابن عباس سے کہا:۔

یا ابن عباس قطعتم ارحامکم	اے ابن عباس تم لوگوں نے قطع رحم کیا، اپنے
وقتلتم امامکم ولم تدرکوا ما	امام (عثمان) کو قتل کر ڈالا اور اپنی آرزوؤں میں
املتم۔ (اخبارالطوال ص۱۶۵)	بھی ناکام رہے۔

ابن عباس نے کہا کہ بس الزام تراشی و یاوہ گوئی کو چھوڑو اور میرے مقابلہ کے لئے آگے بڑھو۔ مگر اسے آگے بڑھنے کی جراٴت نہ ہوئی اور جو گرجتے ہیں سو برستے نہیں کچھ دیر چیختا چلاتا رہا اور پھر دبک کر بیٹھ گیا۔ ابن

عباس اپنے ہمراہیوں کو لے کر شامیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ظہر تک معرکہ کارزار گرم رہا۔

اسی دن سمرہ ابن ابرہہ حمیری قراء و حفاظ کی ایک معتدبہ جماعت کے ساتھ شامیوں سے الگ ہوکر امیرالمومنین کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ جس سے معاویہ کو اچھا خاصا دھچکا لگا کیونکہ یہ ان کے موقف کے خلاف انہی کی جماعت کی عملی شہادت تھی۔

چھٹے دن عراقیوں کی صف سے قیس ابن سعد انصاری اور شامیوں کے لشکر سے ابن ذی الکلاع حمیری میدان میں اُترے ظہر تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور پھر اپنی اپنی صفوں میں واپس آگئے۔

ساتویں دن سپاہ امیرالمومنین کی طرف سے مالک اشتر اور ادھر سے حبیب ابن مسلمہ ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے۔ سپاہِ شام سے حجر الشر کندی گھوڑے پر سوار ہوکر مبارز طلب ہوا اس کے مقابلہ میں اس کے ہم نام اور ہم قبیلہ حجر ابن عدی جو حجر الخیر کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے نکلے۔ دونوں نیزے تان کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے اس اثنا میں لشکر شام کا ایک سپاہی خزیمہ ابن ثابت اسدی بیچ میں کود پڑا اور حجر الخیر پر حملہ آور ہو کر ان کا نیزہ توڑ ڈالا چند عراقی سپاہیوں نے یہ دیکھا تو آگے بڑھ کر خزیمہ اسدی کو قتل کر دیا اور حجر الشر جان بچا کر نکل گیا مگر کچھ دیر کے بعد پھر للکارتا ہوا میدان میں آیا۔ حکم ابن ازہر اس کے مقابلہ کے لئے بڑھے کچھ دیر اس سے جنگ کی۔ آخر حجر الشر کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حکم کے ابن عم رفاعہ ابن ظالم حمیری نے حکم ابن ازہر کو گرتے دیکھا تو پیچ و تاب کھاتے ہوئے صفوں سے باہر نکلے اور حجر الشر پر حملہ کر کے اُسے تہ تیغ کر دیا۔ امیرالمومنین نے دیکھا، تو فرمایا خدا کا شکر ہے کہ حکم ابن ازہر کا قاتل مارا گیا۔

میدان میں تلواریں چل رہی تھیں اور عراقی و شامی ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے کہ عراقی دستہ کا ایک سپاہی ابوایوب شامیوں پر حملہ کر کے صفوں سے باہر نکلا دیکھا کہ ایک شامی عراقیوں کی صف پر حملہ کر کے پلٹ رہا ہے جب دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو تلواریں کھینچ لیں اور حملہ کر دیا ابوایوب نے اس کی گردن پر اس طرح چابکدستی سے تلوار ماری کہ گردن کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی اور سر جوں کا توں اس کے دھڑ پر رکھا رہ گیا۔ دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ وار خالی گیا ہے مگر جب اس کے گھوڑے نے حرکت کی تو سر دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑا لوگوں نے یہ دیکھا تو نعرہ لگایا اور دل کھول کر ابوایوب کی تیغ زنی کی داد دی اور جب وہ پلٹ کر امیرالمومنین کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا کہ شاعر کا یہ شعر تمہارے حسب حال ہے ؎

وعلمنا الضرب اٰباؤنا   ونحن نعلم ایضا بینناً

"ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں تیغ زنی کی تعلیم دی ہے اور ہم بھی اپنے بیٹوں کو یہ تعلیم دیں گے۔"

ان خونی ہنگاموں میں بھی حضرت کی یہ کوشش رہی کہ یہ جنگ و خونریزی بند ہو اور صلح و آشتی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اگرچہ امیرِ شام کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے اس کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی پھر بھی مزید اتمامِ حجت کے لئے آپ نے مصحف ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنے لشکر والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس مصحف کو لے کر شامیوں کے پاس جائے اور انہیں قرآن مجید کے فیصلہ پر عمل کرنے کی دعوت دے ایک نوجوان صفوں سے باہر نکل کر حضرت کے سامنے آیا اور کہا کہ میں اس کے لئے حاضر ہوں حضرت نے دوبارہ دریافت کیا مگر اس نوجوان کے علاوہ کوئی تیار نہ ہُوا۔ آخر حضرت نے اسی کو مصحف دے کر روانہ کیا اس نے مخالف صفوں کے قریب پہنچ کر کہا کہ اے لوگو امیرالمومنین تمہیں قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں آؤ ہم اس کے فیصلہ پر اپنے جھگڑے نمٹائیں اور قتل و خونریزی سے ہاتھ اٹھائیں مگر کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو میدانِ جمل میں مسلم مجاشعی کا ہُوا تھا اور چند شامیوں نے ہجوم کر کے اُسے قتل کر دیا۔

امیرالمومنین نے یہ دیکھ کر کہ دونوں طرف کے لشکر جان لڑائے ہوئے ہیں اگر یہ جنگ و خون ریزی جاری رہی تو عرب کا بہت بڑا حصّہ فنا ہو کر رہ جائے گا۔ لہذا دوسروں کو جنگ کے شعلوں میں جھونکنے کے بجائے مجھے معاویہ کو مقابلہ کی دعوت دینا چاہیئے تاکہ ہم آپس میں نمٹ لیں۔ چنانچہ حضرت نے دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر بلند آواز سے پوچھا کہ معاویہ کہاں ہے۔ معاویہ نے سنا تو کہا کہ پوچھو کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ اُسے کہو کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے سامنے آئے۔ میں اس سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ معاویہ عمرو ابن عاص کو لے کر صفوں سے باہر نکلے اور حضرت کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے معاویہ تم لوگوں کا خونِ ناحق بہا رہے ہو آؤ ہم دونوں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ہم میں سے جو غالب آئے وہ منصب خلافت سنبھال لے۔ عمرو ابن عاص نے کہا کہ علی نے سچ کہا ہے۔ یہی دونوں نزاع کا مرکز و محور ہیں انہیں آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ معاویہ نے عمرو سے مخاطب ہو کر کہا۔

ما انصفت وانك لتعلم انه
لم يبارزه رجل قط الا قتله
(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۲۹)

"تم نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ ان کے مقابلہ میں جو نکلا انہوں نے اسے قتل کئے بغیر نہیں چھوڑا۔"

عمرو نے کہا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مقابلہ سے روگردانی کر کے اپنے کو لوگوں کی نظروں سے گراؤ معاویہ

نے کہا کہ کیا میں تمہارے طیش دلانے سے اپنی جان سے ہاتھ دھولوں تم تو یہ چاہتے ہی ہو کہ میں مارا جاؤں اور تم راج پاٹ سنبھال لو۔ اور یہ کہہ کر پیچھے کی طرف مڑے اور دھیرے دھیرے لشکر کی آخری صف میں پہنچ گئے۔ معاویہ کو عمرو کی اس حرکت پر غصہ تو تھا ہی اُسے بلا کر سخت سست کہا اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ عمرو نے اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا کہ اگر تم لڑنا نہیں چاہتے ہو تو میں علی سے لڑوں گا۔ چنانچہ اس نے مقابلہ کی ٹھان لی اور ایک موقع پر گرجتا برستا ہوا میدان میں نکلا اور حضرت کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ حضرت نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے سر پر پہنچ گئے۔ جب تلوار بلند کی تو اس نے اپنے کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور ایک ٹانگ اٹھا دی۔ جس سے اس کی شرمگاہ کھل گئی۔ حضرت نے اس کی یہ ذلیل حرکت دیکھی تو منہ پھیر لیا۔ عمرو گرد جھاڑتا ہوا اُٹھا اور اپنے لشکر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ معاویہ نے یہ واقعہ سنا تو عمرو سے کہا :۔

احمد اللہ و سوداء استک یا عمرو۔ (اخبار الطوال صلہ)	اے عمرو اللہ کا شکر کرو کہ تم اپنی شرمگاہ کی بدولت بچ گئے۔

سپاہِ شام کے ایک سپہ سالار ابرہہ ابن صباح حمیری نے بھی جنگ کی تباہ کاری سے متاثر ہو کر یہی بات کہی تھی کہ علی اور معاویہ آپس میں لڑ بھڑ کر فیصلہ کر لیں۔ چنانچہ اس نے اپنے قبیلہ والوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے اہلِ یمن ہم کب تک تیروں اور تلواروں کا نشانہ بنتے رہیں گے اس جنگ کو رکوانے کی کوئی تدبیر کرو اور علی اور معاویہ پر زور دو کہ وہ آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ان دونوں میں سے جو غالب آئے گا ہم اس کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے۔ امیرالمومنین تک یہ بات پہنچی تو فرمایا کہ خدا کی قسم میرے لئے اس سے زیادہ خوش آئند کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ دونوں لشکر ایک طرف ہو جائیں اور ہم آپس میں نمٹ لیں۔ جب معاویہ نے ابرہہ کی یہ تجویز سُنی تو بہت سٹپٹائے اور قدم بقدم پیچھے ہٹتے ہوئے آخری صفوں میں پہنچ گئے اور اپنے حاشیہ نشینوں سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ کی عقل جاتی رہی ہے لوگوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے وہ زیرک و دانا اور با فہم ہے اور شجاعت و دلیری کے اعتبار سے بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم علی سے دو بدو ہو کر لڑنے سے گھبراتے ہو۔ معاویہ تو خاموش رہے البتہ عروہ ابن داؤد کو جوش آیا اور کہنے لگا کہ اگر امیر لڑنا نہیں چاہتے تو میں علی سے دو دو ہاتھ کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں صفوں میں کھڑا ہو کر للکارنے لگا اور حضرت کو دعوت مبارزت دی آپ نے اس کی سرکوبی کے لئے قدم بڑھایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین آپ اس دنی و ذلیل کے مقابلہ کے لئے نہ جائیں ہم میں سے کسی کو حکم دیں وہ اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ مگر حضرت نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کے سر پر اس طرح تلوار

ماری کہ اس کا آدھا دھڑ ایک طرف اور آدھا دھڑ دوسری طرف گرا۔ لوگ حضرت کے زورِ بازو اور تلوار کی کاٹ پر لرز اُٹھے اور دیکھنے والوں پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ جب عروہ دو ٹکڑے ہو کر گرا تو اس کے ایک ابن عم نے جذبۂ انتقام سے مشتعل ہو کر حضرت پر حملہ کیا۔ حضرت نے اس کا وار خالی دے کر اس پر نیزہ مارا۔ نیزہ اس کے سینہ میں گڑ گیا اور اس نے زمین پر گر کر دم توڑ دیا۔

معاویہ نے اپنے دو آدمیوں کو قتل ہوتے دیکھا تو پیچ و تاب کھا کر کہا کہ تم میں کون ہے جو عروہ اور اس کے ابن عم کے قاتل علی سے دو بدو ہو کر لڑے یا موقع پا کر انہیں قتل کرے۔ ولید ابن عقبہ نے کہا کہ مناسب تو یہ تھا کہ تم خود اُن کے مقابلہ کے لئے نکلتے کہا کہ وہ پہلے بھی مجھے للکار چکے ہیں۔ مگر یہ لشکر کاہے کے لئے ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے میدان میں نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عقبہ ابن ابی سفیان نے کہا تمہاری رائے صائب ہے وہ للکاریں بھی تو تم ٹال جاؤ۔ جب معاویہ کے بار بار کہنے پر بھی کسی نے حضرت کے مقابلہ میں نکلنے کی جرأت نہ کی تو انہوں نے بسر ابن ابی ارطاۃ سے کہا کیا تم ان سے لڑو گے کہا کہ بہتر تو یہ تھا کہ تم ہی اُن سے دو بدو ہو کر لڑتے اور اگر تم یہی چاہتے ہو کہ میں لڑوں تو مجھے انکار نہیں ہے۔ بسر کے ایک قریبی عزیز نے یہ سنا تو بسر سے کہا کہ معاویہ مر گئے تو ان کا کوئی بھائی بند تخت و تاج کا وارث ہو گا تم اپنے کو کیوں خطرہ میں ڈالتے ہو۔ کہا کہ میں زبان سے کہہ چکا ہوں۔ اب تو مجھے نکلنا ہی پڑے گا۔ اس شخص نے یہ سُنا تو بسر کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے :-

تنازلہ یا بسران کنت مثلہ   والافان اللیث للشاء اکل

" اگر تم ان کے پایہ کے ہوتے تو بے شک ان سے لڑتے ورنہ یاد رکھو کہ شیر بکریوں کو کھا جایا کرتا ہے "

کانک یا بسر ابن ارطاۃ جاھل   باثارہ فی الحرب او متجاھل

" اے بسر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم علی کے جنگی کارناموں سے بے خبر ہو یا جان بوجھ کر بے خبر بن رہے ہو "

بسر نے کہا کہ آخر ایک دن مرنا ہے پھر کیوں بزدلوں کی موت مرا جائے میں ان کا مقابلہ کروں گا اور ضرور کروں گا۔ چنانچہ وہ لڑنے کے لئے میدان کی طرف بڑھا۔ امیر المومنین مالک اشتر کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ کسی ٹیلے کی تلاش میں) بڑھ رہے تھے کہ بسر زرہ بکتر پہنے سر پر خود رکھے آپ کے قریب آ کر مبارز طلب ہوا۔ آپ بڑے اطمینان سے پلٹے اور قریب پہنچ کر نیزے کی انی اس کی زرہ میں گڑو کر اسے نیچے گرایا اور چاہا کہ نیزہ اس کے سینہ میں اتاریں۔ بسر نے جب جان بچتی نہ دیکھی تو اپنے ستر کو عریاں کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت

نے منہ موڑ لیا اور پیچھے ہٹ آئے۔ مالک اشتر نے اسے پہچان کر کہا کہ یا امیرالمومنین یہ دشمن خدا بسر ابن ابی ارطاۃ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس پر خدا کی پھٹکار اس حرکت کے بعد اسے کیا کہا جائے چھوڑو اسے جانے دو۔ بسر جلدی سے اٹھا اور ستر ڈھانکتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ معاویہ نے اس کے کارنامہ پر مطلع ہونے کے بعد اس سے کہا کہ شرملنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ عمرو ابن عاص نے بھی تو اسی طرح اپنی جان بچائی تھی۔

معاویہ اس خیال سے میدان میں کم نکلتے تھے کہ اگر حضرت کا سامنا ہو گیا تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اور اگر نکلتے بھی تو اس سمت کا رُخ نہ کرتے جدھر حضرت کے موجود ہونے کا شبہ ہوتا۔ ایک مرتبہ لڑنے کے لئے نکلے اور میسرہ پر حملہ کر دیا۔ حضرت میسرہ کے اندر موجود تھے اور صفوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ حضرت نے انہیں دیکھا تو اس خیال سے کہ وہ آپ کو دیکھ کر بھاگ نہ کھڑے ہوں اپنا گھوڑا اور اپنی زرہ دوسرے کے گھوڑے اور زرہ سے تبدیل کی اور صف سے باہر نکلے۔ معاویہ حملہ کے ارادہ سے بڑھے تھے کہ پہچان لیا کہ مقابلہ میں امیرالمومنین ہیں۔ انہوں نے فوراً رُخ موڑ کر گھوڑے کو مہمیز لگائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ امیرالمومنین نے کچھ دیر تک پیچھا کیا مگر وہ تیزی سے اپنی صفوں میں روپوش ہو گئے اور جان بچا لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

معاویہ عموماً اپنے ایک آزاد کردہ غلام حریث کو اپنا بھیس بدلوا کر میدان میں بھیجتے تھے تاکہ دوسروں کو یہ تاثر دیں کہ وہ خود بھی عملاً شریک جنگ ہیں۔ چنانچہ جب وہ معاویہ کی زرہ پہن کر اور ہتھیار سج کر نکلتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ معاویہ جنگ آزما ہیں۔ معاویہ نے اسے یہ تاکید کر دی تھی کہ مجھے تمہاری جان عزیز ہے تم لاکھ طاقتور اور جنگجو سہی مگر علی کا مقابلہ نہ کرنا ورنہ تمہیں اپنی جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں عمرو ابن عاص نے اسے بہکایا اور کہا کہ معاویہ تمہیں علی کے مقابلہ سے اس لئے منع کرتے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ تمہیں اُن سے دو بدو ہو کر لڑنے کا امتیاز اور قریش کے مقابلہ میں سر بلندی حاصل ہو۔ اگر تم قریشی ہوتے تو وہ تمہیں ان کے مقابلہ سے کبھی منع نہ کرتے۔ حریث عمرو کے بہکانے سے طیش میں آ گیا اور کہا کہ میں علی سے لڑے بغیر نہیں رہوں گا۔ چنانچہ اُس نے آگے بڑھ کر انہیں مقابلہ کے لئے للکارا آپ ایک دستہ فوج کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ حریث کی صدائے مبارز طلبی سنی۔ آپ نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا اور اُسے مہلت دیئے بغیر اس پر تلوار کا وار کیا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ معاویہ کو حریث کے مارے جانے کی خبر ہوئی تو انہیں انتہائی رنج و غم ہوا اور عمرو ابن عاص کو برا بھلا کہا کہ اُس کے بہکانے سے حریث کی جان گئی اور لوگوں پر یہ بات بھی کھل گئی کہ معاویہ کے بھیس میں حریث نکلا کرتا تھا۔

معاویہ کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنا بھیس بدلوا کر میدان میں بھیجتے اور امیرالمومنین، عباس

ابن ربیعہ یا کسی اور کا بھیس بدل کر میدان میں آتے تا کہ حریف انہیں مقابلہ میں دیکھ کر بھاگ نہ کھڑا ہو چنانچہ ایک مرتبہ عباس ابن ربیعہ خود زرہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر صف سے باہر نکلے۔ غراز ابن ادہم نے انہیں دیکھا تو جنگ کی دعوت دی۔ عباس نے کہا کہ میں گھوڑے سے نیچے اترا آتا ہوں اور تم بھی نیچے اُتر آؤ تا کہ ہم میں سے کوئی میدان چھوڑ کر نکل بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ دونوں پیادہ ہو گئے اور تلوار لے کر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ وار پر وار ہوتے مگر تلواریں ڈھالوں اور آہنی خودوں سے ٹکرا کر رہ جاتیں۔ ہر ایک اپنے حریف کو زیر کرنے کے لئے داؤں پیچ دکھاتا مگر کوئی مغلوب ہوتا نظر نہ آتا۔ اتنے میں عباس کو غراز کی زرہ کا ایک حلقہ ڈھیلا نظر آیا۔ انہوں نے ہاتھ کی صفائی سے اس حلقہ کو تلوار کی نوک میں پرو لیا اور جھٹکا دے کر زرہ کے حلقے چیر ڈالے اور پھر تاک کر ایسا وار کیا کہ تلوار ہڈیوں کو توڑتی ہوئی سینہ میں اُتر گئی غراز پیٹھ کے بل زمین پر گرا اور گرتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔ عراقیوں نے عباس کی مہارت و چابکدستی پر اس زور سے تکبیر کا نعرہ بلند کیا کہ پوری فضا گونج اٹھی۔ امیرالمومنین نے تکبیر کی آواز سنی تو پوچھا کہ یہ کون تھا جس نے دشمن کو مار گرایا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عباس ابن ربیعہ تھے۔ حضرت کے تیور بگڑے اور عباس کو بلا کر کہا کہ تمہیں حکم دیا تھا کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو اور اسے خالی نہ چھوڑو کہا کہ یا امیرالمومنین یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجھے مقابلہ کے لئے للکارا جائے اور میں خاموش رہوں۔ کہا کہ دشمن کا مقابلہ اتنا ضروری نہیں ہے، جتنا امام کے حکم کی پابندی ضروری ہے۔ پھر خود ہی فرمایا خداوندا عباس کو اس کارنامہ کی جزائے خیر دے۔ میں نے اس سے درگذر کیا تو بھی اس سے درگذر فرما۔

معاویہ کو غراز کے مارے جانے کا علم ہوا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور لشکر والوں سے کہا کہ تم میں کوئی ہے جو عباس کو قتل کر کے غراز کے خون کا بدلہ لے اس آواز پر قبیلۂ لخم کے دو شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہوئے اور عباس کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ عباس نے اُن کی للکار سنی تو ان کی رگوں میں خون شجاعت جوش مارنے لگا امیرالمومنین کی اجازت کے بغیر اپنی جگہ بھی نہ چھوڑ سکتے تھے کہا کہ کچھ دیر توقف کرو میں اپنے امیر سے اجازت لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت کی خدمت میں آئے اور اُن سے لڑنے کی اجازت مانگی۔ حضرت نے فرمایا کہ خدا کی قسم معاویہ یہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم میں سے کوئی متنفس روئے زمین پر زندہ نہ رہے تا کہ رشد و ہدایت کی شمعیں گل ہو جائیں اور اسے ضلالت و گمراہی کے پھیلانے کا موقع ملے مگر اللہ اس کے علی الرغم اپنے نور کو درخشندہ و تابندہ رکھے گا۔ پھر عباس سے فرمایا کہ تم اپنے ہتھیار اتار کر مجھے دو۔ حضرت نے عباس کی زرہ اور بکتر پہنا سر پر خود رکھا اور انہی کے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آئے۔ حضرت کو دیکھ کر دونوں لخمی یہ سمجھے کہ عباس مقابلہ کے لئے آئے ہیں کیونکہ گھوڑا اور ہتھیار انہی کے تھے اور خود و مغفر سے چہرہ نظر

نہ آتا تھا۔ کہا کہ کیا تم اپنے امیر سے اجازت لے آئے ہو۔ حضرت نے جواب میں اس آیت کی تلاوت کی۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا ان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔

"جن (مسلمانوں) کے خلاف (کافر) لڑا کرتے ہیں اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔"

اب ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر تلوار سے حملہ کیا۔ حضرت نے اس کا وار خالی دے کر جوابی حملہ کیا اور تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا جوشِ غضب میں حملہ آور ہوا حضرت نے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور پلٹ کر عباس کو ان کے ہتھیار دیئے اور فرمایا کہ اگر کوئی تمہیں مقابلہ کے لئے للکارے تو مجھے خبر دو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔

امیرالمومنین نے دیکھا کہ شامیوں کی طغیانی و سرکشی بڑھتی جا رہی ہے اور جب تک مجموعی قوت سے ان کی طاغوتی طاقتوں کو کچلا نہیں جائے گا۔ لڑائی رکنے میں نہیں آئے گی۔ چنانچہ آپ نے غروبِ آفتاب کے قریب اپنے لشکر میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

الا انکم لاقوا القوم غدا فاطیلوا اللیلۃ القیام واکثروا تلاوۃ القرآن واسئلوا اللہ النصر والصبر والقوھم بالجد والحزم وکونوا صادقین۔

"دیکھو کل تمہیں دشمن سے جنگ کرنا ہے۔ لہٰذا آج کی رات نماز اور تلاوتِ قرآن میں گزارو اور اللہ سے نصرت اور صبر و استقامت کی دعا مانگو اور پوری تندہی و ہوش مندی سے دشمن سے ٹکرا جاؤ۔ اور صحیح معنی میں راستباز ثابت ہو۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۵۱)

امیرالمومنین نے تمام رات جاگ کر جنگ کی تیاری اور فوجوں کی صف بندی میں گذاری میمنہ و میسرہ ترتیب دیئے رسالے اور دستے مرتب کئے اور لشکر والوں نے بھی ہتھیاروں کو جانچا پرکھا۔ تلواروں پر صیقل کی تیروں کے بھال اور نیزوں کے پھل درست کئے اور صبح ہونے تک دشمن پر آخری حملہ کے لئے پوری طرح تیار ہو گئے۔

حضرت علی کے اس اعلان سے معاویہ پر خوف و ہراس چھا گیا۔ انہوں نے سپہ سالارانِ لشکر کو لشکر ترتیب دے کر فوراً پیش ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ ابوالاعور سلمی اہل حمص کے لشکر کے ساتھ ابن عمرو سلمی اہلِ اردن کے ساتھ زفر ابن حارث اہلِ قنسرین کے ساتھ اور ضحاک ابن قیس فہری دمشق کے دستہ کے ہمراہ پیش ہوا اور اسی طرح دستوں پر دستے آتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے شامیوں کے غول چاروں طرف پھیل گئے اور

امیر شام کو پوری جوانمردی اور ثبات قدمی سے لڑنے کا یقین دلایا۔

شب کی تاریکی کے چھٹتے ہی عراقی و شامی پرے جما کر کھڑے ہوگئے۔ حضرت نے میمنہ کی کمان عبداللہ ابن بدیل کے اور میسرہ کی کمان عبداللہ ابن عباس کے سپرد کی اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہو کر ایک مشکیں گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا اور گھوڑے کی باگ اٹھاتے ہی ایڑ لگائی اور دم کے دم میں دشمن کی صفوں کے قریب پہنچ گئے اور عبداللہ ابن بدیل کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ابن بدیل دُہری زرہ پہنے اور دو تلواریں لٹکائے میمنہ لشکر کو لے کر میسرہ شام پر حملہ آور ہوئے اور تابڑ توڑ حملوں سے صفوں پر صفیں الٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ میسرۂ شام کے قدم اکھڑ گئے اور صفیں پراگندہ ہوگئیں۔ ابن بدیل نے میسرہ کو پسپا ہوتے دیکھا تو قلب لشکر کا رُخ کیا جہاں معاویہ پورے حفاظتی سر و سامان کے ساتھ مقیم تھے۔ اگرچہ ان کے گرد پانچ محافظ دستے آہنی دیوار کی طرح حصار باندھے کھڑے تھے مگر فوج کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو خوف و دہشت سے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹے ان کے ساتھ قلب لشکر بھی پیچھے ہٹا اور پیچھے ہٹ کر پھر سے صفیں جمائیں اتنے میں میسرہ شام پسپائی کے بعد آگے بڑھا اور قلب لشکر کے ساتھ مل کر میمنۂ عراق پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میمنۂ عراق کے قدم اکھڑ گئے اور جدھر جس کا منہ اٹھا اُدھر چل دیا۔ ابن بدیل کے ہمراہ صرف گنے چنے دو تین سو آدمی رہ گئے جو پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمن کے مقابلہ میں جمے رہے۔ ابن بدیل انہی گنتی کے چند آدمیوں کو لے کر معاویہ کے خیمہ کی طرف بڑھے تاکہ انہیں ٹھکانے لگائیں ادھر سے کمانیں کڑکیں چلے کھنچے اور تیروں کی بوچھار شروع ہوگئی مگر ان جانبازوں کے قدم نہ رُکے اور دشمن کی صفوں میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ چاروں طرف سے دشمن کے نرغہ میں گھر گئے۔

امیرالمومنین نے جب اپنے میمنہ کو بکھرتے اور ابن بدیل کے ہمراہیوں کو منتشر ہوتے دیکھا تو انہیں موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ آپ نے سہل ابن حنیف سے فرمایا کہ آگے بڑھ کر میمنہ کی مدد کرو مگر شامی سواروں نے حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ادھر میمنہ کے منتشر ہونے سے قلب لشکر جس میں خود امیرالمومنین تشریف فرما تھے متاثر ہوا اور لوگ متفرق و پراگندہ ہوگئے۔ حضرت نے قلب لشکر کی یہ حالت دیکھی تو میسرہ لشکر کا رُخ کیا اس حالت میں کہ نہ بدن پر زرہ تھی اور نہ سر پر خود اور ہاتھ میں صرف ایک نیزہ تھا۔ امام حسن امام حسین اور محمد ابن حنفیہ آپ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ داہنے بائیں اور سر کے اُوپر سے تیر سنسناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مگر چمکتی ہوئی تلواریں لچکتے ہوئے نیزے اور برستے ہوئے تیر آپ کے قدموں کو روک نہ سکے اس اثناء میں بنی اُمیہ کا ایک آزاد کردہ غلام احمر سامنے آیا یہ تلوار کا دھنی اور مانا ہوا شہزور تھا۔ حضرت

نے اس کی طرف بڑھنا چاہا کہ آپ کا ایک غلام کیسان اس کی طرف لپکا کچھ دیر مقابلہ کیا اور آخر اس کے ہاتھ سے شہید ہوگیا۔ اب اس نے امیرالمومنین پر حملہ کرنا چاہا آپ نے اس کے حملہ آور ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر اس کی زرہ کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور زور کر کے گھوڑے کے اوپر سے اسے اٹھا لیا اور اتنی زور سے زمین پر مارا کہ اس کی ہڈیاں پس کر سُرمہ ہوگئیں۔

حضرت دشمن کی کثرت اور گرد و پیش کے خطرات سے بے نیاز ہو کر تیزی سے آگے بڑھے امام حسن نے دشمن کی بڑھتی ہوئی یلغار کو دیکھ کر کہا کہ بابا کیا یہ بہتر نہ تھا کہ آپ دشمن کی طرف بڑھنے کی بجائے اپنی صفوں کی طرف چلے جاتے۔ حضرت نے فرمایا:۔

ان اباک واللہ لا یبالی اوقع علی الموت ام وقع الموت علیہ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۵۲)

بیٹا! خدا کی قسم تمہارے باپ کو اس کی پروا نہیں کہ وہ موت کی طرف بڑھے یا موت اس کی طرف بڑھے۔"

جب امیرالمومنین میسرہ کے قریب پہنچے تو لہراتے ہوئے پھریروں کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کن کے نشانات ہیں لوگوں نے کہا کہ یہ قبیلۂ ربیعہ کے پرچم ہیں فرمایا کہ یہ اللہ کی جماعت کے پرچم ہیں جس کے قدموں میں لغزش نہیں آئی اور جنگ کی سختیوں کے باوجود ثابت قدم رہی ہے۔ پھر ایک نوجوان حضین ابن منذر کو جو سرخ پرچم اٹھائے ہوئے تھا اپنے قریب بلایا اور فرمایا کہ تم اس علم کو لے کر ایک ہاتھ آگے نہیں بڑھتے اس نے کہا ضرور ایک ہاتھ کیا دس ہاتھ۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا حضرت نے اسے ضرورت سے زیادہ آگے بڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ بس یہیں رُک جاؤ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ قبیلۂ ربیعہ نے حضرت کو اپنی صفوں میں دیکھ کر کہا کہ اے لوگو تم میں سے ایک شخص کے زندہ ہوتے ہوئے اگر امیرالمومنین کو کوئی گزند پہنچا تو تم تمام عرب میں ذلیل و رسوا ہو جاؤ گے۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شامیوں کی صفوں کے مقابلہ میں صفیں جما دیں۔

حضرت میمنہ لشکر کے پسپا اور قلب لشکر کے منتشر ہونے کے بعد میسرہ میں تشریف فرما تھے کہ مالک اشتر کو میسرہ کی جانب آتے دیکھا۔ جب وہ قریب آئے تو فرمایا اے مالک تم میدان چھوڑ کر جانے والوں کو آواز دو اور انہیں کہو کہ اگر حیاتِ فانی کے دن ختم ہو چکے ہیں تو یہ فرار تمہیں موت سے نہیں بچا سکتا مالک نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کو آواز دی کہ اے لوگو! میں مالک اشتر ہوں تم میدان چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو۔ دشمن صرف دین کی بناء پر تم سے برسرِ پیکار ہے وہ چاہتا ہے کہ سنت کے آثار ختم کرے۔ جاہلیت کا دور پلٹائے اور تمہیں اسی مذہب و مسلک کا پابند بنائے جسے تم حسنِ بصیرت و حسنِ توفیق سے چھوڑ چکے

ہو۔ اے لوگو دین کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دینے کے لئے آؤ۔ یاد رکھو کہ فرار دنیا کی روسیاہی اور آخرت کی تباہی کا باعث ہے۔ مالک کی اس آواز پر قبیلۂ بنی مذحج پلٹا اور کہا کہ ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم اس پر عمل کریں گے۔ مالک نے کہا کہ تم نے میدان چھوڑ کر اپنے کو رسوا کیا ہے اب اس کی تلافی کرو اور مجھے امیرالمومنین کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دو۔ یہ لوگ مالک کی سرکردگی میں میمنہ کی جانب بڑھے جو دشمن کے حملوں کی تاب نہ لا کر پوری طرح بکھر چکا تھا۔ اگرچہ میمنہ میں سبھی کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ مگر قبیلۂ ہمدان نے سب سے آخر میں میدان چھوڑا تھا۔ ان کے آٹھ سو جانباز سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں جمے رہے اور جب ان میں سے ۱۸۰ آدمی کام آگئے اور ۱۱ علمبردار یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے اور ان کے قدم بھی اکھڑ گئے ان علمبرداروں میں کریب ابن شریح، شرجیل ابن شریح، مرثد ابن شریح، ہبیرہ ابن شریح اور سمیر ابن شریح چھ حقیقی بھائیوں نے باری باری علم اٹھایا اور جاں نثاری کا حق ادا کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ پھر سفیان ابن زید، اور کریب ابن زید نے علم بلند کیا اور یہ تینوں بھائی دادِ شجاعت دیتے ہوئے کام آگئے۔ ان کے بعد عمیرہ ابن بشیر نے علم اٹھایا اور یہ دونوں بھائی بھی شہید ہو گئے۔ ان کے بعد جب وہب ابن کریب نے علم اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس کے قبیلہ کے ایک آدمی نے کہا کہ اس علم کے نیچے بڑی کثرت سے لوگ مارے جا چکے ہیں تم اس علم کو لے کر میدان سے ہٹ جاؤ اور اپنی اور اپنے قبیلہ کی جانیں بچاؤ ورنہ تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اس نے دیکھا کہ مختصر جمعیت کے ساتھ شام کی طوفانی یلغاروں کو روکا نہیں جا سکتا مجبوراً پیچھے ہٹا اور اس کے ساتھ بچے کھچے لوگ بھی پیچھے ہٹے اور کہنے لگے کہ اگر ہمیں ایک ایسا گروہ مل جائے جو ہم سے یہ معاہدہ کرے کہ ایک ایک کر کے قتل ہو جائیں گے اور میدان نہیں چھوڑیں گے تو ہم آگے بڑھ کر لڑیں گے یہاں تک کہ قتل ہو جائیں یا دشمن کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ جب یہ لوگ مالک اشتر کے قریب سے گزرے تو انہوں نے ان کی بات سن کر کہا کہ آؤ ہم تم سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ جیتے جی میدان نہیں چھوڑیں گے یا ہم قتل ہو جائیں گے یا دشمن کو ٹھکانے لگائیں گے اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد وہ مالک کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ مالک نے از سر نو میمنہ کی صف بندی کی فوج میں جوش و ولولہ کی نئی روح بھری اور انہیں لے کر بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی سپاہ پر حملہ آور ہوئے۔

مالک مصروف جنگ تھے کہ چند آدمیوں کو دیکھا کہ وہ ایک سپاہی کو ہاتھوں پر اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کون ہے بتایا کہ یہ زیاد ابن نضر حارثی ہیں جو عبداللہ ابن بدیل کے لشکر میں شامل تھے۔ جب ابن بدیل نرغہ میں گھر گئے تو انہوں نے علم بلند کیا اور لڑتے ہوئے زخموں سے چور چور ہو گئے ہیں۔ پھر دیکھا کہ ایک اور زخمی کو اٹھا کر لایا جا رہا ہے۔ پوچھا کہ یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ یہ یزید ابن قیس

ارحبی ہیں جنہوں نے زیاد ابنِ نضر کے بعد علم اٹھایا اور لڑتے ہوئے زخموں سے نڈھال ہو گئے ہیں۔ مالک نے کہا کہ خدا کی قسم یہ ہے ان جانبازوں کا صبر و استقلال اور ان کی جانفروشی کا زندہ ثبوت۔ انسان کو شرم آنا چاہیئے کہ وہ جان لئے یا جان دیئے بغیر میدان سے منہ موڑے۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے اور صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں عبداللہ ابن بدیل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ زخموں سے بے حال پڑے تھے۔ جب ابن بدیل اور ان کے ہمراہیوں نے اپنے آدمیوں کو دیکھا تو ڈھارس بندھی اور ایک تازہ دم فوج کے مانند حملہ کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور معاویہ کی قیام گاہ کا رُخ کیا۔ مالک نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وُہ نہ رُکے اور قدم آگے بڑھائے۔ شامیوں کے لشکر سدِراہ ہوئے مگر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکے ان میں سے جو سامنے آتا ابنِ بدیل اسے تہ تیغ کر دیتے یہاں تک کہ سات آدمیوں کو قتل کر کے سیدھے معاویہ کے خیمہ کی طرف بڑھے۔ معاویہ نے انہیں دیکھا تو لشکر والوں سے چلا کر کہا کہ اگر تم تیروں، تلواروں اور نیزوں سے انہیں نہیں روک سکتے تو ان پر پتھر برساؤ چنانچہ چاروں طرف سے پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ابن بدیل اور اُن کے ساتھی زخموں سے نڈھال ہو گئے۔ شامیوں نے سنگِ باراں کر کے انہیں بے حال کر دیا تو تلواریں لے کر بڑھے انہوں نے بھی ہتھیار سنبھال لئے۔ مگر شامیوں کی بڑھتی ہوئی یلغار کو چند محصور اور زخمی نہ روک سکے۔ عبداللہ ابن بدیل اور ان کے ہمراہیوں میں سے کچھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور کچھ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ شامیوں نے ان بھاگنے والوں کا پیچھا کیا مگر مالک اشتر نے ابن جمہان جعفی کو ایک دستہ فوج کیساتھ بھیجا جنہوں نے شامیوں پر حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور یہ لوگ مالک کے لشکر میں آکر شامل ہو گئے۔

مالک اشتر دوسری سمت سے حملہ آور تھے اور اُن کے پرچم کے نیچے بنی مذحج اور قبیلہ ہمدان دشمن کے سروں پر تلواریں برسا رہے تھے۔ جب انہوں نے مل کر حملہ کیا تو شامی اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ جس طرح بھیڑیئے کو دیکھ کر بھیڑ بکریوں کے غول بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور عصر کے بعد ان صفوں میں جا کر شامل ہو گئے جو معاویہ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ان کی حفاظت کر رہی تھیں۔ مالک پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ان گھیرا ڈالنے والی صفوں پر حملہ کر کے انہیں منتشر کرنا شروع کیا۔ جب پانچ حفاظتی حلقوں میں سے صرف ایک حلقہ منتشر ہونے سے رہ گیا تو معاویہ نے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھ دیئے اور میدان چھوڑ کر نکل بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر پھر سنبھلے اور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جب قبیلۂ ربیعہ کے افراد میدان میں پرچم لہراتے ہوئے آئے تو شامیوں کی طرف سے ذوالکلاع حمیری قبیلہ حمیر کے ساتھ اور عبیداللہ ابن عمر چار ہزار قاریانِ شام کی جمعیت کے ساتھ حملہ آور ہوئے یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کمزور دل لوگوں کے قدم اکھڑ گئے اور جو ثابت قدم رہے وہ بھی توڑ کر لڑتے تو رہے مگر دشمن

کے مقابلہ میں کمزور پڑ گئے۔ زیاد ابن خصفہ نے جب دیکھا کہ شامی قبیلۂ ربیعہ پہ چھائے جارہے ہیں تو انہوں نے قبیلۂ عبد القیس سے کہا کہ ذوالکلاع اور عبیداللہ ابن عمر قبیلۂ ربیعہ کو ختم کئے دے رہے ہیں۔ اٹھو اور ان کی مدد کرو ورنہ وہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ قبیلۂ عبد القیس نے ہتھیار سنبھالے اور گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ربیعہ کی مدد کے لئے بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان پر اس طرح چھا گئے جس طرح مچلتی گھٹائیں اُفق پر چھائی جاتی ہیں۔ قبیلۂ عبد القیس کے آنے سے قبیلہ ربیعہ کی قوت و طاقت بڑھ گئی اور وہ پوری پامردی سے دشمن کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ ذوالکلاع اور عبیداللہ جو بڑے جوش و خروش سے لڑ رہے تھے ٹھنڈے پڑ گئے اور قبیلۂ حمیر میں بھی دم خم نہ رہا۔

اس ہنگامۂ کارزار میں امیرالمومنین کے لشکر میں سے ابو شجاع حمیری نے قبیلۂ حمیر سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے گروہ حمیر خدا تمہیں ذلیل و روسیاہ کرے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایک طاغی و باغی کی حمایت میں علی سے برسرِ پیکار ہو اور یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ معاویہ علی سے بہتر و افضل ہے اور پھر ذوالکلاع سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے ذوالکلاع ہم تمہارے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ تم دینی جذبات رکھتے ہو کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ معاویہ علی سے افضل اور اُن کے مقابلہ میں حق بجانب ہے کہا کہ میں معاویہ کو علی سے افضل تو نہیں سمجھتا مگر خون عثمان کے سلسلہ میں مجھے ان سے لڑنا پڑ گیا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ عثمان کا خون رائیگاں جائے۔ ذوالکلاع حضرت علی افضلیت کا تو اقرار کرتا ہے مگر قصاص کے جنون نے اسے فہم و فراست سے اس حد تک دور کر دیا تھا کہ لشکر شام کی ضلالت و کجروی کے بارے میں حدیث نبویؐ سن کر بھی اس کی بصیرت نے کام نہ دیا۔ چنانچہ اس نے عمرو ابن عاص سے جنگ کے دوران اور اس سے قبل پیغمبر اسلام کی یہ حدیث سنی تھی کہ عمار کا قاتل ایک باغی گروہ ہوگا۔ اس حدیث کی وجہ سے وہ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہا اور چاہا کہ وہ اس جنگ میں عمار کا موقف معلوم کرے۔ چنانچہ وہ حضرت کی صفوں میں اپنے قبیلہ کی ایک فرد ابو نوح حمیری کی تلاش میں آیا تاکہ اس سے عمار کے بارے میں دریافت کرے۔ جب اس سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں گو تم لشکر مخالف کی ایک فرد ہو مگر تمہاری صدق بیانی و راست گوئی پر مجھے اعتماد ہے۔ کہا کہ پوچھو میں صحیح صحیح بات کہوں گا اور غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا۔ کہا کہ عمرو ابن عاص نے حضرت عمر کے دورِ خلافت میں یہ حدیث بیان کی تھی کہ شام اور عراق کے دو گروہ آپس میں ٹکرائیں گے اور وہ گروہ حق بجانب ہوگا جس میں عمار یاسر ہوں گے۔ کیا عمار یاسر تمہاری صفوں میں موجود ہیں کہا کہ خدا کی قسم وہ ہمارے لشکر میں موجود ہیں اور تم میں سے ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتارنے کی فکر میں ہیں۔ کہا کہ پھر تھوڑا وقت نکال کر میرے ساتھ عمرو ابن عاص کے خیمہ تک

چلو اور اسے بتاؤ کہ عمار یاسر تمہارے لشکر میں موجود ہیں شائد اس کے نتیجہ میں جنگ رُک جائے، صلح کی کوئی صورت نکل آئے اور ہم ہلاکت و تباہی بچ جائیں۔ کہا کہ میں جانے کو تو جا سکتا ہوں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ میں تمہارے غدر و فریب کا شکار نہ ہو جاؤں۔ ذوالکلاع نے کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو درمیان میں لا کر تم سے عہد کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ نہ تمہیں قتل کیا جائے گا۔ نہ تمہارے ہتھیار چھینے جائیں گے اور نہ تمہیں بیعت پر مجبور کیا جائے گا تم صرف عمرو ابن عاص کے سامنے اتنا کہہ دو کہ عمار تمہارے لشکر میں موجود ہیں۔ اس عہد و پیمان کے بعد دونوں عمرو ابن عاص کی قیامگاہ پر پہنچے۔ عمرو نے ذوالکلاع کے ہمراہ ایک اجنبی کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون ہے مجھے تو یہ ابوترابی معلوم ہوتا ہے ابو نوح نے کہا کہ میرے چہرے سے پیغمبر اور دوستداران پیغمبر کی عظمت و قدوسیت کے آثار نمایاں ہیں اور تمہارے اندر مجھے ابوجہل اور فرعون کے عادات و اطوار کی جھلک نظر آرہی ہے۔ اس پر ابوالاعور سلمی نے تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ یہ ذلیل اور جھوٹا ہمارے منہ پر ہمیں گالیاں دیتا ہے ہم اس بدزبانی کا اسے مزا چکھائیں گے۔ ذوالکلاع نے کہا کہ یہ میرا ابن عم ہے اور میں نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اگر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں تمہاری ناک توڑ دوں گا۔ میں اسے اس غرض سے لایا ہوں کہ یہ تمہیں عمار کے بارے میں بتائے۔ عمرو ابن عاص نے پوچھا کہ کیا عمار علی کے لشکر میں شامل ہیں۔ ابو نوح نے کہا کہ تم ان کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو؟ کہا کہ میں نے رسول کو فرماتے سنا تھا۔ ان عمارا تقتله الفئة الباغیه۔ عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔" کہا کہ خدا کی قسم عمار ہمارے لشکر میں موجود ہیں اور وہ تمہیں اور تمہاری سپاہ کو نیست و نابود کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ذوالکلاع کو جب عمار کی موجودگی اور حدیث پیغمبر کی کی تصدیق ہو گئی تو کہا کہ پھر وہ باغی گروہ تو ہم ہوئے عمرو نے کہا کہ وہ علی کے ساتھ ہیں تو کیا ہوا آخر میں وہ ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔

یہ جواب صرف ایک طفل تسلی کی حیثیت رکھتا ہے جس سے سطحی ذہنوں سے تو کھیلا جا سکتا ہے۔ مگر کسی بابصیرت شخص کے لئے اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ کون سے قرائن تھے جن کے پیش نظر یہ دعویٰ کیا گیا کہ عمار امیرالمومنین سے کٹ کر سپاہ شام میں شامل ہو جائیں گے۔ کیا ان سے رسل و رسائل کا رابطہ تھا یا ان سے در پردہ کوئی بات چیت ہو رہی تھی یا ان کے طور طریقوں سے اس کا اندازہ لگایا تھا؟ جب یہ کچھ نہ تھا تو یہ جواب ایک فریب کے سوا کیا ہو سکتا ہے جسے اس لئے گھڑ لیا گیا تاکہ سننے والوں کو اپنے دام میں جکڑے رکھیں۔ خدا جانے یہ جواب ذوالکلاع کو مطمئن کر سکا یا نہیں مگر وہ عملاً سپاہ شام ہی سے منسلک رہا۔ حالانکہ لشکر ہی کی ایک فرد عبداللہ ابن عمر عنسی نے اس گفتگو کو سن کر ذوالکلاع کو رائے

دی کہ وہ باغی گروہ کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جائے مگر وہ نہ مانا۔ شائد اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی ہوگی کہ عمار ان کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے۔ البتہ عبداللہ ابن عمر عنسی لشکر شام سے الگ ہو کر امیرالمومنین کے لشکر میں شامل ہو گیا اور اس موقع پر چند اشعار کہے جن میں سے دو شعر یہ ہیں :۔

لا لا اقاتل عمار اعلیٰ طمع　　　بعد الروایة حتی ینفخ الصور

" اس روایت کے بعد میں کسی طمع و لالچ کی بناء پر صور کے پھونکنے تک عمار سے جنگ وقتال نہیں کروں گا "

ترکت عمرا واشیاعاله نکدا　　　انی بترکهم یا صاح معذور

" میں نے ابن عاص اور اس کے باغی گروہ کو چھوڑ دیا ہے اور اے دوست میں انہیں چھوڑ دینے میں معذور ہوں "

معاویہ کو اس واقعہ کا جب علم ہوا تو وہ عمرو ابن عاص پر بہت بگڑے۔ عمرو نے کہا کہ میں نے تو حدیث رسول بیان کی تھی اب کوئی چلا جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

ذوالکلاع عمار یاسر کی راہ تکتا رہ گیا اور میدان جنگ میں لڑتا ہوا قبیلۂ بکر ابن وائل کی ایک فرد خندف بکری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ذوالکلاع کے بیٹے کو جب باپ کے مارے جانے کا علم ہوا تو ایک شخص کے ذریعہ اشعث ابن قیس کو کہلوا بھیجا کہ اسے باپ کا لاشہ اٹھالانے کی اجازت دی جائے۔ اشعث نے جواب میں کہا کہ اگر میں نے اجازت دے دی تو امیرالمومنین مجھے مشکوک نظروں سے دیکھیں گے۔ اور میں پہلے ہی کون سا ثقہ و معتمد ہوں۔ تم سعید ابن قیس ہمدانی سے جو میمنہ لشکر میں موجود ہیں دریافت کرو۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو پھر تمہیں کوئی روک نہیں سکتا۔ ابن ذی الکلاع نے سعید کے پاس آدمی بھیجا اور ان سے اجازت طلب کی۔ سعید نے کہا کہ امیرالمومنین کی اس پر نظر نہیں ہے کہ تم میں سے کون آتا ہے اور کون جاتا ہے تم بے کھٹکے آؤ اور اپنے باپ کا مُردہ اٹھالے جاؤ۔ ابن ذی الکلاع حضرت کے میمنۂ لشکر میں آیا اور باپ کا لاشہ ادھر اُدھر تلاش کیا مگر کہیں نظر نہ آیا۔ پھر میسرہ لشکر کا رُخ کیا وہاں بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی نظر ایک خیمہ پر پڑی دیکھا کہ ذوالکلاع کا لاشہ خیمہ کی طنابوں سے جکڑا پڑا ہے۔ اس نے خیمہ والوں سے کہا کہ مجھے اپنے باپ کی میت اٹھالے جانے کی اجازت دو۔ انہوں نے کہا کہ ہماری طرف سے اجازت ہے اور ہم تم سے معذرت خواہ ہیں اور اللہ سے بھی عذر خواہ ہیں۔ اگر تمہارا باپ امیرالمومنین کا باغی نہ ہوتا تو اس حالت میں نہ پڑا رہتا۔ ابن ذی الکلاع اور اس کے ایک حبشی غلام نے چاہا کہ اسے اٹھائیں مگر اس پہاڑ کا اٹھانا آسان کام نہ تھا ہمت ہار کر بیٹھ گئے

اور اہلِ خیمہ سے کہا کہ تم میں کوئی ہے جو اس کے اٹھانے میں ہمارا ہاتھ بٹائے؟ خندف بکری نے کہا کہ تم دونوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ کہا کہ اگر ہم پیچھے ہٹ گئے تو تم اکیلے اسے کیونکر اٹھا سکو گے۔ کہا کہ جس نے اُسے اس حالت تک پہنچایا ہے وُہ اُسے اٹھا بھی سکتا ہے۔ چنانچہ خندف نے اسے اٹھا کر خچر پر لادا اور رسیوں سے جکڑ دیا۔

ذوالکلاع کے مارے جانے سے حمیریوں کا جوشِ انتقام بڑھ گیا اور وُہ عبیداللہ ابن عمر کی صفوں میں آکر شامل ہو گئے۔ اس موقع پر عبیداللہ نے ایک دام فریب بچھایا اور امام حسن کو پیغام بھجوایا کہ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اسے سن لیجئے۔ امام حسن کو یہ پیغام ملا تو آپ صفوں سے نکل کر اس کے سامنے آئے اور فرمایا کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟ کہا کہ میں جو بات کہنے والا ہوں اس سے آپ ہی کا مفاد وابستہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ قریش کو علی سے انتہائی صدمات پہنچ چکے ہیں وہ آپ کی امارت تو گوارا کر سکتے ہیں مگر ان کا اقتدار کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ انہیں اقتدار سے الگ کرنے میں ہمارا ساتھ دیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ان کی برطرفی کے بعد خلافت آپ کے سپرد کر دیں گے۔ امام حسن نے یہ بات سنی تو نفرت وحقارت سے پیشانی پر بل ڈالا اور فرمایا کہ اے عبیداللہ تم آج نہیں تو کل مارے جاؤ گے۔ تمہیں شیطان نے بہکا کر اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہلاکت اور تباہی ہی تباہی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں امیرالمومنین کے خلاف کسی سازش میں حصہ لوں۔ تم نے یہ کہہ کر اپنی کم ظرفی اور عقل سے تہی دامانی کا ثبوت دیا ہے۔ عبیداللہ نے یہ جواب سُنا تو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

اب اس نے پلٹ کر صف بندی کی اور عقبی جانب سے حضرت کے میسرہ پر حملہ کیا۔ میسرہ میں قبیلۂ ربیعہ کے جانباز پہلے ہی سے مستعد تھے انہوں نے تلواریں کھینچ لیں اور دشمن کی صفوں میں گھس کر تہلکہ مچا دیا۔ ظہر سے لے کر مغرب تک پیہم تلواریں چلتی رہیں اور خون کے سیلاب بہتے رہے۔ آخر میسرۂ عراق نے اس شدت سے حملہ کیا کہ میمنۂ شام منتشر ہو گیا۔ مگر رات کے اندھیرے میں پھر سمٹ کر جمع ہوا۔ قبیلہ ربیعہ نے حملہ کر کے پھر اسے منتشر کیا یہاں تک کہ شامیوں کے جھنڈے کے گرد صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے جنہوں نے از سرِ نو اپنی صفیں درست کیں اور جان توڑ مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ ادھر قبیلہ ربیعہ بھی جان لڑائے ہوئے تھا آگے بڑھ کر شامیوں سے گتھ گیا۔ شب بھر تلواروں پر تلواریں چلتی رہیں اور لاشوں کے ڈھیر لگتے رہے۔ اس خونی ہنگامہ میں نماز کا وقت آتا اور گزر جاتا۔ اور اتنا موقع ہی نہ ملتا تھا کہ نماز ادا کی جا سکے۔ اوقات نماز میں صرف تکبیروں پر اکتفاء کی جاتی تھی۔ جب اس بھیانک رات نے اپنا دامن سمیٹا اور افق پر صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو حضرت کے لشکر میں اذان کی آواز بلند ہوئی۔ حضرت نے صدائے اذان سُن کر فرمایا:۔

یا مرحبا بالقائلین عدلا   و بالصلوٰۃ مرحبا و اھلا

اس معرکہ میں عبیداللہ ابن عمر، ہانی ابن خطاب یا محرز ابن صحصح یا حریث ابن جابر حنفی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ شامیوں کی طرف سے عبیداللہ کا لاشہ حاصل کرنے کے لئے دس ہزار درہم کی پیشکش کی گئی مگر حضرت نے ان کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا:۔

انما جیفتہ جیفۃ کلب لایحل بیعھا۔ (مروج الذہب۔ ج ۲ ص ۲۴)   "یہ ایک سگِ مردہ کی لونتھ ہے اس کی بیع جائز نہیں ہے۔"

آخر اس کی دونوں بیویوں بحریہ بنت ہانی اور اسماء بنت عطارد اس کی میت لینے کے لئے آئیں کچھ لوگوں نے کہا کہ تم تو ان کی میت اٹھانے سے رہیں اگر چاہو تو ہم اس کا لاشہ خچر کی دُم سے باندھے دیتے ہیں۔ اور اسے ہنکاتے ہوئے تمہارے خیمہ تک پہنچائے دیتے ہیں۔ اتنے میں زیاد ابن خصفہ خیمہ سے باہر نکلے تو بحریہ بنت ہانی نے ان سے میت لے جانے کے لئے کہا۔ انہوں نے لاشہ ایک خچر پر لدوا دیا اور وُہ اسے اپنے ہمراہ لے گئیں اس طرح کہ اس کے ہاتھ پیر زمین پر گھسٹتے جارہے تھے۔

ذوالکلاع اور عبیداللہ کے مارے جانے سے معاویہ پر خوف وہراس طاری ہو گیا۔ انہوں نے عمرو ابن عاص سے کہا کہ خدا جانے اب یہ عراقی کیا قدم اٹھانے والے ہیں۔ عمرو نے کہا کہ تم قبیلۂ ربیعہ کے حملوں کو تو دیکھ ہی چکے ہو اگر انہوں نے علی کے گرد جمع ہو کر حملہ کیا تو ان کے مقابلہ میں شامیوں کے قدم مشکل ہی سے جم سکیں گے۔ معاویہ نے کہا کہ تم مجھے حوصلہ دلانے کے بجائے اور ہراساں کر رہے ہو۔ کہا کہ جو مجھے نظر آرہا ہے میں نے وہی کہا ہے۔ معاویہ کو جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے خالد ابن معمر کو جو سپاہِ ربیعہ کی کمان سنبھالے ہوئے لڑ رہا تھا یہ پیغام بھجوایا کہ اگر تم میدان سے پیچھے ہٹ جاؤ گے تو میں کامیابی کے بعد تمہیں خراسان کی امارت دوں گا جس پر تم میری زندگی تک فائز رہو گے۔ چنانچہ جب ربیعہ کی پرجوش فوجیں شامیوں کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اس نے اپنے قدم روک لئے اور فوجوں کو منتشر کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ خالد نے ہوس اقتدار سے مغلوب ہو کر آخرت سے منہ موڑا مگر اسے دنیا بھی نصیب نہ ہو سکی۔ چنانچہ جب معاویہ نے اس غداری کے صلہ میں اسے امارت خراسان کا پروانہ بھیجا تو وُہ خراسان پہنچنے سے پہلے مرگیا اور دنیا و آخرت دونوں سے محروم رہا۔

اس حرب وضرب کی گرم بازاری میں لشکر شام کا ایک تیغ زن کریب ابن صباح حمیری صفوں سے باہر نکل کر للکارا۔ سپاہِ عراق میں سے مرتفع ابن وضاح زبیدی اس کے مقابلہ کے لئے نکلے مگر تابِ مقاومت کھو کر اس کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ اس نے دوسری مرتبہ للکارا۔ اب حارث ابن جلاح اس کے مقابلہ

کے لئے بڑھے مگر وُہ بھی اسے زیر نہ کر سکے اور تلوار کا وار کھا کر دم توڑ دیا۔ اس کے تیسری مرتبہ پکارنے پر عائذ ابن مسروق ہمدانی میدان میں آئے اور وُہ بھی اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ان تین آدمیوں کو شہید کرنے کے بعد کریب کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے تینوں لاشوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھا اور ان پر چڑھ کر للکارنے لگا۔ امیرالمومنین نے اس کی یہ وحشیانہ حرکت دیکھی تو اس خیال سے کہ دیکھنے والے اس کی تیغ زنی سے مرعوب نہ ہوں کسی اور کو بھیجنے کے بجائے خود اس کے مقابلے کے لئے بڑھے اور اس کے قریب پہنچ کر فرمایا اے کریب یاد رکھ کہ ہند جگر خوار کا بیٹا تجھے جہنم کے شعلوں میں جھونک دے گا میں تجھے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہم اس قسم کی باتیں بہت سنتے چلے آرہے ہیں آپ میری تلوار کی کاٹ تو دیکھ ہی چکے ہیں اگر حوصلہ ہے تو مجھ سے لڑ لیجیے۔ حضرت کے تیور بدلے اور آگے بڑھ کر اس پر تلوار کا وار کیا وہ زخمی ہو کر زمین پر گرا اور کچھ دیر خاک و خون میں لوٹنے اور ایڑیاں رگڑنے کے بعد خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ اسے ختم کرنے کے بعد حضرت نے دوسرا مبارز طلب کیا۔ فوج مخالف سے حارث ابن وداعہ حمیری میدان میں آیا حضرت نے اسے بھی زمین پر پچھاڑ دیا۔ پھر تیسری مرتبہ للکارنے پر مطاع ابن المطلب عبسی مقابلہ کے لئے نکلا۔ حضرت نے اسے بھی تہ تیغ کر دیا۔ اور شامیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر تم ابتداء نہ کرتے تو ہم بھی پہل نہ کرتے اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی :۔

الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات قصاص فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین ۔	حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مساوی ہے اور حرمت والی چیزوں میں برابر کا بدلہ ہے لہٰذا جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے کی ہے ویسی زیادتی تم بھی اس پر کرو اور اس بات کو جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

اس واقعہ پر نظر کرنے سے حق و عدالت کی ایسی تصویر نظروں کے سامنے آتی ہے جس کی مثال تاریخ حرب و ضرب میں نظر نہیں آتی۔ آپ نے اس موقع پر تین جنگ آزماؤں کو تہ تیغ کرنے کے بعد اپنا ہاتھ روک لیا حالانکہ ایسے موقع پر جب تین جوانمرد قتل ہو چکے ہوں۔ تو شجاعت کا دلولہ ابھر آتا ہے۔ اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے جس طرح کریب کا حوصلہ دیوانگی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ اگر آپ اس کے بعد بھی للکارتے اور دشمن کی صفوں سے نکلنے والے سورماؤں کو قتل کرتے رہتے تو شامیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ٹھکانے لگ سکتی تھی کیونکہ تلوار "شیرِ خدا" کے ہاتھ میں تھی مگر آپ نے حق و انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اتنے ہی افراد قتل کئے جتنے اس موقع پر دشمن کے ہاتھ سے مارے گئے تھے

اور جتنی کریب کے ہاتھوں سے خونریزی ہوئی تھی اس سے زیادہ خونریزی گوارا نہ کی۔

تیغ بہرِ عزتِ دین است وبس　　مقصدِ او حفظِ آئین است وبس

اس محاربہ حق و باطل میں عمار ابن یاسر خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہ رہ سکتے تھے وہ جنگ آزما تلوار کے دھنی اور مانے ہوئے مردِ میدان تھے۔ بدر، اُحد، خندق اور دوسرے غزوات میں شریک ہوکر اپنی شجاعت کا لوہا منوا چکے تھے۔ اگرچہ اب ہاتھوں میں رعشہ چہرے پر جھریاں اور کمر میں جھکاؤ آ گیا تھا اور عمر کی ترانویں منزلیں طے کرچکے تھے مگر انحطاط عمر کے باوجود جوانوں سے آگے نظر آتے تھے۔ رنگ گندم گوں سینہ چوڑا چکلا آنکھیں بڑی قد لانبا ریش سفید اور تیور شجاعانہ تھے۔ جب سے پیغمبر اکرم کی زبان مبارک سے اپنی شہادت کی خبر سنی تھی جذبۂ جہاد سے مخمور اور شوقِ شہادت میں سرشار رہتے تھے۔ شام کے باغیوں کو دیکھ کر پیغمبر کی صدائے حق یا عمار تقتلك الفئة الباغیه " اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا" کانوں میں گونجنے لگی۔ خمیدہ کمر میں پٹکا باندھا لٹکی ہوئی بھووں کو اوپر اٹھایا۔ کانپتے ہاتھوں میں تلوار لی اور امیر المومنین کے سامنے آکر اجازت طلب ہوئے۔ حضرت نے نظر بھر کر عمار کو دیکھا اور فرمایا مہلاً رحمك الله " ٹھہرو خدا تم پر رحم کرے" عمار نے حضرت کو اذنِ جہاد دینے میں متردد دیکھا تو کہا کہ پیغمبر اکرم مجھے شہادت کی خبر دے گئے تھے۔ اب میں عمر کی آخری منزل میں ہوں اور شہادت گاہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ لہٰذا مجھے اجازت دیجیئے۔ حضرت نے عمار کے تیور دیکھے تو انہیں بادل نخواستہ اجازت دی۔ عمار نے زرہ پہنی ہتھیار سجے گھوڑے پر پڑی جمائی اور سر آسمان کی طرف بلند کرکے کہا:-

اللھم انك تعلم انی لو اعلم ان رضاك فی ان اقذف بنفسی فی ھذا البحر لفعلته اللھم انك تعلم انی لو اعلم ان رضاك فی ان اضع ظبة سیفی فی صدری ثم انحنی علیھا حتّٰی تخرج من ظھری لفعلته و انی لا اعلم الیوم ھو ارضی لك من جھاد ھولاء الفاسقین ولو اعلم ان عملا من الاعمال

بارِ الٰہا! تُو خوب جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ تیری رضا اس میں ہے کہ میں دریا میں پھاند جاؤں تو میں ایسا کر گزرتا۔ اے خدا تُو جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تیری خوشنودی اس میں ہے کہ مَیں تلوار کی نوک اپنے سینہ پر رکھوں اور اتنا جھکوں کہ تلوار میرا سینہ چیر کر پشت کے پار ہو جائے تو مجھے اس میں بھی دریغ نہ ہوتا۔ میں آج کے دن تیری خوشنودی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں سمجھتا کہ ان فاسقوں سے جہاد کروں اگر مجھے علم ہوتا کہ اس عمل سے بڑھ

هو ارضی لك لفعلته۔ | گر کوئی عمل تجھے خوش کرنے والا ہے تو میں اس میں بھی کوتاہی نہ کرتا۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۲۶)

امیرالمومنین نے ایک دستۂ فوج عمار کی زیر کمان ترتیب دیا۔ علمِ لشکر ہاشم ابن عتبہ مرقال کے سپرد کیا اور اُن سے مسکراتے ہوئے فرمایا اے ہاشم تم کب تک روٹیاں توڑتے رہوگے۔ اٹھو اور دشمنانِ دین سے جنگ کرو۔ ہاشم نے جو جواب دیا اس کی ترجمانی سعدی کا یہ شعر کرتا ہے ؎

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من | ایں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرم

ہاشم نے علم لینے کے بعد معاویہ کے لشکر کی طرف نظر دوڑائی اور ایک دستہ فوج کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں بتایا گیا کہ یہ ذوالکلاع کا قبیلہ ہے۔ پھر ایک اور دستہ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ کون ہیں بتایا گیا کہ یہ قریش اور اہل مدینہ کا ملا جلا مجمع ہے۔ پھر دوسری سمت اشارہ کرکے پوچھا کہ اس گنبد نما خیمہ کے گرد و پیش کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ معاویہ اور ان کے حفاظتی دستے ہیں۔ کہا کہ خیمہ کی ادھر بھی کچھ لوگوں کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ بتایا گیا کہ یہ عمرو ابن عاص اس کے بیٹے اور اہالی موالی ہیں۔ جب فوجیں صف بستہ و تیار ہوگئیں تو عمار یاسر نے ان سے خطاب کرتے ہوئے، کہا اے جانبازو اٹھو اور ان فتنہ پردازوں سے جنگ کرو جنہوں نے خونِ عثمان کے قصاص پر جنگ چھیڑی ہے، وہ لوگوں کو فریب دینے کے لئے کہتے ہیں کہ عثمان مظلوم مارے گئے اور ہم ان کے قصاص کے طالب ہیں۔ انہیں قصاص سے کیا مطلب انہیں تو جنگ چھیڑنے کے لئے کوئی بہانہ چاہیئے تھا اور یہ بہانہ ان کے ہاتھ لگ گیا جس سے وہ عوام کو ورغلا کر میدان میں لے آئے ہیں۔ اس جنگ و قتال کا مقصد صرف اقتدار حاصل کرنا ہے۔ انہیں نہ دین سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ حق سے کوئی واسطہ وہ نہیں چاہتے کہ کہ دین و مذہب کی پابندیاں اُن کے مادی لذائذ اور دنیوی تعیشات میں حائل ہوں۔ اس تقریر کے بعد ہاشم نے علم کو جنبش دی لشکر میں حرکت پیدا ہوئی اور ہاشم اور عمار دونوں ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور فوجوں کے جلو میں دشمن کی صفوں کی طرف بڑھے۔ عمار جس طرف سے ہو کر گزرتے صحابہ ہجوم کرکے ساتھ ہو جاتے۔ معاویہ نے جب اس جم غفیر کو بڑھتے دیکھا تو ابوالاعور سلمی کی قیادت میں تازہ دم فوجوں کو میدان میں اتارا۔ عمار یاسر نے سپاہِ شام میں عمرو ابن عاص کو دیکھا تو اُسے مخاطب کرکے کہا "تف ہے تیری اوقات پر تو نے مصر کی چند روزہ حکومت کی خاطر اپنا دین تک بیچ ڈالا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے تو نے ہمیشہ اسلام کیخلاف بغاوت کرکے اپنی کجروی کا ثبوت دیا ہے۔" عمرو نے کہا کہ ہم خون عثمان کا بدلہ لے رہے ہیں۔ کہا کہ تو نے یہ قدم اللہ کو خوش کرنے کے لئے نہیں اٹھایا۔ میں اس سے پہلے بھی تین

مرتبہ پیغمبر اکرم کے لشکر میں شامل ہو کر تجھ سے لڑ چکا ہوں اور جس نظریہ کی بنا پر پہلے لڑا تھا آج بھی اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر لڑ رہا ہوں۔ اے عمرو کیا تو پیغمبر کا یہ ارشاد بھول گیا کہ:" اے عمار تمہیں اے ایک باغی گروہ قتل کرے گا تم اسے جنت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تمہیں دوزخ کی طرف دعوت دے گا"، مجھے دیکھو اور پہچانو میں عمار ہوں۔ عمرو کے پاس ان باتوں کا جواب ہی کیا تھا سن کر چپ ہو رہا۔

جب دونوں طرف کے لشکر بالمقابل کھڑے ہوئے تو تلواریں اور نیزے لے کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور تلواریں تلواروں سے ٹکرانے لگیں۔ اس گھمسان کی جنگ میں ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ عمار اور ہاشم بھی اس ریلے میں بہہ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ عمار پیری و ضعیفی کے باوجود کانپتے ہاتھوں سے تلوار چلاتے اور دشمن کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے رہے لڑتے لڑتے نظریں اٹھیں تو دیکھا کہ ہاشم کھڑے ہیں۔ کہا اے ہاشم کیوں کھڑے ہو آگے بڑھو اور دشمن کی صفوں میں گھس کر حملہ کرو آج جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور جنت تیغ و سنان کے سایہ میں ہے۔ اگر یہ لوگ ہمیں پسپا کر کے بحرین کے نخلستان تک دھکیل لے جائیں جب بھی ہمیں یقین ہے کہ ہم حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر ہیں ہاشم نے علم لہرایا اور برق خاطف کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ سروں پر تلواریں چمکیں، سینوں میں نیزے اُترے اور لاشوں پر لاشے گرنے لگے۔ عمرو ابن عاص نے دیکھا تو کہا کہ اگر یہ سیاہ جھنڈے والا یونہی لڑتا رہا تو عرب کا صفایا کر دے گا۔ ہاشم اور عمار کے پے در پے حملوں سے شامیوں کی پانچ صفوں میں سے تین صفیں منتشر ہو گئیں۔ جب چوتھی صف پر حملہ آور ہونے کی نوبت آئی تو وہ جان توڑ کر مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں سے قبیلہ ازد اور بجیلہ نے قبیلہ ہمدان کے جوانوں پر بھرپور حملہ کیا جس سے وقتی طور پر ان کے قدم اکھڑ گئے اور ایک ٹیلے پر چڑھ کر پناہ لینے کے لئے پیچھے ہٹے مگر بجیلہ اور ازد نے تعاقب کر کے انہیں میدان میں اُتار لیا۔ اب ہمدان کے جوانمردوں نے جم کر جو حملہ کیا تو ان کے تین ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کر کے بقیۃ السیف کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ عمار یاسر اپنے ہمراہیوں کو لیکر آگے بڑھے اور ان جتھوں کے قریب پہنچ گئے جو معاویہ کے گرد حصار باندھے کھڑے تھے۔ معاویہ نے انہیں آگے بڑھتے دیکھا تو حفاظتی دستوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر ان کا راستہ روکیں۔ چنانچہ وہ شمشیر بکف آگے بڑھے۔ ان لوگوں میں عمرو ابن عاص کا بیٹا عبداللہ بھی تھا۔ جو ایک تلوار کمر میں لٹکائے اور ایک تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ جب عمار نے اس سمت کا رُخ کیا جدھر عبداللہ تھا تو عمرو اپنے بیٹے کو دیکھ کر چلایا کہ ہائے میرا بیٹا۔ معاویہ نے کہا کہ حوصلہ سے کام لو کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ کہا یہ میرا بیٹا ہے اگر تمہارا بیٹا یزید ہوتا تو میں دیکھتا کہ تم کس طرح صبر کرتے ہو۔ آخر عمرو کے چیخنے چلانے

کی وجہ سے چند شامی آگے بڑھے اور عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو صفوں سے باہر نکال لائے۔

عمار یاسر حملوں پر حملے کر رہے تھے کہ ایک شخص کے ہاتھ سے زخمی ہو گئے۔ قوت و طاقت نے جواب دے دیا اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی زخموں نے نڈھال اور پیاس کی شدت نے بے حال کر دیا ۔ آپ کے ایک غلام راشد نے دودھ میں پانی ملا کر پیش کیا آپ نے اس میں سے کچھ پیا اور کہا:۔

صدق اللہ ورسولہ الیوم القی الاحبۃ محمدا وحزبہ قال رسول اللہ ان اخر رزقی من الدنیا ضیحۃ لبن۔ (تاریخ ابو الفداء ج ا ص ۱۸۱)	اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات سچ ہے۔ میں آج اپنے دوستوں سے ملاقات کروں گا۔ محمد مصطفیٰ اور ان کے گروہ سے۔ رسول اللہ فرما گئے تھے کہ اس دنیا میں میرا آخری رزق پانی میں ملا ہوا دودھ ہو گا،،

دودھ پینے سے جسم لاغر میں کچھ توانائی آئی اور پھر حملہ کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے دل میں جان دینے اور مرمٹنے کا جذبہ تھا دنیا کی زندگی سے جی اچاٹ ہو چکا تھا اور ہر قدم طلب شہادت میں اٹھ رہا تھا۔ آپ مصروفِ جہاد تھے کہ باغی گروہ کی ایک فرد ابو الغادیہ فزاری نے آپ پر نیزہ مارا اور ابن جون سکسکی نے آگے بڑھ کر تلوار سے سر قلم کر دیا۔

امیر المومنین کو عمار کی شہادت کی خبر ہوئی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ان کی میت پر آئے اور لاش کو دیکھ کر یہ دو شعر پڑھے:۔

الا ایھا الموت الذی ھو قاصدی ارحنی فقد افنیت کل خلیلی

"اے موت آ اور مجھے سکون و راحت سے ہمکنار کر تو نے میرے تمام دوستوں کو فنا کر ڈالا ہے اور مجھے بھی چھوڑنے والی نہیں ہے "

اراک بصیرا بالذین احبھم کانک تنحو نحوھم بدلیل

"مجھے یوں نظر آتا ہے کہ تو میرے دوستوں میں سے ایک ایک کو پہچانتی ہے گویا کوئی بتانے والا تجھے ان کی نشاندہی کر رہا ہے"

پھر انا للہ وانا الیہ راجعون کے بعد فرمایا کہ جو شخص عمار کی موت سے رنجیدہ خاطر نہیں ہے وہ اسلام سے بہرہ یاب نہیں ہے۔ اس کے بعد نماز جنازہ ادا کی اور انہی کپڑوں میں اسی سرزمین پر انہیں دفن کر دیا۔

عمار کی شہادت سے شامیوں کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوا اور ان کا باغیانہ موقف بے نقاب ہو

گیا کیونکہ ان میں سے ایک طبقہ نے پیغمبر اکرم کا یہ ارشاد سن رکھا تھا:۔

تقتله الفئة الباغية الناکبة عن الطریق وان اخر رزقه ضیاح من لبن۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۵۸)

انہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا جو سیدھی راہ سے منحرف ہوگا اور ان کا آخری رزق دودھ ہو گا جس میں پانی ملا ہوا ہوگا۔

اسی حدیث کی بنا پر ذوالکلاع حمیری کو ذہنی پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ مگر عمرو ابن عاص نے یہ کہہ کر اسے اطمینان دلا دیا تھا کہ عمار ہماری طرف پلٹ آئیں گے۔ اب وہ زندہ ہوتا تو عمرو سے پوچھتا کہ تمہارا وہ دعویٰ کیا ہوا اور ممکن تھا کہ وہ اس واضح حقیقت کو دیکھ کر عمرو کے فریب کا پردہ چاک کرتا اور اپنے قبیلہ سمیت باغیوں کے گروہ سے علیحدہ ہو جاتا۔ چنانچہ عمرو نے عمار کی شہادت پر اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

ما ادری بقتل ایهما انا اشد فرحا بقتل عمار او بقتل ذی الکلاع والله لو بقی ذوالکلاع بعد قتل عمار لمال بعامة اهل الشام الی علی۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۵۸)

مجھے نہیں معلوم کہ میں عمار کے قتل سے زیادہ خوش ہوں یا ذوالکلاع کے مارے جانے سے۔ خدا کی قسم اگر ذوالکلاع کے جیتے جی عمار قتل ہو جاتے تو وہ شامیوں کو لے کر علی کے لشکر میں شامل ہو جاتا۔

خزیمہ ابن ثابت انصاری بھی عمار کی شہادت سے پہلے متردد اور حق و باطل کی تمیز سے قاصر رہے اور اس وقت تک تلوار اٹھانا گوارا نہیں کیا جب تک عمار شہید نہ ہو گئے۔ اور جب وہ شہید ہو گئے تو کہا کہ اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا کہ باغی گروہ وہ ہے جس کا سرغنہ معاویہ ہے۔ یہ کہہ کر جہاد کے لئے میدان میں اتر آئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

عمرو ابن عاص کے بیٹے عبداللہ کے دل میں بھی کھٹک پیدا ہوئی اور اس نے اپنے باپ عمرو سے کہا کہ آج ہم نے اس شخص کو قتل کیا ہے جس کے چہرے سے پیغمبر اکرم نے اپنے ہاتھ سے گرد جھاڑتے ہوئے فرمایا تھا:۔

ویحك یا بن سمیة الناس ینقلون لبنة لبنة وانت تنقل لبنتین لبنتین رغبة فی الاجر وانت مع ذلك تقتلك الفئة الباغیة۔

اے سمیہ کے بیٹے لوگ تو ایک ایک اینٹ اٹھا رہے ہیں اور تم اجر و ثواب کی خاطر دو دو اینٹیں اٹھاتے ہو۔ تمہیں ایک باغی گروہ

قتل کرے گا۔" (تاریخ کامل۔ ج ۳ صفحہ ۱۵۸)

ابن عاص نے معاویہ سے کہا کہ تم نے سنا ہے عبداللہ کیا کہتا ہے۔ معاویہ نے عبداللہ اور دوسرے عوام کی پریشان ذہنی پر قابو پانے کے لئے فوراً کہا:۔

انحن قتلناہ انما قتلہ من جاء بہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۵۸) "کیا ہم نے قتل کیا ہے قتل تو اس نے کیا ہے جو انہیں لے کر آیا ہے۔"

معاویہ کا کہنا تھا کہ شامیوں میں سے ہر شخص یہ کہتا سنا گیا انما قتل عمارا من جاء بہ "عمار کا قاتل وہ ہے جو انہیں لے کر آیا ہے۔" حضرت علی نے یہ پُرفریب تاویل سنی تو فرمایا کہ پھر حمزہ کے قاتل رسول اللہ تھے جو انہیں میدانِ اُحد میں لے کر آئے تھے۔

ہاشم ابن عتبہ میدان میں اترے ہوئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو دم لینے کے لئے رُکتے دیکھا تو انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ تم میں سے جو اللہ کی خوشنودی اور عقبیٰ کی سرخروئی چاہتا ہے وہ دشمن سے ٹکرانے کے لئے آگے بڑھے۔ لشکر میں حرکت پیدا ہوئی اور نیزے تان کر آگے بڑھے جس سمت سے بڑھتے شامی فوجیں راستہ روک کر کھڑی ہو جاتیں اور تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگتیں۔ اسی اثنا میں شامی فوجوں میں سے ایک غسانی نوجوان صفوں سے باہر نکلا اور یہ شعر پڑھا ؎

انی اتانی خبر فاشجان ان علیا قتل ابن عفان

"میں نے یہ اندوہناک خبر سنی ہے کہ علی نے ابن عفان کو قتل کر ڈالا ہے۔"

پھر امیرالمومنین کو برا کہتا ہوا حملہ کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ ہاشم نے اس کے تیوروں سے سمجھ لیا کہ یہ نوجوان فریب خوردہ اور قتلِ عثمان کے پس منظر سے بے خبر ہے۔ آپ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اس سے کہا کہ اے شخص اپنے موقف پر نظر کر، اور اللہ سے ڈر۔ کل تجھے اللہ کے رُو برُو اس کا جواب دینا ہو گا۔ کہا کہ میں تم لوگوں سے جنگ کرنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں اس لئے کہ نہ تم نماز پڑھتے ہو اور نہ تمہارا امیر نماز پڑھتا ہے اور تمہارے امیر ہی نے تم لوگوں کے تعاون سے عثمان کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ ہاشم نے کہا کہ تجھے عثمان سے کیا واسطہ انہیں صحابہ، صحابہ زادوں تابعین اور حفاظ قرآن نے قتل کیا ہے جو شریعت کے احکام بھی جانتے ہیں اور دین میں بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تُو نہ دین کے بارے میں سُوجھ بُوجھ رکھتا ہے اور نہ اُمت کے اچھے بُرے کو سمجھنے کی صلاحیت۔ کہا کہ میں جھوٹ کو بُرا سمجھتا ہوں۔ تم نے جو بات کہی ہے وہ درست ہے کہا کہ پھر جس چیز کا تجھے علم نہیں ہے اسے جاننے والوں ہی تک محدود رکھ اور اندھیرے میں غلط قدم اٹھانے سے بچ کر رہ۔ تو نے جو یہ کہا ہے کہ ہمارا امیر نماز

نہیں پڑھتا تو دنیا جانتی ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے رسول اللہ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اور روئے زمین پر اُن سے بڑھ کر کون ہے جو اسرار دین کا سمجھنے والا اور احکام شرع کی پابندی کرنے والا ہو۔ انہیں رسول اللہ سے قرب و قرابت کا وہ شرف حاصل ہے جو کسی ایک کو بھی حاصل نہیں ہے۔ تو نے ہم پر یہ الزام عاید کیا ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تو کیا تجھ کو نظر نہیں آتا کہ ہمارے آدمی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مصلے بچھاتے نمازیں پڑھتے اور تلاوت قرآن کرتے ہیں۔ تجھے چند شوریدہ سر لوگوں نے بہکا دیا ہے جس کے نتیجہ میں تم نے حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھ لیا ہے اور کورانہ اطاعت کرتے ہوئے ضلالت و گمراہی کی راہ پر چل پڑا ہے اس نوجوان نے یہ باتیں سنیں تو اس کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور کہا کہ تم مجھے راست گو اور نیک کردار انسان نظر آتے ہو۔ اگر میں توبہ کروں تو کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟ کہا کہ ہاں اللہ توبہ کا قبول کرنے والا اور خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہے۔ یہ سن کر وہ نوجوان جنگ سے دستبردار ہو کر واپسی کے ارادہ سے پلٹا۔ ایک شامی نے اسے کہا کہ اس عراقی نے تمہیں فریب دیا ہے کہا کہ فریب اور ہے اور حق کی کشش اور ہے۔ اس نے مجھے باطل کی حمایت سے بچا کر ہمدردی و خیر خواہی کا ثبوت دیا ہے۔

ہاشم اپنے ہمراہیوں کے ساتھ میدان میں کھڑے تھے کہ شامیوں کی طرف سے قبیلہ تنوخ کا ایک دستہ آگے بڑھا۔ ہاشم اپنے لشکر کو لے کر ان پر حملہ آور ہوئے۔ کچھ دیر تک تلواریں چلتی رہیں نو یا دس تنوخی ہاشم کے ہاتھ سے تہ تیغ ہوئے۔ اسی لڑائی کے دوران حارث ابن منذر تنوخی نے آپ کے پیٹ پر نیزہ مارا آپ بے حال ہو کر زمین پر گر پڑے۔ لشکر کی پیش قدمی رُک گئی اور ایک عام بے دلی سی پھیل گئی امیر المومنین نے بڑھتے ہوئے لشکر کو رکتے دیکھا۔ تو ایک شخص کے ذریعہ ہاشم کو پیغام بھجوایا کہ علم لے کر آگے بڑھو۔ ہاشم نے پیغامبر سے کہا کہ ذرا میرے پیٹ کی طرف دیکھو۔ دیکھا کہ پیٹ چاک ہو چکا ہے اور خون کا فوارہ اُبل رہا ہے۔ کچھ دیر موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد دم توڑ دیا اور خلد بریں کی راہ لی۔ ہاشم کے ہمراہ قبیلہ اسلم کے حفاظ کی ایک جماعت بھی شہید ہو گئی۔ جب پیغامبر نے پلٹ کر امیرالمومنین کو ہاشم کی شہادت کی خبر دی تو آپ ہاشم اور دوسرے شہداء کے لاشوں پر آئے اور یہ دو شعر پڑھے ؎

جزی اللہ خیرا عصبۃ اسلمیہ   صباح الوجوہ صرعوا حول ھاشم

"خدا اس اسلمی جماعت کو جزائے خیر دے جو روشن چہروں والے اور ہاشم کے گرد و پیش لڑتے ہوئے مارے گئے ہیں۔"

بریدہ وعبداللہ منھم ومنقذ   وعروۃ ابنا مالک فی الاکادم

"اس جماعت میں بریدہ عبداللہ اور مالک کے دونوں بیٹے عروہ اور منقذ شامل ہیں یہ وہ تھے جن کا شمار شرفائے عرب میں ہوتا تھا۔"

اس اثنا میں امیرالمومنین نے شامیوں کے پرچم کے نیچے ایک جتھا دیکھا پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ بتایا گیا کہ یہ قبیلۂ غسان ہے۔ فرمایا کہ یہ ابھی تک میدان میں جمے ہوئے ہیں۔ جب تک ان کے سروں پر تلواروں کے بھرپور وار نہ ہوں گے اور نیزے ان کے سینوں میں نہ اتریں گے یہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے۔ پھر اپنی صفوں کی طرف نظر کی اور پکار کر کہا کہ تم میں کون ہے جو ثواب آخرت پر نظر رکھ کر صبر و استقامت سے لڑے اس آواز پر فوج کا ایک دستہ آگے بڑھا۔ حضرت نے محمد ابن حنفیہ کو بلا کر کہا کہ تم اس دستہ فوج کو لے کر آہستگی کے ساتھ آگے بڑھو اور نیزے تان کر دشمن کی صفوں کے آگے کھڑے ہو جاؤ اور میرے حکم کا انتظار کرو۔ محمد ابن حنفیہ کے روانہ ہونے کے بعد مالک اشتر کو ایک دستہ فوج کے ساتھ ان کی کمک کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ اب حملہ کر دو۔ محمد ابن حنفیہ اور مالک اشتر نے مل کر حملہ کیا۔ جب ایک ساتھ نیزے اور تلواریں لے کر دشمن کی فوج پر جا پڑے تو غسانیوں کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ اور اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔

اس جنگ کی گرم بازاری میں عراقیوں کے ایک ہزار سوار اپنے لشکر سے کٹ کر شامیوں کے گھیرے میں آ گئے۔ یہ محاصرہ اتنا شدید تھا کہ فوج بے دست و پا ہو کر رہ گئی۔ امیرالمومنین نے دشمن کو گھیرا ڈالے دیکھا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ تم میں کون ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ عبدالعزیز ابن حارث جعفی نے کہا کہ آپ حکم دیں میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔ فرمایا کہ اللہ تمہارا مددگار ہو تم شامیوں کا حصار توڑ کر اپنے لشکر والوں کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ وہ ادھر سے اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں اور ادھر سے ہم نعرۂ تکبیر لگائیں اور ایک ساتھ گھیرا ڈالنے والوں پر حملہ کر دیں۔ عبدالعزیز جعفی نے ہتھیار سجے گھوڑے پر پڑی جمائی باگیں اٹھائیں اور دم کے دم میں دشمن کی صفوں تک پہنچ گئے اور نیزے سے محاصرین کے سینے چھیدتے اور صفیں توڑتے ہوئے عراقیوں کے لشکر تک پہنچ گئے۔ لشکر نے انہیں دیکھا تو والہانہ انداز سے ان کی طرف بڑھا بے بسی و ناتوانی کا احساس جاتا رہا۔ پوچھا کہ امیرالمومنین کس حالت میں ہیں؟ کہا کہ وہ صحیح و سالم ہیں اور تمہیں حکم دیا ہے کہ ادھر سے تم نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے حملہ کرو اور ادھر سے ہم نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے حملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ نعروں کی گونج میں حملہ ہوا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچ گیا حصار ٹوٹ گیا اور شامیوں کے سات سو سوار لقمۂ اجل ہو گئے۔ امیرالمومنین نے عبدالعزیز جعفی کے جرأت مندانہ اقدام کو بہت سراہا اور تحسین آفرین کے کلمات سے ان کی عزت افزائی کی۔

امیرالمومنین شامی صفوں کے مقابلہ میں برا جمائے کھڑے تھے کہ شامیوں کا ایک سردار زرہ بکتر پہنے صفوں سے باہر نکلا اور پکار کر کہا کہ ابوالحسن کہاں ہیں۔ حضرت اس کے سامنے آئے تو اس نے

فرزند ابو طالب آپ ایمان میں سابق ہجرت میں سابق اور اسلامی غزوات میں بھی آپ پیش پیش رہے ہیں اس خونریزی کو بھی روکیئے۔ ہم عراق آپ کے لئے چھوڑے دیتے ہیں اور آپ شام کا علاقہ ہمارے لئے چھوڑ دیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

یا ھذا انی قد ضربت انف ھذا الامر و عینیہ فلم اجدہ یسعنی الا القتال او الکفر بما انزل اللہ علی محمدؐ ان اللہ لا یرضی من اولیائہ ان یعصی فی الارض وھم سکوت لا یامرون بالمعروف ولا ینھون عن المنکر فوجدت القتال اھون من معالجۃ الاغلال فی جھنم۔

اے شخص میں نے اس چیز کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے میرے لئے جنگ کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے یا ان چیزوں کا انکار کردوں جو اللہ نے پیغمبر اکرمؐ پر نازل کی ہیں۔ اللہ اپنے دوستوں سے یہ امر پسند نہیں کرتا کہ زمین میں اس کے احکام کی خلاف ورزی ہو اور وُہ چپ سادھے بیٹھے رہیں نہ نیکی کا حکم دیں اور نہ برائی سے منع کریں۔ اس بنا پر جہنم میں پا بجولاں ہونے سے جنگ کی سختیاں مجھے سہل نظر آئیں۔"

(اخبار الطوال۔ ص ۱۸۸)

میدان کارزار میں تلواریں چل رہی تھیں اور مختلف فوجی دستے آپس میں گتھے ہوئے تھے کہ حضرت نے حکم دیا کہ فوج کا ہر حصّہ اپنے مقابل والے دستہ پر حملہ کردے۔ چنانچہ تمام لشکر میدان میں اُمنڈ آیا اور ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ قعقاع ابن ابرو کا بیان ہے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بجلیاں کوند رہی ہیں پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور زمین زلزلوں کی لپیٹ میں ہے۔ امیرالمومنین دشمن کی صفوں میں ڈوب کر اُبھرے تو سر اور چہرہ خون سے رنگین تھا اور تلوار لہو میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس گھمسان کی جنگ میں علمبرداروں کے قدم اکھڑ گئے اور صفیں درہم و برہم ہوگئیں۔ عدی ابن حاتم جب لڑتے ہوئے ان صفوں کے قریب آئے جہاں حضرت کو چھوڑ گئے تھے تو آپ کو وہاں پر موجود نہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ اس سمت ہیں جدھر جنگ ہو رہی ہے۔ عدی وہاں پر آئے حضرت کو دیکھا تو کہا:۔

یا امیرالمومنین اما اذا کنت حیا فالامر امم واعلم انی ما مشیت الیک الا علی اشلاء القتلی وما ابقی لنا ھذا الیوم ولا لھم عمیدا۔

(اخبار الطوال ص ۱۸۶)

یا امیرالمومنین آپ زندہ ہیں تو ہر مصیبت آسان ہے۔ میں کشتوں کے کٹے ہوئے اعضاء کو روندتا ہوا آپ تک پہنچا ہوں آج تو نہ ہمارا سردار باقی رہا ہے اور نہ ان کا کوئی سردار بچا ہے۔"

سعید ابن قیس ہمدانی نے میدان جنگ سے حضرت کو پیغام بھجوایا کہ یا امیر المومنین ہم اس وقت دشمن پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں اگر کسی دستہ کو ہماری امداد کی ضرورت ہو تو ہم اس کی مدد کے لئے تیار ہیں حضرت نے ان کی صفوں کے قریب قبیلہ ربیعہ اور ہمدان سے کہا کہ تم میرے لئے بمنزلہ نیزہ اور زرہ کے ہو اٹھو اور دشمن سے میدان خالی کرواؤ۔ اس آواز پر بارہ ہزار شمشیر زن اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت نے رسول اللہ کا سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور انہی کے گھوڑے پر جس کا نام مرتجز تھا سوار ہوئے۔ میمنہ مالک اشتر کے اور میسرہ ابن عباس کے سپرد کیا اور خود قلب لشکر میں تشریف فرمائے ہوئے اور ربیعہ اور ہمدان کے جوانوں کو لے کر اس طرح حملہ کیا کہ دشمن کے پرے ٹوٹ گئے۔ اور اس طرح تلوار چلائی کہ سروں کے انبار لگ گئے۔ جب لڑتے لڑتے تلوار دوہری ہو گئی تو صفوں سے نکلے تلوار کو سیدھا کیا اور فرمایا کہ اگر تلوار دوہری نہ ہو جاتی تو لشکر سے الگ نہ ہوتا۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور فوجوں کے دل میں گھس کر حملہ کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور صفوں کو چیرتے اور دشمن کو تہ تیغ کرتے ہوئے معاویہ کے خیمہ قریب پہنچ گئے اور فرمایا:۔

اضربهم ولا ادری معاویة　　الجاحظ العین العظیم الحاویة

"میں ان دشمنوں پر تلوار چلاؤں گا اور معاویہ کو بھی نہیں چھوڑوں گا جو ابھری ہوئی آنکھوں اور بڑے پیٹ والا ہے"

معاویہ نے یہ صورت دیکھی تو گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھ دیئے اور میدان چھوڑ کر چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر ایک شخص کے للکارنے پر جب شامی فوجیں پلٹیں تو انہوں نے نکل بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب شامی فوجوں نے مل کر حملہ کیا مگر قبیلہ ربیعہ و ہمدان کے جوانمرد خون کے سیلاب بہاتے صفوں کو روندتے اور لاشوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ امیر المومنین نے انکی پیش قدمی کو سراہتے ہوئے فرمایا ہے:۔

یقودهم حامی الحقیقة ماجد　　سعید ابن قیس والکریم یحامی

"انہیں آگے بڑھائے لئے جا رہے تھے سعید ابن قیس جو معزز اور قومی وقار کے پاسبان ہیں اور شریف انسان عزت و آبرو کی حفاظت کیا ہی کرتا ہے"

یہ پنجشنبہ کا دن اور جنگ کا نواں روز تھا۔ جب دن کا اجالا سمٹا اور لرزتا ہوا آفتاب اس خونی منظر کو دیکھتا ہوا غروب کی منزل کے قریب پہنچا تو وہ ہولناک اور دہشت انگیز رات آئی جو تاریخ میں لیلۃ الہریر کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ہر طرف ایک حشر برپا تھا تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی بوچھار سے دل دہلے اور نعروں کی گونج اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے ہر سمت تڑپتے لاشے

اور کٹے پھٹے اعضاء اڑتے نظر آ رہے تھے۔ امیرالمومنین کبھی قلب لشکر میں ہوتے کبھی میمنہ کی طرف بڑھتے کبھی میسرہ کی طرف لپکتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ میدانِ جنگ میں ہر مورچے پر موجود ہیں۔ جس طرف دشمن کا زور بڑھتا فوراً ادھر کا رُخ کرتے اور تلواروں نیزوں اور بھالوں کے اندر کود پڑتے اور اس طرح حملہ کرتے کہ صفوں پر صفیں چڑھ جاتیں اور لاشوں پر لاشیں گرنے لگتیں۔ آخر اس معرکہ حرب و پیکار میں نیزے ٹوٹ گئے تلواریں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنے تک کی نوبت آ گئی۔ اس رات میں پانچ سو تئیس مرتبہ حضرت کی صدائے تکبیر کو شمار کیا گیا اور صبح کو ان کے مقتولین کو دیکھا گیا تو ان کی تعداد بھی پانچ سو تئیس تھی اور ایک روایت یہ ہے کہ اس رات میں نو سو سے زائد شامی آپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور مجموعی طور پر فریقین کے مقتولین کی تعداد تیس ہزار یا تینتیس ہزار تھی۔

جب رات کا اندھیرا چھٹا تو جنگ آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ امیرالمومنین کی فوجیں مالک اشتر اور ابن عباس کی کمان میں برابر لڑ رہی تھیں۔ حضرت قلب لشکر میں رونق افروز تھے اور چاروں طرف جنگ کے شعلے شامیوں کو بھسم کر رہے تھے۔ مالک اشتر تلوار لہراتے میمنہ لشکر کے جلو میں آگے بڑھے۔ جب تلوار کو جھکاتے تو یہ معلوم ہوتا کہ پانی برس رہا ہے اور اُسے اُونچا کرتے تو اس کی چمک سے آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی۔ آپ نے پرچم حیان ابن ہوذہ نخعی کے سپرد کیا اور فوج لے کر شامیوں پر ٹوٹ پڑے اور صفوں کو منتشر کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ چند ہمراہیوں کے قدم رکے تو پکار کر کہا کہ یہ مردوں کا کام نہیں ہے کہ وُہ بکریوں کا دودھ دوہتے رہیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں مردانہ وار آگے بڑھو۔ سست قدموں میں تیزی آئی اور تازہ دم فوج کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ شامی ان تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکے اور گرتے پڑتے پیچھے ہٹے۔ امیرالمومنین نے اپنی فوجوں کو فتحیابی کے قریب دیکھا تو ان کی کمک کے لئے ایک اور دستہ بھیجا اور سب نے مل کر شامیوں کا رہا سہا زور ختم کر دیا۔ ادھر شامیوں کا لشکر پس رہا تھا ادھر امیرالمومنین کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ ہاں اے جوانمردو تم فتح کی منزل کے قریب پہنچ چکے ہو دشمن دم توڑ رہا ہے اب اسے ختم کئے بغیر دم نہ لینا۔

معاویہ کے لئے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ عراقی آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے اور اب یہ توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ شامی ان کی پیش قدمی کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ معاویہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور سر پر مایوسیوں اور نا امیدیوں کے بادل منڈلا رہے تھے انہوں نے گھبرا کر عمرو ابن عاص کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب کیا ہو گا۔ اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے میں نے اس موقع کے لئے پہلے ہی سے ایک تدبیر سوچ رکھی ہے۔ کہا کہ وہ تدبیر کیا ہے کہا کہ قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کر کے

اسے ثالث بنانے کی تجویز اُن کے سامنے رکھی جائے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عراقیوں کا ایک گروہ ہمارا ہمنوا ہو کر جنگ رکوانا چاہے گا اور ایک گروہ جنگ کے جاری رکھنے پر زور دے گا اور اس طرح ہم ان میں پھوٹ ڈلوا کر جنگ کے ملتوی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ معاویہ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع تو پہنچ ہی چکی تھی کہ اشعث ابن قیس جنگ کو کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے رکوانا چاہتا ہے اور وہ اپنے قبیلہ والوں سے برملا کہہ رہا ہے :-

قد رأیتم ما کان فی الیوم الماضی من الحرب المبیرۃ واللہ ان التقینا غدا انہ لبوار العرب وضیعۃ الحرمات (اخبار الطوال ص۱۸۸)	تم نے روز گزشتہ دیکھ ہی لیا ہے کہ کتنی مہلک و تباہ کن جنگ ہوئی ہے۔ خدا کی قسم اگر ہم کل پھر لڑے تو عرب کی ہلاکت اور عزت و ناموس کی پامالی یقینی ہے۔"

اب معاویہ نے بھی اشعث کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے کہا کہ اشعث سچ کہتا ہے اگر یہ جنگ جاری رہی تو فارس والے عراق پر چڑھائی کریں گے اور روم والے شام پر حملہ آور ہوں گے اور ہماری عزت و ناموس کو پامال کر دیں گے۔ لہٰذا اس تدبیر کو بروئے کار لا کر جلد جنگ کو رکوایا جائے اور قرآن کو نیزوں پر بلند کر کے اسے ثالث قرار دیئے جانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ شامیوں کی صف اوّل میں پانچ آدمیوں نے دمشق کا مصحف اعظم پانچ نیزوں پر بلند کیا اور اس کے علاوہ جتنے قرآن مہیا ہو سکے۔ نیزوں پر اٹھائے گئے اور کچھ لوگوں نے اینٹوں پر جزدان لپیٹ کر انہیں قرآن کی صورت میں نیزوں پر آویزاں کیا۔ جب معاویہ کی طرف سے قرآن بلند ہوئے تو اشعث ابن قیس جو اس سازش میں شریک تھا امیرالمومنین کے پاس آیا اور کہا کہ شامیوں نے قرآن کو حکم قرار دیا ہے اور لوگ قرآن کے علاوہ کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں معاویہ سے اس سلسلہ میں بات چیت کروں۔ حضرت نے فرمایا کہ بات چیت کر کے دیکھ لو۔ اشعث معاویہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ یہ قرآن نیزوں پر کیوں بلند کئے گئے ہیں۔ کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک حَکَم ہماری طرف سے ہو، اور ایک حَکَم تمہاری طرف سے اور وہ دونوں مل کر قرآن سے فیصلہ کریں۔ ان دونوں میں ملی بھگت تو تھی ہی کہا کہ یہ بات درست اور قابل تسلیم ہے۔ اس نے پلٹ کر حضرت کو معاویہ کی تجویز سے آگاہ کیا اور خود بھی قرآن لے کر دونوں صفوں کے درمیان آ کھڑا ہوا اور قرآن کو حَکَم مان لینے پر زور دینے لگا۔ عراقیوں نے معاویہ کے ساختہ پرداختہ لوگوں کی شہ پا کر کہنا شروع کیا کہ ہم قرآن کے فیصلہ پر راضی ہیں اور اسے حَکَم ماننے کے لئے تیار ہیں۔ امیرالمومنین نے جب قرآن کے سایہ میں مکر و فریب کے جال بچھتے دیکھے تو فرمایا :-

عباد الله امضوا علی حقکم و صدقکم وقتال عدوکم فان معاویة وعمرا و ابن ابی معیط وحبیبا وابن ابی سرح والضحاک لیسوا باصحاب دین ولا قرآن انا اعرف بهم منکم قد صحبتهم اطفالا ثم رجالا فکانوا شر اطفال و شر رجال ویحکم واللہ ما رفعوها الاخدیعة ووهنا ومکیدہ۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۶۱)

اے خدا کے بندو تم حق وصداقت کی جس روش پر چل رہے ہو اس پر چلتے رہو اور اپنے دشمن سے جنگ جاری رکھو۔ معاویہ ہو یا عمرو، ابن ابی معیط ہو یا حبیب ابن مسلمہ، ابن ابی سرح ہو یا ضحاک یہ لوگ نہ دین والے ہیں اور نہ قرآن پر عمل کرنے والے۔ میں تم لوگوں سے زیادہ ان لوگوں کو جانتا پہچانتا ہوں۔ بچپن اور جوانی دونوں میں میرا ان کا ساتھ رہ چکا ہے۔ یہ بچپن میں بھی بُرے اور جوانی میں بھی بُرے تھے۔ خدا کی قسم انہوں نے قرآن مکر و فریب کی بنا پر اور اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے اٹھایا ہے۔"

امیرالمومنین نے لشکر کو سمجھانے بجھانے کی بہتیری کوششیں کی مگر اشعث ابن قیس اور اس کے ہمنواؤں کا جو در پردہ معاویہ سے ساز باز کئے ہوئے تھے داؤ چل چکا تھا وہ سمجھنے سوچنے کے بجائے بغاوت و سرکشی پر اُتر آئے اور مسعر ابن فدکی تمیمی اور زید ابن حصین طائی بیس ہزار آدمیوں کو لے کر آگے بڑھے اور حضرت سے کہا کہ اے علی اگر آپ نے قرآن کو حکم ماننے سے انکار کیا تو ہم آپ سے جنگ لڑیں گے۔ آپ فوراً جنگ کے رُکوانے کا حکم دیں اور مالک کو پیغام بھیجیں کہ وہ میدانِ جنگ سے واپس آئیں۔ حضرت نے جب دیکھا کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور لوگ شر و فساد پر آمادہ ہیں تو یزید ابن ہانی کے ہاتھ مالک اشتر کو پیغام بھجوایا کہ جس حالت میں ہو فوراً واپس چلے آؤ۔ مالک نے یہ پیغام سنا تو حیرت میں کھو گئے اور کہا کہ امیرالمومنین سے کہئے کہ دشمن ایک آدھ لمحہ میں ہتھیار ڈال دے گا میں ابھی فتح کی خوشخبری لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ یزید تے پلٹ کر مالک کا جواب عرض کیا تو لشکر والوں نے شور مچایا اور کہا کہ آپ نے در پردہ مالک کو جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے تمہارے سامنے کہا ہے اس کا موقع ہی کہاں تھا کہ میں چوری چھپے کوئی بات کہتا۔ کہا کہ آپ یزید کو دوبارہ بھیجیں اور مالک کو فوراً واپس بلوائیں۔ اگر مالک نے پلٹنے میں تاخیر کی تو پھر شامیوں پر چلنے والی تلواریں آپ پر چلیں گی۔ حضرت نے یزید ابن ہانی کو دوبارہ بھیجا۔ انہوں نے مالک سے کہا کہ اگر تمہیں امیرالمومنین کی جان عزیز ہے تو فوراً جنگ سے ہاتھ اٹھا کر اُن کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔ مالک افسردہ دلی کے ساتھ حضرت کے پاس چلے آئے اور اس ہڑبونگ

کو دیکھ کر لوگوں کو بُرا بھلا کہا۔ مگر جو قدم اکھڑ چکے تھے۔ اب انہیں دوبارہ جمایا نہ جا سکتا تھا۔ امیرالمومنین نے دیکھا کہ اگر جنگ کے التوا کا فیصلہ نہ کیا گیا تو آپس میں تلوار چلنے لگے گی آپ نے بادلِ ناخواستہ جنگ کے التوا کا حکم دے دیا اور مجبوراً تحکیم پر آمادہ ہو گئے۔

اس التوائے جنگ کے بعد عمرو ابن عاص نے معاویہ کو یہ مشورہ دیا کہ تمام جنگی قیدیوں کو جوان کی تحویل میں ہیں قتل کر دیا جائے۔ ان قیدیوں میں سے عمرو ابن اوس اودی نے یہ سنا تو اس نے معاویہ کو کہلوایا کہ اگر قتل کی نوبت آئے تو مجھے قتل نہ کیا جائے اس لئے کہ میں اُن کا بھانجا ہوں اور وُہ میرے ماموں ہیں اس کے قبیلہ بنی اود کے کچھ لوگوں نے بھی اس کی سفارش کی کہ ہمارے قبیلہ کے آدمی کو چھوڑ دیا جائے۔ معاویہ نے کہا کہ وہ کہتا ہے کہ میں اُس کا ماموں ہوں اگر وُہ سچا ثابت ہُوا تو تمہاری سفارش کے بغیر اُسے چھوڑ دیا جائے گا اور اگر جھوٹا ثابت ہوا تو تمہاری سفارش درکار ہو گی۔ چنانچہ معاویہ نے اُسے بلا کر پوچھا کہ میں کیسے تمہارا ماموں ہوں کہا کہ اگر میں اس کا ثبوت دوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا؟ کہا کہ ہاں۔ کہا کیا زوجۂ رسولؐ ام حبیبہ بنت ابی سفیان تمہاری بہن نہیں ہیں کہا کہ ہاں وہ میری بہن ہیں کہا کہ پھر میں اُن کا بیٹا ہوں۔ معاویہ نے کہا کہ تمہارے علاوہ یہ بات کسی کو نہیں سُوجھی تم نے صحیح کہا ہے اور اسے چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں وہ شامی جو عراقیوں کی قید و بند میں تھے سب واپس آ گئے۔ معاویہ نے انہیں دیکھا تو عمرو سے کہا کہ اگر میں تمہارے مشورہ پر عمل کرتا تو ان اسیروں میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ آتا۔ اور تمام اسیروں کو رہا کر دیا۔

یہ جنگ یکم صفر ۳۷ھ کو شروع ہوئی اور دس صفر ۳۷ھ کو روز جمعہ ختم ہو گئی۔ مقام صفین میں فوجوں کا قیام ایک سو دس دن رہا اور نوّے معرکے پیش آئے۔ امیرالمومنین کے لشکر میں سے پچیس ہزار افراد شہید ہوئے جن میں اسی اصحاب بدریین اور تریسٹھ بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ تھے۔ اور معاویہ کے لشکر میں سے پینتالیس ہزار آدمی کام آئے۔

یہ خونی ہنگامہ معاویہ اور عمرو ابن عاص کے ذوقِ سربلندی اور ہوسِ اقتدار کی پیداوار تھا۔ معاویہ حضرت عمر کے دَور سے شام پر حکومت کرتے چلے آ رہے تھے اور عمرو مصر کا گورنر رہ چکا تھا۔ معاویہ اپنے اقتدار کو ہر قیمت پر بحال رکھنا چاہتے تھے اور عمرو مصر کے اقتدار رفتہ کو پھر سے حاصل کرنے کی فکر میں تھا اور یہ اقتدار پسند افراد کا طبعی خاصہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ حکومت و امارت سے روشناس ہونے کے بعد ہر حیلہ و تدبیر سے اسے باقی و برقرار رکھنا چاہتے ہیں خواہ اخلاق و دیانت کی قدروں کو کچل کر اور حق و انصاف کے تقاضوں سے منہ موڑ کر جنگ و خونریزی پر اترنا پڑے یا حیلہ و فریب کی راہ اختیار کرنا پڑے۔ چنانچہ

معاویہ نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے قصاص کا شاخسانہ کھڑا کیا اور عوام کو مشتعل کر کے جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا اور عمرو ابن عاص نے امارت مصر کی خاطر ہر چیز داؤ پر لگا دی اور حق کو جاننے اور پہچاننے کے باوجود باطل کی ہمنوائی پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی دنیا کی طلبی کا واشگاف لفظوں میں اعتراف کرتے ہوئے معاویہ سے کہا:۔

ام واللہ ان قاتلنا معک نطلب بدم الخلیفۃ عثمان ان فی النفس ما فیہا حیث تقاتل من تعلم سابقتہ وفضلہ وقرابتہ ولکنا انما اردنا ھذہ الدنیا۔

(الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۹۸)

خدا کی قسم اگرچہ ہم تمہارے ساتھ ہو کر قصاص خون عثمان کے سلسلہ میں جنگ کر رہے ہیں مگر دل کے اندر جو ہے سو ہے جب کہ تم اس شخص سے برسر پیکار ہو جس کی سبقت فضیلت اور رسول اللہ سے قرابت کا تمہیں علم ہے لیکن ہم تو فقط اس دنیا کے درپے ہیں۔

معاویہ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے خون عثمان کو ذریعہ قرار دیا اور فضا کو ہمنوا بنانے کے لئے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ قتل عثمان نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے اور جب تک وہ قصاص نہیں لیں گے انہیں چین نہیں آئے گا حالانکہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ حضرت عثمان نے محاصرہ کے دنوں میں ان سے بار بار مدد مانگی۔ مگر انہوں نے تعاون سے گریز کیا۔ البتہ ایک مختصر سی فوج بھیجی۔ مگر اسے یہ تاکید کر دی کہ وہ حدودِ مدینہ سے باہر رہے اور عملاً کوئی قدم نہ اٹھائے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ دوسروں کو یہ تاثر دیں کہ انہوں نے خیل و سپاہ سے مدد کی مگر مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے وہ سمجھتے تھے کہ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے جائیں تاکہ وہ قصاص کے نام پر جنگ چھیڑ کر مستقل اقتدار کی راہ ہموار کریں۔ چنانچہ انہوں نے عمرو ابن عاص سے حکومت مصر کا وعدہ کر کے اسے اپنے ساتھ ملا لیا اور امیر المومنین پر خونِ عثمان کا الزام عائد کر کے ان سے قاتلین عثمان کا مطالبہ شروع کر دیا حالانکہ یہ چیز ان سے مخفی نہ تھی کہ قاتلین عثمان کا دائرہ حجاز اور مصر عراق تک پھیلا ہوا ہے۔ جنہوں نے مدینہ پر ہجوم کر کے انہیں محاصرہ میں لے لیا اور اڑوس پڑوس کی دیواریں پھاند کر انہیں قتل کر دیا تھا۔ ان کے محاصرین کے انبوہِ کثیر میں سے قاتلوں کی نشاندہی کی کوئی صورت ہی نہ تھی بلکہ جو موقع واردات پر موجود تھے انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس صورت میں کسی ایک کو قاتل قرار دینا مشکل تھا اور اس کا نہ کوئی امکان تھا اور نہ کوئی جواز کہ تمام محاصرہ کرنے والوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا جاتا تاکہ وہ ایک فرد کے بدلے میں ہزاروں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ چنانچہ قرآن مجید میں قانونِ قصاص کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل۔

"جو شخص مظلوم قتل کر دیا جائے ہم نے بے شک اس کے ولی کو حق قصاص دیا ہے مگر قتل میں مقررہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔"

معاویہ حضرت عثمان کے ابن عم تھے مگر ان کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے وہ کسی قاعدہ و قانون سے ان کے ولی نہ تھے کہ انہیں طلب قصاص کا حق ہوتا کیونکہ یہ اولیاء مقتول کا حق ہے یا حکومت وقت کا۔ اور معاویہ نہ اولیاء مقتول میں شامل تھے اور نہ مسلمانوں کے حکمران۔ وہ صرف رعایا کا ایک فرد تھے یا زیادہ سے زیادہ سابقہ حکومت کی طرف سے ایک صوبہ کے عامل۔ انہیں چاہیئے تو یہ تھا کہ پہلے حضرت کو ولی امر مانتے ان کی حکومت تسلیم کرتے اور ان کے اقامۂ حدود کے حق کا اعتراف کرتے اور پھر ان سے مطالبہ کرتے کہ وہ آئینی طور پر حکم قصاص کا اجرا کریں۔ اسی اصول کی بناء پر حضرت نے معاویہ کو تحریر کیا تھا کہ پہلے بیعت کرو اور پھر قاتلین عثمان کا معاملہ میرے سامنے پیش کرو تا کہ میں کتاب و سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کروں مگر وہ ایک طرف تو بیعت سے انکار کرتے رہے اور دوسری طرف قصاص پر زور دیتے رہے۔ یہ مطالبۂ قصاص صرف انکار بیعت کا ایک بہانہ تھا تا کہ اس طرح حضرت پر دباؤ ڈال کر امارت شام کی دستاویز حاصل کر لیں۔ چنانچہ جریر ابن عبداللہ بجلی سے صاف لفظوں میں کہا کہ اگر مجھے حکومت شام پر باقی رہنے دیا جائے تو میں بیعت کر لوں گا اس کے بعد اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں رہتا کہ بیعت سے کنارہ کشی کا مقصد امارت شام کا تحفظ تھا اور وہ امارت کے تحفظ کا یقین حاصل کر لینے کے بعد مطالبۂ قصاص سے دستبردار ہو جاتے اگر انہیں قصاص سے کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو وہ اُم المومنین عائشہ اور طلحہ و زبیر کی جب کہ وہ قصاص ہی کا نام لے کر کھڑے ہوئے تھے مدد کرتے ان کی کمک کے لئے شام سے فوجیں بھیجتے یا طلحہ و زبیر کے مارے جانے پر اظہار اطمینان کرتے کیونکہ وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ انہی لوگوں نے حضرت عثمان کے قتل پر بیرونی اور مقامی باشندوں کو بھڑکایا تھا مگر وہ چپ سادھے فریقین کی جنگ کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے۔ ان کا مقصد بھی تو یونہی پورا ہوتا تھا کہ علی اور طلحہ و زبیر آپس میں بھڑ جائیں اور ان میں سے جو فریق ہار جائے گا اس سے چھٹکارا مل جائے گا اور جو جیتے گا اس کی طاقت اتنی کمزور ہو چکی ہو گی۔ کہ وہ جنگ اقتدار میں ان سے ٹکر نہ لے سکے گا اور اس طرح وہ اپنے حریفوں کی قوت و طاقت کو مضمحل کر کے کامیابی و کامرانی کی راہ پیدا کر لیں گے۔

اگر قصاص ان کے پیش نظر ہوتا تو جب وہ امیرالمومنین کی شہادت کے بعد ایک بڑی طاقت کے مالک بن چکے تھے عملاً نہ سہی زبانی ہی لب کشائی کرتے مگر انہوں نے ایسی چپ سادھی کہ گویا کوئی حادثہ

ہوا ہی نہ تھا حالانکہ جنہیں قاتل کہا جاتا تھا وہ اسی طرح دندناتے پھر رہے تھے اور حضرت عثمان کی بیٹی عائشہ نے انہیں قصاص کی طرف متوجہ بھی کیا تھا۔ مگر اس سے پہلو بچا لیے گئے۔ چنانچہ ابن عبدربہ الاندلسی نے عقدالفرید میں تحریر کیا ہے کہ عام الجماعہ کے بعد جب معاویہ مدینہ میں آئے تو حضرت عثمان کی بیٹی عائشہ کے ہاں گئے اس نے معاویہ کو دیکھا تو باپ کا نام لے کر گریہ زاری شروع کر دی اور اُن سے شکوہ کیا کہ تم نے میرے باپ کے قصاص کو نظر انداز کر دیا ہے۔ معاویہ نے کہا کہ اب وہ لوگ ہمارے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو چکے ہیں اور ہم نے ان سے امان کا وعدہ کر لیا ہے۔ اگر ہم نے عہد شکنی کرتے ہوئے۔ انہیں چھیڑا تو وُہ ہماری طرف سے دلوں میں کینہ تو رکھتے ہی ہیں فوراً بھڑک اٹھیں گے اور بیعت توڑ کر مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہوں گے پھر خدا معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو۔ اگر حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو تمہاری حیثیت ہی کیا رہے گی۔ اور اب تو تم ایک خلیفہ کی بیٹی اور ایک خلیفہ کی بھتیجی ہو۔ اگر حرف بحرف یہی عذر امیرالمومنین کی طرف سے پیش کیا جائے کہ وہ لوگ آپ کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو چکے تھے اور اگر انہیں چھیڑتے تو وہ حرب و پیکار پر اُتر آتے اور خدا جانے اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوتا تو پھر ان کے خلاف جنگ برپا کرنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

معاویہ نے قصاص کے نام پر ایک بھاری ہجوم اپنے گرد جمع کر کے جنگ چھیڑ دی مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ کہ اس کا نتیجہ عروج یا زوال تخت یا تختہ ہے اس لئے انہوں نے جنگ جیتنے کے لئے کوئی حربہ اٹھا نہ رکھا خواہ اس سے شرافت پر حرف آتا ہو یا انسانیت داغدار ہوتی ہو۔ چنانچہ صفین میں وارد ہوتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ فرات پر پہرہ بٹھایا اور اس کے جواز میں یہ کہا کہ آخر ان لوگوں نے بھی تو عثمان پر پانی بند کیا تھا حالانکہ اگر انہیں پانی بند کرنے کا مشورہ دیا بھی جاتا تو انہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ علی پر پانی بند نہ کیا جائے کیونکہ محاصرہ کے دنوں میں حضرت عثمان کے ہاں کسی نے پانی پہنچایا تھا تو وہ علی تھے اس کے برعکس جب امیرالمومنین کی فوجوں نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور معاویہ کے طرزِ عمل کا جواب ویسے ہی طرزِ عمل سے دینا چاہا تو حضرت نے فرمایا کہ غلط روش کا جواب غلط روش نہیں ہے فوراً گھاٹ کو خالی کر دیا جائے اور کسی کو پانی سے نہ روکا جائے حالانکہ حضرت پانی روک کر اس کے جواز میں کہہ سکتے تھے کہ پہلے ان لوگوں نے پانی بند کیا۔ پھر ہم نے جواباً پانی روکا ہے تو معاویہ کی من گھڑت وجہ جواز سے یہ وجۂ جواز زیادہ قوی ہوتی مگر حضرت یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ایسا اقدام کریں جس سے ان کی بلند نفسی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی مجروح ہو۔ اسی طرح جب عمار ابن یاسر کی شہادت سے ان کا باغیانہ موقف بے نقاب ہوا تو انہوں نے فوراً بات بنائی کہ عمار کے قاتل علی ہیں جو انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ اتنی کھلی خلافِ حقیقت بات تھی، کہ

اسے فریب و دغل بھی تو نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ فریب کاری میں حقیقت کے چہرے پر ایسے دبیز پردے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس کے خط و خال ظاہری نظروں سے چھپ جاتے ہیں مگر یہاں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ایک واضح حقیقت کو جھٹلایا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اہل شام اس بوچ اور لچر تاویل پر کیونکر مطمئن ہو گئے اگر ان میں کچھ بھی عقل و شعور ہوتا تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا جنگ کا رخ پلٹ جاتا اور جو تلواریں ان کی حمایت میں چل رہی تھیں وہ اُن پر اور اُن کے خصوصی مشیروں کے سروں پر چلنے لگتیں اس لئے کہ ان کا اور ان کے گروہ کا بنص رسول باغی گروہ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو چکا تھا باطل کے دھندلکے چھٹ چکے تھے اور حق پوری تابانیوں کے ساتھ چمک اٹھا تھا مگر شامیوں کی کج ذہنی و کج فکری نے ان کی آنکھوں سے نور بصارت چھین کر انہیں گھور اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا اور وُہ باغی گروہ کو پہچاننے کے بعد بھی اسی باغی گروہ سے چمٹے رہے۔ اگر اس تاویل کو ان کے دل و دماغ نے قبول کر لیا تھا تو اس تاویل کی رُو سے انہیں چاہیئے تھا کہ اپنی تلواروں کا رُخ معاویہ کی طرف موڑ دیتے اس لئے کہ شامیوں میں سے جتنے آدمی مارے گئے تھے انہی کی پیش کردہ تاویل کی بنا پر وہ ان سب کے قاتل تھے وہی انہیں میدان میں لے کر آئے تھے اور انہیں نیزوں اور تلواروں کے سامنے کھڑا کیا تھا جب حضرت عثمان کے قصاص میں ہزاروں آدمیوں کو قتل کیا جا سکتا ہے تو ان ہزاروں قتل ہونے والوں کا قصاص ایک فرد سے کیوں نہیں لیا جا سکتا۔

جب اس قسم کے حربوں کے باوجود شکست ناگزیر نظر آئی تو ایسی پُر فریب چال چلی گئی کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور عین اس وقت جب کہ شامیوں کی شکست یقینی ہو چکی تھی میدان لاشوں سے پٹ چکا تھا۔ اور بچے کھچے لوگ راہِ فرار ڈھونڈ رہے تھے کہ ان میں کے چند افراد قرآن لے کر نکل آئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرآن ہے آؤ اپنے جھگڑے اس کی روشنی میں نمٹائیں اور جنگ ختم کریں یہ حربہ اتنا کارگر ثابت ہوا کہ بڑھتے ہوئے قدم تھم گئے اور چلتی ہوئی تلواریں رُک گئیں۔ امیرالمومنین نے عراقیوں کو دشمن کے مکر و فریب سے آگاہ کیا مگر وہ اپنی بات پر اڑ گئے۔ ان میں کچھ تو وُہ تھے جو معاویہ سے ساز باز کئے ہوئے تھے اور کچھ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ واقعاً قرآن کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔ اور اگر انہوں نے اس آواز پر لبیک نہ کہی تو منکرین قرآن کی صف میں شمار ہونے لگیں گے مگر انہوں نے اتنا نہ سوچا کہ اگر یہ قرآن کی طرف دعوت دینے والے قرآن پر عمل کرنے والے ہوتے تو جنگ شروع ہوتے سے پہلے دعوت دیتے جس طرح امیرالمومنین نے جنگ جمل میں آغاز جنگ سے پہلے قرآن کی دعوت دی تھی یا جنگ کے دوران قرآن کے فیصلہ پر آمادگی ظاہر کرتے مگر انہیں قرآن اس وقت یاد آتا ہے جب شکست کے بادل اُن کے سروں پر منڈلانے لگتے ہیں اور حریف کی تلواروں سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

معاویہ کی اس کامیابی میں جو عناصر کارفرما تھے ان میں زور و فریب کے علاوہ اہلِ شام کی اطاعت و سرافگندگی کا بھی بڑا دخل ہے۔ انہوں نے نہ جنگ میں تامل کیا اور نہ جنگ سے دستبرداری میں چون و چرا سے کام لیا۔ اور رعایا کی اطاعت کا یہی جذبہ حکمران کی قوت و طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اہلِ شام اپنی رائے پر اعتماد کرنے کے بجائے معاویہ کی چشم و ابرو کی گردش کو دیکھتے تھے اور جو ادھر سے اشارہ ہوتا تھا بے سوچے سمجھے اس پر چلنے لگتے تھے۔ ان کی اندھا دھند پیروی کا یہ عالم تھا کہ جب معاویہ نے صفین کی طرف جاتے ہوئے بدھ کے دن نماز جمعہ پڑھا دی تو نہ کسی نے انہیں روکا اور نہ کوئی اس پر معترض ہوا۔ مسعودی نے تحریر کیا ہے :۔

لقد بلغ من امرھم فی طاعتھم	وہ معاویہ کے یہاں تک مطیع و فرمانبردار تھے کہ
لہ انہ صلی بھم عند مسیرھم	انہوں نے صفین کی طرف جاتے ہوئے بدھ کے
الی صفین الجمعۃ فی یوم الاربعاء	دن نماز جمعہ پڑھا دی"

(مروج الذہب ۔ ج ۲ ۔ ص۷۲)

اہلِ شام کی اسلامی معاشرہ سے بیگانگی اور دین و مذہب سے بے خبری کی وجہ یہ ہے کہ جب اسلام کی شعاعیں عرب کے گوشہ گوشہ کو منور کر چکی تھیں سوادِ شام پر کفر کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور جب حضرت عمر کے اوائل دورِ حکومت میں اسلام کے مفتوحہ علاقوں میں داخل ہوا تو اسلام سے روشناس ہونے کے بعد انہوں نے فرزندانِ ابوسفیان یزید اور معاویہ کو اسلامی نمائندہ کی حیثیت سے مسندِ امارت پر دیکھا۔ یزید تو تھوڑے ہی دنوں بعد چل بسا اور معاویہ اپنے بیس سالہ دورِ اقتدار میں انہیں اسلام کے آداب و احکام سے کیا روشناس کرتے جب کہ وہ خود ہی اسلامی اوامر و نواہی کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں بے خبر رکھنے میں یہ سیاسی مصلحت بھی کارفرما تھی کہ اگر ان میں اسلامی شعور بیدار ہو گیا تو وہ حق و باطل اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرنے لگ جائیں گے اور پھر اُن کی بے شعوری و بے خبری سے جو فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس سے محروم ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اگر انہیں دین و مذہب سے لگاؤ ہوتا تو وہ غلط اور صحیح اقدام میں فرق کرتے علی کے مقابلہ میں آنے سے ہچکچاتے اور ان کی عظمت و منزلت کو سمجھتے مگر انہیں تو جان بوجھ کر علی اور خاندانِ نبوت کے دوسرے افراد سے اندھیرے میں رکھا گیا تھا تاکہ معاویہ اور ان کے خاندان کے علاوہ کسی اور کی طرف ان کی نظریں اٹھنے ہی نہ پائیں یہی وجہ ہے کہ وہ نہ علی کو جانتے پہچانتے تھے نہ ان کی علمی و عملی منزلت سے واقف تھے اور نہ اُن کے زہد و اتقاء کی بلندی سے آگاہ تھے۔ چنانچہ صفین میں ایک شامی نے برملا کہا کہ ہم علی سے اس لئے برسرِ پیکار ہیں کہ نہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ اُن کے ساتھی نماز گزار ہیں۔ اس نے تو جو معاویہ اور ان کے حواریوں سے سنا تھا وہی کہا

مگر جب ہاشم ابن عتبہ نے اسے توجہ دلائی تو اس کی غلط فہمی دور ہوئی اور شامیوں کی صف سے کٹ کر الگ ہو گیا۔ اس دینی بے حسی و بے خبری کے ساتھ حکومت کی زر پاشیوں نے بھی انہیں معاویہ کا گرویدہ بنا رکھا تھا جس کے نتیجہ میں وہ بے سوچے سمجھے باطل کے برسر اقتدار آنے کا ذریعہ بن گئے۔

امیرالمومنین کے لشکر میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو کسی مصلحت یا قبائلی دباؤ کے زیر اثر شریک جنگ تو ہو گئے تھے مگر نہ ان کے خیالات میں ہم آہنگی تھی اور نہ اطاعت و انقیاد کا جذبہ اور پھر اشعث ابن قیس اور خالد ابن معمر ایسے افراد معاویہ کے ہاتھ بکے ہوئے تھے۔ انہیں قرآن کی آڑ میں شورش انگیزی کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے جنگ کا نقشہ الٹ دینے میں شامیوں کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ اشعث ابن قیس باوجودیکہ امیرالمومنین اسے متنبہ کرتے ہیں کہ یہ دھوکا ہے فریب ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور قرآن لے کر صفوں میں آ کھڑا ہوتا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اے لوگو علی کو مجبور کر دو کہ وہ قرآن کو حکم تسلیم کریں اور اس خونریزی کو روکیں۔ حیرت ہے کہ جب حضرت کی فوجیں فتحیابی کے قریب پہنچ جاتی ہیں تو مسلمانوں کی باہمی خونریزی کو دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اگر اس کا دل اس خون خرابہ سے اتنا ہی متاثر تھا تو اس کا اظہار اس وقت بھی کیا ہوتا جب تلواریں ایک سطح پر چل رہی تھیں اور ایک فریق دوسرے فریق پر غالب ہوتا نظر نہ آ رہا تھا مگر اس کا دل دکھتا ہے تو حضرت کی فتح و کامرانی کے موقع پر کیونکہ اس فتحیابی میں اسے کوئی فائدہ نظر نہ آ رہا تھا اور حضرت کو ناکام بنا کر ایک لاکھ کا انعام تو کہیں گیا نہ تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے صلہ میں کسی صوبہ کی گورنری کی توقع بھی لئے ہوئے ہو۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ معاویہ کا یہ اقدام خلیفۂ برحق کے خلاف ایک جارحانہ و باغیانہ حیثیت رکھتا تھا مگر جہاں اصحاب جمل طلحہ و زبیر کے اقدام پر خطائے اجتہادی کا پردہ ڈالا گیا ہے۔ وہاں معاویہ کے اس عظیم کشت و خون کو بھی خطائے اجتہادی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ پیغمبر اکرم جس اقدام کو بغاوت سے تعبیر فرمائیں اس پر اجر و ثواب کا استحقاق ثابت کیا جائے۔ کیا پیغمبر کا یہ ارشاد ان کے گوش گزار نہ ہوا تھا:

ویح عمار تقتله الفئة الباغیة	عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ عمار انہیں
عمار یدعوھم الی اللہ و یدعونہ	اللہ کی طرف دعوت دیں گے اور وہ انہیں جہنم کی
الی النار۔ (صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۹۲)	طرف بلائے گا"

پیغمبر کے اس ارشاد کے بعد اسے خطائے اجتہادی سے تعبیر کرنا اور اس کے مرتکب کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دینا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اجتہاد نام ہے اس کے ماخذ و مدرک سے حکم شرعی کے استنباط

کا پھر کس ماخذ سے اس جنگ کا جواز اخذ کیا گیا تھا جب کہ بغاوت کے معنی ظلم و فساد کے ہیں اور ظلم و طغیان کو اجتہاد سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مگر جن لوگوں نے حضرت علی کے قتل تک کو خطائے اجتہادی کہہ دیا ہو وہ اُن سے جنگ و جدال کو خطائے اجتہادی سے تعبیر کریں تو کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے۔ چنانچہ ابن حزم اور اس کے ہمنواؤں نے عبدالرحمٰن ابن ملجم کے اقدامِ قتل کو خطائے اجتہادی قرار دے دیا ہے۔ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں :۔

وبالغ ابن حزم فقال لاخلاف بين احد من الائمة فی ان ابن ملجم قتل عليا متاولا مجتهدا مقدرا انه علی الصواب۔

(التلخیص الجبیر ص۳۴۸)

ابن حزم نے یہ کہہ کر مبالغہ سے کام لیا ہے کہ آئمہ میں سے کسی ایک نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا کہ ابن ملجم نے علی کو اجتہاد کرتے ہوئے تاویلاً قتل کیا اور وہ اس قتل میں اپنے کو حق بجانب سمجھتا تھا۔"

حالانکہ پیغمبر نے ابن ملجم کے بارے میں اشقی هذه الامة (اس امت کا شقی ترین فرد) فرمایا تھا۔ اسی طرح یہ گروہ عمار ابن یاسر کے قاتل ابوالغادیہ فزاری کو بھی خطائے اجتہادی کا مرتکب قرار دیتا ہے۔ حالانکہ پیغمبر کا ارشاد ہے کہ قاتل عمار وسالبه فی النار (عمار کا قاتل اور ان کا سامان جنگ چھین لینے والا دوزخ میں جائے گا) تعجب ہے کہ حضرت علی اور عمار یاسر کے قاتلوں کو مجتہد مخطی تجویز کر کے انہیں مستحق اجر و ثواب قرار دیا جاتا ہے اور حضرت عثمان کے قاتلین و محاصرین کو ابن حزم اور ان کے ہم مسلک افراد صحابیت کی تمام قدروں کو نظرانداز کر کے باغی، ظالم، فاسق، مفتری، کاذب اور ملعون وغیرہ کی لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور ان کے لئے خطائے اجتہادی کا ادنیٰ احتمال بھی گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ ان میں افاضل صحابہ اکابر مجتہدین اور صلحاء امت شامل تھے۔

اس اجتہاد کی کارفرمائی کا یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ معاویہ اس موقع پر تبصرہ روم کو ہدایا و تحائف پیش کر کے صلح کا پیغام دیتے ہیں اور جن کے ہاتھوں پر انصار و مہاجرین نے بالاتفاق بیعت کر لی تھی۔ ان کے خلاف محاذ جنگ قائم کرتے ہیں۔ کیا اجتہاد اسی کا نام ہے کہ ایک کافر سے دوستی کی طرح ڈالی جائے اور علی، اصحاب بدر بین، شرکاء بیعت رضوان اور انصار و مہاجرین اوّلین سے دو چار مؤلفة القلوب قسم کے صحابیوں اور بساط اسلام پر تازہ وارد ہونے والے شامیوں کو لے کر جنگ کی جائے غرض یہ دعوئ اجتہاد دنیا کی ایک نرالی اپج ہے۔ مولانا جامی کہتے ہیں :۔

اختلافے کہ داشت با حیدر   در خلافت صحابیٔ دیگر!

حق در آنجا بدست حیدر بود   جنگ با او خطائے منکر بود

مرزا غالب دہلوی بھی اس اجتہاد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ گئے ہیں ؎

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں   علی سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

قراردادِ تحکیم

جب تحکیم کی قرارداد طے پا گئی تو عراق و شام کے قاریوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دو حکم مقرر کئے جائیں۔ ایک اہل شام نامزد کریں اور ایک اہل عراق، اور وُہ دونوں قرآن و سنت کی روشنی میں جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لئے قابل تسلیم ہو گا۔ شامیوں نے عمرو ابن عاص کو اپنا نمائندہ مقرر کیا اور عراقیوں کی طرف سے اشعث بن قیس، مسعر ابن فدکی، یزید ابن حصین اور اُن کے ہم خیال لوگوں نے ابو موسیٰ اشعری کا نام پیش کر دیا۔ جو شام ہی کے علاقہ میں مقام عرض میں ٹھہرا ہوا تھا۔ امیر المومنین نے ابو موسیٰ کا نام سُنا تو فرمایا:۔

لست اثق برای ابی موسیٰ ولا بحزمه ولکن اجعل ذلك لعبد الله ابن عباس۔ (اخبار الطوال، صفحہ ۱۹۲)

مجھے ابو موسیٰ کی رائے اور اس کی سُوجھ بوجھ پر اعتماد نہیں ہے میں یہ حق نمائندگی عبد اللہ ابن عباس کو دینا چاہتا ہوں۔"

اس پر ہلڑ مچا اور انہی لوگوں نے ابن عباس کے انتخاب پر اعتراض کرتے ہُوئے کہا کہ آپ اور ابن عباس ایک ہی ہیں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو حَکَم قرار دیا جائے۔ ہم ایسے شخص کو حکم قرار دینا چاہتے ہیں جو غیر جانبدار ہو اور دونوں فریق میں سے کسی فریق سے وابستہ نہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر تم لوگوں نے عمرو ابن عاص کے انتخاب پر کیوں اعتراض نہیں کیا وہ تو معاویہ کا خاص آدمی ہے۔ کہا کہ ہم اپنے کام کے ذمہ دار ہیں ان کے معاملہ میں دخل نہیں دے سکتے۔ فرمایا اگر تمہیں ابن عباس پر اعتراض ہے تو میں مالک اشتر کا نام پیش کرتا ہوں۔ کہا کہ وہی تو جنگ کے شعلے بھڑکانے والے ہیں وہ تو یہی چاہیں گے کہ تحکیم ناکام ہو۔ تاکہ انہیں جنگ و خونریزی کا پھر موقع مل سکے۔ فرمایا کہ اگر تم ابو موسیٰ ہی کو حکم بنانے پر مصر ہو تو پھر تم جانو اور تمہارا کام جو چاہو کرو اور جسے چاہے منتخب کر لو۔ احنف ابن قیس نے کہا کہ اے لوگو! اگر عبد اللہ ابن عباس اور مالک اشتر کا نام تمہیں پسند نہیں ہے تو مجھے حَکَم مقرر کر دو میں عمرو کے داؤ پیچ کو خوب سمجھتا ہوں وہ مجھے فریب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر تم مجھے نہیں چاہتے تو کسی اور کو منتخب کر لو مگر ابو موسیٰ کو کسی صورت میں یہ موقع نہ دو وہ کام سنوارنے کے بجائے اور بگاڑ دے گا مگر وہاں تو ایک

سازش کے ماتحت پہلے ہی سے ابوموسیٰ کا نام طے کیا جا چکا تھا۔ اس شور و ہنگامہ میں کسی نے کوئی بات نہ سنی اور آخر امیرالمومنین کی رائے کے خلاف ابوموسیٰ کا انتخاب ہو گیا۔

انتخاب حکمین کے بعد جب عبداللہ ابن ابی رافع شرائط معاہدہ قلمبند کرنے لگے تو انہوں نے معاہدۂ صلح کے شروع میں یہ جملہ لکھا:۔ هذا ما تقاضى عليه على اميرالمومنين ومعاويه ابن ابى سفيان "یہ امیرالمومنین علی اور معاویہ ابن ابی سفیان نے یہ فیصلہ کیا ہے" عمرو ابن عاص نے لفظ "امیرالمومنین" پر اعتراض کیا۔ اور کہا کہ وہ دوسروں کے امیر ہوں گے ہمارے امیر نہیں ہیں۔ لہذا لفظ امیرالمومنین کاٹ دی جائے اور اس کے بجائے علی اور اُن کے والد کا نام لکھا جائے۔ احنف ابن قیس نے حضرت سے کہا کہ آپ لفظ امیرالمومنین" کے کاٹنے کی ہرگز اجازت نہ دیں خواہ اس کے نتیجہ میں کشت و خون کی نوبت کیوں نہ آئے۔ آج یہ لفظ کاٹ دی گئی تو پھر امارت پلٹ کر کبھی آپ کی طرف نہیں آئے گی۔ اشعث ابن قیس اور اس کے حواری مصر تھے کہ اسے کاٹ دیا جائے۔ امیرالمومنین ان سب باتوں سے بے نیاز چپ سادھے ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے ہوئے تھے اور صلح حدیبیہ کا عکس حال کے آئینہ میں دیکھ رہے تھے۔ آپ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا۔ کہ میں نے جب حدیبیہ کے دن صلح نامہ لکھا اور آنحضرتؐ کے اسم گرامی کیساتھ لفظ رسول اللہ تحریر کی تو نمائندہ قریش سہیل نے کہا تھا کہ ہم انہیں اللہ کا رسول کب مانتے ہیں لہذا لفظ رسول اللہ مٹا دی جائے اور اس کے بجائے محمد ابن عبداللہ لکھا جائے۔ میں نے لفظ رسول اللہ پر خط کھینچنے میں تامل کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

اكتب فان لك مثلها تعطيها وانت مضطهد۔

"یہی لکھ دو۔ اور ایک دن تمہیں بھی ایسا واقعہ پیش آئے گا اور تم بے بس و مجبور ہو گے"

(سیرت حلبیہ۔ ج ۳۔ صـ ۳۳)

اس پر عمرو نے بگڑ کر کہا کہ آپ ہمیں بھی ویسا ہی کافر سمجھتے ہیں جیسے وہ تھے فرمایا:۔

يا ابن النابغة ومتى لم تكن للفاسقين وليا وللمسلمين عدوا وهل تشبه الا امك التى وضعت بك۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴ صـ ۳۷)

"اے نابغہ کے بیٹے تم کب فاسقوں کے دوست اور مسلمانوں کے دشمن نہیں رہے تم اپنی جننے والی ماں ہی کے مشابہ ہو"

ابن عاص نے کہا کہ بس آج کے بعد نہ ہم ایک جگہ مل کر بیٹھیں گے اور نہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے روادار ہوں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ خداوند عالم میری مجلس کو تم سے اور تم

ایسے لوگوں سے پاک وصاف رکھے۔

جب لفظ امیر المومنین کاٹ دی گئی اور از سرِ نو تحریر لکھی جانے لگی تو حضرت سے کہا گیا کہ آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ معاویہ اور اہلِ شام مسلمان ہیں حضرت نے فرمایا:۔

ما اقر لمعاویة ولا لاصحابه انهم مومنون ولا مسلمون و لکن یکتب معاویة ما شاء بما شاء و یقر ما شاء بما شاء لنفسه واصحابه ویسمی نفسه بما شاء واصحابه۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج صا)

میں معاویہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ مومن و مسلم ہیں لیکن معاویہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں جو چاہے لکھے جس چیز کا چاہے اقرار کرے اور جو نام چاہے تجویز کرے۔"

آخر صلحنامہ قلمبند کیا گیا جو حسب ذیل دفعات پر مشتمل تھا:۔

(۱) دونوں طرف کے حَکَم اس کے پابند ہوں گے کہ وہ قرآن مجید کی رُو سے فیصلہ کریں۔ اگر کتاب اللہ سے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں تو متفقہ سنت رسول کی روشنی میں تصفیہ کریں۔

(۲) حَکَمین جو فیصلہ کریں گے دونوں فریق اس کے پابند ہوں گے۔ بشرطیکہ فیصلہ کتاب و سنت کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔

(۳) حکمین کو اس ماہِ رمضان کے آخر تک فیصلہ کر دینا چاہیئے اور اگر مدت میں توسیع کی ضرورت محسوس کریں تو وہ خود ہی اتفاق رائے سے مقررہ مدت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

(۴) اگر فیصلہ کے لئے شہادتوں کی ضرورت پیش آئے تو وہ مہیا کی جائیں گی۔

(۵) تصفیۂ تحکیم تک جنگ بند رہے گی دونوں فریق حکمین کی جان و مال کی حفاظت کریں گے۔ اور فریقین میں سے کسی فرد پر کہیں آنے جانے میں رکاوٹ پیدا نہیں کی جائے گی۔

(۶) اگر فیصلہ سے قبل کسی حکم کا انتقال ہو جائے تو اس کی جماعت اس کی جگہ پر دوسرا حکم منتخب کرے گی۔

(۷) یہ اجتماع ایسے مقام پر ہو گا جو عراق و شام کے درمیان واقع ہو۔

ان دفعات میں سے بیشتر دفعات کا تعلق طریق کار اور انتظامی ضوابط سے ہے اور بنیادی دفعہ صرف ایک ہے کہ حکمین کتاب و سنت کی بناء پر فیصلہ کریں گے اور انہیں اپنی ذاتی رائے یا ذاتی رجحان پر فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہ ہو گا۔ اب اگر وہ اس شرط کی پابندی نہ کریں یا اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فیصلہ

کریں تو ظاہر ہے کہ نہ ان کی ثالثی حیثیت باقی رہ سکتی ہے اور نہ اُن کے فیصلہ کی پابندی کی جا سکتی ہے واقعات پیش آئند اس کے شاہد ہیں کہ جس طرح قصاص کی آواز اٹھانا اور نیزوں پر قرآن بلند کرنا دھوکا اور فریب تھا اسی طرح تحکیم میں بھی فریب ہی فریب کارفرما تھا۔ نہ کسی نے کتاب اللہ کو دیکھا اور نہ کسی نے سنتِ رسولؐ پر نظر کی اور ایک حریف نے دوسرے حریف کو سیاسی پٹخنیاں دے کر چت کر دینا ہی اپنا کارنامہ سمجھا۔

تحکیم کے خلاف خوارج کا ہنگامہ

عراق و شام کی فوجیں ابھی صفین ہی میں موجود تھیں کہ معاہدہ تحکیم کے ضبط تحریر میں لائے جانے کے بعد عراقیوں نے تحکیم کے خلاف سرگوشیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ جب اشعث ابن قیس نے مختلف قبائل کے جھنڈوں کے پاس جا کر قرارداد تحکیم کی عبارت پڑھ کر سنائی تو تحکیم کے خلاف نفرت کے جذبات پوری شدت سے بھڑک اٹھے اور وہی لوگ جو کچھ دیر پہلے تحکیم کے ماننے پر زور دے رہے تھے۔ تحکیم کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کرنے لگے۔ بنی عنزہ نے معاہدہ تحکیم کی تحریر سنی تو اُن میں سے دو حقیقی بھائیوں جعد اور معدان نے لاحکم الا للہ (حکم اللہ کے لئے مخصوص ہے) کا نعرہ لگایا اور تلوارلے کر میدان میں نکل آئے اور لڑتے بھڑتے ہوئے قتل ہو گئے۔ بنی مراد نے یہ تحریر سنی تو صالح ابن شقیق نے کہا:۔ لاحکم الا للہ ولو کرہ المشرکون۔ (حکم اللہ کے لئے مخصوص ہے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے)۔ بنی راسب کو یہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی تو انہوں نے تحکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:۔ لا یحکم الرجال فی دین اللہ (اللہ کے دین میں لوگوں کو حکم قرار نہیں دیا جا سکتا) اس تحکیم کی مخالفت کرنے والوں میں اکثریت بنی تمیم کی تھی جب انہوں نے یہ تحریر سنی تو عروہ ابن ادیہ تمیمی نے اشعث سے کہا:۔

اتحکمون الرجال فی دین اللہ	کیا تم نے دین میں لوگوں کو حکم قرار دے لیا ہے
فاین قتلانا یا اشعث۔	اے اشعث اگر یہی ہونا تھا تو ہمارے مقتولین کیوں قتل ہوئے؟

(اخبار الطوال صفحہ ۱۹۶)

پھر تلوار لے کر اشعث پر حملہ آور ہوا۔ اشعث نے تیزی سے سواری کا رُخ موڑا تلوار سواری کے پُٹھے پر پڑی اور وہ اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔

اس جنگ بندی اور معاہدۂ تحکیم کے نتیجہ میں عراقیوں کی یکجہتی ختم ہو گئی ہر طرف فتنہ و شر اُٹھ کھڑا

ہوا، محرز ابن خنیس نے فضا کو بگڑتے ہوئے دیکھا تو امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا امیر المومنین کیا اس معاہدہ کو ختم کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک عظیم فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا اور آپ کو شکی و پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت نے فرمایا:۔

ایعد ان کتبناہ ننقضہ؟ ھذا لا یجوز۔ (اخبار الطوال ص ۱۹۷) کیا معاہدہ تحریر کرنے کے بعد ہم عہد شکنی کریں یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

جب امیرالمومنین نے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے ہتھیار رکھ دینے کے بعد ہتھیار اٹھانا گوارا نہ کیا تو نفاق کے جراثیم بغاوت و سرکشی کی صورت میں اُبھر آئے اور علویہ و عثمانیہ کے علاوہ ایک تیسرے گروہ کی بنیاد پڑ گئی ان لوگوں کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اس نئی تحریک کے پیچھے لگ گئے جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو جنگ کے جاری رکھنے پر مصر تھے اور وہ بھی جو تحکیم کے منواتے میں پیش پیش تھے اور یہ نعرہ جو وقتی ہیجان کے نتیجہ میں دو نوجوانوں اور عروہ ابن ادیہ کی زبان سے نکلا تھا اس گروہ کا جماعتی نعرہ بن گیا جب دونوں طرف کے لشکروں کی واپسی ہوئی اور امیرالمومنین اپنے لشکر کے ہمراہ کوفہ کی جانب روانہ ہوئے تو ہر ایک کے تیور چڑھے ہوئے پیشانیوں پر بل اور آنکھیں غیظ و غضب سے اُبلی پڑتی تھیں۔ کچھ لوگوں کو یہ صدمہ ہوا کہ جیتی ہوئی جنگ اپنے ہاتھوں سے ہار دی اور کچھ لوگوں کو یہ غم کہ تحکیم کو کیوں مانا گیا اور مانا گیا تو اسے وہیں پر کیوں نہ مسترد کر دیا گیا۔ جماعت میں پھوٹ تو پڑ ہی چکی تھی آپس میں الجھتے اور پیچ و تاب کھاتے ہوئے جب کوفہ کے قریب پہنچے تو بارہ ہزار افراد نے حدود شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور جماعت سے کٹ کر کوفہ کے قریب مقام حروراء میں اُتر پڑے اور لاحکم الا للہ کی بنیاد پر ایک مستقل اور خطرناک محاذ قائم کر لیا۔ یہ جماعت خوارج اور حروریہ کے نام سے موسوم ہوئی اور جماعتی تنظیم کے پیش نظر انہوں نے شبث ابن ربعی کو امیر جنگ اور عبداللہ ابن کوا یشکری کو امام جماعت مقرر کر لیا۔

امیرالمومنین نے ان کی نافرمانی و سرکشی کے باوجود ان پر کسی قسم کی سختی گوارا نہ کی کیونکہ آپ انسانی افتاد طبیعت کو سمجھتے تھے کہ ایک باغی و سرکش جماعت کی کج فکری و کج ذہنی میں سختی و تشدد سے اضافہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی ذہنی و فکری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ البتہ جب نرمی و ملاطفت سے کام نہ نکلے اور سرکش جماعت کی کج ذہنی امن عامہ میں خلل کا باعث ہونے لگے تو پھر سختی و تشدد کا جواز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے انہیں افہام و تفہیم اور دلیل و برہان سے قائل کرنے کا لائحہ ترتیب دیا اور خود ان کے ہاں جا کر انہیں راہ راست پر لانے کا فیصلہ کیا اور جانے سے پہلے ابن عباس کو ان کے ہاں جانے کا حکم دیا اور ان

سے فرمایا کہ تم خوارج کے ہاں پہنچ کر میرا انتظار کرنا اور میرے آنے سے پہلے ان سے اختلافی موضوع پر کوئی بات چیت نہ کرنا۔ اس گفتگو پر بندش لگانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ خوارج ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوں یا ان کے طرزِ گفتگو اور طریقِ استدلال پر بھڑک اٹھیں اور ذہنی طور پر آپ کی بات پر بھی کان نہ دھریں۔ جب ابن عباس ان کے ہاں پہنچے تو انہوں نے تحکیم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ شرع میں زنا کی سزا سو تازیانے اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں ان میں کسی کو ردّوبدل کا اختیار نہیں ہے تو پھر دو آدمیوں کو حکم قرار دینا کہ وہ ایک دینی معاملہ کا فیصلہ کریں کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ ابن عباس ضبط نہ کر سکے اور کہا کہ خداوند عالم نے حالتِ احرام میں جو شکار کیا جائے، اس کے بارے میں فرمایا ہے:۔

یا ایھا الذین امنوا لا تقتلوا الصید و انتم حرم و من قتلہ متعمداً فجزاء مثل ما قتل من النعم یحکم بہ ذوا عدل منکم۔	ایمان والو جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارو اور جو کوئی تم میں سے جان بوجھ کر مار ڈالے تو چوپاؤں میں سے جس جانور کو مارا ہے ویسا ہی اس کا بدلہ دینا ہوگا جو تم میں سے دو منصف آدمی تجویز کریں۔"

خوارج نے کہا کہ اس صورت کو مسلمانوں کی خونریزی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور پھر عمرو ابن عاص عادل کب ہے۔ کل تو ہم اسے غیر عادل سمجھ کر اس سے لڑ رہے تھے اور آج وہ عادل کیسے ہو گیا۔ تم لوگوں نے اللہ کے کام میں دو آدمیوں کو حکم ٹھہرا لیا ہے۔ حالانکہ جب معاویہ اور اس کے ساتھیوں نے بغاوت کی تھی۔ تو ان کے بارے میں خدا کا حکم یہ تھا کہ یا انہیں قتل کیا جائے یا اُن سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے۔ مگر انہیں قتل کرتے یا اُن سے توبہ کا مطالبہ کرنے کے بجائے تم لوگوں نے اُن سے صلح کر لی۔ حالانکہ سورۂ برأت کے نازل ہونے کے بعد اہلِ حرب سے صلح کا جواز اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک وہ جزیہ دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

اس اثنا میں امیر المومنین تشریف لے آئے اور ابن عباس کو مصروفِ گفتگو دیکھ کر فرمایا کہ میں نے تمہیں بحث و مباحثہ سے منع کیا تھا پھر خوارج سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں بغاوت کی ہے ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں تحکیم سے اختلاف ہے۔ فرمایا تمہیں یاد ہوگا کہ جب شامیوں نے نیزوں پر قرآن بلند کئے تھے تو میں نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ لوگ نہ دین سے کوئی واسطہ رکھتے ہیں اور نہ قرآن سے یہ شکست کی روسیاہی سے بچنے کے لئے قرآن کو بیچ میں لے آئے ہیں مگر تم لوگوں نے کہا کہ ہم قرآن

کے فیصلہ پر راضی ہیں اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں جنگ روک کر تحکیم کو تسلیم کر لوں حالانکہ میں اسے ناپسند کرتا تھا۔ جب تمہاری ضد سے مجبور ہو کر مجھے تحکیم ماننا ہی پڑی تو میں نے فریقین کے نمائندوں پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ کتاب و سنت کی بنیاد پر فیصلہ کریں اور اگر انہوں نے اس شرط کی پابندی نہ کی تو ہم ان کے فیصلہ کو ٹھکرا دیں گے۔ خوارج نے کہا کہ یہ تمام باتیں صحیح ہیں مگر آپ ہماری رائے پر عمل نہ کرتے اور تحکیم کو ٹھکرا دیتے۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے تحکیم کو مان کر کفر کا ارتکاب کیا تھا مگر اب کفر سے تائب ہو چکے ہیں۔ لہذا جس طرح ہم نے کفر کا اقرار کیا ہے اسی طرح آپ بھی کفر کا اقرار کر کے توبہ کریں پھر ہم آپ کی بیعت بھی کریں گے اور حلقۂ اطاعت میں بھی داخل ہو جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تحکیم کو مان کر کافر کیسے ہو گیا جب کہ خداوند عالم نے حکم قرار دینے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ زن و مرد کے اختلاف کے بارے میں ارشاد ہے :-

ان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا	اگر تمہیں میاں بی بی کے درمیان تفرقہ کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے کنبہ میں سے اور ایک ثالث عورت کے کنبہ میں سے مقرر کر دو۔

تو کیا اللہ کے نزدیک امت کے اختلاف و افتراق کی اہمیت میاں بی بی کے تفرقہ سے بھی کم ہے۔ کہا کہ آپ کو چاہیئے تھا کہ قرآن کو حکم قرار دیتے مگر آپ نے قرآن کو حکم قرار دینے کے بجائے لوگوں کو حکم قرار دے لیا۔ فرمایا :-

انا لسنا حکمنا الرجال انما حکمنا القرآن وھذا القرآن انما ھو خط مسطور بین دفتین لا ینطق انما یتکلم بہ الرجال۔	ہم نے آدمیوں کو نہیں بلکہ قرآن کو حکم قرار دیا تھا چونکہ یہ قرآن دو دفتیوں کے درمیان لکھی ہوئی کتاب ہے کہ جو بولا نہیں کرتی اور وہ آدمی ہی ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کیا کرتے ہیں۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۹۹)

خوارج سے جب اس کا کوئی جواب بن نہ پڑا تو کہنے لگے کہ آپ نے عمرو ابن عاص کے کہنے سے لفظ امیر المومنین پر خط کھینچ دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ امارت و خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ فرمایا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام نے لفظ رسول اللہ پر خط کھینچ دیا تھا تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رسالت سے اپنی برطرفی کا اعلان کر رہے تھے۔ میرا طرزِ عمل وہی تھا جو رسول اللہ کا طرزِ عمل تھا اور وہ مجھے خبر دے گئے تھے کہ اے علی تمہیں بھی ایک دن اسی قسم کے معاملہ سے دوچار ہونا پڑے گا اور تمہیں بھی وہی کرنا ہو گا

جو میں نے کیا ہے۔ کہا کہ آپ نے فیصلہ کے لئے انہیں ڈھیل کیوں دی فرمایا تاکہ حقیقتِ حال سے بے خبر آگاہ ہو جائے اور باخبر اپنے موقف پر مضبوطی سے جم جائے اور اس طرح مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس پر وہ لوگ خاموش ہو گئے تو حضرت نے فرمایا خدا تم لوگوں پر رحم کرے اٹھو اور اپنے گھروں کو واپس چلو۔ خوارج آپ کی باتوں سے وقتی طور پر متاثر ہوئے۔ اور ظہر کی نماز آپ کی اقتداء میں پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شہر میں چلے آئے۔

یہ لوگ کوفہ میں داخل ہونے کو تو ہو گئے مگر اپنی کج فکری کے نتیجہ میں جو نظریہ قائم کر چکے تھے۔ اس سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہ کر سکے۔ چنانچہ جب ان سے موقف کی تبدیلی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارا موقف جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے اور کوفہ میں چلے آنے کے بارے میں یہ بات بنائی کہ جب حضرت نے ہم سے یہ کہا کہ تم لوگوں نے تحکیم پر اصرار کیا تھا تو ہم نے کہا کہ ہم نے تحکیم کو مان کر کفر کا ارتکاب کیا تھا اور اب توبہ کر لی ہے آپ بھی کفر کا اعتراف کر کے توبہ کر لیں تو ہم آپ کی اطاعت کرنے پر تیار ہیں۔ حضرت نے ہماری بات مان لی ہے اور ہم سے وعدہ کیا ہے کہ چھ ماہ توقف کرو اس عرصہ میں جنگی مصارف کے لئے مال بھی فراہم ہو جائے گا اور جانور بھی فربہ ہو جائیں گے پھر ہم شامیوں کے مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ خوارج نے یہ بات صرف اپنی ندامت کو چھپانے کے لئے گھڑ لی تھی ورنہ اس میں قطعاً کوئی صداقت نہ تھی۔ چنانچہ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے کہ:۔

قد کذب الخوارج فیما زعموا — خوارج نے اپنے زعم باطل میں جو کچھ کہا ہے سراسر جھوٹ ہے۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۶۶)

اگرچہ خوارج کی یہ بات جھوٹی اور حقیقت کے خلاف تھی مگر زبانوں پہ گردش کرتی ہوئی عام ہو گئی اور لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ حضرت نے اپنے گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کر لی ہے اور حکمین کے فیصلہ سے پہلے شام پر چڑھائی کا ارادہ کر لیا ہے۔ اشعث ابن قیس نے فتنہ و شر کو ہوا دینے کے لئے حضرت سے کہا کہ یا امیر المومنین لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ تحکیم کو ضلالت اور اس پر اصرار کو کفر سمجھتے ہیں۔ حضرت نے اس کی تردید ضروری سمجھی اور منبر پر کھڑے ہو کر مجمع عام میں اعلان کیا کہ جو شخص میری طرف یہ نسبت دیتا ہے کہ میں تحکیم کے معاہدہ سے منحرف ہو گیا ہوں وہ جھوٹ کہتا ہے۔ حضرت کے اس اعلان پر خوارج پھر بھڑک اٹھے۔ ان کا پول کھل گیا اور جھوٹ بے نقاب ہو گیا۔ انہوں نے احتجاجاً لاحکم۔ الا للہ کا نعرہ لگایا۔ اور پھر اس نعرہ کی گونج مسجد کے ہر کونے سے سنائی دینے لگی اور ایک شخص نے حضرت کو مخاطب کر کے یہ آیت پڑھی:۔

لئن اشرکت لیحبطن عملك و لتکون من الخاسرین۔

اگر تم شرک کرو گے تو تمہارے تمام اعمال اکارت جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گے۔"

امیرالمومنین نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی:۔

فاصبر ان وعد اللہ حق لا یستخفنك الذین لا یوقنون۔

صبر سے کام لے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور یہ بے یقین لوگ تمہیں مغالطہ میں نہ ڈالیں۔"

اب جوں جوں حکمین کے اجتماع کا وقت قریب آنے لگا ان لوگوں کی شر انگیزی و دریدہ دہنی زور پکڑنے لگی۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ اب وہ افہام و تفہیم کے حدود سے گزر کر تیغ و سنان کے ذریعہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب ابو موسیٰ کے روانہ ہونے کا وقت قریب تھا تو وہ جنگ کا بہانہ تلاش کرنے کے لئے شوخ چشمی و اشتعال انگیزی پر اُتر آئے اور ان کے دو نمائندے زرعہ ابن بُرج طائی اور حرقوص ابن زہیر اسدی حضرت کے پاس آئے اور حسب معمول لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگایا اور پھر حرقوص نے حضرت سے گستاخانہ لہجہ میں کہا کہ آپ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اس سے توبہ کیجئے اور تحکیم سے دستبردار ہو کر شام چلئے اور دشمن سے جنگ کیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ جب تم جنگ کے رکوانے پر مصر تھے تو میں نے جنگ کے جاری رکھنے پر زور دیا تھا مگر تم لوگوں نے میری مخالفت کی اور اپنی ضد پر اڑے رہے اور اب جب کہ عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ ہمارے لئے اس معاہدہ کی پابندی ضروری ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے:۔

واوفوا بعهد اللہ اذا عاهدتم۔

جب آپس میں قول و قرار کر لو تو اللہ کے عہد و پیمان کو پورا کرو۔"

حرقوص نے کہا کہ وہ معاہدہ سرے سے گناہ تھا اور خلاف شرع معاہدہ کی پابندی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ فرمایا کہ معاہدۂ تحکیم گناہ نہیں تھا بلکہ تم لوگوں کی فکر و رائے کی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ میں نے تحکیم سے تمہیں منع کیا تھا مگر تم نے میری بات نہ مانی اور جنگ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس پر زرعہ ابن برج نے کہا کہ اے علی اگر آپ نے معاہدۂ تحکیم کو ختم نہ کیا تو ہم اللہ کی خوشنودی کی خاطر آپ سے جنگ کریں گے۔ حضرت نے فرمایا:۔

بوسالك ما اشقاك كانى بك قتيلا تسفى عليك الريح۔

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۵۳)

تیرا برا ہو تو کتنا بدبخت ہے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تو قتل کیا جا چکا ہے اور باد صرصر تجھ پر خاک ڈال رہی ہے۔"

اس نے کہا کہ میں تو یہی چاہتا ہوں یہ کہہ کر دونوں لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اب خوارج نے مسجد کو شورش و ہنگامہ آرائی کا مرکز بنا لیا اور جب بھی حضرت خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو ہر سمت سے نعروں کا شور بلند ہونے لگتا۔ ایک مرتبہ انہوں نے نعرہ لگایا تو حضرت نے فرمایا اللہ اکبر! بات سچی ہے مگر ان کا مقصد غلط ہے۔ اگر یہ خاموش رہے تو ہم ان کے ساتھ بھلائی کرتے رہیں گے اگر یہ ہمارے خلاف بولیں گے تو انہیں دلائل سے چپ کریں گے انہوں نے ہم پر خروج کیا تو ہم ان سے لڑیں گے۔ اس پر ایک خارجی یزید ابن عاصم محاربی تلملا کر اٹھا اور کہنے لگا کہ اے علی آپ ہمیں قتل سے کیا ڈراتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم عنقریب آپ پر تلواریں برسائیں گے۔ ہم دین کے معاملہ میں ذلت گوارا نہیں کر سکتے کیونکہ دین میں ذلت کو گوارا کرنا غضب خدا کو دعوت دینا ہے ایکدن خطبہ دیتے ہوئے مسجد کے ہر کونے سے نعروں کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو حضرت نے فرمایا :-

اللہ اکبر! کلمۃ حق یلتمس	اللہ اکبر! کلمہ حق ہے مگر مقصد باطل ہے۔ دیکھو
بھا باطل اما ان لکم عندنا	جب تک تم ہمارے ساتھ رہو گے تمہارے تین حق
ثلاثا ما صحبتمونا لا نمنعکم	ہمارے ذمہ ہوں گے ہم تمہیں مساجد میں اللہ کا
مساجد اللہ ان تذکروا فیھا	ذکر کرنے سے منع نہیں کریں گے۔ جہاد میں ہمارے
اسمہ ولا نمنعکم الفیء ما	ساتھ تعاون کرو گے تو تمہیں مال غنیمت سے محروم
دامت ایدیکم مع ایدینا ولا	نہیں کریں گے اور اس وقت تک تم سے جنگ
نقاتلکم حتی تبدؤنا۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۳)	نہیں کریں گے جب تک تم پہل نہ کرو گے۔"

امیرالمومنین کے حلم و ضبط اور نرم روی سے اثر لینے کے بجائے خوارج تمرد و سرکشی پر اتر آئے۔ اور حضرت کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن وہب راسبی کے گھر میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے لئے جمع ہوئے اور اپنے محاذ کو مضبوط تر کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ عبداللہ ابن وہب نے کہا کہ ہمیں اس شہر سے نکل کر پہاڑی علاقوں یا دور افتادہ بستیوں کی طرف چل دینا چاہئے، تاکہ یہاں کے ظالم باشندوں کے علی الرغم اللہ کی نافرمانیوں اور گمراہ کن بدعتوں کا انسداد کر سکیں۔ حرقوص ابن زہیر نے اس کی تائید کی اور حمزہ ابن سنان نے اس تجویز سے موافقت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام جماعتی تنظیم کے ماتحت ہی انجام دیا جا سکتا ہے لہذا :-

ولوا امرکم رجلا منکم فانہ	اپنے لوگوں میں سے کسی کو ولی امر منتخب کر لو اس

لابد لکم من قائد وسائس۔ لئے کہ تمہارے لئے ایک قائد و سربراہ کا ہونا ضروری ہے۔"
(اخبار الطوال۔ صفحہ ۲۰۲)

اس پر بھی اتفاق رائے ہوا اور انہوں نے یزید ابن حصین طائی کو امارت کی پیش کش کی مگر اس نے امارت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے حرقوص ابن زہیر، حمزہ ابن سنان اور شریح ابن اوفی عبسی کو قیادت کی پیش کش کی گئی مگر ان تینوں نے معذرت کی اور اس ذمہ داری سے پہلو بچاتے گئے۔ آخر میں عبداللہ ابن وہب سے کہا گیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں امارت قبول کروں تو اس لئے نہیں کہ میں دنیوی نام و نمود کا خواہشمند ہوں اور اگر قبول نہ کروں تو اس لئے نہیں کہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔ جب امیر کا تقرر ضروری ہے تو مجھے بہر حال اس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑے گا۔

اس انتخاب کے بعد شریح ابن اوفی کے مکان پر مزید صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ عبداللہ ابن وہب نے کہا کہ جب ہمیں کوفہ چھوڑ ہی دینا ہے تو پھر اس شہر کا رُخ کرنا چاہیئے جہاں ہم بغیر کسی روک ٹوک کے اللہ کے احکام کا نفاذ کر سکیں۔ شریح نے کہا کہ اس مقصد کے لئے مدائن سے بہتر اور موزوں تر کوئی جگہ نہیں ہے ہم وہاں کے باشندوں کو باہر نکال کر شہر پر قبضہ کر لیں گے اور بصرہ میں جو ہمارے ہم خیال بھائی بند ہیں انہیں بھی مدائن چلے آنے کی دعوت دیں گے۔ وہ یقیناً ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور اس طرح ہم قوت و طاقت میں معتدبہ اضافہ کر سکیں گے۔ یزید ابن حصین نے کہا کہ اگر ہم نے مدائن کا رُخ کیا تو وہاں کے لوگ پوری طاقت سے ہمارا مقابلہ کریں گے اور شہر میں داخل ہونے سے مانع ہوں گے۔ لہذا ہمیں مدائن کے بجائے نہروان کی طرف جانا چاہیئے۔ اس تجویز پر اتفاق رائے کے بعد یہ طے پایا کہ ایک ساتھ نکلنے کے بجائے ایک ایک یا دو دو کر کے نکلیں تاکہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی روک نہ لئے جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ مختلف راستوں سے اکیلے دکیلے نکل کھڑے ہوئے اور چھپتے چھپاتے نہروان کی طرف چل دیئے۔ اہل بصرہ کو اپنے عزائم سے آگاہ کرنے کے لئے عبداللہ ابن سعد عبسی کو بصرہ بھیجا اور انہیں تاکید کی کہ وہ جلد از جلد نہروان پہنچ جائیں۔ بصرہ والوں نے جواب دیا کہ ہم تم لوگوں کی رائے سے پوری طرح متفق ہیں اور جلد پہنچا چاہتے ہیں۔

ان خروج کرنے والوں میں عدی ابن حاتم کا بیٹا طرفہ بھی تھا وہ مقام سیب میں پہنچ کر یزید ابن حصین کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ عدی کو اپنے بیٹے کے خروج کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور اس کے تعاقب میں مدائن پہنچے مگر وہاں خوارج میں سے کوئی نظر نہ آیا تو کوفہ کے ارادہ سے پلٹے۔ جب مدائن سے نکل کر ساباط میں وارد ہوئے تو عبداللہ ابن وہب سے جو دیر عاقول سے دریا عبور کر کے نہروان جا رہا

تھاڈ بھیڑ ہو گئی۔ عبداللہ ابن وہب نے عدی کو اکیلا پا کر انہیں قتل کر دینا چاہا مگر عمرو ابن مالک نبہانی اور بشر ابن یزید بولانی ان کے قتل سے مانع ہوئے اور ان کی جان بچ گئی۔ عدی نے خوارج کے اس جتھے کو دیکھ کر حاکم مدائن سعد ابنِ مسعود کو پیغام بھجوایا کہ خوارج کا ایک دستہ آگے بڑھ رہا ہے وُہ اسے روکنے کا انتظام کریں۔ سعد نے اپنے بھتیجے مختار ابن ابی عبید کو مدائن میں اپنا نائب مقرر کیا اور پانچ سو سواروں کا دستہ لے کر خوارج کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ عبداللہ بن وہب کے ہمراہ صرف تیس سوار تھے اسے سعد اور ان کے ہمراہیوں کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے راستہ بدل دیا اور بغداد کا رُخ کر لیا۔ سعد نے اس کا پیچھا کیا اور غروب آفتاب کے وقت اُسے کرخ میں جا لیا۔ کچھ دیر تک دونوں فریق جھگڑتے رہے آخر سعد کے ساتھیوں نے کہا کہ انہیں چھوڑ دینا چاہیئے اس لئے کہ ہمیں امیرالمومنین نے ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ البتہ امیرالمومنین کو اس کی اطلاع دے دینا چاہیئے۔ اگر وہ فرمائیں گے تو ان کا پیچھا کیا جائے گا ورنہ جہاں یہ جانا چاہتے ہیں انہیں جانے دیا جائے۔ مگر سعد نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہمیں ان سے لڑنا چاہیئے۔ ادھر رات ہو چکی تھی اور جنگ چھیڑی نہ جا سکتی تھی۔ صبح کے انتظار میں خوارج کے قریب پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔ عبداللہ ابن وہب اور اس کے ساتھیوں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا اور راتوں رات دریا عبور کر کے جوخی پہنچ گئے اور وہاں سے نہروان کی طرف نکل گئے۔ خوارج نہروان کے پُل کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑے تھے اور عبداللہ ابن وہب اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کرنے کے بعد یہ چاہتے تھے کہ حرقوص ابن زہیر یا یزید ابن حصین کو امیر منتخب کریں کہ یہ لوگ پہنچ گئے۔ اہلِ کوفہ میں سے قعقاع ابن قیس طائی، عبداللہ ابن حکیم، سالم ابن ربیعہ عبسی اور چند افراد خوارج کی جماعت میں شامل ہونے کے لئے نہروان جانا چاہتے تھے مگر ان لوگوں کو ان کے گھر والوں نے روک دیا اور انہیں مجبوراً رُک جانا پڑا اور سالم ابنِ ربیعہ کو امیرالمومنین نے بُلا کر منع کر دیا۔

بصرہ سے مسعر ابن فدکی تمیمی کی قیادت میں پانچ سو خوارج نہروان کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے جب حاکم بصرہ ابن عباس کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ابوالاسود دئلی کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا تاکہ انہیں سمجھا بجھا کر واپس لائیں۔ ابوالاسود جب خوارج تک پہنچے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ خوارج انہیں دیکھ کر جسر کے قریب ٹھہر گئے اور یہ تاثر دیا کہ وہ رات یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ ابوالاسود بھی رات کے اندھیرے میں کوئی قدم نہ اُٹھا سکتے تھے وہ بھی صبح کے انتظار میں ٹھہر گئے مگر خوارج رات کی تاریکی میں چپکے سے نکل کھڑے ہوئے اور ان کی گرفت سے نکل کر نہروان پہنچ گئے اور کوفہ و بصرہ اور اطراف و جوانب کے خوارج نے جمع ہو کر نہروان کو ہنگامہ و شورش کا آماجگاہ بنا لیا۔

خوارج کی اس جتھا بندی کے پیشِ نظر امیرالمومنین کے مخلص اصحاب نے چاہا کہ حضرت کو اپنی دوستی وجان نثاری کا یقین دلا کر تجدید بیعت کریں۔ چنانچہ وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم اس معاہدہ پر آپ کی بیعت کرتے ہیں کہ جو آپ کا دوست ہوگا۔ ہم اسے دوست رکھیں گے اور جو آپ کا دشمن ہوگا ہم اسے دشمن رکھیں گے۔ حضرت نے ان لوگوں سے بیعت لی اور ربیعہ ابن ابی شداد خثعمی سے جو جمل و صفین میں آپ کے ہمرکاب رہ کر جنگ کر چکا تھا فرمایا کہ تم بھی کتاب و سنت کے اتباع کی بنیاد پر بیعت کرو۔ اس نے کہا کہ میں سنّت ابوبکر و عمر کی پیروی کی شرط پر بیعت کروں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا تمہیں اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے انکار ہے۔ اگر ابوبکر و عمر کی سنت کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ قابلِ عمل ہی نہیں ہے پھر اس شرط کے پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پھر حضرت نے تیور بدل کر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا:۔

اما واللہ لکانی بک وقد نفرت	خدا کی قسم میں یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا
مع ھذہ الخوارج فقتلت	ہوں کہ تم خوارج کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے ہو
وکانی بک وقد وطئتک الخیل	اور گھوڑے اپنے سموں سے تمہیں روند رہے ہیں۔"

بحوافرھا۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص۱۶۷)

اگر یہ صحیح ہے کہ عملی تضاد ذہنی انتشار کا نتیجہ ہوتا ہے تو بلا شبہ خوارج ذہنی و فکری انتشار کا شکار تھے۔ انہوں نے نہ صرف تحکیم کو مانا بلکہ امیرالمومنین کو بھی تحکیم کے ماننے پر مجبور کر دیا۔ اور جب آپ نے تحکیم کی اجازت دے دی تو لاحکم الا للہ کا نعرہ لگاتے ہوئے تحکیم کی مخالفت کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے

"ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا"

خوارج نے اپنے نعرہ کا استخراج آیت قرآنی ان الحکم الا للہ سے کیا ہے جو ابتداء میں صرف تحکیم کی مخالفت میں بلند ہوا اور پھر اس آیت کے ظاہر پر نظر کرتے ہوئے ان لوگوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ حکومت بھی اللہ کے لئے ہے اور بیعت بھی اللہ کے لئے اور اس کے علاوہ کوئی حاکم و فرمانروا نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح یہ نعرہ ایک جدید نظریۂ حکومت کی بنیاد قرار پا گیا۔ اور خوارج اس آیت کی آڑ میں کہنے لگے کہ ہم حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتے ہیں کیونکہ حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے۔ مگر انہوں نے اس پر غور نہ کیا کہ حکومتِ الٰہیہ کے معنی ابطال امارت کے نہیں ہیں بلکہ حکومتِ الٰہیہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے احکام کا نفاذ الٰہی نمائندوں کے ذریعہ ہو اور ان نمائندوں کے مقابلہ میں کسی کو رائے زنی و قیاس آرائی کا حق حاصل نہ ہو لہٰذا آیت ان الحکم الا للہ کا یہ مفہوم قرار دینا کہ حکومت و فرمانروائی اللہ کے علاوہ کسی کی

نہیں ہوسکتی اور دینی و دنیوی تنظیم کے لئے کسی امیر کی احتیاج نہیں ہے ایک غلط نظریہ ہے اور قرآنی آیت کا اس سے کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ آیت حضرت یعقوب کے واقعات کے سلسلہ میں ہے اور پوری آیت اس طرح ہے:۔

وقال یا بنی لاتدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقۃ وما اغنی عنکم من اللہ من شیء ان الحکم الا للہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المتوکلون۔	اور (یعقوب نے) کہا اے بیٹو تم سب کے سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اس مصیبت کو جو خدا کی طرف سے آئے ٹال نہیں سکتا حکم تو دراصل خدا ہی کے واسطے ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے"۔

اس آیت میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے کہ جب حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو مصر روانہ کیا تو ان سے کہا کہ تم الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا تاکہ نظر بد سے بچے رہو اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر تم متفرق دروازوں سے داخل ہوگے تو ضرور بچے ہی رہوگے اس لئے کہ حکم چلتا ہے تو اللہ کا چلتا ہے۔ اور وہ جس کام کا ارادہ کرلیتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اس کے برخلاف دوسروں کے ارادے کبھی پورے ہوتے ہیں اور کبھی پورے نہیں ہوتے مگر پھر بھی اپنی طرف سے تدبیر و احتیاط ضروری ہے۔ یہ تھا اس آیت کا واضح مطلب۔ مگر خوارج نے نہ آیت کے مورد و محل کو دیکھا نہ اس کے معنی و مفہوم پر نظر کی اور اس کا مطلب یہ قرار دے لیا کہ سرے سے کوئی حاکم ہو ہی نہیں سکتا۔ امیرالمومنین نے خوارج کی اس من گھڑت تاویل کی رد میں فرمایا ہے "بات درست ہے مگر ان کی مراد باطل ہے۔ بے شک حکم اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے مگر یہ لوگ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی حالانکہ لوگوں کے لئے ایک حاکم کا ہونا ضروری ہے"۔ چنانچہ خوارج کا یہ نظریہ نظریئے ہی کی حد میں رہا اور کسی دور میں اسے عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ بلکہ خود خوارج بھی اس پر عملدرآمد نہ کرسکے اور کشود و بست کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا امیر و سربراہ منتخب کرتے رہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیاسی و انتظامی نقطۂ نظر سے حکومت کا قیام لازمی اور ایک سربراہ مملکت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ حکومت ہی شخصی و اجتماعی مفادات کی حفاظت کرتی اور معاشی و معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرتی ہے۔ اگر حکومت نہ ہو تو نہ ریاست کی تنظیم ممکن ہے نہ اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے نہ نظم و نسق باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن و امان برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ اگر خوارج کا یہ نعرہ دیانت و نیک نیتی کے زیر اثر ہوتا تو وہ تحکیم کے جواز کی نفی

کرنے کے بجائے یہ کہہ سکتے تھے کہ حکم قرار دینا تو جائز ہے جیسا کہ پیغمبر اکرم نے بنی قریظہ کے بارے میں سعد ابن معاذ کو حکم مقرر کیا تھا مگر اس موقع پر جب کہ دشمن اس کے ذریعہ فریب دینا چاہتا ہے تحکیم ناروا اور خلاف مصلحت ہے تو اسے ایک حد تک ایک صحیح جذبہ کے تحت لایا جا سکتا تھا مگر انہوں نے تو شورش و ہنگامہ آرائی کا جواز پیدا کرنے کے لئے یہ نعرہ لگایا تھا تا کہ حکومت الٰہیہ کے پردے میں قبائلی عصبیت کو زندہ اور لاحکومت کا نعرہ لگا کر طوائف الملوکی کا اعادہ کر سکیں ورنہ حکومت الٰہیہ کا قیام ہی ان کے پیش نظر ہوتا تو امیرالمومنین سے تعاون کرتے اس لئے کہ ان سے بہتر کون ہو سکتا تھا جو حکومت الٰہیہ کو الٰہی احکام و قوانین کی بنیادوں پر استوار کرتا اور دنیا کو انہی درخشاں خطوط پر چلاتا جنہیں پیغمبر اکرم نے وحی ربانی کی روشنی میں ترتیب دیا تھا۔

خوارج پر ایک نظر

خارجیت کے جراثیم پیغمبر اکرم کے زمانہ ہی میں پیدا ہو چکے تھے جو اندر ہی اندر بڑھتے اور پھیلتے رہے یہ لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام ہی کے خلاف سازشیں کرتے تخریبی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور ان کی گستاخی و شوخ چشمی کا یہ عالم تھا کہ پیغمبر اکرم کی عدالت و دیانت پر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ چنانچہ جب آنحضرت نے غزوۂ حنین کا مال غنیمت وادیٔ جعرانہ میں تقسیم فرمایا۔ اور تازہ مسلمانوں کی دلجوئی کے لئے اپنے حصۂ خمس میں سے انہیں اوروں کی نسبت زیادہ دیا تو اس گروہ کی ایک فرد ذوالخویصرہ تمیمی نے گستاخانہ لہجہ میں آنحضرت سے کہا کہ آپ عدل و انصاف کریں جس پر آنحضرت نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہ کروں گا تو پھر کون ہے جو عدل کرے گا۔ حضرت عمر بھی اس پر بگڑے اور کہا کہ یا رسول اللہ کیا ہم اسے قتل نہ کر دیں آنحضرتؐ نے فرمایا:-

دعه فان له اصحابا يحقر احدکم صلاته مع صلاته وصيامه مع صيامه يمرقون من الدين کما يمرق السهم من الرمية۔

(صحیح بخاری - ج ۴ ص ۱۳۴)

چھوڑو اسے اس جیسے اور بھی اس کے ساتھی ہیں اگر تم میں سے کوئی ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے مقابلہ میں اپنے روزوں کو دیکھے گا تو اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر و پست سمجھے گا۔ یہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے۔"

یہ لوگ بظاہر شعائر اسلام اور احکام دین کے پابند اور نماز و روزہ اور تلاوت قرآن کے دلدادہ

تھے مگر اسلام کی روح سے نا آشنا اور دین کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:۔

تفترق امتی علی فرقتین تمرق بینهما فرقة محلقون رؤوسهم محفون شواربهم ازرهم الی انصاف سوقهم یقرؤن القرآن لا یتجاوز تراقیهم یقتلهم احبهم الیّ واحبهم الی اللہ تعالیٰ۔

(تاریخ بغداد۔ ج ۱ صفحہ ۱۶۰)

میری اُمت دو فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان دو میں سے ایک اور فرقہ نکل کھڑا ہو گا اس فرقہ کے لوگ سر منڈوائے مونچھیں باریک کٹوائے۔ اور آدھی پنڈلیوں تک تہمد باندھے ہوں گے، وُہ قرآن کی تلاوت کریں گے۔ مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا انہیں وُہ شخص قتل کرے گا جو مجھے اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

ان کی اس ظاہری وضع قطع عبادت میں انہماک نمازوں میں خضوع خشوع اور پیشانیوں پر پڑے ہوئے گھٹوں کو دیکھ کر اکثر لوگ ان کے فریب کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان کی نمازوں کی یہ کیفیت تھی کہ صحابہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت نے ذوالخویصرہ کو سجدہ میں دیکھا آپ نماز پڑھ کر فارغ ہو گئے مگر وُہ اسی طرح سجدہ میں پڑا تھا۔ آنحضرتؐ نے پلٹ کر حضرت ابو بکر سے کہا کہ تم جاؤ اور ذوالخویصرہ کو قتل کر دو۔ حضرت ابو بکر نے اُسے بڑے خضوع و خشوع سے نماز پڑھتے دیکھا تو اُسے قتل کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس پلٹ آئے۔ پھر پیغمبر نے حضرت عمر کو اس کے قتل پر مامور کیا۔ وہ بھی اُسے نماز پڑھتے دیکھ کر واپس چلے آئے اور آنحضرت سے کہا کہ وُہ تو نمازی ہے میرا دل نہیں مانا کہ اُسے قتل کروں۔ آخر آنحضرت نے حضرت علی کو بھیجا مگر امیر المومنین کے پہنچنے سے پہلے وہ وہاں سے چلا گیا۔ آپ نے پلٹ کر پیغمبر سے عرض کیا کہ وہ جا چکا ہے۔ فرمایا وُہ آج قتل ہو جاتا تو فتنہ دب جاتا۔ وہ اس گروہ کا ایک فرد تھا جو دین سے اس طرح نکل جائے گا جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔

خوارج عرب کے صحرائی و بدوی باشندے تھے جن پر بدویت ہی کا رنگ غالب تھا اور طبعاً شورش پسند فتنہ جو اور قتل و غارت کے خوگر تھے۔ پیغمبر اکرم کے بعد انہیں مختلف جنگوں میں ڈھکیلا جاتا رہا اور وہ جنگ و قتال کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اور کچھ نہ ہوتا تو آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ ان جنگی مصروفیات نے انہیں اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور اور اس کے اخلاق و آداب سے اثر پذیر ہوتے۔ فتح عراق کے بعد جب سرحدوں کی حفاظت کے لئے کوفہ و بصرہ کی بنیادیں رکھی گئیں تو ان چھاؤنیوں کی آباد کاری کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو طبعاً جنگجو اور جنگی خو بو رکھتے

ہوں۔ چنانچہ ان لوگوں کو یہاں آباد کیا گیا اور یہ لوگ بہتر مستقبل کی امید میں یہاں بس گئے۔ مگر شہری زندگی اختیار کرنے کے باوجود اجتماعی زندگی سے مانوس نہ ہوسکے اور انفرادیت اور قبائلی عصبیت جو بدوی زندگی کا خاصہ ہے ان میں رچی بسی رہی۔ جب امیرالمومنین کو دشمن کے مقابلہ میں فوج کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ لوگ سابقہ حکومتوں میں جنگی خدمات بجالانے کے عادی تو تھے ہی حضرت کی آواز پر بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے مخالفین سے جنگوں میں حصہ لیا۔ یہ حق کی تائید اور دین کی حمایت کے جذبہ کے زیر اثر نہ تھا بلکہ اس میں عصبیت جنگ پسندی اور مادی مقاصد کارفرما تھے۔

خوارج میں زیادہ تر بنی تمیم اور عرب کے موالی شامل تھے اور اُن کے سردار بھی عموماً بنی تمیم کے افراد تھے چنانچہ عبداللہ ابن اباض، عروہ ابن ادیہ، مستورد ابن سعد، ابوبلال مرداس ابن ادیہ، مسعر ابن فدکی وغیرہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قبل اسلام بنی تمیم مجوسی تھے اور فقر و افلاس کی بناء پر لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ چنانچہ قیس ابن عاصم تمیمی جب اسلام لایا تو پیغمبر سے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے زمانہ جاہلیت میں اپنی آٹھ بیٹیوں کو زندہ دفن کیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کی بہیمیت و دنائت طبع میں فرق نہ آیا اور دورِ جاہلیت کی تخریب پسندی اور مجوسیت کی خو بو ورثہ میں ساتھ لائے۔ طرماح نے ان کے عادات و اطوار پر نظر کرتے ہوئے صحیح کہا ہے ؎

تمیم بطرق اللوم اھدی من القطا ولو سلکت سبل المکارم ضلت

"بنی تمیم پستی و دنائت کی راہوں کو نہیں بھولتے جس طرح قطا پرندہ اپنا راستہ نہیں بھولتا اگر انہیں بزرگی و شرافت کی راہوں پر چلنا پڑے تو بھٹک جائیں"

جب بنی تمیم وفد کی صورت میں مدینہ آئے اور پیغمبرِ اکرم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لانا چاہا تو اُن میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا یا محمدؐ اخرج الینا (اے محمدؐ باہر نکلو) اس انداز تخاطب پر بنی تمیم کو تنبیہہ کرتے اور اُن کی سفاہت و کم عقلی پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ آیت اُتری:۔

ان الذین ینادونک من ورآء الحجرات اکثرھم لا یعقلون۔ — وہ لوگ جو تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں اُن میں سے اکثر بے عقل ہیں۔"

پیغمبرِ اکرم کے بعد ان کی اکثریت اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گئی اور مشہور مدعیہ نبوت سجاح بنت حارث بھی اسی قبیلہ سے تھی جس نے اسلام میں رخنہ اندازی کر کے انتشار و اختلاف کو ہوا دی۔ بنی تمیم کے اس قومی مزاج کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دلوں میں قطعاً اسلام راسخ نہ ہوا تھا اور ان کا باطنی نفاق کبھی ارتداد کی صورت میں اور کبھی خروج کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا اور آخر ان کی خودسری و شورہ پشتی

نے انہیں امیرالمومنین کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔

ایک گروہ نے خوارج کو شیعہ قرار دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شیعوں نے حضرت کی کامیابی کو ناکامی میں بدل کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور پھر ان کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آئے اور اسے امیرالمومنین کی سیاسی کمزوری کے ثبوت میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ اپنے ہی لوگوں پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ بے شک یہ لوگ امیرالمومنین کے لشکر میں شامل رہے تھے مگر انہیں شیعۂ امیرالمومنین قرار دے کر شیعیت کو موردِ الزام قرار دینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت کی صفوں میں ایک ہی مسلک و عقیدہ کے لوگ نہ تھے۔ ان میں ایک طبقہ ایسا ضرور تھا جو ان کی امامت کو منصوص سمجھتا تھا اور جانشینِ رسُولؐ ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت کو ضروری اور نافرمانی کو حرام جانتا تھا۔ یہ لوگ نہ کسی وقت بدلے اور نہ کسی حالت میں آپ کا ساتھ چھوڑا اور ایک گروہ جو اکثریت میں تھا آپ کی خلافت کو جمہور کی آراء سے وابستہ سمجھا تھا اور جس حیثیت سے پہلے خلفاء کو مانتا چلا آرہا تھا اسی حیثیت سے حضرت کو بھی چوتھے درجہ پر قرار دے کر ان کے ساتھ ہوگیا تھا یہ لوگ امیرالمومنین کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے دوسروں سے منسلک رہے اور حضرت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد معاویہ کے مقابلہ میں ان کے ساتھ ہوگئے اور انہی میں ایک گروہ نے جب امیرالمومنین کو اپنی طبیعت و مزاج کے موافق نہ پایا تو تحکیم کا حیلہ تراش کر حضرت سے کٹ گیا اور جو لوگ موقع و وقت دیکھ کر ساتھ ہو جاتے ہیں وہ موقع و وقت دیکھ کر ساتھ چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ یہ نہ اس وقت امیرالمومنین کے مخلص تھے جب اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور نہ اس وقت شیعیانِ علی میں شامل تھے۔ جب بیعت توڑ کر الگ ہوئے تھے۔ یہ لوگ تو سرے سے امیرالمومنین کی خلافت چاہتے ہی نہ تھے بلکہ کوفہ والے چاہتے تھے کہ زبیر خلیفہ ہوں اور بصرہ والے چاہتے تھے کہ طلحہ برسرِ اقتدار آئے۔ اور جب طلحہ و زبیر کی خلافت کی صورت پیدا نہ ہوسکی تو انہوں نے اہلِ مدینہ کے انتخاب سے موافقت کرتے ہُوئے حضرت کی خلافت پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بہرحال جس فوج میں ایسے عناصر شامل ہوں اُسے اتنے عرصہ تک دشمن کی صفوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھنا امیرالمومنین کے حسنِ تدبر ہی کا کرشمہ ہوسکتا ہے ورنہ جہاں اندر ہی اندر بد دلی پھیلائی جارہی ہو عہدوں پر بک جاتے ہوں اور روپیہ پیسہ کے لالچ میں اپنا موقف چھوڑ دیتے ہوں وہاں اس کے علاوہ اور توقع ہی کیا کی جاسکتی تھی کہ وہ عین فتح کے وقت ہتھیار رکھ کر فتح کو شکست سے بدل دیں۔

حکمین کا فیصلہ

۱۳ ر ماہِ صفر ۳۷ھ میں تحکیم کی قرار داد منظور ہوئی اور ماہِ شعبان ۳۷ھ میں دونوں حکم ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص معان اور وادیٔ موسیٰ کے درمیان مقام اذرح میں جمع ہوئے اور حسب قرار داد دونوں جماعتوں کے چار چار سو آدمی بھی پہنچ گئے۔ شامی وفد کا قائد ابو الاعور سلمی تھا اور عراقی وفد کے سربراہ عبداللہ ابن عباس اور شریح ابن ہانی تھے۔ امامت نماز کا فریضہ ابن عباس سے متعلق تھا اور شریح وفد کی قیادت کے علاوہ عمرو ابن عاص کے نام حضرت کا ایک پیغام لے کر بھی آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عمرو ابن عاص سے ملاقات کی اور اس سے کہا کہ امیر المومنین علی نے تمہیں پیغام دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے، جو باطل کی راہ سے منہ موڑ کر حق کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ اگرچہ باطل سے فائدہ اور حق سے نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ لہذا تم جان بوجھ کر حق سے آنکھ بند نہ کرنا اور نہ دنیوی اقتدار کی خاطر اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی مول لینا۔ اس دنیا سے جو کچھ تمہیں حاصل ہوگا وہ آخر تم سے چھن جائے گا۔ وہ دن دور نہیں ہے جب تم بستر مرگ پر کروٹیں لیتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹو گے اور یہ کہو گے کہ کاش میں نے ظالموں سے تعاون کرکے کسی مرد مسلم کی عداوت مول نہ لی ہوتی اور رشوت کی پیشکش قبول کر کے غلط فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ عمرو نے یہ پیغام سنا تو کہا:۔

متی کنت اقبل مشورۃ علی او انتھی الیٰ امرہ او اعتد برایہ۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۶۷)

ایسا موقع کب آیا ہے کہ میں نے علی کا مشورہ قبول کیا ہو یا اُن کی رائے پر عمل کیا ہو یا اُن کی رائے کو کوئی وزن دیا ہو"

شریح نے کہا کہ اے نابغہ کے بیٹے اگر تم امیر المومنین کے مشورہ کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے تو حضرت ابوبکر وحضرت عمر تک ان سے مشورے لیتے رہے ہیں جو بہر حال تم سے بہتر تھے۔ عمرو نے کہا کہ مجھ ایسا آدمی تم سے گفتگو کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ شریح نے کہا کہ یہ غرور و تمکنت عاصی ابن وائل کی طرف نسبت کی بناء پر ہے یا ماں کی شہرت کی بناء پر اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور واپس چلے آئے۔

اس اجتماع سے قبل معاویہ نے عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر، ابوالجہم ابن حذیفہ اور عبدالرحمٰن ابن عبد یغوث کو تحریر کیا تھا کہ تم لوگ جنگ صفین میں تو شریک نہیں ہو سکے لیکن تمہیں ایک مبصر کی حیثیت سے اذرح میں پہنچنا چاہیے تاکہ تحکیم کی کاروائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ چنانچہ یہ لوگ کاروائی کے شروع

ہونے سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ عبدالرحمٰن ابن ابی بکر، سعد ابن ابی وقاص اور مغیرہ ابن شعبہ بھی تحکیم کا جائزہ لینے کے لئے چلے گئے۔ مغیرہ نے اذرح میں پہنچ کر ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی اور ان کا عندیہ معلوم کیا اور پھر معاویہ کے ہاں دمشق پہنچ گیا۔ معاویہ نے پوچھا کہ تم نے حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیا ہو گا تمہارا کیا خیال ہے کہ حکمین کس کے حق میں فیصلہ کریں گے کہا کہ میں نے ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص سے الگ الگ ملاقات کی تھی۔ ابو موسیٰ کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ علی کو خلافت سے علیحدہ کر کے کسی ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو جنگ سے کنارہ کش رہا ہو اس لئے کہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ وہی لوگ قوم وملت کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں جنہوں نے فریقین میں سے کسی فریق کا ساتھ نہ دیا ہو اور نہ اُن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جھکاؤ عبداللہ ابن عمر کی طرف ہے۔ اور عمرو ابن عاص کی افتادِ طبیعت سے تم بخوبی واقف ہو اس کا نظریہ ابو موسیٰ کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے وہ جنگ میں غیر جانبدار رہنے والوں کو غلط کار سمجھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ خود خلیفہ بنے یا اپنے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ بنائے کیونکہ وہ اپنے اور اپنے بیٹے کے مقابلہ میں کسی کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتا۔ معاویہ نے یہ سنا تو پریشان ہو گئے۔ عمرو سے رابطہ قائم کیا تو اس نے نامہ وپیام سے ان کو تسلی کر دی۔

فیصلہ صادر کرنے سے پہلے حکمین کا کسی متفقہ فیصلہ پہ پہنچنا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ تبادلۂ خیالات کے لئے ایک مقام پہ جمع ہوئے اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عمرو ابن عاص نے ابو موسیٰ سے کہا کہ تمہارا عثمان کے بارے میں کیا خیال ہے کیا وہ مظلوم نہیں مارے گئے کہا کہ ہاں وہ مظلوم مارے گئے اور ان کا قتل ناروا تھا۔ کہا کہ معاویہ اُن کے ولی دوارث ہیں اور قرآن مجید میں ہے :۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا۔ — جو شخص مظلوم قتل کر دیا جائے ہم نے اس کے ولی کو حقِ قصاص دیا ہے"

اس کے علاوہ معاویہ کو جو خاندانی عظمت وبلندی حاصل ہے وُہ نہ تم سے پوشیدہ ہے اور نہ کسی اور سے مخفی ہے۔ وُہ پیغمبر کے صحابی دربارِ نبوت کے کاتب اور ام المومنین ام حبیبہ کے بھائی ہیں۔ لہذا ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ہمیں ان کے خلاف فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس امر کا بھی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ اگر وہ برسرِ اقتدار آ گئے تو جو فوائد ان سے حاصل ہو سکتے ہیں اُن کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی۔ ابو موسیٰ نے عمرو کی باتوں کے جواب میں کہا کہ تم نے جو یہ کہا ہے کہ معاویہ عثمان کا ولی ہے تو ان کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے وہ ولی کیسے ہو گئے۔ عثمان کا ولی اُن کا بیٹا عمرو ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے

کہ ہم مہاجرین اولین کو نظر انداز کر کے اس شخص کو خلافت کے لئے منتخب کریں کہ جسے نہ اسلام میں سبقت حاصل ہے اور نہ کوئی فضیلت۔ اور جس خاندانی بلندی کا تم نے ذکر کیا ہے تو اگر ہم اُسے ہی معیار خلافت قرار دے لیں تو پھر ابرہہ ابن صباح کی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہیئے اس لئے کہ وہ ان بادشاہوں کی نسل میں سے ہو گا جو شرق و غرب عالم پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ باقی رہا مفاد کا سوال تو میں رشوت لے کر بک نہیں سکتا۔ میری رائے میں اس وقت موزوں ترین شخصیت عبداللہ ابن عمر کی ہے۔ ہم اسے برسر اقتدار لا کر حضرت عمر کا نام زندہ کر سکیں گے۔ عمرو نے کہا کہ پھر میرا بیٹا عبداللہ کیا بُرا ہے وہ صاحب علم و فضل بھی ہے اور صالح بھی ہے اور اسے صحبت رسُول اور ہجرت کا شرف بھی حاصل ہے کہا کہ یہ درست ہے مگر اس کے ہاتھ خون سے رنگین ہیں اور وہ تمہارے ساتھ شریک جنگ رہ چکا ہے۔ میں عبداللہ ابن عمر ہی کو ترجیح دوں گا۔ اس لئے کہ وہ جنگ سے علیحدہ اور غیر جانبدار رہا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اقتدار تو اسی کو سونپا جا سکتا ہے جو صرف اپنا پیٹ بھرنا ہی نہ جانتا ہو بلکہ دوسروں کے پیٹ کا بھی خیال رکھے۔ ابو موسیٰ نے کہا کہ مُسلمانوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد یہ معاملہ ہمارے سپرد کیا ہے ہمیں فکر و تامل سے اسے سلجھانا چاہیئے اور کوئی نیا شاخسانہ کھڑا نہ کرنا چاہیئے۔ کہا کہ میرے ذہن میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ علیؑ اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیا جائے اور مسلمانوں کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ شوریٰ کے ذریعہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ عمرو نے کہا کہ یہ تجویز بُری نہیں ہے میں اس سے متفق ہوں۔ چنانچہ دونوں ثالثوں نے اس تجویز پر اتفاق رائے کے بعد اس کے اعلان کا فیصلہ کر لیا۔

اس تصفیہ کے بعد جب دونوں الگ الگ ہوئے تو ابن عباس نے موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو فیصلہ متفقہ طور پر تمہارے درمیان ہوا ہے۔ عمرو اس کا پابند نہیں رہے گا۔ وہ ہوشیار و چالاک ہے ضرور تمہیں فریب دے گا۔ لہٰذا جب اعلان کا موقع آئے تو پہلے اسے اعلان کرنے دینا اور بعد میں تم اعلان کرنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ وُہ ایسا چکمہ دے گا کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ ابو موسیٰ نے کہا کہ ہم جس امر پر متفق ہوئے ہیں اس میں کسی فریب یا ہیر پھیر کی گنجائش نہیں ہے۔ جب اس تصفیہ کے دوسرے دن شام و عراق کے نمائندے مبصرین اور دونوں ثالث مسجد جامع میں جمع ہوئے تو عمرو نے ابو موسیٰ سے کہا کہ آپ اعلان کریں۔ عمرو نے پہلے سے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ وُہ ہر بات میں ابو موسیٰ کو مقدم کرتا اور اُسے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ چونکہ وہ بزرگ اور پہلے کا صحابی ہے لہٰذا اس پر سبقت کرنا ایک طرح سوءِ ادب اور ناقابلِ تلافی جرم ہے۔ اور ابو موسیٰ بھی اپنی روایتی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ آؤ بھگت اس کے مرتبہ و مقام کی وجہ سے ہے

اس نے ابن عباس کی نصیحت کو نظر انداز کر دیا اور بڑی تمکنت سے اٹھا اور فرازِ منبر پر بلند ہو کر حمد و ثنا پر مشتمل خطبہ پڑھا اور پھر مجمع سے مخاطب ہو کر کہا اے لوگو ہم نے اُمت کی فلاح و یکجہتی کے پیشِ نظر بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم دونوں علی اور معاویہ کو معزول کر دیں اور امرِ خلافت شوریٰ کے حوالے کر دیں۔ لہٰذا میں علی اور معاویہ دونوں کو برطرف کرتا ہوں۔ اب تم جسے چاہو اسے سربراہِ مملکت منتخب کر لو۔

یہ اعلان عراقیوں کیلئے بڑا حوصلہ شکن تھا مگر وُہ بڑے ضبط و صبر سے بیٹھے رہے تاکہ عمرو ابن عاص کی زبان سے بھی یہ فیصلہ سن لیں۔ عمرو ابن عاص نے منبر پر کھڑے ہو کر حمد و ثناء کے بعد کہا اے لوگو ابو موسیٰ نے جو کچھ کہا ہے وُہ تم نے سن لیا ہے وُہ علی کے مقرر کردہ نمائندے ہیں انہوں نے علی کو معزول کر دیا ہے۔ میں بھی انہیں اسی طرح معزول کرتا ہوں جس طرح انہوں نے معزول کیا ہے لیکن معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں۔ کیونکہ وہ عثمان کے ولی ان کے قصاص کے خواہاں اور اُن کی نیابت و جانشینی کے اہل ہیں۔ اس اعلان پر شامیوں نے نعرے لگائے، عراقیوں نے حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس پُر فریب اعلان پر بگڑے چیخے چلّائے مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا فریب اپنا کام کر گیا۔ ابو موسیٰ جو اس غلط فیصلہ کا بڑی حد تک ذمہ دار تھا وُہ بھی عمرو کی بد عہدی و فریب کاری پر سٹپٹایا اور اس سے کہا کہ اے ابن عاص خدا تجھ سے اپنی توفیقات کو سلب کرے تو نے مجھے اندھیرے میں رکھا اور آخر میں دھوکا دیا تمہاری مثال کتے کی سی ہے وُہ ہانپے گا اور زبان نکالے گا چاہے اس پر حملہ کرو چاہے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ عمرو نے بھی اس کی بزرگی و صحابیت کی بساط لپیٹ دی اور بگڑ کر کہا:۔

ومثلك كمثل الحمار يحمل اسفارا۔ (اخبار الطوال۔ صفحہ ۲۰۰)	تمہاری مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں"

شریح ابن ہانی اس مکارانہ کاروائی پر ضبط نہ کر سکے اور آگے بڑھ کر عمرو پر کوڑا برسایا۔ اس نے بھی کوڑا اٹھا لیا۔ کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر انہیں چھڑایا۔ شریح اس کے بعد کہا کرتے تھے:۔

ما ندمت علیٰ شیئ ندامتی علیٰ ضرب عمرو بالسوط ولم اضربه بالسیف۔ (تاریخ کامل ج ۳۔ صفحہ ۱۶۸)	میں کسی بات پر اتنا نہیں پچھتایا جتنا اس بات پر پچھتاتا ہوں کہ میں نے کوڑے کے بجائے عمرو پر تلوار کیوں نہ چلائی"

ابن عباس نے بھی پیچ و تاب کھاتے ہوئے ابو موسیٰ سے کہا کہ تم نے میری بات پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا اور اس میں تمہارا قصور نہیں ہے تم سے اسی کی توقع ہو سکتی تھی۔ اس میں قصور ہے تو ان لوگوں کا

جنہوں نے نہیں نا اہل ہونے کے باوجود ثالث بنایا۔ عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے کہا :-

لو مات الاشعری قبل ھذا الیوم لکان خیرا لہ۔ ابو موسیٰ کے لئے بہتر یہی تھا کہ وُہ اس دن سے پہلے ہی مر کھپ گیا ہوتا "

(تاریخ کامل۔ ج ۳ صفحہ ۱۶۸)

غرض اس طرح اور لوگوں نے بھی اس کی سادہ لوحی فریب خوردگی کا رونا رویا اور اسے بُرا بھلا کہا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اب کون دیکھتا تھا کہ فیصلہ کیا ہوا تھا اور اعلان کیا ہوا۔ شامی فتح و کامرانی کے نعرے لگاتے ہُوئے دمشق کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر معاویہ کو خلافت کی مبارکباد دی اور عراقی رنجیدہ و دل شکستہ کوفہ کی طرف واپس ہوئے اور ابو موسیٰ بھی اس کارنامہ کے بعد منہ چھُپا کر مکہ کی طرف نکل گیا۔

ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص کو اس امر کا پابند کیا گیا تھا کہ وہ قرآن مجید کی روشنی میں فیصلہ کریں اور اگر قرآن سے فیصلہ اخذ نہ کر سکیں تو سنّتِ رسول کی رُو سے تصفیہ کریں۔ مگر ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی آخر کس قرآنی آیت یا سنت کی بنار پر ایک اپنے بیٹے عبداللہ کا نام خلافت کے لئے لیتا ہے اور دوسرا عبداللہ ابن عمر کا نام پیش کرتا ہے اور پھر مہاجرین اولین کے ہوتے ہوئے ان میں کون سی امتیازی فضیلت تھی کہ مسلمانوں کی قیادت ان کے سپرد کی جاتی۔ فرزند ابن عاص وُہ ہے جو ابتدار میں معاویہ سے وابستگی کو دُنیا پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے باپ کو اُن کے ہاں جانے سے منع کرتا ہے اور پھر خود ان کی صفوں میں شامل ہو کر حضرت علی کے خلاف جنگ میں حصہ لیتا ہے۔ اور عبداللہ ابن عمر وُہ ہے جسے خود اُس کے باپ حضرت عمر نے مسئلہ طلاق سے بے خبر ہونے کی بنار پر خلافت کا اہل نہ سمجھا تھا اور جن چھ آدمیوں کا شوریٰ ترتیب دیا تھا اس میں اس کا نام تک تجویز نہ کیا۔ پھر حکمین کو اس کا اختیار ہی کب تھا کہ وہ کسی کو خلیفہ نامزد کریں یا امیرالمومنین کو خلافت سے معزول کر کے خلافت معاویہ کے حوالے کر دیں۔ معاویہ کے گرد جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ قصاص کے لئے جمع ہوئے تھے اور اسی قصاص کے لئے انہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا کیونکہ معاویہ نے یہ چیز ان کے ذہن نشین کر دی تھی کہ حضرت عثمان کے قتل کی ذمہ داری حضرت علی پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے معاویہ کو مسند خلافت پہ بٹھانے کے لئے جنگ نہیں چھیڑی تھی مگر ان دونوں ثالثوں نے قصاص کو نظر انداز کر کے خلافت کو محل بحث بنا لیا حالانکہ خلافت نہ محل نزاع تھی اور نہ اس کا تحکیم سے کوئی واسطہ تھا۔ انہیں قاتلین عثمان کو زیر بحث لانا چاہیئے تھا اور پھر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے تھا کہ حق قصاص معاویہ

کو حاصل ہے یا یہ مرکزی حکومت کا حق ہے مگر اذرح کی پوری کارروائی کو دیکھ جائیے کسی کی زبان پر بھولے سے بھی قاتلین عثمان کا نام نہیں آتا اور نہ قصاص کا کوئی تذکرہ ہوتا ہے۔ البتہ عمرو ابن عاص نے اتنا کہا کہ عثمان مظلوم قتل کئے گئے اور معاویہ ان کے ولی اور طالب قصاص ہیں مگر ان کی تان بھی خلافت پر ٹوٹتی ہے اور اسے معاویہ کے استحقاقِ خلافت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ابن حجر مکی اور ان کے ہم خیال لوگوں نے معاویہ کے دل و دماغ کو ہوسِ خلافت سے خالی ثابت کرنے کے لئے اس نظریہ پر زور دیا ہے کہ وہ خلافت کے لئے برسرپیکار نہ تھے بلکہ ان کا مقصد قصاص خون عثمان تھا۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں :۔

ومن اعتقاد اهل السنة و الجماعة ان ماجرى بين معاوية وعلى رضى الله عنهما من الحروب فلم يكن لمنازعة معاوية لعلى فى الخلافة للاجماع على حقيتها لعلى۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۲۱۶)

"اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ معاویہ اور علی کے درمیان جو جنگیں ہوئیں وہ اس وجہ سے نہ تھیں کہ معاویہ علی سے خلافت کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے اس لئے کہ علی کی خلافت کے حق ہونے پر اجماع ہو چکا تھا۔"

اگر ابن حجر کی مراد یہ ہے کہ معاویہ حضرت علی کی خلافت پر معترض نہ تھے اور ان کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے تو صرف یہ ایک دعوی ہی دعوی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر وُہ حضرت کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے تو پھر بیعت سے انکار کیوں جب کہ انکارِ بیعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ انہیں خلافت سے انکار تھا اور اگر یہ مراد ہے کہ وُہ اپنے لئے خلافت کے خواہاں نہ تھے تو یہ بھی واقعات کے سراسر خلاف ہے اس لئے کہ اگر خلافت ان کے پیشِ نظر نہ تھی تو عمرو ابن عاص سے امارتِ مصر کا وعدہ کس بنا پر کیا تھا اور امیرالمومنین نی ہوج کے ایک سردار زیاد ابن خصفہ کو بصرہ یا کوفہ کی پیش کش کس برتے پر کی تھی اور خالد ابن معمر سے خراسان کا اور قیس ابن سعد سے حکومت عراقین کا وعدہ کس امید پر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ وعدے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ہی پورے کئے جا سکتے ہیں اور یہ سارے جھگڑے جھیلے اسی لئے تو تھے کہ خلافت کو اپنے پائے نام کر کے اموی حکومت کی بنیاد رکھ دیں۔

معاویہ کی خلافت متفقہ فیصلہ کی خلاف ورزی اور عمرو ابن عاص کی بدعہدی کے نتیجہ میں قرار پائی دونوں ثالثوں میں یہ طے پایا تھا کہ علی اور معاویہ دونوں کی برطرفی کا اعلان کیا جائے مگر عمرو نے عہد شکنی کرتے ہوئے علی کی برطرفی کو بحال رکھا اور معاویہ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس علانیہ فریب کاری کے نتیجہ میں تشکیل پانے والی خلافت کی شرعی و اخلاقی حیثیت اس خلافت کے مقابلہ میں جس کی صحت

پر انصار و مہاجرین اولین کا اجماع قائم ہو چکا ہو کیا باقی رہ جاتی ہے اور علماء اہلسنت کے نزدیک ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے دوسرے مدعی خلافت کی بیعت سراسر ناجائز اور غلط ہے بلکہ اس سلسلہ میں پیغمبر اکرم کی متعدد حدیثیں بھی کتب احادیث میں موجود ہیں کہ :۔

اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الاخر منہما۔ (جامع الاصول۔ ج ۴ ص ۴۴۲)	جب دو خلیفوں کی بیعت کی نوبت آئے تو اُن میں جو دوسرا ہو اسے قتل کر دو"

تحکیم کے سلسلہ میں ابو موسیٰ نے جو کردار ادا کیا اس کی توقع کسی بھی سُوجھ بُوجھ رکھنے والے انسان سے نہیں کی جا سکتی ۔ اس نے پہلے تو علی اور معاویہ کو ایک سطح پر لانے کے لئے دونوں کی معزولی کا فیصلہ کیا گویا یہ دونوں برابر کے دعویداران خلافت تھے اور اس کا تصفیہ اس کے سپرد کیا گیا ہے حالانکہ معاویہ کی معزولی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں کیونکہ نہ کسی نے خلافت کے سلسلہ میں اُن کا نام لیا تھا اور نہ کسی نے انہیں امیدوار نامزد کیا تھا اور امیرالمومنین کی خلافت کو شام کے علاوہ حجاز، مصر، یمن، خراسان تمام صوبوں کے باشندے تسلیم کر چکے تھے اور ان کا انتخاب بھی صحابہ کبار کی رائے سے عمل میں آیا تھا اس کے بعد خلافت کے سلسلہ میں دونوں کا یکساں نام لینا اموی سازش کا کرشمہ نہ تھا تو کیا تھا امیرالمومنین اس چیز کو سمجھتے تھے اسی لئے انہوں نے نمائندوں کے انتخاب کے موقع پر ابو موسیٰ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا اور جنگ جمل کے موقع پر اس کے کردار کو دیکھنے کے بعد اس پر اعتماد کیا بھی کیسے جا سکتا تھا۔ اس غلط انتخاب کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہو گی جو اس کے انتخاب پر زور دیتے رہے تھے حالانکہ وُہ اس امر سے بے خبر نہ تھے کہ ابو موسیٰ حضرت سے بغض و عناد کی بنار پر اُن کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

ابو موسیٰ یہ بھی سمجھتا تھا کہ حضرت علی کے کامیاب ہونے کی صورت میں اُسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو گا البتہ معاویہ کی حمایت کا صلہ کسی عہدہ کی صورت میں مل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد سر پر ایک لانبی ٹوپی رکھے ان کے ہاں پہنچ گیا۔ اور بصد احترام السلام علیک یا امین اللہ کہہ کر انہیں فرشی سلام کیا۔ معاویہ سمجھ گئے کہ یہ اپنی کارکردگی کا صلہ مانگنے آیا ہے جب وہ ادھر ادھر ہوا تو معاویہ نے درباریوں سے کہا :۔

قدم الشیخ لاولیہ ولاواللہ لااولیہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۲۴۵)	یہ بزرگ اس لئے آئے ہیں کہ میں انہیں کسی صوبہ کا حاکم بنا دوں گا مگر خدا کی قسم میں انہیں کوئی عہدہ نہیں دوں گا"

اس تحکیم اور اس کے بے ضابطہ فیصلہ کے نتیجہ میں اختلافات ویسے کے ویسے باقی رہے بلکہ امیرالمومنین کے خلاف دوطرفہ محاذ قائم ہوگیا۔ ایک طرف خوارج تھے اور دوسری طرف اہل شام اور اب ان دونوں سے نمٹنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

جنگِ نہروان

ابوموسیٰ نے امیرالمومنین کی برطرفی اور عمرو ابن عاص نے اس برطرفی کے ساتھ معاویہ کے تقرر کا جو کھیل کھیلا اور جس طرح قرآن وسنت کے تقاضوں کو نظر انداز کیا اور عہد و پیمان کی دھجیاں اڑائیں۔ وہ تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ لوگ جو امیرالمومنین کو میدان حرب و ضرب میں شکست نہ دے سکے وہ مکر و فریب کے میدان میں بازی لے گئے۔ اور حق و دیانت سے منہ موڑ کر معاویہ کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن گئے۔

امیرالمومنین کے لئے حکمین کا فیصلہ خلاف توقع نہ تھا بلکہ تحکیم کی قرارداد کو بروئے کار لانے والے افراد کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ یہ دونوں معاویہ کی جنبہ داری اور اُن کے اقتدار کا تحفظ کریں گے اگرچہ خوارج فیصلہ تحکیم سے پہلے آپ کو جنگی قدم اٹھانے پر مجبور کرتے رہے مگر آپ نے معاہدہ کی خلاف ورزی گوارا نہ کی۔ اور جب حکمین نے اپنے حدود کار سے تجاوز کر کے قاتلان عثمان کے بارے میں فیصلہ کرنے کے بجائے خلافت کا فیصلہ کر دیا اور اس سلسلہ میں نہ قرآن کی طرف رجوع کیا اور نہ سنت رسول کو پیشِ نظر رکھا حالانکہ یہ دونوں چیزیں قرارداد میں بنیادی حیثیت سے شامل تھیں تو آپ نے اہل شام سے دوبارہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اس لئے کہ امیرالمومنین کے لئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو باطل کے آگے سر جھکا دیں یا شام پر دوبارہ چڑھائی کر دیں۔ پہلی صورت ممکن ہی نہ تھی کہ حق کو پامال ہوتے دیکھیں اور خاموش رہیں اور دنیا کو یہ تاثر دیں کہ حکمین نے فیصلہ کیا ہے وہ صحیح اور مطابق کتاب وسنت ہے۔ اب یہی ایک صورت تھی کہ لشکر ترتیب دے کر شام کی طرف قدم بڑھائیں تاکہ معاویہ کی فریب کاری اور حکمین کی عہد شکنی عالم آشکارا ہو جائے۔

جب امیرالمومنین نے شام پر چڑھائی کا ارادہ کر لیا تو چاہا کہ خوارج کو بھی جو شام پر حملہ آور ہونے کے لئے بے چین تھے شریک جنگ ہونے کی دعوت دیں۔ چنانچہ آپ نے عبداللہ ابن وہب اور یزید ابن حصین کو تحریر کیا کہ "ہم نے جن دو آدمیوں کو حکم تسلیم کیا تھا انہوں نے کتاب خدا کی خلاف ورزی

کی ہے اور نفسانی خواہشات کی رو میں بہہ گئے ہیں انہوں نے نہ قرآن پر عمل کیا اور نہ سنت رسولؐ پر اب ہمارا موقف وہی ہے جو تحکیم سے پہلے تھا لہٰذا تم ہم سے تعاون کرو تا کہ اپنے مشترکہ دشمن کی طرف قدم بڑھائیں اور اُن سے جنگ کریں یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" خوارج نے جواب میں تحریر کیا کہ اب آپ خدا کی خوشنودی کی خاطر جنگ کے لئے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ اپنے نفس کی خاطر جنگ لڑنا چاہتے ہیں اگر آپ اپنے کفر کا اعتراف کر کے توبہ کریں تو پھر ہم غور کریں گے کہ ہمیں آپ کا ساتھ دینا چاہیئے یا نہیں اور اگر آپ نے اقرار کفر کے بعد توبہ نہ کی تو ہم آپ سے لڑینگے اور اللہ خیانت کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب امیرالمومنین نے دیکھا کہ خوارج ساتھ دینے پر تیار نہیں ہیں تو انہیں نظر انداز کر کے فوج کی فراہمی میں معروف ہو گئے اور اہل کوفہ کے ایک اجتماع میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا اہل کو یاد رکھو کہ جو جہاد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے وُہ تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتا اٹھو اور ان لوگوں کے مقابلہ میں کمربستہ ہو جاؤ جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہیں اور خُدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں یہ ظالم جفا کار اور راہ حق سے برگشتہ ہیں۔ یہ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ دین میں سُوجھ بُوجھ رکھتے ہیں اور نہ خلافت کے اہل ہیں۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ برسراقتدار آ گئے تو اسلامی قدروں کو پائمال کر کے ہرقلی و کسروی نظام قائم کریں گے اُٹھو اور ان دشمنانِ دین سے جنگ کرو۔ ہم نے بصرہ سے بھی فوجی مدد طلب کی ہے اس کے آتے ہی ہم شام کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔

حضرت نے عامل بصرہ ابن عباس کو تحریر فرمایا کہ ہم شامیوں سے لڑنے کے لئے جا رہے ہیں تم بصرہ سے فوجی کمک لے کر نخیلہ پہنچو جسے ہم نے فراہمی لشکر کے لئے چھاؤنی قرار دیا ہے۔ حضرت کے اس پیغام پر ابن عباس اور احنف ابن قیس نے اہل بصرہ کو حضرت کے حکم سے آگاہ کیا گیا انہیں جلد از جلد تیاری کی ہدایت کی اس آواز پر پندرہ سو آدمی جنگ کے لئے آمادہ ہوئے۔ ابن عباس نے اس قلیل جماعت کو دیکھا تو اہلِ بصرہ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اے لوگو! میں تمہیں امیرالمومنین کے حکم سے آگاہ کر چکا ہوں انہوں نے تمہیں دشمن سے لڑنے کے لئے بلایا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے شہر سے جہاں ساٹھ ہزار جنگجو افراد موجود ہیں صرف پندرہ سو آدمی جنگ کے لئے آمادہ ہوئے ہیں اگر تم جنگ سے پہلو تہی کرتے ہوئے گھروں میں بیٹھے رہے تو یاد رکھو کہ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ میں نے جاریہ ابن قدامہ سعدی کو فراہمی لشکر کے لئے مامور کیا ہے تم فوراً ان کے پرچم کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ اس کہنے سننے اور جھنجھوڑنے سے مزید سترہ سو آدمی تیار ہوئے اور یہ تین ہزار دو افراد کا لشکر کوفہ کی سمت روانہ ہو گیا۔

اس لشکر کے وارد نخیلہ ہونے کے بعد رؤسائے کوفہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے

ان سے فرمایا کہ اہلِ بصرہ نے جس حدتک تعاون کیا ہے وہ تمہارے سامنے ہے تم لوگ میرے اعوان و انصار اور بازوئے شمشیر زن ہو تم میں سے ہر سردار قبیلہ کو چاہیئے کہ وُہ اپنے قبیلہ والوں کو جہاد کی ترغیب دے اور جو بھی لڑنے کے قابل ہو اسے لشکر میں شامل ہونے کی دعوت دے اس پر سعید ابن قیس ہمدانی، معقل ابن قیس، عدی ابن حاتم، زیاد ابن خصفہ، حجر ابن عدی اور دوسرے سردارانِ قبائل نے کہا کہ ہم بسر و چشم آپ کا ہر حکم بجالائیں گے اور افواج و عساکر کی فراہمی میں تعاون کریں گے۔ چنانچہ ان لوگوں کی تحریک پر مختلف قبائل سے پینسٹھ ہزار شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہوئے امیرالمومنین نے سعد ابن مسعود عامل مدائن کو بھی لشکر کی فراہمی کے لئے تحریر فرمایا اور اس طرح کوفہ بصرہ اور مدائن سے آنے والے ستر ہزار افراد آپ کے پرچم نیچے جمع ہو گئے۔

جب فوجیں منظم اور جنگی تیاریاں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمیں پہلے خوارج سے نمٹ لینا چاہیئے اور اس کے بعد شام کا رُخ کرنا چاہیئے۔ حضرت نے فرمایا کی فی الحال خوارج کو اُن کے حال پر چھوڑ دو اور شام کی سمت بڑھو، اگر تم ادھر جنگ میں مصروف ہو گئے تو معاویہ کو مزید قوت و طاقت کے بہم پہنچانے کا موقع مل جائے گا۔ مناسب یہی ہے کہ اسے موقع دیئے بغیر اس سے جنگ چھیڑ دی جائے۔ لوگوں نے کہا یا امیرالمومنین آپ جو مناسب سمجھیں وُہ کریں ہم بہر صورت آپ کے ساتھ ہیں صیفی ابن نسیل شیبانی نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم آپ کے گروہ میں شامل اور آپ کے دست و بازو ہیں ہم اس کے دوست ہیں جو آپ کا دوست ہو اور اس کے دشمن ہیں جو آپ کا دشمن ہو وُہ جو بھی ہو اور جہاں بھی ہو۔ آپ انشاء اللہ مددگاروں میں کمی اور ہمارے ارادوں میں سستی محسوس نہ کریں گے محرز ابن شہاب تمیمی نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم آپ کے مطیع و فرمانبردار اور آپ کی نصرت پر یکدلی سے جمع ہیں آپ خوارج کی طرف بڑھیں یا اہل شام کی طرف ہم آپ کے دشمنوں سے لڑنے میں حیل حجت نہیں کریں گے جب کہ ہمیں علم ہے کہ آپ کی اطاعت فرض اور آپ کے دشمنوں سے جہاد باعث ثواب عظیم ہے۔

اس اثناء میں خوارج کی شوریدہ سری و شورہ پشتی نے قتل و غارت گری کی صورت اختیار کر لی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ راستے میں انہیں جو شخص ملتا اس سے تحکیم کے بارے میں پوچھتے اگر وُہ اس سے اظہار بیزاری کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے ورنہ اسے قتل کر دیتے البتہ غیر مسلم کو ذمی ہونے کی بناء پر چھوڑ دیتے اور مسلم کے لئے اُن سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا بلکہ خنزیر پر ہاتھ اٹھانا گناہ اور مسلمان کو قتل کرنا کارِ ثواب سمجھتے۔ مبرد نے کامل میں لکھا ہے کہ خوارج نے نہروان کے راستے میں ایک نصرانی اور ایک مسلمان کو دیکھا۔ مسلمان کو انہوں نے قتل کر دیا اور نصرانی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ہمارے نبی نے نصرانیوں کو اہل ذمہ

میں سے قرار دیا تھا لہٰذا ان پر ہاتھ اٹھانا گناہ اور پیغمبرؐ کے معاہدہ کی توہین ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ سے اگر کوئی اپنی جان بچانا چاہتا تھا تو اس کے لئے یہی ایک صورت تھی کہ وُہ اپنے کو ذمی یا مشرک ظاہر کرے اور تو اور واصل ابن عطاء نے بھی اپنے کو مشرک کہہ کر اُن سے اپنی جان چھڑائی۔ واقعہ یہ ہُوا کہ واصل اور اس کے چند رؤسا کی خوارج سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ خوارج نے پوچھا کہ تم کون ہو واصل نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ خوارج ہیں تم خاموش رہو میں تمہاری طرف سے گفتگو کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر خوارج کے قریب آئے اور کہا کہ ہم لوگ مشرک ہیں اور تم لوگوں سے پناہ کے طالب ہیں تاکہ تم سے قرآن کے اوامر و نواہی سیکھیں اور ان پر عمل کریں۔ واصل کہتا ہے کہ انہوں نے ہماری بات کو صحیح سمجھا اور ہمیں قرآن کے احکام سکھاتے اور اس کی تاویل بتاتے رہے اور ہم ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ جب ہم نے ان کی تمام باتیں بے کم وکاست تسلیم کرلیں تو انہوں نے کہا کہ اب تم ہمارے بھائی ہو جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ واصل نے کہا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:۔

وان احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم ابلغه مامنه۔	اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وُہ اللہ کا کلام سن لے پھر اُسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دو۔"

لہٰذا ہمیں اپنی حفاظت میں ہمارے گھروں تک پہنچاؤ۔ خوارج نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کہ قرآن کی رُو سے ان کا مطالبہ جائز ہے لہٰذا ہمیں ان لوگوں کو ان کے گھروں تک پہنچانا چاہیے۔ چنانچہ انہیں ان کے گھروں تک چھوڑ گئے اور اس طرح واصل نے تقیہ کا سہارا لے کر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا تحفظ کیا۔

اسی طرح صحابی رسُول خباب بن ارت کے فرزند عبداللہ گلے میں قرآن حمائل کئے ان کے قریب سے گزرے تو انہیں روک لیا اور پوچھا کہ تم کون ہو کہا کہ میں صحابیٔ رسول خباب کا بیٹا عبداللہ ہوں کہا کہ اگر تم ہمیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے ہو تو اپنے دل سے خوف وہراس نکال ڈالو ہم چاہتے ہیں کہ تم سے وہ حدیث سنیں جو تم نے اپنے باپ سے روایت کی ہو کہا کہ میرے باپ نے رسول اللہ کو فرماتے سُنا:۔

تكون فتنة يموت فيها قلب الرجل كما يموت فيه بدنه يمسى فيها مومنا ويصبح كافرا	ایک فتنہ کھڑا ہو گا جس میں انسان کا دل مُردہ ہو جائے گا جس طرح اس کا بدن مُردہ ہو جاتا ہے۔ وُہ شام کو مومن ہو گا اور صبح ہوتے کافر ہو

ویصبح کافرا ویمسی مومنا۔ | جائے گا اور صبح کافر ہوگا اور شام ہوتے مومن ہو جائے گا۔"
(تاریخ کامل۔ج ۳ ص ۱۷۲)

خوارج نے کہا کہ ہم تمہاری زبان سے یہی حدیث سننا چاہتے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ علی کے بارے میں جب کہ انہوں نے نظریۂ تحکیم تسلیم کر لیا کیا کہتے ہو کہا:۔

انہ اعلم باللہ منکم واشد توتیا علی دینہ وانفذ بصیرۃ | وہ تم لوگوں سے زیادہ اللہ کو پہچانتے ہیں اور دین میں انتہائی محتاط اور کامل بصیرت رکھتے ہیں۔"
(تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۷۲)

کہا کہ تم شخصیت پرست ہو اور کام کے بجائے نام سے متاثر ہو خدا کی قسم ہم تمہیں ہوائے نفس کی پیروی کی سزا دیں گے اور اس طرح قتل کریں گے کہ کسی اور کو یوں قتل نہ کیا ہوگا۔ یہ کہہ کر ان کی مشکیں باندھ لیں اور انہیں اور اُن کی بیوی کو جو حاملہ تھیں ایک درخت خرما کے قریب لے آئے۔ اس درخت پر سے کھجور کا ایک دانہ زمین پر گرا جسے ایک خارجی نے اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ لوگوں نے شور مچا دیا حرام حرام۔ اس نے فوراً خرما منہ سے پھینک دیا۔ اتنے میں ایک خنزیر ادھر سے گزرا ایک خارجی نے اسے مار ڈالا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ فساد فی الارض ہے اور اس وقت تک انہوں نے چین نہ لیا جب تک اس کے مالک کو بلا کر راضی نہ کر لیا۔ عبداللہ نے ان کا یہ طرز عمل دیکھا تو کہا کہ جب تم لوگ ذرا ذرا سی بات میں اتنی احتیاط برتتے ہو تو مجھے تم لوگوں سے کوئی خطرہ نہ ہونا چاہیئے جب کہ میں مسلمان بھی ہوں اور کسی ایسے جرم کا مرتکب بھی نہیں ہوا جس کی سزا قتل ہو۔ مگر انہوں نے کوئی بات نہ سنی اور انہیں زمین پر پچھاڑ کر نہایت بے دردی سے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کا پیٹ چاک کر کے اُسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور بنی طے کی تین عورتوں اور ام سنان صیداویہ کو بھی ذبح کر ڈالا۔ اس بہیمانہ وسفاکانہ قتل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ایک عیسائی سے ایک درخت خرما کا پھل خریدنا چاہا اس نے کہا کہ مجھے قیمت نہیں چاہیئے تم یونہی لے لو۔ کہا کہ ہم ایک ذمی کا مال قیمت ادا کئے بغیر نہیں لیں گے۔ اس نصرانی نے حیرت سے کہا کہ تم ابن خباب ایسے شخص کو بے گناہ مار ڈالتے ہو اور ایک درخت کا پھل بے قیمت لینا گوارا نہیں کرتے۔

ان وحشت و بربریت کے مظاہروں کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا مملکت کے لئے انتہائی خطرناک تھا کیونکہ امیرالمومنین دارالحکومت کوفہ کو خالی چھوڑ کر شام پر چڑھائی کے ارادہ سے نکلنے والے تھے اور کوفہ خوارج کے مرکز سے قریب تھا اور خود کوفہ میں بھی ان کے ہم خیال لوگ موجود تھے۔ ان حالات میں

یہ قوی اندیشہ تھا کہ وہ حضرت کی عدم موجودگی میں بلا مزاحمت دارالحکومۃ پر قبضہ کر لیں اور اپنے مخالفین کا قتل عام شروع کر دیں۔ حضرت کے لشکر میں اکثریت اہل کوفہ کی تھی ان کے اہل وعیال اور املاک و اموال خوارج کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پہلے ان سے نمٹ لیا جائے اور پھر شام کا رُخ کیا جائے۔ چنانچہ لشکر والوں نے حضرت سے اس خیال کا اظہار کیا آپ نے خوارج کا جائزہ لینے کے لئے حارث ابن مرہ عبدی کو ان کے ہاں بھیجا مگر خوارج نے انہیں بھی قتل کر دیا۔ اب کوئی چارہ نہ تھا کہ پہلے خوارج سے نمٹا جائے۔ اور پھر شام کی جانب کوچ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت نے شام جانے کے بجائے نہروان جانے کا حکم دے دیا جب لشکر روانہ ہونے لگا تو مسافر ابن عفیف ازدی نے کہا کہ یا امیر المومنین میں ستاروں کی گردش کو پہچانتا ہوں یہ نیک ساعت نہیں ہے۔ جب تین گھڑی دن گزر جائے اس وقت سفر کا آغاز کیا جائے ورنہ لشکر کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم بتا سکتے ہو کہ میری گھوڑی کے پیٹ میں کیا ہے؟ کہا کہ میں حساب لگا کر بتا سکتا ہوں۔ فرمایا جو تمہاری اس بات پر یقین کرے گا وہ قرآن مجید کے جھٹلانے کا مرتکب ہو گا۔ قرآن یہ کہتا ہے:۔

ان اللہ عندہ علم الساعۃ و	"اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے وہی مینہ برساتا ہے
ینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام۔	اور وہی جانتا ہے کہ شکموں کے اندر کیا ہے"

پھر اس منجم کو تہدید و سرزنش کی اور لشکر والوں سے فرمایا کہ ان چیزوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اور اللہ پر بھروسا کر کے چل کھڑے ہو۔

جب لشکر نے نہروان کی راہ لی تو آگے بڑھ کر متعدد آدمیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ خوارج حلوان و بغداد کے درمیان نہر طبرستان کو عبور کر کے پار اُتر گئے ہیں۔ امیرالمومنین کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا وُہ ابھی اسی طرف ہیں اور دریا کے ادھر ہی رمیلہ کی سرزمین پر قتل کئے جائیں گے۔ اتنے میں مقدمۃ الجیش کا ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں پل کے ذریعہ پار اُترتے دیکھا ہے۔ حضرت نے تین مرتبہ اُس سے دریافت کیا اس نے ہر مرتبہ قسم کھا کر یہی کہا کہ وُہ دریا کے اُدھر جا چکے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

واللہ ما عبروہ وان مصارعھم	"خدا کی قسم انہوں نے نہر کو عبور نہیں کیا ان کے قتل
لدون الجسر واللہ لا یقتل منکم	ہو کر گرنے کی جگہ پل کے ادھر ہے۔ خدا کی قسم تم میں
عشرۃ ولا یسلم منھم عشرۃ۔	سے دس آدمی بھی قتل نہیں ہوں گے اور اُن میں
(تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۷۴)	سے دس بھی نہیں بچیں گے"

ایک طرف پے در پے یہ خبریں آ رہی تھیں کہ خوارج پار اُتر گئے ہیں اور ادھر امیر المومنین برابر یہ فرما رہے تھے کہ وہ نہر کے ادھر ہی ہلاک ہوں گے اس سے بعض لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہوئے اور ایک نوجوان نے تیور چڑھا کر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خوارج نے دریا عبور کر لیا ہو گا تو میں حضرت پر نیزہ تان کر کھڑا ہو جاؤں گا کہ اب آپ عالم غیب کی خبریں بھی دینے لگ گئے ہیں۔ امیر المومنین نے کچھ لوگوں کی یہ ذہنی کیفیت دیکھی تو گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے نہر کی طرف بڑھے۔ جب نہر کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ خوارج نہر کے ادھر ہی پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں اور اسے عبور نہیں کیا ہے۔ اتنے میں لشکر بھی پہنچ گیا اس نے خوارج کو نہر کے ادھر دیکھا تو اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضرت نے لشکر سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

واللہ ما کذبت ولا کذبت

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۷۴)

خدا کی قسم نہ میں نے جھوٹ کہا ہے اور نہ مجھے جھوٹی خبر دی گئی تھی۔

امیر المومنین نے خوارج سے تین میل کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ خارجیوں نے لشکر کو دیکھا تو لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگایا اور حضرت کو پیغام بھجوایا کہ اب بھی آپ تائب ہو جائیں تو ہم آپ کی بیعت کریں گے ورنہ خلافت سے علیحدہ ہو جائیے تاکہ ہم اپنا کوئی امام منتخب کریں۔ حضرت نے انہیں کہلوایا کہ ہمارے دوستوں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو تاکہ ہم ان سے قصاص لیں اور اس کے بعد جب تک ہم شام کی جنگ سے فارغ نہیں ہو جاتے تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے اور تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے شائد اس عرصہ میں اللہ تمہیں سوچنے سمجھنے اور حق کی طرف پلٹ آنے کی توفیق دے دے۔ خوارج نے جواب میں کہا کہ ہم سب نے آپ کے بھائی بندوں کو قتل کیا ہے اور ہم سب آپ کا اور ان کا خون بہانا جائز و مباح سمجھتے ہیں۔

امیر المومنین نے خوارج کے اس جواب پر مشتعل ہونے کے بجائے انہیں پھر سمجھانے کی کوشش کی اور قیس ابن سعد انصاری کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں فتنہ انگیزی سے روکیں انہوں نے خوارج کے ہاں پہنچ کر ان سے کہا کہ اے لوگو تم گناہ عظیمہ کے مرتکب ہوئے ہو، ہمیں بلاوجہ کافر قرار دیتے ہو تم قتل ناحق سے باز آؤ اور ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے جہاد کرو۔ اس پر عبد اللہ ابن شجرہ سلمی نے کہا کہ اب ہماری آنکھوں سے پردہ اٹھ چکا ہے باطل کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں اور حق کے اُجالے ہر سمت پھیل چکے ہیں۔ اب ہم کسی حالت میں تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ قیس نے کہا کہ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں تم فتنوں میں نہ پڑو اور اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان نہ کرو۔ اس کے بعد ابو ایوب انصاری ان کے ہاں گئے،

اور انہیں افتراق انگیزی اور فتنہ پردازی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنائے مخاصمت کیا ہے اور تم کیوں جنگ و قتال پر اُتر آئے ہو۔ اگر لڑنے بھڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اٹھو اور ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرو۔ خوارج نے کہا کہ اگر ہم ساتھ دیں تو کل پھر ہم پر تحکیم مسلط کر دو گے۔ ابوایوب نے کہا کہ پہلے حال کی خبر لو پھر مستقبل کی بھی فکر کر لینا مگر خوارج ان سفارتوں اور پندو موعظت کی باتوں سے راہِ راست پر آنے والے نہ تھے۔ سمجھانے والے سمجھا کر ہار گئے اور جھنجھوڑنے والے جھنجھوڑ کر تھک گئے مگر انہوں نے کروٹ نہ بدلی۔ آخر خود امیرالمومنین اُن کے ہاں تشریف لے گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اے لوگو تم نافہمی و بداندیشی کی وجہ سے جماعت سے کٹ گئے ہو اور نفسانیت کی بناء پر حق سے بے راہ ہو گئے ہو میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں کہ تم اس وادی اور اس وادی کے موڑ میں قتل کئے جاؤ گے اُمت تم پر نفرین کرے گی اور ہر طرف سے تم پر پھٹکار پڑے گی اس لئے کہ تمہارا موقف سراسر غلط اور تمہارا اعتماد بلاوجہ ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تمہیں تحکیم کے ماننے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ مکرو فریب ہے۔ اس فریب میں نہ آؤ مگر تم نے میری بات تک نہ سنی اور جنگ سے ہاتھ اٹھا لئے میں نے تحکیم کو مانا تو تمہاری ضد سے مجبور ہو کہ پھر بھی آنکھ بند کر کے تحکیم کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حکمین سے یہ عہد لے لیا کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلہ کریں۔ مگر انہوں نے کتاب و سنت کے خلاف فیصلہ کیا لہٰذا ہم اُن کا فیصلہ ٹھکرا دینے میں حق بجانب ہیں۔ خوارج نے کہا کہ بیشک ہم نے تحکیم کو مانا جس کے نتیجہ میں ہم کافر ہو گئے مگر ہم نے توبہ کر لی ہے آپ بھی اپنے کفر کا اعتراف کر کے توبہ کریں پھر ہم آپ کی بیعت بھی کریں گے اور آپ کے ساتھ ہو کر دشمن سے جنگ بھی لڑیں گے۔ فرمایا کیا اللہ کے رسول پر ایمان لانے ان کے ساتھ ہجرت کرنے اور اسلامی غزوات میں شریک ہونے کے بعد میں اپنے بارے میں کفر کی شہادت دوں یہ کیونکر ممکن ہے۔ اس پر خوارج نے شور مچایا اور کہا کہ اگر آپ کفر کا اقرار نہیں کرتے تو ہم آپ سے کوئی بات چیت نہیں کریں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہلڑ ہنگامے میں نہ کوئی بات منوائی جا سکتی ہے اور نہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔ آؤ یوں فیصلہ کریں کہ تم اپنا ایک نمائندہ منتخب کرو جو مجھ سے گفتگو کرے اگر اس نے مجھے قائل کر دیا تو میں اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کر لوں گا اور اگر میں نے اسے مطمئن کر دیا تو پھر تمہیں اس معاندانہ رویہ کو ترک کرنا پڑے گا۔ خوارج نے پہلے تو اس میں پس و پیش کیا اور پھر تیار ہو گئے اور عبداللہ ابن کواء کو اپنا نمائندہ بنا کر پیش کیا۔ حضرت نے ابن کواء سے کہا کہ تم کس بات پر برہم و رنجیدہ ہو جب کہ تم میری امارت پر راضی اور میرے فرمانبردار تھے اور جنگ جمل میں میرے مخالفین سے لڑ بھی چکے ہو کہا کہ اس موقع پر تحکیم کی صورت پیدا نہ ہوئی تھی۔ فرمایا اے

ابن کوا! میرا فیصلہ زیادہ صحیح ہونا چاہیئے یا رسول اللہ کا؟ کہا رسول اللہ کا۔ فرمایا کہ تم نے اللہ کا یہ ارشاد تو سنا ہو گا:۔

فقل تعالوا ندع ابناء نا و ابناء کم ونساء نا ونساء کم و انفسنا وانفسکم ثم نبتہل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔	کہو آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو پھر گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔"

کیا اللہ نے اس لئے اپنے پیغمبر کو مباہلہ کا حکم دیا تھا کہ اسے پیغمبر کے سچا اور نصاریٰ کے جھوٹا ہونے میں شبہ تھا اور وہ اس مباہلہ کے ذریعہ اپنا شبہ برطرف کرنا چاہتا تھا؟ کہا کہ نہ اللہ کو شبہ تھا اور نہ اُس کے رسول کو یہ نصاریٰ کے مقابلہ میں ایک احتجاج تھا۔ فرمایا کہ پھر تحکیم بھی تو ایک طرح سے احتجاج تھی کہا کہ حَکَم مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس امر میں شک ہوا کہ آپ حق پر ہیں یا نہیں حالانکہ جنگ اس بنیاد پر لڑی جا رہی تھی کہ آپ حق پر ہیں اور اہل شام باطل پر۔ چنانچہ آپ نے معاویہ سے واضح الفاظ میں کہا کہ اگر کتاب خدا ہمارے حق میں فیصلہ کرے تو تم ہماری پیروی کرنا اور کتاب خدا تمہارے حق میں فیصلہ کرے تو ہم تمہارا اتباع کریں گے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ آپ کو خود اپنے حق بجانب ہونے میں شبہ ہوا اور جب آپ خود اپنے متعلق شک میں پڑ گئے تو ہمارے لئے زیادہ گنجائش ہے کہ ہم آپ کے حق بجانب ہونے میں شبہ کریں۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ اتباع مشروط تھا اور مشروط اتباع کے اقرار سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہمیں اپنے موقف کی صداقت میں شبہ تھا اور ایسے مشروط اتباع کی پیش کش رسول اللہ نے بھی کی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

قل فاتوا بکتاب من عند اللہ هو اهدی منهما اتبعه ان کنتم صادقین۔	کہو کہ اللہ کی طرف سے کوئی نوشتہ لاؤ جو (تورات و قرآن سے) زیادہ ہدایت انسانی کے لئے بہتر ہوتا کہ میں اس کی پیروی کروں اگر تم سچے ثابت ہوئے۔"

ابن کوا نے کہا کہ یہ بات درست ہے مگر آپ نے حکمین مقرر کر کے اللہ کا کام دوسروں کے سپرد کر دیا اور اس طرح کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے صرف ابو موسیٰ کو حکم مقرر کیا تھا۔ کہا کہ ابو موسیٰ کافر ہے۔ فرمایا کہ وہ کب سے کافر ہوا جب اسے تحکیم کے لئے منتخب کیا گیا یا جب اس نے فیصلہ صادر کیا؟ کہا کہ جس وقت اُس نے فیصلہ کیا۔ فرمایا تو پھر تم نے تسلیم کر لیا کہ جب اسے حکم مقرر کیا گیا تھا وہ مسلمان تھا اور تمہیں یہ اُمید تھی کہ وہ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کرے گا لہذا اسے حکم مقرر

کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ ابن کوا نے کہا کہ جب اس نے فیصلہ کیا اس وقت تو وہ کافر ہو گیا۔ فرمایا کہ اگر رسول اللہ کسی مسلمان کو کفار کی طرف بھیجیں کہ وُہ انہیں اسلام کی دعوت دے اور وہ اسلام کے بجائے ضلالت و گمراہی کی تعلیم دینے لگے تو کیا رسول اللہ پر اس کی ذمہ داری عائد ہو گی؟ ابن کوا نے کہا نہیں فرمایا کہ پھر ابوموسیٰ کافر ہو گیا تو اس کا الزام مجھ پر کیوں عائد کرتے ہو اور تمہارے لئے یہ جواز کیونکر پیدا ہو گیا کہ تم تلواریں کندھوں پر رکھے مسلمانوں کو قتل و غارت کرتے پھرو۔ رہا دوسرا حَکَم عمرو ابن عاص تو اسے نامزد کرنے والا معاویہ تھا میں اسے کیونکر حَکَم قرار دے سکتا تھا۔ جب کہ اس کا بس چلتا تو میرے قتل کا فیصلہ کرتا۔ کہا کہ پھر آپ ایک مسلمان اور ایک کافر کی تحکیم پر کیوں رضامند ہُوئے؟ فرمایا خداوند عالم نے زن و مرد کے اختلاف کی صورت میں حکم قرار دینے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا ہے:۔

وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ و حکما من اھلھا۔

اگر تمہیں میاں بی بی کے درمیان تفرقہ کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے کنبہ میں سے اور ایک ثالث عورت کے کنبہ میں سے مقرر کر دو۔"

اب اگر کوئی مسلمان کسی یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح کر لیتا ہے اور پھر دونوں میں مناقشہ رونما ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ مرد کے کنبہ کا ثالث مسلمان ہو گا اور عورت کے کنبہ کا ثالث یہودی ہو گا یا عیسائی۔ تو کیا ازروئے قرآن ایک مسلمان اور ایک کافر کے حکم قرار دیئے جانے کا جواز ثابت نہیں ہوتا؟

خوارج نے جب دیکھا کہ ابن کوا سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو اسے کہلوا بھیجا کہ گفتگو ختم کر کے واپس چلے آؤ۔ چنانچہ وہ بات چیت کو ادھورا چھوڑ کر واپس اپنی صفوں میں چلا گیا۔ امیرالمومنین نے باوجودیکہ ان پر حجت تمام کر دی مگر ان کی متمردانہ روش میں کوئی فرق نہ آیا۔ اب جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ حضرت نے لشکر کو صف بندی کا حکم دیا اور میمنہ و میسرہ ترتیب دیئے۔ میمنہ کی کمان حجر ابن عدی کے اور میسرہ کی کمان شبث ابن ربعی کے سپرد کی اور سواروں پر ابوایوب انصاری کو اور پیادوں پر ابوقتادہ انصاری کو افسر مقرر کیا اور اہل مدینہ کی قیادت جن کی تعداد سات سو یا آٹھ سو تھی۔ قیس ابن سعد انصاری سے متعلق کی اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہوئے۔ خوارج نے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا کہ میمنہ پر یزید ابن حصین کو اور میسرہ پر شریح ابن اوفی عبسی کو سالار مقرر کیا۔ سواروں پر حمزہ ابن سنان اسدی کو اور پیادوں پر حرقوص ابن زہیر کو امیر قرار دیا۔ جب صفوں کے مقابلہ میں صفیں جم گئیں تو حضرت نے ابوایوب انصاری کو ایک سفید پرچم

دے کر دو ہزار کی جمیعت کے ساتھ خوارج کی طرف بھیجا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ اے لوگو! امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ تم میں سے جو شخص اس علم کے نیچے چلا آئے یا کوفہ یا مدائن واپس چلا جائے یا اس جماعت کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائے اس کے لئے امان ہے۔ اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ فروہ ابن نوفل اشجعی نے جو رؤسائے خوارج میں سے تھا اپنے قبیلہ والوں سے کہنے لگا کہ خدا کی قسم ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس بناء پر علی کے مقابلہ میں صف آراء ہوئے ہیں۔ نہ ہمارے پاس اس محاربہ کے جواز کی کوئی دلیل ہے اور نہ اس خروج کی کوئی معقول وجہ۔ ہمیں ان لوگوں سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے بعد ہم سوچیں گے کہ ہمیں علی کی اطاعت کرنا چاہیئے یا ان سے جنگ کرنا چاہیئے۔ یہ کہہ کر وہ پانچ سو آدمیوں کے ساتھ خوارج سے الگ ہو کر بندنجین چلا گیا اور ایک گروہ کوفہ روانہ ہو گیا اور سو آدمی ابوایوب کے پرچم کے نیچے آ کر حضرت کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ یہ حضرت کے موقف کی صحت، استدلال کی قوت اور مصالحانہ روش کا نتیجہ تھا۔

امیرالمومنین نے بقیہ خوارج کو جنگ کے ہولناک نتائج سے متنبہ کیا مگر وہ جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب جنگ کے شروع ہونے میں خوارج کے حملہ کا انتظار تھا کیونکہ حضرت نے اپنی فوج کو پابند کر دیا تھا کہ جب تک ادھر سے حملہ نہ ہو وہ حملہ نہ کرے آخر ایک خارجی اپنی صفوں سے نکلا اور حملہ کر کے حضرت کی سپاہ میں سے تین آدمیوں کو شہید کر دیا۔ حضرت طیش میں آگے بڑھے اور تلوار سے اس پر حملہ کیا۔ جب تلوار اس پر پڑی تو کہنے لگا کہ جنت میں جانا کتنا گوارا اور شیریں ہے۔ عبداللہ ابن وہب نے یہ الفاظ سُنے تو کہا کہ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تو جنت کی طرف جا رہا ہے یا دوزخ کی طرف۔ بنی سعد کے ایک خارجی نے یہ سنا تو کہا کہ میں عبداللہ ابن وہب کے ورغلانے سے یہاں چلا آیا اور اسے ابھی تک یہ علم نہیں کہ اس کا موقف صحیح ہے یا غلط اور اس کی جماعت کو جنت میں جانا ہے یا دوزخ میں اور یہ کہہ کر اپنی جماعت سمیت خوارج کی صفوں سے علیحدہ ہو گیا۔ خوارج ایک ایک کر کے لڑنے کے بجائے جلد ہی مجموعی حملہ پر اُتر آئے۔ چنانچہ انہوں نے تلواروں کی نیامیں توڑ ڈالیں۔ کمانوں میں تیر جوڑ لئے نیزے تانے اور "لا حکم الا اللہ" کا نعرہ لگا کر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ سواروں کے قدم اکھڑ گئے۔ مگر پیچھے ہٹ کر سنبھلے اور نیزوں اور تلواروں کے آگے سینے تان کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے پکار کر کہا ہاں اے جوانمردو! آگے بڑھ کر شیرانہ حملہ کرو۔ یہ کہہ کر حضرت بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب جو فوج نے آپ کی کمان میں ایک ساتھ حملہ کیا تو ہر طرف خون برسنے لگا اور لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں۔ اس پُرزور حملہ سے دشمن کے پرے ٹوٹ گئے اور صفیں درہم و برہم ہو گئیں۔ حضرت کی تلوار

میں لڑتے لڑتے خم آگیا آپ نے اسے زانو پر رکھ کر سیدھا کیا اور پھر پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہوئے ادھر لشکر والے خوارج کے سروں پر تلواریں چلاتے اور پیچھے ہٹنے والوں پر تیر برساتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ انہیں چاروں طرف سے نرغہ میں لے لیا اور راہِ فرار اُن پر بند کر دی اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ تلواریں شعلے برسانے لگیں اور زندگی کی لو دم توڑتی نظر آنے لگی اور بقول شخصے اس طرح وہ گر گر کر مرنے لگے گویا کسی نے ان سے کہہ دیا ہو کہ "مر جاؤ" اور وہ مر گئے۔ چار سو خوارج زخمی ہو کر جنگ کے قابل نہ رہے اور نو آدمیوں نے بھاگ کر جان بچائی جن میں سے دو عمان کی طرف دو سجستان کی طرف دو کرمان کی طرف، اور دو جزیرہ کی طرف بھاگ گئے اور ایک یمن میں تل موزن میں پہنچ گیا اور باقی سب کے سب قتل ہو گئے۔ سردارانِ خوارج میں سے عبداللہ ابن وہب کو زیاد ابن خصفہ نے یزید ابن حصین طائی کو ابو ایوب انصاری نے حرقوص ابن زہیر کو جیش ابن ربیعہ کنانی نے عبداللہ ابن شجرہ سلمی کو عبداللہ ابن زحر خولانی نے اور شریح ابن اوفی کو قیس ابن معاویہ نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور امیرالمومنین کے لشکر میں سے صرف آٹھ آدمی شہید ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ رویہ ابن وبر بجلی، سعید ابن خالد سبیعی، عبداللہ ابن حماد احبنی، فیاض ابن خلیل ازدی، کیسوم ابن سلمہ جہنی، عبید ابن عبید خولانی، جمیع ابن جشم کندی، حبیب ابن عاصم اسدی۔

امیرالمومنین کے ہمراہیوں نے جب دیکھا کہ خوارج سب کے سب قتل ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اب صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا:۔

کلا واللہ انهم نطف فی اصلاب الرجال و قرارات النساء کلما نجم منهم قرن قطع حتی یکون اخرهم لصوصا سلابین۔ (نہج البلاغہ)	ہرگز نہیں۔ ابھی تو وہ مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے شکموں میں موجود ہیں۔ جب بھی ان میں کا کوئی گروہ اُبھرے گا تو اسے کاٹ کر رکھ دیا جائے گا، یہاں تک کہ ان کی آخری فردیں چور اور ڈاکو ہو کر رہ جائیں گی۔"

جب جنگ ختم ہو گئی تو خوارج کی ایک فرد ذوالثدیہ کے لاشہ کی تلاش شروع ہوئی کیونکہ امیرالمومنین ان کے خروج سے پہلے فرمایا کرتے تھے:۔

ان قوما یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة علامتهم رجل مخدج الید۔	ایک قوم دین سے اس طرح نکل جائے گی جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے۔ ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک شخص ناقص

ہاتھ والا ہوگا۔" (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۷۵)

کچھ لوگوں نے اسے ادھر ادھر لاشوں میں تلاش کیا مگر اس کی لاش نہ مل سکی۔ انہوں نے پلٹ کر حضرت سے کہا کہ ہم نے تمام لاشیں دیکھ ڈالی ہیں مگر اس کی لاش کہیں نظر نہیں آئی۔ فرمایا خدا کی قسم اس کی لاش انہی لاشوں میں موجود ہے۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان ابن ثمامہ حنفی اور ریان ابن صبرہ کو ساتھ لے کر تلاش کے لئے کھڑے ہوئے۔ جب لاشوں کو دیکھتے بھالتے ہوئے نہر کے کنارے پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک گڑھے میں چالیس پچاس لاشیں پڑی ہیں۔ جب ان لاشوں کو ہٹا کر دیکھا گیا تو ان کے نیچے ذوالثدیہ کی لاش بھی پڑی تھی۔ حضرت نے اپنے ہمراہیوں سے فرمایا:۔

الله اکبر! واللّٰہ ما کذبت و لا کذبت اما واللّٰہ لولا ان تنکلوا عن العمل لاخبرتکم بما قضی اللّٰہ علی لسان نبیہ لمن قاتلھم مستبصرا فی قتالھم عارفا للحق الذی نحن علیہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۶۶)

"اللہ اکبر! نہ میں نے جھوٹ کہا اور نہ مجھے جھوٹی خبر دی گئی۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم عمل سے روگرداں ہو جاؤ گے تو میں ان خوارج سے بصیرت کے ساتھ جنگ کرنے والوں اور جس حق پر ہم ہیں اس حق کے پہچاننے والوں کے لئے اللہ نے اپنے پیغمبر کی زبان سے جس اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اس سے تمہیں آگاہ کرتا۔"

جب پلٹ کر خوارج کی لاشوں کی طرف سے ہو کر گزرے تو فرمایا تم پر افسوس ہے جس نے تمہیں فریب دیا اس نے تمہیں نقصان پہنچایا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یا امیر المومنین انہیں کس نے فریب دیا فرمایا کہ شیطان اور نفس امارہ نے ان دونوں نے فریب کا جال بچھایا امیدوں کے ذریعہ انہیں ورغلایا گناہوں کو سج کر ان کے سامنے پیش کیا اور یہ چیز ان کے ذہنوں میں بٹھا دی کہ وہ غالب و کامران رہیں گے۔

اس جنگ میں کامیابی کے بعد امیر المومنین نے اپنے ہمراہیوں کو منجم کی وہ بات یاد دلاتے ہوئے جو اس نے ساعت کے بد ہونے کے متعلق کہی تھی، فرمایا:۔

لو سرنا فی الساعۃ التی امر بھا المنجم لقال الجھال الذین لا یعلمون شیئا سار فی الساعۃ التی امر بھا المنجم فظفر۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۷۳)

"اگر ہم اس گھڑی میں نکلتے جس میں نکلنے کا مشورہ نجومی نے دیا تھا تو جاہل و بے خبر لوگ یہ کہتے کہ یہ فتح اس گھڑی میں نکلنے کا نتیجہ ہے جس کی ہدایت اس نجومی نے کی تھی۔"

خوارج کا طرزِ عمل انتہائی تعجب انگیز ہے۔ انہوں نے صفین میں عین فتح کے موقع پر تلواریں روک کر اپنے سروں پر تلواروں کے چلنے کا سامان کیا۔ خود ہی تحکیم پر زور دیا اور خود ہی اس کے مخالف ہو گئے۔ اتفاق و اتحاد کو پارہ پارہ کیا اور نت نئے فتنے اٹھائے۔ امیرالمومنین جن کا ہر قول و عمل سراپا ایمان تھا ان سے برائت کا نام ایمان رکھا اور ان سے وابستگی کو کفر سے تعبیر کیا اور برابر اس پر اصرار کرتے رہے کہ آپ کفر کا اقرار کر کے توبہ کریں اور تحکیم کا معاہدہ توڑ کر جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر یہ لوگ واقعاً تحکیم کے مخالف اور معاویہ سے جنگ کرنا چاہتے تھے تو تحکیم کے فیصلہ کے بعد اس کا موقع تھا کہ وہ معاویہ سے جنگ کرنے مگر معاویہ سے لڑنے کے بجائے وہ حضرت کے مقابلہ میں صف آراء ہو گئے اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ سے جنگ و قتال اُن کے نزدیک اتنا ضروری نہ تھا جتنا حضرت کی زبان سے کفر کا اعتراف اہم تھا ورنہ معاویہ بھی تو ان کے نزدیک کافر تھا پہلے اس سے نمٹ لیتے جب کہ اس سے نمٹنے کا موقع فراہم ہو گیا تھا اور پھر حضرت علی سے جنہیں بزعم خود کافر سمجھتے تھے نمٹتے۔ بلکہ وہ اپنے نعرہ لاحکم الا اللہ۔ میں مخلص ہوتے تو انہیں پہلے معاویہ ہی کے مقابلہ میں اترنا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ وجہ کفر تو تحکیم تھی اور معاویہ اس تحکیم کا بانی و تجویز کنندہ تھا اور حضرت علی نے اسے مانا تھا تو مجبوری کی صورت میں، پھر معاویہ کو نظرانداز کر کے حضرت سے اقرار کفر کے مطالبہ کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ حضرت کو کفر و عہد شکنی کا مرتکب قرار دے کر دوسروں کی نظروں سے گرائیں اور معاویہ سے لڑنے کا ولولہ ان کے دلوں میں ہوتا تو فتح سے دستبردار ہو کر جنگ بندی پر اصرار ہی کیوں کرتے۔

خوارج کی غرض صرف امیرالمومنین کی مخالفت تھی۔ انہوں نے آپ کے خلاف فتنہ و بغاوت کو ہوا دی طرح طرح کے الزام تراشے اور حق و صداقت کے مقابلہ میں ضلالت و گمراہی پر جمے رہے۔ حضرت نے انہیں سمجھانے بجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ نہ ان پر سختی روا رکھی اور نہ اُن کے معاشی وظائف میں کمی کی۔ اور جب ان کی طغیانی و سرکشی اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے بے دریغ مسلمانوں کو حق گوئی کے جرم میں قتل کرنا شروع کر دیا اور عورتوں تک کو ذبح کر ڈالا تو بحالت مجبوری ان کی طرف قدم اٹھایا اور میدانِ جنگ میں بھی انہیں دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور جب دلائل کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو عمومی امان کا اعلان اور جنہوں نے اس امان سے فائدہ اٹھایا انہیں کسی بازپرس کے بغیر جدھر وہ جانا چاہتے تھے جانے دیا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود جب وہ جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر اس کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا کہ انہیں قرار واقعی سزا دی جائے اور جنگ لڑ کر ان کے کس بل نکال دیئے جائیں۔

اس جنگ سے قبل اور اس کے دوران امیرالمومنین نے متعدد پیشینگوئیاں فرمائیں اور ہر پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ یہ پیشینگوئیاں کہانت وستارہ شناسی پر مبنی نہ تھیں ورنہ ایک ماہر منجم کی پیشینگوئی کو ٹھکرانے کے بجائے اس کی صحت وسقم پر غور کرتے اور اپنے مقررہ قواعد پر جانچتے پرکھتے مگر آپ نے اسے تکذیب قرآن کے مترادف سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا بلکہ یہ تمام اُمور وُہ تھے جن کا علم پیغمبر اکرم کے ذریعہ اُن کے سینہ میں ودیعت تھا جس کے بعد نہ ان کی صحت میں کوئی شک وشبہ ہو سکتا تھا اور نہ خلاف واقع ہونے کا وہم وگمان اس لئے کہ ہر مورد پر آپ نے جو خبر دی یقین و وثوق کے ساتھ۔ گویا آپ کی آنکھیں غیب کے پردوں کو چاک کر کے مستقبل کے صفحہ پر ابھرنے والے نقوش کو دیکھ رہی ہیں۔ ذیل میں چند پیشینگوئیاں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) آپ نے زرعہ ابن برج طائی سے کہا تھا کہ تم قتل کئے جاؤ گے اور ربیعہ ابن شداد خثعمی سے کہا تھا کہ تمہاری نعش گھوڑوں کے سموں میں پامال ہوگی۔ چنانچہ یہ دونوں اس جنگ میں قتل کئے گئے اور ربیعہ کی لاش گھوڑوں کے سموں میں پامال ہو گئی۔ قبیصہ کہتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ گھوڑوں کے سموں سے ربیعہ کا چہرہ اور سر کچلا گیا ہے اور جسم کے ٹکڑے ہو گئے ہیں تو

فذکرت قول علی و قلت للہ	مجھے حضرت علی کی بات یاد آئی اور میں نے کہا کہ
در ابی الحسن ما حرک شفتیہ	ابوالحسن کی خوبیوں کا کیا کہنا انہوں نے جب بھی
قط بشیئ الا کان کذلک۔	کوئی بات کہی وہ اسی طرح ہو کر رہی۔"

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ۔ جلد ۱ ص ۱۵۱)

(۲) خوارج کے بارے میں فرمایا کہ وُہ پل کے ادھر قتل ہوں گے اور نہر عبور کر کے پار نہیں اتریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وُہ نہر کے ادھر اس قطعہ زمین پر مارے گئے جسے رمیلہ کہا جاتا تھا۔

(۳) آپ نے خبر دی کہ آپ کے لشکر میں سے دس آدمی بھی مارے نہیں جائیں گے اور خوارج میں سے دس بھی نہیں بچیں گے۔ چنانچہ آپ کے لشکر میں سے آٹھ آدمی شہید ہوئے اور خوارج میں سے نو آدمیوں نے بھاگ کر جان بچائی۔

(۴) ذوالثدیہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ یقیناً مارا گیا ہے اور اس کی نعش مقتولین میں موجود ہے چنانچہ اس کی نعش لاشوں کے ڈھیر میں سے برآمد ہوئی۔

(۵) آپ نے خوارج کے مارے جانے کے بعد فرمایا کہ وہ ختم نہیں ہوئے ابھی صلبوں اور شکموں میں موجود ہیں اور جب بھی سر اٹھائیں گے کچل دیئے جائیں گے۔ چنانچہ جنگ نہروان کے بعد وہ چھوٹے بڑے

جنھوں کی صورت میں علم و بغاوت بلند کرتے رہے اور حضرت کی فوج کے ہاتھوں مارے جاتے رہے اور پھر اموی و عباسی دور میں ہر حکومت سے ٹکرانے کے لئے اُٹھے اور مہلب ابن ابی صفرہ بارہ[۱۲] برس تک ان سے نبرد آزما رہا اور آخر ان میں پھوٹ ڈلوا کر اور انہیں آپس میں لڑوا کر انتہائی کمزور کر دیا اور عباسیوں نے انہیں اس طرح کچلا کہ ان اطراف میں ان کے لئے جینا مشکل ہو گیا اور تتر بتر ہو کر عمان و افریقہ کی طرف نکل گئے اور اب بھی مسقط و زنجبار میں جماعتی صورت میں موجود ہیں۔

(۶) آپ نے فرمایا کہ ان کی آخری فردیں رہزنوں اور قزاقوں کی صورت میں ابھرتی رہیں گی۔ چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ انہوں نے اپنا شیوہ بنا لیا۔ جہاں موقع ملتا دھاوا بولتے اور جو ہاتھ لگتا لوٹ لے جاتے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

وصح اخباره ایضًا انه سیکون اٰخرهم لصوصا سلابین فان دعوة الخوارج اضمحلت و رجالها فنیت حتی افضی الامر الی ان صار خلفهم قطاع طریق متظاهرین بالفسوق والفساد فی الارض (شرح ابن ابی الحدید ج صـ۲۴۸)

"امیرالمومنین کی یہ پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی کہ خوارج رہزن و قزاق ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ خارجیوں کی دعوت کمزور پڑ گئی اور اُن کے جوانمرد فنا ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کے بعد آنے والے رہزن ہو گئے جو علانیہ فسق و فجور کے مرتکب ہوتے اور زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے۔"

محارباتِ خوارج

جنگِ نہروان سے فارغ ہو کر امیرالمومنین شام جانے کا ارادہ تو رکھتے ہی تھے آپ نے اپنے لشکر سے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں خوارج کے مقابلہ میں فتح و کامرانی دی ہے اب شام جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہو اور دشمن سے لڑ کر سرخروئی حاصل کرو۔ اشعث ابن قیس اور دوسرے چند آدمیوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہمارے لئے تیر ختم ہو چکے ہیں تلواریں کند ہو گئی ہیں اور نیزوں کی انیاں ناکارہ ہو چکی ہیں کچھ دنوں کے لئے کوفہ تشریف لے چلئے تاکہ ہم سستا بھی لیں اور تلواروں پر صیقل اور ہتھیاروں کی اصلاح و درستی بھی کر لیں۔ پھر تازہ دم ہو کر دشمن سے لڑیں گے۔ حضرت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہماری اصل منزل شام ہے اب اس میں مزید تاخیر کرنا خلافِ مصلحت ہے۔ حضرت نے بہت کچھ کہا سنا مگر وہ لوگ نہ مانتے اور

آپ کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ امیرالمومنین کوفہ کی جانب واپس تو ہوئے مگر شہر میں داخل ہونے کے بجائے نخیلہ میں قیام فرما ہوئے اور لشکر والوں کو بھی وہیں پر ٹھہرنے کا حکم دیا تاکہ وہ گھروں میں پہنچ کر دوسرے بھمیلوں میں نہ پڑ جائیں۔ یہ لوگ کچھ دن تو ٹھہرے رہے پھر کچھ حیلے بہانے کر کے اور کچھ چپکے چپکے کھسکنے لگے یہاں تک کہ چند گنے چنے آدمیوں کے علاوہ سب ہی چلے گئے۔ اب نخیلہ میں ٹھہرنا بیکار تھا حضرت بھی وہاں سے اٹھ کر کوفہ میں چلے آئے۔

جب کوفہ میں تشریف فرما ہوئے تو اور فتنے اُٹھ کھڑے ان میں ایک فتنہ خوارج بھی تھا۔ اگرچہ جنگ نہروان میں ان کی ایک بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا مگر پوری طرح ان کا قلع و قمع نہ ہوا تھا۔ بہت سے ان کے ہم مسلک و ہم عقیدہ کوفہ میں موجود تھے جو کسی مصلحت کی بناء پر جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ اب انہوں نے پر پرزے نکالے اور جتھا بندی کر کے مملکت کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امیرالمومنین اس فتنۂ خوارج اور دوسری شورشوں کے دبانے میں مصروف ہو گئے اور شام پر لشکر کشی میں التواء ناگزیر ہو گیا۔

ان باغی گروہوں میں سے ایک گروہ خریت ابن ارشد کا تھا جو بنی ناجیہ کے خوارج کا سرغنہ اور کوفہ ہی میں مقیم تھا۔ یہ ایک دن تیس آدمیوں کے ہمراہ امیرالمومنین کے پاس آیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں نہ آپ کا کوئی حکم مانوں گا نہ آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور کل سے آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم کس بات پر اتنے برہم ہو کہا کہ آپ نے تحکیم کو مان کر اسلام کے حکم سے کھلّم کھلّا انحراف کیا ہے فرمایا کہ تم نے یہ بات بے سوچے سمجھے کہی ہے اگر تم سمجھنا چاہو تو تمہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہا کہ آج تو میں جاتا ہوں کل کسی وقت آؤں گا اور اس سلسلہ میں بات چیت کروں گا۔ فرمایا کہ شیطان کے بہکانے میں نہ آنا اور غلط قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اگر میری باتوں سے تمہاری تسلی نہ ہوئی تو پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرنا۔ جب وہ پلٹ کر اپنی منزل پر آیا تو قبیلۂ ناجیہ سے کہا کہ میں نے علی سے کل ملنے کا وعدہ کیا ہے مگر مجھے ان کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں جو قدم اٹھانا ہے اٹھا لینا چاہیئے اور یہاں سے چل دینا چاہیئے۔ حضرت نے دوسرے دن اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو عبداللہ ابن قعین ازدی کو اس کے پاس بھیجا۔ عبداللہ نے پلٹ کر بتایا کہ وہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ کوفہ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ حضرت نے یہ سُنا تو فرمایا "انہیں قوم ثمود کی طرح خدا کی رحمت سے دوری ہو دیکھنا جب نیزوں کے رُخ ان کی طرف سیدھے ہوں گے اور تلواروں کے وار اُن کی کھوپڑیوں پر پڑیں گے تو اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔" زیاد ابن خصفہ نے کہا کہ ہمیں اُن کے چلے جانے پر رنج و افسوس

نہ ہونا چاہیئے۔ نہ ان کے رہنے سے ہمیں کوئی فائدہ تھا اور نہ ان کے چلے جانے سے کمی کا احساس ہو گا۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو آپ کی اطاعت میں ہیں بہکائیں گے اور امن عامہ میں خلل انداز ہوں گے اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں واپس لانے کی کوشش کروں۔ فرمایا تمہیں کیا معلوم کہ وہ کس طرف گئے ہیں کہا کہ دریافت کرنے پر معلوم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ میرے عمال ان کی نقل وحرکت کے بارے میں مجھے ضرور تحریر کریں گے تم جاؤ اور دیر ابی موسیٰ میں پہنچ کر میرے حکم کا انتظار کرو زیاد اپنی منزل پر آئے اور اپنے قبیلہ بکر ابن وائل کو جمع کیا اور تمام واقعہ ان سے بیان کر کے کہا کہ تم امیرالمومنین کے انصار و اعوان ہو اس مہم میں میرا ساتھ دو تاکہ دشمن کو آگے بڑھنے سے روک سکیں اور انہیں واپس لائیں۔ اس آواز پر ایک سو تیس آدمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ زیاد نے کہا کہ دشمن پر قابو پانے کے لئے اتنے آدمی بہت ہیں اور انہیں لے کر دیر ابی موسیٰ میں پہنچے اور امیرالمومنین کے حکم کے انتظار میں ٹھہر گئے۔

اس اثنا میں حضرت کے ایک عامل قرظہ ابن کعب انصاری نے حضرت کو اطلاع دی کہ بنی ناجیہ کا لشکر مقام نفر کی طرف نکل گیا ہے اور اُس نے راستے میں ایک مسلمان زاذان فروخ کو اس جرم میں قتل کر دیا ہے۔ کہ اس نے آپ کے بارے میں عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کیا اور ایک ذمی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ اس کے قتل کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب حضرت کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے ایک نوجوان عبداللہ ابن وال کے ذریعہ زیاد ابن خصفہ کو تحریراً اطلاع دی کہ خریت اور اس کے ہمراہی نفر کی طرف جا چکے ہیں انہوں نے ایک مرد مسلمان کو قتل کر ڈالا ہے۔ تم ان کا پیچھا کرو اور انہیں واپس لانے کی کوشش کرو اگر وہ واپس آنے پر تیار نہ ہوں تو اُن سے جنگ کرو کیونکہ اُن کی امن سوز حرکات نے جنگ کا جواز پیدا کر دیا ہے۔ عبداللہ ابن وال خط لے کر چند قدم چلے ہوں گے کہ پلٹ کر حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین کیا میں بھی زیاد ابن خصفہ کے لشکر میں شامل ہو سکتا ہوں؟ حضرت نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا اور فرمایا کہ ہاں تم بھی شریکِ لشکر ہو جانا مجھے اُمید ہے کہ تم حق کے معاون اور ظالموں کے مقابلہ میں میرے ناصر و مددگار ثابت ہوگے۔ عبداللہ ابن وال کہتے ہیں کہ:۔

فواللہ ما احب ان لی بمقالۃ علی تلک حمر النعم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴ صفحہ ۹۰)	"خدا کی قسم حضرت نے جن الفاظ سے مجھ یاد کیا ہے میں ان لفظوں کے بدلے میں سُرخ بالوں والے اونٹوں کا لینا بھی گوارا نہ کروں گا۔"

جب عبداللہ نے دیر ابی موسیٰ میں پہنچ کر زیاد ابن خصفہ کو حضرت کا پیغام دیا تو زیاد نے عبداللہ

ابن وال کی سواری، ہتھیار اور شجاعانہ تیور دیکھ کر کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ تم میرے ساتھ رہو۔ عبداللہ نے کہا کہ میری بھی دلی خواہش یہی ہے اور میں امیرالمومنین سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ چنانچہ وہ زیاد کے دستہ میں شامل ہو گئے اور بنی ناجیہ کے تعاقب میں نفر کی طرف چل دیئے۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ جرجرایا کی طرف چلے گئے ہیں۔ زیاد نے ان کا تعاقب کیا اور بصرہ و واسط کے درمیان مقام مذار میں انہیں جا لیا اور ان کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ خریت ان کے پڑاؤ کے پاس آیا اور پوچھا کہ تم کس مقصد سے آئے ہو کہا کہ ابھی ہمیں دم لینے دو کچھ دیر ستا لیں تو پھر تمہیں مقصد بھی بتا دیں گے۔ زیاد کچھ دیر ستانے اور گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد خریت کے پاس گئے اور کہا کہ تم کوفہ چھوڑ کر کیوں نکل کھڑے ہوئے ہو؟ کہا کہ مجھے علی کے طور طریقے ناپسند ہیں اور ان کی امارت کھٹکتی ہے۔ اب میں ان لوگوں کا ساتھ دوں گا۔ جو شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کریں۔ کہا کیا انتخاب کے ذریعہ ایسا شخص مل سکتا ہے جو اسلام میں سابق کتاب و سنت کا سب سے بڑھ کر عالم اور رسول کا قرابت دار ہو کہا کہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہا کہ تم نے ایک مرد مسلمان کو قتل کر دیا ہے تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے۔ کہا کہ میں نے قتل نہیں کیا میرے ہمراہیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہو گا۔ کہا کہ ان قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو تا کہ ہم اُن سے قصاص لیں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہا کہ پھر تم بھی شریک جرم ہو۔ اب دونوں نے اپنے اپنے دستوں کی صف بندی کی اور نیزے تان کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ظہر کے وقت ہتھیار حرکت میں آئے اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ نیزے سینوں میں گڑنے لگے اور تلواریں سینوں پر چلنے لگیں۔ جب رات کا اندھیرا پھیلا تو خوارج اپنے پانچ لاشے میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ زیاد کے دستہ میں سے دو آدمی سوید اور واقد ابن بکر شہید ہو گئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ زیاد جو خود بھی زخمی ہو چکے تھے بصرہ میں چلے آئے اور امیرالمومنین کو تحریر کیا کہ مقام مذار میں خریت سے مقابلہ ہوا ہے اس کے پانچ آدمی مارے گئے ہیں اور وہ اپنے کشتوں کو چھوڑ کر اہواز کی جانب چلا گیا ہے اور اس کی جمعیت دو سو تک پہنچ گئی ہے۔ ہمارے کچھ آدمی زخمی ہو گئے ہیں میں ان کے علاج معالجہ کے لئے بصرہ میں ٹھہر گیا ہوں اور آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔

امیرالمومنین نے زیاد کو واپس بلوا لیا اور معقل ابن قیس ریاحی کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ اہواز کی جانب روانہ کیا اور ابن عباس عامل بصرہ کو تحریر فرمایا کہ معقل کی کمک کے لئے دو ہزار جوانمرد اہواز کی جانب روانہ کر دو۔ جب معقل لشکر کی کمان کرتے ہوئے اہواز میں وارد ہوئے تو بصرہ کی سپاہ کے انتظار میں ٹھہر گئے۔ ادھر خریت نے اہواز کے کافروں قزاقوں اور اپنے ہم مسلک عربوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک

کثیر جمعیت بہم پہنچالی اور انہیں ساتھ لیکر رامہرمز کی پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ معقل نے مزید انتظار غیر ضروری سمجھا اور خریت کے تعاقب میں چل دیئے۔ ابھی ایک دن کی مسافت طے کی ہوگی ۔ کہ بصرہ کا لشکر خالد ابن معدان طائی کی زیر قیادت پہنچ گیا اور دونوں لشکر ایک ہو کر آگے چل دیئے۔ جب رامہرمز کی پہاڑیوں کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ خریت اپنے لشکر سمیت پڑاؤ ڈالے پڑا ہے۔ معقل نے اپنے لشکر کی صف بندی کی میمنہ پر یزید ابن معقل کو اور میسرہ پر منجاب ابن راشد ضبی کو افسر بنایا۔ خریت کا میمنہ عربوں پر اور میسرہ کافروں اور کردوں پر مشتمل تھا۔ جب صفیں آراستہ ہو گئیں تو دونوں نے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔ اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ معقل کے لشکر نے خوارج کو تلواروں کی باڑ پر رکھ لیا اور جب خریت کی فوج کے تین سو ستر آدمی مارے گئے تو اس کے قدم اکھڑ گئے اور ساحل بحر کی طرف جہاں اس کے قوم و قبیلہ کے کچھ لوگ آباد تھے چلا گیا۔ یہاں بھی لوگوں کو حضرت کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور بہلا پھسلا کر ایک کثیر جماعت کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔

خریت کے پسپا ہونے کے بعد معقل نے امیرالمومنین کو تحریر کیا کہ خریت کے ہمراہیوں کی ایک کثیر تعداد قتل ہو چکی ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے ۔ امیرالمومنین نے چند سر برآوردہ لوگوں کو جمع کر کے واقعہ بیان کیا۔ سب نے رائے دی کہ آپ معقل کو تحریر فرمائیں کہ وہ خریت کا تعاقب کر کے اسے قتل کریں یا حدودِ مملکت سے باہر نکال دیں ورنہ وہ فتنہ انگیزی سے باز نہیں آئے گا۔ چنانچہ امیرالمومنین نے انہیں تحریر کیا کہ وہ اس وقت تک اس کا پیچھا کریں جب تک اس کی جماعت کا قلع و قمع نہیں ہو جاتا۔ معقل کو جب یہ حکم پہنچا تو وہ لشکر کو لے کر ساحل بحر کی طرف چل دیئے۔ خریت کو اس تعاقب کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنی جمعیت بڑھانے کے لئے خوارج کے گروہ سے کہا کہ میں تمہارا ہم عقیدہ ہوں علی حَکم قرار دینے کے مجاز نہ تھے، اور کوفہ والوں سے کہا کہ علی کو انہی کے نمائندہ (ابو موسیٰ) نے معزول کر دیا تو انہیں حق امارت کہاں رہا۔ اور عثمانیوں سے کہا کہ میں تمہارا ہم خیال ہوں عثمان قطعاً مظلوم مارے گئے تھے اور خراج و صدقات روک لینے والوں سے کہا کہ تم یہ صدقات حکومت کے کارندوں کو دینے کے بجائے اپنے عزیز و اقارب پر صرف کرو اور اس طرح مختلف الخیال لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے گرد جمع کئے رہا۔ اس گروہ میں نومسلموں کی بھی ایک جماعت شامل تھی جو عیسائیوں سے مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے جب خریت کے گروہ میں مختلف خیالات و نظریات کے لوگ دیکھے تو کہنے لگے کہ ان لوگوں کے دین سے تو ہمارا پہلا دین ہی اچھا تھا۔ یہ لوگ ایک امت اور ایک مذہب و مسلک پر ہوتے ہوئے ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ خریت نے سنا تو کہا کہ تم لوگ دوبارہ عیسائی ہو کر اپنی جانیں نہیں بچا سکتے اس لئے کہ

اسلام لانے کے بعد جو شخص اسلام سے منحرف ہو جاتا ہے اسے قتل کر دیا جاتا ہے اب تلواروں سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ تم ڈٹ کر مقابلہ کرو اور چلتی ہوئی تلواروں کو تلواروں سے روکو ورنہ یہ لوگ تمہارے بال بچوں کو قتل کر دیں گے۔ اور تمہاری عورتوں کو کنیزیں بنا ئیں گے۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ ساری مصیبت تمہاری لائی ہوئی ہے ہم آگے بڑھتے ہیں جب موت ہے اور پیچھے ہٹتے ہیں جب موت ہے۔

معقل نے ان لوگوں کے پڑاؤ کے قریب جھنڈا گاڑ دیا اور اعلان کیا کہ جو لوگ اس جماعت میں تازہ شامل ہوئے ہیں وہ الگ ہو جائیں اُن سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ بنی ناجیہ کے علاوہ دوسرے لوگ چھٹ گئے بنی ناجیہ میں ایک گروہ عیسائیوں کا تھا اور ایک گروہ وُہ تھا، جو بعض مصالح کی بناء پر مسلمان ہو گیا تھا اور ایک گروہ وُہ تھا جو خراج دینا نہ چاہتا تھا۔ خریت نے ان مختلف عناصر کو منظم کر کے صف بندی کی اور مقابلہ پر اُتر آیا۔ معقل نے بھی اپنی صفیں ترتیب دیں اور ایک مختصر تقریر سے لشکر کا جوش بڑھایا اور پھر ایک دم حملہ کر دیا نعمان ابن صہبان راسبی نے خریت پر نیزے کا وار کیا۔ خریت گھوڑے سے زمین پر گرا اور پھر سنبھل کر تلوار سے حملہ آور ہوا۔ نعمان نے اس کا وار خالی دے کر جو حملہ کیا تو اُسے مار گرایا۔ خریت کے گرتے ہی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اس کی فوج کے ایک سو ستر آدمی مارے جا چکے تھے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔

معقل نے ان کے مردوں بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے جو مسلمان تھے ان سے بیعت لے کر انہیں رہا کر دیا اور جو مرتد ہو گئے تھے انہیں دوبارہ اسلام کی دعوت دی۔ ایک بوڑھے رماحس ابن منصور نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اتنی بڑی غلطی کبھی نہیں کی جتنی ایک اچھے دین کو چھوڑ کر بُرے دین کو اختیار کرنے میں کی ہے۔ میں اب اپنے سابقہ مذہب عیسائیت ہی پر باقی رہوں گا۔ چنانچہ اس بوڑھے کے علاوہ دوسرے لوگوں نے اسلام قبول کر کے اپنی جانوں کا تحفظ کر لیا اور اس بوڑھے عیسائی کو ارتداد کے جرم میں قتل کر دیا گیا باقی جن عیسائیوں نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا انہیں اور اُن کی عورتوں کو اسیر کر لیا گیا ان اسیروں کی تعداد پانچ سو تھی۔ جب معقل ان اسیروں کو لے کر اردشیر خرہ پہنچے تو ان قیدیوں نے وہاں کے حاکم مصقلہ ابن ہبیرہ شیبانی کے سامنے چیخنا چلانا شروع کیا اور کہا کہ ہم پر احسان کیجئے اور ہمیں خرید کر آزاد کر دیجئے۔ مصقلہ نے ذہل ابن حارث کے ذریعہ معقل کو پیغام بھجوایا کہ ان اسیروں کو میرے ہاتھ بیچ ڈالئے۔ معقل نے پانچ لاکھ درہم میں وُہ قیدی مصقلہ کے ہاتھ بیچ ڈالے اور کہا کہ یہ رقم فوراً امیرالمومنین کو بھیج دی جائے۔ مصقلہ نے کہا کہ میں کچھ رقم ابھی بھیج دیتا ہوں اور بقیہ رقم بالاقساط ادا کر دوں گا۔ جب معقل امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور تمام واقعہ بیان کیا۔ حضرت نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کچھ دنوں تک رقم کا انتظار کرتے رہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ مصقلہ نے اسیروں کو چھوڑ دیا ہے اور ان پر کوئی بار نہیں ڈالا تو فکر ہوئی کہ وہ اکیلا کیونکر اتنی خطیر رقم ادا کر سکے گا آپ نے ابو جرہ حنفی کے ذریعہ مصقلہ کو پیغام بھیجا کہ یا قیمت بھجواؤ یا خود آؤ۔ مصقلہ کوفہ آیا اور دو لاکھ درہم ادا کر دیئے۔ ابھی وہ کوفہ ہی میں تھا کہ اس نے ذہل ابن حارث کو اپنے ہاں بلایا اور کہا کہ امیرالمومنین بقایا رقم کا تقاضا کر رہے ہیں اور میں اس کے ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ کہا کہ اگر تم چاہو تو ایک ہفتہ میں اتنی رقم فراہم کر سکتے ہو۔ کہا کہ میں کسی پر بوجھ ڈالنا پسند نہیں۔ خدا کی قسم اگر اس موقع پر معاویہ ہوتے تو مجھ سے کبھی مطالبہ نہ کرتے اور اگر حضرت عثمان ہوتے تو وہ بھی درگزر سے کام لیتے۔ آخر وہ اشعث ابن قیس کو آذربائیجان کے خراج میں سے ایک لاکھ درہم سالانہ دیا ہی کرتے تھے۔ ذہل نے کہا کہ یہ علی ہیں یہ مسلمانوں کے مال میں ایک درہم بھی چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ یہ سن کر وہ راتوں رات نکل کھڑا ہوا اور معاویہ کے ہاں پہنچ گیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اگر وہ ٹھہرا رہتا تو ہم مطالبہ میں سختی نہ کرتے اس نے کام تو شریفوں کا سا کیا تھا مگر غلاموں کی طرح بھاگ نکلا۔ معاویہ نے مصقلہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے طبرستان کا حاکم بنا دیا۔ اس نے اپنے بھائی نعیم ابن ہبیرہ کو ایک عیسائی حلوان کے ہاتھ تحریری پیغام بھیجا کہ میں نے معاویہ سے تمہارے بارے میں بات چیت کی ہے انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم یہاں چلے آؤ گے تو تمہیں کوئی نہ کوئی عہدہ دے دیا جائے گا لہٰذا فوراً پہنچو۔ مالک ابن کعب ارحبی نے یہ خط پکڑ لیا اور اس عیسائی کو حضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے اس غداری کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جب اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے قبیلہ بنی تغلب کو حلوان کے مارے جانے کا علم ہوا تو انہوں نے مصقلہ کو گھیر لیا اور کہا کہ تم اس کی موت کا باعث ہوئے ہو اسے زندہ کر دو یا اس کی دیت دو۔ اس نے دیت ادا کر کے چھٹکارا حاصل کیا۔

خریت کے علاوہ اور چند جتھے مختلف اوقات میں تخریبی کارروائیوں کے لئے کھڑے ہوئے مگر عراقی دستوں نے انہیں شکست دے کر پراگندہ و منتشر کر دیا۔

ربیع الثانی ۳۸ھ میں اشرس ابن عوف شیبانی نے مقام دسکرہ میں علم بغاوت بلند کیا اور دو سو کی جمعیت کے ساتھ انبار کا رخ کیا۔ امیرالمومنین نے ابرش ابن حسان کو تین سو کے لشکر کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا جس نے آگے بڑھ کر خوارج کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا۔ اشرس مارا گیا اور اس کی جماعت کے بچے کھچے لوگ منتشر ہو گئے۔

جمادی الاولیٰ ۳۸ھ میں ہلال ابن علقمہ اور اس کے بھائی مجاہد نے دو سو کی جمعیت کے ساتھ خروج کیا امیرالمومنین نے ان کے تعاقب میں معقل ابن قیس کو روانہ کیا جنہوں نے مقام ماسبذان میں خونریز جنگ لڑ کر ہلال اور مجاہد اور ان کے ہمراہیوں کو قتل کر کے شورش کو کچل دیا۔

جمادی الآخرہ ۳۸ھ میں اشہب ابن بشر نے ایک سو اسی آدمیوں کے ساتھ خروج کیا پہلے ماسبذان میں آیا جہاں ہلال ابن علقمہ اور اس کے ساتھی مارے گئے تھے اس نے مقتولین کی میتوں پر نماز جنازہ پڑھی اور جتنی لاشوں کو دفن کر سکتا تھا انہیں دفن کیا پھر فتنہ و شورش کے لئے نکل کھڑا ہوا امیرالمومنین نے اس کے مقابلہ کے لئے جاریہ بن قدامہ کو بھیجا جنہوں نے جوخی کے اطراف میں مقام جرجرایا میں انہیں جا لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر تلواریں سونت لیں جنگ کی شعلے بھڑک اٹھے اور اشہب اور اس کے تمام ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

ماہ رجب ۳۸ھ میں سعید ابن قفل تیمی نے بندنیجین میں علم بغاوت بلند کیا اور دو سو کی جمعیت کے ساتھ مقام درزنجان میں مار دھاڑ کرتا ہوا آیا۔ حاکم مدائن سعد ابن مسعود نے اس کا مقابلہ کیا اور سب کو تہ تیغ کر دیا۔

ماہ رمضان ۳۸ھ میں ابو مریم سعدی تمیمی نے شہر زور میں خروج کیا اس کے ہمراہ دو سو یا چار سو آدمی تھے جن میں زیادہ تر غیر عرب موالی تھے اور عرب صرف چھ تھے۔ اس نے کوفہ سے پانچ فرسخ کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈالا اور شہر کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے پر تولنے لگا۔ امیرالمومنین کو علم ہوا تو آپ نے ایک شخص کو اُن کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں اس خروج و بغاوت کے انجام سے ڈرا کر بیعت پر آمادہ کرے اور سمجھا بجھا کر کوفہ میں لے آئے۔ مگر انہوں نے حضرت کے سفیر کو یہ جواب دیا کہ ہم لڑنے کے لئے آئے ہیں بیعت کے لئے نہیں آئے۔ جب سفیر واپس پلٹ آیا تو آپ نے ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے سات سو کا ایک دستہ شریح ابن ہانی کی زیر قیادت بھیجا۔ ابھی یہ دستہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ خوارج نے ایک دم حملہ کر دیا یہ حملہ اتنا شدید اور ناگہانی تھا کہ شریح کے پانچ سو آدمی میدان چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور ان کے ہمراہ صرف دو سو آدمی رہ گئے جنہوں نے پاس ہی ایک آبادی میں پناہ لے لی۔ میدان چھوڑ کر جانے والوں میں کچھ تو کوفہ چلے گئے اور کچھ شریح کے پاس پلٹ آئے۔ امیرالمومنین کو فوج کے منتشر ہونے کی خبر ہوئی تو جاریہ ابن قدامہ کو خوارج کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں ڈرا دھمکا کر اطاعت پر آمادہ کریں۔ جاریہ کے عقب میں خود امیرالمومنین بھی تشریف لے آئے اور انہیں سمجھایا بجھایا اور سرکشی و بغاوت کے نتائج سے آگاہ کیا مگر ان پر کسی بات کا اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے باغیانہ موقف پر

جمے رہے۔ حضرتؑ نے جب اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو اپنے آدمیوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تلواریں نیاموں سے نکال لیں اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ خوارج کی اکثریت قتل ہو گئی صرف پچاس آدمی بچے جنہوں نے امان طلب کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ ان پچاس آدمیوں میں چالیس افراد زخمی تھے۔ جنہیں کوفہ میں لایا گیا اور ان کا علاج معالجہ کیا گیا۔ یہ خوارج کی سب سے زیادہ جری اور سرکش جماعت تھی جسے کیفرِ کردار تک پہنچایا گیا۔

سقوطِ مصر

قیس ابن سعد کے حالات میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جب تک وہ مصر میں حکمران رہے انہوں نے نظم و نسق برقرار رکھا اور عثمانیوں کو شورش و ہنگامہ آرائی کا موقع نہ تھا۔ جب ان کی برطرفی کے بعد محمد ابن ابی بکر اس عہدہ پر فائز ہو کر مصر میں آئے تو وہ ا ک اٹھائیس سالہ پُرجوش نوجوان تھے انہوں نے مصر کی امارت سنبھالنے کے بعد ایک مہینہ تو خاموشی سے گزارا اور اس کے بعد خربتا کے عثمانیوں کو کہلوا بھیجا کہ وہ بیعت کر کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں اور وفادار بن کر رہیں ورنہ اس مملکت سے نکل کر کسی اور جگہ آباد ہو جائیں مگر انہوں نے نہ اپنا علاقہ خالی کرنا گوارا کیا اور نہ بیعت پر آمادہ ہوئے اور کہا کہ جب تک حالات یکسو نہیں ہوتے ہم بیعت نہیں کریں گے۔ پھر اسی پر بس نہ کی بلکہ اندر ہی اندر سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ اور جب تحکیم کی قرارداد کا انہیں علم ہُوا تو کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئے اور حکومت کا نظم درہم و برہم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد نے ان کی شر انگیزیوں کو دیکھ کر یزید ابن حارث کنانی اور ابن جہمان کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں فتنہ و شر سے روکیں مگر انہوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ محمد نے پھر ابن مضاہم کلبی کو بھیجا اور وہ بھی ان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ معاویہ ابن حدیج کندی جو اب تک خاموش رہا تھا فضا کو ساز گار پا کر فتنہ انگیزی کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا اور قصاص خون عثمان پر لوگوں کو ابھارنا شروع کیا اہلِ خربتا تو اس کے ساتھ تھے ہی دوسرے لوگ بھی اس کے ہمنوا ہو گئے۔ ملکی حالات بگڑ گئے نظم و نسق کا شیرازہ بکھر گیا اور محمد کے لئے اس بغاوت و بدامنی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

جب امیرالمومنینؑ کو مصر کے انتشار و بدنظمی کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ مصر کے بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانا قیس ابن سعد کا کام ہے یا مالک اشتر کا مگر قیس ابن سعد کو فیصلۂ تحکیم تک اپنے ہاں روکنا چاہتے تھے اور اس کے بعد انہیں آذربائیجان کا والی نامزد کر چکے تھے اور مالک نصیبین میں عامل تھے آخر نظرِ انتخاب مالک پر پڑی اور آپ نے انہیں تحریر کیا کہ میں نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا حاکم مقرر کیا تھا

مگر لوگوں نے ان کے خلاف بغاوت کردی ہے وُہ نوجوان اور جنگ و قتال میں نا آزمودہ کار ہے تم شبیب ابن عامر ازدی کو اپنا نائب مقرر کر کے فوراً میرے پاس پہنچو۔ مالک نے اسی وقت رختِ سفر باندھا۔ اور حضرت کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں مصر کے اوضاع سے آگاہ کیا اور فرمایا کہ تم مصر پہنچ کر حکومت سنبھال لو اور حالات کا جائزہ لے کر اپنی صواب دید پر عمل کرو۔

جب معاویہ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی کہ مالک اشتر کو مصر کا عامل مقرر کر کے بھیجا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہوگئے کیونکہ وُہ عمرو ابن عاص سے امارتِ مصر کا وعدہ کئے ہُوئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ محمد ابن ابی بکر کو بڑی آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے مگر مالک اشتر سے نمٹنا آسان کام نہیں ہے انہوں نے چاہا کہ مالک کے مصر پہنچنے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے علاقہ قلزم کے ایک باجگزار جایستار کو پیغام بھجوایا کہ:۔

ان الاشتر قد ولی مصر فان کفیتنیہ لم اخذ منك خراجا ما بقیت وبقیت۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۸۷)	مالک اشتر مصر کا حاکم مقرر ہوا ہے اگر تم اُسے میرے راستے سے ہٹا دو گے تو جب تک میری اور تمہاری زندگی باقی ہے تم سے خراج نہیں لُوں گا۔"

یہاں یہ سوال بالکل بیکار ہے کہ اس اقدام کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں شرعی حدود کا پاس و لحاظ کیا جاتا ہو اور جہاں جاہ و اقتدار قائم رکھنا ہی منتہائے مقصد ہو وہاں اخلاقی احکام اور شرعی اوامر کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جایستار معاویہ کے حکم کی بجا آوری کے لئے قلزم پہنچ گیا۔ جب مالک اشتر مصر جاتے ہوئے وہاں پہنچے تو اُس نے بڑی گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا اور آداب میزبانی بجا لانے کے بعد شہد کا شربت پیش کیا جس میں زہر کی آمیزش تھی۔ آپ نے شربت کا جام لے کر پی لیا مگر پیتے ہی حالت غیر ہوگئی اور کرب و بے چینی کی کروٹیں بدلنے کے بعد دم توڑ دیا۔ جب معاویہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا:۔

کانت لعلی یمینان قطعت احداھما بصفین۔ یعنی عمار ابن یاسر۔ وقطعت الاخریٰ الیوم۔ یعنی الاشتر۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۸۸)	علی کے دو ہاتھ تھے ایک صفین میں قطع ہو گیا۔ یعنی عمار ابن یاسر اور ایک آج قطع ہو گیا یعنی مالک اشتر۔"

جب امیرالمومنین نے مالک کی خبرِ شہادت سنی انا للہ وانا الیہ راجعون کے بعد فرمایا کہ مالک کا

کیا کہنا وُہ آپ اپنی مثال تھا اللہ اس پر رحمت نازل کرے اس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور اپنے پروردگار کے حضور پہنچ گیا۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مصیبت رسول اللہ کا سانحۂ ارتحال تھا اور اس کے بعد تو ہم ہر مصیبت پر صبر کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔

محمد ابن ابی بکر اپنی برطرفی سے رنجیدہ و افسردہ خاطر تھے۔ جب امیرالمومنین کو ان کی افسردگی کی خبر ہوئی تو انہیں تحریر فرمایا کہ میں نے یہ تبدیلی اس لئے نہیں کی تھی کہ تمہیں کام میں سست اور ادائے فرض میں کمزور پایا ہو۔ میں چاہتا تھا کہ تمہیں ایسی جگہ پر مقرر کروں جہاں تمہیں زحمت کم اٹھانا پڑے۔ میں نے جسے تمہاری جگہ پر والیٔ مصر بنا کر بھیجا تھا وہ ہمارا دوست و خیر خواہ اور دشمنوں کے لئے شمشیر قاطع تھا خدا اس پر رحمت کرے اس کی زندگی ختم ہو گئی اور وُہ اس جہانِ فانی سے جوارِ پروردگار میں پہنچ گیا۔ ہم اس سے راضی تھے خدا اس سے راضی و خوشنود ہو۔ تم دشمن کے ریلے کو روکنے کے لئے تیار رہو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ محمد نے جواب میں لکھا کہ میں آپ کی خوشنودیٔ خاطر کو ہر چیز پر مقدم سمجھتا ہوں آپ جو حکم دیں گے میں بسر و چشم اس پر عمل کروں گا اور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ دشمن سے لڑوں گا۔

معاویہ نے مالک کا رشتہ حیات قطع کرنے کے بعد اپنے مشیران کار عمرو ابن عاص حبیب ابن مسلمہ بسر ابن ابی ارطاۃ، ضحاک ابن قیس، عبدالرحمٰن ابن خالد، ابوالاعور سلمی اور شرجیل ابن سمط کندی کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کس مقصد کے لئے تمہیں طلب کیا ہے انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ ہی جانیں کہ کیوں بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اس وقت بلانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ آپ مصر کے بارے میں ہماری رائے دریافت کریں۔ معاویہ نے کہا کہ ہاں اسی مقصد کے لئے بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ ہماری رائے ڈھکی چھپی ہُوئی نہیں ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مصر کی فتح ہو گیا تو آپ کا اور ہم سب کا وقار بڑھ جائے گا اور ہم اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سرنگوں کر کے اپنا پرچم بلند کر سکیں گے۔ معاویہ نے دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے سب نے کہا کہ ہمیں عمرو ابن عاص کی رائے سے اتفاق ہے۔ معاویہ نے کہا کہ مصر میں ہمارے دوست و ہمنوا موجود ہیں۔ انہیں طمع و لالچ دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہیں۔ اور مخالفوں کو ڈرا دھمکا کر پست حوصلہ کر دینا چاہیئے تاکہ وہ لڑنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں اور کیا اچھا ہو کہ یہ مرحلہ جنگ کے بغیر سر ہو جائے۔ عمرو نے کہا کہ جنگ ناگزیر ہے اور اس کے علاوہ کامیابی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اس گفت و شنید کے بعد معاویہ نے مسلمہ ابن مخلد انصاری اور معاویہ ابن حدیج سکونی کے نام ایک خط لکھ کر اپنے غلام سبیع کو دیا اور اسے مصر روانہ کیا۔ اس خط میں ان دونوں کی کوششوں کو سراہتے

ہوئے انہیں مزید سرگرم عمل ہونے کی تاکید کی اور انہیں حکومت میں شریک کیے جانے کا لالچ دیا۔ مسلمہ ابن مخلد نے اپنی طرف سے اور ابن حدیج کی طرف سے جواب دیا کہ ہم عاقبت سنوارنے کے لیے یہ قدم اٹھانا چاہتے ہیں ہمیں نہ منصب کی ضرورت ہے اور نہ اقتدار کی۔ تم سواروں اور پیادوں کے لشکر جلد بھیج دو۔ ہمارے مخالف ہمت ہارے بیٹھے ہیں اگر مدد پہنچ گئی۔ تو اللہ ہمیں فتح دے گا۔ معاویہ کو یہ خط فلسطین میں ملا اس نے وہیں سے چھ ہزار کا لشکر عمرو ابن عاص کی قیادت میں مصر روانہ کر دیا۔ جب عمرو سرزمین مصر کے قریب پہنچا تو مصر کے عثمانی بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عمرو نے معاویہ کا ایک خط جو محمد ابن ابی بکر کے نام تھا انہیں بھیجا جس میں تحریر تھا کہ تم عثمان کے گرد گھیرا ڈالنے والوں میں شامل تھے تمہیں اس جرم کی پاداش میں سزا دی جائے گی اور خود عمرو نے بھی انہیں تحریر کیا کہ مصر کا علاقہ تمہارے خلاف ہو چکا ہے اور کوئی شخص بھی تمہارا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہے لہذا تم اپنی جان بچاؤ اور سرزمین مصر سے نکل جاؤ۔ محمد نے یہ دونوں تحریریں امیرالمومنین کو بھجوا دیں اور انہیں لکھا کہ عمرو ابن عاص مصر کے باہر چھاؤنی ڈالے پڑا ہے میں اپنے آدمیوں میں ولولہ و جوش نہیں پاتا لہذا آپ فوراً کمک روانہ کریں تاکہ دشمن کی فوج سے مقابلہ کیا جا سکے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ تم جتنی فوج مہیا کر سکتے ہو مہیا کرو اور اسے تسلی دو کہ وہ صبر و استقلال سے ثابت قدم رہے میں یہاں سے فوج مرتب کر کے بھیجا چاہتا ہوں۔ محمد ابن ابی بکر نے چار ہزار کی فوج جمع کی اور اسے دو حصوں پر تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ پر کنانہ ابن بشر کو افسر مقرر کر کے آگے روانہ کیا اور ایک حصہ اپنی کمان میں رکھا۔ جب کنانہ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھے تو عمرو نے ان کے مقابلہ کے لیے ایک کے بعد دوسرا دستہ بھیجنا شروع کیا مگر جو دستہ آگے بڑھتا کنانہ اس کا راستہ روک کر اسے پیچھے ڈھکیل دیتے۔ آخر عمرو نے چھ ہزار کی فوج کو ناکافی سمجھتے ہوئے معاویہ ابن حدیج سے کمک طلب کی۔ ابن حدیج اپنے آدمیوں کو لے کر آیا اور شامیوں کے ساتھ مل کر کنانہ اور اس کے لشکر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جب کنانہ نے دیکھا کہ ان کی فوج گھیرے میں آ چکی ہے تو وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئے۔ اور ان کے ساتھی بھی پیادہ ہو گئے اور تلواریں لے کر دشمن کی طرف لپکے مگر حصار توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ محمد نے کنانہ کی فوج کو محاصرہ میں دیکھا تو لشکر کو لے کر آگے بڑھے تاکہ حصار کو توڑ کر اپنے ساتھیوں کو نکال لے جائیں مگر محمد کے ساتھیوں نے کنانہ کی فوج کا حشر دیکھا تو ان کا ساتھ چھوڑ کر چل دیئے۔ ادھر محاصرہ میں گھری ہوئی فوج پر دشمن نے یکبارگی حملہ کر کے سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اب محمد کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ چھپ چھپا کر کہیں نکل جائیں اور اپنی جان بچائیں۔ چنانچہ وہ نکل کھڑے ہوئے اور ایک خرابے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ معاویہ ابن حدیج کو جب یہ معلوم ہوا کہ محمد بچ کر نکل گئے

ہیں تو وُہ خود تلاش کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک مقام پر چند آدمیوں کو دیکھا تو ان سے پوچھا کہ تم نے ادھر سے کسی کو گزرتے دیکھا ہے اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں نے ایک شخص کو اس خرابے میں دیکھا ہے۔ ابن حدیج نے کہا کہ پھر وہی ہو گا۔ چنانچہ اُس نے خرابے میں جھانک کر دیکھا تو وُہ محمد ہی تھے انہیں کشاں کشاں باہر نکالا اور جکڑ باندھ کر اپنے ساتھ لے لیا۔ جب عبدالرحمٰن ابن ابی بکر کو جو شامیوں کی سپاہ میں شامل تھا محمد کی گرفتاری کا علم ہوا تو اس نے عمرو ابن عاص سے کہا کہ تم ابن حدیج کو مجبور کرو کہ وہ میرے بھائی کو قتل نہ کرے۔ عمرو نے ابن حدیج کو پیغام بھجوایا کہ محمد کو میرے پاس بھیج دو۔ ابن حدیج نے کہا کہ تم لوگوں نے میرے ابن عم کنانہ ابن بشر کو تو بے دریغ قتل کر دیا ہے اور محمد کو بچا لے جانا چاہتے ہو اب وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔ محمد نے موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا تو کہا کہ میں بہت پیاسا ہوں مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔ ابن حدیج نے پانی پلانے سے انکار کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے عثمان کو پیاسا مارا تھا۔ خدا مجھے سیراب نہ کرے۔ اگر میں تمہیں ایک قطرہ پانی دوں۔ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ اور اللہ تمہیں جہنم کے کھولتے ہوئے پانی اور پیپ سے سیراب کرے گا۔ محمد نے کہا کہ اے یہودیہ کے بیٹے یہ نہ تیرے بس کی بات ہے اور نہ عثمان کے بس کی اللہ اپنے دوستوں کو سیراب کرے گا اور تجھ ایسے لوگوں کو پیاسا ہی رکھے گا۔ خدا کی قسم اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو تیری یہ جرأت نہ تھی کہ مجھے اس آسانی سے گرفتار کر لیتا۔ ابن حدیج نے کہا کہ اب تو تم میرے قبضہ میں ہو میں پہلے تمہیں قتل کروں گا اور پھر تمہاری لاش گدھے کے پیٹ میں رکھ کر جلا دوں گا۔ محمد نے کہا کہ اگر تُو نے ایسا کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ ہو گی تم لوگ ہمیشہ سے دوستانِ خدا کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے چلے آئے ہو۔ میں اللہ سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گا جس طرح ابراہیم خلیل اللہ پر ٹھنڈا کیا تھا اور تیرے دوست معاویہ اور عمرو ابن عاص کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے گا اور جب اس کی آنچ مدہم ہونے لگے گی تو اسے اور بھڑکا دے گا۔ اس پر ابن خدیج نے غضب ناک ہو کر تلوار ماری اور محمد خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ ابھی رمقِ جان باقی تھی کہ انہیں مردہ گدھے کے پیٹ میں رکھ کر جلا دیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ کو محمد کے مارے جانے کی خبر ہوئی تو وہ بے ساختہ رونے لگیں اور مرتے دم تک ہر نماز کے بعد ان کے قاتلوں پر نفرین کرتیں۔

امیرالمومنین نے محمد کے کمک طلب کرنے پر انہیں تحریر کیا تھا کہ میں فوجی دستوں کی روانگی کا سروسامان کر رہا ہوں۔ چنانچہ جب عبداللہ ابن قعین اور کعب ابن عبداللہ محمد کا پیغام لے کر آئے تو آپ نے اہلِ کوفہ کو مصر جانے کے لئے کہا اور فرمایا کہ وُہ کل کوفہ و حیرہ کے درمیان مقام جرعہ میں جمع ہو جائیں۔ دوسرے دن امیرالمومنین خود بھی وہاں پہنچ گئے اور صبح سے دوپہر تک منتظر رہے مگر اس عرصہ میں آنے والوں کی تعداد

ایک سو تک بھی نہ پہنچ سکی۔ حضرت بددل ہو کر واپس پلٹ آئے اور شب کو اعیان و اشرافِ کوفہ کو جمع کر کے فرمایا کہ میں تمہیں کوئی حکم دیتا ہوں کہ تم منہ پھیر لیتے ہو۔ اب تو تمہاری صحبت سے بیزار ہو چکا ہوں۔ نہ تمہارے اندر ملکی حمیت ہے نہ دینی جذبہ۔ معاویہ لوگوں کو پکارتا ہے تو لوگ اندھا دھند اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور میں تمہیں پکارتا ہوں تو تمہاری زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں حالانکہ تم دانا و ہوشمند ہو۔ کعب ابن مالک ارحبی نے کہا کہ یا امیر المومنین میں اس مہم پر جانے کے لئے حاضر ہوں اور اہل کوفہ سے کہا کہ اے لوگو اللہ سے ڈرو اپنے امام کی آواز پر لبیک کہو اور دشمن سے لڑنے کے لئے نکل کھڑے ہو۔ جب کعب اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہوئے تو حضرت نے اپنے غلام سعد کو حکم دیا کہ وہ اعلان عام کرے کہ تمام لوگ کعب کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں اور فوراً محمد کی مدد کے لئے پہنچیں مگر ان لوگوں نے ایک مہینہ جمع ہونے میں گزار دیا اور جب کعب دو ہزار کا لشکر لے کر مصر روانہ ہوئے تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے اُمید نہیں کہ تم بروقت پہنچ سکو اور کسی کام آسکو۔

اس لشکر کو روانہ ہوئے دو چار دن ہوئے تھے کہ حجاج ابن غزیہ انصاری جو محمد ابن ابی بکر کے لشکر میں شامل تھے بچ بچا کر کوفہ آئے اور مصر کے سقوط اور محمد بن ابی بکر کے قتل کی خبر دی اور عبدالرحمٰن ابن شبیب فزاری نے شام سے پلٹ کر بتایا کہ میں نے اہلِ شام کو اتنا خوش ہوتے کبھی نہیں دیکھا جتنا فتح مصر اور محمد کے قتل پر خوش ہوتے دیکھا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ جتنی انہیں محمد کے مارے جانے پر خوشی ہوئی ہے ہمیں اس سے کئی گنا زائد رنج ہوا ہے۔ حضرت کو رنجیدہ و غمناک دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یا امیر المومنین آپ ان کے مارے جانے پر اتنے غمگین کیوں ہیں۔ فرمایا:۔

ما یمنعنی انه کان لی ربیبا و کان لبنی اخاه و کنت له والدا اعده ولدا۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۶ ص ۹۲)

"کیوں رنجیدہ نہ ہوں وہ میرا پروردہ میرے بیٹوں کا بھائی اور میں اس کا باپ تھا اور اسے اپنا بیٹا شمار کرتا تھا۔"

اب مصر جانے والے لشکر کا کوئی مصرف نہ رہا۔ حضرت نے عبدالرحمٰن ابن شریح کو کعب ابن مالک کے عقب میں روانہ کیا کہ وہ لشکر سمیت واپس پلٹ آئیں۔ چنانچہ وہ واپس آ گئے اور مصر پر معاویہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

معاویہ جہاں شام پر اپنا تسلط و اقتدار برقرار رکھنا چاہتے تھے وہاں مصر پر بھی قبضہ کرنا چاہتے تھے اور اسی بناء پر انہوں نے عمرو ابن عاص سے امارتِ مصر کا وعدہ کیا تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک طرف

سے اہلِ مصر اور دوسری طرف سے اہلِ عراق ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو شام کا علاقہ چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ جائے گا اس لئے شام کا تحفظ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مصر کو اپنی مقبوضہ میں شامل نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ مصر ایک شاداب و زرخیز علاقہ تھا اور وہاں کے خراج کی آمدنی بھی اور صوبوں سے زیادہ تھی۔ معاویہ کی نظر اس کے خراج پر ہو یا نہ ہو مگر وُہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ حضرت علی کو اس آمدنی سے محروم کر کے مالی طاقت کے لحاظ سے کمزور کر دیں تاکہ وہ کسی وقت اس مادی طاقت کا سہارا لے کر اُن کے خلاف فوجی کاروائی نہ کر سکیں۔

مصر کی صورت حال یہ تھی کہ وہاں اگرچہ حضرت عثمان کے حامی بھی تھے مگر وہ زیادہ سے زیادہ دس ہزار تھے جو ایک بستی خربتا میں آباد تھے اور عمومی طور پر اہلِ مصر حضرت عثمان کے حامیوں کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ محمد ابن حذیفہ کی تحریک پر سب سے بڑی جماعت یہیں سے کھڑی ہوئی جس نے حضرت عثمان کے گرد گھیرا ڈالا تھا۔ ان حالات میں سقوطِ مصر کمزور قیادت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور معاویہ نے مصر پر حملہ آور ہونے سے پہلے اس قیادت ہی کو کمزور کرنے کی تدبیریں کیں اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کوئی حیلہ وحربہ اٹھا نہ رکھا۔ چنانچہ محمد ابن حذیفہ کو جو عبداللہ ابن ابی سرح کو امارت مصر سے الگ کر کے مصر پر قابض ہو گئے تھے دھوکا دے کر قتل کر دیا۔ پھر قیس ابن سعد کو حکومت کا لالچ دے کر اپنا ہمنوا بنانا چاہا اور جب وہ ان باتوں میں نہ آئے تو ان کی طرف سے جعلی خطوط بنا ڈالے اور اس طرح دام فریب بچھا کر مصر سے اُن کی برطرفی کا ساماں کیا۔ اور پھر تمام اخلاقی و شرعی حدود توڑ کر مالک اشتر ایسے جلیل القدر بزرگ کا زہر سے خاتمہ کروایا تاکہ مصر کو مضبوط قیادت میسر نہ آسکے۔

محمد ابن ابی بکر اگرچہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے مگر انہوں نے جنگی تدابیر کو بروئے کار لانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ انہوں نے نصف فوج دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے آگے بھیج دی اور نصف فوج اپنے ہمراہ رکھی کہ اگر دشمن پیش قدمی میں کامیاب ہو جائے تو ایک دستہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود رہے اور جب آپ کے ہمراہیوں ہی نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تو پھر کوئی گوشہ ڈھونڈنے کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔ اس شکست کا ذمہ دار جہاں محمد کے ہمراہیوں کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ وہاں اہلِ کوفہ کے کردار کی کمزوری بھی اس کا ایک اہم سبب ہے۔ اگر وہ بروقت پہنچ جاتے تو پھر نتیجہ اس سے مختلف ہوتا۔

بصرہ میں ابن عامر کی آمد

جب معاویہ نے مصر پر قبضہ و اقتدار حاصل کر لیا تو چاہا کہ بصرہ پر تاخت و تاراج کر کے اسے بھی اپنے مقبوضہ علاقوں میں شامل کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ ابن عامر حضرمی کو بلا کر کہا کہ بصرہ والوں میں ابھی تک خونِ عثمان کے قصاص کا جذبہ موجود ہے وہ چاہتے ہیں کہ کوئی آگے بڑھے اور وہ اس کے ساتھ ہو کر قاتلانِ عثمان سے جنگ کریں۔ میں اُن کی قیادت کے لئے تمہیں موزوں سمجھتا ہوں لہٰذا تم بصرہ جاؤ اور بنی تمیم کے ہاں قیام کرو۔ لیکن قبیلہ ربیعہ سے چوکنا اور ہوشیار رہنا کیونکہ وہ ترابیہ یعنی شیعیانِ ابو تراب ہیں ابن عامر نے اس پر خندہ پیشانی سے اظہارِ آمادگی کیا۔ معاویہ نے اسے آمادہ پایا تو عمرو ابن عاص کو تحریر کیا کہ میں ابن عامر کو بصرہ بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ وہ تحریکِ قصاص کو پھر سے زندہ کرے تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ عمرو نے اس رائے سے اتفاق کیا اور معاویہ نے ابن عامر کو بصرہ روانہ کر دیا۔

جب ابن عامر بصرہ میں وارد ہوا تو حسب ہدایت بنی تمیم کے ہاں جا کر ٹھہرا۔ اہلِ بصرہ کی ایک جمعیت بھی اس کے گرد جمع ہو گئی جس میں زیادہ تر اس کے ہم خیال لوگ تھے۔ اس نے ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ عثمان مظلوم مارے گئے اور اس کی ذمہ داری علی پر عائد ہوتی ہے۔ تم نے عثمان کے قصاص کے سلسلہ میں تعاون کیا تھا خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے۔ تمہارے ہاں کے چیدہ و برگزیدہ افراد قصاص طلب کرتے ہوئے مارے گئے۔ اٹھو اور اپنے قاتلوں سے انتقام لو ہم ہر حالت میں تمہاری مدد کے لئے موجود رہیں گے۔ ضحاک ابن عبداللہ نے یہ سُنا تو ابن عامر سے کہا کہ خدا تمہارا بُرا کرے تم پھر سوئے ہوئے فتنہ کو جگانے کے لئے آ گئے ہو۔ یہی فتنہ تو طلحہ و زبیر نے کھڑا کیا تھا۔ اور ہمیں امیرالمومنین کے خلاف بھڑکایا تھا حالانکہ ہم ان کی بیعت کر چکے تھے ہم سب یکدل و یک آواز تھے مگر ان دونوں نے یہاں پہنچ کر گھر گھر میں پھوٹ ڈلوادی اور ہمیں آپس میں لڑوا دیا۔ ہم ابھی تک اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں کہ تم پھر اسی ہلاکت و تباہی کا پیغام لے کر آ پہنچے ہو۔ ہم اس مردِ صالح کی بیعت کر چکے ہیں۔ جس نے ہماری خطاؤں سے چشم پوشی کی مجرموں سے درگزر کیا اور دشمنوں تک کو معاف کر دیا۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تلواریں لے کر میدان میں اُتر آئیں اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹیں تاکہ تمہیں معاویہ کے دورِ اقتدار میں کوئی عہدہ مل جائے، خدا کی قسم علی کا ایک دن معاویہ و آلِ معاویہ کی صد سالہ زندگیوں سے بہتر ہے۔ اس پر عبداللہ ابن خازم سلمی نے کہا کہ خاموش رہو تم اس کے اہل نہیں ہو کہ ان امور

میں دخل دو۔ اور ابن عامر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہم تمہارے یار و انصار ہیں اور قصاص کے سلسلہ میں پُورا پُورا تعاون کریں گے۔ ضحاک نے کہا کہ اے زن حبشیہ کے بیٹے تم ہو گیا اور تمہاری بساط کیا ہے۔ خدا کی قسم جس کا تم ایسا حمایتی ہو وہ بے یار و مددگار ہے اور جس کا تم ایسا مخالف ہو اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر دونوں آپس میں اُلجھ پڑے اور گالم گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ عبدالرحمٰن ابن عمیر تمیمی نے کہا کہ ہم اس لئے جمع نہیں ہوئے کہ آپس میں لڑیں جھگڑیں ہمیں اپنے اندر اتفاق و یکجہتی پیدا کرنا چاہئے۔ میری رائے یہ ہے کہ پہلے امیر شام کا تحریری پیغام سنو اور اگر وہ مفید مطلب ہو تو اس پر عمل کرو چنانچہ معاویہ کا خط پڑھا گیا۔ جس میں تحریر تھا کہ اے اہلِ بصرہ تم نے عثمان ابن عفان کے طرز عمل کو دیکھا بھالا ہے وہ امن کوش عافیت پسند مظلوم کے حامی اور کمزوروں کی سپر تھے۔ چند ظالموں نے انہیں گھیرے میں لے کر بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا ہم تمہیں اس خون ناحق کے قصاص کی دعوت دیتے ہیں اور اس امر کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلے کتاب و سنت کی روشنی میں کریں گے اور سال میں دو مرتبہ معینہ وظائف ادا کئے جائیں گے۔ جب یہ خط پڑھا جا چکا تو حاضرین میں سے اکثر لوگوں نے اس کی تائید کی اور نصرت و حمایت کا یقین دلایا۔ احنف ابن قیس خاموش بیٹھے رہے اور کہا کہ ہمیں ان باتوں سے کوئی مطلب و سروکار نہیں ہے۔ البتہ قبیلۂ عبدالقیس کے ایک فرد عمرو ابن مرحوم نے کہا کہ اے لوگو تم اپنی سابقہ بیعت پر باقی رہو اور بیعت شکنی کر کے جماعت میں انتشار و افتراق پیدا نہ کرو۔ اگر تم بیعت توڑ کر اس شخص کی آواز پر اُٹھ کھڑے ہُوئے تو یاد رکھو کہ ہلاکت و تباہی سے دوچار ہُوئے بغیر نہیں رہو گے۔ عباس ابن صحار عبدی جو اپنے قبیلہ عبدالقیس کی روش کے برخلاف امیرالمومنینؑ سے پرخاش رکھتا تھا کہنے لگا کہ ہم قولاً اور عملاً اس کا ساتھ دیں گے اور نصرت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے۔ مثنی ابن مخربہ عبدی نے یہ سُنا تو ابن عامر سے کہا کہ تم ابن صحار کی باتوں میں نہ آجانا۔ بہتر ہے کہ تم جدھر سے آئے ہو اُدھر واپس چلے جاؤ ورنہ ہم تلواروں تیروں اور نیزوں سے تمہیں واپس پلٹ جانے پر مجبور کر دیں گے۔ کیا ہم ابن عم رسولؐ کی اطاعت سے منہ موڑ کر ایک باغی و طاغی کی بیعت کریں۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو گا۔ ابن عامر نے جب اپنے مخالفین کی باتیں سنیں تو خطرہ کے پیش نظر صبرہ ابن شیمان ازدی سے کہا کہ اے صبرہ تم بھی تو ہمارے ہمخیال ہو اور عرب کی عظیم شخصیت اور اپنے قبیلہ کے سردار ہو میری مدد کرو اور پناہ دینے کا وعدہ کرو۔ صبرہ نے کہا کہ اگر تم بنی تمیم کے ہاں سے اُٹھ کر ہمارے ہاں چلے آؤ اور میرے گھر میں ٹھہرو تو ہم مدد بھی کریں گے اور پناہ بھی دیں گے۔ کہا کہ ہمیں یہیں قیام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبرہ نے یہ سنا تو پیشانی پر بل ڈال کر چل دیا۔

بصرہ کے حاکم عبداللہ ابن عباس تھے مگر وُہ محمد ابن ابی بکر کی تعزیت کے سلسلہ میں کوفہ جا چکے تھے اور بصرہ کی امارت زیاد ابن عبید کے سپرد کر گئے تھے۔ زیاد، ابن عامر کی آمد پر ہراساں ہو گیا۔ کیونکہ بنی تمیم اور دوسرے قصاص طلب اس کی پشت پر تھے۔ اس نے حضین ابن منذر اور مالک ابن مسمع کو دارالامارہ میں بلوایا اور اُن سے کہا کہ اے گروہ بکر ابن وائل تم امیرالمومنین کے حامیوں میں شمار ہوتے ہوئیں دشمن کی چیرہ دستی و فتنہ انگیزی سے مامون نہیں ہوں۔ جب تک امیرالمومنین کی طرف سے کوئی حکم نہیں آتا مجھے اپنے ہاں پناہ دو۔ حضین ابن منذر نے کہا کہ تم پناہ کے طالب ہو تو میں تمہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہوں مگر مالک نے کہا کہ میں اپنے آدمیوں سے پوچھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب زیاد نے مالک کو پناہ دینے سے پہلو بچاتے دیکھا تو اپنا ارادہ بدل دیا اور صبرہ ابن شیمان ازدی کو کہلوا بھیجا کہ مجھے پناہ دو اور بیت المال کی حفاظت کا انتظام کرو۔ صبرہ نے کہا کہ تم ہمارے ہاں چلے آؤ اور بیت المال بھی یہاں منتقل کر دو ہم تمہیں بھی پناہ دیں گے اور بیت المال کی بھی حفاظت کریں گے۔ چنانچہ زیاد راتوں رات ان کے ہاں چلا گیا اور بیت المال اور منبر بھی ادھر منتقل کر دیا۔

جب زیاد کے جانے کے بعد دارالامارہ خالی ہو گیا تو بنی تمیم اور ان کے ہمنواؤں نے چاہا کہ ابن عامر کو دارالامارہ میں لے جا کر اتاریں۔ چنانچہ بنی تمیم ابن عامر کو لے کر دارالامارہ کی طرف بڑھے۔ بنی ازد نے دیکھا تو وہ بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر آ گئے اور کہا کہ ہم ایک ناپسندیدہ شخصیت کو دارالامارہ میں اترنے نہیں دیں گے۔ جب ادھر سے اصرار بڑھا اور تصادم کا خطرہ پیدا ہُوا تو احنف ابن قیس بیچ میں پڑے اور ابن عامر کے ہمراہیوں سے کہا کہ دارالامارہ پر تمہارا حق دوسروں سے فائق نہیں ہے اور نہ تمہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ دوسروں پر ایک ایسے شخص کو مسلط کرو جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔ احنف کے کہنے سننے سے وہ لوگ واپس پلٹ گئے اور بنی ازد نے بھی اپنے گھروں کی راہ لی۔

زیاد نے عبداللہ ابن عباس کو تحریر کیا کہ معاویہ کی طرف سے ابن عامر حضرمی یہاں وارد ہُوا ہے اور بنی تمیم کے ہاں مقیم ہے اس نے لوگوں کو خونِ عثمان کے قصاص پر اُبھارا ہے اور اکثر اہل بصرہ اس کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ میں نے صبرہ ابن شیمان ازدی کے ہاں پناہ لے لی ہے اور بیت المال بھی بنی ازد کے ہاں منتقل کر دیا ہے۔ شیعیان امیرالمومنین کا میرے ہاں آنا جانا ہے۔ شیعیان عثمان، ابن عامر کے ہاں جمع ہیں اور دارالامارہ خالی پڑا ہے۔ آپ امیرالمومنین سے صورتِ حال بیان کریں اور وُہ جو حکم دیں اس سے مجھے آگاہ کریں۔

زیاد، بنی ازد کے ہاں پہنچ کر ایک دن تو چھپا رہا اور شائد کچھ اور دن چھپا رہتا لیکن بنی ازد

نے کہا کہ اب چھپنے سے کام نہیں چلے گا تمہیں نماز جمعہ بھی پڑھانا ہوگی اور خطبہ دینا ہوگا۔ چنانچہ زیاد نے نماز جمعہ کھلے بندوں پڑھائی اور خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر میں بنی تمیم کے ہاں پناہ لیتا اور ابن عامر تمہارے زیر حمایت ہوتا تو میں ابن عامر پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اور جب کہ میں تمہاری پناہ میں ہوں۔ ابن عامر مجھے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا اور نہ ہند جگر خوارہ کا بیٹا معاویہ امیرالمومنین اور انصار و مہاجرین پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اے بنی ازد میں نے جمل کے موقع پر تمہاری دلیری و شجاعت دیکھی ہے اگر اس دن باطل کی حمایت میں صبر و ثبات دکھایا تھا تو آج حق کی حمایت میں جرأت و پامردی کے جوہر دکھاؤ۔ اس پر صبرہ کے باپ شیمان نے کہا کہ اے گروہ بنی ازد جنگ جمل کے نتیجہ میں تمہیں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اگر میں اس موقع پر موجود ہوتا تو تمہیں کبھی لڑنے کی اجازت نہ دیتا۔ اگر تم کل علی کے خلاف تھے تو آج ان کی حمایت کر کے خلاف ورزی کے بدنما دھبوں کو دھو ڈالو۔ اگر بنی تمیم اپنے سردار کو لے کر میدان میں آئیں تو تم بھی اپنے سردار کو لے کر مقابلہ کرو اگر وہ معاویہ سے کمک مانگیں تو تم بھی علی سے مدد طلب کرو اگر وہ مصالحت چاہیں تو تم بھی مصالحت پر آمادہ ہو جاؤ۔ پھر اس کا بیٹا صبرہ کھڑا ہوا اور کہا کہ ہمیں علی سے اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا معاویہ سے خطرہ ہے۔ لہذا اب شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہو اور پناہ دہی کا حق ادا کر دو۔ بنی ازد نے کہا کہ ہم تمہارے تابع فرمان ہیں ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے۔ زیاد نے کہا کہ اے صبرہ تمہیں یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ تم بنی تمیم کا مقابلہ نہ کر سکو گے کہا کہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر وہ احنف کو لے کر آئیں گے تو ہم اس کے مقابلہ میں ابو صبرہ کو پیش کریں گے۔ اگر وہ حبات کو لائیں گے تو میں اس سے دو دو ہاتھ کروں گا اور اگر وہ جوانوں کو لے کر آئیں گے تو ہمارے ہاں بھی جوانمردوں کی کمی نہیں ہے۔ بنی تمیم نے جب دیکھا کہ بنی ازد زیاد کے پشت پناہ بن کر لڑنے کے لئے آمادہ ہیں تو انہیں پیغام بھجوایا کہ ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں ہے تم زیاد کو باہر نکالو اور ہم ابن عامر کو باہر نکالتے ہیں تاکہ وہ دونوں آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ہم ان میں سے جو غالب ہوگا اس کی اطاعت تسلیم کر لیں گے۔ ابو صبرہ نے جواب میں کہا کہ یہ مطالبہ اس صورت میں تو مانا جا سکتا تھا۔ جب ہم نے زیاد کو پناہ نہ دی ہوتی اور اب تو انہیں مقابلہ کے لئے باہر نکالنا اور قتل کر ڈالنا دونوں برابر ہیں۔

جب امیرالمومنین بصرہ کے بگڑے ہوئے حالات پر مطلع ہوئے تو آپ نے کوفہ کے بنی تمیم سے کہا کہ وہ بصرہ جا کر اپنے قوم و قبیلہ کے لوگوں کو سمجھائیں اور انہیں فتنہ و شر انگیزی سے روکیں مگر کوئی جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں اپنے قبیلہ کے مقابلہ میں جانے سے کیا امر مانع ہے آخر وہ لوگ بھی

مسلمان تھے جو رسول اللہ کے ساتھ ہو کر اپنے باپ بیٹوں بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے تھے تم اپنے بھائیوں کو نیکی و ہدایت کی دعوت دو اگر وہ ہدایت سے روگردانی کریں تو ان سے جنگ کرو۔ اس پر اعین ابن ضبیعہ تمیمی کھڑے ہوئے اور کہا کہ یا امیرالمومنین میں اس کام کے لئے حاضر ہوں یا تو ابن عامر کو قتل کر کے اس قصہ کو ختم کر دوں گا یا اسے حدود بصرہ سے نکال باہر کروں گا۔ حضرت نے انہیں بصرہ روانہ کیا اور زیاد کو لکھا کہ میں اعین ابن ضبیعہ کو بھیج رہا ہوں تا کہ وہ اپنی قوم کے سر پھروں کو سمجھا بجھا کر منتشر کریں اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو ہم یہی چاہتے ہیں اور اگر بنی تمیم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئیں تو پھر تم اپنے آدمیوں کو لے کر ان سرکشوں اور باغیوں سے جہاد کرو اگر تمہیں غلبہ حاصل ہو تو بہتر اور اگر غلبہ کے آثار نظر نہ آئیں تو انہیں ڈھیل دیتے جاؤ یہاں تک کہ لشکرِ اسلام انہیں کچلنے کے لئے پہنچ جائے۔ جب ابن ضبیعہ بصرہ میں وارد ہوئے تو بنی ازد کے ہاں پہنچ کر زیاد کو امیرالمومنین کا خط دیا۔ اور کہا کہ مجھے توقع ہے کہ انشاء اللہ حالات روبا صلاح ہو جائیں گے۔ اس کے بعد بنی تمیم کو جمع کر کے ان سے کہا کہ اے میری قوم کی فردو تم ان شورش پسندوں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ ہو کر کیوں اپنی جانیں تلف کرتے ہو۔ خدا کی قسم تمہاری سرکوبی کے لئے لشکر ترتیب دیا جا چکا ہے اگر تم سیدھی راہ پر آجاؤ گے تو وہ لشکر آگے نہیں بڑھے گا اور اگر تم بغاوت و سرکشی پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ تمہاری ہلاکت و تباہی یقینی ہے۔ ابن ضبیعہ دن بھر انہیں سمجھاتے بجھاتے اور بیعت شکنی کے تباہ کن نتائج سے ڈراتے رہے۔ آخر ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کی بات مانتے لیتے ہیں اور کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کریں گے۔ جب ابن ضبیعہ مطمئن ہو کر شام کے وقت اپنی منزل کی طرف پلٹے تو دس آدمی اُن کے پیچھے لگ گئے۔ ابھی وہ راستے میں تھے کہ وہ تلواریں لے کر اُن پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے جان بچانے کے لئے بھاگنا چاہا مگر ان لوگوں نے انہیں پکڑ کر بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا۔

زیاد نے ابن ضبیعہ کی مخلصانہ سعی اور اُن کے مارے جانے کی اطلاع امیرالمومنین کو دی۔ حضرت نے جاریہ ابن قدامہ سعدی کو بنی تمیم کے پچاس آدمیوں کے ہمراہ بصرہ بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ دشمن کی طرف سے ہوشیار رہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح ابن ضبیعہ کو بے خبری میں مار ڈالا ہے اسی طرح تمہیں بھی فریب دے کر قتل کر دیں۔ جاریہ نے بصرہ میں وارد ہونے کے بعد پہلے زیاد سے بات چیت کی اور پھر بنی ازد کے ہاں آئے اور امیرالمومنین کا خط جو اہلِ بصرہ کے نام تھا پڑھ کر سنایا۔ اس میں تحریر تھا کہ اے اہلِ بصرہ تم بغاوت و سرکشی کی بنا دیہ اس کے مستحق تو نہ تھے کہ تم سے کوئی مراعات برتی جاتی مگر میں نے تمہارے ہاں کے مجرموں کو معاف کر دیا۔ ہتھیار رکھ دینے والوں سے اپنی تلوار روک لی اور عذر خواہوں کے عذر

کو قبول کر لیا۔ تم نے برضا و رغبت میری بیعت کی تھی اگر تم بیعت پر قائم رہو گے اور اطاعت کو اپنا شعار بناؤ گے تو میں تمہارے بارے میں کتاب و سنت کے تقاضوں پر عمل کروں گا اور اگر تم نے کم عقلی و بے راہروی کا ثبوت دیا اور اپنے معاندانہ رویہ سے مجھے نقل و حرکت پر مجبور کر دیا تو پھر یاد رکھو کہ تمہیں ایسی جنگ سے دوچار ہونا پڑے گا کہ اس کے سامنے جنگ جمل کی سختیوں کو بھول جاؤ گے مجھے توقع ہے کہ تم اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت و تباہی کا سامان نہیں کرو گے۔" جب یہ خط پڑھا جا چکا تو صبرہ ابن شیمان نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم امیرالمومنین کی ہر بات سنیں گے اور ہر امر میں ان کی اطاعت کریں گے جس سے وہ جنگ کریں گے اس سے ہم لڑیں گے اور جس سے وہ صلح کریں گے اس سے ہم صلح کریں گے۔ اے جاریہ اگر تم اپنے آدمیوں کو لے کر دشمن سے نمٹ سکتے ہو تو بہتر ورنہ ہم ہر طرح تمہاری نصرت کے لئے تیار ہیں۔ پھر یکے بعد دیگرے اور لوگوں نے بھی تعاون کا یقین دلایا۔ یہاں سے فارغ ہو کر جاریہ اپنے گنے چنے ساتھیوں کے ہمراہ بنی تمیم کے ہاں آئے اور انہیں نشیب و فراز سمجھا کر راہِ راست پر لانا چاہا مگر کسی نے ان کی بات پر کان نہ دھرا بلکہ گالی گفتار اور فساد پر اتر آئے۔ جاریہ نے یہ صورت دیکھی تو زیاد اور بنی ازد سے مدد مانگی زیاد نے بنی ازد سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے بنی ازد جو کل دوست تھے وہ آج دشمن ہیں اور جو کل دشمن تھے۔ وہ آج دوست ہیں جاریہ کو ہماری کمک کی ضرورت ہے لہٰذا اُٹھو اور دشمن کے مقابلہ میں ان کی مدد کرو چنانچہ بنی ازد ہتھیار سج کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور شریک ابن عمار حارثی جو امیرالمومنین کے شیعہ اور جاریہ کے دوست تھے وُہ بھی شریکِ لشکر ہو گئے۔ اِدھر ابن عامر نے عبداللہ ابن خازم سلمی کو سواروں کا افسر مقرر کیا اور اپنی فوج کو لے کر میدان میں اُتر آیا کچھ دیر تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے آخر ابنِ عامر اور اس کے ساتھی اپنی جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور قصرِ سنبیل میں جس کے گرد خندق کھدی ہوئی تھی پناہ لے لی۔ ان پناہ لینے والوں میں عبداللہ ابن خازم بھی تھا جب اس کی ماں عجلی کو خبر ہوئی کہ اس کا بیٹا قصر میں محصور ہو گیا ہے تو وہ دوڑتی بھاگتی آئی اور ابن خازم کو آواز دی اس نے اُوپر سے جھانک کر ماں کو دیکھا تو پوچھا کہ تم کیوں آئی ہو کہا کہ تم نیچے اُترو اور میرے ساتھ گھر چلو اس نے نیچے اترنے سے انکار کیا عجلی نے جو ایک کالی کلوٹی حبشیہ عورت تھی سر سے چادر اتار دی اور کہا کہ اگر تم باہر نہیں آؤ گے تو میں مجمع عام میں عریاں ہو جاؤں گی۔ ابن خازم مجبور ہو کر نیچے اُترا اور ماں کے ساتھ چلا گیا۔ ابن خازم کے جانے کے بعد جاریہ اور زیاد نے قصر کو محاصرہ میں لے لیا اور جب اُسے خالی کروانے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی تو جاریہ نے اس میں آگ لگا دی اور ابن عامر اپنے ستر آدمیوں سمیت ہلاک ہو گیا۔ کچھ آگ میں جل گئے کچھ دیوار کے نیچے دب کر مر گئے اور کچھ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے مارے گئے۔ ان ہلاک ہونے

والوں میں عبدالرحمٰن ابن عمیر تمیمی اور وادع ابن بدر بھی شامل تھا۔

زیاد نے ظبیان ابن عمیر کو خط دے کر امیرالمومنین کی خدمت میں بھیجا اور انہیں تحریر کیا کہ ہمیں فتح و کامیابی حاصل ہوئی ہے اور جاریہ کے ہاتھوں دشمن کا صفایا ہو گیا ہے۔ حضرت نے اس بغاوت کے فرو ہونے پر اظہار اطمینان کیا اور ظبیان سے پوچھا کہ بصرہ میں تمہارا مکان کس جگہ پر واقع ہے اس نے جگہ کی نشاندہی کی۔ فرمایا کہ تم بصرہ کے اطراف میں مکان بنوا کر وہاں منتقل ہو جاؤ۔ یہ بصرہ ہمیشہ آگ اور پانی کی زد میں رہے گا اور اس طرح غرق ہو گا کہ مسجد کے کنگروں کے علاوہ کوئی عمارت نظر نہ آئے گی۔ چنانچہ بصرہ دو دفعہ غرق ہوا اور ایک دفعہ قادر باللہ کے دور میں اور ایک دفعہ قائم بامراللہ کے عہد حکومت میں اور بالکل یہی صورت پیش آئی۔ کہ جامع مسجد کے کنگروں کے علاوہ کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔

معاویہ کا یہ اقدام سینہ زوری امن دشمنی اور ہوس ملک گیری کا نتیجہ تھا جس کا خمیازہ انہیں بدترین شکست کی صورت میں بھگتنا پڑا اور جس قبیلۂ بنی ازد پر انہیں وثوق و اعتماد تھا کہ وہ ساتھ دے گا وہی قبیلۂ زیاد کی پناہ گاہ اور جاریہ کا بازوئے شمشیر زن ثابت ہوا اور آخر دشمن کو اس طرح کچلا کہ صفحۂ ہستی پر اس کا نام ونشان تک نہ چھوڑا۔ معاویہ کا اقدام بے سوچے سمجھے یا وقتی اشتعال کے زیر اثر نہ تھا۔ بلکہ سوچ بچار اور صلاح و مشورہ کے بعد عمل میں لایا گیا تھا جس میں حسب ذیل وجوہ و مقاصد کارفرما تھے:۔

(۱) معاویہ نے فتح مصر سے یہ اندازہ لگایا کہ عراق میں حضرت علی کی عسکری قوت کمزور پڑ چکی ہے ورنہ کوفہ سے محمد ابن ابی بکر کی مدد کے لئے فوج بھیجتے۔ اور جب مرکز میں فوجی طاقت نہیں ہے تو بصرہ میں کہاں ہو گی جو مزاحم ہو سکے۔

(۲) عبداللہ ابن عباس جو حضرت کے عزیز اور دست و بازو ہیں وہ ان دنوں بصرہ میں موجود نہیں ہیں اور ان کا نائب زیاد جس کا اقتدار وقتی حیثیت رکھتا ہے وہ شہر کے بچاؤ کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہیں ڈالے گا اور بے لڑے ہتھیار ڈال دے گا۔

(۳) بصرہ جنگ جمل کا میدان رہ چکا ہے اور وہیں کے لوگوں نے قصاص خون عثمان کے سلسلہ میں طلحہ و زبیر کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہ ہو گی جنہیں قصاص کے نام پر برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور وہ بہرحال تعاون کریں گے اور اگر تعاون نہ بھی کریں جب بھی فریق مخالف کا ساتھ نہ دیں گے۔

(۴) اہل بصرہ کے ان گنت افراد علی اور ان کے لشکر کے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور مقتولین کے وارثوں اور ان کے قبیلہ والوں کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہو گی اور وہ اس انتقامی جذبہ کے زیر اثر

علی کی فوج کے مقابلہ میں اُن کے آدمیوں سے تعاون کریں گے۔

(۵) بصرہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے فارس کے علاقہ سے متصل ہے اگر بصرہ فتح ہو جائے تو یہ فتح مزید فتوحات کا پیش خیمہ بن سکتی ہے اور بڑی آسانی سے فارس پر جو علی کے مقبوضہ علاقوں میں شامل ہے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

شامیوں کے جارحانہ حملے

بصرہ کی ہزیمت کے بعد معاویہ کو اندازہ ہو گیا کہ عراق کے شہروں پر حملہ کر کے کامیابی حاصل کرنا مشکل ہے البتہ مضافاتی آبادیوں اور دُور افتادہ بستیوں میں قتل و غارت سے دہشت پھیلائی جا سکتی ہے چنانچہ انہوں نے امیرالمومنین کے سرحدی قصبوں اور فوجی بارکوں پر تاخت و تاراج اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پر رونق و شاداب بستیاں ویرانوں میں بدل گئیں اور بے گناہوں کے خون کا سیلاب ہر طرف اُمنڈ آیا۔ ان غارت گریوں کا مقصد یہ تھا کہ حضرت کے قلمرو مملکت میں انتشار و بدامنی پھیلا کر اسے کمزور سے کمزور تر کر دیا جائے اور آپ کو انہی شورشوں اور ہنگاموں کے فرو کرنے میں الجھائے رکھا جائے تا کہ وہ کسی وقت اپنی بکھری طاقت کو یکجا کر کے ان کے مقابلہ میں کھڑے نہ ہو سکیں۔ چنانچہ ۳۹ھ میں نعمان ابن بشیر کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ عین التمر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا یہاں امیرالمومنین کا ایک اسلحہ خانہ تھا جس کے نگران مالک ابن کعب ارحبی تھے اور ان کی ماتحتی میں ایک ہزار کی جمعیت ہمیشہ یہاں موجود رہتی تھی مالک کو جب نعمان کی پیش قدمی کا علم ہوا تو اس وقت اُن کے پاس صرف ایک سو آدمی تھے اور باقی اجازت لے کر کوفہ جا چکے تھے انہوں نے امیرالمومنین کو تحریر کیا کہ دو ہزار شامیوں کا لشکر حملہ کے ارادہ سے بڑھ رہا ہے اور یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ اس یلغار کو روکنے کے لئے ناکافی ہیں لہٰذا فوراً ایک دستہ سپاہ روانہ کریں۔ امیرالمومنین نے صورتِ حال پر مطلع ہوتے ہی حارث ہمدانی سے فرمایا کہ وہ کوفہ میں اعلان کریں کہ تمام لوگ رحبہ میں جمع ہوں۔ حضرت دوسرے دن نماز صبح سے فارغ ہو کر رحبہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ تین سو کے لگ بھگ آدمی جمع ہیں۔ آپ نے اہل کوفہ کی جنگ سے بے دلی دیکھی تو فرمایا اے اہل کوفہ میں نے تمہیں تمہارے بھائیوں ہی کی مدد کے لئے بلایا تھا مگر جب بھی شامیوں کے لشکر تمہارے سروں پر منڈلاتے ہیں تو تم جنگ سے جی

چرانے لگتے ہو اور دروازے بند کر کے گھر کے گوشوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہو۔ عدی ابن حاتم نے آپ کو افسردہ خاطر دیکھا تو کہا کہ یا امیرالمومنین میرے قبیلہ بنی طے میں ایک ہزار افراد جنگجو موجود ہیں اگر آپ حکم دیں تو میں انہیں لے کر دشمن کی سرکوبی کے لئے جاؤں فرمایا کہ مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دشمن کے مقابلہ میں ایک ہی قبیلہ کے لوگ جائیں اور اسے یہ تاثر دیں کہ دوسرے قبائل تعاون سے گریزاں اور ہماری نصرت سے روگرداں ہیں تم نخیلہ میں جا کر دوسرے لوگوں کو بھی جہاد کی دعوت دو۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں سے کہا سنا اور بنی طے کے علاوہ ایک ہزار افراد اور جمع ہو گئے۔ عدی ابن حاتم لشکر ترتیب دے کر کوچ کرنا چاہتے تھے کہ مالک ابن کعب کا پیغام آیا کہ ہم نے دشمن کو اپنی سرحد سے نکال باہر کیا ہے اب فوجی کمک کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوا یہ کہ مالک نے بایں خیال کہ شاید حضرت کی طرف سے مدد کے آنے میں تاخیر ہو جائے۔ حسن تدبر سے کام لیتے ہوئے عبداللہ ابن حوزہ ازدی کو قرظہ ابن کعب اور مخنف ابن سلیم کے ہاں بھیج دیا اور موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ان سے مدد طلب کی۔ قرظہ نے کہا کہ میں خراج کی جمع آوری پر متعین ہوں میرے ماتحت ایسے لوگ نہیں ہیں۔ جنہیں میں بھیج سکوں البتہ مخنف ابن سلیم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کی قیادت میں پچاس آدمیوں کا ایک مختصر دستہ بھیج دیا۔ جب عصر کے وقت یہ دستہ عین التمر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ مالک اور اُن کے ساتھی دیوار سے پشت لگائے کھڑے اور تلواروں کے نیام توڑ کر مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ نعمان نے اس دستہ کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ یہ مقدمۃ الجیش ہے اور اس کے عقب میں فوج آ رہی ہے اس نے فوراً واپسی کے ارادہ سے رُخ موڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مالک نے پیچھا کر کے اس کے تین آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا اور دشمن انہیں کوئی صدمہ نہ پہنچا سکا۔

اسی سنہ ۳۹ھ میں معاویہ نے سفیان ابن عوف غامدی کو چھ ہزار کی جمیعت کے ساتھ ہیت انبار اور مدائن پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا اور اُسے ہدایت کی کہ وُہ حضرت کے فوجی ٹھکانوں پر حملہ کر کے انہیں تباہ و برباد کر دے۔ سفیان نے حسب ہدایت پہلے ہیت کا رُخ کیا۔ ہیت کے عامل کمیل ابن زیاد نخعی تھے وہ یہ سن کر کہ قرقیسیا میں سپاہِ شام کے کچھ لوگ جمع ہیں جو ہیت پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ شہر کو خالی چھوڑ کر اُن کے تعاقب میں چلے گئے۔ حالانکہ انہیں امیرالمومنین کی طرف سے یہ اجازت نہ تھی کہ وہ اپنا مرکز چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب سفیان کا لشکر ہیت پہنچا تو دیکھا کہ شہر خالی پڑا ہے اور اس کی پیش قدمی کو روکنے والا کوئی نہیں ہے وہ بلا مزاحمت ہیت سے گزر کر انبار کی طرف بڑھا۔ یہاں پانچ سو آدمیوں کا ایک دستہ شہر کی حفاظت کے لئے متعین تھا۔ مگر

اس وقت صرف دو سو آدمی موجود تھے اور باقی اِدھر اُدھر جا چکے تھے۔ سفیان نے فوج کا اندازہ کرنے کے لئے وہاں کے چند نوجوانوں کو پکڑ کر ان سے دریافت کیا کہ یہاں فوج کے کتنے آدمی ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا کہ اس وقت دو سو کے لگ بھگ ہیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ فوج کی تعداد انتہائی کم ہے تو اس کی ہمت بڑھی اور اپنے لشکر کی صف بندی کرکے آگے بڑھا۔ ادھر سے اشرس ابن حسان بکری جو فوجی دستہ کے افسر اعلیٰ تھے۔ اپنے گنے چنے ساتھیوں کو لے کر مقابلہ کے لئے نکل آئے۔ جب ان کے ہمراہیوں نے دشمن کو کثرت و قوت کو دیکھا تو ان دو سو میں سے بھی آدھے لوگ منتشر ہو گئے اور باقی ماندہ گلی کوچوں میں کبھی دشمن سے دوبدو ہو کر لڑتے اور کبھی جھکائی دے کر اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ اشرس نے جب دیکھا کہ اس طرح دشمن کو جھکائیاں دے کر جانیں بچالے جانا مشکل ہے تو انہوں نے باہر نکل کر لڑنے کی ٹھان لی اور پکار کر کہا کہ جو اللہ کی راہ میں جان دینا چاہتا ہے اور اُس کی رضا و خوشنودی کا طالب ہے۔ وہ باہر میدان میں نکل آئے۔ اس آواز پر تیس آدمی نکلے جنہوں نے جانثاری و جانبازی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور لڑتے بھڑتے سب کے سب شہید ہو گئے۔ اب شامیوں کی چیرہ دستیوں کو روکنے والا کوئی نہ تھا انہوں نے ایک ایک گھر کو لوٹا عورتوں کے زیورات تک اتروا لیئے اور جو ہاتھ لگا کر سمیٹ کر چلتے بنے۔

جب امیرالمومنین کو دشمن کی غارت گری و تباہ کاری کا علم ہوا تو آپ نے کمیل ابن زیاد کو تہدید آمیز خط لکھا اور شہر کو حفاظتی دستہ کے بغیر چھوڑنے پر سرزنش کی اور منبر پر خطبہ دیتے ہوئے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی اور دشمن کے تعاقب میں جانے کے لئے کہا مگر کسی سمت سے لبیک کی آواز بلند نہ ہوئی۔ حضرت نے انہیں خاموش اور جنگ سے پہلو تہی کرتے دیکھا تو غم و غصہ میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور تن تنہا دشمن کو کچلنے کے ارادہ سے چل دیئے۔ اب لوگوں کو بھی غیرت آئی اور وہ حضرت کے پیچھے ہو لئے جب وادیٔ نخیلہ میں پہنچے تو کہا کہ یا امیرالمومنین آپ واپس تشریف لے جائیں ہم دشمن سے نمٹنے کے لئے کافی ہیں۔ جب ان لوگوں کا اصرار بڑھا تو آپ کوفہ واپس آ گئے اور سعید ابن قیس کی قیادت میں آٹھ ہزار کا لشکر دشمن کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ جب یہ لشکر فرات کی جانب سے عانات پہنچا تو سعید نے ہانی ابن خطاب ہمدانی کو دشمن کا کھوج لگانے کے لئے آگے روانہ کیا وہ کھوج لگاتے ہوئے حدود قنسرین تک گئے مگر سفیان کا لشکر آگے جا چکا تھا اور یہ تعاقب نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔

جب سعید ابن قیس واپس پلٹے تو حضرت نے جہاد کی اہمیت کے بارے میں خطبہ دیا اور جنگ سے جی چرانے والوں کو دشمن کی سرکوبی پر ابھارا اس پر جندب ابن عفیف ازدی کھڑا ہوا اور کہا

کہ یا امیرالمومنین میں اپنی ذات اور اپنے بھتیجے عبدالرحمن ابن عبداللہ پر اختیار رکھتا ہوں آپ ہم دونوں کو جو حکم دیں گے ہم اسے بسر وچشم بجا لائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں جو چاہتا ہوں وہ تم دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے ہیت اور انبار میں غارت گری کی تھی انہیں اس طرح کچلا جائے کہ آئندہ انہیں عراقی سرحدوں پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہو سکے۔ آپ نے سعید کی واپسی کے بعد چند دن توقف فرمایا اور پھر اہل کوفہ کو جمع کر کے خطبہ دیا اور فرمایا کہ اے لوگو تم انصار مدینہ سے تعداد میں کہیں زیادہ ہو انہوں نے کم ہونے کے باوجود پیغمبر اور مہاجرین کو اپنے ہاں پناہ دی انہوں نے کڑیاں جھیلیں مصیبتیں برداشت کیں مگر اسلام و اہل اسلام کی نصرت وحمایت سے ہاتھ نہ اٹھایا یہاں تک کہ اسلام کا پرچم فضائے عرب پر لہرانے لگا اس پر ایک دریدہ دہن شوخ چشم اور دراز قامت شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ آپ نہ محمد اور نہ ہم انصار ہم پر اتنا ہی بوجھ ڈالئے جتنا ہم اٹھا سکیں حضرت نے فرمایا کہ بات کو سمجھو اور سوچ کر بولو۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں محمد ہوں اور تم انصار ہو میں نے تو یہ مثال کے طور پر کہا ہے تاکہ تم بھی انصار کی راہ وروش پر چل کر اپنے اندر ان کا سا جذبہ پیدا کرو اور حوزۂ اسلام کے تحفظ کے لئے آئے دن کی غارت گریوں کو روکو۔ اس پر ایک اور شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ آج امیرالمومنین کو اصحاب نہروان کی ضرورت کا احساس ہوا ہو گا۔ جنہیں خود اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ پھر ہر طرف سے مختلف آوازیں آنے لگیں کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ اور ایک ہڑبونگ سا مچ گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ آج مالک اشتر زندہ ہوتے تو ان لوگوں کو ہلڑ مچانے کی جرأت نہ ہوتی اور ہر شخص سوچ سمجھ کر منہ سے بات نکالتا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم پر حیف ہے۔ اشتر کا حق تو اتنا ہی تھا جتنا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر ہوتا ہے اور میرے حقوق تو کہیں زیادہ ہیں جن کی نگہداشت تمہارے لئے واجب و لازم ہے۔ آخر سعید ابن قیس اور حجر ابن عدی نے کہا کہ آپ ہمیں جو حکم دیں گے ہم اس سے سرتابی نہیں کریں گے خواہ اس کی بجا آوری میں ہمارا مال و متاع چھن جائے اور عزیز و اقربا قتل کر دیئے جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دشمن کی سرکوبی کے لئے اٹھ کھڑے ہو اور انہیں قرار واقعی سزا دے کر ہمیشہ کے لئے کچل دو۔ یہ کہہ کر منبر سے نیچے اتر آئے۔ اور بیت الشرف میں تشریف لائے آپ کے عقب میں چند مخلص اصحاب بھی آپ کے ہاں پہنچ گئے آپ نے ان سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری نظروں میں ایسا شخص کون ہے جو خود بھی چاق چوبند اور اہل عراق کو بھی جنگ پر مستعد کر سکے تاکہ اس کی سرکردگی میں لشکر کی روانگی کا سروسامان کیا جائے سعید ابن قیس نے کہا کہ یا امیرالمومنین اس مہم کو سر کرنے کے لئے معقل ابن قیس تمیمی سے موزوں تر کوئی

دوسرا نہیں ہے وہ آپ کے مخلص دوست اور جری و شجاع ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں وہ اس کام کے لئے مناسب ہیں اور پھر معقل کو طلب کر کے اس مہم پر بھیج دیا۔

اسی سال معاویہ نے عبداللہ ابن مسعدہ فزاری کو سترہ سو آدمیوں کے ساتھ تیماء کی جانب روانہ کیا اور اُسے حکم دیا کہ وُہ مکہ و مدینہ تک بڑھتا چلا جائے اور راستے میں جو بستیاں آئیں وہاں کے باشندوں سے زکوٰۃ و صدقات جمع کرے اور جو انکار کرے اُسے بے دریغ قتل کر دے۔ چنانچہ وُہ چل دیا اور اس کے قوم و قبیلہ کے لوگ بھی اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے۔ حضرت کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے مسیب ابن نجبہ فزاری کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ جب ابن مسعدہ مار دھاڑ کرتا ہوا تیماء میں پہنچا تو حضرت کا لشکر بھی پہنچ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر تلواریں سونت لیں اور جنگ چھڑ گئی جو صبح سے ظہر تک جاری رہی۔ مسیب نے ابن مسعدہ پر جو اسی کے قبیلہ میں سے تھا تلوار کا وار تو کیا مگر اس کا بچاؤ کرتے ہوئے اور چپکے سے کہا کہ بھاگ کر اپنی جان بچاؤ چنانچہ وہ فوج کے ایک دستہ کو لے کر ایک قلعہ میں قلعہ بند ہو گیا اور بقیہ لشکر شام کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ابن مسعدہ اور اس کے ساتھیوں نے زکوٰۃ و صدقات کے نام پر جو اونٹ لوگوں سے زبردستی چھینے تھے وہ وہاں کے بادیہ نشین عربوں نے چھین لئے۔ جب ابن مسعدہ کو قلعہ بند ہوئے تین دن گزر گئے تو قلعہ کو آگ لگا دینے کی تجویز ہوئی۔ چنانچہ دروازہ پر لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا دی گئی۔ ابن مسعدہ نے دیکھا تو کہا اے مسیب تم اپنے ہی قبیلہ کے لوگوں کو جلائے دیتے ہو۔ مسیب نے حکم دیا کہ آگ بجھا دی جائے چنانچہ آگ بجھا دی گئی۔ آگ بجھانے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی ہے کہ شام کا ایک لشکر ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ سن کر سب لوگ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ابن مسعدہ کو موقع مل گیا اور وہ رات کے اندھیرے میں اپنے لشکر سمیت شام کی طرف نکل بھاگا۔ جب اس کے نکل بھاگنے کا پتہ چلا تو عبدالرحمٰن ابن شبیب نے کہا کہ ہمیں ابن مسعدہ کا تعاقب کرنا چاہئے مگر مسیب نہ مانا۔ جس پر عبدالرحمٰن نے کہا کہ تم نے امیرالمومنین کے خلاف دشمن سے ساز باز کر رکھی ہے اور تمہارا رویہ سراسر منافقانہ ہے۔

اسی ۳۹ھ میں معاویہ نے ضحاک ابن قیس فہری کو حیرہ کی طرف چار ہزار کے لشکر کے ساتھ بھیجا اور اُسے حکم دیا کہ ان بادیہ نشین عربوں کو جو علی کی اطاعت قبول کر چکے ہوں قتل کرے اور ان کا مال و اسباب لُوٹ لے۔ چنانچہ وہ آبادیوں کو روندتا اور بستیوں کو ویران کرتا ہوا ثعلبیہ تک پہنچ گیا اور حاجیوں کے ایک قافلہ پر حملہ کر کے ان کا سارا مال و اثاثہ چھین لیا اور پھر واقصہ اور شراف کی طرف سے ہوتا ہوا

قسطنطنیہ کی طرف بڑھا اور یہاں عمرو ابن عمیس ابن مسعود اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ امیر المومنین کو جب ان غارت گروں کی اطلاع ہوئی تو آپ نے لوگوں کو اُن کے تعاقب میں جانے کے لئے کہا مگر انہوں نے بے حسی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت نے اُن کے رویہ پر غم و غصّہ کا اظہار کیا اور اُن کی غیرت و حمیت کو جھنجھوڑا۔ آخر چار ہزار کا لشکر حجر ابن عدی کی قیادت میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے سماوہ میں پہنچا۔ یہاں حجر نے حرم سید الشہداء جناب رباب کے والد امرا القیس ابن عدی سے ملاقات کی اور ان کے قبیلہ بنی کلب کے چند افراد راستہ دکھاتے اور دشمنوں کی نشاندہی کرنے کے لئے ساتھ ہو گئے۔ جب حجر تیزی سے مسافت طے کرتے ہوئے تدمر کے اطراف میں پہنچے تو دیکھا کہ ضحاک کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ جب آمنا سامنا ہوا تو دونوں فریق نے تلواریں کھینچ لیں اور جنگ چھیڑ دی۔ اس معرکہ میں ضحاک کی فوج کے انیس آدمی مارے گئے اور حجر کے لشکر میں سے دو آدمی شہید ہوئے۔ اور جب رات کا اندھیرا پھیلا تو ضحاک اپنے لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور حجر کوفہ واپس پلٹ آئے۔

اسی سال معاویہ نے یزید ابن شجرہ رہاوی کو حج کے ایام میں مکہ بھیجا تاکہ وہ امارت حج کے فرائض انجام دے اور امیر المومنین کے مقرر کردہ عمال کو وہاں سے نکال کر معاویہ کے لئے بیعت لے۔ چنانچہ وہ تین ہزار سواروں کے جلو میں مکہ روانہ ہو گیا۔ جب عامل مکہ قثم ابن عباس کو اس لشکر کی آمد کی اطلاع ہوتی تو انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا کہ اے اہل مکہ شامیوں کا لشکر سرزمین حرم پر خون ریزی کے ارادہ سے نکل چکا ہے تم اپنے ہتھیار سنبھال لو اور دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دو مگر شیبہ ابن عثمان عبدری کے علاوہ سب نے ان کی بات بے توجہی و بے رُخی سے سنی اور کسی نے اُن کی آواز پر لبیک نہ کہی۔ جب قثم ابن عباس نے اہل مکہ کو تعاون سے پہلو تہی کرتے دیکھا تو چاہا کہ مکہ سے باہر نکل کر کسی گھاٹی میں پناہ لے لیں۔ اور امیر المومنین کو حالات سے آگاہ کر کے اُن سے فوجی کمک طلب کریں اور جب انکی طرف سے فوجی کمک آجائے تو پناہ گاہ سے نکل کر دشمن سے لڑیں۔ ابو سعید خدری کو جب یہ معلوم ہوا کہ قثم مکہ چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو انہوں نے اس کی مخالفت کی اور قثم سے کہا کہ سپاہِ شام کی آمد کا انتظار کیجئے اگر آپ دیکھیں کہ اس کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو مقابلہ کریں ورنہ مکہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ قثم اس پر رضامند ہو گئے اور امیر المومنین کو مدد کے لئے تحریر کیا۔ امیر المومنین نے یکم ذی الحجہ کو ایک دستہ سپاہ جس میں ابو الطفیل اور ریان ابن ضمرہ بھی شامل تھے روانہ کر دیا۔ یزید ابن شجرہ یوم ترویہ سے دو دن پہلے اپنے لشکر سمیت مکہ پہنچ گیا اور ابو سعید خدری کو بلا کر کہا کہ قثم ابن عباس سے کہئے کہ وہ امامت نماز اور امارت حج سے الگ ہو جائیں اور میں بھی الگ ہو جاتا ہوں۔ اور لوگوں کو اختیار دے دیں کہ وہ جسے چاہیں اُسے

منتخب کریں۔ قثم ابن عباس نے کچھ پس و پیش کیا اور پھر کمزوری اور دشمن کی کثرت و قوت کو دیکھتے ہوئے تیار ہو گئے اور لوگوں نے امامتِ نماز اور امارتِ حج کے لئے شیبہ ابن عثمان کو منتخب کر لیا۔ جب حج تمام ہو گیا تو ابن شجرہ شام کی طرف چل دیا۔ اس اثنا میں حضرت کا بھیجا ہوا لشکر بھی پہنچ گیا۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ شامیوں کا لشکر یہاں سے چل دیا ہے تو معقل ابن قیس نے لشکر کی کمان اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا تعاقب کیا اور وادی القریٰ سے نکل کر اُسے جا لیا۔ شامیوں نے بچ کر نکل جانا چاہا مگر معقل کے سپاہیوں نے پیچھا کر کے اُن کے چند آدمیوں کو اسیر کر لیا اور کوفہ واپس پلٹ آئے۔

جب یزید ابن شجرہ شام پہنچا تو معاویہ کو اپنے چند آدمیوں اسیر ہونے کی اطلاع دی۔ معاویہ نے حرث ابن نمر تنوخی کو جزیرہ کی طرف بھیجا تاکہ ان لوگوں میں سے جو حضرت کی بیعت کر چکے ہیں چند ایک کو اسیر کر کے لائے۔ چنانچہ اس نے جزیرہ میں پہنچ کر بنی تغلب کے سات آدمی گرفتار کر لئے۔ جب یہ اسیر معاویہ کے ہاں پہنچے تو بنی تغلب کی ایک جماعت نے جو امیرالمومنین سے کٹ کر معاویہ کے زیر سایہ آبسی تھی، معاویہ سے کہا کہ ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے مگر معاویہ نے قیدیوں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا جس پر بنی تغلب کبیدہ خاطر ہو کر معاویہ سے علیحدہ ہو گئے۔ معاویہ نے امیرالمومنین کو لکھا معقل نے یزید ابن شجرہ کی فوج میں سے جو قیدی بنائے تھے ان اسیروں کے بدلے میں بنی تغلب کے اسیروں کا تبادلہ کر لیا جائے حضرت نے اسے منظور کیا اور قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ ہو گیا۔

اسی سال معاویہ نے عبدالرحمٰن ابن قباث کو بلاد جزیرہ پر چڑھائی کے لئے بھیجا۔ جب جزیرہ کے عامل شبیب ابن عامر کو خبر ہوئی تو انہوں نے کمیل ابن زیاد کو جو ہیت میں والی تھے، دشمن کے حملہ آور ہونے کی اطلاع دی اور اُن سے فوجی مدد طلب کی۔ کمیل چھ سو سواروں کا ایک دستہ لے کر ان کی مدد کو چل دیئے۔ جب اطرافِ جزیرہ میں پہنچے تو دشمن کی سپاہ سے جو عبدالرحمٰن ابن قباث اور معن ابن یزید سلمی کی کمان میں تھی مڈبھیڑ ہو گئی۔ کمیل انہی چھ سو سواروں کو لے کر ان سے ٹکرا گئے اور ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کو تہِ تیغ کر دیا اور آپ کے ہمراہیوں میں سے دو آدمی شہید ہوئے۔ اب دشمن کے قدم جم نہ سکے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے حکم دیا کہ بھاگنے والوں کا پیچھا نہ کیا جائے۔ اور نہ زخمیوں کو جان سے مارا جائے۔ شامیوں کو تتر بتر کرنے کے بعد امیرالمومنین کو اپنی فتح و کامیابی کی خبر دی۔ حضرت ان کے کارنامے سے بہت خوش ہوئے اور ہیت کو خالی چھوڑ کر جانے کی جو غلطی اُن سے ہوئی تھی اس کی تلافی ہو گئی۔ جب نصیبین سے شبیب ابن عامر لشکر لے کر آئے تو دیکھا کہ کمیل نے دشمن کو پسپا کر دیا ہے انہوں نے اس کامیابی پر کمیل کو مبارکباد اور واپس جانے کے بجائے دشمن کے تعاقب میں

چل دیئے اور دریائے فرات کو عبور کرکے بعلبک تک پہنچ گئے۔ معاویہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے حبیب ابن مسلمہ کو ایک دستہ فوج کے ساتھ مقابلہ کے لئے بھیجا مگر وہ شبیب کے لشکر کو نہ پا سکا۔ شبیب نے اب تعاقب جاری رکھنے کے بجائے رقہ پر جو اموی ہوا خواہوں کا مرکز تھا حملہ کیا اور ہتھیار گھوڑے چھین لئے اور مویشی بھی ہنکا کر اپنے ساتھ لے لئے۔ جب پلٹ کر واپس آئے تو امیرالمومنین کو تمام روداد تحریر کی حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ وُہ گھوڑے اور ہتھیار جن سے دشمن میدانِ جنگ میں کام لیتا ہے وہ تو تمہیں لے لینے کا حق تھا مگر مال مویشی کے چھیننے کا کوئی حق نہ تھا۔ اور اس کے ساتھ اُن کی جرأت و حوصلہ مندی کی داد دیتے ہوئے فرمایا:۔

رحم اللہ شبیبا لقد ابعد الغارۃ وعجل الانتصار۔

خدا شبیب پر رحم کرے اس نے دُور تک حملہ کیا اور بدلہ اٹھا نہیں رکھا۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳ صفحہ ۱۹۱)

اسی سال معاویہ نے زہیر ابن مکحول عامری کو حضرت کے مقبوضہ شہر سماوہ کی جانب زکوٰۃ و صدقات کی وصولی کے لئے روانہ کیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو آپ نے جعفر ابن عبداللہ اشجعی، عروہ ابن عشبہ کلبی اور جلاس ابن عمیر کلبی کو قبیلہ بنی کلب و بکر ابن وائل سے صدقات کی جمع آوری کیلئے بھیجا۔ جب یہ تینوں آدمی پہنچے تو معاویہ کے آدمیوں سے تصادم ہو گیا۔ جعفر ابن عبداللہ قتل ہو گئے ابن عشبہ کو زہیر نے سواری کے لئے گھوڑا دیا اور وُہ جان بچا کر واپس آ گیا۔ اس سے حضرت کی نگاہوں میں اس کی شخصیت مشکوک ہو گئی۔ آپ نے اس پر دُرّہ اٹھایا اور ڈانٹا ڈپٹا آخر وہ بھاگ کر معاویہ کے پاس چلا گیا۔ جلاس بھی چپکے سے بھاگ نکلا اور راستے میں ایک چرواہے کو اپنا قیمتی جُبّہ دے کر اس کا پھٹا پرانا جبہ لے کر اوڑھ لیا تاکہ اُسے کوئی شناخت نہ کر سکے اور اس طرح بچتا بچاتا کوفہ چلا آیا۔

انہی دنوں میں معاویہ نے مسلم ابن عقبہ مری کو دومۃ الجندل بھیجا۔ یہاں کے لوگوں نے نہ حضرت علی کی بیعت کی تھی اور نہ معاویہ کی۔ حضرت کو جب مسلم ابن عقبہ کی نقل و حرکت کا علم ہُوا تو آپ نے مالک ابن کعب ہمدانی کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بھیجا۔ جب دونوں فریق کا آمنا سامنا ہُوا تو جنگ چھڑ گئی جو دن بھر جاری رہی آخر ابن عقبہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے جانے کے بعد مالک نے وہاں کے باشندوں سے حضرت کی بیعت کے لئے کہا مگر وُہ بیعت پر آمادہ نہ ہُوئے اور کہا کہ جب تک لوگ ایک خلیفہ پر اتفاق نہ کر لیں گے ہم کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کوفہ میں جہاں امیرالمومنین کے مخلص شیعہ اور جاں نثار تھے

وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو خارجیانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بات بات پر الجھتے انتشار و بددلی پھیلاتے اور سلطنت کو کمزور سے کمزور تر کرنے کی فکر میں کھوئے رہتے۔ ایک طرف ان لوگوں کی دورخی اور بے راہروی داخلی انتشار کی صورت اختیار کئے ہوئے تھی اور دوسری طرف شامیوں کے جارحانہ حملے آپ کے لئے مستقل پریشانی و دردسری کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اس دوطرفہ خلفشار اور ہنگامہ آرائیوں میں آپ نے جس حد تک حالات پر قابو رکھا وہ آپ کی اعلیٰ سیاست اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔ اگر ان صبر آزما حالات سے کسی اور کو دوچار ہونا پڑتا اور وہ نظم و ضبط مملکت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا تو پھر اس کے سیاسی تدبر کا ڈھنڈورہ پیٹنا زیب دے سکتا تھا۔ مگر نہ کسی کو ان جیسے دشوار حالات سے گزرنا پڑا اور نہ ان جیسے لوگوں سے سابقہ پڑا جن کی بے حسی اور سرد مہری ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔

بسر ابن ابی ارطاۃ کی تباہ کاریاں

یمن جو امیرالمومنین کے قلمرو مملکت میں شامل تھا وہاں پر عثمانیوں کی بھی ایک خاصی جمعیت تھی جنہوں نے بظاہر حضرت کی بیعت کر لی تھی اور پُرامن رعایا کی طرح رہتے سہتے تھے مگر باطن میں مملکت کے بدخواہ اور حضرت سے عناد رکھتے تھے اور والیٔ یمن عبیداللہ ابن عباس سے بھی ان کا رویہ معاندانہ تھا۔ جب مصر میں محمد ابن ابی بکر قتل کر دیئے گئے اور شامیوں کے تابڑ توڑ حملوں کے نتیجہ میں عراق بھی انتشار کی زد میں آ گیا تو انہوں نے پر پُرزے نکالے اور خون عثمان کے قصاص پر لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ عبیداللہ ابن عباس کو ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا علم ہوا تو انہوں نے چند سربرآوردہ لوگوں کو بلا کر کہا کہ میں تم لوگوں کے بارے میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے جو سُنا ہے صحیح ہے ہم قتل عثمان کو شروع ہی سے ایک المیہ سمجھتے رہے ہیں اور جنہوں نے اُن کے قتل کے اسباب فراہم کئے ان کے خلاف قدم اٹھانا ہمارا فریضہ ہے۔ عبیداللہ ابن عباس نے فتنہ کو ابھرتے ہوئے دیکھا تو انہیں نظر بند کر دیا تاکہ ملکی فضا مکدر نہ ہونے پائے مگر یہ اقدام موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ ان لوگوں نے فوج کے ان سپاہیوں کو جو اُن کے ہم خیال تھے۔ یہ پیغام بھجوایا کہ ہنگامہ کھڑا کر کے فوج کے افسر اعلیٰ سعید ابن نمران کو عہدہ سے الگ کر دو۔ چنانچہ انہوں نے بغاوت کر کے فوجی کمان اُن کے ہاتھ سے لے لی اور فوج کا شیرازہ درہم برہم ہو کر رہ گیا عسکری قوت کے کمزور ہو جانے سے وہ لوگ جو اب تک دبے ہوئے تھے کھل کر سامنے آ گئے۔

اور وُہ لوگ جو اُن کے ہم خیال تو نہ تھے مگر خراج و زکوٰۃ سے بچنا چاہتے تھے وُہ بھی اُن میں آکر شامل ہو گئے اور حکومت کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا گیا۔

عبیداللہ ابن عباس سعید ابن نمران اور شیعیان علی نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ ہمیں امیرالمومنین کو ان حالات سے آگاہ کرنا چاہیئے اور جو وُہ فرمائیں اس پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اگر ہم نے از خود ان عثمانیوں سے جنگ چھیڑ دی تو خدا جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔ چنانچہ امیرالمومنین کو تمام حالات تحریر کیئے گئے اور مستقبل کے اقدام کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا۔ حضرت نے یہ تحریر پڑھی تو پیشانی پر بل آیا اور عبیداللہ اور سعید کو تحریر فرمایا کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے وہ تمہاری کمزور سیاست کا نتیجہ ہے ورنہ وُہ اس قابل کب تھے کہ انہیں اہمیت دی جاتی۔ نہ وہ گنتی میں زیادہ تھے اور نہ قوت و طاقت میں۔ تم انہیں سمجھاؤ بجھاؤ اور تقویٰ وخوفِ الٰہی کی دعوت دو اگر وُہ راہِ راست پر آجائیں تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور اگر جنگ ہی پر اُتر آئے ہوں تو ہم بھی لڑنے پر تیار ہیں۔ اس کے ساتھ عثمانیوں کو بھی قبیلۂ ہمدان کے ایک شخص کے ہاتھ یہ تحریری پیغام بھجوایا کہ مجھے تمہاری بغاوت و سرکشی کی اطلاع ملی ہے تم لوگ بغاوت سے دستکش ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاؤ۔ اگر تم نے اس میں کچھ پس و پیش کیا تو یاد رکھو کہ تمہاری سرکوبی کے لیئے ایسا لشکر آرہا ہے جو تمہیں پیس کر رکھ دے گا۔ مگر ان لوگوں نے اس دھمکی کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے موقف پر بدستور جمے رہے۔ امیرالمومنین کے قاصد نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو کہا کہ امیرالمومنین یزید ابن قیس ارحبی کو ایک لشکرِ گراں کے ساتھ بھیجنے والے ہیں وہ فقط میرے جواب کے منتظر ہیں۔ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو لشکر حرکت میں آجائے گا اور پھر تمہارے روکے نہ رُکے گا۔ جب انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ خالی دھمکی نہیں ہے بلکہ ایسا ہو کر رہے گا تو انہوں نے کہا کہ اگر عبیداللہ ابن عباس اور سعید ابن نمران کو یہاں سے برطرف کر دیا جائے تو ہم حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بات صرف دفع الوقتی کے لئے تھی۔ ورنہ یہ لوگ عمال کی تبدیلی پر اکتفا کر کے خاموش رہنے والے نہ تھے وہ معاویہ کو پہلے ہی پیغام بھیج چکے تھے کہ وہ یمن کے شیعوں سے نمٹنے کے لئے فوج بھیج دیں ہم اس تعاون کر کے حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔

معاویہ جو عراق کے مختلف شہروں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیئے ہوئے تھے یمنیوں کی اس تحریک پر خاموش نہ رہ سکتے تھے انہوں نے فوراً بسر ابن ابی ارطاۃ کو جو انتہائی ظالم و سفاک اور درندہ صفت انسان تھا تین ہزار کے لشکر کے ساتھ بھیج دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ مدینہ اور مکہ سے ہوتا ہُوا یمن جائے اور راستے میں جن جن بستیوں سے اُس کا گزر ہو وہاں کے باشندوں کو ڈرا دھمکا کر بیعت لے اور شیعیانِ علی

ہیں سے جو بیعت سے انکار کرے اسے تہِ تیغ کر دے اور اس کا گھر بار لوٹ لے۔ چنانچہ وہ لشکر کی کمان کرتا ہوا مدینہ کی طرف چل دیا اور راستے میں جہاں کوئی چشمہ آتا وہاں اتر پڑتا اور لوگوں کے اونٹ ہنکا کر ساتھ لے لیتا۔ جب اس طرح لوٹ مار کرتا ہوا مدینہ کے قریب پہنچا تو بنی قضاعہ نے اُسے خوش آمدید کہا اور اونٹوں کو نحر کر کے تمام لشکر کے کھانے کا انتظام کیا۔ جب یہاں سے فارغ ہو کر حدودِ مدینہ میں داخل ہوا تو ابوایوب انصاری جو امیرالمومنین کی طرف سے والئ مدینہ تھے۔ سپاہِ شام کی کثرت و قوت سے ہراساں ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور کوفہ کی طرف چل دیئے۔ اب کوئی مزاحمت کرنے والا نہ تھا۔ بسر سیدھا مسجد میں آیا اور لوگوں کو جمع کر کے انہیں ڈرایا دھمکایا سب وشتم کا نشانہ بنایا اور اس قدر ہراساں کیا کہ سب کو موت کا یقین ہو گیا کچھ لوگوں نے حویطب ابن عبدالعزیٰ سے جس کے گھر میں بسر کی ماں تھی کہا کہ وہ ان کی جانوں کے تحفظ کی کوئی تدبیر کرے۔ اس نے بسر سے کہا کہ اے بسر یہ لوگ رسول اللہ کے انصار ہیں نہ یہ عثمان کے قاتل ہیں اور نہ ان کے قتل سے انہیں کوئی تعلق ہے ان سے درگزر کرو۔ بسر نہ مانا۔ اور جب ان لوگوں نے معاویہ کی بیعت پر آمادگی ظاہر کی تو اُن سے بیعت لے کر انہیں گھروں میں واپس جانے کی اجازت دے دی۔ البتہ جن کے بارے میں اُسے شبہ تھا کہ وُہ معاویہ کی بیعت نہیں کریں گے ان کے گھروں کو جلا دیا ان گھروں میں ابوایوب انصاری، عبداللہ ابن سعد، رفاعہ ابن رافع زرقی اور زرارہ ابن حرون کے مکانات بھی شامل تھے۔

بسر کی آمد پر بہت سے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے ان میں جابر ابن عبداللہ انصاری بھی شامل تھے وہ اپنے گھر سے نکل کر دوسری جگہ روپوش ہو گئے۔ بسر کو جب جابر نظر نہ آئے تو اس نے انصار کی ایک شاخ بنی سلمہ سے کہا کہ جب تک تم جابر کو حاضر نہیں کرو گے تمہیں جان و مال کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ جب جابر کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے قبیلہ والوں کی جانیں خطرہ میں ہیں تو وُہ رات کے اندھیرے میں چھپتے چھپاتے ام المومنین ام سلمہ کے ہاں آئے اور کہا کہ میں اس وقت اس غرض سے آیا ہوں کہ آپ مجھے مشورہ دیں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ اب اسکے سوا کیا چارہ ہے کہ معاویہ کی بیعت کر کے اپنی اور اپنے قبیلہ والوں کی جانیں بچاؤ۔ اگرچہ یہ بیعت سراسر ضلالت و گمراہی ہے اور میں نے اپنے بیٹے عمر ابن ابی سلمہ اور اپنے داماد عبداللہ ابن زمعہ سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ بیعت کر کے اپنے کو ہلاکت سے بچائیں۔ چنانچہ جابر نے مجبوری کی بنا پر بیعت کر کے اپنی اور اپنے قبیلہ والوں کی جانوں کا بچاؤ کیا۔ بسر جتنے دن مدینہ میں ٹھہرا مدینہ پر خوف و ہراس کے بادل چھائے رہے جبر و استبداد کے سامنے عوام کی ہمتیں پست اور قوتیں مضمحل ہو گئیں اور جان کے اندیشہ سے بیعت

کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بسر نے انہیں جان کی معافی دینے کے بعد کہا کہ اے اہل مدینہ تم اس قابل تو نہ تھے کہ تم میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ چھوڑا جاتا اس لئے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے عثمان قتل کر دیئے گئے۔ اور تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اگرچہ میں تمہیں اس دنیا میں معاف کئے دیتا ہوں مگر مجھے امید ہے کہ آخرت میں تم اللہ کی رحمت سے محروم رہو گے۔ میں حکومت شام کی طرف سے ابو ہریرہ کو تم پر حاکم مقرر کئے دیتا ہوں خبردار ان کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ اس کے بعد مکہ کی جانب روانہ ہو گیا اور جب خوف و دہشت پھیلاتا قتل و غارت کرتا اور بے گناہوں کا خون بہاتا ہوا مکہ کے قریب پہنچا تو حاکم مکہ قثم ابن عباس مکہ سے نکل گئے اور اکثر اہل مکہ بھی گھر بار چھوڑ کر ادھر اُدھر چل دیئے ان لوگوں میں ابو موسیٰ اشعری بھی شامل تھا۔ بسر کو جب یہ بتایا گیا کہ ابو موسیٰ بھی ڈر کے مارے بھاگ گیا ہے تو اس نے کہا کہ اُسے کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے تھا جس نے علی کا نمائندہ ہوتے ہوئے انہیں خلافت سے معزول کر دیا ہو اُسے قتل نہیں کیا جا سکتا تھا بسر نے اہل مکہ کو ڈرایا دھمکایا اور انہیں خطاب کرتے ہوئے کہا خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں غلبہ دیا اور ہمارے دشمنوں کو ذلیل و رسوا کیا۔ ابن ابی طالب ہی کو دیکھ لو کہ عراق کے ایک گوشہ میں اس طرح پڑے ہیں کہ خود اُن کی مملکت کی وسعتیں اُن پر تنگ ہو گئی ہیں۔ اللہ نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں انہیں مصیبتوں میں جکڑ رکھا ہے اور ان کے ساتھی بھی اُن سے بگڑ کر علیحدہ ہو چکے ہیں اس وقت مسلمانوں کے سربراہ معاویہ ہیں جو حضرت عثمان کے ولی اور اُن کے قصاص کے علمبردار ہیں۔ لہٰذا ان کی بیعت کرو۔ اور ان کی اطاعت سے منہ موڑ کر اپنی جانوں کو خطرہ میں نہ ڈالو۔ لوگ خائف و ہراساں تو تھے ہی خون آشام تلواروں کو دیکھ کر بیعت پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ان سے بیعت لی اور شیبہ ابن عثمان کو مکہ کا اقتدار سونپ کر طائف کی طرف چل دیا۔

جب بسر کچھ فاصلہ پر پہنچا تو ایک قرشی کو تبالہ کی طرف روانہ کیا اور اسے کہا کہ وہاں پر شیعوں کی بڑی جمعیت موجود ہے تم انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دو۔ چنانچہ اس نے تبالہ پہنچ کر شیعیان علی کو حراست میں لے لیا۔ ان لوگوں نے اس قرشی سے کہا کہ ہم لوگ تمہارے ہی قوم قبیلہ کے افراد ہیں ہمیں اتنی مہلت دو کہ ہم میں سے کوئی آدمی بسر کے پاس جائے اور اس سے امان کے لئے کہے اگر اس نے تحریراً امان دیدی تو بہتر ورنہ ہمیں قتل کر دینا۔ اس نے اجازت دے دی اور منیع باہلی طائف میں آیا جہاں بسر اس قرشی کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔ منیع نے بسر سے امان کی خواہش کی اور طائف کے چند سر کردہ افراد نے بھی اس پر زور دیا ان لوگوں کے کہنے سننے سے اُس نے امان کا وعدہ کر لیا مگر امان نامہ لکھ کر دینے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ اور جب یہ سمجھ لیا کہ اس کے آدمی نے سب کو قتل کر لیا ہو گا یا منیع کے واپس پہنچنے تک موت کے گھاٹ

اتار دیئے جائیں گے تو امان نامہ لکھ کر دے دیا۔ منیع فوراً واپسی کے ارادہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جب اپنا سامان سفر لینے کے لئے اس خاتون کے مکان پر آیا جس کے ہاں بطور امانت رکھا تھا تو دیکھا کہ وہ موجود نہیں ہے اس نے انتظار گوارا نہ کیا اور اونٹنی پر ایک چادر ڈال کر سوار ہو گیا اور اُسے سرپٹ دوڑاتا ہوا تبالہ کی طرف چل دیا۔ اِدھر وہ لوگ منیع کی واپسی سے مایوس ہو چکے تھے اور قرشی اور اس کے ہمراہی انہیں قتل کرنے کے لئے میدان میں جمع کر چکے تھے بلکہ ان میں سے ایک پر تلوار اٹھ بھی چکی تھی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ تلوار نے کام نہ کیا اور ٹوٹ گئی۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ تلواروں میں لچک پیدا کرنے کے لئے انہیں ہلاؤ جلاؤ چنانچہ انہوں نے تلواروں کو دھوپ میں ہلانا جلانا شروع کیا۔ جب منیع ایک دن اور ایک رات لگاتار پشتِ ناقہ پر گزارنے کے بعد بستی کے قریب پہنچا تو تلواروں کو چمکتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھا کہ تلواریں چل رہی ہیں اس نے سواری کو تیزی سے ہنکایا اور چادر ہلا ہلا کر انہیں اپنی آمد سے آگاہ کیا اور بڑی تگ و دو کے بعد ان تک پہنچ گیا۔ دیکھا کہ جس پر تلوار اٹھائی گئی تھی وہ اسی کا بھائی تھا۔ اُس نے بڑھ کر امان نامہ دکھایا اور محنتِ شاقہ کے بعد اُن کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

بسر طائف سے نکل کر بنی کنانہ کی بستیوں کی طرف بڑھا جہاں عبید اللہ ابن عباس کے دو کمسن بچے قثم اور عبدالرحمٰن اور ان بچوں کی ماں ام حکیم جوریہ بنتِ قارظ کنانیہ مقیم تھیں۔ بسر نے ان بچوں کو تلاش کرنے کے لئے آدمی دوڑایا تاکہ انہیں قتل کرے۔ عبید اللہ ابن عباس ان بچوں کو ایک کنانی کی زیرِ نگرانی چھوڑ گئے تھے اس نے جب یہ دیکھا کہ بسر ان بچوں کو قتل کرنا چاہتا ہے تو اس کی حمیت و غیرت نے گوارا نہ کیا، کہ خاموشی سے ان بچوں کو موت کے منہ میں جانے دے اس نے تلوار کھینچ لی اور مرنے مارنے پر اُتر آیا۔ بسر نے اس سے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں ہے اور نہ تمہیں قتل کرنے کا کوئی ارادہ ہے تم الگ رہو اور ان بچوں کے معاملہ میں دخل نہ دو۔ اس نے کہا کہ حقِ جوار کی پاسداری مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے یہ کہہ کر تن تنہا دشمن پر ٹوٹ پڑا اور لڑتا ہوا قتل ہو گیا۔ بسر نے قثم و عبدالرحمٰن کو تلاش کر کے انتہائی سفاکی و بے دردی سے قتل کر دیا۔ بنی کنانہ کی عورتوں نے سنا تو وہ گھروں سے باہر نکل آئیں اور ایک خاتون نے کہا کہ آج تک مردوں کو تو قتل کیا جاتا رہا ہے مگر اسلام تو اسلام دورِ جاہلیت میں بھی بچوں کو قتل نہیں کیا گیا۔ وہ حکومت کبھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی اساس ظلم و جور پر ہو اور جس میں بچوں اور بوڑھوں پر بھی ترس نہ کھایا جاتا ہو۔ بسر نے کہا کہ خدا کی قسم میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ان تمام عورتوں کو بھی تہ تیغ کر دوں کہا کہ خدا شاہد ہے کہ اگر تم ایسا کر گزرو تو ہمارے دل کی بے چینی کا مداوا ہو جائے۔ ام حکیم نے اپنے جگر پاروں کو خاک و خون میں غلطاں دیکھا تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور والہانہ طور پر اس طرح گھومتی پھرتی رہتیں گویا اپنے بچوں کو

تلاش کر رہی ہیں اور حج کے دنوں میں اپنے دردناک اشعار سے سننے والوں کے کلیجے ہلا دیتیں۔

جب امیرالمومنین کو ان بچوں کے قتل کئے جانے کی خبر ہوئی تو آپ بہت غمگین و افسردہ خاطر ہوئے۔ اور بسر کے حق میں بد دعا کرتے ہوئے کہا:۔

اللّٰھم اسلبه دینه وعقله۔ خدایا اس سے دین اور عقل چھین لے۔

(تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۹۳)

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ وقت آیا کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ مگر اس بدحواسی کے عالم میں بھی یہ کہتا کہ مجھے تلوار دو۔ آخر لکڑی کی ایک تلوار اسے دے دی گئی اور مشک میں ہوا بھر کر اس کے سامنے رکھ دی گئی وہ اس مشک پر تلوار چلاتا اور جذبۂ خوں آشامی کی تسکین کا سامان کرتا۔ آخر اسی دیوانگی کے عالم میں مر کھپ گیا۔

غرض اسی طرح درندگی و خونخواری کا مظاہرہ کرتا ہوا نجران میں وارد ہوا اور عبداللہ ابن عبدالمدان حارثی اور ان کے فرزند مالک کو قتل کیا۔ اہل نجران کو ہراساں کرنے کے بعد ارحب میں آیا اور ابوکرب کا خون بہایا جو امیرالمومنین کے مخلص شیعہ اور قبیلۂ ہمدان کے سردار تھے اس کے بعد یمن کے صدر مقام صنعاء کا رخ کیا۔ عمرو ابن اراکہ ثقفی نے جنہیں عبیداللہ ابن عباس اپنا قائم مقام بنا گئے تھے بچی کھچی فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور آخر اس خونریز تصادم کے نتیجہ میں مارے گئے۔ بسر نے شہر میں داخل ہو کر قتل عام کیا اور سینکڑوں بے گناہوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس طوفانی دورہ میں اس نے بستیوں کو اجاڑا لوگوں کا مال و اسباب لوٹا گھروں کو جلایا اور تیس ہزار مسلمانوں کو قتل کر کے بربریت و بہیمیت کو انتہا پر پہنچا دیا۔

امیرالمومنین نے بسر کی تباہ کاریوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے اہل کوفہ سے کہا مگر انہوں نے بے حسی کا ثبوت دیا اور دشمن کے تعاقب سے پہلو بچانے لگے۔ حضرت کے بار بار جھنجھوڑنے پر ابو بردہ ابن عوف ازدی نے کہا کہ اگر آپ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے ہمارے ساتھ چلیں تو ہم چلنے کے لئے تیار ہیں فرمایا تمہاری یہ رائے درست نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ میں مرکز کا نظم و نسق دوسروں پر چھوڑ کر چند رہزنوں کے پیچھے بھاگتا پھروں۔ جاریہ ابن قدامہ سعدی نے کہا کہ یا امیرالمومنین میں دشمن کے تعاقب میں جانے کے لئے حاضر ہوں۔ فرمایا کہ تم بصرہ سے دو ہزار کا لشکر لے کر حجاز اور پھر یمن تک اس کا تعاقب کرو اور اسے قرار واقعی سزا دو۔ وہب ابن مسعود ثقفی نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین میں کوفہ سے دو ہزار کا لشکر فراہم کر کے دشمن کی سرکوبی کے لئے جاتا ہوں۔ حضرت نے اسے بھی اجازت دی اور یہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان دونوں کے روانہ ہونے کے بعد اہل کوفہ کو احساس ہوا کہ انہوں نے

حضرت کی آواز پر گرم جوشی سے لبیک نہیں کہی۔ چنانچہ چند سر کردہ افراد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا امیرالمومنین ہم نادم و شرمسار ہیں کہ ہم نے دشمن کے مقابلہ سے پہلو تہی کی اور یہ ہماری کوتاہی اور کمزوری ہی کا نتیجہ ہے کہ دشمن کو ہمارے شہروں پر حملہ آور ہونے کی جراٴت ہوئی ہے۔ ہمیں حکم دیجئے کہ ہم لشکر ترتیب دے کر دشمن کا پیچھا کریں اور اسے کیفرِ دار تک پہنچائیں۔ فرمایا کہ میں نے اس شخص کو بھیجا ہے جو دشمن کو حدودِ مملکت سے نکالے بغیر نہیں پلٹے گا۔ البتہ تم ان جھڑپوں کے بجائے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کرو تاکہ ان آئے دن کے حملوں کا سدِّباب ہو سکے۔ اٹھو اور معاویہ ابن ابی سفیان کے مقابلہ میں صف بندی کرو اور اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دو۔ سعید ابن قیس ہمدانی نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم بسر و چشم حاضر ہیں میں اور میرا قبیلہ آپ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرے گا۔ ہم حدودِ مملکت کے اندر رہ کر بھی اور حدودِ مملکت سے باہر نکل کر بھی دشمن سے ٹکرائیں گے اور جان پر کھیل کر ضلالت و گمراہی کے بتوں کو پاش پاش کر دیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے تم نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے۔ پھر زیاد ابن خصفہ نے اسی قسم کے الفاظ کہہ کر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ امیرالمومنین نے اہلِ کوفہ کے ایک اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اہلِ کوفہ میں شامیوں سے لڑنے کے لئے لشکر ترتیب دے رہا ہوں تم میں سے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے وہ لشکر میں شامل ہو جائے۔ اہلِ کوفہ تلواروں کو صیقل اور ہتھیاروں کو درست کر کے جوق در جوق اٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ حضرت نے دس ہزار کی سپاہ پر اپنے فرزند امام حسین کو اور دس ہزار کی فوج پر قیس ابن سعد کو اور دس ہزار کے لشکر پر ابو ایوب انصاری کو افسر مقرر کیا اور اسی طرح مختلف دستوں پر مختلف افسروں کو نامزد کیا۔ آپ اس لشکر کو لے کر ایک ہفتہ کے بعد صفین کی طرف حرکت کرنا چاہتے تھے کہ ایک خارجی ابن ملجم مرادی نے آپ کے سرِ اقدس پر ضرب لگا کر آپ کو شہید کر دیا۔ اس سانحہٴ عظمیٰ کے رونما ہونے سے حالات دگرگوں ہو گئے افواج و عساکر کا شیرازہ درہم و برہم ہو گیا اور ایک استبدادی حکومت کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس سانحہ کے دور رس نتائج پر نظر کرنے کے بعد ایک دردِ دل رکھنے والا انسان اشک بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عین اس وقت جب کہ طاغوتی طاقت کو کچلنے کا سر و سامان ہو چکا تھا ایک شقی ازلی کی تلوار اس کے آگے دیوار کھڑی کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں اس تاریک دور کا آغاز ہوا جو قہر و استبداد اور ظلم و استبداد کا مثالیہ ہے جس میں اسلام کے خد و خال مسخ ہوئے دین کی قدریں ختم ہوئیں اور روحِ حریت پژمردہ ہو کر رہ گئی۔

ادھر جاریہ ابن قدامہ بصرہ سے لشکر لے کر یمن میں آئے۔ جب عثمانیوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف نکل گئے مگر جاریہ کے لشکر نے ان کا پیچھا کر کے انہیں گھیرے میں لے لیا اور

ان میں سے چند آدمیوں کو تہِ تیغ کر دیا۔ جاریہ نے بسر کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بنی تمیم کی بستیوں کی طرف چلا گیا ہے۔ جاریہ نے اس کا تعاقب کیا۔ ظالم و خونخوار بزدل تو ہوتا ہی ہے۔ اسے عراقی لشکر کے تعاقب کا پتہ چلا تو وہ یمامہ کی طرف نکل گیا۔ اور پھر وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا اور کبھی کسی سمت نکل جاتا اور کبھی کسی سمت۔ لوگ اس کی خونخواریوں سے واقف تو ہو ہی چکے تھے جدھر سے گزرتا لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے اور بنی تمیم نے تو اس کا تھوڑا بہت مال و اسباب بھی لوٹ لیا۔ جاریہ تعاقب کرتے ہوئے مقام حرس میں پہنچے تو خستہ و درماندہ لشکر نے تقریباً ایک مہینہ یہاں قیام کیا اور پھر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مکہ پہنچ کر جاریہ نے اہل مکہ سے پوچھا کہ کیا تم نے معاویہ کی بیعت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیعت کی تو تھی مگر اس صورت میں جب بیعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہا کہ اب بیعت کرو۔ کہا کس کی بیعت کریں۔ امیر المومنین تو دنیا سے چل بسے۔ کہا کہ پھر اصحاب علی نے جس کی بیعت کی ہے تم بھی اس کی بیعت کرو۔ چنانچہ اہل مکہ نے امام حسن کی بیعت کی اور جاریہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں ابوہریرہ امامت نماز کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ جب اس نے جاریہ کی آمد کی خبر سنی تو روپوش ہو گیا۔ جاریہ نے اس کے بھاگ نکلنے کی اطلاع ہوئی تو کہا:-

واللہ لو اخذت ابا سنور لضربت عنقه (تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۱۰۷)

خدا کی قسم اگر ابوہریرہ میرے ہاتھ لگ جاتا تو اس کی گردن اڑا دیتا۔

پھر اہل مدینہ سے کہا کہ وہ امام حسنؑ کی بیعت کریں۔ تمام لوگوں نے بیعت کی اور جاریہ لشکر سمیت کوفہ کی طرف سے روانہ ہو گئے۔ بسر بھی جان بچا کر شام پہنچ گیا اور اپنے سیاہ کارناموں پر معاویہ سے داد طلب ہوا۔

معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنی مملکت کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے امیر المومنین کے مقبوضہ شہروں پر پیہم تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری کیا اور ضحاک فہری و بسر ابن ابی ارطاۃ ایسے درندہ صفت انسانوں کی قیادت میں شامیوں کے غول بھیج کر امن عامہ کو تباہ کیا گھروں کو پھونکا بستیوں کو لوٹا بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور لوگوں سے زبردستی بیعت لی۔ اگرچہ یہ سب کچھ قصاص خون عثمان کی آڑ میں کیا جا رہا تھا مگر حقیقتہً یہ جارحانہ اقدامات ہوس ملک گیری کا نتیجہ تھے جنہیں قصاص سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسی توسیع مملکت کے لئے عمارتوں کو کھنڈر بستیوں کو ویران اور بچوں کو تہِ تیغ کیا گیا۔ سرزمین حرم اور دار الہجرۃ مدینہ کی حرمت و عظمت کو نظر انداز کر کے فضا میں خوف و ہراس پھیلایا گیا۔ حالانکہ مکہ وہ مقام امن ہے جہاں نہ خوف و ہراس پھیلانے کا جواز ہے اور نہ قتل و خونریزی

کا یہاں تک کہ پیغمبر اکرم نے فتح مکہ کے موقع پر امن عام کا حکم دے کر خون کے پیاسوں تک کو معاف کر دیا اور اس سلسلہ میں فرمایا :-

لا یحل لامرء یومن باللہ و الیوم الاخر ان یسفك بھا دما ولا یعضد بھا شجرۃ۔
(صحیح بخاری ۔ ج ۳ ص ۱۶۷)

جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مکہ میں خون بہائے اور درخت کاٹے ۔

اسی طرح مدینہ بھی حرم ہے اور اہل مدینہ کو خوف زدہ کرنا ان میں خوف و دہشت پھیلانا جرم اور انتہائی سنگین جرم ہے اور پیغمبر اکرم نے مدینہ میں دہشت و ہراس پھیلانے اور وہاں کے باشندوں کو خوف زدہ کرنے والوں پر لعنت کی ہے ۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے :-

من اخاف اھل المدینۃ ظلما اخافہ اللہ وعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین لا یقبل اللہ منہ صرفا ولا عدلا۔
(وفاءالوفاء ۔ ج ۱ ص ۳۲)

جو شخص از روئے ظلم اہل مدینہ کو خوف زدہ کرے اللہ اسے خوف و ہراس میں مبتلا کرے گا اور اس پر اللہ کی اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو اور خدا ایسے شخص کے نہ کسی فریضہ کو قبول کرے گا اور نہ کسی نافلہ کو ۔

شہادت

سنہ ۴۰ھ میں جنگ نہروان کے چند بچے کھچے خوارج نے مکہ میں اجتماع کیا اور نہروان کے کشتوں پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے بھائی بندوں کے خون کی ذمہ داری علی معاویہ اور عمرو ابن عاص پر عائد ہوتی ہے لہذا ان تینوں کو قتل کر کے ہمیں اپنے کشتوں کا انتقام لینا چاہیئے ۔ ان خوارج کی رگوں میں انتقامی خون تو کھول ہی رہا تھا سب نے اس پر اتفاق کیا اور برک ابن عبداللہ صریمی نے معاویہ کو عمرو ابن بکر تمیمی نے عمرو ابن عاص کو اور عبدالرحمٰن ابن ملجم نے حضرت علی کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور یہ طے کیا کہ ایک ہی دن اور ایک ہی وقت حملہ ہونا چاہیئے تاکہ ان میں سے ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہونے پائے ورنہ ایک کے قتل کی خبر دوسروں کو چوکنا و ہوشیار کر دے گی اور وہ حفاظتی تدابیر عمل میں لا کر اس تجویز کو ناکام بنا دیں گے ۔ چنانچہ دن اور وقت کی تعیین کر کے برک ابن عبداللہ دمشق کی

طرف، عمرو ابن بکر مصر کی طرف اور عبدالرحمٰن ابن ملجم کوفہ کی طرف چل دیا۔

اس خطرناک کام کے لئے ماہِ رمضان کی انیسویں شب اور نمازِ صبح کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ برک ابن عبداللہ مقررہ تاریخ پر جامع دمشق آیا اور جب صبح کی جماعت کھڑی ہوئی تو وہ پہلی صف میں معاویہ کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ جب معاویہ رکوع کے لئے جھکے تو اس نے تلوار کا وار کیا جو اُن کے عقبی حصّہ پر پڑا گھاؤ معمولی تھا چند دنوں میں بھر گیا اور حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا۔ عمرو ابن بکر انیسویں شب کو جامع مصر میں آکر ٹھہرا تا کہ صبح کی نماز میں ابن عاص کو قتل کرے مگر اتفاق ایسا ہوا کہ عمرو ابن عاص قولنج کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا اور اس نے اپنی جگہ خارجہ ابن حذافہ سہمی کو نماز پڑھانے کے لئے بھیج دیا عمرو ابن بکر اندھیرے میں پہچان نہ سکا اور اس نے خارجہ کو عمرو ابن عاص سمجھ کر قتل کر دیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور جکڑ باندھ کر عمرو ابن عاص کے پاس لائے۔ جب اسے معلوم ہُوا کہ ابن عاص کے بجائے خارجہ اس کے ہاتھ سے قتل ہُوا ہے تو اسے اپنی ناکامی پر افسوس ہُوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا جو ہونا تھا وُہ ہو چکا تھا۔ عمرو ابن عاص نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا مگر تیرِ قضا کا رُخ خارجہ کی طرف مڑ گیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر خارجہ کے خون کے عوض اسے قتل کر دیا گیا۔

عبدالرحمٰن ابن ملجم آخر ماہِ شعبان میں کوفہ آیا اور محلہ بنی کندہ میں خوارج کے ہاں قیام کیا مگر کسی کو اپنے خطرناک ارادہ سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ اپنے طرزِ عمل سے اپنے موقف کو مشکوک ہونے دیا۔ اس اثنائ میں اس کی ملاقات ایک خارجیہ عورت قطام بنت اخضر تیمیہ سے ہوئی وُہ اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وُہ بے شوہر کے ہے تو اس سے نکاح کی خواہش کی۔ قطام کا باپ اور بھائی جنگ نہروان میں مارے گئے تھے اور وُہ حضرت علی سے انتقام لینا چاہتی تھی مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس خواستگاری سے اس کے دل میں انتقام کی افسردہ آگ پھر سے بھڑک اٹھی اور اسے کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں راضی ہوں مگر میرا مہر تین ہزار درہم ایک غلام ایک کنیز اور علی ابن ابی طالب کا قتل ہے۔ ابن ملجم اس جرم کے ارتکاب پر تلا ہوا تھا ایک تو وہ اسی مقصد سے آیا تھا اور دوسرے اس مقصد کے پیچھے ایک اور قوی محرک کار فرما ہو چکا تھا مگر بظاہر اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ علی کو قتل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ قطام نے کہا کہ تم اچانک حملہ کر کے ان کا کام تمام کر سکتے ہو اگر تم کامیاب ہو گئے تو بہتر ورنہ وہ ثواب آخرت تو کہیں نہیں گیا جس کے تم بہر حال مستحق ہو گے۔ ابن ملجم نے جب دیکھا کہ قطام اس کے خیالات و نظریات سے پوری

طرح ہم آہنگ ہے تو کہا کہ میں اسی ارادہ سے یہاں آیا ہوں اور علی کو قتل کر کے نہروان کے کشتوں کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ قطام نے کہا کہ پھر ہمت و جرأت سے کام لو اور میں اپنے قبیلہ کے قابلِ اعتماد لوگوں سے کہوں گی کہ وہ اس سلسلہ میں تمہاری مدد کریں۔ چنانچہ اس نے وردان ابن مجاہد کو اس کی مدد کے لئے آمادہ کیا اور ابن ملجم نے شبیب ابن بجرہ اشجعی کو اپنا معاون اور اشعث ابن قیس کو اپنا ہمراز بنا لیا اور حملہ کے لئے دن اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

امیرالمومنین اس ماہِ رمضان میں باری باری اپنی اولاد اور عبداللہ ابن جعفر کے ہاں روزہ افطار فرماتے غذا بہت کم ہو چکی تھی لقموں پر اکتفا کرتے اور پوچھا جاتا تو فرماتے:۔

احب ان یاتینی امر اللہ و انا خمیص۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۹۵)

میں چاہتا ہوں کہ جب میری موت آئے تو میں خالی شکم ہوں۔"

انیسویں شب کو حضرت اپنی دختر جناب ام کلثوم کے ہاں تشریف فرما تھے انہوں نے جو کی دو روٹیاں ایک پیالہ دودھ کا اور ایک طشتری میں نمک رکھ کر پیش کیا۔ آپ نے اس کھانے کو دیکھا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کی پیروی میں کبھی گوارا نہیں کیا کہ ایک وقت میں دسترخوان پر دو قسم کی چیزیں ہوں۔ اے بیٹی دنیا کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عقاب۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا باپ دیر تک موقف حساب میں کھڑا رہے۔ ان دو چیزوں میں سے ایک چیز اٹھا لو جناب ام کلثوم نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اور آپ نے چند لقمے نمک کے ساتھ تناول فرمائے۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول مصلائے عبادت پر کھڑے ہو گئے مگر آج بار بار صحن میں نکلتے آسمان پر نظر کرتے اور ڈوبتے اور جھلملاتے ستاروں کو دیکھتے اور فرماتے:۔

واللہ ما کذبت ولا کذبت و انہا اللیلۃ التی وعدت بہا۔ (صواعق محرقہ ص ۱۳۴)

خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا اور نہ مجھے غلط بتایا گیا ہے یہی وہ رات ہے جس کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

آپ کرب و اضطراب کی حالت میں کبھی سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے کبھی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور کبھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھتے اور کبھی کہتے اللھم بارک لی فی الموت۔ خدایا موت کو میرے لئے با برکت قرار دے۔" ام کلثوم نے یہ کیفیت دیکھی تو عرض کیا کہ بابا آج آپ اتنے پریشاں حال کیوں ہیں فرمایا کہ بیٹی آخرت کی منزل درپیش ہے اور میں اللہ کی بارگاہ میں جانے والا ہوں۔ ام کلثوم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ بابا آج آپ مسجد میں تشریف نہ لے جائیں جعدہ ابن ہبیرہ

موجود ہیں انہیں حکم دیجئے کہ وہ نماز پڑھا دیں۔ فرمایا لامفر من قضاء اللہ قضائے الٰہی سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔" ابھی کچھ رات باقی تھی کہ ابن تیاج مؤذن نے حاضر ہو کر نماز کے لئے عرض کیا۔ حضرت مسجد کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب صحن خانہ میں آئے تو گھر میں پلی ہوئی بطوں نے پر پھڑ پھڑائے اور چیخنے چلانے لگیں۔ کسی نے ان بطوں کو ہٹانا چاہا تو فرمایا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ابھی کچھ دیر کے بعد نوحہ و بکا اور نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوں گی۔ امام حسنؑ یا ام کلثوم نے عرض کیا کہ بابا آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں فرمایا کلمہ حق تھا جو میری زبان پر جاری ہو گیا ہے۔ پھر حضرت نے ام کلثوم سے فرمایا کہ بیٹی یہ بے زبان جانور ہیں ان کے آب و دانہ کا خیال رکھنا اور اگر ایسا نہ کر سکو تو انہیں رہا کر دینا تاکہ یہ زمین میں چل پھر کر اپنا پیٹ پال سکیں۔ جب دروازہ کے قریب پہنچے تو پٹکا کمر میں کس کر باندھا اور احیحہ انصاری کے یہ دو شعر پڑھے ؎

اشدد حیازیمک للموت فان الموت لاقیکا

"موت کے لئے کمر کس لو کہ موت تمہارے سامنے آنے والی ہے۔"

ولا تجزع من الموت اذا حل بوادیکا

"جب موت تمہارے ہاں ڈیرے ڈالے تو اس پر بے تابی کا مظاہرہ نہ کرو۔"

اُم کلثوم نے آنسو بہاتے ہوئے باپ کو الوداع کہا۔ امام حسنؑ نے چاہا کہ مسجد تک حضرت کے ہمرکاب جائیں مگر آپ نے منع کر دیا۔ جب مسجد میں تشریف لائے تو مسجد تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی آپ نے اندھیرے میں چند رکعات نماز پڑھی اور تعقیبات سے فارغ ہوئے تو خونریز سحر نمودار ہو چکی تھی آپ گلدستہ اذان پر تشریف لے گئے اور صبح کی اذان دی یہ آپ کی آخری اذان تھی جو مسجد سے بلند ہوئی اور کوفہ کے ہر گھر میں سنی گئی۔ اذان کے بعد الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہہ کر لوگوں کو نماز صبح کے لئے بیدار کرنے لگے انہی لوگوں میں ابن ملجم بھی تھا۔ آپ نے اُسے اوندھا لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ شیطان کے سونے کا انداز ہے۔ داہنی کروٹ سو جو مومنین کا شعار ہے یا بائیں کروٹ لیٹ جو حکماء کا طریقہ ہے یا پیٹھ کے بل سو جو انبیاء کا طرزِ عمل ہے۔ اٹھ نماز پڑھ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تو کس ارادہ سے آیا ہے اور کیا چیز زیر دامن چھپائے ہوئے ہے۔

حضرت لوگوں کو بیدار کرنے کے بعد محراب عبادت میں کھڑے ہو گئے اور جب نافلۂ صبح کی پہلی رکعت کے سجدہ سے سر اٹھایا تو شبیب ابن بجرہ نے تلوار سے حملہ کیا مگر تلوار ستون مسجد سے ٹکرائی اور اس کا وار ناکام رہا۔ پھر ابن ملجم نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سر پر ماری جس سے فرق مبارک شگافتہ ہو گیا آپ نے بیساختہ فرمایا

بسم اللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ فزت ورب الکعبۃ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا ہوں" لوگو مجھے یہودیہ کے بیٹے ابن ملجم نے قتل کرڈالا ہے۔ امام بمنزلۂ روح کائنات اور جانِ عالم ہوتا ہے۔ جب جان پر بنتی ہے تو اعضا متاثر و مضمحل ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ اس موقع پر آسمان کانپا زمین لرزی مسجد کے دروازے آپس میں ٹکرائے اور زمین و آسمان کے درمیان یہ آواز گونجی تھدمت واللہ ارکان الھدیٰ قتل ابن عم المصطفیٰ قتل الوصی المجتبیٰ قتل علی المرتضیٰ۔ خدا کی قسم رکن ہدایت گر گئے ابنِ عم رسول قتل کر دیئے گئے وصی پیغمبر مارے گئے علی مرتضیٰ شہید کر دیئے گئے" اس آواز نے کوفہ کی آبادی کو لرزا دیا تمام شہر کانپ اٹھا لوگ جوق در جوق گھروں سے باہر نکل آئے۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سراسیمہ و پریشان حال مسجد کی طرف دوڑے جہاں لوگ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ امیرالمومنین شہید کر دیئے گئے۔ فرزندانِ رسول نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ محراب مسجد لہو سے تر ہے اور حضرت خاک و خون میں پڑے لوٹ رہے ہیں اور مٹی اٹھا اٹھا کر فرق مبارک پر ڈالتے اور اس آیت کی تلاوت فرماتے جاتے ہیں :۔

منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم — ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور زمین کی طرف
ومنھا نخرجکم تارۃ اخریٰ۔ — پلٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ نکالیں گے"

امیرالمومنین کے چہرہ و سر کو خون میں رنگین دیکھ کر امام حسن نے گلوگیر آواز میں کہا کہ بابا آپ کا خون کس نے بہایا ہے۔ حضرت نے سر اٹھا کر حسن کو دیکھا اور فرمایا بیٹا پہلے نماز ادا کرو۔ چنانچہ امام حسنؑ نے نماز پڑھائی اور خود حضرت نے بیٹھ کر نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت کو محراب مسجد سے صحن میں لایا گیا۔ اس متوحش خبر کو سن کر لوگ سمٹ کر مسجد میں جمع ہو چکے تھے ہر چشم اشکبار اور ہر دل غم سے فگار تھا۔ امام حسنؑ نے قاتل کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا مجھے ابن ملجم مرادی نے قتل کیا ہے اور باب کندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی اس دروازہ سے اسے لایا جاتا ہے۔ اتنے میں باب کندہ کی طرف سے شور اُٹھا اور ابن ملجم گرفتار کر کے لایا گیا۔ مجمع غم و غصہ سے بے قابو ہو رہا تھا آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور ہر شخص اس پر لعنت بھیج رہا تھا۔ جب اُسے امام حسنؑ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے کہا کہ اے بدبخت و لعین تو نے امیرالمومنین کو قتل کر دیا ہے کیا یہ ان احسانات کا بدلہ ہے جو انہوں نے ہمیشہ تم پر کئے۔ ابن ملجم سر جھکائے خاموش کھڑا رہا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔ امیرالمومنین نے غشی سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور فرمایا کہ اے ابن ملجم کیا میں تیرا اچھا امام نہ تھا اور کیا میرے احسانات بھلا دیئے جانے کے قابل تھے۔ اس پر ابن ملجم نے کہا :۔ افانت تنقذ من فی النار"

کیا آپ اسے چھڑائیں گے جو دوزخ کا سامان کر چکا ہو۔ اس کے بعد آپ نے امام حسن کی طرف رُخ کیا اور فرمایا کہ اے فرزند اگر میں بچ رہا تو مجھے اختیار ہوگا کہ اسے سزا دوں یا معاف کر دوں۔ اور اگر اس ضربت کے نتیجہ میں چل بسا تو تم اسے قصاصاً قتل کر دینا اور ایک ضربت کے بدلے ایک ضربت لگانا اور اور قتل کے بعد اس کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا کیونکہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے ایاکم والمثلۃ ولو بالکلب العقور۔ خبردار کسی کو مثلہ نہ کرنا اگرچہ کاٹنے والا کتا کیوں نہ ہو" اور اس کے ایام اسیری میں جو خود کھانا وہ اسے کھانے کے لئے دینا اور جو خود پینا وہ اسے پینے کے لئے دینا۔

اب لوگ حضرت کو ہاتھوں پر اٹھا کر گھر میں لائے گھر کے باہر کہرام بپا تھا امام حسنؑ گریہ وزاری کی آوازیں سُن کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ اے لوگو امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ تم اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں کہ لوگ منتشر ہو گئے مگر میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں حضرت کو دیکھے بغیر واپس جاؤں وہیں پر کھڑا رہا اور جب امام حسن دوبارہ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا کہ فرزندِ رسولؐ میں امیرالمومنین کو دیکھے بغیر جانا نہیں چاہتا مجھے ایک نظر دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ امام حسنؑ اندر تشریف لیگئے اور کچھ دیر کے بعد باہر نکلے اور مجھے اپنے ہمراہ اندر لے گئے میں نے دیکھا کہ حضرت کے سر پہ زرد رنگ کی پٹی بندھی ہوئی اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ میں پٹی اور چہرے کی رنگت میں تمیز نہ کر سکا اور بے ساختہ رونے لگا۔ حضرت نے مجھے روتے دیکھا تو فرمایا کہ اے اصبغ روؤ نہیں میں جنت کی طرف جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے معلوم ہے کہ آپ جنت میں جائیں گے مگر میں تو آپ کی مفارقت پر روتا ہوں اب ہمارا کون پُرسانِ حال ہوگا اور یتیموں اور بیواؤں کی کون دستگیری کرے گا یہ کہہ کر اصبغ اُٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت پر نقاہت طاری ہو گئی اور غشی کے دورے پڑنے لگے کبھی ہوش میں آجاتے اور کبھی بے ہوش ہو جاتے۔ امام حسنؑ نے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا آپ نے کچھ پیا اور فرمایا کہ ابن ملجم کو بھی دودھ کا شربت دیا جائے۔ اس عرصہ میں کوفہ کے طبیب جمع ہو گئے۔ ان میں مشہور جراح اور ماہر طبیب اثیر ابن عمرو سکونی بھی تھا اس نے زخم کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ اس کاری ضرب سے جانبر ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ زہر آلود تلوار سے مغزِ سر بھی متاثر ہوا ہے اور جسم میں بھی زہر پھیل چکا ہے۔ یہ سن کر سب کو حضرت کی زندگی سے نا اُمیدی ہو گئی۔ سینوں میں دل بیٹھنے لگے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت نے انیسویں اور بیسویں رات انتہائی کرب و تکلیف میں گزاری اور جب اکیسویں رات کا دو تہائی حصہ گزرا تو حالت دگرگوں ہو گئی۔ پیشانی پر موت کا پسینہ آیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر جان، جان آفرین کے سپرد کر دی اور روح طیب عالم قدس کی طرف پرواز کر گئی۔ تقوی و راستبازی کا

چراغ گل ہو گیا علم وعمل کا آفتاب گہنا گیا دُنیا تیرہ وتار ہو گئی۔ افسوس جس کی زیست کا ہر لمحہ حق کی نصرت اور باطل کے خلاف جہاد میں گزرا ایک شقی ازلی کی تلوار سے مجروح ہو کر دُنیا سے چل بسا اور جس کی زندگی کی راتیں محراب عبادت میں جاگ کر گزریں لحد کا گوشہ آباد کرنے کیلئے ابدی نیند سو گیا۔

قتل ایک جرم ہے مگر قتل کی نوعیت مقتول کی حیثیت اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج واثرات کے اعتبار سے اس کی سنگینی اور سزا کے درجوں میں فرق ہو سکتا ہے۔ ایک عام فرد کا قتل جرم اور بڑا جرم ہے مگر قتل مومن اس سے بھی بڑھ کر جرم ہے۔ جس کی سزا نص قرآن کی رُو سے دوزخ کا دائمی عذاب ہے اور امیرالمومنین کا قتل تو ہر اعتبار سے سنگین جرم اور عظیم حادثہ تھا جس نے دینی حدوں کو پامال اور اسلامی قدروں کو مجروح کر دیا اس لحاظ سے قاتل دنیا وآخرت میں شدید ترین عذاب کا مستحق ہو گا۔ یہ ایک عابد شب زندہ دار کا قتل تھا جو محراب مسجد میں اور سجدہ کی حالت میں واقع ہُوا۔ قاتل نے نہ مسجد کی تقدیس کا خیال کیا نہ نماز کا احترام ملحوظ رکھا نہ سجدہ کی حالت پر نظر کی اور اس نمازی کا خون بہایا جو اسلام کا پاسبان ثانی قرآن اور سراپا ایمان تھا۔ اس سانحہ کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ حادثہ اس وقت رونما ہوا جب حضرت لشکر وسپاہ جمع کر چکے تھے اور دو چار دن کے بعد شام کی طرف کوچ کرنے والے تھے تاکہ ایک فیصلہ کن جنگ لڑ کر ضلالت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں مگر ایسا نہ ہو سکا اور اس قتل کے نتیجہ میں غیر شرعی اقتدار کے قدم گڑ گئے اور افق اسلام پر ضلالت وگمراہی کی گھٹائیں چھا گئیں۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کی تہ میں کوئی سازش کارفرما ہو۔ اگر ایک باجگزار کے ذریعہ مالک اشتر کو اور جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ امام حسنؑ کو زہر دے کر راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے تو امیرالمومنین کی زندگی ختم کرنیکا منصوبہ بھی بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہ اقدام کسی خاص تحریک کا نتیجہ ہو یا انتقامی جذبہ کا قاتل کی شقاوت ومحسن کشی تاریخ کا ایک مثالیہ ہے اور پیغمبر اکرم نے بھی اپنے ارشادات میں حضرت کے قاتل کو شقی ترین امت اور عاقر ناقۂ صالح کے مانند قرار دیا ہے۔ چنانچہ جابر ابن سمرہ کہتے ہیں:۔

قال رسول الله لعلی من اشقی الاولین قال عاقر الناقة قال فمن اشقی الآخرین قال الله ورسوله اعلم قال قاتلك۔

(تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۱ ص ۱۳۵)

"رسول اللہ نے حضرت علی سے کہا کہ پہلے لوگوں میں شقی ترین مردم کون ہے کہا اونٹنی کو پے کرنے والا۔ فرمایا بعد والوں میں زیادہ شقی کون ہے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے فرمایا، وہ تمہارا قاتل ہے۔"

ناقۂ صالح حضرت صالح کا معجزہ تھا اور علی ابن ابی طالب پیغمبر اسلام کا معجزہ تھے۔

"یکے از معجزات او، علی بود"

اگر ناقۂ صالح کا پے کرنے والا جہنم کا مستحق قرار پا چکا ہے تو حضرت علی کا قاتل دوزخ کے عذاب سے کیونکر بچ سکتا ہے جب کہ دونوں نے یکساں نبوت کے معجزہ کو ختم کیا اور آیتِ الٰہیہ کو مٹایا اس کے بعد ابنِ حزم وغیرہ کی اس رائے کو کوئی وزن نہیں دیا جا سکتا کہ یہ قتل خطائے اجتہادی کا نتیجہ تھا اور نہ اس طرح جرم کی سنگینی کو ہلکا کر کے قاتل کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

تجہیز و تکفین

اکیسویں رات کے چند لمحے باقی ہیں چاند کی پھیکی پھیکی روشنی فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ستارے تھرتھرا رہے ہیں اور کاشانۂ امامت میں خاموشی چھائی ہوئی ہے ایک طرف اعزہ کا مجمع ہے اور ایک جانب چند اصحاب حسرت و اندوہ کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ اور آنسوؤں اور آہوں میں غسل و کفن کا سر و سامان کیا جا رہا ہے۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام نے غسل دیا اس طرح کہ امام حسینؑ پانی ڈالتے تھے اور امام حسنؑ غسل دیتے تھے اور ایک روایت کی بنا پر محمد ابن حنفیہ پانی ڈالتے تھے اور حسنین علیہما السلام غسل دیتے جاتے تھے۔ غسل کے بعد اس کافور سے جو پیغمبر اکرم کے غسل سے بچ رہا تھا حنوط کیا گیا۔ غسل و حنوط کے بعد سفید پارچوں کا کفن دیا گیا اور امیر المومنین کے حسب وصیت فرزندانِ امیر المومنین نے راتوں رات جنازہ اٹھایا اور دفن کے لئے کوفہ کی غربی جانب حیرہ کی طرف چل دیئے۔ جب حیرہ کے قریب سرزمین نجف پہنچے تو جنازہ زمین پر رکھ دیا اور امام حسنؑ نے سات تکبیروں یا پانچ تکبیروں کے ساتھ نماز جنازہ با جماعت ادا کی۔ دینوری نے تحریر کیا ہے:۔

دفن علی رضی اللہ عنہ وصلی علیہ الحسن وکبر خمسا۔

"علی رضی اللہ عنہ مدفون ہوئے اور حسنؑ نے نماز جنازہ پڑھی اور پانچ تکبیریں کہیں۔"

(اخبار الطوال - ص ۲۱۶)

نماز جنازہ کے بعد سفید پہاڑیوں کے درمیان ایک مقام سے مٹی ہٹائی تو قبر اور لحد تیار ملی۔ حسنین علیہما السلام محمد ابن حنفیہ اور عبد اللہ ابن جعفر قبر میں اترے اور نعش اقدس کو لحد میں اتارا اور لحد کو اینٹوں سے بند کر کے مٹی ڈالی اور قبر زمین کے برابر کر دی۔

صلی الالہ علی جسم تضمنہ ۔۔۔ قبر فاصبح فیہ العدل مدفونا

نجف کے ریگزار میں نعش اطہر کو خاموشی کے ساتھ سپرد لحد کر دیا گیا اور لوگوں کو دفن کا علم اس وقت ہوا جب حسنین علیہما السلام اور دوسرے اعزہ و اصحاب پلٹ کر کوفہ واپس آئے۔ اب عوام میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔ کسی نے کہا کہ آپ دارالامارہ میں دفن کئے گئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ مسجد کوفہ میں کسی نے کہا کہ رحبۂ کوفہ میں اور کسی نے کہا کہ بغداد کے محلہ کرخ میں مگر قبر کے محل وقوع کا صحیح علم امیرالمومنین کی اولاد اور ان مخصوص اصحاب کے علاوہ جو شریک جنازہ تھے کسی کو نہ تھا۔ قبر کے مخفی رکھنے میں یہ مصلحت کار فرما تھی کہ خوارج اور اموی حکمران اس وحشیانہ طرز عمل کا اعادہ نہ کر سکیں۔ جس کا مظاہرہ اُحد میں شہداء کے اعضاء و جوارح کاٹنے کی صورت میں ہو چکا تھا۔ جب اموی دور ختم ہو گیا اور وقتی طور پر فضا پُر سکون ہوئی تو ابوالعباس السفاح کے دور میں امام جعفر صادق عراق میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے اصحاب میں سے ابوبصیر، عبداللہ ابن طلحہ، معلی ابن خنیس، یونس ابن ظبیان اور زرارہ وغیرہ کو قبر کے محل وقوع سے مطلع کیا جسکے بعد خواص شیعہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

امام جعفر صادق اور دوسرے آئمہ اہلبیت کے اتفاق اور فرقۂ امامیہ کے اجماع کے بعد یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ امیرالمومنین کا مدفن نجف اشرف میں ہے جو سلطنت عباسیہ کے اوائل سے لے کر اب تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے اور علمائے اہلسنت نے بھی اپنی کتابوں میں واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں :۔

والاصح ان قبره هو الموضع الذی یزار و یتبرك به۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ صہ ۱۹۹)	صحیح تر قول یہی ہے کہ آپ کی قبر وہی ہے جس کی زیارت کی جاتی ہے اور برکت کے حصول کا ذریعہ ہے۔"

ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے کہ ابوالغنائم محمد ابن علی متوفی ۵۱۰ھ کہا کرتے تھے کہ :۔

مات بالكوفة ثلثمائة صحابی لیس قبر احد منهم معروفا الا قبر امیر المومنین و هو هذا القبر الذی یزوره الناس الآن۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲ صہ ۴۵)	کوفہ میں تین سو صحابیوں نے وفات پائی۔ مگر امیرالمومنین کی قبر کے علاوہ کسی کی قبر کا پتہ نہیں ہے اور حضرت کی قبر وہی ہے جس کی لوگ اب زیارت کرتے ہیں۔"

چند تاثرات

امیرالمومنین کی شہادت عالم اسلام کا ایک عظیم سانحہ تھی جس نے ہر اُس فرد کو جو انسانی اقدار سے آشنا تھا متاثر کیا خصوصاً کوفہ میں جہاں یہ روح فرسا المیہ رونما ہوا ہر شخص غمگین وافسردہ خاطر تھا حضرت کے عزیز واقارب کی نظروں میں تو دُنیا تاریک ہو ہی چکی تھی دوستوں کے ولولے بھی سرد پڑ گئے اور غم ورنج نے ان کا ذہنی سکون تہ وبالا کر دیا بلکہ دشمن بھی حضرت کی شخصیت اور کردار کی بلندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اُن کی زبانوں پر ایسے کلمات آ گئے ہیں جن سے آپ کی عظمت کا واضح اعتراف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند تاثرات درج کئے جاتے ہیں جنہیں صفحاتِ تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے:۔

لقد قتلتم الليلة رجلا فی لیلۃ فیھا نزل القرآن وفیھا رفع عیسیٰ وفیھا قتل یوشع ابن نون واللہ ماسبقہ احد کان قبلہ ولا یدرکہ احد یکون بعدہ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۰۱)

"تم نے ایک بزرگ کو اس رات میں قتل کیا جس میں قرآن نازل ہوا، عیسیٰ آسمان پر اٹھائے گئے اور یوشع ابن نون قتل ہوئے۔ خدا کی قسم اگلے لوگوں میں سے کوئی ان پر سبقت نہ لے سکا اور بعد والوں میں سے کوئی ان کے مرتبہ ومقام کو نہ پا سکے گا"

عبداللہ ابن عباس نے کہا:۔

واللہ لقد کانت الدنیا اھون علیہ من شسع نعلہ لیث فی الوغا بحر فی المجالس حکیم فی الحکماء ھیھات قد مضی الی الدرجات العلی۔

"خدا کی قسم دنیا ان کی نظروں میں جوتی کے تسمے سے بھی زیادہ بے ارزش تھی وہ رزم میں شیر بزم میں دریا اور صفِ حکما میں حکیم ودانا تھے۔ افسوس وہ چل بسے اور درجاتِ عالیہ پر فائز ہو گئے"

صعصعہ ابن صوحان عبدی نے قبر مطہر پر ہاتھ رکھ کر کہا:۔

اسئل اللہ ان یمن علینا باقتفاء اثرک والعمل بسیرتک والموالاۃ لاولیائک والمعاداۃ لاعدائک وان یحشرنا فی زمرۃ اولیائک فقد نلت مالم ینلہ احد وادرکت مالم یدرکہ احد۔ (بحارالانوار)

"میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ ہم پر یہ احسان فرمائے کہ ہم آپ کے نقش قدم پر چلیں آپ کی سیرت پر عمل کریں آپ کے دوستوں سے دوستی اور آپ کے دشمنوں سے دشمنی رکھیں اور اللہ ہمیں آپ کے دوستوں کی جماعت میں محشور کرے۔ جو مرتبہ آپ نے پایا وہ کوئی پا نہ سکا اور جو مقام آپ نے حاصل کیا وہ کوئی حاصل نہ کر سکا"

معاویہ نے حضرت کی خبر شہادت سن کر کہا :۔

ذھب الفقھہ والعلم بموت ابن ابی طالب۔ (استیعاب ج ۳ صہ ۴۵)	ابن ابی طالب کی موت سے فقہ و علم کا خاتمہ ہو گیا۔"

حضرت عائشہ نے خبر شہادت سنی تو کہا :۔

لتصنع العرب ماشاءت فلیس لھا احد ینھاھا۔ (ریاض النضرہ صہ ۳۳)	اب اہل عرب جو چاہیں کریں اب کوئی نہیں ہے جو انہیں روکے ٹوکے۔"

ابنِ ملجم اور اس کے ساتھیوں کا انجام

امیرالمومنین کے قتل میں چار افراد عبدالرحمٰن ابن ملجم، قطام بنت اخضر، شبیب ابن بجرہ اور وردان ابن مجالد شریک تھے۔ جب حادثہ، قتل کے بعد مسجد میں شور بلند ہوا اور لوگ محراب کی طرف بڑھے تو وردان بھاگ کر اپنے گھر میں آگیا۔ اس کے ایک عزیز کو اس کے شریک قتل ہونے کا علم ہوا تو اس نے تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ ابن ملجم حملہ کرنے کے بعد بھاگ نکلا تھا لوگوں نے اسے بھاگتے دیکھا تو اس کا پیچھا کیا۔ اس نے تعاقب کرنے والوں کو قتل کی دھمکی دی مگر قبیلہ ہمدان کا ایک شخص اور مغیرہ ابن نوفل اسے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ امیرالمومنین کے سپرد لحد کئے جانے تک اسے حراست میں رکھا گیا اور جب امام حسنؑ دفن سے فارغ ہو کر کوفہ میں آئے تو اسے طلب کیا اور اس سے کہا کہ اے دشمن خدا تم نے کس جرم کی پاداش میں امیرالمومنین کو قتل کیا ہے کیا انہوں نے تم سے کوئی برا سلوک کیا تھا۔ کہا کہ میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ انہیں قتل کروں گا۔ چنانچہ میں نے انہیں قتل کر کے اپنا عہد پورا کر دیا ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے قصاص لیں چاہے معاف کر دیں۔ اگر آپ امان دیں گے تو میں معاویہ کو قتل کر کے آپ کو ہمیشہ کے لئے مطمئن کر دوں گا۔ امام حسنؑ نے فرمایا کہ تم اسی کے سزاوار ہو کہ تمہیں کیفر وار تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ ہیثم بنت اسود نخعیہ نے کہا کہ اس کا لاشہ میرے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کا لاشہ اسے دے دیا گیا اور اس نے آگ روشن کر کے اسے جلا دیا اس کے بعد بپھرے ہوئے ہجوم نے قطام کے گھر کا رخ کیا۔ اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذرِ آتش کر دیا اور اس کا گھر بار لوٹ لیا۔

شبیب ابن بجرہ لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر بچ رہا تھا جب معاویہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد کوفہ میں آئے تو شبیب ان کے پاس آیا اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کہا کہ میں علی کو قتل کرنے میں ابن ملجم کا شریک کار تھا معاویہ نے یہ سنا تو گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے قبیلہ والوں کو پیغام بھجوایا کہ اگر میں نے پھر شبیب کو یہاں

دیکھا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ لہذا اسے کوفہ سے باہر نکال دو۔ اس نے یہ سنا تو رات کے اندھیرے میں نکل گیا اور جب مغیرہ ابن شعبہ کوفہ کا حاکم مقرر ہوا تو اس کے لشکر کے مقابلہ میں اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔

نجف کی آباد کاری

نجف کوفہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر مغرب کی سمت واقع ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں پانی کا ذخیرہ جمع تھا جو ان یانے کے نام سے موسوم تھا۔ جب پانی زمین کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا تو ان جف یانے جف کہا جانے لگا۔ یعنی ان یانے خشک ہو گیا پھر کثرت استعمال سے نجف کہلانے لگا۔ نجف سے متصل ایک قدیم آبادی تھی جو کوفہ سے تین میل کے فاصلہ پر حیرہ کے نام سے موسوم تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع ریگزار تھا جو ملطاط کہلاتا تھا۔ حیرہ کی بنیاد کلدانیوں کے فرمانروا بخت نصر نے رکھی۔ اور سکندر مقدونی نے اس کی تعمیر و تجدید میں حصہ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حیرہ کی آبادی انبار کی طرف منتقل ہو گئی اور حیرہ ویران ہو گیا۔ آبادیاں اجڑتی بستی رہتی ہیں۔ چنانچہ ویرانی کے بعد اس کی آبادی کی پھر صورت نکل آئی اور مالک ابن فہم جو یمن کے غرق آب ہونے کا خطرہ محسوس کر کے وہاں سے نکل کھڑا ہوا تھا اس نے عراق میں طرح اقامت ڈالی اور وہاں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اس کے بعد اس کا بیٹا جذیمہ ابرش برسر اقتدار آیا اور جب وہ زباء ملکہ جزیرہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھانجا عمرو ابن عدی ۲۴۰ء میں شاہ پور اول کے دور میں تخت و تاج کا وارث ہوا۔ عمرو نے زمام حکومت ہاتھوں میں لینے کے بعد حیرہ کو اپنی منزل قرار دیا جس کے بعد فرمانروایان عراق کا مستقلاً پائے تخت قرار پا گیا۔ گھنے باغوں اور نخلستانوں سے اس کی رونق بڑھی اور خورنق و سدیر ایسی فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہاں کے باشندوں کا ذریعۂ معیشت کاشتکاری و باغبانی تھا مگر ایران کے زیر اثر اور اس کی سرحد پر آباد ہونے کی وجہ سے ایرانی سرحدوں اور تجارتی قافلوں کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دیتے اور ایران سے اس کا معاوضہ لیتے اور خوشحال زندگی بسر کرتے۔ جب فتح عراق کے بعد کوفہ کی بنیاد رکھی گئی تو یہاں کی آبادی کوفہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور اس کی عمارتوں کے اینٹ پتھر بھی کوفہ کی بعض عمارتوں کے کام میں آئے اور حیرہ جو سرسبز و شاداب مقام پر تھا۔ ویران اور ریت کا میدان ہو کر رہ گیا اور جب حیرہ کے جوار میں امیرالمومنین مدفون ہوئے، تو پھر آبادی کا رُخ ادھر ہو گیا اور دوسری صدی ہجری کے وسط سے مختلف دیار و امصار کے لوگ ترک وطن کر کے یہاں آباد ہونے لگے اور یہ آبادی نجف مشہد اور غری کے نام سے یاد کی جانے لگی اور حیرہ کا نام صرف صفحات تاریخ پر باقی رہ گیا بلکہ کوفہ بھی اپنے پھیلاؤ کے باوجود اس کی ایک ملحقہ

آبادی ہو کر رہ گیا۔ غری کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جذیمہ ابرش نے نجف کے قریب اپنے دو ندیموں مالک اور عقیل کی قبروں پر دو بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ جنہیں غریین کہا جاتا تھا رفتہ رفتہ غریین کے بجائے زبانوں پر غری آنے لگا اور پھر سرزمین نجف کو قرب کی بنا پر غری کہا جانے لگا۔

جب شیعیان امیرالمومنین نے یہاں مجاورت اختیار کی تو انہوں نے مرقد امیرالمومنین کے گرد و پیش حجرے اور جھونپڑیاں تعمیر کر لیں آبادی روز بروز بڑھتی گئی اور آبادی کے ساتھ تعمیرات میں اضافہ ہوتا گیا اور جہاں خاک اڑتی تھی وہاں شہر بس گیا۔ نجف سے شام تک خشکی کی راہ تھی اور بادیہ نشین عربوں سے لوٹ مار کا خطرہ رہتا تھا اس خطرہ کے پیش نظر امرا و سلاطین شیعہ نے شہر کے گرد چار دیواری کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ سب سے پہلے عضدالدولہ فناخسرو نے ۳۶۶ھ اور ۳۷۲ھ کے درمیانی عرصہ میں مرقد امیرالمومنین کی تعمیر شروع کی تو شہر کے گرد چار دیواری کی تعمیر کا بھی اہتمام کیا جس میں حسب ضرورت توسیع و ترمیم ہوتی رہی چنانچہ ۴۰۰ھ میں سلطان الدولہ دیلمی کے وزیر ابو محمد ابن سہلان نے پہلی فصیل کو منہدم کر کے اس سے وسیع تر فصیل بنوائی۔ ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے:۔

مرض ابو محمد ابن سھلان فاشتد مرضہ فنذر ان عوفی بنی سورا علی مشھد امیرالمومنین علیہ السلام فعوفی فامر ببناء سور علیہ فبنی فی ھذہ السنۃ۔

(تاریخ کامل۔ ج ۷، ص ۹۴۲)

ابو محمد ابن سہلان بیمار ہو گئے۔ جب بیماری نے شدت اختیار کی تو انہوں نے منت مانی کہ اگر انہیں شفا ہوئی تو وہ امیرالمومنین علی علیہ السلام کے مشہد کے گرد فصیل تعمیر کریں گے۔ چنانچہ انہیں صحت ہو گئی اور انہوں نے فصیل کی تعمیر کا حکم دیا اور وہ اسی سال (۴۰۰ھ) میں تعمیر کر دی گئی۔"

آخری فصیل فتح علی شاہ قاچار متوفی ۱۲۵۰ھ کے وزیر نظام الدولہ اصفہانی نے تعمیر کی مگر شہر کے پھیلاؤ کی بنا پر اس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے۔

نجف کی آبادی خالص شیعہ افراد پر مشتمل ہے جن میں ایک بڑی تعداد ان طلبۂ علوم دینیہ کی ہے جو مختلف ممالک سے سمٹ کر ہر دور میں یہاں مقیم رہتے ہیں اور اس مرکز افادہ و فیضان اور سرچشمۂ علم و عرفان سے اپنی تشنگی دور کرتے ہیں اگرچہ نجف بہت پہلے سے ایک معہد علمی قرار پا چکا تھا مگر ۴۴۸ھ میں جب شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی بغداد کے آئے دن کے جھگڑوں اور شورشوں سے تنگ آ کر نجف میں چلے آئے۔ تو باقاعدہ جامعۂ نجف کی بنیاد قائم ہو گئی اور یہ باب مدینۃ العلم کے برکات کا کرشمہ ہے کہ نجف ہمیشہ مرکز علم رہا اور آج بھی دنیائے اسلام کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز ہے۔

مرقد علوی کی تعمیر

مرقد امیر المومنین کے محل و مقام کا علم آئمہ اہل بیت اور مخصوص افراد کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ اور علم ہوتا بھی تو کیونکر جب کہ قبر ایک ویران ٹیلے پر خاک کے اندر پنہاں تھی نہ نشان قبر تھا اور نہ لوح مزار۔ اس کا عمومی انکشاف اس وقت ہوا جب ہارون رشید عباسی ۱۷۰ھ میں برسر اقتدار آنے کے بعد کوفہ کے اطراف میں آیا۔ یہاں آنے کا مقصد سیر و شکار تھا۔ چنانچہ اس نے چند ہرن دیکھے تو ان کے پیچھے باز اور شکاری کتے چھوڑے مگر یہ دیکھ کر حیرت میں کھو گیا کہ جب باز اور شکاری کتے ہرنوں کا پیچھا کرتے ہیں تو وہ ایک ٹیلے پر چڑھ جاتے ہیں پھر نہ باز جھپٹتے ہیں اور نہ شکاری کتے آگے بڑھتے ہیں۔ اس نے حیرہ کے ایک شخص کو بلا کر پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اس نے بتایا کہ یہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کا مدفن ہے۔ ہارون نے اسے انعام دے کر رخصت کیا اور قبر کی زیارت کرنے کے بعد

ان هارون امر فبنی علیہ قبۃ واخذ الناس فی زیارتہ والدفن لموتاھم حولہ۔

(عمدۃ الطالب۔ ص۴۴)

"حکم دیا کہ یہاں روضہ تعمیر کیا جائے چنانچہ ایک قبہ تعمیر کیا گیا اور لوگ اس کی زیارت کے لئے آنے اور اس کے گرد و پیش اپنے مردے دفن کرنے لگے۔"

یہ عمارت ایک سرخ گنبد کی صورت میں تھی جس کے چاروں طرف چار دروازے تھے۔ اور قبر کی دیواریں سفید اینٹوں سے اٹھائی گئی تھیں۔

محمد ابن زید حسنی والیٔ طبرستان نے معتضد باللہ عباسی کے دور میں قبہ چار دیواری اور قلعہ نما روضہ تعمیر کیا جس میں ستر طاق تھے۔ معتضد باللہ کا دور حکومت ۲۷۹ھ سے ۲۸۹ھ تک ہے۔

جب ۳۶۷ھ میں عضد الدولہ فنا خسرو ابن رکن الدولہ برسر اقتدار آیا تو اس نے بصرف کثیر روضہ کی پرشکوہ عمارت بنوائی دیواروں پر ساج کی لکڑی کے تختے جڑے اور سفید رنگ کا گنبد تعمیر کیا۔ حسین ابن حجاج بغدادی متوفی ۳۹۱ھ نے اپنے مدحیہ قصیدہ میں کہا ہے:۔

یا صاحب القبۃ البیضا علی النجف — من زار قبرک واستشفی لدیک شفی

"اے سرزمین نجف میں سفید گنبد کے مکین جو شخص آپ کی قبر کی زیارت کرے اور شفا چاہے وہ شفایاب ہوگا۔"

اس تعمیر کے موقع پر عضد الدولہ نے وصیت کی تھی کہ اسے نجف میں حضرت کے جوار میں دفن کیا جائے

چنانچہ ابن خلقان نے تحریر کیا ہے:-

بنی علیہ المشهد الذی هناک وعزم علیه شیئاً کثیراً واوصی بدفنه فیه (وفیات الاعیان ج۱ ص۴۱۶)

عضد الدولہ نے صرف کثیر سے وہاں زیارت گاہ تعمیر کی اور وصیت کی کہ اسے بھی وہیں پر دفن کیا جائے۔"

چنانچہ جب اس نے ۸ شوال ۳۷۲ھ میں انتقال کیا تو اُسے روضۂ اطہر کی غربی جانب دفن کیا گیا۔
۷۵۵ھ میں آتشزدگی کا حادثہ رونما ہوا اور عمارت کا بیشتر حصہ منہدم ہوگیا مگر ۷۶۰ھ میں اُسے پھر سے تعمیر کر دیا گیا۔

۹۱۴ھ میں شاہ اسمٰعیل صفوی متوفی ۹۳۰ھ نے فولادی ضریح بنوائی اور حرم میں طلائی قندیلیں آویزاں کیں۔

۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس کبیر متوفی ۱۰۳۸ھ نے روضہ اقدس کی تعمیر کی اور صحن کو وسعت دی۔

۱۰۴۷ھ میں شاہ صفی صفوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے روضہ کی تعمیر شروع اور اس کی تکمیل اس کے بیٹے شاہ عباس ثانی متوفی ۱۰۷۷ھ نے کی۔

۱۱۵۴ھ یا ۱۱۵۶ھ میں نادر شاہ افشاری نے فتح ہند کے بعد کاشی کی اینٹوں سے روضہ کی مرمت کی اور گنبد اور میناروں پر سونا چڑھایا۔

۱۲۰۷ھ میں محمد خاں قاچار نے ۱۲۳۲ھ میں فتح علی شاہ قاچار نے اور ۱۲۸۸ھ میں ناصرالدین شاہ قاچار نے روضہ کی تعمیر و تزئین میں حصہ لیا۔

۱۳۶۱ھ میں ملا طاہر سیف الدین رئیس جماعت بوہرہ نے ایک خوشنما گنگا جمنی ضریح نصب کی۔

غرض ہر دور میں خصوصاً سلاطین دیالمہ جلائریہ ایلخانیہ حمدانیہ صفویہ اور قاچاریہ کے عہد میں روضۂ انور کی تعمیر و تزئین میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور اس چودھویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایرانی تاجر نے خالص سونے کے دروازے لگوائے اور شاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی طرف سے آئینہ کاری کی گئی اور انہی کی طرف سے روضہ کے اندر یہ رباعی آویزاں ہے:-

کارے نہ سزائے شہریاری کردم — گرد حرمت آئینہ کاری کردم
تا جلوۂ حق بہ بینم از طلعت تو — در پیش رخت آئینہ کاری کردم

تم المجلد الاول من السیرة العلویة علی صاحبها افضل الصلوٰة واتم التحیة۔

ملنے کا پتہ :-

العصر اسلامک بک سنٹر

۳۵۔ حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور